جون ۱۹۸۳ء

ماہنامہ

۵۰ پیسے

جلد ۳۸ نمبر ۳

جون ۱۹۸۳ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: گنگادھر پرشاد شکلا

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک ڈر

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

وفیات

ملک کے ممتاز و مقبول اردو شاعر سکندر علی وجد بھی چل بسے۔ ان کا انتقال اورنگ آباد میں ۱۶ مئی کو تقریباً ۷۰ سال کی عمر میں ہوا۔ وہ محض ایک شاعر اور ادیب ہی نہیں تھے بلکہ جج کے عہدۂ جلیلہ پر بھی فائز رہ چکے تھے اور ایک سیاست داں کی حیثیت سے بھی انہیں ہر طبقہ میں کافی مقبولیت اور شہرت حاصل تھی۔ اردو زبان و ادب سے والہانہ لگاؤ کے ساتھ ساتھ ان کے دل و دماغ میں تخلیق کا جو شعلہ روشن تھا اس نے انھیں ایک دن اس منزل پر پہنچا دیا، جہاں انھوں نے سیشن جج کا عہدہ بھی چھوڑ دیا اور وہ تمام تر اردو زبان و ادب کے ہو کر رہ گئے۔ ان کے متعدد شعری مجموعے لہو ترنگ (۱۹۴۴) آفتاب تازہ (۱۹۵۲) اوراق مصور (۱۹۶۴) اور بیاض مریم (۱۹۷۴) شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہوئے۔ وہ انجمن ترقی اردو (مہاراشٹر) کے صدر بھی رہے۔ ۱۹۷۵ء میں وہ مہاراشٹر اردو اکاڈمی کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۱ء میں انھیں مرکزی حکومت کے ترقی اردو بورڈ کا نائب صدر نامزد کیا گیا اس طرح وہ برابر اردو کے فروغ و ترقی سے متعلق سرگرمیوں سے باقاعدہ طور پر وابستہ رہے اور اردو کی گراں قدر خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۹۷۲ء میں وہ راجیہ سبھا کے ممبر بھی ہوئے مرکزی حکومت کی جانب سے ان کی خدمات کے صلے میں انھیں پدم شری کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ اس کے علاوہ انھیں متعدد انعامات اور اعزازات بھی حاصل ہوئے۔ غالب اکاڈمی نے انھیں ۱۹۷۷ء میں اکاڈمی ایوارڈ دیا۔ اسی سال اتر پردیش اردو اکاڈمی نے ان کے شعری مجموعے بیاض مریم پر انھیں ۳ ہزار روپے کا انعام پیش کیا۔ ان کی متعدد نظمیں کافی مقبول و مشہور ہوئیں، جن میں کارواں نیرنگی، اجنتا اور تاج محل قابل ذکر ہیں۔

● اردو کے بزرگ اور کہنہ مشق شاعر نجم رودلوی بھی ۱۴ مئی کی شب میں داغِ مفارقت دے گئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۶ سال تھی۔ وہ کافی عرصے سے لکھنؤ ہی میں مقیم تھے، بلکہ ایک طرح سے لکھنؤ ہی کے ہو گئے تھے۔ ان کی شاعری لکھنؤ اسکول سے متاثر رہی چنانچہ ان کی زبان اور ان کے اسلوب پر لکھنؤ کی زبان کے چٹخارے نکھار اور شگفتگی کا اثر نمایاں ہے۔ ان کا شعری مجموعہ ہنگام سحر ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا تھا، جس پر اتر پردیش اردو اکاڈمی نے انھیں انعام بھی پیش کیا تھا۔ ان کے انتقال سے ہم نے ایک اچھا شاعر اور پرانی قدروں نیز پرانی روایات کا ایک قابل قدر نمائندہ کھو دیا ہے۔ خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

● اردو کے ایک بزرگ شاعر و ادیب جناب ودیا ساگر شعلہ کا بھی گزشتہ ۱۰ اپریل کو دہلی میں انتقال ہو گیا۔ شعلہ صاحب ۱۹۱۰ء میں لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ دہلی آگئے تھے اور دہلی میں مستقل طور سے قیام پذیر ہو گئے تھے۔ ان کا ایک مجموعۂ کلام نغمۂ نادر ۱۹۶۲ء میں شائع ہو چکا ہے اور بہت سا کلام اب بھی غیر مطبوعہ ہے۔ وہ نثر بھی بہت شگفتہ لکھتے تھے۔ حفیظ جالندھری کے پرستاروں میں سے تھے۔ اور ان کا بہت ہی ادب و احترام کرتے تھے۔ تین ماہ قبل جب میں دہلی گیا تھا تب مرحوم سے فون پر بات ہوئی تھی اور میری درخواست پر انھوں نے نیا دور کے "فراق نمبر" کے لیے اپنا ایک گرانقدر تاثراتی مضمون بھی مرحمت فرمایا تھا۔ افسوس کہ "فراق نمبر" ان کی حیات میں شائع نہ ہو سکا۔ غیر منقسم پنجاب نے ایک سے بڑھ کر ایک غیر مسلم اردو ادیبوں اور شاعروں کی ایک بہت بڑی کھیپ تیار کی تھی جنھوں نے اپنی بیش بہا تخلیقات و نگارشات کے ذریعہ اردو زبان و ادب کے خزانے کو انمول موتیوں اور جواہرات سے بھر دیا ہے۔ لیکن افسوس صد افسوس اب وہ پرانی نسل ختم ہوتی جا رہی ہے۔

——— ایڈیٹر

خواجہ احمد عباس
فلومینا اپارٹمنٹس
چرچ روڈ۔ جوہو
بمبئی ۴۰۰۰۴۹

افسانہ

چڑے چڑیا کی کہانی

مکرمی صدیقی صاحب!
ایک کہانی "چڑے چڑیا کی کہانی" "نیا دور" کے لیے آپ کو بھیج رہا ہوں
شاید کسی قابل ہو۔ رسید سے مطلع کریں۔ شکرگزار ہوں گا۔
خاکسار
خواجہ احمد عباس

ایک تھا چڑا۔ ایک تھی چڑیا۔
چڑا شوہر تھا۔ چڑیا بیوی تھی
چڑا لاتا چاول کا دانہ۔
چڑیا لاتی دال کا دانہ۔
پھر دونوں کھچڑی پکاتے۔ مزے لے لے کر کھاتے۔
دونوں جنگل میں آرام سے رہتے تھے مگر جنگل میں اور بھی جانور تھے۔ انھیں چڑے چڑیا کی محبت اور ان کی خوشحال زندگی سے اندر ہی اندر جلن ہوتی تھی۔

ایک تھی گھونس جوان کے پیڑ کے نیچے بل میں رہتی تھی۔ ایک دن اس نے چڑے چڑیا کو دیکھ لیا کہ دونوں کھچڑی پکا کر مزے سے کھا رہے ہیں۔ وہ جل ہی تو گئی۔

چڑا کھچڑی کھا کر سیر کو چلا گیا۔ تب وہ بولی: "چڑیا چڑیا۔ تو نے اس چڑے کو بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ وہ مُوا ایک چاول کا دانہ ہی تو لاتا ہے۔ وہ بھی بالکل سفید۔ تو کتنی محنت سے دال کا دانہ لاتی ہے۔ پھر پکانے میں بھی محنت تو ہی زیادہ کرتی ہے۔ پھر بھی وہ مُوا آدھی سے زیادہ تیری پکائی ہوئی کھچڑی ہڑپ کر جاتا ہے۔"

چڑیا اس وقت تو چپ رہی۔ مگر یہ بات اس کے دل میں گھر کر گئی۔

پھر جب چڑیا باہر گئی اور چڑا گھونسلے میں لوٹ آیا تو گھونس اس سے بولی "چڑے چڑے تو تو بالکل پاگل ہے۔ اتنی ذرا سی چڑیا سے ڈرتا ہے۔ کتنی محنت کرتا ہے تو۔ چاول کے دانے کو اپنے پنجوں میں لاتا ہے چاول جو سفید براق ہوتا ہے۔ وہ کلموہی چڑیا تو دال کا ایک چھوٹا سا دانہ لاتی ہے۔ وہ اپنے دال کے دانے کی طرح کالی ہے۔ تُو تو اپنے چاول کے دانے کی طرح سفید ہے۔ کالے اور سفید کا کیا مقابلہ۔؟ تو کھانا پکانے میں بھی کتنا کام کرتا ہے۔ اس سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ تھکا ماندہ آیا ہے تیرے پیر ہی دبا دے۔ مزے سے بیٹھی رہتی ہے۔ بھلا میاں بیوی کے درجے کا خیال بھی نہیں اُسے۔؟ اور سچ تو یہ ہے کہ کالے اور گورے کی جوڑی تو ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتی! یہ بھی کوئی جوڑی ہوئی اگر دنیا میں ایسا ہی ہونے لگا تو ساری دنیا کا خانہ خراب ہو جائے گا۔!"

چڑا بھی یہ سن کر اس وقت تو چپ رہا لیکن اس کے دل میں یہ

... دن جب جنگل سے چاول کا دانہ لے کر چڑا اپنے گھونسلے کو لوٹا تو چڑیا پہلے ہی اپنا دال کا دانہ لیے بیٹھی تھی ۔

"آج بڑی دیر لگا دی تم نے ۔ ؟" چڑیا نے نخرے سے کہا "کب سے انتظار کر رہی ہوں کہ تم چاول کا دانہ لاؤ تو میں کھچڑی پکاؤں ۔ ؟"

چڑا یہ سن کر جل ہی تو گیا ۔ بولا "چاول کا سفید دانہ اتنی آسانی سے تھوڑا ہی ملتا ہے ۔ یہ آدمی لوگ بہت سیانے ہو گئے ہیں ۔ جب سے چاول پانچ روپئے سیر بکنے لگا ہے، پوری چوکیداری کرتے ہیں ۔ مجال ہے ایک دانہ کہیں گرا دیں ۔ اسی کی تلاش میں گھوم رہا تھا ۔ تمھاری کالی دال کا کیا ہے ۔ ہر طرف بکھری پڑی رہتی ہے ۔"

"تو کل سے تم کالی دال لا دیا کرو ۔ جانتے ہو تمھارے سفید چاول کا بھاؤ پانچ روپئے سیر ہے تو میری دال کا بھاؤ سات روپئے سیر ہے ۔ خزانے کی طرح چھپا کر رکھتے ہیں اسے آدمی آج کل ۔" چڑیا بولی ۔

"بڑبڑ نہ کر ۔" چڑا چڑ کر بولا ۔ "چل، کل سے تیری کالی دال ہم لا دیا کریں گے ۔ تب جانیں گے جب تم سفید چمکتا ہوا چاول کا دانہ لا کر دکھاؤ ۔"

کھچڑی اس دن بھی پکی ۔ مگر پیار سے نہیں ۔ دونوں نے تھوڑی تھوڑی کھائی، تھوڑی بچا دی ۔ "اب یہ کھچڑی کون کھائے گا ۔ ؟" چڑیا بولی ۔

چڑے نے جواب دیا "مجھے آج بھوک نہیں ہے، پھینک دے ۔ صبح تک باسی ہو جائے گی ۔"

سو چڑیا نے کھچڑی گھونسلے کے باہر پھینک دی ۔ جیسے ہی زمین پر پڑی ۔ گھونس نے بل سے نکل کر کھچڑی بڑے مزے سے کھائی اور پھر اپنے بل میں گھس کر بیٹھ گئی ۔

رات تو چڑا اپنے پروں میں سمٹا ہوا سوتا رہا
چڑیا اپنے پروں میں سمٹی ہوئی سوتی رہی ۔
صبح کو چڑا بغیر چڑیا سے کچھ کہے چلا گیا ۔ آج اسے دال کا دانہ لانا تھا ۔

چڑیا نے جب چڑے کو غائب دیکھا تو وہ بھی جانے لگی ۔

اتنے میں گھونس باہر نکل آئی ۔ کہنے لگی ۔ "چڑا کہاں سویرے سویرے گیا ہے ۔ ؟"

"میری جانے بلا ۔" چڑیا نے تنک کر جواب دیا ۔

"کیوں لڑائی ہو گئی کیا ۔ ؟" گھونس بولی ۔ "ذرا خیال رکھا کرو ۔ آج کل ایران سے بڑی خوبصورت خوبصورت بلبلیں آئی ہوئی ہیں اسی جنگل میں ۔ کتنے ہی چڑے ان کے جال میں پھنس گئے ہیں ۔ چڑیوں کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں آج کل ۔"

"تو جائے جہاں جاتا ہے ۔ بلبلوں کے پاس جاتا ہے یا رنگین چڑیوں کے جال میں پھنستا ہے مجھے کوئی پرواہ نہیں ۔" چڑیا جل کر بولی ۔ "میں تو چاول کے سفید دانے کی تلاش میں جا رہی ہوں ۔" اور چڑیا اڑ گئی ۔

اور گھونس بڑی دیر تک اپنی چالاکی کی کامیابی پر ہنستی رہی ۔

اس دن چڑے کو معلوم ہوا کہ ایک دال کا دانہ لانا کتنا مشکل کام ہے ۔ اس کی تلاش میں کہاں کہاں پھرا ۔ پہلے کھیتوں میں گیا ۔ وہاں دیکھا کہ سوکھا پڑا ہے ۔ بنجر زمین پڑی ہے ۔ پھر گاؤں میں گیا ۔ دیکھا کہ لوگ بھوکے مر رہے ہیں ۔ دال کے بجائے گھاس پھوس ابال کر بچوں کو کھلا رہے ہیں ۔ ہاں ایک ساہوکار کے ہاں دال پکی ہوئی دیکھی مگر اس کی بیوی اتنی ہوشیار تھی کہ اس نے ایک دانہ دال کا باہر نہ گرنے دیا ۔ اسی تلاش میں اپنے پر پھڑپھڑاتا ہوا پھر رہا تھا کہ ایک سوراخ نظر آیا ۔ اس کے اندر گھس کر دیکھا کہ گودام میں دال کے بورے بھر کے رکھے تھے ۔ چڑا خوش ہو گیا ۔ مگر سب بوروں پر رسی بندھی ہوئی تھی ۔ باہر ایک دانہ نہیں تھا ۔ مگر ایک کونے میں جب دال کے دانے بکھرے ہوئے نظر آئے تو چڑا ان پر جھپٹا ۔ مگر یہ ایک جال تھا جس میں پھنس کر چڑا گرفتار ہو گیا ۔

اتنے میں گودام کا دروازہ کھلا اور وہ اونچی آواز میں کہہ رہا تھا ۔ "اب تو سوکھا پڑ گیا ہے ۔ اس دفعہ تو میں دس روپے سیر دال بیچوں گا ۔" اتنے میں اس کی نظر چڑے پر پڑی ۔ کہنے لگا ۔ "اچھا ہوا آج ایک چڑا پھنس گیا ہے ۔ شام کو اس کو کسی چڑیمار کو بیچ دوں گا ۔ وہ کم سے کم دو روپے میں اسے کسی کے ہاتھ بیچ دے گا ۔ جنم کا

شاکا ہاری ہوں۔ نہیں تو میں ہی اس چڑے کو پکڑوا کر کھا جاتا۔ روز میرے گودام میں دانے غائب ہوتے ہیں۔ اصل چور آج پکڑا گیا ہے"۔

چڑا سوچتا رہا کہ "میں تو آج پہلی بار آیا ہوں۔ پہلے کون آتا رہا ہے یہاں۔؟"

ادھر چڑیا چاول کے سفید دانے کی تلاش میں پریشان تھی۔ کھیت کھلیان سب دیکھ ڈالے، ہر جگہ سوکھا پڑا تھا۔ بنجر کھیتوں میں چاول کے دانے کہاں ملتے۔؛ پھر وہ بھی گاؤں آئی۔ ادھر ادھر دیکھا، سونگھا مگر چاول کا دانہ کہیں نہیں ملا۔ اتنے میں واپس اڑ رہی تھی کہ چڑے کی چوں چوں کی آواز کان میں آئی۔ ادھر ادھر دیکھا تو پتہ چلا کہ آواز ایک سوراخ میں سے آ رہی ہے۔ وہ سوراخ میں گھسی تو چڑے کو جال میں پھنسا ہوا پایا۔

"کیوں جی۔ یہاں کیا کر رہے ہو؟ میں تو سمجھی تھی ایرانی بلبلوں یا رنگ برنگی چڑیوں کی تلاش میں بھٹک رہے ہو گے۔؟"

لعنت بھیجو ایرانی بلبلوں اور رنگ برنگی چڑیوں پر بھی اور مجھے اس مصیبت سے نجات دلواؤ۔ وہ ساہوکار مجھے آج چڑی مار کے ہاتھوں بیچ ڈالے گا۔ اور وہ کسی مانساہاری کے ہاتھ بیچ ڈالے گا۔"

"تمہارا شوربہ تو بڑا مزیدار ہوگا۔؟" چڑیا نے ہنس کر کہا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہے۔؟" چڑے نے پوچھا۔

چڑیا نے چونچ سے پھندا کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ "اس میں میرے پیار کا مزا بھی ہوگا نا۔؟"

آزاد ہو کر چڑا کچھ دیر تک تو چڑیا کے گرد پھڑ پھڑاتا رہا۔ پھر بولا "چلو دال کا دانہ نہیں ملا تو چل کر چاول کا دانہ ہی ڈھونڈ لیں"۔

"دال کا دانہ تو لے لیں"۔ یہ کہہ کر چڑیا ایک کونے میں اڑی اور وہاں ایک بوری پھٹی ہوئی تھی۔ اس سوراخ میں چونچ مار کر ایک دال کا دانہ نکال لیا۔ پھر کہنے لگی "یہ تو بالکل آسان ہے لیکن معلوم ہونا چاہیے کہ کہاں چونچ مارنی ہے۔؟"

"جس کا کام ہو وہی جانے۔ مجھے بھی چاول کا دانہ کہیں نہیں ملا۔ سب جگہ پر مار کر چلی آئی"۔

سو دال کا دانہ تو مل گیا۔

چڑا اور چڑیا دونوں ایک اور ساہوکار کے ہاں پہنچے۔ جہاں گودام میں سیکڑوں بورے چاول بھرے پڑے تھے۔ ان میں سے ایک میں چونچ مار کر چڑے نے ایک دانہ چرایا۔ واپس جا رہے تھے کہ چڑیا نے بہت سے چاول کے دانے بکھرے دیکھے۔ کہنے لگی۔ "اتنے سارے چاول کے دانے! ان کو بھی لے لیں۔ ہفتے بھر کے لیے چھٹی ہو جائے گی"۔

چڑے نے جواب دیا۔ "میں سب جانتا ہوں۔ یہ ساہوکار نے ہمیں پھانسنے کے لیے یہاں ڈال رکھے ہیں۔ وہ دیکھو جال بچھا ہوا ہے۔ جب تک ہم ایک دانے پر قناعت کریں گے ساہوکار کو پتہ بھی نہ چلے گا"۔

سو چڑا لایا ایک چاول کا دانہ
چڑیا لائی ایک دال کا دانہ
دونوں نے اس رات مل کر کھچڑی پکائی۔
اس رات کھچڑی بڑی مزیدار تھی۔

چڑے نے کہا۔ "چوں چوں چوں"۔ یعنی "تمہاری پکائی ہوئی کھچڑی آج بڑی مزیدار تھی"۔

چڑیا نے کہا۔ "چوں چوں چوں"۔ یعنی "اس میں ہمارے پیار کا مزا تھا نا؟"

چڑے نے کہا، "چوں چوں چوں"۔ یعنی "تم کتنی سندر لگ رہی ہو آج۔!"

چڑیا نے کہا۔ "چوں چوں چوں"۔ یعنی "کچھ تو شرم کرو گھونس سن رہی ہو گی"۔

چڑے نے کہا "سنے دو۔ وہ بل میں رہنے والی ہم اڑنے والے پنچھیوں کے پیار کو کیا جانے۔ زیادہ سے زیادہ اپنے بل ہی میں تو گھس جائے گی۔!"

✱

غزلیں

نذیر بنارسی
پانڈے حویلی
وارانسی

جتنے ٹوٹے جام ملتے جائیں سب یکجا کریں
دل کے زندانِ کہن کی یاد پھر تازہ کریں

دوسروں سے کب تلک ہم پیاس کا شکوا کریں
لاؤ تیشہ ایک دریا دوسرا پیدا کریں

یہ کریں اور وہ کریں ایسا کریں ویسا کریں
زندگی دو دن کی اس دو دن میں ہم کیا کیا کریں

ہم نے تو طے کر لیا تھا اب نہ جائیں گے اُدھر
راستہ ہی اس طرف مڑ جائے تو ہم کیا کریں

حسن خود آئے طوافِ عشق کرنے کے لیے
عشق والے زندگی میں حسن تو پیدا کریں

گذری باتوں کا بھی دہرانا ضروری ہے مگر
وقت ہی اتنا نہیں تم کیا کرو ہم کیا کریں

اس پرانی بے وفا دنیا کا رونا کب تلک
آیئے مل جل کے اک دنیا نئی پیدا کریں

چڑھ کے سولی پر خریدیں گے خریدار آپ کے
آپ اپنے حسن کا بازار تو اونچا کریں

آج کل کی بات کوئی گھات سے خالی نہیں
آپ ہر دستک پہ دروازہ نہ اپنا وا کریں

زندہ رہنا ہے تو نکلیں روز گھر سے سر بہ کف
موت کیوں پیچھا کرے ہم موت کا پیچھا کریں

دل ہمیں تڑپائے تو کیسے نہ ہم تڑپیں نذیر
دوسرے کے جسم میں رہ کر اپنی والی کیا کریں

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
قطب پور۔ ڈالی گنج۔ لکھنؤ

دیکھیے اس عشق میں کیا کچھ ہمیں آجائے ہے
جس کو سوچا بھی نہیں جاتا تھا برتا جائے ہے

یہ تقاضا عشق کا ہر دم کہ ان کا نام لوں
ضبط کہتا ہے کہ اس سے دل پہ حرف آجائے ہے

کیا ہی طرفہ رنگ لائیں شوق کی بے باکیاں
آئینہ اب وہ اگر دیکھے ہے شرما جائے ہے

عہدِ رنگین جوانی، کاہشِ زلفِ دراز
اب بھی یاد اُس کی جب آجاتی ہے لہرا جائے ہے

آپ جب دنیا کی حالت کو بدل سکتے نہیں
کیوں نہ چلیے اس طرف جس سمت دنیا جائے ہے

دل کو لٹنے سے بچا لیتے مگر کیا کیجیے
زندگی کا عشق کے کوچے سے رستا جائے ہے

دیکھتے ہی دیکھتے ہر صبح ہو جاتی ہے شام
وقت کی اوقات کیا ہر وقت گزرا جائے ہے

اک زمانہ گر غلط رستے پہ جاتا ہے تو جائے
مردِ خود آگاہ اپنی راہ تنہا جائے ہے

کچھ نہ پوچھو آج کل کیونکر گزرتی ہے یہاں
جیسے صحرا میں مسافر آبلہ پا جائے ہے

ضیاء الدین اصلاحی

مشترکہ کلچر

شترکہ کلچر کی ضرورت اہمیت

ہندستان جیسے بڑے اور وسیع و عریض ملک میں آباد تلف مذہبی، لسانی، تہذیبی اور نسلی گروہوں اور فرقوں ین اتحاد و یکجہتی کے لیے مشترکہ کلچر کی ضرورت و اہمیت سلم ہے کیونکہ اس کے بغیر ملک مضبوط اور مستحکم نہیں ہو سکتا ہاں کے باشندوں کا تعلق خواہ کسی نسل، مذہب، زبان اور لاقے ہو مگر چونکہ ان کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی مسائل یکساں نوعیت کے ہیں اس لیے ان کی وہی حیثیت ہے جو ایک اں باپ کی اولاد یا ایک خاندان کے افراد کی ہوتی ہے جن ی شکل و صورت، قد و قامت، ذوق و طبیعت، ذہنی و ملی صلاحیتوں، جذبات و میلانات اور افکار و خیالات یں بڑا فرق و اختلاف ہوتا ہے مگر اس کے باوجود وہ سب تحد و متفق رہتے ہیں اور اپنے اشتراک و تعاون سے اپنے ھر اور خاندان کی ترقی و تحفظ میں حصہ لیتے ہیں اور اس کی عزت و نیک نامی میں اضافہ کرتے ہیں اسی طرح ہندستان کے مختلف عقیدہ و مذہب کے ماننے والوں کو بھی ملک ی ترقی و استحکام اور اس کا وقار بڑھانے میں متحد اور سرگرم عمل رہنا چاہیئے اور یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب ان مختلف و متضاد عناصر میں ذہنی و فکری ہم آہنگی ہو اور ان کا کلچر بھی یکساں ہو۔

ایک اور پہلو سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ مذہبی، لسانی تہذیبی اور نسلی اختلافات کے باوجود ہندستان کی نوعیت جغرافیائی اعتبار سے اکائی کی ہے اس لیے اس کے باشندوں میں ایک متحدہ ثقافت و تہذیب کا پایا جانا فطری اور ناگزیر ہے۔

آزادی کے بعد نئے ہندستان کی تعمیر و ترقی کے سلسلے میں جو مسائل درپیش ہیں ان سے عہدہ بر آ ہونے کے لیے بھی مشترکہ کلچر کی اہمیت و ضرورت مسلّم ہے، کیونکہ اس کے بغیر نہ قومی اتحاد و یکجہتی کی راہ کا روڑے دور ہو سکتی ہیں اور نہ ملک کے فلاحی، تعمیری اور ترقیاتی منصوبے عملی جامہ پہن سکتے ہیں۔

کلچر کا مفہوم اور اس کے اجزاء

کلچر ایک وسیع اصطلاح ہے اس میں مذہبی عقائد و تہذیب معاشرت اور علوم و فنون وغیرہ سب ہی شامل ہیں مگر اس کے خاص اور اہم اجزا یہ ہیں۔

۱۔ مذہبی عقائد، عبادات اور حلال و حرام کے ضوابط

۲۔ پرسنل لا اور مذہبی احکام و مسائل۔

۳۔ ملی و تاریخی روایات۔

۴۔ عام تہذیب و معاشرت یعنی رسم و رواج، لباس وضع قطع، رہنے سہنے کے آداب، کھانے پینے، ملنے جلنے اور نشست و برخواست کے طریقے، فنون لطیفہ ادب، شاعری، مصوری، موسیقی، سنگ تراشی اور طرز تعمیر وغیرہ

پہلے جز کا مذہب سے نہایت گہرا تعلق ہے اور دوسرے اور تیسرے اجزا کا بھی ایک حد تک مذہب سے تعلق ہے اس لیے ان میں وحدت و اشتراک کا سوال نہیں پیدا ہوتا کیونکہ کلچر کے یہ اجزا ہر ہر مذہب میں جدا جدا ہوتے ہیں اور ان ہی پر مذاہب کے خاص مزاج اور انفرادی وجود کا دار و مدار ہوتا ہے، اسی اعتبار سے دنیا کی تمام جمہوری حکومتوں کے دستور میں علاحدہ سے کلچر کے تحفظ کی ضمانت ہوتی ہے، ہندستان کے دستور میں بھی یہ ضمانت موجود ہے اور اسی حیثیت سے صدر کانگریس مولانا ابو الکلام آزاد نے رام گڑھ کے اجلاس کے خطبہ صدارت میں فرمایا تھا:

"بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔"

ہندستان کے جدا جدا مذاہب تو در کنار خود ایک ہی مذہب سے تعلق رکھنے والے مختلف فرقوں میں نہ مکمل یکسانیت ہے اور نہ ان میں کلچرل اور تہذیبی اتحاد ہے، ہندستان میں مسلمانوں کے متعدد فرقے ہیں بوہرہ، خوجہ، شیعہ سنی، حنفی، دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث وغیرہ۔ ان سب کے نقطۂ نظر اور کلچر و ثقافت میں جو اختلاف ہے وہ ظاہر ہے ہندوؤں کے مختلف فرقوں میں تو یہ اختلاف اور بھی زیادہ ہے چنانچہ سناتن دھرم، بدھ مذہب، جین مذہب، آریہ سماج اور برہمو سماج وغیرہ میں تہذیبی و ثقافتی حیثیت سے گوناگوں اختلافات ہیں۔ ہندستان کے دوسرے مذاہب، سکھ، پارسی اور عیسائیت وغیرہ کے مختلف فرقوں کے درمیان بھی بکثرت اختلافات پائے جاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ کلچر کے جن اجزا کا تعلق مذہب، اس کے عقائد، اصول اور احکام سے ہے ان میں ہندستان تو کیا دنیا کے کسی اور ملک میں بھی وحدت و اشتراک نہیں ہے اب اگر کسی ملک میں ان اجزا میں بھی اتحاد و اشتراک کا مطالبہ کیا جائے تو اس سے اتفاق و یکجہتی کے بجائے تفرقہ پیدا ہوگی اسی لیے اب یہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کلچر مذہب میں داخل ہو ہی نہیں سکتا۔

البتہ ثقافتی و معاشرتی اعتبار سے ملک کا کلچر آج سے نہیں صدیوں سے تقریباً یکساں رہا ہے اس لیے اسی اعتبار سے ہم اپنے مشترکہ کلچر کی مختصر سرگزشت بیان کرتے ہیں۔

ہندستان کے مشترکہ کلچر کی سرگزشت

ہمارے ملک کی قدیم قوم دراوڑ ہے، جب آرین فاتح کی حیثیت سے آئے تو انھوں نے اسے جنوب کی طرف ڈھکیل دیا، لیکن ملک کی تہذیب و کلچر میں دونوں کے عناصر شامل رہے بودھ مت اور جین مذہب نے بھی ہماری تہذیب اور کلچر کو سنوارنے اور نشو و نما دینے میں حصہ لیا بلکہ بدھ مت کی بدولت ہمارا کلچر دوسرے ملکوں میں بھی پھیلا، سکندر اعظم کی فتوحات کے ساتھ یونانی تہذیب کی لہریں بھی ہمارے ملک سے ٹکرائیں، آخر میں مسلمان آئے اور ان کی تہذیب کے عناصر بھی اس ملک کے کلچر میں شامل ہوئے۔ کالی داس کپور لکھتے ہیں:

> "دونوں کا میل ہوا، دونوں نے ایک دوسرے سے سبق سیکھا، دونوں نے مل کر اس تہذیب کی وہ شکل پیدا کر دی جسے ہندستانی تہذیب کہتے ہیں، ہمارے ملک کی تہذیب کی سب سے بڑی خوبی یہ رہی ہے کہ اس نے دیگر تہذیبوں کو جذب کر کے اپنی ظاہری حالت کو تھوڑا بہت بدل دیا۔ ہندستان میں جب اسلامی تہذیب آئی تو رفتہ رفتہ اس کا عربی رنگ پھیکا پڑ گیا اور اس نے ہندو تہذیب سے بہت کچھ لیا، غرض ہندو اور مسلمان تہذیب کے معاملہ میں ایک دوسرے کے مقروض ہیں، دونوں نے مل کر ہندستانی تہذیب کو بنایا۔"

ہندستان میں جو مسلمان آئے وہ نسلاً عرب نہ تھے بلکہ ایرانی تورانی، مغل، پٹھان اور ترک تھے جن کا کلچر اسلامی اور عربی نہ تھا اس لیے ان کے واسطے سے جو کلچر اس ملک میں آیا وہ ایرانی و

عجمی یا عربی آمیز عجمی تھا۔ اس کے بعد ہندستانی تہذیب و کلچر کے امتزاج سے ایک دلکش و دلآویز نئے کلچر نے جنم لیا، اس دلفریب گنگا جمنی کلچر میں قدیم ہندستان کے نقوش کی عظمت کے ساتھ عجم کا حسن طبیعت اور عرب کا سوز دروں بھی شامل ہے۔

مغلوں نے ہندستانی تہذیب و کلچر کو آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا مگر ان کے بعد انگریز آئے تو ان کی تہذیب و تمدن کے نقش و نگار بھی ہمارے کلچر میں نظر آنے لگے، اس طرح ہمارا مشترک کلچر ایرانی، ہندی اور انگریزی تمدن کے حسین و دلکش عناصر کا بوقلموں اور دلفریب مرقع بن گیا۔ اس کی خاص خوبی یہ ہے کہ یہ مختلف مذاہب، متعدد زبانوں اور گوناگوں ثقافت و تہذیب اور رسم و رواج کے ماننے والوں کے میل جول سے بنا ہے اس لیے اس میں سب کا جوہر اور عطر موجود ہے۔

مشترکہ کلچر کس طرح وجود میں آیا

ہر تہذیب جس طرح دوسری پر اثر انداز ہوتی ہے اسی طرح اس سے اثر پذیر بھی ہوتی ہے، جب دو قوموں کا میل جول اور دو تہذیبوں کا اختلاط ہو گا تو فطری طور پر وہ ایک دوسرے سے متاثر ہوں گی، ہماری مشترک تہذیب اور کلچر اسی اتصال اور تاثر کا نتیجہ ہے، مسلمانوں نے دوسری قوموں کے تہذیبی اثرات جس قدر قبول کیے ہیں اس کی مثال کسی اور قوم میں نہیں مل سکتی علاوہ ازیں انھوں نے ہندستان کو اپنا وطن بنا لیا تو یہاں شادی بیاہ کر کے اس کے باشندوں سے گھل مل گئے تھے، ان کی بڑی تعداد ہندی الاصل ہے، ان کے بزرگوں نے کسی زمانہ میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس لیے ان کا دین تو اسلام ہو گیا مگر معاشرت وہی پرانی ہی رہی، اسی لیے دیہات کے ہندواؤ مسلمانوں میں مذہب کے علاوہ تہذیب و معاشرت کا کوئی فرق نہیں، کلچر اور تمدن عورتوں کے ذریعہ زیادہ پھیلا ہے، جن ہندستانی عورتوں نے اسلام قبول کیا، جب وہ مسلمانوں کے حبالۂ عقد میں آئیں تو ان کے ذریعہ ہندوؤں کی تہذیب و معاشرت مسلم گھرانوں میں بھی پہنچ گئی، اس طرح گو مسلمان باہر سے آئے مگر انھوں نے ہندستانی تہذیب و ثقافت کو اپنا لیا۔

مسلمانوں میں ہندو کلچر کے اثرات

اس مشترک کلچر اور ہندو تہذیب کے اثرات سے مسلمانوں کی زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ خالی ہو، ان میں بھی نسلی امتیاز و تفوق، ذات پات کا تصور اور اعلیٰ و ادنیٰ کے طبقے پیدا ہو گئے ہیں، بیوہ کی دوسری شادی اور طلاق کو وہ بھی معیوب سمجھتے ہیں اور لڑکیوں کو ترکہ نہ دینے کی روایت ان میں بھی قائم ہو گئی ہے، حالانکہ ان چیزوں کے بارہ میں ان کی شریعت کے احکام ان کے مروجہ طریقوں کے یکسر خلاف ہیں۔

• پیدائش کے سلسلے میں چھٹی۔ چلّا، سوہل، سور کے ٹوٹکے اور زچہ بچہ کے متعلق ساری یہیں کی رسمیں مسلمانوں نے بھی اختیار کر لی ہیں، شادی میں مانجھا، منڈوا، بارات، بری بھاٹا ڈولا، پائل، چوتھی، چالہ، نیگ اور جہیز وغیرہ سے متعلق رسمیں بھی مسلمانوں کے یہاں ادا کی جاتی ہیں۔ موت میں تیجہ، دسواں بیسواں، چالیسی، تماہی، چھماہی، برسی مردہ کے مرنے کی جگہ چراغ جلانا وغیرہ یہ سب مسلمانوں میں بھی رواج پا گئے ہیں، مسلمانوں میں خوشی کی تقریبوں کے سارے گانے ہندی ہیں، ہولی اور بسنت کے تیوہار اکثر مسلمان بھی مناتے ہیں، جن مردوں اور عورتوں میں مذاق کا رشتہ ہوتا ہے وہ ہولی کے موسم میں ایک دوسرے پر عبیر و گلال اڑاتے ہیں۔ مذاق کا رشتہ خود ہندستانی اثر کا نتیجہ ہے۔

مسلمانوں نے جہاں ہندوؤں کے کلچر کی بہت سی چیزوں کو اپنا لیا ہے وہاں اس پر اثر انداز بھی ہوئے ہیں جنگ آزادی کے مشہور رہنما اور آل انڈیا کانگریس کے سابق صدر ڈاکٹر پٹابی، سیتا رمیہ نے کانگریس کے سالانہ اجلاس جے پور کے خطبہ صدارت میں اس کا اس طرح اعتراف کیا ہے:

"مسلمانوں نے ہمارے تمدن کو مالا مال کیا اور ہمارے نظم و نسق کو مستحکم و مضبوط بنایا نیز وہ ملک کے دور دراز کے حصوں کو ایک دوسرے سے قریب

لانے میں کامیاب ہوئے، اس ملک کے ادب اور اجتماعی زندگی میں ان کی چھاپ بہت گہری دکھائی دیتی ہے۔"

ہماری وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے بھی چودھویں صدی ہجری کی تقریبات میں تقریر کرتے ہوئے ان باتوں کا ذکر کیا ہے۔ ہندوؤں کے بعض گروہوں میں توحید خالص کا تصور مسلمانوں ہی کے ذریعہ آیا، معاشرت میں ستی کی رسم کا خاتمہ عقد بیوگان کا رواج ہوا اور لڑکیوں کی وراثت۔ طلاق اور چھوت چھات سے نفرت کی تحریک ملی۔

مشترکہ ہندو مسلم کلچر کے بعض نمونے

بہت ساری چیزوں میں ہندو مسلمانوں کی معاشرت بالکل یکساں ہے۔ مثلاً لباس میں کرتہ، پائجامہ، قمیص، شیروانی، انگرکھا، ہندستانی کوٹ، دوپلڑی اور کشتی نما ٹوپی، سلیم شاہی جوتا، یا انگریزی جوتا اسی طرح بہت سے انگریزی لباس تمام ہندو مسلمانوں کے شہری اور تعلیم یافتہ طبقہ میں عام طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ دیہاتی مسلمانوں اور ہندوؤں کے لباس میں اس سے بھی زیادہ یکسانیت اور وحدت ہے، دھوتی ہندو مسلمان دونوں پہنتے ہیں۔ ساڑیاں ہندو عورتوں کی طرح مسلمان عورتیں بھی پہنتی ہیں اور شلوار اور جمپر مسلم خواتین کی طرح ہندو عورتوں کا لباس بھی بنتا جا رہا ہے۔

روزانہ کی غذا میں ترکاری، چپاتی، دال، چاول، پوری سہال، اچار، چٹنی، مٹھائیوں کی بیشتر قسمیں اور چائے کے سب سامان دونوں فرقوں کے لوگوں کے یہاں یکساں ہیں، یہاں تک کہ ہندوؤں کے بعض طبقے اور تعلیم یافتہ لوگ اب گوشت اور انڈے بھی کھانے لگے ہیں اس لیے وہ بھی مسلمانوں کی مخصوص غذا نہیں رہی۔ مسلمانوں کے جو پُرتکلف کھانے ایرانی تھے اب انھوں نے ہندستانی شکل و صورت اختیار کرلی ہے اور وہ خالص ایرانی نہیں ہیں۔ کھانے پینے کے برتن اور آداب معز ز ہندو اور مسلمانوں کے ایک جیسے ہیں، دونوں کے یہاں میز کرسی کا استعمال ہوتا ہے، چائے کی پیالیاں، شربت کے گلاس اور کھانے کی پلیٹیں یکساں ہوتی ہیں۔

رہنے سہنے اور ملنے جلنے کے آداب، مکانات کے ساز و سامان اور طرز آرائش و زیبائش میں کوئی فرق نہیں رہ گیا ہے، دونوں کی سج دھج اور ظاہری وضع قطع میں اس قدر یکسانیت ہوتی ہے کہ ہندو مسلم کو پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ درختوں، پھلوں اور پھولوں میں بھی دونوں کے کلچر کی جھلک ہے، ہندستان میں جدید چمن بندی اور باغ لگانے کے طریقے بھی مشترکہ کلچر کی دین ہے آم سب کو مرغوب ہے، سیب، ناشپاتی، انار اور انناس باہر سے ضرور آئے مگر اب وہ بھی ہندستانی ہو گئے ہیں۔

علم و ادب میں مسلمانوں نے ہندو تہذیب اور فلسفہ و ادب کا گہرا مطالعہ کیا، ابومعشر فلکی اور البیرونی نے سنسکرت سے عربی میں اور عربی سے سنسکرت میں کتابوں کا ترجمہ کرکے ہمارے کلچر اور ہماری تہذیب کو مالا مال کیا، غزنوی عہد میں کئی بلند پایہ مسلمان شعرا نے برج بھاشا میں شاعری کی، اکبری دور میں عبدالرحیم خان خاناں نہایت باکمال ہندی شاعر تھا۔ ابوالفضل فیضی اور نقیب خاں سنسکرت زبان اور ہندو فلسفہ و ادب کے ماہر تھے، دارا شکوہ کی ہندو مذہب و علوم سے دلچسپی مشہور ہے اس نے اُپنشد اور بھگوت گیتا کا فارسی ترجمہ کیا۔ امیر خسرو نے بھاشا کا بے نظیر کلام یادگار چھوڑا، ان کی فارسی شاعری، ہندو مذہب اور کلچر سے دلچسپی اور سرزمین ہند سے ان کی شیفتگی کا ثبوت ہے۔ انھوں نے اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں ہندستان کے فضائل، اس کی اور ہندو مذہب کی فضیلت و عظمت کے اسباب بیان کیے ہیں، رحیم اور تلسی داس ہم عصر ہندی شاعر تھے اور دونوں میں بڑی الفت و محبت تھی۔ ہندو کبیر کو ہندو کہتے تھے جبکہ مسلمان انھیں مسلمان سمجھتے تھے، شیر شاہی عہد میں ملک محمد جائسی بھاشا کے اونچے درجے کے شاعر تھے، ان کی مثنوی پدماوت آج بھی مشہور ہے۔ تمام تیموری سلاطین علم و فن کے سرپرست اور ہندوؤں کے علوم اور ہندی شاعری کے قدرداں تھے۔ یہ دلچسپی یک طرفہ نہ تھی بلکہ ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کے مذہب سے واقفیت حاصل کی اور ان کے علوم اور فارسی زبان میں مہارت بہم پہنچائی،

پنڈتوں اور کالستھوں میں متعدد ایسے اصحاب کمال گذرے ہیں۔ ہمارے ملے جلے کلچر اور دلفریب گنگا جمنی تہذیب کی سب سے عظیم الشان یادگار اردو زبان ہے جو ہندو و مسلمانوں کی مشترکہ کوششوں سے وجود میں آئی اور دونوں نے مل کر اسے ترقی دی اس کی زمین اور قواعد بھاشا کے ہیں مگر ہندی کی طرح اس میں فارسی اور عربی الفاظ کے گل بوٹے بھی جڑے ہوئے ہیں اردو شعرا نے مسلمانوں کی اہم شخصیتوں کی طرح ہندوؤں کی مایہ ناز ہستیوں کا بھی نہایت عقیدت و احترام سے ذکر کیا ہے — رام چندر جی کرشن جی، سیتا جی، گوتم بدھ، گرو نانک اور متعدد مذہبی پیشواؤں پر اردو میں کتابیں اور نظمیں لکھی گئی ہیں، بھیم و ارجن کی شجاعت کے ولولہ انگیز کارنامے بھی اردو شاعری کا موضوع ہیں۔

اردو شاعری اور زبان کا رنگ وروپ خالص اور تمامتر ہندستانی ہے اور اس میں ہندو کلچر ہندی تہذیب و معاشرت، ہندستانی افکار و خیالات، آداب و رسوم اور ہندستان کے قدرتی مناظر اور طبعی و جغرافیائی اثرات پوری طرح موجود ہیں، یہاں تک کہ مسلمانوں کی خالص مذہبی نوعیت کی نظمیں بھی ان اثرات سے خالی نہیں ہیں۔ محسن کاکوروی کے مشہور نعتیہ قصیدہ کی تشبیب سراسر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے جس کا مطلع ہے:

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

ڈاکٹر اقبال اسلامی شاعر سمجھے جاتے ہیں مگر "سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا" سے بہتر کوئی ترانہ ہندی زبان میں بھی موجود نہیں، انھوں نے گرو نانک، سوامی رام تیرتھ، شوالہ ہمالیہ اور ہندستان کے قدرتی مناظر کے متعلق جو نظمیں کہی ہیں وہ سب ہندی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ نظیر اکبرآبادی، انشا اللہ خاں انشا، اکبر الہ آبادی اور زمانہ حال کے اکثر و بیشتر شعرا کے یہاں بھی یہ اثرات اس قدر زیادہ ہیں ان پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

مغلوں اور دوسرے مسلم فرمانرواؤں کے فن تعمیر میں بھی ایرانی و ہندستانی کلچر کا امتزاج ہے، جونپور کی عمارتیں ابراہیم شاہ شرقی کے وقت میں تعمیر ہوئیں، ان کے دروازے اور دالان ایرانی طرز کے ہیں لیکن اندر کی گیلریاں اور کھمبے ہندستانی طرز تعمیر کا نمونہ ہیں۔

موسیقی ہندستان کی خاص چیز ہے، عرب مصنفین کو اس میں اہل ہند کی مہارت کا اعتراف ہے لیکن اس کو انتہائی عروج پر پہنچانے کا سہرا مسلمان سلاطین کے سر ہے، اسی طرح ہندستانی مصوری میں بھی دونوں قوموں کے کلچر سے دلکشی و دلآویزی پیدا ہوئی اور اس نے نیا روپ اختیار کیا۔ کس کس چیز کو گنایا جائے مولانا ابو الکلام آزاد کیا خوب فرما گئے ہیں۔

> "ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا مذاق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ چکی ہو"

غرض ہمارا مشترک کلچر ہندستان کی گذشتہ کئی صدیوں کی روایات و خصوصیات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور اس کے تنوع، کثرت اور رنگا رنگی میں وحدت و یکتائی کی شان ہے

بدلے ہوئے حالات میں ملک کا مشترکہ کلچر کیا اور کیسا ہو

کلچر کے وہ اجزا جن کا تعلق دین و مذہب سے نہیں ہے وہ کوئی جامد شے نہیں بلکہ ترقی پذیر ہیں اس لیے ہر دور کے حالات کے مطابق ان میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ ہندستان کے مشترکہ کلچر کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس سے اندازہ ہوا ہوگا کہ وہ کس قدر جامع اور مکمل ہے تاہم اس کو بھی اب ہندستان کے بدلے ہوئے حالات کا اور زیادہ آئینہ دار بنانے کے لیے اس کی وسیع بنیادوں پر از سر نو تعمیر و تشکیل ضروری ہے تاکہ اس میں تمام مذہبی، لسانی اور تمدنی گروپ برابر کے حصہ دار ہوں اور یہ ملک کے مختلف فرقوں، طبقوں اور علاقوں کے رجحانات و میلانات کا نمائندہ ہو۔ یہ کلچر کسی خاص فرقہ و جماعت اور علاقہ کا نہ ہو بلکہ وفاقی ہو جس میں جماعتی کلچر کے اپنے اپنے دائرے ہوں اور ایک مشترک دائرہ قومی کلچر کا ہو، اس سے نہ تو انتشار ہوگا اور نہ متحدہ

کلچر کی نفی ہوگی بلکہ اس طرح قومی وحدت و ایکتا کو مزید قوت و توانائی حاصل ہوگی۔ ہمارے ملک کے ذمہ دار رہنما بھی اس پر متفق ہیں کہ ملک کا تہذیبی اور کلچرل نقشہ کثرت میں وحدت کا نمونہ ہونا چاہیے۔ نئے ہندستان اور اس کے بدلے ہوئے حالات میں ہمارا مشترکہ کلچر کسی مذہب پر مبنی ہونے کے بجائے اسی معنی میں سیکولر ہو جس معنی میں یہ ملک سیکولر ہے جس کا تمام فرقوں اور جماعتوں کی پرانی تاریخی اور مذہبی روایات سے رشتہ ہو اور وہ ملک کی بدلتی ہوئی سماجی، معاشی، سیاسی اور تہذیبی قدروں کا آئینہ دار ہو، جو کلچر کسی خاص قوم و مذہب کی روایات و تصورات کا نمائندہ ہو اور جس کے تسلط سے کسی دوسرے مذہب اور قوم کی تہذیبی خصوصیات اور امتیازی کلچر کے مٹنے کا خطرہ ہو اس کا ہندستان کی جمہوری سیکولر اور سوشلسٹ ریاست میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

مشترکہ کلچر کے چند مطالبات

ہمارے مشترکہ کلچر اور متحدہ ثقافت کے چند اہم مطالبات ہیں جنھیں ایک ہندستانی کی حیثیت سے ہمیں پورا کرنا ضروری ہے

۱۔ ہندستان جیسے وسیع و عریض ملک میں آباد مختلف مذاہب و عقائد کو ماننے والے تمام فرقوں اور گروہوں میں اتحاد و یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی ہو۔ اس کے بغیر ملک کی وحدت و سلامتی باقی نہیں رہ سکتی۔

۲۔ مختلف نسلوں، مذہبوں، گروہوں اور علاقوں کی اپنی اپنی انفرادی خصوصیات کے باوجود ملک کے تمام باشندوں کو اپنے ہندستانی اور ایک قوم ہونے کا شدید احساس ہو تاکہ وہ بلحاظ ہندستانی قومیت اپنے کو بھائی بھائی اور ایک ایسے رشتہ میں منسلک سمجھیں جو خون کے رشتے سے بھی زیادہ مضبوط ہو۔

۳۔ ہمارے مشترکہ کلچر کی اصل روح سیکولر ہندستانیت ہے اس لیے اس ملک میں بسنے والی ہندستانی قوم کو بھی سیکولر بن کر سیکولر سوشلسٹ اور جمہوری ہندستان کی تعمیر و تشکیل میں خاطر خواہ حصہ لینا چاہیے۔

۴۔ کسی ملک کے قومی کلچر کا اسکی سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی سے بہت اہم اور گہرا تعلق ہوتا ہے اس لیے ہمارے مشترکہ کلچر کا یہ مطالبہ بھی ہے کہ ہندستان کے سارے مذہبی فرقے اور لسانی و نسلی گروپ سیاسی، معاشی اور سماجی حیثیت سے مساوی ہوں یا کم از کم ان کو بھی ان میدانوں میں یکساں ترقی کے مواقع ملیں ورنہ جو مذہبی فرقہ یا نسلی و لسانی گروپ کم ترقی یافتہ ہوگا وہ ملک اور اس کے قومی کلچر کے نشو نما میں نہ صرف یہ کہ اپنا حق ادا نہیں کر سکے گا بلکہ زیادہ ترقی یافتہ اور مضبوط مذہبی اور لسانی فرقہ کا اثر قومی کلچر پر اس قدر حاوی ہو جائے گا کہ دوسرے فرقے آہستہ آہستہ اس کے اندر ضم ہوتے چلے جائیں گے جس کے نتیجہ میں یہ مشترکہ قومی کلچر کے بجائے ترقی یافتہ اکثریت کا کلچر بن جائے گا جو سیکولر ہندستان کے آئین اور روح کے سراسر منافی ہوگا اس لیے ہمارے مشترکہ کلچر کا یہ پرزور مطالبہ ہے کہ غیر ترقی یافتہ گروپ اور اقلیتوں کو بھی سیاسی، معاشی اور سماجی ترقی کے مواقع حاصل رہیں۔ اور ان سیاسی، سماجی اور معاشی سطح کو بلند کرنے میں اکثریت کو انھیں تعاون بھی دینا چاہیے۔

۵۔ جب ہمارا مشترکہ کلچر کسی ایک تہذیب کا مرہون منت نہیں ہے اور نہ یہ کسی خاص فرقہ و مذہب کے اصولوں پر مبنی ہے بلکہ پوری ہندستانی قوم کے لیے مختلف تہذیب و تمدن کے اختلاط و اشتراک سے وجود میں آیا ہے۔ اور اس میں عام انسانی جذبہ اور آفاقیت بھی شامل ہے اس لیے ہمارے مشترکہ کلچر کا ایک مطالبہ یہ بھی ہے کہ ہم انسانیت عامہ کے تصور کو فروغ دیں اور رنگ و نسل، زبان، مذہب اور قوم کے تفرقے یکسر مٹا دیں اور بھید بھاؤ کو ختم کریں۔

۶۔ ملک کے تمام باشندوں میں انسانی برادری، مساوات اور روا داری کا جذبہ پیدا ہو، کوئی فرقہ دوسرے فرقہ کو کمتر اور حقیر نہ سمجھے اور سب مل جل کر متحدہ قومیت اور ملک و وطن کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیں۔

۷۔ سب کے ذاتی اور شہری حقوق یکساں ہوں تاکہ ہر ایک کو مذہبی، فکری اور تہذیبی آزادی حاصل رہے۔ کوئی گروہ اپنے

(باقی صلا پر)

وقار خلیل
ایوانِ اردو، حیدر آباد ۲۸

سروجنی نائیڈو کی یاد میں

سنہرے گھر کا دروازہ کھُلا، اس نے بُلایا ہے
وہ بلبل پھر غزلخواں ہے، وہ نغمہ پھر پرافشاں ہے
کہ جس کے سحر سے ارضِ وطن کا ذرّہ ذرّہ مست و بیخود تھا
سلونی سانولی مورت، عبیر و صندل و گل میں ڈھلی مورت
وہ بیٹی بھی تھی اور ماں بھی:
وہ خوشبو تھی، مہک تھی، حرف و لب مصری کی ڈلیاں تھے
سراپا آشتی، اخلاص اُس کے فن کا زیور تھا
دکن سے بے نہایت عشق تھا، اس کو
جنوبی ہند اس کی فکر کا کعبہ تھا کاشی تھا
قطب شاہی نظامِ مملکت سے آصفی عہدِ تمنا تک
ہر اک منظر سمرقند و بخارا سے سوا تھا
نظر میں اس کی خاکِ ہند کا ہر ذرّہ جھومر تھا
مرے شہرِ تمنا کی عظیم المرتبت بیٹی!
جسے گاندھی کی چاہت ٹیگور و اقبال کی شفقت بھی حاصل تھی
جواہر لال نہرو کی رفاقت آئیڈل جس کا
معلم تھی، سخنور تھی، وہ ایسی رہنما بھی تھی
قصیدے فکر و دانش کے قلم لکھتا رہے گا مدتوں، برسوں
مقدس ماں!
میں اردو کا معمولی سخنور
سلامِ شوق کی خاطر تری چوکھٹ پہ حاضر ہوں

ترے نغموں کا عاشق ہوں، تری آواز سُنتا ہوں
مجھے سب یاد ہے تو نے کہا تھا:
"بہادر خاں مرا بیٹا، دکن میرا، وطن میرا، میں بلبل ہوں چمن میرا"
اب ایسا ہے کہ تیرے نام سے اک جامعہ روشن
تری نظموں کی خوشبو سے مشامِ جاں مہک اُٹھے

مقدس ماں: ترا فیضان روشن ہو
ترے شہرِ تمنا میں بہاراں چارسُو ہو
سنہری قہقہے، اخلاص کی خوشبو سے باغِ ہند کا ہر گوشہ رقصاں ہو
سنہرے گھر کا دروازہ کھُلا، ماں نے بلایا ہے
ادیبو، شاعرو، صورت گرو آؤ ادھر آؤ
تمہیں ماں نے بُلایا ہے
وفا کا آج سے اس کا پیامِ جانفزا ہر گھر میں پھیلے گا
سنہرے گھر کا درواز کھلا —
تشنہ لبو! اب جامِ اخلاص و محبت خم بہ خم چھلکاؤ
اور تقدیسِ مادر کے ترانوں سے فضا کا رُخ بدل دو۔

عرفان عباسی
۵۰، موتی لعل بوس روڈ
نیا گاؤں لکھنؤ۔

مولانا فضل الحسن حسرت موہانی
۱۸۷۵ء — ۱۹۵۱ء

شیرینیٔ نسیم ہے سوز و گداز میرؔ
حسرتؔ ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

یہ ۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء کی بات ہوگی، امین الدولہ پارک لکھنؤ کے سامنے سنٹرل بنک والی لائن میں گلی کے نکڑ پر ایک چھوٹی سی چائے کی دکان تھی جس کے روحِ رواں تھے سابق خاکسار لیڈر رئیس فاطمی صاحب۔ دکان کیا تھی سپاٹ، بنچ بینکے، بگڑے خاکسار لوگوں کی پناہ گاہ اور علامہ مشرقی کے کارناموں کی نشرگاہ تھی۔ رئیس فاطمی صاحب خاکسار تحریک کے عروج کے زمانے میں اس سے وابستہ اور تنظیم کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے تھے جب خاکسار جماعت اپنی ہی سیاست و قیادت کی نذر ہو گئی تو انھوں نے وقت گزارنے کے لیے یہ چھوٹا سا ہوٹل کھول لیا تھا۔ چائے بنتی تھی خاک اڑتی رہتے تھے۔ حساب نہ کتاب، نفع نہ نقصان۔ ہوٹل کے کارکن بھی سب سابق خاکسار ہی تھے۔ گاہکوں میں بھی انھیں کی اکثریت تھی، کبھی کبھی کچھ ایسے لوگ بھی نظر آتے تھے جو دوسرے سیاست زدہ چائے خانوں کے گھٹن والے ماحول سے گھبرا کر کوئی نیا ٹھکانہ ڈھونڈ لیتے تھے۔ مجھے مائل ملیح آبادی کے ساتھ پہلی بار اس چائے خانے کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ایک دن ایک پیالی چائے کا آرڈر دے کر اندر قدم رکھا تو وہاں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ کرسیاں تو بھری تھیں ہی کافی لوگ میزوں پر بیٹھے تھے۔ اسی حالت میں لڑکے نے چائے کی بھاپ اگلتی پیالی تھما دی۔ اب کہیں ٹکنے کی جگہ کی تلاش میں بھیڑ کو چیرا تو ایک صاحب نظر آئے۔

چھوٹا قد، منحنی جسم، سفید بکھری ہوئی داڑھی، غیر جاذب چہرہ کوتاہ گردن۔ عجیب سی مہین، پھٹی پھٹی۔ پھنسی پھنسی آواز جو بیک وقت حلق اور ناک سے نکلتی۔ ڈھیلی ڈھالی بوسیدہ اور میلی کئی جگہ مختلف رنگ کے دھاگوں سے گانٹھی ہوئی شیروانی، بغیر پھندنے کی کثیف ترکی ٹوپی، خاکی انگا اور ملگجا پاجامہ، پیروں میں ٹائر سول چپل آنکھوں پر دھجی سے بندھی بیضا دی شیشوں والی عینک۔ بائیں ہاتھ میں پرانی اور کئی تیلیوں سے الگ لٹکتے کپڑے والی چھتری، زانو پر کپڑے کا گندہ سا لیکن بھرا ہوا تھیلا۔ لوگ انھیں گھیرے تھے اور وہ سب سے مخاطب تھے — رئیس فاطمی صاحب کی نظر پڑی تو مجھے پکارتے ہوئے کہا "مولانا حسرت موہانی" — یہی تھے اردو زبان کے مایہ ناز و صاحب طرز شاعر، رئیس الاحرار، مجاہد آزادی، رہنمائے قوم، ممبر دستور ساز اسمبلی، ہر ہندستانی سیاسی پارٹی کو اپنے مشوروں سے نوازنے والے، اشتراکیت پسند زندگی کا بیشتر حصہ آزادیٔ وطن کی خاطر قید و بند میں گزارنے والے مولانا فضل الحسن حسرت موہانی۔

۱۸۷۵ء میں قصبہ موہان ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے والد ماجد کا نام سید اظہر حسن تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر کے بزرگوں سے حاصل کی۔ ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔

شعروادب سے لگاؤ بچپن سے تھا۔ شروع میں ایک بزرگ خاندان مولوی فخر الحسن فطرت سے اصلاح لیتے تھے۔ جب کلام میں پختگی آئی، تو ۱۹۰۱ء کے قریب مشہور استاد منشی امیراللہ تسلیم لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ انھوں نے نسیم دہلوی کے کلام کا بغور مطالعہ کیا تھا، اور ان سے بہت متاثر تھے، کہتے ہیں ؎

پیرو تسلیم ہوں، شیدائے اندازِ نسیم
شوق ہے حسرت مجھے اشعار حیرت خیز کا

مولانا حسرت ان شعراء میں سر فہرست ہیں جو لکھنؤ اور دہلی اسکول کی بحث میں کبھی نہیں پڑے۔ وہ تخیل و خیال میں دہلی کی پیروی کرتے رہے اور ہیئت میں لکھنؤ کی۔ ایک شعر دیکھیے ؎

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگ دہلی کی نمود!
تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہوگیا

یہی نہیں بلکہ اساتذۂ دہلی سے فیضِ سخن کا یوں ذکر کرتے ہیں ؎

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن!
طبعِ حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

مولانا حسرت نے اردو غزل کو روایتی "کنگھی چوٹی" کے حصار سے نکال کر ایک نئی زندگی، ایک نئی روح اور وقار بخشا اور اسے مبالغہ آرائی کے بجائے دلی جذبات وکیفیات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ شگفتہ بیانی، پرخلوص جذبہ، تازگی و رعنائی، بیباک قوت اظہار، والہانہ سرمستی، نشتر انگیزی، درد و تاثیر، بے ساختگی وسادگی اور مسائل زندگی کے اظہار پر قدرت ان کے کلام کی عظیم خصوصیات ہیں۔

حسرت صاحب اپنے دور کے بہت بڑے غزل گو بھی تھے۔ نامور جہاندیدہ اور بیباک رہنما بھی۔ وہ ملک کی دستور ساز اسمبلی کے رکن ہوئے تو وہاں اپنا ترتیب دیا ہوا مسودہ دستور پیش کیا۔ وہ ساری زندگی اپنی گوناں گوں خصوصیات کی بناپر ہر محفل میں نمایاں اور چھائے رہے۔ ساری زندگی معاشی بدحالیوں میں مصائب و شدائد کا مقابلہ کرتے ہوئے گزار دی۔ ان کا یہ شعر ان کی زندگی کا آئینہ ہے ؎

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

مولانا حسرت نے ۱۹۰۳ء میں اردو کا مشہور رسالہ "اردوئے معلیٰ" جاری کیا تھا جس نے ملک گیر مقبولیت وشہرت حاصل کی، اور عرصہ تک کوئی اور ادبی رسالہ اس کی جگہ نہ لے سکا۔ اس معیاری رسالہ نے تقریباً نصف صدی تک گراں قدر ادبی خدمات انجام دیں۔ حسرت صاحب حضرت مولانا شاہ عبدالرزاق صاحب فرنگی محلی کے مرید تھے، اور ان سے بڑی والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔

تقریباً ۷۶ سال کی عمر میں زندگی کا بیشتر حصہ چمن اردو کی آبیاری میں گزار کر ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو درویش صفت رہنما، صبر و استغنا کی مکمل تفسیر، مجاہد ملک وملت، محسنِ اردو، مشعل علم وادب، زائر حرم، عالم و صوفی، دنیا کی لذتوں سے بے نیاز، اپنی ذات سے ایک انجمن، صاحب کردار، حقیقت وصداقت کا پرستار، آستانہ پیر طریقت فرنگی محل میں آخری سانس لے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سوگیا۔ اور اس عظیم المرتبت ہستی کو باغ مولوی انوار لکھنؤ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے پرسا دیا۔

"حسرت رخصت! تو تنہا آیا تھا تنہا گیا۔ البتہ تیری نیکی، تیری شرافت، تیری اخلاص اور حسنِ عقیدت کے اعمال تیرے ساتھی ہیں۔ اور وہی تیرے رفیقِ آخرت۔ بارالٰہا! اس کی حق گوئی کی، بے کسی کی شرم رکھ لیجیے، اور اس کو اپنی رفاقت سے نواز دیجیے"۔

مولانا حسرت کے دیوان کا حصۂ اوّل ۱۹۱۴ء میں۔ حصۂ اول و دوم ۱۹۱۶ء میں، حصۂ چہارم ۱۹۱۸ء میں، دیوان حسرت موہانی مکمل حصہ اوّل، دوم، سوم و چہارم ۱۹۲۲ء میں، کلیات حسرت موہانی ۱۹۲۸ء، ۱۹۴۳ء و ۱۹۶۴ء میں چھپ چکے ہیں۔ لاتعداد کتابیں، رسائل، انتخابات ومضامین اس کے علاوہ ہیں۔

نمونہ کلام

نعت

مظہر شانِ کبریا صلی علیٰ محمدؐ — آئینہ خدا نما صلی علیٰ محمدؐ
موجب نازِ عارفاں، باعث فخر صادقاں — سرور خیر و انبیا صلی علیٰ محمدؐ
مرکز عشق دلکشاں مصور حسن جانفزا — صورت و سیرت خدا صلی علیٰ محمدؐ

مونس دل شکستگاں، پشت پناہ خستگاں   شافع عرصۂ جزا صلی علیٰ محمد
حسرت اگر کرے ہے تو بخشش حق کی آرزو
ورد زباں رہے سدا صلی علیٰ محمد

غزل کے اشعار ؎

توڑ کر عہد کرم نا آشنا ہو جایئے   بندہ پرور جایئے اچھا خفا ہو جایئے

نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے   وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
دلوں کو فکر دو عالم سے کر دیا آزاد   ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد   جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے
امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ   تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر   ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

یہ بھی آدابِ محبت نے گوارا نہ کیا   ان کی تصویر بھی آنکھوں سے لگائی نہ گئی

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن   آیا میرا خیال تو شرما کے رہ گئے

بے زبانی ترجمانِ شوقِ بے حد ہو تو ہو!
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تدبیریں کہیں

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں
نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

نظم "نجاتِ ہند"

اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو
ہمتِ سربلند سے یاس کا انسداد کر
قول کو زید و عمر کے حد سے سوا اہم نہ جان
روشنیٔ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر
حق سے بہ عذر مصلحت وقت پہ جو کرے گریز
اس کو نہ پیشوا سمجھ اس پہ نہ اعتماد کر
خدمتِ اہل جور کو نہ کر قبول زینہار
فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر
غیر کی جد و جہد پہ تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ
کوششِ ذاتِ خاص پر ناز کر اعتماد کر

مثنوی (مشاعرہ شعرائے قدیم در عالم خیال) چند اشعار ؎

خواب شب کو جو میرا یار ہوا   اک عجب شہر میں گذار ہوا
ہر طرف نور کی تھی جلوہ گری   چھائی تھی ہر مکاں پہ بے خبری
اک خموشی کا تھا سماں چھایا   تھا پڑا ہر طرف کو سناٹا
ناگہاں اک عجب صدا آئی   جس سے ٹوٹا طلسم خاموشی
اس کے الفاظ جو اخیر کے ہیں   وہ تو بے شبہ شعر میر کے ہیں
لو سنو آئی پھر وہی آواز   کوئی پڑھتا ہے یوں بہ سوز و گداز
رنج کھینچے تھے داغ کھائے تھے   دل نے صدمے بہت اٹھائے تھے
میں نہ تھا گرچہ روشناسِ ولی   پر پتا دے گیا لباسِ ولی
دَرد و ایک طرف کو بیٹھے تھے   اشک آنکھوں میں بھر کے یوں بولے
ہمت آرزو جو ٹوٹ گئی   مستیٔ شاعری بھی چھوٹ گئی
میر مضموں بھی پاس بیٹھے تھے   اور شاکر اداس بیٹھے تھے
تھا سراپائے میرزا مظہر   نور ایماں کا سربسر منظر
میر تاباں کا چہرہ تھا تاباں   حسن کے جس میں اب تلک تھے نشاں
درد کے وہ جو درد پنہاں تھے   سو وہ چہرے پہ سب نمایاں تھے
سوز کی ہے پر اثر باتیں   خوش مزاجی بھی تھی ملی جن میں
ٹک ادھر دیکھیو خدا کے لیے   میر صاحب نے اب کے شعر پڑھے
جوش میں کھل گئی جو آنکھ مری
نہ وہ حضرات تھے نہ محفل تھی

**

باوا کرشن گوپال مغموم
۱۰، کلنٹن روڈ، فیئرفیلڈ، نیوجرسی ۰۷۰۰۶،
امریکہ

بیادِ فردوسیِ اسلام
مولانا ابوالاثر حفیظ جالندھری

گذشتہ سال تھا منحوس تر دنیائے اردو میں
قیامت کا سماں آیا نظر دنیائے اردو میں
گئے جوشؔ و فراقؔ و دانشؔ اس دنیا کی محفل سے
صدائے ماتمِ جانسوز اٹھی ایک اک دل سے
تھمے تھے اشک مشکل سے، ابھی تک بیقراری تھی
طبیعت مضمحل تھی، روح و دل پر سوگواری تھی
جہاں میں آہ! اُن جیسے بڑے شاعر کہاں ہونگے
گزر جائیں گی صدیاں، تب کہیں شیوا بیاں ہونگے
نہ ان جیسی زباں ہوگی، نہ ان جیسا بیاں ہوگا
نہ اُن سا محرمِ فطرت، نہ ان سا رازداں ہوگا
زبان و فن پہ قدرت، اور ایسی قدرتِ کامل
معانی کی لطافت، اور ایسی ندرتِ کامل
کہاں سے ڈھونڈ لائے گا مثال انکی، نظیر انکی
زمانہ اب نہ پائے گا مثال اُن کی، نظیر انکی
پلائے گا لہو کا قطرہ قطرہ کون اردو کو
جہاں میں کون پھیلائے گا اب اردو کی خوشبو کو؟
یہی تھے وسوسے اپنے یہی تھا سوچ کا دھارا
قضا نے تیرگی شب میں تیر اک تاک کر مارا
خبر آئی حفیظؔ خوشنوا بھی چل بسا آخر
وہ زندہ دل، ظرافت کا خدا بھی چل بسا آخر
وہ خالق آہ! پاکستان کے قومی ترانے کا
بڑا ہی مقتدر شاعر جو تھا اپنے زمانے کا

نہایت باخبر شاگردِ مولانا گرامی کا
جو تھا مشہور تر شاگرد مولانا گرامی کا
کرم فرما، نہایت مہرباں وہ پنڈت اختر کا
جلیسِ دائمی و قدرداں وہ پنڈت اختر کا
لڑکپن ہی سے جو آواز کا جادو جگاتا تھا
نوا کے سوز سے جو سننے والوں کو رلاتا تھا
کلامِ داغؔ کو ہر وقت سینے سے لگاتا تھا
اسی کو گنگناتا تھا، اسی سے فیض پاتا تھا
نہ پایا فیض اس نے رسمی تعلیم و تعلم سے
دلِ اہلِ ہنر میں بس گیا حسنِ تکلم سے
بلا کی تیز فہمی سے، ذہانت سے ریاضت سے
مدارج شاعری کے طے کیے فطری متانت سے
حریفوں کی تھی ہر کوشش اسے نیچا دکھانے کی
مگر اس کو تو عادت تھی ہمیشہ مسکرانے کی
اسے خود اپنی استعداد پہ پورا بھروسہ تھا
یقیناً طبع کی افتاد پر پورا بھروسہ تھا
مسلسل کاوشِ ذاتی سے آخر وہ مقام آیا
اسی کا نام ہر اک لب پہ با صد احترام آیا
کئی گیت اس نے لکھے پیار کے اور نوجوانی کے
حیاتِ عیش پرور کے، سرورِ شادمانی کے
ہوئے مقبولِ خاص و عام اک دو گیت ایسے تھے
رہے گا جن سے اسکا نام اک دو گیت ایسے تھے

کہ فن اور اسکی بنسی پر بھی لکھیں دلنشیں نظمیں
نہایت دلکش و رنگیں، نہایت ہی حسیں نظمیں
غزل میں خاص رنگ اس کی طبیعت نے دکھایا تھا
وہ اسلوب اسکا حصہ تھا، اسی کے ہاتھ آیا تھا
پڑھی تاریخِ اسلام اسنے برسوں سخت محنت سے
ہوا واقف مفاہیم و مطالب کی نزاکت سے
اسے اسلام کی تاریخ کو منظوم کرنا تھا
اسے مقسوم کو، فی الواقعی مقسوم کرنا تھا!
خدا و مصطفیٰ کا نام لے کر ابتدا کردی
عقیدت کو وہ وسعت دی بحدِ انتہا کردی
لکھی وہ رزمیہ نظم اسنے بے حد جانفشانی سے
فصاحت سے، بلاغت سے، طبیعت کی روانی سے
زباں ایسی کہ سلکِ گوہریں ہر لفظ پر قرباں
بیاں ایسا، نظامی اور فردوسی بھی ہوں حیراں
یہ کام ایسا تھا جس کو اور کوئی کر نہ سکتا تھا
سمندر تھا، جسے کوزے میں کوئی بھر نہ سکتا تھا
بڑی پیچیدہ باتیں تھیں، کئی نازک مراحل تھے
بھنور میں فن کی کشتی تھی، نظر سے دور ساحل تھے
اجازت کس کو تھی اپنی طرف سے رنگ بھرنے کی؟
کسے جرأت تھی ایسی آزمائش میں اترنے کی؟
ہر اک غزوے کا نقشہ اس قدر تفصیل سے کھینچا
کہ جیسے اس نے وہ سب کچھ خود اپنی آنکھ سے دیکھا
وہ جنگِ حق و باطل اور پھر حق کی ظفریابی
وہ ایماں کی حرارت سے دل افروزی، جگر تابی
سبق آموزِ دنیا بھی ہے عبرت کا بیاں بھی ہے
حقیقت سی حقیقت ہے، نرالی داستاں بھی ہے
یہی اعجازِ شعری ہے یہی وہ زورِ خامہ ہے
یہی "شہنامۂ اسلام" اس کا کارنامہ ہے
اسی نے بخش دی ہے شہرتِ جاوید شاعر کو
عطا کی ہے اسی نے عظمتِ جاوید شاعر کو
رگوں میں خون کو گرمائے گا جوشِ کلام اُس کا
رہے گا بزمِ اردو میں ہمیشہ دورِ جام اُس کا

---

[1] مولانا غلام قادر گرامی فارسی کے مشہور شاعر تھے اور علامہ اقبال کے قریبی دوستوں میں تھے۔

[2] مشہور شاعر پنڈت ہری چند اختر سے مراد ہے۔ اختر صاحب حفیظ صاحب کے قریب قریب ہم عمر تھے۔ فارسی کے ایم۔ اے تھے اور ظرافت کے پتلے۔ حفیظ صاحب کو اپنا استاد مانتے تھے اور ان سے ہر وقت کا ساتھ تھا۔ اختر کی ناگہانی موت سے انھیں بے پناہ صدمہ پہنچا جس کا اظہار انھوں نے اپنے اشعار میں فرمایا تھا۔

مغموم

غزل

راجیندر بہادر موج
فتح گڈھ ضلع فرخ آباد

کوئی آغاز نہیں ہے کوئی انجام نہیں
مستقل محوِ سفر ہوں مجھے آرام نہیں
دور تک منزلِ ہستی کا کہیں نام نہیں
راہ میں تھک کے ٹھہرنا بھی مرا کام نہیں

غمِ فردا، غمِ ماضی، غمِ دنیا، غمِ عشق
اتنے غم ہیں کہ سکوں صبح نہیں شام نہیں
کس کو راس آیا ہے یہ سلسلۂ لیل و نہار
کون ہے جو ہدفِ گردشِ ایام نہیں

دیکھنے والی نگاہیں ہی نہیں ہیں ورنہ
کیا نمائش ترے جلووں کی سرِ عام نہیں
پرتوِ نورِ حقیقی ہو اگر سینے میں
صبح ہی صبح ہمیشہ ہے کبھی شام نہیں

ربطۂ زندگی و موت میں ہے موجِ ازل
موج اس بحر میں ساحل کا کہیں نام نہیں

ڈاکٹر محمد طاہر
شعبۂ اردو
شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج
اعظم گڑھ۔

علامہ شبلی نعمانی کی تاریخِ ولادت

علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت اور ان کی علمی و ادبی خدمات پر اب تک جتنا کام ہوا ہے اسے بھرپور اور مکمل تو نہیں، اطمینان بخش ضرور کہا جا سکتا ہے لیکن یہ بھی ایک قابل ذکر حقیقت ہے کہ علامہ کی تاریخ ولادت اور مبینہ بیان ولادت کے تضاد و تفاوت کی جانب محققین اور اہل علم حضرات نے زیادہ توجہ نہیں فرمائی۔ زیر نظر مضمون میں علامہ شبلی نعمانی کی تاریخ ولادت کے تعین کی کوشش کی گئی ہے

علامہ شبلی کے سوانحی حالات و واقعات کے سلسلے میں سب سے مستند ماخذ "حیات شبلی" کو سمجھا جاتا ہے جس کے مرتب و مولف سید سلیمان ندوی ہیں۔ موصوف علامہ شبلی کی ولادت کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

> مولانا شبلی مرحوم کی ولادت ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ مطابق مئی ۱۸۵۷ء میں عین اس ہنگامہ خیز زمانہ میں ہوئی جو عام طور سے غدر کے نام سے مشہور ہے اور یہ بھی عجیب اتفاق کہ عین اس دن ولادت ہوئی جس دن اعظم گڑھ کے باغیوں کی ایک جماعت نے ڈسٹرکٹ جیل کے پھاٹک کو توڑ ڈالا تھا۔

سید سلیمان ندوی علامہ شبلی کے سوانحی مواد اور اپنے ذرائع علم کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> "..... مولانا کے خاندانی اور ابتدائی زندگی کے واقعات ان کے اعزا و احباب اور ان کے ابتدائی شاگردوں سے پوچھے اور سنے ....."

حیات شبلی قلم بند کرنے کا کام سب سے پہلے مولانا عبدالسلام ندوی کے سپرد کیا گیا تھا اور اس کو انھوں نے انجام بھی دیا لیکن جب مسودہ کو مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی نیز دوسرے احباب نے دیکھا تو بقول سید سلیمان ندوی "ان کو اس مجموعہ میں زندگی کی روح نظر نہ آئی" اور اس کام کو پھر علامہ اقبال سہیل کے سپرد کیا گیا۔ انھوں نے مولانا عبدالسلام ندوی کے مسودہ میں ترمیم و تنسیخ اور علی گڑھ کے بہت سے نئے واقعات کا اضافہ کیا جو "سیرت شبلی" کے عنوان سے رسالہ "الاصلاح" سرائے میر اعظم گڑھ کے شماروں میں ۳۷-۱۹۳۶ء میں قسط وار شائع ہوا۔

اس رسالہ میں اس دور کے حالات اور علامہ شبلی کی ولادت کا ذکر علامہ اقبال سہیل کی زبان قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

> "..... غدر ۱۸۵۷ء میں وہ افسوسناک اور غیر منظم شورش رونما ہوگئی جس نے انتہائی ناکامی کے باوجود ہندوستان کی عنان حکومت تاجروں کے ہاتھ سے نکال کر براہ راست تاج برطانیہ کے دست اختیار میں دے دی اور تاریخ ہند میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ مئی ۱۸۵۸ء میں یہ شورش ہمارے ضلع میں انتہائی جوش پر تھی اور یہی زمانہ تھا کہ جب اس ذات گرامی کو خلعت ظہور عطا کیا گیا۔ صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ لیکن اس قدر یقینی ہے کہ "بہ ماہ مبارک میان در عید" یعنی ذیقعدہ سنہ ۱۲ ہجری (۱۲۷۴ ہجری) میں مولانا کی ولادت ہوئی"......

علامہ اقبال سہیل کے پیش نظر مولانا عبدالسلام ندوی کا مسودہ حیات شبلی تھا جس میں انھوں نے ترمیم و اضافہ کیا۔ مولانا عبدالسلام ندوی کا مسودہ حیات شبلی دارالمصنفین میں محفوظ ہے لیکن اس کا سوانحی باب باوجود تلاش و جستجو کے دستیاب نہ ہو سکا۔ لیکن یہ بات قرین قیاس ہے کہ علامہ اقبال سہیل کا بیان ولادت مولانا عبدالسلام ندوی کے بیان پر مبنی ہے۔ اس قیاس کو تقویت اس سے بھی ملتی ہے کہ سیرت شبلی میں " بہ ماہ مبارک میان دو عید" واوین کے اندر لکھا ہے جو ممکن ہے عبدالسلام ندوی کے مسودہ سے ماخوذ ہو۔ سیرت شبلی میں سنہ ہجری صرف ۱۲ھ طبع ہوا ہے۔ ظاہر ہے وہ سہو کتابت ہے ۱۲۷۴ھ لکھا ہوگا، اسی طرح ۱۸۵۸ء بھی سہو کتابت ہے، کیونکہ آغاز عبارت میں ۱۸۵۷ء ہی کی شورش و ہنگامہ کا ذکر ہے' دوسرے یہ کہ اعظم گڑھ ضلع میں غدر کی شورش و ہنگامہ کا شباب ۱۸۵۷ء ہے نہ کہ ۱۸۵۸ء اسی طرح مذکورہ بیان کی روشنی میں علامہ شبلی کی ولادت مئی ۱۸۵۷ء میں ہوگی۔ اور اسی کا حوالے سے سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں ذی قعدہ ۱۲۷۳ ہجری کا مطابق مئی ۱۸۵۷ء تحریر فرمایا۔

اگر ماہ ذی قعدہ ۱۲۷۴ ہجری علامہ شبلی کی ولادت تسلیم کرلی جائے تو تقویم عیسوی و ہجری کے مطابق ماہ جون ۱۸۵۸ء ہوگا نہ کہ مئی ۱۸۵۷ء اور اگر مئی ۱۸۵۷ء کو صحیح وقت قرار دیا جائے تو تقویم کے مطابق شوال ۱۲۷۳ ہجری ہوگا نہ کہ ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ، اس طرح دونوں صورتوں میں انگریزی و عربی ماہ و سال میں مطابقت نہیں ہو رہی ہے۔

سید سلیمان ندوی کے بیان ولادت مئی ۱۸۵۷ء سے قطع نظر اس روایت کا بھی جائزہ لیں جس میں وہ فرماتے ہیں کہ عین اس دن ولادت ہوئی جس دن جیل کا پھاٹک باغیوں کی جماعت نے توڑا اور قیدیوں کو نکال لے گئے۔

اعظم گڑھ گزیٹیر ۱۸۸۳ء میں ۱۸۵۷ء کی شورش اور ڈسٹرکٹ جیل کے پھاٹک کے توڑنے اور قیدیوں کے رہا ہونے کا واقعہ مذکور ہے۔ اصل عبارت درج ذیل ہے۔

THE GARRISON OF AZAMGARH IN MAY 1857 CONSISTED OF THE 17 TH NATIVE INFANTRY. ON THE 3rd. OF JUNE, AT 8 P.M. ACTUAL MULTINY BE- -GAN BY THE SHOOTING OF THE QUAR- -TER-MASTER SERGEANT, LEWIS, FOLLOWED BY THAT OF LIEUTENANT HUTCHISON. THE JAIL WAS BROKEN OPEN AND THE PRISONERS RELEASED.

ڈسٹرکٹ جیل کے پھاٹک کے توڑنے اور قیدیوں کے رہا کرانے کی تاریخ مطابق گزیٹیر ۳ جون ۱۸۵۷ء ہے۔

زمانہ قدیم سے تاحال یہ روایت چلی آرہی ہے کہ لوگوں کی ولادت و وفات اہم و تاریخی واقعات سے منسوب کر کے یادداشت میں محفوظ کی جاتی ہے، اس لیے " ماہ مبارک میان دو عید" کی روایت کے مقابلے میں اس اہم اور تاریخی واقعہ کے دن علامہ شبلی کی ولادت کی روایت زیادہ مستند اور معتبر ہے۔ اس روایت اور تاریخی واقعہ کی روشنی میں علامہ کی تاریخ ولادت کا تعین کرنے میں ایک اور داخلی ثبوت سے تقویت پہنچتی ہے۔ " صحیفہ زریں" نامی ایک بہت ہی ضخیم کتاب راقم السطور کو محمد اعظم خاں صاحب (راجہ صاحب اعظم گڑھ) کی مہربانی و عنایت سے دیکھنے کو ملی۔ اس کتاب کے مرتب پراگ نرائن بھارگو ہیں اور یہ کتاب ۱۹۰۲ء میں نول کشور پریس لکھنؤ سے طبع ہوئی ہے۔ اس میں نہ صرف ہندستان بلکہ مضافات ہندستان کے بھی والیان ریاست، مشاہیر اور خطاب یافتگان کے سوانحی حالات مع تصاویر مندرج ہیں۔ اس میں علامہ شبلی نعمانی کا بھی تذکرہ ہے۔ سوانحی حالات کے چند جملے درج ذیل ہیں:-

" محمد شبلی۔ مولوی نعمانی شمس العلماء۔ ولادت جون ۱۸۵۷ء۔ آپ کے والد مرحوم شیخ حبیب اللہ ضلع اعظم گڑھ کے مشہور رؤسا وکلا میں سے تھے ... سکونت اعظم گڑھ حال حیدر آباد "

صحیفہ زریں کا سال طباعت ۱۹۰۲ء ہے۔ یہ کتاب علامہ شبلی نعمانی کی زندگی میں یعنی ان کی وفات سے بارہ سال قبل طبع ہو چکی تھی۔ تمہید میں مرتب نے کتاب کی ترتیب و مواد کی فراہمی کے سلسلے میں تحریر

کیا ہے :-

"...... جن صورتوں میں مجھ کو بالواسطہ آگاہی نہیں ہوئی تو میں نے جدید الطبع کتب، اخبارات اور رسل و رسائل کے ذریعہ سے اس کے حاصل کرنے میں کوشش بلیغ کی...... البتہ جو حالات براہ راست یا معتبر ذرائع سے حاصل نہیں ہوئے ان کے اندراج سے اجتناب کیا۔"....

جیسا کہ اوپر تحریر کیا جا چکا ہے کہ مذکورہ کتاب علامہ شبلی نعمانی کی حیات میں طبع ہو چکی تھی۔ کتاب کے مرتب کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب کے سوانحی مواد براہ راست صاحب سوانح سے حاصل کیے گئے۔ اور جن کے حالات براہ راست نہیں دستیاب ہوئے وہ معتبر ذرائع سے بہم پہنچائے گئے۔ علامہ شبلی کے سوانحی تذکرے کی تفصیلات اور عرض مرتب کی روشنی میں قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں علامہ شبلی کے مندرج سوانحی حالات خود انھیں کے تحریر کردہ ہوں۔ اس کتاب میں علامہ کی جو تصویر ہے وہ بھی نادر ہے ایسی تصویر کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملی۔ صحیفہ زریں میں علامہ شبلی نعمانی کا تذکرۂ ولادت بہ ماہ جون ۱۸۵۷ء اور جیل کے پھاٹک کے ٹوٹنے اور قیدیوں کے رہا ہونے کا واقعہ جو ۴ جون ۱۸۵۷ء کو پیش آیا، مطابقت ہو رہی ہے اس لیے مذکورہ بالا داخلی ثبوت و شواہد کی روشنی میں علامہ شبلی نعمانی کی تاریخ ولادت ۴ جون ۱۸۵۷ء بروز بدھ قرار دینا درست اور صحیح ہوگا۔ **

ص۱۲ کا بقیہ: مشترکہ کلچر

عقیدہ و مذہب اور تہذیب و روایات کو جبراً دوسرے گروہ پر مسلط نہ کرے، سب ایک دوسرے کے جان، مال، عزت و آبرو کا خیال رکھیں، دوسرے مذاہب کا احترام کریں کوئی کسی مذہب و فرقہ کو نہ برا سمجھے نہ برا کہے۔

۸ - جو چیزیں ان مقاصد کے حصول میں رکاوٹ بنیں مل جل کر انھیں دور کیا جائے۔ ہماری تاریخ نگاری کا یہ انداز بدلنا چاہیے۔ جس سے ملک کے مختلف فرقوں میں میل کے بجائے فصل اور یک جہتی کے بجائے انتشار پیدا ہوا اور جس کے نتیجہ میں ہماری گذشتہ تاریخ مذہبی آویزشوں اور قومی کشا کشوں کی آماجگاہ بن گئی ہے۔

۹ - ہمارے مشترکہ کلچر کا یہ مقصد اور مطالبہ بھی ہونا چاہیے کہ محبت و اخوت کی جہانگیری ہو، فرقہ واریت تنگ نظری اور تعصب کے زنگ سے ہمارا آئینۂ قلب صاف اور بے داغ ہو۔ ہم ہر حال پر عدل و انصاف پر قائم رہیں۔ غرض جن باتوں سے وحدت و محبت کے جذبات فروغ پائیں انھیں اختیار کریں اور جن باتوں سے نفرت و عداوت کی آگ بھڑکے انھیں ترک کر دیں۔

ہمارا مشترکہ کلچر اس وقت مکمل سمجھا جائے گا۔ جب تمام ملک میں مکمل امن و امان اور فارغ البالی ہو اور ہر فرقہ آسودہ اور خوشحال ہو۔

*

ڈھاکہ
۱۳ اپریل ۸۳ء

مکرمی ایڈیٹر "نیا دور" لکھنؤ
آداب و احترام!

خدا کرے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں۔ بنگلہ دیش میں اردو شاعری پھر سے جوان ہو رہی ہے۔ راجدھانی ڈھاکہ سے ادبی رسائل و جرائد کا اجراء اور کالونیوں کے تنگ کمروں میں مشاعروں کا انعقاد دو ایسے ذرائع ہیں جو شاعروں میں شعر گوئی کی تحریک پیدا کر رہے ہیں لیکن ان مشاعروں اور ادبی جریدوں سے اس بات کا پتہ چلانا ذرا مشکل ہے کہ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد اردو شاعری کس سمت کو رواں دواں ہے۔ شاعری میں کبھی کبھی چونکا دینے والی آواز بھی سنائی دیتی ہے لیکن اس کے بعد پھر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے خلاء میں ایک تیر چھوڑ دیا ہے اور اب یہ دیکھ رہا ہے کہ تیر کس سمت کو جاتا ہے۔ لیکن ان دنوں اردو کے ادیبوں اور شاعروں میں ایک نیا احساس جنم لے رہا ہے وہ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ ان کی منزل خلاء میں نہیں ہے۔

اسی احساس اور کلیے کے پیش نظر آپکے رفیع الشان اردو ماہنامہ "نیا دور" میں ایک غیر مطبوعہ غزل ارسال کر رہا ہوں۔ پسند آئے تو کسی قریبی اشاعت میں شریک کر کے ممنون فرمائیں۔

آپکا صادق
محبوب شیدائی

غزلیں

بانٹ لے آپس کا غم ایسا یہاں اب کون ہے
آشنائے لذتِ دردِ جہاں اب کون ہے

خواب ہے تنہائی ہے یا رینگتی پرچھائیاں
میں جہاں سے آ گیا دیکھو وہاں اب کون ہے

لوٹ جاؤ سرزمینِ خواب کے سوداگرو!
جاگتے خطے میں شب کا رازداں اب کون ہے

خوش نما ہو نیند سپنوں سے زیادہ تو یہاں
تحفۂ تعبیر کے شایانِ شان اب کون ہے

ساری بستی میں اندھیرا ہے مقفل در کرو
کون آئے گا بھلا اپنا یہاں اب کون ہے

میں ادھر بیٹھا ہوا ہوں، سامنے ہے آئنہ
سوچے دیواروں کے درمیاں اب کون ہے

پہلا پتھر مجھ کو وہ مارے کہ جو ہو بے گنہ
ساری دنیا دیکھ لے عیسیٰ یہاں اب کون ہے

صرف سمتوں کا تعین ہی نہیں صبحِ سفر
دیکھنا یہ بھی ہے میرِ کارواں اب کون ہے

سارے رشتے وقتِ ہجرت ساتھ دیتے ہیں مگر
تھام لے محبوب کا دامن یہاں اب کون ہے

سلطان احمد نادم

مکہ گیتی پھاٹک
بالسی کی مسجد۔ لکھنؤ

محبت کا حسیں اقرار سا ہے
جو آنکھوں میں تری انکار سا ہے

چھڑک جاؤ نمک بھی زخمِ دل پر
ستم پر جو تمہیں اصرار سا ہے

سماج اپنا ہے محرومِ مسرت
یہاں ہر فرد کچھ بیمار سا ہے

بھرا ہے رنگ ان کی ہر ادا میں
زمانہ بھی بڑا فنکار سا ہے

عجب سی بے دلی ہے زندگی میں
جسے دیکھو وہی بیزار سا ہے

نہیں آتا لبوں تک لفظِ الفت
نگاہوں سے مگر اظہار سا ہے

ہم اپنے شہر میں خود اجنبی ہیں
یہاں ماحول پُراسرار سا ہے

کہاں نادم مجھے احساسِ دوراں
مزاجِ دل مزاجِ یار سا ہے

عبیدہ بیگم
معرفت۔ ڈاکٹر۔ ایچ۔ پی۔ کپور
کینٹ پولیس اسٹیشن کے پیچھے۔ گورکھپور

خلیل علی خاں اشک

اور — رسالہ کائنات جُو

اردو نثر کے ارتقا میں انیسویں صدی ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر تک اردو ادب میں شاعری نے تو اپنا ایک خاص مقام بنا لیا تھا لیکن نثری تصانیف کی تعداد برائے نام تھی۔ دراصل اہل علم تصنیف و تالیف کے لیے اردو نثر کو ذریعہ بنانے سے گریز کرتے تھے۔ مغل حکمرانی کی زبان فارسی تھی۔ عوام میں بھی فارسی زبان ہی سکۂ رائج الوقت تھی بول چال میں اردو زبان کا رواج ضرور تھا لیکن علمی اور ادبی تصانیف کے لیے فارسی ہی کو بہتر سمجھا جاتا تھا۔ انیسویں صدی کا آغاز ہی اردو نثر کے لیے مژدۂ جانفزا ثابت ہوا۔ ۱۰ر جولائی ۱۸۰۰ء کو گورنر جنرل لارڈ ویلزلی کے ہاتھوں فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) کی داغ بیل ڈالی گئی۔ ملک کے طول و عرض سے شعراء اور ادیب بلوائے گئے۔ ان ادیبوں نے "صاحبان عالی شان" کے زیر سرپرستی وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جنھیں اردو ادب کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ انگریزوں کے دل میں اردو ادب کی خدمت کا جذبہ کارفرما تھا انھیں تو اپنی حکومت کو استحکام بخشنے کے لیے ایسے انگریز افسران کی ضرورت تھی جو مقامی زبان و ادب سے واقفیت رکھتے ہوں اور اسی مقصد کے تحت اس ادارے کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ کالج کے مصنفین کا مقصد بھی ادب کی خدمت سے زیادہ انگریزوں کی خوشامد اور حصول زر تھا۔ لیکن سیاست اور مصلحت کے ان رموز و نکات سے قطع نظر ان مصنفین نے نہ صرف اردو نثر کو بول چال کی زبان سے آشنا کر کے اسے حیاتِ جاوداں بخشی بلکہ مختلف مضامین کو اردو نثر کے قالب میں ڈھال کر اردو کے نثری ادب کو مالا مال کر دیا۔

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں خلیل علی خاں اشک کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ فورٹ ولیم کالج سے منسلک ہونے کے بعد اشک نے دس سال کے عرصے میں کم از کم چھ کتابیں تصنیف کیں۔ ان کتابوں کے دیباچوں سے کسی حد تک ان کے حالات زندگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خصوصاً انتخاب سلطانیہ میں انھوں نے بڑی حد تک مفید معلومات فراہم کی ہیں۔

اشک کا پورا نام محمد خلیل علی خاں فیض آبادی اور اشک تخلص تھا۔ ان کی جائے پیدائش شاہ جہاں آباد (دہلی) تھی۔ پرورش و پرداخت فیض آباد میں ہوئی۔ یہیں سن بلوغ کو پہونچے[1] ان معلومات کی روشنی میں نادم سیتاپوری کا یہ بیان غلط ثابت ہوتا ہے کہ اشک خیرآباد میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت حاصل کی[2]

اشک کے فیض آباد آنے کا سبب احمد شاہی دور کا انتشار و خلفشار، افراتفری اور احمد شاہ درانی کے حملوں کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اجڑی ہوئی دلی کے لیے اودھ ہی تباہ حالوں کا ملجا و ماوی تھا۔ فیض آباد میں ہی اشک نے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ان کو شہزادوں کی محفلوں

تک بھی رسائی حاصل تھی۔ اشک نے ان کی صحبتیں بھی اٹھائی
تھیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے رسالہ کائنات کے مقدمے میں
لکھا ہے کہ:

"..... وہ (اشک) ۱۲۰۹ھ تک فیض آباد
میں رہے اور یہاں مختلف شہزادوں کی صحبتوں
میں عزت کی زندگی بسر کی لیکن زیادہ وقت مرزا
جواں بخت جہاندار شاہ کے ساتھ گزارا۔
جب فیض آباد کی یہ محفلیں برہم ہوئیں تو خلیل
علی خاں اشک نے اس سرزمین کو خیرباد کہا اور
تلاش معاش کے سلسلے میں بنگال پہنچے"

تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ فیض آباد کی محفلیں تو
۱۷۷۵ء میں ہی اجڑنے لگی تھیں جب آصف الدولہ نے
اپنا پایۂ تخت لکھنؤ منتقل کر لیا تھا۔ جواں بخت جہاندار شاہ
بھی لکھنؤ ہی میں آصف الدولہ کا مہمان ہوا تھا۔ اشک نے
جواں بخت جہاندار شاہ کی خدمت میں حاضر رہنے کا جو ذکر
کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اشک بھی فیض آباد چھوڑ
کر لکھنؤ آ گئے ہوں گے اس لیے قطعی طور سے یہ نہیں کہا جا سکتا
کہ اشک فیض آباد سے ہی بنگال روانہ ہوئے ہوں گے۔ ممکن
ہے کہ جہاندار شاہ کی واپسی کے بعد وہ بنگال جانے تک لکھنؤ
ہی میں رہے ہوں۔

جہاندار شاہ نے اشک کی بڑی قدر کی۔ اور انعام واکرام
سے بھی نوازا۔ جہاندار شاہ تھوڑے دنوں بعد لکھنؤ سے بنارس
چلے گئے۔ شہزادے کے بنارس جانے کے بعد تقریباً دس سال کا
عرصہ اشک نے دیگر امراء و روسا کی خدمت میں گزارا۔ لیکن
انھیں اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ اور گردش روزگار سے تنگ
آ کر ۱۲۰۹ھ میں وہ بنگال چلے آئے۔ چند سال (۱۷۹۴ء تا
۱۸۰۱ء) مرشد آباد میں ناظمان بنگالہ کی صحبت میں گزارے۔
لیکن یہاں بھی مطمئن نہ رہ سکے۔ اور ۱۸۰۱ء میں کلکتہ چلے
آئے۔

ان دنوں کلکتہ کے حالات اچھے نہیں تھے۔ انگریزی اقتدار
نے یہاں کی تہذیب و معاشرت کو بری طرح مجروح کر کے رکھ
دیا تھا۔ مغربی تہذیب و تمدن کے نمونے عام ہو رہے تھے
اس کے علاوہ ہندستانی عوام پر بدحالی مسلط ہوتی جا رہی
تھی۔ چنانچہ کلکتہ آنے کے بعد یہاں کے حالات سے اشک
کو اس قدر مایوسی ہوئی کہ وہ خانہ نشین ہو گئے۔ ایک دن مولوی
سعید الدین کی زبانی اشک کو یہ معلوم ہوا کہ "صاحبان عالی شان"
نے لکھنؤ سے شاعر بلوائے ہیں۔ ان میں کاظم علی جوان آ گئے ہیں۔
اشک جوان کی آمد سے بے حد مسرور ہوئے اور فوراً ان سے ملاقات
کی۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے پرانے شناسا تھے۔

جوان کے توسط سے ہی اشک کی رسائی ڈاکٹر گل کرسٹ
تک ہوئی۔ گل کرسٹ اشک کی گفتگو سے بے حد متاثر ہوئے
انھوں نے ان کی ملازمت کے لیے ہر ممکن کوشش کا وعدہ
کر کے ان سے "قصۂ امیر حمزہ" کو ریختہ میں منتقل کرنے کو کہا۔

اشک نے "قصۂ امیر حمزہ" کی چند داستانیں لکھیں لیکن ان
کی خاطر خواہ ہمت افزائی نہ ہو سکی۔ ظاہر ہے کہ جس شخص نے
شہزادوں کی صحبت اٹھائی ہو وہ انگریزوں کی بے توجہی سے
ضرور کبیدہ خاطر ہوا ہوگا۔ اشک نے دل برداشتہ ہو کر ترجمہ
کرنا چھوڑ دیا اور دوبارہ گوشہ نشین ہو گئے۔ جب مولوی
سعید الدین کو یہ کوائف معلوم ہوئے تو انھوں نے پھر سعی کی
اشک کی ہمت افزائی کر کے ہربرٹ ہارنگٹن سے ان کی ملاقات
کروائی۔ اس وقت تک اشک کا کالج کی ملازمت سے
کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہارنگٹن نے ان کی ملازمت کی بابت
کالج کونسل کو لکھنے اور امیر حمزہ کی داستان تصنیف کروا
دینے کا وعدہ کیا۔

ہارنگٹن کی نوازش و عنایت کے بعد گل کرسٹ نے پھر
اشک کی جانب توجہ دی۔ اور "صاحبان عالی شان" کے
ہندی زبان (اردو) کے درس کے سلسلے میں اشک کو مانگ
لیا۔ چنانچہ کالج میں جس دن شب میں ہندی زبان کا درس

وزیر تعلیم شریمتی سروپ
کماری بخشی ۱۱ مئی ۲۰۰۳ء
کو چار باغ لکھنؤ امیرگنج
پیر بابا کے مزار پر چادر
چڑھا کر نذرانۂ عقیدت
پیش کرتے ہوئے۔

دیا جاتا تھا اس دن گل کرسٹ کھانے کے بعد اشک کو لے کر اوپری منزل پر چلے جاتے تھے وہاں "صاحبان عالی شان" بھی موجود ہوا کرتے تھے۔ اشک "تقریر کرتے"[5] اور گل کرسٹ انگریزی میں ترجمہ کرکے بتایا کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد جب گل کرسٹ نے شب میں کالج کا جانا ترک کیا تو اشک کو بھی منع کر دیا۔ یہ سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد گل کرسٹ نے انھیں شعبۂ ہندستانی کے ماتحت منشیوں میں شامل کر لیا۔ لیکن کالج کونسل سے اشک کی ملازمت کی ہنوز توثیق نہیں ہوئی تھی۔

زمرۂ منشیان میں شامل ہونے کے بعد اشک کی مصروفیات میں اضافہ ہو گیا۔ کالج کے کاموں کے علاوہ اشک کسی انگریز کو درس بھی دیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے راتوں کو سخت محنت کرکے "امیر حمزہ" کی دو جلدیں مکمل کیں۔[6] امیر حمزہ کی دونوں جلدیں ۱۸۰۱ء/ ۱۲۱۵ھ میں مکمل ہو چکی تھیں۔[7] ۱۸۰۲ء/ ۱۲۱۷ھ میں اشک نے ایک مختصر رسالہ کائنات جو بھی تصنیف کیا۔[8]

"گلزار چین" کے مقدمے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں۔

> " خلیل علی خاں اشک ۹ر اگست ۱۸۰۳ء کو بحیثیت منشی کے فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہو گئے تیس روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج میں باقاعدہ ملازم ہونے کے بعد انھیں ڈاکٹر جان گل کرسٹ کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں انھوں نے امیر حمزہ کی داستان مکمل کی۔ ایک مختصر سا رسالہ کائنات جو کے نام سے لکھا۔[9]"

لیکن مذکورہ دونوں تصانیف اشک کی باقاعدہ ملازمت (۹ر اگست ۱۸۰۳ء) سے بہت قبل کی ہیں ۱۹ر اگست ۱۸۰۳ء تک تو یہ طبع بھی ہو چکی تھیں۔[10]

۹ر اگست ۱۸۰۳ء کو اشک کی ملازمت کی توثیق کالج کونسل سے ہو گئی۔ اور ان کا مشاہرہ تیس روپے مقرر ہوا۔[11] ۱۸۰۵ء میں Capt. Mount نے ہندستانی شعبے کے منشیوں کی فہرست مرتب کی جو ۳۰ر ستمبر ۱۸۰۵ء کی کالج کونسل کی کارروائی میں پیش ہوئی۔ اس میں دیگر منشیوں کے ساتھ اشک کا نام بھی شامل ہے۔ اور ان کا مشاہرہ چالیس روپے درج ہے۔[12]

یہ پتہ نہیں چلتا کہ اشک کب تک کالج سے وابستہ رہے ۱۸۱۰ء میں انھوں نے "منتخب الفوائد" نام کی ایک کتاب تالیف کی تھی۔ غالباً یہی ان کی آخری تصنیف ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ۱۸۱۰ء کے بعد فورٹ ولیم کالج سے علاحدہ ہو گئے ہوں۔

اشک نے کالج سے وابستہ ہونے کے بعد "امیر حمزہ" اور "رسالۂ کائنات" کے علاوہ قصۂ رضوان شاہ (نگارخانۂ چین یا گلزار چین) انتخاب سلطانیہ، واقعات اکبر اور منتخب الفوائد بھی تصنیف کیں۔

ناؔدم سیتاپوری کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اشک کی وفات ۱۸۲۱ء/ ۱۲۳۷ھ کے آس پاس ہوئی۔[13]

رسالہ "کائنات جو" اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے اردو زبان میں ایک اہم تصنیف کا درجہ رکھتا ہے۔ تاریخ ادب اردو کی بیشتر کتابوں میں خلیل علی خاں اشک کی تصنیف "کائنات جو" کا ذکر بھی نہیں ملتا۔ لیکن کالج کونسل کی کارروائیوں میں اس کا نام شامل ہے۔ عتیق صدیقی نے اپنی کتاب "گل کرسٹ اور اس کا عہد" میں چونکہ کالج کونسل کی مختلف کارروائیاں نقل کی ہیں لہٰذا ان میں "کائنات جو" کا نام بھی نظر آتا ہے۔ لیکن موصوف "جو" کے اضافے پر اشتباہ کا شکار ہو گئے ہیں۔[14] اشک نے رسالے کے شروع میں واضح طور سے رسالہ کائنات جو لکھا ہے۔

اشک نے رسالہ کائنات جو، گل کرسٹ کی نثری پالیسی

کے تحت اپنے مربی ہربرٹ ہارنگٹن کے لیے ۱۸۰۲ء/۱۲۱۷ھ میں اردو میں تصنیف کیا تھا۔ وہ دیباچے میں خود بھی واضح کرتے ہیں:-

"احقر العباد خلیل علی خاں نے جس کا تخلص اشک مشہور ہے۔ عصر میں شاہ عالم بادشاہ خلد اللہ ملکہ کے اور وقت میں امیر الامراء زبدۂ نوئینان عظیم الشان مشیر خاص حضور شاہ کیواں بارگاہ انگلستان اشرف الاشراف مارکوس ولزلی بہادر گورنر جنرل ممالک محروسہ سرکار کمپنی انگریز کشور ہند کے یہ رسالۂ کائنات جو کا سن ہجری بارہ سو سترہ (۱۲۱۷ھ) میں مطابق اٹھارہ سو دو عیسوی (۱۸۰۲ء) کے زبان ریختہ میں بموجب مسٹر جان گل کرسٹ صاحب دام دولتہ کی مصلحت کے واسطے اس نشان سخا کے کہ جس کے رشحۂ فیض کا ہر صدف دل تشنہ ہے۔ یعنی گوہر یکتائے دریائے امارت و شجاعت مسٹر ہربرٹ ہارنگٹین صاحب عالی جاہ کہ ہر بلند اختر ہے جس کا پائے قدر عالی و برتر ہے' تصنیف کیا۔ اور اختصار کیا اسے دس فصل پر" [15]

اشک نے رسالۂ کائنات' کی جانب اپنی ایک دوسری تصنیف "انتخاب سلطانیہ" کے دیباچے میں بھی اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے قصۂ "رضوان شاہ" کی طرح یہ رسالہ بھی مارکوئس ولزلی کو پیش کیا تھا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں رسالۂ کائنات کا جو نسخہ ملا ہے اسے اشک نے ۱۸۰۴ء/۱۲۱۹ھ میں مار دانٹ رکٹس کے لیے تیار کیا تھا۔ چنانچہ اس نسخے کے آغاز میں ایک صفحے پر .... مندرجہ ذیل عبارت درج ہے۔

رسالہ کائنات جو
تصنیف خلیل علی خاں اشک کا مارکوئس ولزلی
گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کے عصر میں مدرسہ
جدید کی خاطر لکھا گیا۔ واسطے صاحب والا ہمت
عالی شان مار دانٹ رکٹس صاحب دام دولتہ
کے سنہ ہجری بارہ سو انیس ۱۲۱۹ھ میں مطابق اٹھارہ
سو چار عیسوی کے۔

قطعہ

صاحب جود مار دانٹ رکٹس
فیض سے جس کے اک جہاں ہے شاد
کس طرح سے رہے نہ زیر نگیں
اس کے ہر ملک دل صدا آباد [16]

ڈاکٹر گل کرسٹ نے ۱۹/اگست ۱۸۰۳ء کو کالج کونسل کے نام ایک مراسلہ تحریر کیا تھا۔ اس مراسلے میں اس نے کالج کے شعبۂ ہندستانی کی تخلیقات پر انعام کی سفارش کی تھی اور مراسلے کے ساتھ ہی تصانیف کی فہرست بھی منسلک کر دی تھی۔ گل کرسٹ کی اس فہرست میں "کائنات جو" مطبوعہ کتابوں کے ذیل میں شامل ہے۔ اس میں کل ۱۰۰ صفحات تھے۔ گل کرسٹ نے اس پر ۶۰ روپے کے انعام کی تجویز پیش کی تھی [17] لیکن کالج کونسل نے اس پوری فہرست کو ہی نامنظور کر دیا تھا۔ وہ کالج کے باتنخواہ ملازمین کو کسی قسم کا انعام دینے کے حق میں نہیں تھی۔ راقم الحروف کو رسالۂ کائنات کا اس زمانے کا کوئی مطبوعہ یا خطی .... نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) اور نیشنل لائبریری (کلکتہ) بھی اس کے نسخوں سے خالی ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کو اس کا قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے کتب خانہ میں دستیاب ہوا۔ اور انھوں نے اسے ایک عالمانہ مقدمے کے ساتھ ۱۹۶۵ء میں کراچی سے شائع کر دیا۔

اشک کی یہ تصنیف اس لحاظ سے کافی اہمیت کی حامل ہے کہ غالباً اردو میں سائنس اور حکمت کے موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے۔ دیباچہ مصنف یا کسی اور ذریعے سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اشک کی ان معلومات کا ماخذ کیا ہے۔ انھوں نے

کائنات جو سے متعلق تمام معلومات کو اجمالی طور سے دس فصلوں میں تقسیم کرکے بیان کر دیا ہے۔ وہ پہلی فصل میں جو اور کائنات جو کے بارے میں وضاحت کرتے ہیں:-

" اب اس احوال کو بیان کرتا ہوں۔ چاہیے کسی اہل دانش و بینش پر مخفی و پوشیدہ نہ رہے کہ اس حکیم علی الاطلاق نے اپنی قدرت کاملہ سے اکثر مخلوقات کی پیدائش کے لیے چار کرۂ خاص پیدا کیے ہیں۔ اول آتش، دوم باد، سوم آب، چہارم خاک کہ اس کو اربع عناصر کہتے ان کے آپس میں ترکیب پانے سے مرکبات پیدا ہوتا ہے۔ لیکن دو طور پر کہ ایک کو مرکب تام کہتے ہیں اور ایک کو مرکب ناقص۔ مرکب تام جو اپنی صورت پر چندے قائم رہے وہ موالید ثلاثہ ہے۔ یعنی حیوانات و نباتات و جمادات اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ مرکب کہ جس کی صورت کو قیام نہیں ــ یعنی پیدا ہو کر جلد زائل ہو جاتا ہے، مرکب ناقص اس کا نام ہے وہ کائنات جو میں ہے اور جو نام ہے بیچ کا زمین و آسمان کے ــ یعنی یہ جو زمین سے آسمان تک وسعت ہے اس کو جو کہتے ہیں۔ اور کائنات جو اٹھارہ چیز ہے مثل ابر و باراں، برف و ژالہ، و میغ و شبنم و تنک و رعد و برق و صاعقہ۔ کہ یہ سب کرۂ زمہریر سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور ریاحات و اعصار و قوس قزح و ہالۂ ماہ اور تفاوہ آفتاب یہ تمام طبقہ ہوائے گرم، وہ جو تلے ہے کرہ زمہریر کے، اس سے اور شہاب ثاقب و ذوات اذناب اور حریق طبقۂ ہوائی مجاور النار سے جو اوپر ہے، کرۂ زمہریر کے" ظاہر ہوتے ہیں۔

انشاء اللہ تعالیٰ کائنات ہر طبقے کی اپنی اپنی جا پر بیان کی جائے گی۔"[۱۸]

افسوس نے بقیہ فصلوں کے عنوانات یوں قائم کیے ہیں۔ ان سے ان کے بیانات کا اندازہ ہوتا ہے:-

فصل دوسری ــ احوال میں ابر و باراں کے۔

فصل تیسری ــ احوال میں برف و ژالہ و میغ و شبنم و تنک کے۔

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

حواشی

[۱] دیباچہ انتخاب سلطانیہ۔ از خلیل علی خاں اشک (قلمی نسخہ) ص۔ ۵ (ASIATIC SOCIETY OF BENGAL-CALCUTTA)
[۲] فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی۔ از آدم سیتاپوری ص، ۲۵ (۳) مقدمہ رسالۂ کائنات۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی (مطبوعہ کراچی) ص ۲
[۴] دیباچہ انتخاب سلطانیہ (ق۔ن) ص ۶ [۵] دیباچہ انتخاب سلطانیہ (ق۔ن) ص ۱۱، ۱۲، ۱۳ [۶] دیباچہ انتخاب سلطانیہ (ق۔ن)
ص ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶ [۷] دیباچہ قصہ امیر حمزہ۔ از اشک ق۔ن برٹش میوزیم لندن بحوالہ مقدمہ گلزار چین مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی
ص ۱۵ [۸] دیباچہ رسالہ کائنات۔ از اشک مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۲۵ [۹] مقدمہ گلزار چین ص ۱۱ [۱۰] PROCEEDING
OF THE COLLEGE OF FORT WILLIAM, VOL 559, P. 278 [۱۱] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۹۹ [۱۲]
FORT WILLIAM, 16 SEPT. 1805-27 JAN 1809, H.M Vol 2 P.53.60 بحوالہ فورٹ ولیم کالج از لکشمی ساگر وارشنے
ص۔ ۶۹ [۱۳] فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص۔ ۲۶ [۱۴] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۹۴ [۱۵] دیباچہ رسالۂ کائنات۔ از
خلیل علی خاں اشک مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۲۴، ۲۵ [۱۶] رسالۂ کائنات۔ آغاز [۱۷] PROCEEDING OF
THE COLLEGE OF FORT WILLIAM VOL. 559. P 278 (NATIONAL ARCHIVES OF INDIA -
DELHI) [۱۸] رسالۂ کائنات: ص ۲۷، ۲۸

غزلیں

ایم کوٹھیاوی راہی
قاضی پور خورد
گورکھپور

غم اکیلا ہے اجلے منارے تلے میری یادوں کو آواز دو اجنبی
پھر محبت کروں پھر کہانی لکھوں آؤ تم بھی اک آغاز دو اجنبی

اشک گرتے نہیں گیت بنتے نہیں دل دھڑکتا نہیں لب پھڑکتے نہیں
مر نہ جائے صدا دستِ مطرب سے دا اپنا ٹوٹا ہوا ساز دو اجنبی

موم کے جسم تو خیر کچھ بھی نہیں سنگ کے جسم تک اب پگھل جائیں گے
میرے شیشے میں مے بن کے ڈھلنے لگے غم کو گر سحر و اعجاز دو اجنبی

رات پھر میری دکھتی ہوئی سیج پر شام ہی سے ہے گم سم سی لیٹی ہوئی
اس کے ہونٹوں کو چاہت کی لے دے سکو مجھ کو جینے کے انداز دو اجنبی

آتشیں ساعتوں میں بھٹکتے ہوئے اس سنہرے پرندے کے پر جل گئے
نقرئی پربتوں میں چہکنے لگے پھر اگر شوقِ پرواز دو اجنبی

ظفر گورکھپوری
ایف ۴/۲ میونسپل کالونی
بمبئی ۴۰۰۰۴۳

اڑو ہوا میں فلک سے معاملہ رکھو
میاں، زمیں سے بھی تھوڑا سا رابطہ رکھو

سمے ہر ایک کا قد ناپ لے گا خود اک دن
یہ بحث کل کے لیے دوستو اٹھا رکھو

نہ جی سکوں گا، اگر خود کو میں نے جان لیا
مجھے فریب میں بس یوں ہی مبتلا رکھو

ڈسے گی سوچ تو کس سے لپٹ کے رو دو گے
جلے مکان میں پرچھائیاں سجا رکھو

کرو گے قتل تو میں جی اٹھوں گا خود تم میں
مرے لیے کوئی اس سے کڑی سزا رکھو

شناخت نام ہے شاید اسی اذیت کا
کہ پانیوں میں رہو، رنگ بھی جدا رکھو

تمام رنگ ہی جب موسموں کو دے آئے
تو پھر یہ عکس یہ خاکے بھی کیوں بچا رکھو

مکاں میں کچھ نہیں اک سوگوار پن کے سوا
زیاں ہی کیا ہے جو دروازے کو کھلا رکھو

یہ زندگی بڑی بے رحم ہے، رلا دے گی
تم اپنے ساتھ کوئی بھر سا سر پھرا رکھو

عطا کیا ہے ظفرؔ زندگی نے کیا آخر؟
گنواؤ کون سی دولت بچا کے کیا رکھو

آغا جمیل کاشمیری
سی کے ۳۴/۱۳۶ ناریل بازار
وارانسی - ۲۲۱۰۰۱

آغا محمود شاہ نشتر کاشمیری

آغا محمود شاہ نشتر کاشمیری عرف قلندر شاہ، آغا حشر کاشمیری کے چھوٹے بھائی تھے۔ وہ ۲۳؍ مارچ ۱۸۸۹ء کو اپنے آبائی مکان ناریل بازار بنارس میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد جناب غنی شاہ صاحب ۱۸۶۸ء میں کشمیر سے اپنے ماموں سید احسن شاہ صاحب کے پاس، جو عرف عام میں "پیر جی" کہلاتے تھے، بنارس آئے تھے۔ ۳۰؍ جولائی ۱۸۶۸ء کو پیر جی نے اپنی سب سے چھوٹی سالی (دختر شیخ رحمن) کا نکاح غنی شاہ سے کر دیا۔ نکاح نامے میں دیگر شرائط کے علاوہ ایک شرط یہ بھی تھی کہ عروس کبھی بنارس سے باہر نہیں جائے گی۔ غنی شاہ بنارس میں آباد ہو گئے۔ اور کشمیری شال کی تجارت کرنے لگے۔

غنی شاہ کشمیری عبا اور قبا ہر وقت زیب تن رکھتے تھے اس بنا پر اہل محلہ انھیں آغا صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ اس طرح لفظ "آغا" ان کے نام کا جز بن گیا اور بعد میں ان کے دونوں صاحبزادگان محمود شاہ نشتر اور محمد شاہ حشر کے ناموں کے ساتھ بھی منسلک رہا۔ غنی شاہ صاحب نے تاحیات کشمیر سے رابطہ قائم رکھا اسی لیے ان کے دونوں صاحبزادگان اپنی وطنیت کو اپنی ذات سے علاحدہ کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور خود کو ہمیشہ کاشمیری کہتے اور لکھتے رہے۔

آغا محمود شاہ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ بعد میں وہ حافظ مقبول احمد صاحب کوکب بنارسی کے سپرد کر دیے گئے جہاں بنگال، بہار اور اطراف و جوانب کے طلبا اردو، فارسی، عربی اور علم دینیات حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔ حافظ صاحب کے یہاں شعر و سخن کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ آغا محمود صاحب بھی مبتدی کی حیثیت سے ان محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ کلام اپنے استاد جناب کوکب صاحب کو دکھاتے تھے۔ استاد ہی نے ان کا تخلص نشتر تجویز کیا تھا۔ پڑھائی کی طرف سے غفلت، شاعری اور دیگر مشاغل میں زیادہ دلچسپی کی خبریں جب آغا حشر صاحب کو بمبئی پہنچیں تو وہ بنارس آئے اور آغا محمود صاحب کو ۱۹۰۴ء میں اپنے ساتھ بمبئی لے گئے۔ جہاں انگریزی اسکول کی تیسری جماعت میں ان کا داخلہ ہو گیا۔ وہ چھٹی جماعت ہی میں تھے جب ان کی والدہ محترمہ کے مطالبے پر ان کو ۱۹۰۷ء میں بنارس واپس آنا پڑا اور ۵؍ ستمبر ۱۹۰۷ء کو ان کا نکاح ان کی حقیقی ماموں زاد بہن سے ہو گیا اور وہ بنارس ہی میں رہنے لگے۔ اس طرح ان کا تعلیمی دور نامکمل رہ گیا۔

۱۹۱۰ء میں آغا حشر صاحب نے بمبئی میں "انڈین شیکسپیئر تھیئٹریکل کمپنی" کی بنیاد ڈالی اور آغا محمود صاحب کو کمپنی کی دیکھ بھال کے سلسلے میں اپنے پاس بلا لیا۔ کمپنی کے ملازمین اور دیگر شناسا بصد خلوص آغا حشر کاشمیری کو "بڑے آغا صاحب" اور آغا محمود صاحب کو "چھوٹے آغا صاحب" کہنے لگے۔ کمپنی پونا، حیدرآباد ہوتی ہوئی ۱۹۱۱ء میں دہلی آئی۔ "یہودی کی لڑکی" ڈرامہ کمپنی کے مشہور ڈراموں میں تھا۔ منصف نامی ایکٹر عذرا (یہودی) کا کردار ادا کرتے تھے مگر جس وقت یہ ڈرامہ دہلی کے اسٹیج پر ہونے والا تھا منصف نے عذرا کا پارٹ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ تاریخ کا اعلان ہو چکا تھا۔ غصے میں بڑے آغا صاحب نے خود عذرا کے کردار

۶

ادا کرنا چاہا مگر چھوٹے آغا صاحب نے انھیں اس عمل سے باز رکھا اور خود عذرا کا کردار ادا کیا۔ یہ کردار انھوں نے اس خوبی اور نئے انداز میں اسٹیج پر پیش کیا کہ پبلک منصف کو بھول گئی۔ اسی کمپنی میں وہ عذرا کے کردار کے علاوہ "سلور کنگ عرف نیک پروین" کے افضل کا کردار بھی ادا کرنے لگے۔ ان دونوں کرداروں سے متعلق ان کی اداکاری کو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہوئی۔

کمپنی کی مشغولیت سے جو وقت بچتا تھا اسے چھوٹے آغا صاحب بڑے آغا صاحب کی نجی لائبریری میں جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی تھی اور جس میں روز افزوں اضافہ بھی ہوتا جاتا تھا اپنے مطالعہ کو وسعت دینے میں صرف کرتے تھے۔ کثرت مطالعہ سے چھوٹے آغا صاحب کو مذہبیات تاریخ اور ادب کی مختلف اصناف پر اچھی خاصی دست رس حاصل ہو گئی تھی۔

کمپنی ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کرتی ہوئی ۱۹۱۴ء میں کلکتہ پہنچی وہاں بڑے آغا صاحب نے ہندی زبان کا اپنا پہلا ڈرامہ "بلوا منگل عرف بھگت سور داس" چھوٹے آغا صاحب کو لکھایا وہیں بڑے آغا صاحب کی پنڈلی کا ہڈی کا فریکچر ہو گیا تھا اور وہ لیٹے لیٹے ڈرامہ لکھایا کرتے تھے۔ چھوٹے آغا صاحب نے اس ڈرامے کو ڈائرکٹ کر کے مڈن کمپنی اینڈ کو کی تھیٹریکل کمپنی کے مقابلے میں نمبرا مندرا اسٹریٹ میں کچا منڈوا بنوا کر اسٹیج کیا اور خود اس ڈرامے میں بلوا منگل کا پارٹ ادا کیا۔ یہ ڈرامہ اور چھوٹے آغا صاحب کا پارٹ کلکتہ میں اتنے مقبول ہوئے کہ مندرا اسٹریٹ کا نام "حشر کا میدان" پڑ گیا۔ کمپنی شہر بہ شہر دورہ کرتی ہوئی ۱۹۱۷ء میں سیالکوٹ پہنچی، جہاں مالی مشکلات اور کافی خسارے کی وجہ سے اسے بند کر دینا پڑا اور دونوں بھائی تمام سامان لے کر بنارس واپس آ گئے۔

بڑے آغا صاحب بنارس میں چند دن قیام کرنے کے بعد میڈنس اینڈ کو کی دعوت پر کلکتہ چلے گئے۔ لیکن چھوٹے آغا صاحب بنارس ہی میں مقیم رہے۔ ۱۹۲۰ء میں چھوٹے آغا صاحب اختلاج قلب کا شکار رہنے لگے اور بڑے آغا صاحب نے بغرض علاج انھیں کلکتہ اپنے پاس بلا لیا۔ دونوں بھائیوں کے کلکتہ کے قیام کے دوران بشیر احمد

غفیر احمد کی تحریک پر دوسری تھیٹریکل کمپنی کی بنیاد کا خاکہ بنا اور بنارس میں کمپنی کو عملی شکل دینے کے سلسلے میں انتظامات شروع ہو گئے۔

ڈراپ سین کے پردے پر بنارس گھاٹ کا خاکہ پینٹ کیا گیا اور کمپنی کا نام "دی نیو گریٹ الفریڈ تھیٹریکل کمپنی آف کلکتہ" رکھا گیا۔ یہ کمپنی بنارس سے ۱۹۲۵ء میں دورے پر نکلی اور ۱۹۲۹ء میں جب یہ کمپنی پٹنہ شہر میں تھی مہاراجہ چرکھاری نے اسے خرید لیا۔ اور وہ خود بڑے آغا صاحب کے شاگرد ہو گئے۔ کمپنی چرکھاری جا کر اپنے تماشے اسٹیج کرنے لگی اور بڑے آغا صاحب مہاراجہ چرکھاری کے مہمان کی حیثیت سے چرکھاری میں ٹھہر گئے۔ چھوٹے آغا صاحب بحیثیت ڈائرکٹر کمپنی کے انتظامات میں مشغول رہے۔ چند ماہ بعد مہاراجہ چرکھاری نے دونوں بھائیوں سے خوش ہو کر کمپنی ان کو واپس کر دی۔ ۱۹۲۹ء میں کمپنی چرکھاری سے کان پور آئی۔ جہاں سے بڑے آغا صاحب اسے چھوٹے آغا صاحب کے حوالے کر کے کلکتہ چلے گئے اور چھوٹے آغا صاحب کمپنی کے تنہا مالک ہو گئے۔ یہ کمپنی مختلف شہروں کا دورہ کرتی ہوئی ۱۹۳۱ء میں کلکتہ پہنچی، اور وہاں سے رنگون چلی گئی۔ کثیر خسارے کے بعد یہ کمپنی رنگون میں بند ہو گئی۔ جہاں سے ۱۹۳۳ء میں چھوٹے آغا صاحب کلکتہ واپس آ گئے۔

۱۹۳۴ء میں بڑے آغا صاحب نے "حشر پکچرس" کی بنیاد رکھی اور "رستم سہراب" کی شوٹنگ کا آغاز کیا۔ انھیں ایام میں آغا صاحب کو ایک مقدمے کے سلسلے میں لاہور جانا پڑا۔ قیام لاہور کے دوران بعض دوستوں کے اصرار پر انھوں نے "حشر پکچرس" کو بھی وہیں منتقل کر لیا اور "بھیشم پرتگیا" کی شوٹنگ شروع ہو گئی۔ ادھر چھوٹے آغا صاحب کو مہاراجہ چرکھاری نے اپنے یہاں طلب کیا، اور دوبارہ ایک تھیٹریکل کمپنی بنانے کی دعوت دی مگر معاملات طے نہیں ہو پائے۔ اور مارچ ۱۹۳۵ء میں چھوٹے آغا صاحب کلکتہ واپس چلے آئے۔ ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو آغا محمد شاہ حشر کاشمیری کا لاہور میں انتقال ہو گیا۔ چھوٹے آغا صاحب اس حادثہ کی اطلاع پا کر یکم مئی ۱۹۳۵ء کو لاہور پہنچے۔ چالیسویں کے بعد "بھیشم پرتگیا" کی شوٹنگ مکمل کرنے کے سلسلے میں اداکاروں اور دیگر شعبوں کے کارکنوں سے تبادلۂ خیال کیا لیکن معاملات طے نہیں

ہوسکے اور چھوٹے آغا صاحب بنارس ہوتے ہوئے کلکتہ واپس پہنچ گئے
جنوری ۱۹۰۳ء میں اعلیٰ حضرت نواب رام پور جناب رضا علی خاں صاحب
نے چھوٹے آغا صاحب کو رام پور طلب کیا۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے نواب
صاحب کے سامنے ایک قصیدہ پڑھا جس کی تشبیب کے چند اشعار
یہ ہیں :—

معاذ اللہ وہ ایامِ رفتہ کی پریشانی
عزائم کی وہ بیکاری، مصائب کی وہ ارزانی
بلاؤں کا نزول، ادراک مرا کاشانۂ ویراں
ہواؤں کے تھپیڑے اور مری کشتی طوفانی
ہویدا تھا مرے انداز سے اک حالِ بیتابی
نمایاں حالِ بیتابی سے اک شکلِ پریشانی
بڑھائی تیرہ بختی نے جو تاریکی تخیل کی
تو کھو دی مشعلِ امید نے بھی اپنی تابانی
مہیا جس قدر اسباب تھے جمعیتِ دل کے
انھیں اسباب سے بڑھتی رہی آشفتہ سامانی
خیالِ بے پناہی تیز تر ہوتا گیا ہر دم
فزوں ہوتی گئی موجِ حوادث کی بھی طغیانی
کہ اتنے میں تسلی کو نسیمِ رامپور آئی
نسیمِ رامپور آئی بہ شکلِ پیکِ سلطانی
کہا اٹھ محو کر دے ذہن سے تخئیلِ کلفت کو
کہ تجھ کو یاد فرماتا ہے فیضِ ظلِ سبحانی
یہ مژدہ سن کے میرے بختِ خفتہ نے جماہی لی
فروغِ طالعِ روشن سے چمکی لوحِ پیشانی
ہری ہونے لگی کھیتی، نمو کرنے لگا سبزہ
ہوا بدلی، فضا بدلی، گھرے بادل، پڑا پانی
لگا کے شوق کے پر میں جو سوئے رامپور آیا
تو دیکھا اس طرح آراستہ ہے بزمِ سلطانی
بہ مسندِ جلوہ گر ہے آفتابِ دولت و دانش
اور اس کے گرد کچھ ذرّے بہ مجسم عرضِ حیرانی
یہ ذرّے پرورش پاتے ہیں ایمائے تجلی سے
یہ ذرّے کر رہے ہیں عکسِ رخ سے کسبِ تابانی
انھیں ذرّوں میں آ کر مل گیا اک ذرّۂ نو بھی
وہ ذرّہ کون؟ نشتر زار، خاکِ پائے سلطانی

مطلع

حسد سے دیکھتا ہے دیدۂ گردونِ گردانی
کہ سورج اور کرے اک ذرّۂ خاکی کی مہمانی
عروسِ شاعری جس کو بنا لے مانگ کا ٹیکہ
ثنائے شاہِ والا میں پڑھوں وہ مطلعِ ثانی

اعلیٰ حضرت نواب صاحب رامپور نے خوش ہو کر ڈھائی سو روپے ماہانہ مشاہرہ مقرر فرمایا اور مزید عزت افزائی کی غرض سے مصاحبینِ خاص میں جگہ عنایت فرمائی۔

اعلیٰ حضرت نواب صاحب رام پور نے ایک تھیٹریکل کمپنی بنانے کا بھی حکم دے رکھا تھا جو چھوٹے آغا صاحب کے رامپور پہنچنے سے پہلے ہی وجود میں آ چکی تھی۔ نواب صاحب چاہتے تھے کہ چھوٹے آغا صاحب رامپور میں قیام کریں اور اداکاروں کو اداکاری کی تربیت دیں۔ مگر چھوٹے آغا صاحب درباداری کے عادی نہیں تھے اس لیے زیادہ دنوں تک رامپور میں قیام نہیں کرتے تھے۔ دربارِ رامپور میں چھوٹے آغا صاحب کے رسوخ اور ہر دلعزیزی کو دیکھ کر عملے کے کچھ حضرات ان کے خلاف ہو گئے تھے اور نواب صاحب کے کانوں تک یہ خبر پہنچا دی تھی کہ آغا محمود بے حد آتش مزاج ہیں۔ ریہرسل کے وقت جب وہ کسی اداکار کو کچھ بتا رہے ہوں، اگر کوئی انھیں ٹوک دے تو مشتعل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک دن جب وہ اسٹیج پر کسی ایکٹر کو کوئی بزنس بتا رہے تھے، نواب صاحب نے فرمایا: "آغا صاحب! اگر اس بزنس کو یوں کیا جائے تو کیسا ہو" چھوٹے آغا صاحب نے جواب دیا: "بہت بہتر ہوگا سرکار"۔ دوسری مرتبہ نواب صاحب نے اسی بزنس کے سلسلے میں جب ٹوکا تو آغا صاحب کا جواب پہلے جیسا تھا۔ مگر جب تیسری مرتبہ نواب صاحب نے پھر مداخلت کی تو انھوں نے جواباً عرض کیا کہ "سرکار کی بکری ہے چاہے منہ کی طرف سے حلال کریں یا دُم

طرف سے"۔ یہ غیر متوقع جواب سنتے ہی نواب صاحب نے فرمایا "کیا کہا آغا صاحب!" چھوٹے آغا صاحب چیتے اور ہنس کر کہنے لگے کہ سرکار ریہرسل کے وقت اگر ایسے جملے زبان پر آجائیں تو پرفارمنس کے موقعے میں برجستگی نہیں رہ جاتی۔ نواب صاحب ہنسنے لگے اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ مگر یہ حقیقت تھی کہ چھوٹے آغا صاحب خود کو کسی نواب یا راجہ سے کم نہیں سمجھتے تھے اور ان کو اپنے فن پر اعتماد کلی تھا اس لیے وہ وہاں کی درباداری کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ نواب صاحب کی بار بار طلبی کے باوجود وہ سال میں صرف جشن مسند نشینی یا سال گرہ کے موقع پر رام پور جایا کرتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد باوجود طلبی کے رامپور نہیں گئے اور اس طرح یہ مشاہرہ منسوخ ہوگیا۔

کمپنی کے بند ہوجانے اور دیگر مشاغل سے بے تعلقی کے بعد چھوٹے آغا صاحب کا زیادہ تر وقت کلکتہ میں گزرتا تھا۔ بنارس کے قیام کے دوران ان کے بچپن کے ساتھی مرزا عباس بیگ محشر بیشتر ان کے شریک صحبت رہتے تھے۔ مرزا صاحب کے بار بار اصرار پر وہ بنارس کے طرحی مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ اکثر صبح مرزا صاحب کوئی مصرعہ طرح ان کو دے جاتے اور جب شام کی محفل گرم ہوتی تو چھوٹے آغا صاحب اس طرح میں غزل سنا دیتے۔ حافظہ بلا کا تھا جو شعر موزوں ہوجاتا وہ ہمیشہ کے لئے ان کے حافظے میں محفوظ ہوجاتا۔

کلکتہ کے قیام کے دوران چھوٹے آغا صاحب کا زیادہ تر وقت یار باشی میں گزرتا تھا۔ سید محمود طرزی (مالک کلکتہ سنٹرل پریس) چھوٹے آغا صاحب کے ایسے شناسا تھے کہ کلکتہ والوں کو ان لوگوں کے بارے میں بھائی بھائی ہونے کا یقین تھا۔ طرزی صاحب کے علاوہ جمیل مظہری، رضا مظہری، حکیم ناطق، پروفیسر بیخود اور دیگر شعرا اور ادیب گاہے گاہے چھوٹے آغا صاحب سے ملنے آیا کرتے تھے۔ شعر وسخن کی محفلیں گرم ہوتی تھیں اور چھوٹے آغا صاحب سے فرمائش پر فرمائش ہوا کرتی تھی کہ وہ اپنا کلام بھی سنائیں۔ فرمائش پر چھوٹے آغا صاحب بھی اپنا کلام جو ان کی یادداشت میں محفوظ ہوتا تھا سناتے تھے۔ ان نشستوں کا یہ اثر ہوا کہ چھوٹے آغا صاحب اپنے کلام کو محفوظ رکھنے لگے۔ ان کا دھیان اب صرف شعر وشاعری کی جانب مرکوز ہوگیا۔ "بزم احباب" کی نشستوں اور دوسرے طرحی مشاعروں میں ان کی شرکت ہونے لگی اور زیادہ تر وقت شعری تخلیق میں صرف ہونے لگا۔ "بزم احباب" کی نشستوں میں شعرائے کرام کے دو گروپ ہوگئے۔ ایک گروپ چھوٹے آغا صاحب کی استادی کا ممنون تھا تو دوسرا گروپ مولانا حکیم سید ابوالعلا صاحب ناطق لکھنوی کا۔ رسالوں میں دونوں حضرات کی طرحی غزلیں بالمقابل شائع ہونے لگیں۔ مثال کے طور پر ماہنامہ "کسوٹی" کلکتہ ماہ نومبر ۱۹۴۸ء میں دونوں صاحبان کی بالمقابل غزلیں شائع ہوئی تھیں جو درج ذیل ہیں:-

افکارِ عالیہ

از جناب مولانا حکیم سید ابوالعلا صاحب ناطق لکھنوی

تصور بے غرضی کا خیال ہی نہ رہا
بڑا غضب ہوا کوئی سوال ہی نہ رہا

ادائیں اُن کی قیامت تھیں عذرِ رُخصت میں
مجھے فراق کا آخر ملال ہی نہ رہا

شباب میں وہ ہو کیونکر جمال بڑھ کے جلال
مزاجِ حسن میں اب اعتدال ہی نہ رہا

وہ پوچھنے لگے جس روز سے مرا احوال!
نہ بے خودی نہ خودی کوئی حال ہی نہ رہا

سوال ان کے لیے عمر بھر جو سوچا تھا
جب آیا وقت تو وقتِ سوال ہی نہ رہا

بہار باغِ جناں کا ہے لُطف کیا رضواں
خزاں کے آنے کا جب احتمال ہی نہ رہا

بڑی اُمید تھی ایفائے عہد کی مجھ کو
مگر کب آئی قیامت خیال ہی نہ رہا

نگاہِ لطف سے کیا ہوا ہوں شرمندہ
سوال آکے زباں تک سوال ہی نہ رہا

کمالِ عشق نے پہنچا دیا وہاں ناطق
جہاں قضا و قدر کا سوال ہی نہ رہا

رنگِ تغزل

آغا محمود نشتر کاشمیری

نگاہ ملتے ہی دل کا وہ حال ہی نہ رہا
جواب خاک ملے گا سوال ہی نہ رہا

گیا کبھی آ کے تو، لیکن مجھے خبر نہ ہوئی
ترے خیال میں تیرا خیال ہی نہ رہا

طلب تھی جس کی طبیعت کو مل گیا وہ گداز
تم اب ملو نہ ملو یہ سوال ہی نہ رہا

وہ بے خودی جسے کہیے خودی کی بدمستی
کہاں سے لاؤں کہ دل کا وہ حال ہی نہ رہا

مقامِ شوق سے آگے بڑھا جو دل میرا
تو ہجر و وصل کا کوئی سوال ہی نہ رہا

نظر میں آتے ہی اہلِ کمال کا انجام
مرے زوال کو شوقِ کمال ہی نہ رہا

جواب دے دیا اس کی نظر نے پہلے ہی
پھر اب سوال کا کوئی سوال ہی نہ رہا

گناہگار بنایا یقینِ رحمت نے
سزا کا دل میں مرے احتمال ہی نہ رہا

کہاں پناہ اب آغوشِ بیخودی کے سوا
خودی کو ناز تھا جس پر وہ حال ہی نہ رہا

نگاہِ عشق کی پرواز اب وہاں پہ پہنچی
جہاں سے حسن کا کوئی سوال ہی نہ رہا

بہے ان آنکھوں سے آنسو جو وقتِ رخصتِ نشتر
تو مجھ کو اپنے سفر کا ملال ہی نہ رہا!

ان شعری ہنگاموں کے زمانے میں چھوٹے آغا صاحب کے

ایک دوست بابو رام کشن نے کلکتہ میں "رام کشن پروڈکشن" نامی ایک فلم کمپنی بنائی اور ان کے بے حد اصرار پر چھوٹے آغا صاحب نے "منور" نامی فلم میں راجہ کا پارٹ کیا۔ اے۔ آر۔ کاردار اس فلم کے ہدایت کار تھے۔ شوٹنگ کے دوران تیز برقی شعاعوں نے چھوٹے آغا صاحب کی آنکھوں پر بہت برا اثر ڈالا اور آپریشن کے باوجود آنکھوں کی روشنی روز بروز کم ہوتی گئی۔ کثرتِ مے نوشی سے صحت بھی گرتی چلی گئی۔ اس کا اظہار انھوں نے اپنی ایک نظم میں کیا ہے جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

فن کار بھی ہوں شاعرِ شیریں مقال بھی
اور فلسفی بھی مدرسۂ اعتبار کا
پھر بھی یہ حال ہے کہ کوئی پوچھتا نہیں
سڑکوں پہ کھا رہا ہوں طمانچہ غبار کا
ناقدریٔ زمانہ کا کس سے کروں گلہ
پرساں نہیں ہے کوئی مرے شاہکار کا
اپنی خودی کی پیٹھ پہ بایں ہمہ کمال
پھرتا ہوں بار اٹھائے غمِ روزگار کا
سرخ و سپید چہرہ فسردہ ہے اس طرح
جیسے کہ دست بچوڑ لے کوئی انار کا
جیسے کسی غریب کی ٹوٹی ہوئی لحد
یہ حال ہو گیا ہے مرے جسمِ زار کا
آنکھوں کی روشنی بھی گھٹتی جا رہی ہے یوں
بجھتا ہوا چراغ ہو جیسے مزار کا
محفل کا التزام، نہ موسم کا احترام
ساغر میں مرے خون ہے اب تو بہار کا
اب گھر ہے اور چائے کی پیالی میں خونِ دل
برسوں سے میکدہ ہے یہی نشتر زار کا

۱۹۶۰ء میں ان کی آنکھوں کی روشنی بالکل جاتی رہی۔ گھر والوں کی کوششوں کے باوجود کلکتہ کی رنگینیوں نے چھوٹے آغا صاحب کو بنارس

کے بجائے کلکتہ ہی میں رہنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ وہ آخر تک وہیں مقیم رہے اور بجگر کے کینسر کے موذی مرض میں ۲۳ اپریل ۱۹۶۱ء کو وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔

خدوخال کی دلآویزی، شگفتہ مزاجی، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی ہونے کے باوجود چھوٹے آغا صاحب بے حد باوقار شخصیت کے مالک تھے گھر ہو یا باہر وہ رکھ رکھاؤ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ خودداری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ۱۹۲۳ء میں جب وہ رنگون میں تھے اور کمپنی بند ہوچکی تھی، بڑے آغا صاحب نے ناطق فلمی ڈرامہ "یہودی کی لڑکی" نیو تھیٹرس کو دیا تھا اور ان کی دلی تمنا تھی کہ چھوٹے آغا صاحب اس فلم میں عذرا کا پارٹ ادا کریں مگر چھوٹے آغا صاحب نے منظور نہیں کیا۔ کسی کمپنی کی ملازمت ان کی خودداری کے خلاف تھی۔ جب بڑے آغا صاحب کے ٹیلی گرام کے جواب میں چھوٹے آغا صاحب کا ٹیلی گرام انکار میں موصول ہوا تو انھوں نے مجبور ہو کر وہ پارٹ "نواب کشمیری" کو دے دیا۔

بڑے آغا صاحب چھوٹے آغا صاحب سے بے انتہا محبت کرتے تھے اور ان کی جا و بیجا خواہشات کو پورا کر کے خوش ہوتے تھے۔ دونوں بھائیوں میں کبھی کبھی تلخ گفتگو بھی ہوجاتی تھی۔ لیکن چھوٹے آغا صاحب باوجود اپنی گرم مزاجی کے بڑے آغا صاحب کا بہت لحاظ کرتے تھے اور ان کے انتقال کے بعد یہی کہتے تھے کہ "کس پہ ناز کروں، ناز اٹھانے والا چلا گیا۔" شعر و شاعری کی جانب جب چھوٹے آغا صاحب زیادہ مائل ہوئے تو ازراہ مذاق احباب سوال کرتے تھے کہ بڑے آغا صاحب کی حیات میں آپ شعر کیوں نہیں کہتے تھے۔ وہ ہنس کر جواب دیتے کہ اولاً کمپنی کی مصروفیات کی وجہ سے فکر سخن کا موقع ہی کہاں ملتا تھا، اور اگر میں اس زمانے میں فکر بھی کرتا تو لوگ یہی کہتے کہ بھتیا نے لکھ کر دے دیا ہوگا۔ گو کہ میرے اور ان کے رنگ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

۱۹۰۸ء میں چھوٹے آغا صاحب کے یہاں بیٹی پیدا ہوئی جو صغر سنی میں فوت ہوگئی۔ ۱۹۱۰ء میں دوسری بیٹی پیدا ہوئی، اس کا بھی چند ماہ بعد انتقال ہوگیا۔ ۱۹۲۰ء میں یہ خاکسار پیدا ہوا جو دونوں بھائیوں کے درمیان تنہا اولاد ہے۔ اس خاکسار کے پاس والد مرحوم و مغفور کا مجموعہ کلام (جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے) اور بڑے ابا مرحوم کے ڈراموں کے اصل مسودات محفوظ ہیں۔

انتخاب کلام

وہ آئے بھی چلے بھی گئے اور میں بدنصیب
اس وہم میں رہا کہ فریب نظر نہ ہو

فطرت بدل دے کوئی کسے اختیار ہے
وعدہ ادھر ہے اور ادھر اعتبار ہے

نہ کرتے غم اگر وہ مرے مرنے کا تو اچھا تھا
تمنا بن گئی غیروں کی مرگ ناگہاں میری

ذرا حسن تجاہل دیکھنا وہ مجھ سے کہتے ہیں
تو میرا منہ تکا کرتا ہے کیوں دیوانہ وار اکثر

فصل گل، ساغر مے، ابر سیہ کے ہاتھوں
کس طرح آئی ہے توبہ پہ تباہی توبہ

بھولا نہیں ہوں نشتر جوانی کی لذتیں
پیری سے کہہ رہا ہوں کہانی شباب کی

ہنسے گل، روئی شبنم، بلبلوں نے نغمہ سنجی کی!
عیاں راز چمن اور کس طرح یہ بے زباں کرتے

لو ظالم نے دیکھا پلٹ کر دوبارا — غضب ہوگیا دوسرا تیر مارا
ذرا خود کو بھی دیکھ آواز دے کر — بہت تو نے دیر و حرم میں پکارا
جہاں ہوں گی باتیں وفا و جفا کی — وہیں ذکر ہوگا ہمارا تمہارا

پوچھنے والے نہ پوچھیں جو ہے کیسا درد ہے
بس سلیقے سے لگا رکھا ہے ایسا درد ہے

بس ایک دل کے سوا کیا دھرا ہے نشترؔ کے پاس
یہی بتوں کے لیے ہے، یہی خدا کے لیے

تم اگر مخصوص کر دو ہر ستم میرے لیے
ایک عیشِ مستقل بن جائے غم میرے لیے
خوگرِ رنج والم پر بس کرم فرمایئے
ہر عنایت آپ کی ہے اب ستم میرے لیے
جب سے اپنے آپ کو دیکھا عجب عالم میں ہوں
اک تماشہ گاہ ہیں دیر و حرم میرے لیے!
ایسے موسم میں مری بوتل کو خالی دیکھ کر
دیر تک روتا رہا ابرِ کرم میرے لیے
ہائے پھر کرنا پڑا وعدہ شکن کا اعتبار
آج ظالم کھا گیا اپنی قسم میرے لیے

[illegible]
رو رہا تھا نشترؔ اشکِ خوں قلم میرے لیے

اعمال بھلے ہوں تو بھلا ہوتا ہے
اعمال برے ہوں تو برا ہوتا ہے
اعمال ہی دیتے ہیں جزا ہو کہ سزا
اور مفت میں بدنام خدا ہوتا ہے

کچھ کام عسرت ہی نہ امیری نے دیا
کچھ کام نہ پیری کا نہ فقیری نے دیا
طفلی بھی گئی اور جوانی بھی گئی
بس ساتھ دیا نشترؔ تو پیری نے دیا

کب بھلا ان سے بات ہوتی ہے   دن گیا بھی تو رات ہوتی ہے
مسکراتی ہوئی وہ ایک نظر
حاصلِ کائنات ہوتی ہے

✱

خلیل علی خاں اشکؔ (صہ ۲۷ کا بقیہ)

فصل چوتھی — احوال میں برق و رعد و صاعقہ کے۔
فصل پانچویں — احوال میں ریاحات، اعصار و سموم کے۔
فصل چھٹی — احوال میں قوس قزح اور ہالۂ ماہ و تفاوہ آفتاب کے۔
فصل ساتویں — احوال میں شہاب ثاقب و ذوات اذناب اور حریق کے۔
فصل آٹھویں — احوال میں زلزلے کے۔
فصل نویں — احوال میں چشموں کی پیدائش کے۔
فصل دسویں — احوال میں ربع مسکوں اور دائرہ زمین فوقی اور تحتی کے۔

ان عنوانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اشکؔ نے کائنات کے تقریباً تمام عناصر سے متعلق رموز و نکات اس رسالے میں بیان کر ڈالے ہیں۔

رسالہ کائنات کی زبان نہایت عمدہ اور فصیح ہے موضوع کے لحاظ سے انداز بیان عالمانہ ہے۔ بے پناہ اصطلاحوں کا استعمال اشکؔ کی قابلیت اور زبان دانی کی تصدیق کرتا ہے سائنس جیسے خالص علمی موضوع پر اس سے بہتر زبان کا استعمال شاید آج بھی ممکن نہیں۔

غزلیں

اثر عتاسی
جہانگیر، بجنور

کارفرما ہے ساقی کی نظر آج بھی ہے
کیا کیا جائے کہ دل تشنہ جگر آج بھی ہے

باعثِ حیرتِ اربابِ نظر آج بھی ہے
ہر جگہ حسن بہ اندازِ دگر آج بھی ہے

موشگافی تو بہت کرتے ہیں اربابِ خرد
بے خبر اپنی حقیقت سے بشر آج بھی ہے

ہے وہ تیر کہ جس تیر سے بچنا ہے محال
دل کی جانب تری دزدیدہ نظر آج بھی ہے

سوئے میخانہ لرزتے ہوئے بڑھتے ہیں قدم
کیا کروں راہ میں اللہ کا گھر آج بھی ہے

آئینہ خانہ ہے آئینہ نگر سے خالی
وہی جلوے ہیں وہی آئینہ گر آج بھی ہے

بزمِ عشرت میں تو بیٹھا ہوں گر کسے کہوں
زندگی پر غمِ جاناں کا اثر آج بھی ہے

کفیل اثر سلونوی
سلون۔ رائے بریلی

احساسِ درد مژدۂ رسوائی لے گیا
لے جا سکا جو ساتھ وہ سودائی لے گیا

راس آسکا نہ آپ کی یادوں کا سلسلہ
یہ سلسلہ تو لذّتِ تنہائی لے گیا

امید و یاس رنج و الم اضطراب و درد
دل کے عوض جو چیز بھی مل پائی لے گیا

دادِ وفا، خراجِ عقیدت، دعائے خیر
دنیا سے جو بھی چیز جسے بھائی لے گیا

محروم ہوگئی ہے اثر سے نوائے غم
وہ کون تھا جو قوتِ گویائی لے گیا

مبین الحق فاروقی
سینئر اسسٹنٹ محکمۂ آبپاشی
ای۔ ۱۹، یمنا کالونی دہرہ دون

کچھ وہی سمجھے گا رمزِ زندگی میری طرح
جس نے کی ہو آنسوؤں سے میکشی میری طرح

آپ پر بھی عقدہ ہائے نو بہ نو کھل جائیں گے
آپ بھی غم کو سمجھ لیجے خوشی میری طرح

وقت کی رفتار کا کوئی بھروسہ ہی نہیں
یہ کبھی ان کی طرح ہے اور کبھی میری طرح

آپ تو آسودۂ منزل تھے، یہ کیا ہوگیا
کو بہ کو کرنے لگے آوارگی میری طرح

صاحبِ علم و ہنر اہلِ نظر ہوتے ہوئے
ٹھوکریں کھاتے ہیں کتنے آج بھی میری طرح

مبتلائے فکرِ بیش و کم ہوئے اور چل دیے
جو نہ سمجھے زندگی کو زندگی میری طرح

وہ بھلا اس دور میں کیا فیض پائیں گے مبینؔ
جن کے قول و فعل میں ہو سادگی میری طرح

ڈاکٹر حامد اللہ افسر قریشی
بی-۱۱/ ایچ روڈ، مہانگر
لکھنؤ - ۲۲۶۰۰۶

سودا اور مکیں کی چشمک

تاریخ کے ساتھ میں

اودھ کے چوتھے نواب آصف الدولہ کے دور میں اشرف علی خاں نے جو لکھنؤ کی ایک مہذب اور با اخلاق شخصیت تھے فارسی شعرا کے کلام سے اشعار منتخب کر کے برسوں کی محنت کے بعد ایک تذکرہ لکھا۔ ان دنوں مرزا فاخر مکیں کی فارسی گوئی کا شہرہ تھا۔ اشرف علی خاں تذکرے میں شامل اس انتخاب سے مطمئن نہیں تھے چنانچہ اس تذکرہ کو مکیں کے پاس لے گئے۔ مکیں نے متقدمین متوسطین اور متاخرین ہر دور کے شعرا کے کلام پر اعتراض کیا اور اس تذکرہ میں قطع و برید کے الوکھے گل کھلائے۔ اشعار میں کانٹ چھانٹ کر دی۔ کسی لفظ کو بے معنی کہہ کر اس پر ایک تقریر کر دی جس میں تضحیک کا عنصر نمایاں تھا اور بہت سے اشعار کو بے معنی و ناموزوں قرار دے کر صفحات کے صفحات قلم زد کر دیے۔ مرزا رفیع سودا کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے مکیں کی بے جا خامہ فرسائی کو واضح کرنے کے لیے ایک خالص علمی رسالہ لکھا جس کا نام "عبرۃ الغافلین" رکھا اور اس میں مکیں کے کچھ اشعار پر بھی گرفت کی۔ مکیں کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے شاگرد بقا اللہ خاں بقا کو سودا سے مناظرہ کے لیے بھیجا۔ لیکن ان کو ایک بار پھر منہ کی کھانی پڑی۔ قلم کے میدان میں ہارنے کے بعد مکیں نے اپنی خفت مٹانے کے لیے اپنے ہوا خواہوں کو جن میں شیخ زادگانِ لکھنؤ زیادہ تھے، اس بات پر ابھارا کہ وہ لوگ سودا کو ان کے پاس پکڑ لائیں اور ان کی تذلیل کریں۔ بس پھر کیا تھا وہ لوگ خنجروں اور شمشیروں سے لیس ہو کر سودا کے گھر جا دھمکے اور اپنے ساتھ چلنے کے لیے مجبور کیا۔ جب سودا نے آنا کانی کی تو ایک شخص نے ان کے پیٹ پر چھری رکھ دی اور دو نے شمشیر برہنہ کر لی۔ سودا کو مجبوراً ان کے ساتھ میانے پر سوار ہو کر جانا پڑا اس حالت میں بھی ایک شخص چھری لے کر ان کے ساتھ میانے پر سوار رہا۔ ابھی وہ لوگ سودا کے گھر سے بمشکل تمام دس قدم ہی چلے ہوں گے کہ آصف الدولہ کے چھوٹے بھائی سعادت علی خاں با فوج و حشم ادھر سے گزرے۔ انہوں نے سودا سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ جب انہیں اس واقعہ کا تھوڑا سا علم ہوا تو انہوں نے سودا کو اپنے خواص میں جگہ دی اور شر پسند عناصر کو گرفتار کرنے کا حکم دیا لیکن وہ لوگ اسی دوران رفو چکر ہو گئے تھے۔ اس کے بعد سعادت علی سودا کو اپنے گھر لے گئے اور کہا کہ میں اس وقت حاکم نہیں ہوں ورنہ تم دیکھتے کہ میں ان کی کیسی تعزیر کرتا۔ انہوں نے سودا کو چند دن اپنے یہاں قیام کرنے کے لیے بھی کہا تاکہ وہ ان لوگوں کی شرارتوں سے محفوظ رہیں۔ سودا نے ان کی اس کرم فرمائی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ مجھے مکیں سے عداوت نہیں ہے بلکہ مجھ سے فارسی گو مسلم الثبوت استادوں کی تحقیر گوارا نہ ہوئی اور اس لیے میں نے وہ رسالہ لکھا تھا اور

کمینؔ کے اشعار پر بھی بجا گرفت کی تھی۔ جنگ سخن کے لیے تیغ زبان سے بڑھ کر اور کوئی شمشیر نہیں ہو سکتی اس لیے میں نے بھی سخن کی تکرار کی تھی۔ کیونکہ ان کی تیغ سخن اصالت نہیں رکھتی اس وجہ سے انہوں نے شمشیر سے لڑنے کی تدبیر کی لیکن ظاہر ہے کہ یہ محض ان کے "حمق" کی ہی تقصیر ہے۔ اتنا کہہ کر سوداؔ سعادت علی خاں سے رخصت لے کر اسی شب اپنے گھر واپس لوٹ آئے جب نواب آصف الدولہ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو وہ غیظ و غضب سے بھر گئے اور اپنے نائب مختار الدولہ کو طلب کر کے یہ حکم دیا کہ کمینؔ کو فوراً جلا وطن کر دو اور شیخ زادگان لکھنؤ کے محلے کو کھدوا کر ان کے طفل نا بیر کو گنگا پار روانہ کر دو — مختار الدولہ ان دنوں شیخ زادگان لکھنؤ کی سرداری کر رہے تھے۔ اس لیے انہوں نے کمینؔ و شیخ زادگان کو سوداؔ کے گھر بھجوا کر ان کا قصور معاف کروا دیا۔ ہرکارے نے جب اس کی خبر آصف الدولہ کو دی تو ان کا غصہ بھی فرو ہو گیا[۱]

اس تکرار رنجی کی مندرجہ بالا تفصیلات میں نے معصر "تصنیف یکے از تلامذہ ارشد مرزا رفیع المتخلص بہ سوداؔ مع قصیدہ سہ صد و پنجاہ شعر" سے جو کلیات سوداؔ[۲] کے دیباچہ کے طور پر شائع ہوئی تھی اخذ کی ہیں، لیکن اس میں اس تکرار رنجی کے واقعہ کی کوئی تاریخ نہیں دی گئی ہے۔ محمد حسین آزاد[۳] اور رام بابو سکسینہ[۴] نے بھی اس تکرار رنجی کے واقعہ کی کوئی تاریخ نہیں لکھی ہے اور یہی حال شیخ چاند کا ہے جنھوں نے سوداؔ پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا تھا[۵]۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی رقم طراز ہیں کہ لکھنؤ کے ہفت سالہ قیام (۱۱۸۸ھ تا ۱۱۹۵ھ) میں مرزا فاخر کمینؔ سے ان (سوداؔ) کی چشمک خاص طور پر قابل لحاظ ہے[۶]۔ کہ ان کا بیان بھی مبہم ہے۔ اس سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ تکرار رنجی کا یہ واقعہ لکھنؤ میں ہوا تھا اور اس سلسلے میں جو تفصیلات میں نے مندرجہ بالا سطور میں پیش کی ہیں ان سے یہ بھی ظاہر ہے کہ سعادت علی اور مختار الدولہ دونوں اس سے وابستہ تھے۔ جس زمانہ میں آصف الدولہ مسند نشین ہوئے۔ ان دنوں سعادت علی خاں بریلی میں روہیلکھنڈ کے گورنر کی حیثیت سے مقیم تھے اور اپنے بھائی کے بلانے پر اس وقت آکر ان سے مل گئے تھے جبکہ وہ فروری ۱۷۷۵ء میں لکھنؤ کو اپنا دارالسلطنت بنانے کے لیے فیض آباد سے کوچ کر چکے تھے اور ابھی راستہ ہی میں تھے[۷]۔ مختار الدولہ کو ایک سازش کے تحت اٹاوہ میں ۲۷ صفر ۱۱۹۰ھ (۱۷ اپریل ۱۷۷۶ء) کو قتل کر دیا گیا تھا[۸] اس سے پہلے مختار الدولہ اور سعادت علی خاں دونوں شوال ۱۱۸۹ھ (نومبر۔ دسمبر ۱۷۷۵ء) تک لکھنؤ میں تھے[۹] لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ کمینؔ و سوداؔ کی چشمک کا مندرجہ بالا واقعہ لکھنؤ میں فروری یا دسمبر ۱۷۷۵ء کے درمیان کسی وقت ہوا ہوگا۔

محمد حسین آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس تکرار رنجی کے واقعہ کا انجام یہ ہوا کہ علاوہ انعام و اکرام کے سوداؔ کا چھ ہزار روپیہ سالانہ کا وظیفہ بھی مقرر ہو گیا[۱۰] لیکن یہ بات تحقیق کی کسوٹی پر کھری نہیں اترتی کیونکہ ایک معصر کاغذ[۱۱] سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۱۷۸۰ء تک سوداؔ کا وظیفہ محض ۲۳۷۰۔ روپیہ سالانہ تھا۔

حوالہ جات

۱۔ کلیات سوداؔ (نول کشور پریس کان پور ۱۳۲۳ھ) ص ۲ تا ۲۶
۲۔ (ایضاً)
۳۔ آب حیات (الہ آباد ۱۹۷۶ء) ص ۱۶۵ تا ۱۶۸
۴۔ تاریخ ادب اردو لکھنؤ (۱۹۶۹) ص ۱۱۰ تا ۱۱۱
۵۔ سوداؔ (مکتبہ اردو ادب لکھنؤ ۱۹۷۲) ص ۷۵ تا ۷۹
۶۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری (ادبی دنیا اردو بازار دہلی) ص ۱۰۲ تا ۱۰۳
۷۔ سعادت علی آف اودھ: لائف اینڈ ٹائمز (?) —
از: حامد آفاق قریشی (لکھنؤ ۱۹۸۱) ص ۱۳
۸۔ بنگال سیکریٹ کنسلٹیشن (مخطوطہ نیشنل آرکائیوز دہلی) ۲۹ اپریل ۱۷۷۶ء
۹۔ دقائع زمان نواب آصف الدولہ (مخطوطہ رضا لائبریری رام پور)
۱۰۔ آب حیات ص ۱۵۱
۱۱۔ ایبسٹریکٹ اکاؤنٹ ۱۷۸۰ء (مخطوطہ نیشنل آرکائیوز دہلی)

غزلیں

فرقت کھیم پوری
پوسٹ : کرنیل گنج ۔ گونڈہ

میں حقیقتوں سے ہوں آشنا مجھے اب فریب دعا نہ دے
ہے قریب دور کی بات کیا مجھے تو کہیں سے صدا نہ دے
حدِ زندگی میں سکون ہے غمِ اضطرابِ حیات سے
یہ نشاطِ روح کی آرزو کہیں عمر تیری گھٹا نہ دے
تری بے رخی کا الم نہیں نہ ترے سکوت کا غم مجھے
میں پکاروں گا تجھے عمر بھر تو جواب دے مجھے یا نہ دے
مرے حالِ زار کو دیکھ کر گریں تیری آنکھ سے اشکِ غم
تجھے تیرے حسن کا واسطہ تجھے یہ عظیم سزا نہ دے
یہ ہے فرقت اپنا مشاہدہ کہ نصیب اُس کا خراب ہے
نہ فریب دے جسے عہدِ نو یہ زمانہ جس کو دغا نہ دے

قائد حسین کوثر
۴۴/۱۴۷۱۴۴ ۔ چمن گنج ۔ کان پور ۲۰۸۰۰۱

پتھر سمجھ کر اس نے اچھالا تھا میرا نام   پانی کی انگلیوں نے سنوارا تھا میرا نام
وحشی بگولے روندتے پھرتے رہے مجھے   ذروں نے پھر بھی روز سجایا تھا میرا نام
پھر کشتیوں کی فصل اگی تھی سراب میں   اذنِ سفر کو بانٹنے نکلا تھا میرا نام
جس کے لبوں میں نیل کی وادی کا سحر ہے   میرے بدن پہ اس نے ہی لکھا تھا میرا نام
سیسے کا ہر حصار پگھلا موم کی طرح   ہر دائرے کو توڑنے نکلا تھا میرا نام
معکوس آفتاب کی کرنوں کا رخ جال   پلکیں جھپک گئیں کہ چمکتا تھا میرا نام
بے حد بلند سبز سے ٹیلے پہ ایک گھر   ستھری سی اک لکیر نے پوچھا تھا میرا نام
کوہِ ندا پہ خاک کا سایہ اٹھائے ہاتھ
اندھی حقیقتوں نے بتایا تھا میرا نام

ماسٹر عبدالمنان
۹۰ ۔ شیخ سرائے سیتاپور (یوپی)

یہ لمحاتِ حسیں یہ کیف کے ساماں نہیں ہوں گے
جو دل والے شریکِ محفلِ خوباں نہیں ہوں گے
پہن لینا لباسِ آدمیت آ گیا جن کو
وہ دامن چاک ہو جانے پہ بھی عریاں نہیں ہوں گے
مچلتے ہیں تقاضے جن میں اجرِ زہد و طاعت کے
کبھی زاہد وہ سجدے شاملِ ایماں نہیں ہوں گے
خود اپنے ذوق کو رہبر بنائیں رہروِ منزل
وگرنہ زندگی کے مرحلے آساں نہیں ہوں گے
بناتے ہیں جو ساحل سینۂ موجِ تلاطم پر
کبھی منان وہ دامن کشِ طوفاں نہیں ہوں گے

ہوش ملیح آبادی
ملیح آباد لکھنؤ

غم ساز فضا اس کے قریب آئی نہیں ہے
جس دل نے کدورت کبھی اپنائی نہیں ہے
سناٹے میں آہٹ کوئی ملتی ہے مسلسل
تنہائی کی حد میں ابھی تنہائی نہیں ہے
ٹھکراتی ہے دنیا مجھے دیوانہ سمجھ کر
اس بات میں کیا آپ کی رسوائی نہیں ہے
خود اپنے میں غیروں کی برائی کو چھپا لے
ماحول میں اب اتنی بھی گہرائی نہیں ہے
اے ہوش یہ گلشن میں ہوا کیسی چلی ہے
کھلتے ہوئے پھولوں میں بھی رعنائی نہیں ہے

افسانہ

شاکر جرولی

دوسرا کنارہ

وہ ریل کی پٹری کے برابر برابر گھاٹ کی سمت جاتی ہوئی پختہ سڑک پر بے تحاشہ دوڑ رہا تھا۔ گورکھپور سے آنے والی تیز رفتار ایکسپریس اس سے آگے نکل چکی تھی۔ نشیبی سڑک سے پٹریوں کی چمک صاف نظر آ رہی تھی۔ ٹرین اب ایلگن برج میں داخل ہو چکی تھی۔ اور وہ بھاگ رہا تھا ——— بھاگ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے سامنے سے آتی ہوئی بس کو دیکھ کر رفتار کم کر دی۔ بس ایک خطرناک موڑ کو پار کر کے اچانک اس کے سامنے آ چکی تھی۔ وہ تیزی سے کنارے ہو گیا مگر اس نے پھر اپنی رفتار بڑھا دی۔ گھاٹ اب مشکل سے ایک فرلانگ رہ گیا ہوگا۔ راجیش کسی طرح نہیں چاہتا تھا کہ یہ اسٹیمر بھی نکل جائے، جو اب اس کی نظروں کے سامنے گودی میں لنگر انداز تھا۔

اس نے پوری طاقت صرف کر کے دوڑ لگا دی۔ ایسی جیسی ریس کے بڑے بڑے مقابلوں میں لگائی جاتی ہے اور چشم زدن میں گھاٹ پر پہنچ گیا۔ کشتیوں سے بنی ہوئی گودی میں لنگر انداز اسٹیمر پر خاصی بھیڑ بھاڑ تھی ——— مسافر، سامان، جانور، ٹیکسیاں، جیپ اور کاریں ——— سب اس پار اترنے کی منتظر کھڑی تھیں۔ راجیش نے جلدی جلدی ۵۰ پیسے کا فیری ٹکٹ خریدا اور جست لگا کر اسٹیمر پر پہنچ گیا۔ اسٹیمر پہلی سیٹی دے چکا تھا۔ بقیہ مسافر، بیل، بکرے اور موٹر گاڑیاں سب یکے بعد دیگرے ناؤ پر پہنچ چکے تھے جو باقی رہ گئے تھے انھیں اب اگلے پھیرے کا انتظار کرنا تھا۔ اسٹیمر نے دوسری سیٹی دی اور طوفانی موجوں کے دوش پر سبک خرامی سے روانہ ہو گیا۔

اگست کے مہینے میں چڑھی ہوئی ندی، سمندر کو مات کر رہی تھی پانی کا ایک لق و دق صحرا نظروں کے سامنے تھا۔ گھاگھرا کے تیور دیکھنے ہوں تو اسے ایلگن برج کے آس پاس چوکا اور گھاگھرا کے سنگم کے قریب دیکھو۔ امواج پریشاں کا یہ سیل رواں مشکل ہی سے کہیں نظر آئے گا بے اور چھور، اپنی وسعتوں سے بے نیاز ——— افریقہ کی افسانوی ندیوں کی یاد کو تازہ کرتا ہوا۔

راجیش اتنی لمبی دوڑ لگانے کے بعد اب اپنی سانسوں پر قابو پا چکا تھا۔ اس نے ایک نظر گھما کر اسٹیمر کا جائزہ لیا۔ چھوٹے سے کیبن میں جو انجن کے پاس ہی تھا، مختصر گنجائش ہونے کے باوجود مسافر تلے اوپر بیٹھے تھے۔ پوری کشتی میں بارش اور دھوپ سے محفوظ رہنے کے لیے یہی ایک جگہ تھی۔ راجیش بھی وہیں پہنچنا چاہتا تھا مگر دھوپ اور بارش سے بچنے کے لیے نہیں۔!

اس نے دور سے تاڑ لیا۔ ایک نیا شادی شدہ جوڑا بہت سارا سامان لیے کیبن کے ایک گوشہ میں دنیا جہان سے بے نیاز ایک دوسرے میں مگن کھسر پسر کر رہا تھا۔ عورت کے جسم پر قیمتی ساڑی تھی اور اس کا نوجوان ساتھی نئے سوٹ میں ملبوس تھا۔ دونوں گھڑی گھڑی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس دیتے تھے۔ اور پھر بات کرنے لگتے۔

راجیش آہستہ آہستہ ان کی جانب بڑھنے لگا۔ کیبن کے دروازہ سے اندر داخل ہو کر بھیڑ کو چیرتا ہوا وہ آگے کی سمت کھسکنے لگا۔ کیبن میں پندرہ آدمیوں سے زیادہ کے بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ مگر اس وقت وہاں ۵۰ سے کم مسافر نہ تھے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ زیادہ تر لوگ زمین پر جگہ بنائے بیٹھے تھے۔ انھیں راجیش کی مداخلت پسند نہ آئی۔

گھنٹوں باتھ میں ہوں جیسے کئی نوجوان سے کس کا بس چلتا! منھ زور گھوڑا اگر سڑک پہ چلے تو سب ہی راستہ دے دیتے ہیں —— کہیں دولتی نہ جھاڑ دے!

وہ گھسٹتا پلتا نئے شادی شدہ جوڑے کے نزدیک پہنچ گیا اور خاموشی سے اُن کے برابر والے آدمی کو ذرا سا کھسکا کر تین چار انچ جگہ پر قبضہ کرلیا۔ شادی شدہ جوڑے نے اس کی آمد کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

باہر بادل امنڈ امنڈ کر آرہے تھے۔ دھوپ کب کی جا چکی تھی اچانک ہوا کا رُخ بدلا اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ اسٹیمر پر جیسے طوفان سا آگیا۔ لوگ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے کیبن کے اندر گھسنے لگے، اندر والوں نے اس یلغار کو روکنا چاہا تو مار پیٹ شروع ہوگئی۔ اس افراتفری میں راجیش کو دولہا دلہن کے اور قریب آنے کا موقع مل گیا۔ وہ دونوں بھی گھبراہٹ میں ایک بار کھڑے ہوگئے اور جب بیٹھے تو راجیش ان کے پہلو میں بیٹھ چکا تھا۔

چند لمحوں بعد ہنگامہ خود بخود کم ہوگیا۔ بارش اب کم ہوگئی تھی کیبن کے اوپر ٹین کی چھت پر پڑنے والی بوندوں کی آواز مدھم ہوگئی تھی۔ کاروں اور ٹیکسیوں کے مسافر اپنی اپنی گاڑیوں کے اندر چلے گئے تھے۔ بند شیشوں سے ان کے چہروں پر دوڑتی ہوئی آسودگی کی لہریں صاف نظر آرہی تھیں۔ سامنے کی ٹیکسی میں ایک مارواڑی اپنی نوجوان بیوی سے اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ دوسری گاڑی کی چھت پر لیٹ کر ندی کا منظر دیکھنے والا مسافر اب کار کے اندر جا چکا تھا اور سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہا تھا۔

راجیش نے بھی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور برابر والے بوڑھے سے ماچس مانگ کر سگریٹ سلگالی۔ اس کا چہرہ کسی طرح کے بھی جذبے سے بے نیاز تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے اب اس اسٹیمر پر کسی کی بھی ذات سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ ایک ایسی کیفیت جو اسے اس وقت محسوس ہوئی تھی جب آٹھ سال کے سن میں وہ اپنے چھوٹے سے گاؤں اور اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر شہر بھاگ آیا تھا۔ اسے اگر ستاتی تھی تو صرف اپنی چھوٹی بہن گوری کی یاد۔ لیکن کچھ دن کی بے دلی کے بعد وہ اسے بھی بھول گیا تھا۔ [illegible] چہرے کے نقوش بھی اسے یاد [illegible]

بیس برس کے عرصے میں کوئی اتنا کہاں یاد رکھ سکتا ہے۔ جانے کتنے شہروں، قصبوں، گلیوں اور سڑکوں نے اس کے بچپن کو نوجوانی اور پھر جوانی میں بدلتا ہوا دیکھا تھا۔

اچانک اسٹیمر میں زلزلہ سا آگیا۔ دوسرا کنارہ قریب آگیا تھا۔ لوگ جلدی جلدی اپنا سامان اٹھا کر ایک دوسرے سے قبل اسٹیمر سے اتر جانے کی کشمکش میں مبتلا ہوگئے۔ یہ کشمکش کچھ اتنی بڑھی کہ کسی نے بھی یہ نہ دیکھا کہ راجیش کتنی تیزی کے ساتھ کیبن سے نکلا اور اسٹیمر کے آخری سرے پر اس جگہ پہنچ گیا، جہاں سے گودی پر اتر جانا چند لمحوں کی بات تھی۔ گودی جیسے خود بخود اسٹیمر کے قریب آرہی تھی اور پھر ایک دھچکے کے ساتھ سینکڑوں مسافروں اور گاڑیوں کو لیے ہوئے دیو پیکر اسٹیمر کنارے سے لگ گیا۔

راجیش لکڑی کے موٹے موٹے پٹروں سے بنی ہوئی ڈھلان سے اترتا ہوا مسافروں کی بھیڑ میں گم ہوگیا۔ گھاٹ کے اس کنارے پر چائے کی دکانوں کی قطاریں تھیں۔ کچھ دور چل کر وہ بائیں جانب بنے ہوئے چھپروں کے ایک جھونپڑے میں داخل ہوگیا۔ جس کے اگلے حصہ میں چائے کی دوکان اور پچھلی طرف ایک کچی کوٹھری تھی، جہاں دوکان کے رہنے والے رات بسر کرتے تھے۔ دوکان کا ایک دروازہ پیچھے گنے کے کھیتوں میں کھلتا تھا جن کا سلسلہ ببول کے گھنے جنگلوں سے ملا تھا۔

راجیش نے کوٹھری کے اندر پہنچ کر دروازہ بند کرلیا، پھر جیب ٹٹولی۔ سیاہ رنگ کا ایک موٹا سا پرس اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے پرس پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور اس کو چھپر کے ایک شگاف میں ٹھونس دیا۔ پرس کھول کر اس کی رقم دیکھنے کا فی الحال اس کا کوئی موڈ نہ تھا۔ وہ تو کچھ دیر بانس کی کھاٹ پر آرام سے سونا چاہتا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر بری طرح ٹوٹ رہے تھے۔

نیا شادی شدہ جوڑا بھیڑ چھٹنے کے بعد اطمینان سے سامان اٹھا کر کیبن سے نکلا اور آہستہ آہستہ اسٹیمر سے اتر کر چائے کے ہوٹلوں کی قطار کو عبور کرتا ہوا ان بسوں کی جانب چلا جو مسافروں کے انتظار میں گھاٹ پر پرے سے کھڑی تھیں۔ ہوٹلوں میں دکھائی دیتی ہوئی چائے کی پیالیوں نے دونوں کی تشنگی کو بھڑکایا اور وہ آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے

کہ مجبوری سے متفق ہوتے ہوئے ہوٹل کی جانب بڑھ گئے۔
چائے کی دکان کے مالک نے سلیقے سے دو مگ دھوئے اور ان میں گرم گرم چائے انڈیل دی اور ساتھ ہی نمکین شاخوں کی پلیٹ بھی بڑھادی۔
شادی شدہ جوڑا برابر بس کی طرف نظر رکھے تھا۔ انھوں نے جلدی جلدی چائے ختم کی اور خالی مگ میز پر رکھتے ہوئے پیسے پوچھے۔
"بس مالک ڈیڑھ روپیہ۔" دکاندار نے کہا، اور نوجوان کا ہاتھ پیچھے کی پاکٹ میں پرس ٹٹولنے لگا۔
اچانک اس کے چہرے پر زردی چھا گئی۔
"میرا پرس، میرا پرس۔" اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔
لڑکی بے حد نروس ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے دور کھڑے اسٹیمر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"جلدی دوڑو۔ اسٹیمر بھی گیا نہیں ہے۔"
نوجوان اسے وہیں چھوڑ کر اسٹیمر کی طرف دوڑا۔ دکان دار عورت کو تسلی دے رہا تھا، جو اپنی جگہ بت بنی کھڑی تھی۔
"پریشان نہ ہو بیٹا۔ یہاں اکثر ایسا ہوتا ہے۔"
چائے والے کی تسلی کے الفاظ کھوکھلے تھے۔ دل ہی دل میں وہ اس موٹی رقم کے تصور سے خوش ہو رہا تھا جس سے نوجوان جوڑا محروم ہو گیا تھا ——— "تو آج راجیش نے اچھا شکار کیا۔" اس نے سوچا اور پھر لڑکی کو تسلی دینے کے لیے الفاظ ڈھونڈھنے لگا۔
نوجوان تھوڑی سی کد و کاوش کے بعد بے نیل و مرام اسٹیمر کی طرف سے واپس آ رہا تھا۔ لڑکی کو اس کی توقع پہلے سے تھی۔ اس نے اپنا پرس ٹٹول کر چائے والے کے لیے کچھ ریزگاری نکال رکھی تھی۔ شوہر کی ناکام واپسی کا حال سننے سے پہلے ہی اس نے وہ ریزگاری چائے والے کے حوالے کر دی۔ نوجوان صرف اتنا کہہ سکا۔
"وہاں کچھ نہیں ملا، اب کیا ہوگا۔؟"
لڑکی نے حسرت سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور کہا،
"ڈونٹ بی نروس۔ میرے پاس کچھ روپے ہیں ——— جلدی چلو نہیں تو یہ بس بھی نکل جائے گی۔"
دونوں دھیرے دھیرے شکست خوردگی کے قدموں سے بس کی جانب بڑھنے لگے۔
چائے کا دکان دار انھیں جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ وہ بس کی روانگی کا انتظار کرنے لگا۔
اچانک کوٹھری کے اندر سویا ہوا راجیش اٹھ پڑا اور ایک ہی جست میں اس نے چھپر سے بٹوہ نکال لیا۔ پرس کافی وزنی محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے بیتابی سے اس کی زپ کھول دی اور چمڑے کا بٹوہ کسی چھوٹی سی کتاب کی طرح کھل گیا۔ کئی سو کے نوٹ سلیقہ سے رکھے تھے۔ اور پھر اس کی نظر پرس میں لگی ہوئی تصویر پر پڑی۔ وہی شادی شدہ جوڑا عروسی لباس میں تھا۔ بیوی کے بدن پر کامدار ساڑی اور نوجوان نئے سوٹ میں ملبوس۔ کتنے خوش نظر آ رہے تھے وہ دونوں ——— اچانک راجیش کی نظر تصویر کے نیچے لکھے ہوئے ناموں پر پڑی ———
"سوشیل اور گڈی" ——— یکایک راجیش کو لگا کہ لڑکی کی شکل کچھ جانی پہچانی سی ہے۔ اس نے تصویر کو پھر غور سے دیکھا اور یادوں کی لہروں میں ہچکولے کھاتا ہوا وہ گڈی ——— گڈی ——— گڈی ——— چلانے لگا۔
بجلی کی سی تیزی کے ساتھ وہ اٹھا اور کوٹھری کے اس دروازہ کی کنڈی چڑھا دی جو چائے کی دکان کی طرف کھلتا تھا اور پرس جیب میں ٹھونس کر وہ کھیتوں کی طرف کھلنے والے دروازہ سے باہر نکل گیا۔
اب وہ دوڑ رہا تھا ——— بے تحاشہ ——— پوری طاقت سے ——— اس آخری بس کی سمت جو اسٹیمر سے اترے ہوئے مسافروں کو لے کر اپنی منزل پر ابھی روانہ نہیں ہوئی تھی ——— وہ دوڑتا رہا۔ بس اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ ——— راجیش اور تیزی سے دوڑنے لگا۔ اس سے قبل کہ شادی شدہ جوڑے سمیت یہ آخری بس اس کی رسائی سے باہر ہو جاتی، راجیش اس کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا تھا جس کی دوسری طرف دونوں مایوس چہرے لیے بیٹھے تھے۔ راجیش نے ایک جھٹکے سے پرس ان دونوں کی گود میں پھینک دیا۔ اور خود چشم زدن میں گنے کے ان کھیتوں میں روپوش ہو گیا۔ جن کا سلسلہ ببول کے گھنے جنگلوں سے ملتا تھا۔

**

سکندر علی خاں
ایم۔ایل۔اے
تلہر۔شاہجہانپور

اتر پردیش میں ۲۰ نکاتی پروگرام کی پیش رفت

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے نئے ۲۰ نکاتی پروگرام کو عملی شکل دینے کا کام پورے جوش و خروش کے ساتھ ہندوستان کی تمام ریاستوں میں نہ صرف یہ کہ جاری ہے بلکہ کافی آگے بڑھا ہے۔ ریاست اتر پردیش میں بھی پورے خلوص و سرگرمی کے ساتھ اس سلسلے میں کام ہو رہا ہے وزیر اعلا کی سربراہی میں اس کے لیے ریاستی سطح پر ایک کمیٹی کی تشکیل کر دی گئی ہے مجلس وزرار کے اراکین کی قیادت میں ضلعی سطح کی کمیٹیاں بنائی گئی ہیں۔ اسی طرح ممبران مجالس قانون ساز کی سربراہی میں ترقیاتی بلاکوں کی سطح پر بھی کمیٹیاں بنی ہیں یہ ساری کمیٹیاں اپنے اپنے دائرہ کار میں رہ کر پروگرام کی عمل آوری کا بغور جائزہ لے رہی ہیں اور اس سلسلے میں تجاویز بھی پیش کر رہی ہیں تاکہ کوئی رکاوٹ مدراہ نہ ہو۔ دوسری طرف افسران بالا اور ضلع مجسٹریٹ بھی باقاعدہ طور پر اپنے یونٹوں کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اس تال میل کا نتیجہ خوشگوار نکلا ہے یعنی بہت سے منصوبوں میں جنوری ۸۳ء تک جو پیش رفت ہوئی ہے وہ مقررہ نشانوں کے ۵۰ فیصد سے بھی زیادہ ہے۔

۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت مختلف شعبوں میں جو کامیابیاں اتر پردیش میں ہوئی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ آبپاشی صلاحیت میں اضافہ

اس سال مختلف آبپاشی وسائل سے ۸۷ر۱۲ لاکھ ہیکٹیر آبپاشی صلاحیت کا نشانہ مقرر تھا۔ جبکہ جنوری ۸۳ء تک ۱۴ء۸ لاکھ ہیکٹیر آبپاشی صلاحیت پیدا کی جا چکی ہے۔ اصل میں پہلی سہ ماہی میں سیلاب اور بارش کی وجہ سے کامیابی دونوں بھی کم رہی ہے۔ امید ہے کہ جون ختم ہوتے ہوتے مقررہ نشانہ صد فی صد پورا کر لیا جائے گا۔ بجلی کے کنکشنوں کا مسئلہ بھی اس سلسلے میں پریشان کن رہا ہے۔ بہر نوع بجلی کے سامان کی فراہمی کے لیے کوششیں جاری ہیں۔

خشک زمین پر کاشت

خشک زمین پر کاشت کا خاص مسئلہ بیج کی مفید اقسام کی دریافت اور ان کی ترقی ہے۔ بندیل کھنڈ کا علاقہ اس مسئلے سے سب سے زیادہ متاثر ہے۔ اس لیے یہ علاقہ چندر شیکھر آزاد یونیورسٹی (کان پور) کے سپرد کیا گیا ہے۔ وہاں خصوصی مفید اقسام کی دریافت کا کام جاری ہے جس کے مثبت نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں۔

۲۔ دالہن اور تلہن کی ترقی

دالہن کی پیداوار سب سے زیادہ اس ملک میں اپنی ہی ریاست میں ہوتی ہے۔ اس سال دالہن کی ۳۰ لاکھ ٹن پیداوار کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ گزشتہ سال کے مقابلہ اس سال پیداوار زیادہ ہوگی۔ ریاست میں تلہن کی خاص فصلیں رائی، سرسوں، تل، مونگ پھلی، انڈی اور السی ہیں۔ سورج مکھی اور سویابین کی اقسام کو بھی ترقی دی جا رہی ہے۔ سال ۸۳-۱۹۸۲ء میں تلہن کی ۵۰ر۲۰ لاکھ میٹرک ٹن پیداوار کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

۳- مربوط دیہی ترقی اسکیم

اس اسکیم کے تحت ۳۱٫۵ لاکھ خاندانوں کو فیضیاب کرنے کا نشانہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں جنوری ۸۳ء تک ۲٫۶۰ لاکھ خاندان مستفید ہو چکے ہیں جو نشانہ کا ۴۹ فیصد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض دشواریوں کے تحت جن میں بینکوں سے متوقع تعاون کا حاصل نہ ہونا بھی شامل ہے خاطر خواہ کامیابی اس سلسلے میں نہیں ملی ہے۔ مگر جلد ہی دشواریوں پر قابو پاکر اس اسکیم کو آگے بڑھایا جائے گا۔

قومی دیہی روزگار پروگرام

اس کے تحت ۵۶۲ لاکھ انسانی یوم کے بقدر روزگار فراہم کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ جنوری ۸۳ء تک ۱۹٫۷ لاکھ یوم کے بقدر روزگار کے مواقع پیدا کیے گئے جو نشانہ کا ۳٫۵ فیصد ہے۔ کچھ تکنیکی دشواریوں کے سبب اس سلسلے میں پیش رفت کم رہی ہے مگر ان دشواریوں کو دور کرنے کے لیے خصوصی کوششیں کی گئی ہیں، جن کے مثبت نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔

۴- قابلِ کاشت آراضی کی حدبندی

مقررہ حدبندی سے زیادہ زمین کی تقسیم بے زمینوں کے درمیان کیے جانے کے مقصد سے اترپردیش انتہائی جوت حد بندی ترمیمی قانون ۱۹۷۲ء ریاست میں ۸ جون ۱۹۷۳ء سے نافذالعمل ہوا تھا۔ اندازہ تھا کہ اس سے ۳٫۵۰ لاکھ ایکڑ زمین حاصل ہوگی۔ لیکن اس سے ۲٫۶۵ لاکھ ایکڑ آراضی پہلے ہی فاضل قرار دی جا چکی ہے۔ حدبندی سے حاصل شدہ تقریباً تمام آراضی بے زمینوں میں تقسیم کر دی گئی ہے۔

۵- زرعی مزدوروں کی کم سے کم اجرت

زرعی مزدوروں کے لیے کم سے کم اجرت پر کی گئی نظرثانی کے مطابق زرعی کاموں میں لگے ہوئے بالغ مزدوروں کے لیے ریاست کے مختلف منطقوں میں مقرر شرحیں حسب ذیل ہیں۔

۱- مشرقی منطقہ ۔ ۱۶۹ روپیہ ماہانہ یا ۶٫۵۰ روپیہ یومیہ

۲- وسطی منطقہ اور بندیل کھنڈ علاقہ ۔ ۱۸۲ روپیہ ماہانہ یا ۷٫۰۰ روپیہ یومیہ

۳- مغربی منطقہ ۔ ۲۲۱ روپیہ ماہانہ یا ۸٫۰۰ روپیہ

۴- پہاڑی منطقہ ۔ ۲۰۸ روپیہ ماہانہ یا ۸٫۰۰ روپیہ

۶- پابند مزدوروں کی بحالی

اس پروگرام کے تحت حکومت ہند نے ۵۰ فیصد گرانٹ کا بندوبست کیا ہے۔ بحالی اسکیم کے تحت ہر نجات یافتہ پابند مزدور کو ۴۰۰۰ روپیہ تک کی بحالی امداد مہیا کی جاتی ہے تاکہ وہ مویشی پالیں یا کھیتی کریں یا گھریلو صنعت قائم کریں۔ اس سلسلے میں ۷۵ فیصد کامیابی پہاڑی علاقہ میں اور ۳۰ فیصد کامیابی میدانی علاقے میں حاصل ہو چکی ہے۔

۷- اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کی ترقی

اترپردیش میں اقوام مندرجہ فہرست کے تقریباً ۶ لاکھ خاندان رہتے ہیں۔ جن میں تقریباً ۳ لاکھ خاندان غریبی سطح سے بھی نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ اس سال مجموعی طور پر ۵۰۰۰۴ خاندانوں کو غریبی کی سطح سے اوپر اٹھانے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے، اور اس کے لیے تقریباً ۱۲ کروڑ رقم مختص کی گئی ہے۔

۸- پینے کے پانی کا بندوبست

اس سال ریاست کے ۳۶۷۵ مواضعات میں پینے پانی کی فراہمی کا نشانہ ہے۔ جس کے مقابلے میں جنوری ۸۳ تک ۳۱۴۴ مواضعات میں یہ سہولت مہیا کی جا چکی ہے جو نشانے کا ۸۵٫۶ فیصد ہے۔

۹- رہائشی پلاٹوں کا الاٹمنٹ اور مکانات کی تعمیر

اس سلسلے میں کافی تیزی سے کام ہو رہا ہے۔ اس سال ۷۰ ہزار رہائشی پلاٹ الاٹ کرنے کا نشانہ ہے جس کے مقابلے میں جنوری ۸۳ء تک ۶۲۰۶۳ پلاٹ الاٹ۔

جاچکے ہیں۔ دیہی علاقوں میں کمزور طبقوں کے لیے مکانات کی تعمیر کا کام خاص طور سے محکمہ دیہی ترقی کے توسط سے کرایا جارہا ہے۔ اس سال ۱۶۵۲۵ مکانات کی تعمیر کا نشانہ ہے۔

۱۰۔ گندی بستیوں کا سدھار اور معاشی اعتبار سے کمزور طبقوں کے لیے مکانات کی تعمیر

گندی بستیوں میں رہنے والے افراد کی تعداد ۳۵٫۵۰ لاکھ ہے۔ جن میں سے ۸۹۲۸۰۰ افراد کو ۳۱ مارچ ۸۲ء تک مستفید کیا جاچکا ہے۔ اس سال ۱۶۹۸۰۰ افراد کو مستفید کرنے کا پروگرام ہے۔ شہری علاقہ میں بھی معاشی طور پر کمزور طبقوں کے لیے مکانات کی تعمیر کا کام جاری ہے۔ اس سال ۲۲۹۴۶ مکانات کی تعمیر کا نشانہ ہے۔

۱۱۔ بجلی کی پیداوار میں اضافہ

ریاستی بجلی بورڈ کے نظام کے تحت اس وقت مجموعی طور پر ۳۴۹۴ میگا واٹ کی تنصیبی صلاحیت موجود ہے جس میں ۲۲۸۲ میگا واٹ حرارتی اور ۱۲۱۲ میگا واٹ آبی بجلی کی صلاحیت شامل ہے۔ اس سال ۳۱۰ میگا واٹ کی فاضل صلاحیت پیدا کرنے کا نشانہ ہے۔

۱۲۔ شجر کاری پروگرام نیز بایو گیس اور توانائی کے متبادل وسائل

قدرتی ماحول کے توازن کا تقاضہ ہے کہ ریاست میں ایک تہائی رقبہ جنگلات کا ہو۔ اس سال ۳۱ کروڑ درخت لگانے کا نشانہ تھا جو صد فی صد پورا کر لیا گیا ہے۔ آئندہ سال ۴۰ کروڑ سے بھی زیادہ پودے لگانے کا پروگرام ہے۔ اس سال ۱۴۰۰۰ بایو گیس/گوبر گیس پلانٹ لگانے کا نشانہ ہے جس کے مقابلے میں جنوری ۸۳ء تک ۳۳۳۱ پلانٹ لگائے جاچکے ہیں۔

۱۳۔ خاندانی بہبود پروگرام

کثرت آبادی نے جو مسئلے پیدا کیے ہیں ان کی بلاخیزی ہولناک صورت اختیار کر رہی ہے۔ جس کے سبب لوگ خاندانی بہبود کی اہمیت اور ضرورت پہلے سے زیادہ محسوس کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ اس سال کے نس بندی کے ۲۱٫۶ لاکھ کے نشانے کے مقابلے میں جنوری ۸۳ء تک ۸٫۰۲ لاکھ نس بندی آپریشن کیے جاچکے ہیں اور لیپرو اسکوپ طریقہ بھی کافی مقبول ہو رہا ہے۔

۱۴۔ ابتدائی صحت پروگرام

ابتدائی صحت پروگرام کے تحت ۱۷۔ ابتدائی صحت مرکز ۱۴۲۰ ابتدائی ذیلی صحت مرکز اور ۹۶ سبسیڈیری صحت مرکزوں کے قیام کا نشانہ ہے اس کے علاوہ ۵ کوڑھ یونٹ اور اندھے پن کی روک تھام کے لیے آنکھ کے علاج کے ۲۱ یونٹ قائم کرنے کا نشانہ ہے۔

۱۵۔ زچہ۔ بچہ فلاح و بہبود

زچہ بچہ بہبود کے تحت حاملہ ماؤں اور بچوں کے لیے قوت بخش غذا کی فراہمی، حاملہ ماؤں کے ٹیٹنس سے تحفظ، ڈپتھیریا، کالی کھانسی اور ٹیٹنس سے بچوں کے تحفظ، خون کی کمی اور بچوں کے اندھے پن کی روک تھام کے پروگرام چلائے جارہے ہیں۔

۱۶۔ تعلیم

سن ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق اتر پردیش کی آبادی ۱۱٫۰۸۶ کروڑ ہے۔ جس میں ۶ سے ۱۱ سال تک کی عمر کے بچوں کی تعداد تقریباً ۱۴۳ لاکھ ہے اور ۱۱ سے ۱۴ سال تک کے بچوں کی تعداد ۹۰ لاکھ ہے۔ اس طرح صد فیصد تعلیم کے لیے ۲۲۲ لاکھ لڑکوں لڑکیوں کی تعلیم کا بندوبست ضروری ہے۔ تعلیم بالغان کے لیے بھی نئے مرکزوں کا قیام عمل میں لایا جارہا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کی تعداد بھی بڑھائی جارہی ہے اس طرح اس سلسلے میں کافی حوصلہ افزا کام ہو رہا ہے۔

۱۷۔ ضروری اشیاء کی فراہمی

شہری علاقہ میں سستے غلہ کی دکانوں کی تعداد ۴۸۷۷ اور دیہی علاقہ میں ۱۲۲۱۷ ہے دور افتادہ علاقوں، صنعتی علاقوں

اور ہاسٹلوں میں سستے غلہ کی دکانوں کا بندوبست کیا گیا ہے اس طرح ان سستے غلے کی دکانوں کے توسط سے عوام کو ضروری اشیا بہ آسانی دستیاب ہو رہی ہیں۔

۱۸۔ صنعتی پالیسی کا آسان بنایا جانا اور دستکاری ہتھ کرگھا نیز دیہی صنعتوں کی ترقی

ریاستی حکومت نے یو۔ پی۔ اور مالیاتی کارپوریشن کے توسط سے آسان شرحوں پر قرضے کی فراہمی کا ایک جامع پروگرام وضع کیا ہے۔ بڑی اور درمیانہ درجہ کی صنعتوں کے قیام میں حائل دشواریوں کو دور کرنے کے لیے وزیر اعلا کی صدارت میں "ادیوگ بندھو" قائم کیا گیا ہے۔ حکومت دیہی اور چھوٹی صنعتوں پر خاص طور پر زور دے رہی ہے۔ دستکاری، ہتھ کرگھا اور دیگر گھریلو صنعتوں کے لیے نرم شرائط پر قرض کی ضرورت ہے جس کا بندوبست بینکوں کے تعاون سے کیا جا رہا ہے۔

۱۹۔ اسمگلروں، ذخیرہ اندوزوں اور ٹیکس چوروں کے خلاف کارروائی

اسمگلنگ کی روک تھام کے لیے مرکزی حکومت کے کسٹم محکمے سے تجویز موصول ہونے پر ریاستی حکومت کوفے پوسا ایکٹ کے تحت کارروائی کرتی ہے۔ ریاستی حکومت نے اس سلسلے میں موثر اقدامات کیے جن کے اچھے نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں۔ ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری روکنے کے لیے ضروری اشیا، قانون کے تحت کارروائی کی جاتی ہے۔ ٹیکس چوری روکنے کے لیے سیلس ٹیکس ٹرانسپورٹ اور بجلی کے محکموں کی جانب سے کارروائی کی جاتی ہے۔

۲۰۔ سرکاری زمرہ کے اداروں کی کارگزاری میں اضافہ

ریاست میں ۵۷ ریاستی سرکاری ادارے قائم ہیں۔ جن میں سے ۴۹ کمپنی ایکٹ اور باقی آٹھ مختلف قانونی دفعات کے تحت رجسٹرڈ ہیں۔ مارچ ۸۲ء میں ریاستی حکومت کا ۲۱۱.۰ کروڑ روپیہ ان اداروں میں لگا ہوا تھا۔ جس میں ۹۰ فیصد روپیہ آٹھ خاص سرکاری اداروں میں لگا تھا ان میں خاص طور پر اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ اور اترپردیش ریاستی سڑک ٹرانسپورٹ کارپوریشن کے نام قابل ذکر ہیں۔

ان میں ریاستی بجلی بورڈ میں ریاستی حکومت کی سرکاری اداروں میں مجموعی سرمایہ کاری کا ۸۲ فیصد لگا ہوا ہے اور جہاں تک بجلی بورڈ کی کارکردگی کا تعلق ہے، اس سال ۲۸ ۱۲۵ ملین یونٹ بجلی پیدا کرنے کا نشانہ ہے، جس کے مقابلے میں جنوری ۸۳ء تک ۱۰۴۶۴ ملین یونٹ بجلی پیدا ہوئی جو نشانہ کا ۸۳ فیصد ہے۔

*

غزل

ملک زادہ جاوید احمد

دشتِ اجل میں زیست کا منظر نہ مل سکا
ہائے وہ قطرہ جس کو سمندر نہ مل سکا

ساحل کی ریت اٹھالی نشانی کے طور پر
پانی کی تہہ میں جب کوئی گوہر نہ مل سکا

موسم کی نذر ہوگئیں شاخوں کی رونقیں
اڑتے رہے پرند مگر گھر نہ مل سکا

یہ بات دیکھنے کی نہیں سوچنے کی ہے
کیوں کوئی سایہ قد کے برابر نہ مل سکا

یوں تو مرے بزرگوں کی شفقت کا شکریہ
ماں باپ سے مگر کوئی بہتر نہ مل سکا

جاوید میرے بعد مجھے اک نشیب میں
ڈھونڈھا گیا تو جسم ملا، سر نہ مل سکا

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: **عربی زبان و ادب، عہدِ مغلیہ میں**

مصنف: ڈاکٹر شبیر احمد قادر آبادی

ملنے کا پتہ: دانش محل۔ امین الدولہ پارک، لکھنؤ

قیمت: تیس روپے

'عربی زبان و ادب عہدِ مغلیہ میں' ڈاکٹر شبیر احمد قادر آبادی کا تحقیقی مقالہ ہے۔ اس مقالہ پر انھیں لکھنؤ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے۔ دراصل یہ مقالہ عہدِ مغلیہ کے عروج کے زمانے کی ایسی مستند دستاویز ہے جس میں تقریباً دو سو سال (۱۵۲۵ء تا ۱۷۰۷ء) کے مکمل علمی۔ ادبی اور ثقافتی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے اور نہ صرف عربی زبان و ادب کے ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ اس دور کے مشاہیر علماء، ادباء، شعراء اور دیگر ماہرین کی علمی و ادبی خدمات کو بڑی تحقیق و تلاش کے بعد پیش کیا گیا ہے۔

مصنف نے عہدِ مغلیہ کو عربی زبان و ادب کے لیے دو خاص باتوں میں ممتاز و منفرد بتایا ہے۔

۱۔ پہلی بات یہ کہ "اس دور میں کچھ نو مسلم اور غیر مسلم علماء نے علوم اسلامیہ اور فنون ادبیہ کی طرف اس انہماک سے توجہ کی کہ ان کی تدریسی لیاقت اور شاندار تصنیفی صلاحیت کو دیکھ کر اہلِ زبان نے بھی رشک کیا۔ یہ عربی کے ادیب اصلاً عربی یا ان میں سے بعض مسلمان بھی نہیں تھے۔"

۲۔ دوسری اہم بات "فن حدیث شریف اس دور میں خوب پھلا پھولا ..... ایسے محدثین و علماء پیدا ہوئے اور ایسی ایسی نادرۂ کار تصنیفات مدوّن کی گئیں کہ اہلِ عرب نے بھی اس کی داد دی اور اس شعبہ میں ہندوستانیوں کی فضیلت کا اعتراف کیا۔"

ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں مغلوں ہی کے لیے نہیں بلکہ ہندوستان کے لیے بھی قابل فخر ہیں، ان کی تحقیق و تشریح مصنف نے آئندہ ابواب میں بڑی جامعیت سے کی ہے، اور کوئی بات بغیر دلیل اور ثبوت کے پیش نہیں کی ہے۔

مصنف نے عرب، ہند کے قدیم تعلقات اور ان کے اثرات سے بھی بحث کی ہے۔

دوسرے باب میں بابر اور ہمایوں کے حالات اور ان کے کارناموں کا ذکر ہے۔ تیسرا باب عہدِ اکبری کی علمی سرگرمیوں، اور چوتھا باب جہانگیر اور اس کے علمی و ادبی کارناموں پر مشتمل ہے۔ عہدِ اکبری نے

"اپنی فیض بخشیوں اور دلچسپیوں سے وہ ماحول پیدا کر دیا تھا جو کبھی امویوں، عباسیوں اور فاطمیوں کا طرۂ امتیاز تھا۔"

اس دور میں مستقل اور طبع زاد کتابوں کے علاوہ عربی اور سنسکرت سے بھی فارسی میں ترجمے ہوئے۔ رامائن۔ وید۔ مہابھارت، اتھروید، سنگھاسن تاجک، کلیلہ و دمنہ جیسی متعدد کتابوں کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔

جہانگیر خود صاحب سیف و قلم تھا، اس کے اساتذہ میں محدث و مفسر، فقیہ اور متکلم، شعر و ادب، انشاء و املا کے رمز شناس تھے، ان سب سے جہانگیر نے کسبِ کمال کیا۔ علوم اسلامیہ اور فنون عربیہ کی ترویج و ترقی میں اس کو خاص دلچسپی تھی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی، مولانا شکر اللہ شیرازی، مولانا مرزا محمد قاسم گیلانی، ملا جوہر ناتھ کشمیری، عہدِ جہانگیری کے آفتاب و مہتاب ہیں۔ جن میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شیخ احمد سرہندی کے علمی و ادبی، مذہبی و اصلاحی کارنامے زندہ جاوید رہیں گے۔ اس سلسلہ میں جہانگیر کے دور کی ایک نامور ہستی قاضی نور اللہ شوستری کے کارناموں کا بھی ذکر ہونا چاہیے تھا۔

پانچواں اور چھٹا باب شاہجہاں اور اورنگ زیب کے کارناموں اور ان کے دور کے مشاہیر ادب پر مشتمل ہے۔

آخری باب میں عربی زبان و ادب کا تاریخی جائزہ لیا گیا ہے، اور

[ہندو]ستانی ادبار کے تین اسکول ــــ اوراراالنہری اسکول، حجازی اسکول [ہندو]ستانی اسکول کی وضاحت کے بعد عربی کے نصاب تعلیم اور اس کے [د]رجات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد عہد مغلیہ کے علمی سلسلوں سلسلہ مجددیہ، سلسلہ حقانیہ، سلسلہ ولی اللٰہیہ اور درس نظامی کو اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں ہندستانی ادبار کے اسلوب نگارش کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے عربی زبان و ادب کی ترقی کے اسباب کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔

ڈاکٹر بشیر احمد نے بڑی دل سوزی، جاں سپاری، محنت اور لگن کے ساتھ، عہد مغلیہ کے دو سو سال کے عربی زبان و ادب کا تجزیہ پیش کر کے، یہ ثابت کر دیا ہے کہ مغلوں کی علمی و ادبی سرپرستیوں نے ہندستان کو علم و فضل و کمال میں تمام دنیا سے بہتر اور افضل بنا دیا تھا۔ ہزاروں یگانۂ روزگار علمار و مشائخ، ادبار و شعرار اور علوم و فنون کے باکمالوں نے تصنیف و تالیف کے انبار لگا دیے۔ اس تمام سرمایہ کو تلاش و تحقیق کر کے منظرِ عام پر لانا، مصنف کی علمی و ادبی و تحقیقی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔

"عربی زبان و ادب عہد مغلیہ میں" ہمارے ادب میں ایک قابلِ قدر، اہم اور مفید اضافہ ہے۔

ــــ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

نام کتاب "شہ رگ" شاعر: شمیم طارق
قیمت، بارہ روپے۔ ملنے کا پتہ: محافظ پرنٹرز اینڈ پبلشرز
۳۲۴۔ جے جے روڈ۔ بمبئی ۔ ۸

"شہ رگ" بمبئی کے نوجوان شاعر شمیم طارق صاحب کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں چالیس غزلیں، پانچ نظمیں اور چند قطعات شامل ہیں۔

ظ۔ انصاری اور واجدہ تبسم نے اس مجموعے میں ان کی شاعری اور شخصیت کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ اور "میری شہ رگ" کے عنوان سے شمیم طارق نے خود بھی اپنے شعری نظریے پر روشنی ڈالی ہے۔

"شہ رگ" کی شاعری ایک حساس اور پر جوش مگر با ہوش اور جہاندیدہ بلکہ اپنے گرد و پیش سے باخبر رہنے والے نوجوان کی شاعری ہے جس میں عصری حسیت بھی ہے، گہری سوچ بھی اور پاکیزہ جذبات بھی، لیکن ان کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ان کی شائستہ کلاہی ہے۔

شمیم طارق اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ "میرا راگ میری نسل کا راگ ہے جو آگے کی طرف دیکھتی ہے"۔ اپنے کلام کے سلسلے میں ان کی یہ رائے صد فیصد درست ہے۔ ان کے مختصر مگر جامع مجموعہ کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دورِ پرآشوب میں بھی "سچ" ہی شاعری کو تاثر اور گداز دے سکتا ہے ان کی شخصیت اور شاعری دو الگ سمتوں کے مسافر نہیں ہیں "سچ" دونوں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ امید ہے کہ "شہ رگ" کو ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ مجموعے کی کتابت اور سر ورق بھی دیدہ زیب ہیں۔

اطہر نبی

Urdu Monthly

NAYA DAUR

Vol. 38 No. 3
JUNE, 1983
50 paisa

POST BOX No. 146 LUCKNOW 226001

REGD.No.LW/NP.17
Annual Subs.
Rs. 5/-

جولائی ۱۹۸۳ء

جلد ۳۸ نمبر ۴

جولائی ۱۹۸۳ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: گنگا دھر پرشاد شکلا

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی

مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے

زرِ سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلیکیشن برانچ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو.پی. لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

گزشتہ چند دنوں کے اندر ہماری چند انتہائی اہم مذہبی اور ادبی شخصیتیں ہمیں داغ مفارقت دے گئیں۔ مولانا قاری محمد طیب صاحب گوپی ناتھ امن، امین سلونوی اور معراج وارثی صاحب کا انتقال بلاشبہ ملک و قوم کا ایک بڑا نقصان ہے۔

مولانا قاری **محمد طیب** صاحب کے انتقال پر اپنے تعزیتی بیان میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے بالکل صحیح کہا کہ وہ "علوم اسلامی کے عظیم ترین عالموں میں سے تھے اور اسلامی دنیا ان کا بے حد احترام کرتی تھی۔ دارالعلوم دیوبند کے چانسلر کی حیثیت سے انھوں نے ادارے پر اپنی شخصیت کی زبردست چھاپ چھوڑی ہے"۔ قاری صاحب نہ صرف یہ کہ ایک جید عالم تھے بلکہ ایک بہترین مقرر بھی تھے۔ انھوں نے دینی علوم، فقہ اور حدیث پر متعدد اہم اور گراں قدر کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ قاری صاحب کی پیدائش بھی دیوبند میں ہوئی اور انھوں نے تعلیم بھی وہیں دارالعلوم (دیوبند) میں حاصل کی اور اس عظیم اسلامی درس گاہ کے وہ تقریباً پچاس برس تک مہتمم رہے۔ یہ ان کی اس ادارے سے مخلصانہ وابستگی اور ان کی انتھک خدمات ہی کا نتیجہ ہے کہ آج اس ادارے کا شمار دنیا کی عظیم ترین اسلامی درس گاہوں میں ہوتا ہے۔

گوپی ناتھ امن اُردو تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ وہ ہماری سیکولر قدروں اور گنگا جمنی روایات کو نہ صرف یہ کہ اپنی شاعری اور اپنی تحریروں کے ذریعہ بلکہ اپنے قول و عمل سے بھی ہمیشہ تقویت پہنچاتے رہے اور ان قدروں نیز روایات کو مستحکم کرتے رہے۔ امن صاحب ایک شاعر، صحافی اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ مجاہد آزادی بھی تھے۔ انھوں نے ملک کی جنگ آزادی میں عملی حصہ لیا اور آزادی کے بعد ایک نئے ہندستان کی تعمیر و ترقی میں لگ گئے۔ اسی کے ساتھ ان کی مشق سخن بھی جاری رہی اور یہی نہیں انھوں نے بعض بہت ہی اہم کلاسیکی فن پاروں کا اُردو میں ترجمہ کیا اور ترجمہ بھی ایسا جس میں بلا کی روانی اور سادگی پائی جاتی ہے۔ امن صاحب ایک ایسے فن کار اور دانشور تھے جن کا ادبی اور سیاسی حلقے دونوں یکساں طور پر احترام کرتے تھے۔ خاص طور سے دہلی کی تہذیبی، ادبی اور سماجی زندگی میں انھیں خصوصی حیثیت اور اہمیت حاصل تھی۔ صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ نے ان کے انتقال پر اپنے تعزیتی بیان میں بالکل صحیح کہا کہ "امن صاحب نے، جو ایک اچھے شاعر تھے، قومی جدوجہد آزادی میں قابل تقلید رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے دہلی کی سماجی اور تہذیبی قدروں کو اجاگر کرنے میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ ان کے انتقال نے دہلی کو ایک عظیم شہری اور ملک کو ایک عظیم سپوت سے محروم کر دیا!"

امین سلونوی صاحب کا انتقال اُردو صحافت کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کی تہذیبی اور سماجی زندگی کا ایک بڑا نقصان ہے۔ وہ یہاں مختلف اخبارات اور جریدوں سے وابستہ رہے۔ منشی نول کشور کے شہرۂ آفاق "اودھ اخبار" کے آخری دور میں وہ اس کے بھی مدیر رہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک بڑی خدمت یہ انجام دی کہ اُردو اخبارات کے لیے خبروں کی فراہمی کے واسطے ایک "انڈی پنڈنٹ نیوز سروس" قائم کی جو ایک طویل عرصے تک جاری رہی۔ امین صاحب نے شاعری بھی کی اور مشاعروں کی سرپرستی بھی۔ لکھنؤ کے مشاعرے ایک زمانے میں اس وقت تک نامکمل سمجھے جاتے تھے جب تک کہ امین صاحب ان میں شریک نہ ہوں یا ان کی نظامت نہ کر رہے ہوں۔ یوم آزادی اور یوم جمہوریہ کے خصوصی مشاعروں کی روایت اب تک انھیں کے دم سے جاری ہے۔ شاعری اور مشاعروں سے خصوصی دلچسپی کے ساتھ ساتھ نثر سے بھی انھوں نے وابستگی برقرار رکھی جس کا ثبوت ان کے وہ مزاحیہ مضامین ہیں جو کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ امین صاحب انکساری اور وضعداری کی عملی تصویر تھے ان کے انتقال نے اُردو کو ایک مخلص اور بے لوث خادم سے محروم کر دیا ہے بقول وزیر اعلیٰ شری سری پت مشرا: "امین صاحب کے انتقال سے جو خلا پیدا ہو گیا اس کا پُر ہونا مشکل ہے"۔

اُردو کے بزرگ نعت گو شاعر **معراج وارثی صاحب کا انتقال** ہمارے نعتیہ ادب کا ایک بڑا نقصان ہے۔ اُردو زبان و ادب کے ایک گوشہ نشین خادم کی حیثیت سے انھوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز ۱۹۳۰ء میں کیا تھا اور اپنے آخری ایام تک "نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا" کی تفسیر بنے رہے۔ لکھنؤ کی تہذیب اور یہاں کی خصوصی روایات ان کی رگ رگ میں رچی بسی تھیں۔ لکھنویت اور لکھنوی زبان و اسلوب سے انھوں نے اپنی نعتیہ شاعری میں بڑا کام لیا اور اس میں ایک خاص طرح کی اثر آفرینی پیدا کرنے میں کامیاب رہے۔ نعتیہ کلام کے علاوہ ان کی غزلوں کا مجموعہ "معراج غزل" اور "تضمین دیوانِ غالب" بھی شائع ہو چکی ہے۔

**

غلام رضوی گردش
معرفت علی رضا مختار
سیدواڑہ۔ ڈاک خانہ محمد آباد
اعظم گڑھ

ڈاکٹر صفدر آہ

بمبئی سے پچاس میل دور، چار پانچ سو افراد پر مشتمل چھوٹی سی بستی گنیش پوری، چاروں طرف حدنظر تک پھیلے ہوئے پہاڑ ــــ خوداعتمادی اور وقار کی علامت، اونچے اونچے درخت ــــ شان، تنغنا رلیے ہوئے ــــ راؤ بلڈنگ (پولیس اسٹیشن) کے گراؤنڈ فلور پر کونے والے کمرے میں رات کے دس بجے بتیاں بجھ جاتی ہیں اور تین بجے روشن ہو جاتی ہیں ــــ کبھی کچھ کھٹ پٹ، کبھی کھانسنے ڈکارنے کی آواز آتی ہے ــــ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے، ایک ضعیف، نحیف الجثہ آدمی، ڈھائی تین ہزار کتابوں کے انبار میں دھنسا ہوا، ہمہ وقت مطالعہ اور تصنیف میں مصروف رہتا ہے ــــ عموماً اتوار کو اور تعطیلات میں، سیٹھوں، ساہوکاروں اور اداکاروں کی کاریں باہر آکر رکتی ہیں ــــ شاذونادر چند نامور اور کچھ گمنام ادیب و شاعر بھی وارد ہوتے ہیں ــــ کبھی قہقہے بلند ہوتے ہیں، کبھی شدید برہمی کا اظہار ہوتا ہے۔ پھر آسیب زدہ کمرے میں چند لمحوں کے لیے زندگی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں ــــ تالیاں بجا کر ہوٹل والے کو اشاروں سے آرڈر دیا جاتا ہے، کچھ دیر چہل پہل رہتی ہے، پھر خاموشی چھا جاتی ہے ــــ ایک پراسرار اور معنی خیز خاموشی ــــ سکون اور اعتکاف کا عالم! بستی والے حیران ہیں کہ آخر یہ کون شخص ہے جس نے اپنے کالشمس روشن وجود سے اس تیرہ و تار وادی کو منور کر دیا ہے۔

ــــ شاعری، افسانہ، ناول ــــ تحقیق، تنقید، ڈرامہ ــــ فلم، نجوم، زائچے ــــ وضعداری، شرافت، علم دوستی ــــ کرختگی، انانیت، اشتعال انگیزی ــــ طنز، مزاح اداکاری ــــ نفاست، لطافت، شیرینی ــــ سب کو اردو کے آب زر میں پینٹ دیجیے تو آہ صاحب کی دلچسپ اور آتشیں شخصیت کے خدوخال نظر آجائیں گے!

وہ ذی علم اور ہمہ گیر شخصیت، جو تین ٹکڑوں میں منقسم ہے۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۳۶ء تک ــــ کرتا، پاجامہ، شیروانی، ٹوپی، پمپ شو یا ناگرہ ــــ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۵۹ء تک سوٹ بوٹ، ہیٹ، پائپ یا سفید بش شرٹ، سفید پتلون، سفید چشمہ ــــ اور ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء تک ــــ گیروا کرتا، گیروا تہبند، پاؤں میں چپل، یا گیروا کرتا، سفید پاجامہ، گاندھی ٹوپی اور سفید چشمہ ــــ اور تینوں حصوں میں قدر مشترک ہے، علوم کے لیے احساس تشنگی ــــ اور زبردست اسکالرشپ!

سیتاپور کے کھرے سیّد ــــ شاگرد انیس، فارغ کے نواسے جس کا ہمیشہ بھرا دیتے رہے ــــ نظم سیتاپوری کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا، جو روز ایک غزل کہلواتے، اور پھر اسے چاک کر کے کنوئیں میں ڈلوا دیتے ــــ وہ یوں کہ اس طرح کنوئیں کا کھارا پانی میٹھا ہو جائے گا ــــ اچھے شعر کہنے کے لیے میر کے مزار کے پاس لگے سپستان (لسوڑے) کے پیڑ کی پتیاں تبرکاً کھاتے تھے ــــ راجہ ہائی اسکول سیتاپور اور شیعہ کالج لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ ــــ اسکول میں رشید ترابی کے روم پارٹنر ہوئے ــــ شاعری کا چسکا تو تھا ہی، اب سیاسی چکر بھی شروع ہوا ــــ خواجہ غلام الثقلین نے خوب خوب حوصلہ افزائی کی ــــ پرکشش آنکھیں، کشادہ پیشانی، دراز قد، سرخ و سپید رنگت، خوبرو اور سجیلے، نرگسیت

— شمعیں حسینانِ شہر اور شاہیں کوئے ملامت کی نذر ہونے لگیں — بہکے اور خوب بہکے — شکسپیر نے سچ لکھا ہے۔ —

"THE WISER, THE WAYWARDER."

طرہ یہ کہ بیسویں صدی کے اوائل کا لکھنؤ — طلسم ہوشربا کہیے — قدم قدم پر شعری نشستیں، جگہ جگہ مشاعرے — طرحی مشاعرے غیر طرحی مشاعرے، دور کے مشاعرے — چائے کا دور، شربت کا دور، آبخوروں کا دور — اقبال، رسوا اور پریم چند کی آنکھیں دیکھیں — یگانہ، عزیز، ثاقب، چکبست، آرزو، رشید، سراج اور نیاز فتحپوری کے ساتھ اٹھے بیٹھے — ادیب، جوش، حسینی اور مجذوب سے دوستانہ مراسم قائم ہوئے — صفی لکھنوی سے خاص طور سے قربت حاصل ہوئی جنھوں نے ۱۹۳۷ء میں بمبئی آنے سے قبل "آہ" کے "سوشعر" کے لیے ایک رُباعی کہی تھی ؎

تاثیر میں ڈوبے ہوئے دلدوز اشعار

ہیں ناوکِ سر تیز کہ مژگانِ نگار

ناخن بہ جگر ہر ایک مصرع ہے صفیؔ

یہ آہؔ کے سو شعر ہیں یا نشتر زار

دیدۂ حیراں اور دیدۂ نگراں رکھتے تھے، جلد ہی لکھنؤ کی رنگینیوں سے دامن کھینچ لیا، خود کو بکھیرنے کے بعد سمیٹنے کا فن خوب جانتے تھے۔ نام نہاد ادیبوں اور شاعروں کی بھیڑ میں کھو جانے کا ڈر تھا — سیتاپور واپس ہوئے۔ بیٹھے بیٹھے "نیرنگ" رامپور کے قارئین کے لیے "ابوالقلم" کا چولا بدلا، شادی کی اور ہومیو پیتھ ہو گئے۔ ۱۹۲۴ء میں پہلا ناول "انجام محبت" صدیق بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہو چکا تھا۔ اس کے بعد تین اور اہم کام ہوئے۔ "تکمیل ہجا" کے نام سے ایک کتاب ۱۹۲۰ء میں لکھی جس میں اردو تحریر کی اصلاح کا منصوبہ پیش کیا۔ "فلسفۂ میر" ۱۹۲۸ء میں تحریر کی جو ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی۔ تعلیم بالغان کے لیے اردو کا قاعدہ لکھا جو اسی سال شائع ہوا اور جس پر مصنف کی حیثیت سے آہؔ صاحب کے علاوہ مسعود حسن رضوی ادیبؔ اور ظفر حسین خاں کے نام ہیں۔ — اس دور کی دوسری تصانیف ہیں — "گناہ کی دھار" (ناول)، "شرارے" (افسانوی مجموعہ) اور "قومی زبان" (مقالہ)۔

۱۹۳۷ء میں بمبئی میں نزولِ اجلال ہوا۔ ڈائرکٹر محبوب کی ناک کا بال ہوئے، خوبیٔ قسمت کہیے، ۱۹۴۰ء میں، تاردیو برج کے پاس سلاٹر روڈ کی بلڈنگ نمبر ۱ کے تھرڈ فلور کی کھولی سے — ماہم اور دُلال بنگلہ، کیڈل روڈ پر عارضی قیام کرتے ہوئے — ۱۳۰۔ والکیشور روڈ پہنچے — "عورت" اور "روٹی" کے گیت لکھے۔ آخر تیزی اور طراری رنگ لائی، وہی حشر ہوا جو سید انشا کا نواب آصف الدولہ کے ہاتھوں ہوا تھا — حقہ پانی بند، کھیل تماشہ بند۔ — عقل سلیم رکھتے تھے، وقت کے دھارے کو کاٹ کر اپنی راہ متعین کی۔ "پہلی نظر" کے مصنف اور ہدایت کار کی حیثیت سے مشہور ہوئے — "علی بابا چالیس چور" اور "بھگت رائے داس" دوسری کامیاب فلمیں تھیں۔ اپنے نام اور شہرت کو کیش کیا — اور جی بھر کر کیش کیا۔ چشم زدن میں بنگلے کے باہر تین تین کاریں نظر آنے لگیں۔

بمبئی آنے کے بعد اہلیہ کا وطن میں انتقال ہو چکا تھا۔ اکلوتے بیٹے افسر کو بمبئی بلا کر تعلیم کی غرض سے دیولالی بھیج دیا اور خود دنیاوی لہو لعب میں کھو گئے۔

عیش و عشرت، رت جگے، محفل آرائیاں — جوشؔ، سجاد ظہیر، ملک راج آنند، نریندر شرما، پنڈت سدرشن، آرزوؔ، مجازؔ اور بہزادؔ لکھنوی ایک طرف — پرتھوی راج کپور، کے۔ ایل۔ سہگل، موتی لال، سریندر، مظہر خاں، راج کمار، انل بسواس اور مکیش دوسری طرف — اور پھر کبھی کبھی ؏

اتری ہے چھم چھما کے پری آسمان سے

بہت تیز بھاگے تھے — ٹھوکر لگنا ضروری تھا — ۴۷۔ ۱۹۴۶ء میں "بھوک" پروڈیوس کی اور شدید خسارہ اٹھایا — دیوالیہ اور کنگال ہوئے — بالکل قلاش، کوڑی کوڑی کے محتاج — تینوں کاریں یکے بعد دیگرے چھومنتر ہو گئیں۔ — ہر کمالے را زوال — وقت کی لاٹھی میں آواز نہیں تھی — پست ہو گئے — چاروں خانے چت۔ — جن کا کھایا پیا تھا وہ بھلا کیوں چھوڑنے لگے — سیٹھوں، ساہوکاروں نے بنگلے پر یلغار شروع کی۔ دشمن شب خون

مارنے لگے۔ شائلاک جیسے رفاکوں نے گھیر لیا ـــــ کہتے ہیں شیر ڈین کے جنازے میں جتنے لوگ بھی شامل تھے 'وہ سبھی کا مقروض تھا ـــ اس زمانے میں بنگلے پر جو بھی وارد ہوتا، اُس کا کچھ نہ کچھ نکلتا تھا ـــــ آخرش تنگ آکر سارے دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیتے اور کسی خفیہ راستے سے اندر گھس کر دن بھر مطالعہ میں غرق رہتے ـــ "فردوسیٔ ہند" اور "ہندستانی ڈرامہ" اسی اریک دور کی یادگار ہیں۔

تخلیقی اعتبار سے یہ دور کم اہمیت کا حامل ہے، لیکن اس میں زمانے کے بلند و پست دیکھے، زندگی کے نشیب و فراز کا سیر حاصل نظارہ کیا۔ بٹوارے کا قتل عام اور خوں ریزی دیکھی۔ انسان کی ذلالت اور گراوٹ سے عبرت حاصل کی، نتیجتاً ـــــ زندگی کی بھٹی میں جل کر شخصیت کندن کی طرح دمکنے لگی۔!

"مدر انڈیا" کی کامیابی کے بعد محبوب کا طوطی پھر بولنے لگا۔ پھر جب آصف الدولہ سے روٹھے تھے تو انشا نے مناکر انھیں دوبارہ دربار تک پہنچایا تھا ـــــ کسی نیک بخت نے آہ صاحب کو پھر لاکر محبوب کے سامنے کھڑا کر دیا ـــــ محبوب کا بڑا پن تھا خطائیں بخش دیں ـــــ "سن آف انڈیا" کے مکالمے لکھوائے فلم بُری طرح فلاپ ہوئی ـــــ محبوب لڑکھڑائے ـــ آہ صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے ـــــ ہمت پست سے پست تر ہوگئی ـــــ پھر ستم یہ ہوا کہ مالک مکان نے بنگلہ خالی کروانے کے لیے نوٹس دے دیا ـــــ جم کر مقدمہ بازی ہوئی ـــــ آخرش مقدمہ ہار گئے ـــــ بمبئی سے راہِ فرار اختیار کی ـــــ مضافات میں تھانا ضلع کے نارا گاؤں میں پناہ لی ـــ چالیس ہزار میں کاشت کے لیے زمین خریدی ـــ قانونی داؤں پیچ سے ناواقف ـــــ کاغذ کچا تھا ـــ زمین ہاتھ سے نکل گئی ـــــ سوال آذوقے کا تھا ـــ سوچا پھر سے ہومیوپیتھ ہو جائیں ـــ ـــ قانونی پابندی لگ گئی ـــــ مجسٹریٹ کے سامنے پیشی ہوئی الزام تھا ـ IT'S ALL QUAKERY ـــــ تھیوری آف ڈائلوشن کو تفصیل سے سمجھایا ـــــ دلائل سننے کے بعد اس نے فتویٰ دیا ـــــ

HE IS ONE OF OUR ABLEST MEN.

رجسٹریشن بحال ہوا لیکن مسیحائی سے دل ٹوٹ گیا ـــ ماہر علم نجوم بھی تھے ـــ نیا ہاتھ دکھانے کی سوجھی ـــــ شعبدہ بازی کے لیے بہترین اکھاڑہ گنیش پوری تھا ـــــ توہم پرستوں کی آماجگاہ ـــــ آنکھ کے اندھوں گانٹھ کے پوروں کا مسکن ـــ "ہرے راما ہرے کرشنا" کی گت پر تھرکنے والے ـــــ امریکی ہپیّوں کا ڈیرا ـــ کھونٹا گاڑ کر آلتی پالتی مار کر، یہیں سدا کے لیے بیٹھ رہے ـــ اور جب تک جیے چین سے بسر کی!

۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء تک ـــ ۵۴ سال کی عمر سے ۷۴ سال کی عمر تک ـــ ایسی تندہی، جانفشانی، لگن اور خلوص سے علم و ادب کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے جنھیں دیکھ کر رشک محسوس ہوتا تھا۔ "ابوالعلم" کی چھٹی کر دی گئی اور "گلگن" کے قارئین کے لیے "حکیم لقمان" بن بیٹھے ـــــ رات میں دس بجے سوتے، تین بجے اٹھ بیٹھتے ـ لنچ کے بعد گھنٹہ آدھ گھنٹہ قیلولہ کرتے ـــــ اس پکی عمر میں سولہ سے اٹھارہ گھنٹے تک مطالعہ کرنا ـــــ تصنیف و تالیف میں یکسوئی سے مسلسل مصروف رہنا ـــــ کسی مافوق البشر سے ہی ممکن تھا۔

کبھی لکھنے پڑھنے سے جی اچاٹ ہو جاتا تو کنڈلیاں بناتے۔ پڑوس کے بچوں سے چہلیں کرتے، سرپرستوں اور احباب سے "کاغذی پیچ" لڑاتے ـ ـ وہ اس طرح کہ دبیز زرد رنگ کی شیٹ کاٹ کر خاص طرح کے مختلف سائز کے پوسٹ کارڈ بناتے، پھر گہر افشانی کرنے کے بعد ان پر ٹکٹ چسپاں کر کے ڈاک کے حوالے کر دیتے۔!

دیوالی اور نئے سال کے موقع پر پونجی پتیوں کے نام تہنیت اور مبارک باد کے ڈیڑھ دو سو کارڈ روانہ کرتے ـــــ عید کے موقع پر عموماً کارڈ نہیں پوسٹ کرتے بلکہ خود ہی بنفس نفیس پہنچ جاتے ـــــ اہل ثروت سے عید ملنے ـــــ قدم قدم پہ ـــ سانٹھ گانٹھ ـــ جوڑ توڑ ـــ پینترے۔

پوری شخصیت مجموعۂ اضداد تھی ـــــ فقیر طبیعت فقیر،

روں میں اسیر ۔ کبھی ناگ، کبھی رئیس، کبھی شعلہ کبھی شبنم کا، زمین پر، کبھی آسمان پر!

ویسے ویران جنگل اور تن تنہا۔ کمرے میں صرف دو تصویریں، سشنا مورتی اور اپنی بیگم اسرار فاطمہ کی، اردو سمجھنے اور بولنے والا کوئی نہیں ۔۔۔ نہ عزیز نہ اقربا، نہ دوست نہ احباب، نہ نوکر نہ چاکر، صفائی کے لیے ایک خادمہ کبھی آتی کبھی غائب ہوجاتی۔ اپنا چولھا چکی۔ اپنی ہانڈی برتن، اپنا اسٹوو، اپنا کارخانہ، دست خود دہان خود۔ ۔ ہارٹ اٹیک ہو چکا تھا ۔۔۔ موت کے منہ سے خود کو کھینچ لائے تھے ۔۔۔ خوراک برائے نام رہ گئی تھی۔ پوپلے منہ اور نقلی دانتوں سے کھا بھی کیا سکتے تھے ۔۔ دودھ، شہد، بریٹانیا برڈ، چینز نیس کافی، بہت باریک دو تین چلکے مختلف سبزیوں کا شوربہ اور موسمی پھل ۔ ۔۔ وہ بھی بہ قدر قلیل! سردی سے محفوظ رکھنے کے لیے کوسیول (COSAVIL) اور قبض سے بچنے کے لئے ڈلکولیکس DULCOLAX کا مستقل استعمال کرتے تھے۔

واحد فرزند افسر، سر جے جے اسکول آف آرٹس بمبئی سے ڈپلوما لے کر بنارس کی کسی فرم میں ملازم ہو گئے تھے۔ کبھی ان سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوتا کبھی منقطع ہوجاتا ۔۔۔ کبھی ان کی مدح سرائی ہوتی کبھی شدید بیزاری کا اظہار ۔ !

۱۹۶۹ء اور ۱۹۸۰ء کے درمیان باہمی روابط قائم ہوئے۔ مستقل آمد و رفت کی وجہ سے، اور اکثر ان کے ساتھ مہینوں قیام کی وجہ سے گلیش پوری کے بیشتر رہنے والے مجھے ہی افسر سمجھتے تھے۔

جو لوگ آتے تھے اور پھر ان کے نظریات کی انتہا پسندی اور اشتعال انگیزی سے خفا ہو کر بیٹھ رہے، ان میں خواجہ احمد عباس، ظ۔ انصاری، راجندر سنگھ بیدی، کالی داس گپتا رضا، شمس کنول اور واقعت رائے بریلوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ عباس نے دوستی کا احیا کیا اور بیدی نے علالت کے باوجود جنازے میں شرکت کر کے اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیا۔

تخلیقی اعتبار سے یہ دور بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ نظموں کا مجموعہ "گلبن" رباعیات کا مجموعہ "زمزمہ" اور مثنوی "نو بہ نو" کی اشاعت ہوئی ۔۔۔ میرا کے بھجن "پریم وانی" کے عنوان سے ہندوستانی بک ٹرسٹ بمبئی سے شائع ہوئے جس کا انھوں نے مقدمہ لکھا اور بڑی محنت و کاوش سے اس کا فرہنگ تیار کیا۔

"امیر خسرو ۔ بحیثیت ہندی شاعر" کی اشاعت ہوئی جسے بعد میں ہندی ساہتیہ ستھان والوں نے ہندی میں شائع کیا ۔۔۔ ایک ناول "لال قلعہ" بھی شائع ہوا لیکن اس دور کے دو بے حد اہم کارنامے "میرا اور میرایات" اور "رام چرت مانس" ہیں۔ "میرا اور میرایات" پر انھیں اترپردیش اردو اکاڈمی اور مہاراشٹر گورنمنٹ کے انعامات سے نوازا گیا ۔۔۔۔ ڈاکٹر زرینہ ثانی کی کتاب "صفدر آہ: بحیثیت شاعر" ان کی زندگی میں ہی شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی تھی۔

بظاہر روشن اور تابناک شخصیت میں بہت سے کھانچے تھے۔ بہت سے تاریک گوشے تھے، جن پر روشنی ڈالنے کے لیے اخلاقی جرأت چاہیے ۔۔ موصوف دوسرے کے کاندھے پر بندوق رکھ کر نشانہ لگانے میں طاق تھے ۔۔۔ ۱۹۶۹ء کے اوائل میں، مدیر ماہنامہ "کتاب" لکھنؤ کے نام ایک خط لکھا، موضوع تھا فراق کی شاعری ۔ سنانے کے بعد ارشاد ہوا، "آپ متفق ہیں ۔؟" میں نے عرض کیا بہت سی باتوں سے۔ فرمایا، اس کی ایک نقل بنا دیجئے۔ عدول حکمی کی مجال نہیں تھی، ویسا ہی کیا۔ پھر ارشاد ہوا، دستخط کیجیے۔ سو وہ بھی کیا! پھر اپنا خط چاک کر کے میری بنائی ہوئی نقل پوسٹ کر دی۔ چند ماہ بعد اس کی اشاعت ہوئی۔ ادبی دنیا میں کہرام مچ گیا۔ فراق کے مخالفین نے میری پیٹھ ٹھونکی، موافقین نے آڑے ہاتھوں لیا۔ خود جھٹک کر کنارے ہٹ لیے۔ بعد میں بڑی معصومیت سے مجھے لکھا:

"کتاب" میں میں نے بھی آپ کے حریفوں کی یادہ گوئی دیکھی تھی"۔ !

"صفدر آہ ۔۔۔ بحیثیت شاعر" میں ڈاکٹر زرینہ ثانی کے نام سے جو سوانحی خاکہ شائع ہوا ہے وہ بھی انہی کا تحریر کردہ ہے۔

بارہ سال کے دیرینہ اور گہرے مراسم کے دوران، کم از کم بارہ مرتبہ خفا ہوئے ہوں گے۔ ہر بار یا انھوں نے مجھے منا لیا، یا میں نے ان کو۔ ورنہ حسن ۔ سے ایک بار اکھڑے ہمیشہ کے لئے منھ موڑ لیا۔

اس عرصہ میں بمبئی اور اس کے مضافات میں جہاں کبھی میرا قیام تھا، مثلاً مردل (اندھیری)، کلیان، بھیونڈی، مہاپولی، وجرہشوری، انہوں نے قدم رنجہ فرما کر میری عزت افزائی کی۔ لکھنؤ میں غریب خانہ پر بھی تشریف لائے۔ ایک تعلق خاطر تھا جسے نباہ لے گئے، ایک رواداری تھی جس کی آبرو رکھ لی۔ اکثر معلوم ہوا سخت برہم ہیں۔ خدمت میں حاضر ہوا اور چشم زدن میں معاملات رفع دفع ہو گئے۔

سارے گلے تمام ہوے اک نگاہ میں

اس عرصہ میں مجھے اکتالیس خط لکھے۔ ابتدا میں عزیز مکرم، سراپا کرم، عالی جاہ، والا قدر، حضرت، حضرت گردش کے القاب سے یاد فرماتے تھے۔ پھر ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی قائم ہوئی، اس کے بعد "یا گردش سیلانی" اور "حضرت گردش سیلانی" کی جو رٹ لگانا شروع کی تو وہ تادم آخر برقرار رہی۔ ان خطوں میں شوخی و ظرافت طنز و مزاح کی جلوہ سامانیاں ہیں:

"بہتر ہے اس کمزور گردن سے صدارت کا بوجھ بھی اٹھا لوں گا۔ اصل میں اس فن شریف میں مجھے کوئی دخل نہیں۔ بہ مشکل دو تین مرتبہ کسی جلسہ کی صدارت کا گناہ کیا ہے ...."

"رندوں کے یہاں خیریت، ہونا جمود زندگی ہے، پھر بھی اللہ کرے آپ کے یہاں خیریت ہو۔ کچھ آپ بھی مطالعہ کرتے رہیئے۔ اور ہاں اپنے ٹائپ رائٹر کو نہ بھولیے...... پھندر اس سے آگ کھا سکتے ہیں .... بخیر باشید!"

"آپ کی گردشیت نے معاملہ بالکل الٹ پلٹ کر دیا تھا۔ چلیے شکر ہے آپ پھر برسر کار ہو گئے... آپ کو صلاح دینے اور جھک مارنے میں کوئی فرق نہیں پھر بھی اپنی عادت کے مطابق بکواس کیے دیتا ہوں......"

"گردش کو پکڑنا یا مٹھی میں ہوا کا بند کرنا دونوں ناممکنات سے ہیں....."

"آپ کہاں ہیں؟ — اور .. اس خلاف نشان سوال کا بھی جواب دے دیجیے کہ آج کل کیا کر رہے ہیں؟ اپنی تنقید عالیہ کا تراشہ ارسال کر دیجیے گا.. ... یوں تو امید ہے کہ آپ مع الخیر ہی ہوں گے ...... بے خبری کی ایسی کی تیسی ....."

"آپ جب چاہیں تشریف لائیں۔ چشم براہ ہوں .... کتابیں تلاش کرنا ایک خشک اور دردسری کا کام ہے۔ اگر اللہ توفیق دے تو ڈھونڈ لیجیے گا ورنہ کہاں رند آزاد خرام اور کہاں لائبریری کا کرم کتابی کا کام ع
ہرن پہ لادی جاتی ہے گھاس"

"یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کا صیلانی دل خاندانی روابط کی روشنی سے پھر جگمگا اٹھا ہے۔ اللھم زد فزد.... شیعہ کالج "کیا بولا.؟"

جب عرصہ تک خیریت نہیں ملتی تو میرے احباب کو خط لکھ کر خیریت دریافت کرتے تھے۔ فیضی نظام پوری مرحوم کو لکھتے ہیں:—

"کرم گستر تسلیم۔ کیا حضرت گردش بہ بندش کلیان ہیں؟ یا کسی دوسرے ارض البلد میں پہنچ گئے؟ ...... جواب سے سرفراز فرمایئے..."

۱۹۷۰ء میں بھیونڈی کے فرقہ وارانہ فسادات کے فوراً بعد فیضی مرحوم کو لکھتے ہیں:—

"گردش صاحب تو واپس آ گئے ہوں گے، ان سے خط لکھنے کو کہیے ...... مزید یہ کہ حالات معمول پر آنے تک ان کو مکان صحرائی سے ہٹا کر شہر میں رہنے پر مجبور کیجیے بلکہ یہ پیغام انھیں میری طرف سے دے دیجیے......"

فلسفیانہ انداز بیان میں خرد کی تابانیاں پنہاں تھیں۔ انھوں نے حیات و کائنات کے تقریباً ہر موضوع پر اظہار خیال کیا ہے:

"اعتقادی اساطیر میں سوائے نام کے سب سچ ہوتا ہے اور تاریخ میں سوائے نام کے سب جھوٹ

ہوتا ہے:

"غیر معمولی ذہن تین چار پشتوں کی ذہنی تربیت کے بغیر نہیں بن سکتا"...

"نقاد کے لیے محقق ہونا ضروری نہیں لیکن محقق کو اپنے تلاش کیے ہوئے حقائق کو جانچنے کے لیے نقاد بھی ہونا چاہیے"

"جہاں تک انسان کی تقدیر کا تعلق ہے اس میں CHANGE تغیر ممکن ہے... MUTATION ممکن نہیں..... ؎

کرم گتی ٹارے نا ہیں ٹرای"۔

"نو سیاروں کی حرکت اور زمین اور یہاں کے بسنے والوں پر ان کے اثرات کا مطالعہ علم نجوم ہے....."

"فلم میں فنونِ لطیفہ جب ایک نقطہ پر ملتے ہیں تو جو چیز سب سے پہلے مر جاتی ہے وہ خود فنِ لطیفہ ہے"

"سیاحی کے لیے انسانی شعور کو پختہ ہونا چاہیئے ورنہ اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا"

"ترقی پسند ادب کی ترکیب ہی غلط ہے۔ ترقی پسند ادب نہیں ہوتا بلکہ ادیب ہوتا ہے"

ایک دن میں نے خدا کے وجود کے بارے میں سوال کیا۔ ارشاد ہوا ؎

سرمد اگرش وفاست خود می آید
گر آمدنش رواست خود می آید

بیہودہ چرا در پئے او می گردی
بنشیں اگر او خداست خود می آید

اور پھر کہا — "لیکن کبیر داس نے سب کو پچھاڑ دیا ہے

کبیر من نرمل بھیو، جیون گنگا نیر
پاچھے پاچھے ہر پھریا، کہت کبیر کبیر"

میں نے زندگی اور موت کے بارے میں سوال کیا۔ جواب میں شعر سنایا ؎

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

شبِ معراج کا ذکر تھا۔ پھر سرمد کا حوالہ دیا گیا ؎

مُلا گوید بر فلک شد احمد
سرمد گوید فلک بہ احمد در شُد

آہ صاحب کو عوامی شاعری پر حیرت انگیز عبور حاصل تھا۔ وہ کبیر، تلسی، سور، جائسی اور میرا بائی پر سند کی حیثیت رکھتے تھے۔

"کبیر کی شاعری زبان، صناعی اور فن سے بالا تر ہے مگر اتنی توانا ہے کہ یہ سب چیزیں اس کے پیچھے ہاتھ باندھ کر چلتی ہیں........ وہ عامیانہ ہیں مگر خواص الخواص کا سر جھکا دیتے ہیں، وہ جاہل ہیں لیکن علماء کی آنکھیں خیرہ کر دیتے ہیں۔ وہ اکھڑ ہیں لیکن شائستگی ان کو سلام کرتی ہے"

"تلسی نے نرگن اور ادویت واد کی تردید نہیں کی بلکہ نرگن کو مان کر سگن کے وجود کا جواز پیدا کیا ہے... ونے پتر کا" کو چھوڑ کر تلسی کی کوئی بھجن سنگرہ ایسی نہیں جسے حسنِ بیان میں "سور ساگر" سے تول سکیں"

"جائسی علم میں تلسی کے ہم مرتبہ نہ تھے لیکن جذبہ اور احساس کی فراوانی میں جائسی کسی شاعر سے پیچھے نہیں ہیں۔!"

"میرا کی زبان عوامی ہے لیکن النکار کے زیور سے آراستہ ہے..... اس کی شاعری کسی کوئل کی کوک، کسی بلبل کا گیت اور کسی سریلے ساز کا نغمہ ہے!"

آہ صاحب زبان اور فن کے معاملے میں غیر معمولی طور سے محتاط تھے اور اس سلسلے میں کسی بے راہ روی کو نہیں برداشت کر سکتے تھے۔

"اس صدی کے شعورِ تحقیق سے محروم لغت نویسوں نے جو کچھ کیا ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ خود اُردو بورڈ پاکستان کے لغت میں سرورق لفظ "لغت"

مسلسل تانیث لکھا جارہا ہے جو جمہور فصحائے اُردو
کے فیصلے کے خلاف ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس
دیدہ دلیری کی داد دی جائے یا اس پر نفرین کی جائے۔"
مثنوی "حیات و کائنات" پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے ڈاکٹر
عبدالمجید شمس کی کافی مدح کی تھی لیکن موصوف کی غلطیوں کی طرف
بھی اشارہ کیا تھا:۔

" نسل اور اصل کا قافیہ، نظم اور بزم کا قافیہ،
نظم اور عزم کا قافیہ لانا کھلی ہوئی غلطیاں ہیں۔ ڈاکٹر
صاحب نے ظلم یہ کیا ہے کہ فٹ نوٹ لکھ کر ان سراپا
غلط قوافی کو "صوتی قافیہ" قرار دیا ہے۔ "صوتی قافیہ"
ایک مہمل اصطلاح ہے جس کے علم قافیہ میں کوئی معنی
نہیں 'خاتم' اور 'فاطمہ' کا قافیہ تو شیخ سعدی بھی صحیح
نہیں تسلیم کرا سکے۔"

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی کی کتاب "املا نامہ" (مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ)
کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا، جو ان کے پاس تبصرہ کے لیے آئی تھی:

" ذولسانیات" اور "ذوصوتیاتی" غلط ہے۔ تجنیس
خطی کی وجہ سے 'دو معنی' 'ذو معنی' ہو گیا۔۔۔۔۔۔
اسی طرح یہ تراکیب ہیں۔"

جوش سے اپنی لاکھ عقیدت اور محبت کے باوجود وہ ان کے
بہت سے مصرعوں کو غلط سمجھتے تھے۔ مثلاً ع

الاماں نشتر جٹا دھاری

یا

عباس باامداد کے خوں سے دُھلا ہوا

سالک لکھنوی نے کسی موقع پر کہا "دِکھ گئی"۔ بس چراغ پا ہو گئے
" رئیس المتکلمین۔۔۔۔ مولانا سبط حسن کے صاحبزادے
۔۔۔۔ اور "دِکھ گئی"۔۔۔۔ خوب!"
ان کا قول تھا ـــ "میں اپنے فن سے مارواڑی کی طرح محبت
کرتا ہوں"!
آہ صاحب کی فطرت میں شوخی اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری
ہوئی تھی۔ ہنسنا اور ہنسانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

" آپ کے یہاں جدیدیت کا نمائندہ رسالہ "شب خون"
نہیں آتا؟" ـــ ایک دن میں نے پوچھا۔
" الحمدللہ۔۔۔۔ شب خون سے محفوظ ہوں!" انھوں نے
برجستہ جواب دیا۔

" آج رات مجھے بہت کام کرنا ہے۔۔۔۔۔ رت جگا ہے۔" میرے
لہجے میں تفکر تھا۔
" تو پھر گلگلے پکائیے۔۔۔ یا خدا رحم!" انھوں نے مسکراتے
ہوئے مشورہ دیا۔

" شور بہت ہو رہا ہے۔!" میرا اشارہ ان کے پڑوسی کے ریڈیو
کی طرف تھا۔
" یہ تو سرود ہمسایہ ہے۔"
" نہیں۔۔۔۔ یہ شور کچھ کم ہو تو میں آپ کو ایک مضمون سناؤں۔"
" آپ سنائیے۔۔۔۔ ہاں ہاں۔۔۔۔ سنا دیجے ع

کہا ہم چین کو جائیں، کہا تم چین کو جاؤ
کہا جاپان کا ڈر ہے، کہا جاپان تو ہوگا

" آج رنگ بھی ہے شاید۔؟" میں نے سڑک پر نظر ڈالتے
ہوئے پوچھا۔
ارشاد ہوا:ـــ
" ما را چہ ازیں قصہ کہ گو آمد و خر رفت"

رشی کیش کے ایک سادھو بہت دیر تک اپنی علالت کا شکوہ
کرتے رہے۔ وہ صبر و تحمل سے سنتے رہے۔ پھر جب نہیں رہا گیا تو
آہستہ سے کہا:
" آپ لوگ کھاتے بہت ہیں۔۔۔۔ چار چار دن کا کھانا ایک ہی
دن میں کھا جائیں گے تو اور کیا ہوگا۔؟" سادھو جی جن کا پیٹ بہت

ڑا تھا، ایسا چپ ہوئے کہ پھر زبان ہی نہیں کھولی۔

"اس سال بہت سے مصنفین انعامات سے نوازے گئے ہیں"
میں نے اخبار دیکھتے ہوئے انھیں مطلع کیا۔
"لقمہ بہ دہانِ سگ انداختن بہ!"

وہ عہدِ اورنگ زیب کے ہزل گو جعفر زٹلی کا یہ مصرع اکثر پڑھتے تھے

چہ عرفی، چہ فیضی، بہ پیشِ تو پھُس

اور لفظ "پھُس" کو اتنا کھینچ کر پڑھتے تھے کہ حاضرین سے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔

"آپ لوگ کیا پئیں گے.... ٹھنڈا یا گرم؟" انھوں نے اپنے مہمانوں سے پوچھا۔
"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں...!" سب نے ایک ساتھ جواب دیا۔
"بس 'کچھ نہیں' کا چلن یہاں نہیں ہے۔ باقی سب کچھ ملتا ہے۔" ان کے اس جواب پر کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

وہ ظریف لکھنوی کا یہ شعر بھی اکثر پڑھتے تھے ؎

انھیں گانے کی عادت بھی ہے اور شوقِ عبادت بھی
نکلتی ہیں دعائیں ان کے منہ سے ٹھمریاں ہو کر

اور "ٹھمریاں ہو کر" ہاتھوں کو جنبش دے کر اس طرح ادا کرتے تھے کہ عجب لطف پیدا ہوتا تھا۔

چند نوجوانوں کے بار بار اصرار کرنے پر انھیں ایک پروگرام کا ٹکٹ پانچ روپے میں خریدنا پڑا۔ لڑکوں کے جانے کے بعد انھوں نے وہ ٹکٹ میری طرف بڑھا دیا۔
"میں یہ کیا کروں گا؟... جب آپ نہیں تشریف لے جائیں گے تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔"

"ڈھائی میں کوئی لے تو دے دیجیے گا۔" انھوں نے بڑے رازدارانہ انداز میں سمجھایا۔

"موت کو وہ وہ ڈاج دیے ہیں کہ وہ بھی یاد رکھے گی!" وہ اپنی موت کا ذکر چھیڑ کر بھی مسکرایا کرتے تھے۔

"عمر نے آپ کو زندگی کرنے کا فن سکھا دیا ہے؟"
مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا ؎

شیوۂ رندان بے پروا خرام از من مپرس
این قدر دانم کہ دشوار است آسان زیستن

فخریہ کہتے تھے: "میر کے گھر میں آج تک کوئی نہیں داخل ہوا ..... سب سے پہلے میں داخل ہوا ہوں ...... السلام علیکم میر صاحب!"

ہریندر ناتھ چٹوپادھیائے نے بڑھاپے میں دوسری شادی کر لی۔ خبر سن کر مسکراتے ہوئے فرمایا:
"زندگی کو عذاب سمجھتے ہیں۔"!

پرانے وقتوں کی ہیروئن کجن بائی کی والدہ کی باتیں یاد کر کے بہت محظوظ ہوتے تھے۔
"فلاں چیز اتنی زیادہ .... جیسے کجن کے عاشق!"

مدیر "گگن" کا خیال آتے ہی رگ پھڑک اٹھتی تھی۔
"شمس کنول کے دماغ میں بھی موچ ہے..... اپنے نام کے ساتھ کنول ...... رسالے کا نام "آسمان" کی جگہ "گگن"...... "صحیح" کی جگہ "صحی"......!"

آہ صاحب کے کردار کی سب سے بڑی کمزوری ان کی اشتہ

انگیزی تھی۔ وہ اپنے نظریات کے سلسلے میں فطرتاً انتہا پسند واقع ہوئے تھے۔ اس کمزوری کی وجہ سے انھوں نے زندگی میں شدید نقصانات بھی اٹھائے تھے۔

"جوش کوئی شاعر ہیں۔؟ وہ تو بینڈ ماسٹر ہیں ——!"
جگر مرادآبادی نے صابوصدیق پالی ٹکنک بمبئی کے مشاعرے میں ان سے کہا۔
"آپ جوش کو بینڈ ماسٹر کہتے ہیں، لیکن لوگ آپ کو قوال سمجھتے ہیں۔!" انھوں نے برافروختہ ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ کچھ نہیں بھیجتے۔؟" "دھرم یگ" کے ایڈیٹر بھارتی نے ان سے شکایت کی۔
"بھئی میں ہندی بھول گیا۔"!
"نہیں صاحب!" بھارتی نے حیرت کا اظہار کیا۔
"ہاں بھئی ..... آپ لوگ اُردو بھول گئے۔ میں ہندی بھول گیا۔!"

"امیر خسرو پر محمود شیرانی کی تھیسس بہت اچھی ہے۔ مگر جی نہیں بھرا......!" عرشی صاحب نے کسی موقع پر کہا۔
"بازاری باتیں مت کیجئے ...... صاف کہیے ...... صحیح یا غلط!"

"احتشام صاحب کا گھر کہاں ہے۔؟" لکھنؤ میں مقبرۂ عالیہ گولہ گنج کی پشت پر انھوں نے کسی اجنبی سے پوچھا۔
"کون احتشام صاحب۔؟"
"پروفیسر احتشام حسین صاحب ——!" انھوں نے وضاحت کی۔
"کیا کام کرتے ہیں۔؟"
"حجامت کرتے ہیں!" اب وہ ہتھے سے اُکھڑ گئے تھے۔

مکتبہ جامعہ میں اپنی رُباعی سُنائی جس پر قاضی سلیم نے کوئی اعتراض کر دیا۔ بس بھڑک گئے۔
"رُباعی آپ کو سُنائی کس نے؟ آپ کو اس کا اہل کون سمجھتا ہے"

باقر مہدی کا ذکر چھڑتے ہی بے چین ہو جاتے۔
"باقر مجنوں ہے —— کمینہ نہیں —— بڑی اچھی ہے —— آخر رزم ردولوی کا لڑکا ہے......!"

سڑک پر گزرتے ہوئے ایک غیر ملکی کو دیکھ کر قدرے برہمی سے کہا: "یہ ایک بیوقوف اطالوی (ITALIAN) ہے جو یہاں خدا ڈھونڈھتا پھرتا ہے —— یہاں خدا کہاں بیٹھا ہے"؟

"اُردو کے ناقدوں سے سخت بیزار تھے۔ ہاتھ جھٹک کر کہتے۔
"سرسید سے لے کر —— آل احمد سرور تک —— کسی کے ساتھ میرا ایک منٹ بھی گذر نہیں ہو سکتا۔"!

فروری ۱۹۸۰ء —— گنیش پوری میں ان کے ساتھ آخری قیام کمرے میں کرشنا مورتی کی تصویر بدستور آویزاں ہے۔ اسرار فاطمہ کی تصویر ہٹا دی گئی ہے —— رسائل کے ذخیرے کو پہلے ہی میرے حوالے کر چکے تھے —— اب مشاہیر ادب کے خطوط ہیں جن میں جوش کے خط گپتا رضا لے گئے —— ادیب صاحب کے خط رخصت ہونے سے پہلے ان کی درخواست پر میں نے الگ کر دیے ہیں —— بقیہ خطوط انھوں نے سفید پلاسٹک کے ایک بڑے سے تھیلے میں بند کر کے اس پر میرے نام کی چپٹی لگا دی ہے
ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وصیت کرتے ہیں: ——
"میں مر جاؤں تو برہما پربت پر دفن کر دیجئے۔!"
ہمیشہ کی طرح میں اس بار بھی چپ ہوں ——!
گنیش پوری سے واپس لوٹتے وقت میں ہمیشہ سوچتا ہوں —— شاید یہ آخری ملاقات ہو —— اور ہر بار میرا خیال غلط

ثابت ہوتا ہے۔ اس مرتبہ کبھی میں یہی سوچ رہا ہوں۔ شاید یہ آخری ملاقات ہو۔ شاید۔ شاید۔ اچانک میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے اور گلا سوکھ جاتا ہے۔

۱۵ رجولائی ۱۹۸۰ء ــــ بابو بھائی کو بلاکر کہتے ہیں، اب میرا سفر آخرت ہے۔ میرا وقت پورا ہوگیا۔ جیوتش ودیا بتاتی ہے کہ اب میں پندرہ دن سے زیادہ زندہ نہیں رہوں گا ــــ بابو بھائی نے ہنس کر ٹال دیا۔ سنی ان سنی کر دی ــــ چودہ دن حسب معمول بیت گئے ــــ ۲۸ اور ۲۹ رجولائی کی درمیانی شب میں ــــ رات بھر کمرے کی بتی جلتی بجھتی رہی، بے ہنگم اور اکھڑی ہوئی سانسوں کی آواز آتی رہی۔ متصل کمرے میں مقیم کانسٹبل تیرتھے کے چھوٹے بھائی کو کئی بار آواز دی۔ اس کی آنکھ بھی کھلی، لیکن اس نے سوچا نیند میں اکثر بڑبڑانے کی عادت ہے ــــ تیرتھے ڈیوٹی پر، اس کی بیوی اپنے میکے میں ــــ صبح ہوگئی دودھ والا آیا آواز دے کر واپس لوٹ گیا، دروازہ نہیں کھلا۔ صفائی والی دروازہ پیٹ کر واپس لوٹ گئی، دروازہ نہیں کھلا ــــ دن چڑھ گیا، دس بجنے کو آئے پڑوسیوں کا ماتھا ٹھنکا، اوسان خطا ہوئے۔ بابو بھائی کو مطلع کیا گیا، پولیس کی مدد لی گئی ــــ دروازہ کھولا گیا ــــ جان جان آفریں کے سپرد کر چکے تھے ــــ بابو بھائی سے اپنی موت کے بارے میں جو پیشین گوئی کی تھی وہ من وعن سچ نکلی ــــ آخر گیانی تھے، عالم تھے، یوگی تھے۔!

سرہانے سرپرستوں اور احباب کے نام کی ایک طویل فہرست ان کے فون نمبر کے ساتھ ہمیشہ لٹکی رہتی تھی ــــ بابو بھائی نے بمبئی یکے بعد دیگرے ۲۲ ٹرنک کال کیے ــــ مہاپولی جاکر مولوی بلا لائے ــــ دھرشوری اور مضافات میں، جہاں ٹکڑیوں میں میمن اور کوکنی آباد ہیں، اپنے مسلمان دوستوں کو مطلع کیا ــــ جو لوگ بمبئی سے جنازے میں شرکت کرنے پہنچ سکے ان میں راجندر سنگھ بیدی، مجروح سلطانپوری، اندر راج آنند، علی رضا، نمی، چترا، ساحرہ، منور سلطانہ اور آرٹسٹ مسز شمیم رائے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

گنیش پوری میں بینک آف بڑودہ کے سامنے سڑک کے اس پار، تقریباً سو گز کے فاصلے پر، ایک گمنام پیر کے شکستہ مزار کے پاس ۲۹ رجولائی ۱۹۸۰ء کی شام کو مجسم علم دفن ہوگیا، ایک زندہ اور متحرک شخصیت منوں مٹی کے نیچے دب گئی، اردو ادب کا ایک زریں عہد ختم ہوگیا۔

اور اب آنے والا وقت سنتا کے الفاظ کی تصدیق کرے گا:-

"LIFE LEVELS ALL MEN.. DEATH
REVEALS THE EMINENT."

موت بھی ایسی جس پہ تاریخ رشک کرے گی۔ شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، دنیا دیا فیہا سے الگ تھے، لیکن شخصیت میں تشیع کی بو باس تھی ــــ خوبی قسمت، نماز جنازہ اہل سنت نے اپنے مسلک کے مطابق ادا کی ــــ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور کتنے ہی مقامی آدی واسیوں نے آخری رسوم میں شرکت کی۔ انسانی بھائی چارے اور قومی یک جہتی کی اس سے زیادہ روشن اور تابناک مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔!

۱۴ اور ۱۵ رنومبر ۱۹۸۰ء ــــ قبر پر چھوٹی چھوٹی سیاہ کنکریاں بچھا دی گئی ہیں۔ چاروں طرف پتھروں کے بڑے بڑے ٹکڑے شاید قبر کی شناخت کے لیے ڈال دیے گئے ہیں ــــ حد نظر تک پھیلے ہوئے پہاڑ ــــ مبہوت اور حیران ــــ اونچے اونچے درخت ــــ خاموش اور سرنگوں ــــ نہ جانے کیوں مجھے وہ سلگتی ہوئی دوپہر یاد آرہی ہے جب بمبئی سنٹرل پر انھیں الوداع کہہ کے میں ایروز میں فلم FAREWELL FRIEND دیکھنے چلا گیا تھا

موہن فوٹوگرافر اور جان صاحب، جن کے نزدیک آہ صاحب کوئی اولیا یا پیر تھے، اکثر شام کے وقت قبر پر شمع روشن کر جاتے ہیں ــــ اور ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر ــــ کمرے میں تالا بند ہے ــــ نہ بتیاں جلتی ہیں نہ بجھتی ہیں، نہ کھٹ پٹ کی آواز، نہ کھانسنے ڈکارنے کی، نہ قہقہے، نہ برہمی، نہ کنڈلیاں نہ زائچے، نہ ادب نہ شاعری، نہ فلم، نہ ڈرامہ، نہ بچوں سے چہلیں، نہ تالی بجانے کی آواز ــــ بس ایک حزن آلود فضا، ایک بے پایاں سکوت ع

مجنوں جو مر گیا۔ ہے تو جنگل اداس سا ہے

ایک سماجی نظم

تحفۂ کردگار ہے لڑکی

علیم مختار مبارکپوری
محلہ پرانی بستی
ڈاک خانہ مبارک پور
اعظم گڑھ

کوئی لڑکی جو ہوتی ہے پیدا　　پھیل جاتا ہے گھر میں سناٹا
سانپ سینے پہ لوٹ جاتا ہے　　ہوش رہتے نہیں کسی کے بجا
سوگ جیسا سکوت ہوتا ہے　　شاد رہتا نہیں کوئی چہرا
ذکر ہوتا ہے رات دن گھر میں　　نامرادی کا، بدشگونی کا
گودیاں سب کی تنگ ہوتی ہیں　　حیف ایسا نصیب لڑکی کا

کس قدر نا صبور ہے انساں
کچھ نہیں پاس مرضیٔ رب کا

لوگ کہتے ہیں "لڑکی نعمت ہے"　　جھوٹ ہے جھوٹ! اُن کا یہ کہنا
اک فریب خیال ہے یہ تو　　اس میں کیا شائبہ حقیقت کا
دیکھ کر ماں کی گود میں اس کو　　کون کرتا ہے شکر کا سجدہ
جو سلوک اس کے ساتھ ہوتا ہے　　اس سے محسوس ہوتا ہے ایسا
گھر میں وہ سر بسر مصیبت ہے　　بار، گویا وجود ہے اس کا
پالنا لاڈ، پیار سے اس کو　　واقعی ہے خسارے کا سودا
اس کی دلجوئی کیوں کرے کوئی　　وہ سہارا نہیں بڑھاپے کا
تربیت اس کی کیوں کرے کوئی　　اس میں کچھ فائدہ نہیں اپنا
خانہ داری کے سیکھ کر انداز　　گھر سنوارے گی وہ پرائے کا
لیکن اس طرح سوچتا ہے وہی　　جس نے گہرائی سے نہیں سوچا

تحفۂ کردگار ہے لڑکی
کاش انسان یہ سمجھ سکتا

وہ محبت کا ایک پیکر ہے　　اس کی ہے ہر ادا وفا پیشہ
دیدہ و دل کا وہ اُجالا ہے　　واقعی وہ جگر کا ہے ٹکڑا
جس کے گھر میں وہ جنم لیتی ہے　　اس پہ کھلتا ہے باب رحمت کا
گوہر معدن حیات ہے وہ　　اس کا بے حد بلند ہے رُتبہ
آدمیت کی آبرو ہے وہ　　ختم ہے اس پہ نعمت عظمیٰ
اُس کے دم سے ہیں رونقیں ساری　　اس کی ہر سانس ہے گرانمایہ
وہ نہ ہوتی اگر شریک کار　　گھر کا ہوتا کچھ اور ہی نقشہ
پاؤں اس کے کبھی نہیں تھکتے　　شاق ہوتا ہے اس کو دم لینا
جب اُٹھاتی ہے ہاتھ میں جاروب　　گھر کو کر دیتی ہے وہ آئینہ
وہ ہمہ وقت رہتی ہے مصروف　　اس کو فرصت نہیں کسی لمحہ
کم سنی میں بھی وہ اٹھاتی ہے　　دوش پر بار گھر گرہستی کا
اپنے ہر فرض کو سمجھتی ہے　　جانتی ہے ہر ایک کا رتبہ
جب صدا دو تو ایسے آتی ہے　　جیسے باد نسیم کا جھونکا
فکر میں رات بھر نہیں سوتی　　دیکھتی ہے جو ماں کو افسردہ
کوئی آفت جو گھر پہ آتی ہے　　آنسوؤں کا بہاتی ہے دریا
گھر میں ہوتا ہے جب کوئی بیمار　　رات کی رات مانگتی ہے دُعا
درد مندی ہے اس کی فطرت میں　　دل میں رکھتی ہے خیر کا جذبہ
مانگتی ہے جو ماں ذرا پانی　　لے کے فی الفور آتی ہے کوزہ
ماں پہ ایسے نثار رہتی ہے　　شمع پہ جیسے کوئی پروانہ
کچھ جو ملتی ہے کام سے فرصت　　یاد کرتی ہے وہ سبق اپنا
پڑھنے لکھنے میں غرق رہتی ہے　　یہی ہوتا ہے مشغلہ اس کا
نسبت رکھتی ہے ہنر سے بھی　　کرتی ہے احترام ہر فن کا
روز ہی کچھ نہ کچھ بناتی ہے　　جھالر، فانوس، جھالریں طغری

گڑیاں ایسی کہ دیکھتے رہیے　　کتنا موزوں ہے پیرہن ان کا
کیسے کیسے حسیں کھلونے ہیں　　شیر، خرگوش، فاختہ، مینا
دستکاری ہے یہ کہ جادو ہے　　ابرقوں کا حسین گلدستہ
ننھے ننھے ظروف مٹی کے　　یہ رکابی، گلاس اور گھڑا
ہاتھ میں اس قدر ہے تیز روی　　جیسے کوئی مشین کا پرزہ
انگلیوں میں ہے اتنی مشاقی　　ایک دو دن میں بنتی ہے موزہ
سادہ کپڑوں پہ ایسی گلکاری　　منھ چھپاتا پھرے چمن اپنا

کتنی ذی فہم ہوتی ہے لڑکی
اس کے ہر کھیل میں ہے اک نکتہ

گھر گھروندے دلیل ہیں اسکی　　وہ بناتی ہے گھر کا منصوبہ
خانہ سازی ہے اس کی فطرت میں　　گھر سے ہوتی نہیں وہ بے پروا
دال، چاول، شکر، نمک، گندم　　رکھتی ہے وہ حساب اک اک کا
جانتی سب ہے پھر بھی دلداری　　پوچھ کر ہی پکاتی ہے کھانا
کھا پکا کے جو پاتی ہے فرصت　　آگے دادا کے رکھتی ہے حقہ
مہر و الفت سے کام ہے اس کو　　خوش مزاجی ہے اس کا سرمایہ
مصلحت آشناس ہوتی ہے　　ذہن ہوتا ہے اس کا پاکیزہ

اتنا کچھ کر کے بھی کوئی لڑکی
جھیلتی ہے حیات کا صدمہ

خیر سے جب جواں وہ ہوتی ہے　　پھر تو ہوتا ہے کچھ عجب نقشہ
اس کو ایسا گمان ہوتا ہے　　ہو گیا اس کا کچھ سبک پلّہ
دیکھ کر والدین کے چہرے　　بھانپ لیتی ہے مدعا دل کا
جیسے وہ بار ہو گئی گھر پر　　دل میں ہوتا ہے یہ گماں پیدا
کچھ زباں سے مگر نہیں کہتی　　نامناسب ہے لب کشا ہونا
کتنی مجبور ذات ہے اس کی　　کچھ نہیں صبر کے سوا چارہ

غم سہے اور ٹھوکریں کھائے
اشک پینا نصیب ہے اس کا

ذہن میں جب یہ بات آتی ہے　　غم جدائی کا جھیلنا ہوگا،
سوچ کر ہی وہ کانپ اٹھتی ہے　　چھوٹ جائے گا ساتھ سکھیوں کا
ہائے افسوس! بھائیوں سے بھی　　ٹوٹ جائے گا ایک دن رشتہ

میرے اپنے حسیں کھلونے بھی　　حق وفا کا نہ کر سکیں گے ادا
ہوں گے دیوار و در بھی بیگانے　　دم جو بھرتے ہیں آشنائی کا

کتنی باظرف ہوتی ہے لڑکی
اس کو ہوتا نہیں کسی سے گلا

دیکھ کر ریت ساری دنیا کی　　بھول جاتی ہے رنج و غم اپنا
لوگ شام و سحر چراغ بکف　　ڈھونڈتے ہیں گلی گلی رشتہ
مال و دولت اگر نہیں گھر میں　　اچھا لڑکا کہیں نہیں ملتا
گویا شادی غریب لڑکی کی　　آج ہے جوئے شیر کا لانا
خیر کچھ بھی ہو فرض ہے شادی　　دوسرا تو نہیں کوئی رستہ
اپنے گھر میں جوان لڑکی کو　　عمر بھر کوئی رکھ نہیں سکتا
لاکھ ناز و نعم کی پالی ہو　　پھر بھی سب چاہتے ہیں چھٹکارا

ماں کو ہر وقت فکر رہتی ہے
بوجھ لڑکی سے جلد ہو ہلکا

الغرض وہ گھڑی بھی آتی ہے　　گھر میں ہوتا ہے جشن شادی کا
میہمانوں کی بھیڑ لگتی ہے　　ہفتوں رہتا ہے ایک میلہ سا
پاؤں دھرنے کو بھی کہیں گھر میں　　خالی ملتا نہیں کوئی گوشہ
رشتے ناتے کے لوگ آتے ہیں　　خوب رہتا ہے رات دن ریلا
گیت خوشیوں کے گائے جاتے ہیں　　بجتا رہتا ہے رات دن باجا
رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں　　لیکے بارات آتا ہے دولھا
گونجتی ہے فضا میں شہنائی　　پھوٹتا ہے زمین سے نغمہ
یہ گھڑی بھی عجیب ہوتی ہے　　رقص کرتی ہیں عورتیں کیا کیا
پھلجھڑی چھوٹتی ہے خوشیوں کی　　امڈا پڑتا ہے نور کا دھارا

قہقہہ زار رہتی ہے محفل
رسمیں ہوتی ہیں ایک ایک ادا

صحن میں لوگ بیٹھ جاتے ہیں　　قاضی پڑھتا ہے عقد کا خطبہ
عقد سے جب فراغ ہوتا ہے　　دور چلتا ہے کھانے پینے کا
شغل یہ بھی عجیب ہوتا ہے　　حال ہوتا ہے دیدنی سب کا
کوئی رکھتا ہے ناک پر رومال　　اور کوئی کھجاتا ہے ماتھا
کوئی کہتا ہے روٹیاں لاؤ　　کوئی کہتا ہے بوٹیاں دینا

کوئی کہتا ہے اے مرے بھائی قاب تھوڑا ادھر بھی سرکانا

قورما، شیرمال، بریانی

نعمتیں سب ہیں نام کیا لینا

کچھ بھی ہو لازمی ہے شادی میں سارے باراتیوں کا دل رکھنا

ہاتھ کھینچا ذرا جو خدمت سے ان کو رہ جائے گا سدا شکوہ

اس سے ہر ایک خوف کھاتا ہے لگنے پائے نہ نام پر بٹہ

فکر سب کو یہی تو رہتی ہے کچھ بھی ہو جائے سر نہ ہو نیچا

ساز و سامان کی نمائش بھی اب ہے شادی کا لازمی حصہ

حسب خواہش اگر جہیز نہ ہو ڈوب جاتا ہے دل براتی کا

پوچھتے ہیں سبھی یہ دولھا سے

تم کو سسرال سے ملا کیا کیا

سیکڑوں خوبیاں ہوں لڑکی میں کوئی ان پر نظر نہیں کرتا

کیا حقیقت ہے مال و دولت کی؟ اس سے لڑکی کو تولنا کیسا؟

سیم و زر کی چمک دمک کیسی؟ سب پہ بالا ہے جسم کا رشتہ

قابل قدر ہوتی ہے لڑکی ذات اس کی ہے ارفع و اعلیٰ

وہ تو خود ہی وجود میں اپنے لے کے آتی ہے نسل کا ثمرہ

کوئی شے اس سے بڑھ کے کیا ہوگی ہے اسی پر مدار دنیا کا

اس کے قدموں کے نیچے برکت ہے

اس کے لب پر ہے خلد کا مژدہ

سوچیے اس پہ کیا گذرتی ہے چھوڑتی ہے وہ اپنا جب میکہ

رخصتی اس کی اک قیامت ہے اس کو ڈستا ہے ایک اک لمحہ

اس طرف کس کا دھیان جاتا ہے کس کا بیدار ذہن ہے اتنا؟

جس پہ سو جان سے وہ مرتی تھی وہ مکاں بھی نہ اب رہا اس کا

اپنے میکے سے پیار کرتی ہے موڑ لیتی ہے پھر بھی منھ اپنا

جب دلہن بن کے وہ نکلتی ہے غم سے ہوتی ہے سوگوار فضا

پاؤں رکھتی ہے جب وہ ڈولی میں اس کا قابو میں دل نہیں رہتا

اس کی جانب نظر جب اٹھتی ہے کرتی ہے چیخ چیخ کر گریہ

دیکھ کر بھائی بہنوں کے چہرے ذہن مفلوج ہوتا ہے اس کا

باپ کی سسکیاں جو سنتی ہے غم سے ہوتا ہے دل تہ و بالا

ہوک اٹھتی ہے دل میں رہ رہ کر جب خیال آتا ہے پڑوسی کا

بس یہ لڑکی ہے جو غم فرقت

جھیل جاتی ہے یک و تنہا

جب سمانے میں آتی ہے کچھ دور جانتی ہے حقیقت دنیا

دل سنبھلتا ہے اس حقیقت سے ہے مسافر یہاں کا ہر ذرہ

جب اسے کچھ قرار آتا ہے جائزہ لینے لگتی ہے اپنا

مجھ کو کیا کیا سلیقے آتے ہیں جن سے تعمیر ہو سکے دنیا

کیا کروں گی کہ میرے دم سے کبھی منتشر ہو سکے نہ شیرازہ

کس طرح مجھ کو زندہ رہنا ہے؟ دل کسی کا نہ ہو سکے میلا

اپنی تعمیر شخصیت کے لیے وہ بناتی ہے ذہن میں نقشہ

زندگی کے سنوارنے کا اسے ہونے لگتا ہے حوصلہ پیدا

جب وہ دل میں یہ عہد کرتی ہے میں سجاؤں گی جنت فردا

یاد آتا ہے لفظ لفظ اسے

کہ سن باپ کی وصیت کا

پاؤں رکھنا سنبھال کر بیٹی خار سے ہے بھرا ترا رستہ

خود کو رکھنا حیا کے پردے میں طور اچھا نہیں زمانے کا

ہو نہ جانا حدود سے باہر حلقۂ احتیاط میں رہنا

داغ لگنے نہ پائے دامن پر پاس رکھنا پدر کی عزت کا

حرص ہرگز نہ کرنا دولت کی جاننا اس کو زہر کا پیالہ

لوگ دولت کو آگ کہتے ہیں اس سے دامن کو دور ہی رکھنا

دل میں رکھنا طمع محبت کی بیش از بیش ہے یہ گنجینہ

فاقہ ہو تو جناب زینب سے حوصلہ مانگنا قناعت کا

سارے فتنے یہی جگاتی ہے خواب تک دیکھنا نہ دولت کا

سامنے سیدہ کی سیرت ہو اس سے بہتر نہیں کوئی گہنا

حق تعالیٰ پسند کرتا ہے اشک آلود، غمزدہ چہرا

سختیاں زندگی میں آئیں گی لیکن ان سے کبھی نہ گھبرانا

نیک اعمال سے رہے یاری ان سے ہرگز نہ توڑنا رشتہ

لاکھ پر خاش ہو زمانے کو تم کسی سے نہ دشمنی رکھنا

سرگرانی رہے، کہ غصہ ہو اپنے ایثار سے نہ باز آنا

بیٹی کا فرض جو ہوئے رشتے میں — اس کے اوپر بھی پھول برسانا
حسنِ اخلاق اک بڑی شے ہے — منفعت کا نہیں ہے کفّارہ
اپنے پلّو میں باندھ لو بیٹی — تم کو تحفہ ہے یہ نصیحت کا
دیکھو اونچی نہ ہو کبھی آواز — اپنے بس میں زبان کو رکھنا
اور بیٹی یہ بات بھی سُن لو — صبر سے کوئی پھل نہیں میٹھا

کھوٹ رکھا دا اپنے دل میں اگر
بال بیکا کبھی نہیں ہوگا

باپ کی بات دل میں دُہراتی — طے وہ کرتی ہے راستہ اپنا
جز غم و یاس اس کے سینے میں — ہے اگر کچھ تو بس غمِ فردا
اب اُجالے کو آنکھ ترسے گی — چھا گئی رات، دن ہوا پورا
جب خسارہ لکھا ہو قسمت میں — نفع پھر زندگی میں کیا ہوگا
اپنی دولت نہ اپنی پونجی ہے — غیر کا سب ہے، کچھ نہیں اپنا
دور منزل ہے راستہ دشوار — اور کچھ ساتھ میں نہیں توشہ
لے چلی ہے ہوا سفینے کو — حق تعالیٰ ہے ناخدا اپنا
جسم کو جس نے رُوح بخشی ہے — ہے نگہبان بھی وہی اس کا

راستے گو کہ پُر خطر ہیں مگر
ہوں ارادے قوی تو کیا خطرہ

جب دلہن بن کے وہ نئے گھر میں — پاؤں رکھتی ہے لے کے نامِ خدا
دیکھتی ہے وہ اجنبی چہرے — اس کو ملتی ہے اک نئی دُنیا
کیسے کیسے خیال آتے ہیں — دل میں ہوتے ہیں وسوسے پیدا
ذہن میں ناچتے ہیں اندیشے — سوچتی ہے مآلِ زیست اپنا
رفتہ رفتہ مگر اٹھاتی ہے — ایک اک بار اس نئے گھر کا
سب کے دل کو ٹٹولتی ہے وہ — جانچتی ہے مزاج اک اک کا
ساس کرتی ہے جب نظر اس پر — بھیگ جاتا ہے خوف سے ماتھا
امتحاں گاہ ہوتی ہے سسرال — سچ ہے اہلِ نظر کا یہ کہنا
اب وہ آزادیاں کہاں اس کی — اب تو ہے ہر قدم پہ اک پہرا
گھر سے باہر نکل نہیں سکتی — کھنچ گیا اس کے گرد اک حلقہ
بات بھی سب سے کر نہیں سکتی — کھل کے ہنسنا بھی جرم ہے اس کا
آ کے سسرال، ہو گئی محکوم — شاہزادی سمجھتا تھا میکہ

اب کسی چیز پر نہیں قابو
اب تو ہر شے سے اٹھ گیا قبضہ

ہو گئے ترک مشغلے سارے — بجھ گیا اس کے شوق کا شعلہ
بے نیازی کی عمر ہے لیکن — ہو گئی ہے ابھی سے سنجیدہ
کام دیکھو تو ہے بڑی بوڑھی — سن کو دیکھو تو ہے لڑکپن کا
اس کو فرصت کہاں ہے اب اتنی — اب تو اس کو ہے گوندھنا آٹا
کپڑے دھوتی ہے پانی بھرتی ہے — اس کے ذمہ ہے رات دن دھندا
اپنے شوہر کا دھیان رکھتی ہے — دل میں خدمت کا آنا ہے جذبہ
منھ اندھیرے ہی سو کے اٹھتی ہے — ہو گیا خواب نیند بھر سونا
اپنے گھر کو سنوارنے کے لیے — جھیلتی ہے مشقتیں کیا کیا
کب وہ ہوتی ہے کام سے غافل — ہر گھڑی رہتی ہے کمر بستہ
اس کا شیوہ ہے نرم گفتاری — تلخ ہوتا نہیں کوئی فقرہ
سب کی کرتی ہے ناز برداری — پھر بھی رہتا ہے ساس کو شکوہ
سنتی رہتی ہے جھڑکیاں پہروں — کام اس سے اگر کوئی بگڑا
کوئی غصے سے دیکھتا ہے اگر — بہہ نکلتا ہے آنکھ سے دریا
دکھ سے اس کو کبھی نجات نہیں — صورتِ شمع ہے اسے جلنا
احتجاجاً اگر زباں کھولے — حرف آئے زباں درازی کا
ہو گئی بوجھ زندگی اس کی — فکر نے ہر طرف سے آگھیرا
ہر گھڑی فکر ہے، تردد ہے — ہو گیا زرد پھول سا چہرا
حیف لڑکی کی یہ زبوں حالی — ہو گئی زیست درد کا نوحہ

کس سے آخر کوئی سوال کرے
ظلم لڑکی پہ تا بکے ہوگا۔؟

جس کی تعظیم کی رسُولوں نے — آج بھی! اس کا پست ہے درجہ
جبکہ وہ آبروئے ہستی ہے — شاد و آباد اس سے ہے دُنیا
وہ نہ ہوتی تو باغِ عالم میں — کیسے آدم کا پھیلتا کنبہ
اس سے باقی ہے نوعِ انسانی — اس سے قائم ہے نظمِ خلقت کا
کیا ستم ہے کہ باوجود اس کے — غم اٹھاتی ہے دُخترِ حوّا

غور کا ہے مقام اے مختار
خونچکاں ہے بہت یہ افسانہ

**

ڈاکٹر سلام سندیلوی
امام باڑہ پورب پھاٹک
میاں بازار، گورکھپور

مومن کی شاعری میں کشمکش

"انڈیویجول بیویر" individual Behaviour کے مصنفین نے انسان کی شخصیت کو دو خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی قسم کے انسان مضبوط شخصیت Edequate Personality کے مالک ہوتے ہیں اور دوسری قسم کے انسان کمزور شخصیت Inadequate Personality کے حامل ہوتے ہیں۔[1]

شخصیت کی جانچ کا طریقہ ماسلو (Maslow) نے ایجاد کیا ہے۔ وہ انسان کی حرکات و سکنات کے مشاہدے پر زور دیتا ہے اور ماہر نفسیات کو مشورہ دیتا ہے کہ اس قسم کے مشاہدات کے بعد وہ یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ کوئی انسان مضبوط شخصیت کا مالک ہے یا کمزور شخصیت کا حامل ہے۔ مضبوط شخصیت کے انسان فطری طور پر پختہ اور مستحکم ارادوں کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ اپنی قوت ارادی کے بل پر قدم قدم پر کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کو اطمینان اور سکون کے پھولوں سے سجاتے ہیں، ان کے دامن حیات سے شگفتگی اور آسودگی کی خوشبو اڑتی رہتی ہے۔ ان کو آفاق کے اس کارگہ شیشہ گری میں ہر طرف امید کی صورتیں نظر آتی ہیں۔

مضبوط شخصیت کے انسانوں کے دوش بدوش کمزور شخصیت کے افراد بھی اس دنیا میں نظر آتے ہیں۔ دراصل وہ فطری طور پر کچھ کمزور اور حساس ہوتے ہیں اس لیے وہ آلام روزگار کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں۔ ان کے لیے بعض اوقات معمولی چیز خطرے کا باعث بن جاتی ہے۔ وہ کاہ کو کوہ اور میخ کو تیغ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ایسے اشخاص زیادہ تر کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

دراصل ہم دنیا کے سارے انسانوں کو شخصیت کے اعتبار سے سخت گیری کے ساتھ الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کر سکتے ہیں۔ اس کا امکان ہے کہ بعض وقت مضبوط شخصیت کا انسان کسی مخصوص خطرے کا مقابلہ نہ کر سکے اور اپنے مقصد میں ناکام ثابت ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی کمزور شخصیت کا فرد کسی مخصوص موقع پر کامیابی کے جوہر دکھا جائے اور سرخ روئی حاصل کر لے۔ مگر عام طور سے مضبوط شخصیت اور کمزور شخصیت کے انسانوں کی خصوصیات کسی نہ کسی حد تک جداگانہ ہوتی ہیں۔ دراصل جو شخص فطری طور پر جتنا کمزور واقع ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ کشمکش میں مبتلا ہوگا۔

"سائیکالوجی" کے مصنفین نے کشمکش (Conflict) کی مختلف شکلیں پیش کی ہیں۔ کشمکش کی پہلی شکل وہ ہے جس کو (Approach Approach Conflict) کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ دو اشیا ایک ہی طرح دلکش نظر آتی ہوں اور انسان کے لیے یہ بات دشوار نظر آئے کہ وہ کس شے کا انتخاب کرے۔ ایسی صورت میں انسان کے دماغ میں کشمکش پیدا ہوگی۔ کشمکش کی دوسری شکل کو (Avoidance Avoidance Conflict) کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کے سامنے دو اشیا یکساں خطرناک ہیں۔ اب اس کو ان دو اشیا میں سے کسی ایک شے سے گریز کرنا ہے۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ وہ کس شے سے گریز اختیار کرے۔ یہی مسئلہ انتخاب اس کے دماغ میں کشمکش پیدا کر دے گا۔ کشمکش کی

بڑی شکل کو Approach Avoidance Canflict کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ایسی کشمکش میں ایک چیز بہت دلکش آتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ چیز مضر بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ کشمکش کی پیچیدہ شکل ہے۔ ایسے موقع پر انسان کے دماغ میں کشمکش زیادہ پریشان کن صورت اختیار کر لیتی ہے۔[۱۵]

چونکہ شعرا حساس زیادہ ہوتے ہیں اس لیے وہ عام انسانوں کی بہ نسبت کشمکش میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں۔ اردو شعرا میں میر، غالب، مومن، آتش، فانی اور یگانہ چنگیزی وغیرہ کے یہاں کشمکش کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اس موقع پر مومن کی کشمکش کے اسباب پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

مومن ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دادا حکیم نامدار خاں کشمیر کے شرفا میں شمار کیے جاتے تھے۔ وہ سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں دہلی آگئے تھے اور شاہی طبیب مقرر کیے گئے تھے۔ ان کو شاہ عالم کے عہد میں پرگنہ نارنول موضع بلاہ میں جاگیر بخش دی گئی تھی۔ یہ جاگیر حکیم نامدار خاں کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے حکیم غلام نبی خاں کو مل گئی۔ جب انگریزی حکومت قائم ہوئی تو نارنول کا پرگنہ جھجّر کی ریاست میں شامل ہو گیا، جس کے مالک نواب فیض طلب خاں تھے انھوں نے ان حکیموں کی جائداد ضبط کر لی، اور ایک ہزار روپیہ سالانہ حکیم نامدار کے ورثا کو مقرر کر دیا۔ اسی پنشن کا کچھ حصہ مومن کو ملتا تھا

مومن نے بہ حیثیت طبیب دہلی میں کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ دہلی کے شرفا ان سے علاج کراتے تھے۔ ان کے مریضوں میں مختلف طبقے کے لوگ ہوتے تھے۔ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی علاج کے لیے ان کی طرف رجوع ہوتی تھیں، اس لیے دہلی میں مومن کا ایک وقار قائم تھا۔

حکیم مومن خاں کو نجوم میں زبردست دخل تھا۔ ان کی پیشین گوئیوں کے سامنے بڑے بڑے منجم دم بخود رہ جاتے تھے، اس لیے ان کے معتقدین کی تعداد بھی کافی تھی۔ اس لحاظ سے بھی مومن کو بڑی عزت حاصل تھی۔

مومن اپنے عہد کے اعلا درجے کے شاعر تھے۔ وہ اپنی لیاقت اور صلاحیت کے سامنے سب کو ہیچ و حقیر سمجھتے تھے۔ حد یہ ہے کہ گلستانِ سعدی کو بھی وہ ایک معمولی کتاب تصور کرتے تھے۔ مومن کا قول تھا کہ اس میں ہے کیا۔؟ "گفت گفت، گفتہ اند" کہتا چلا جاتا ہے۔ وہ غالب اور ذوق کے کلام کا مضحکہ اڑاتے تھے۔ مومن کو تاریخ گوئی میں ملکہ حاصل تھا۔

مومن موسیقی میں بھی ماہر تھے، خصوصاً بین بہت اچھی بجاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مومن کے انتقال کے بعد نظیر بین نواز نے بین اٹھا کر رکھ دی اور کہا کہ اب اس فن کا کوئی قدر دان نہیں رہا۔

ان تمام خصوصیات کے ساتھ ہی مومن کا رجحان مذہب کی طرف بھی تھا۔ انھوں نے نوجوانی ہی میں مولوی سیّد احمد بریلوی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ مولوی سید احمد بریلوی نے شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے تعلیم حاصل کی تھی۔ انھوں نے فرقہ وہابیہ کی بنیاد ڈالی تھی، ان میں مذہبی جوش و خروش حد سے زیادہ تھا۔ مومن نے ایک "مثنوی جہادیہ" نظم کی۔ اسی مثنوی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مومن پر مذہب بہت غالب تھا۔

ایک طرف تو مومن کا وقار، نسلی برتری، طبابت میں مہارت، علم نجوم پر عبور، شاعری میں کمال، موسیقی میں ملکہ اور مذہبی رجحان کی بنا پر قائم تھا، دوسری طرف مومن فطرتاً عاشق مزاج تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ حد درجہ حسین تھے۔ مومن کا حلیہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے سنہ ۱۲۶۱ھ میں "دہلی کا ایک مشاعرہ" میں یوں بیان کیا ہے:

"حکیم مومن خاں کی عمر تقریباً چالیس سال کی تھی، کشیدہ قامت تھے۔ سرخ و سپید رنگ تھا جس میں سبزی جھلکتی تھی۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں، کھنچی ہوئی بھنویں، لمبی ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، ان پر پان کا لاکھا جما ہوا، مسّی آلودہ دانت، ہلکی ہلکی مونچھیں، خشخشی داڑھی، بھرے بھرے بازو، پتلی کمر، چوڑا سینہ، لمبی لمبی انگلیاں، گھونگھر والے بال، زلفیں پشت پر اور شانوں پر بکھری ہیں۔ کچھ کٹیں پیشانی کے دونوں طرف کاکلوں کی شکل رکھتی ہیں۔ کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑ کر

زلفیں بنا لیا تھا، بدن پر شربتی ململ کا چولی کا انگرکھا لیکن اس کے نیچے کرتہ نہ تھا، اور جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ، اس میں چھوٹا سا سنہری تعویذ، کاکریزی رنگ کے ڈوپٹے کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیا تھا اور اس کے دونوں سرے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خاردست، پاؤں میں سرخ گلبدن کا پاجامہ، مہریوں پر سے تنگ اور اوپر جا کر کسی قدر ڈھیلا۔ کبھی کبھی ایک برکا پائجامہ بھی پہنتے تھے مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہی ہوتا تھا۔ جوڑا سرخ نیفہ، انگرکھے کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئی کبھی لٹکتی رہتی تھیں اور کبھی الٹ چڑھا لیتے تھے۔ سر پر گلشن کی بڑی دوپلڑی ٹوپی۔ اس کے کناروں پر باریک لیس، ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈھ کر آ گئی تھی۔ اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے۔"[۵۳]

مرزا فرحت اللہ بیگ کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مومن ایک خوبصورت انسان تھے، اس کے ساتھ ہی عاشق مزاج بھی تھے، اس لیے وہ مختلف عورتوں سے عشق کرتے تھے۔ اس کا امکان ہے کہ ان کے حسن پر عورتیں خود بھی فریفتہ ہو جاتی ہوں۔

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مومن کے عشق کے بارے میں لکھتے ہیں،

"آدمی بہت خوبصورت، خوش وضع اور عاشق مزاج تھے۔ عشق بازی کے لیے دلی ایسا وسیع شہر پایا تھا جہاں ان کے عشق و محبت کے افسانے لوگوں کے زبان زد تھے۔"[۵۴]

مومن کو امۃ الفاطمہ بیگم عرف صاحب جی سے بھی عشق تھا، اس کا ذکر نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے "گلشن بے خار" میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"صاحب تخلص، نامش امۃ الفاطمہ بیگم مشہور بہ صاحب جی کہ ماہِ آسمان نکوئی است، آفتاب صفت از مشرق بجانب مغرب آمد۔ بہ تقریب مداوا با مومن خاں کارش افتاد۔ ماہے چند کارہا در رد و دوا بود۔ سالہا است باز بہ لکھنؤ رفت۔ مثنوی "قول غمیں" نام کہ از مصنفات خان معزی الیہ است شرح نسخۂ حسن و جمال ہماں موزوں قد است۔ القصہ بہ فیض صحبت شاں دل بہ شعر و شاعری میل کرد۔ از موزونیِ قامت بہ موزونیِ طبع گرائیدہ و از آرائشِ زلفِ پریشاں موشگافیِ اشعارِ پیچیدہ ازوست۔"[۵۵]

اس واقعہ سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ مومن خاں عاشق مزاج تھے۔ مگر دوسری طرف مذہبی انسان بھی تھے اور دلی کے سماج میں ایک اعلیٰ مرتبہ بھی رکھتے تھے۔ اسی بنا پر وقار اور عشق میں تصادم ہوا۔ مومن اپنے وقار کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اس کے ساتھ ہی کرچہ عشق چھوڑنے پر بھی تیار نہیں تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عشق ہی ان کے لیے مضر تھا اور عشق ہی ان کے لیے پرکشش بھی تھا۔ اس طرح مومن کشمکش میں مبتلا ہوئے۔ دراصل مومن Approach Avoidance Conflict کے اسیر تھے، اس لیے وہ ساری زندگی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہے۔ یہی ذہنی کشمکش ہم کو ان کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے

مومن کی ذہنی کشمکش مندرجہ ذیل شعر میں ملاحظہ فرمائیے ؎

کس صنم سے چھڑا دیا واعظ
لے خدا تجھ سے انتقام مرا

واعظ نے مومن سے ان کے صنم کو چھڑا دیا۔ مومن فطری طور پر ایک عاشق ہیں مگر اس کے ساتھ ہی ان کا رجحان مذہب کی طرف بھی ہے اس لیے جب واعظ نے پند و نصائح کی باتیں کیں تو مومن نے محبوب کو ترک کر دیا۔

مومن نے تقریباً یہی خیال اس شعر میں ظاہر کیا ہے ؎

بے اعتبار ہو گئے ہم ترک عشق سے
از بسکہ پاسِ وعدہ و پیماں نہیں رہا

مومن کے مزاج میں عشق رچ بس گیا ہے اور اس میں ان کو دلکشی محسوس ہوتی ہے مگر کسی بنا پر یہ عشق ان کے لیے مضر ثابت ہو رہا ہے، اس لیے ان کو ترک عشق کرنا پڑا۔ اس شعر سے بھی ذہنی کشمکش

واضح ہوتی ہے۔

مومن نے مجبوراً ترکِ محبت کی ہے، اس کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں ؎

دل کو قلق ہے ترکِ محبت کے بعد بھی
اب آسماں کو شکوۂ بیداد آگیا

مومن نے بدرجۂ مجبوری ترکِ محبت کیا ہے۔ محبت ان کی فطرت میں داخل ہے مگر حالات ناسازگار تھے اس لیے مومن نے محبت کا راستہ چھوڑ دیا۔

مومن کی ذہنی کشمکش کا عکس اس شعر میں بھی نظر آتا ہے ؎

کس پہ مرتے ہو؟ آپ پوچھتے ہیں
مجھے فکرِ جواب نے مارا

یہ بات مثلِ آئینہ روشن ہے کہ مومن کسی پہ مرتے ہیں، کیونکہ یہ ان کی فطرت ہے مگر وہ کس پر مرتے ہیں اس کا جواب دینا ان کے لیے مشکل ہے کیونکہ رازِ عشق کے اظہار سے ان کے وقار کو ضرب پہنچے گا۔

کہہ رہا ہے کون کس سے بے شکیبائی ملا
مجھ کو قسمت سے نصیحت گر بھی سودائی ملا

ناصح کو یہ پتہ چل گیا کہ مومن نے کسی معشوق سے ملاقات کی ہے معشوق سے ملاقات کرنا مومن کی فطرت کے مطابق ہے مگر ناصح پر یہ راز ظاہر ہو گیا۔ یہ غضب ہو گیا۔

مومن کا مندرجہ ذیل شعر واضح طور پر اُن کی ذہنی کش مکش کا غماز ہے ؎

وہ دن گئے کہ لاف و گزافِ جہاد تھا
مومن ہلاکِ خنجرِ نازِ بتاں ہے اب

مومن مولوی سید احمد بریلوی کی تحریکِ جہاد سے متاثر تھے۔ کیونکہ وہ ان کے مُرید تھے۔ یہ تو مومن کی خارجی شخصیت ہے مگر ان کی داخلی شخصیت یہ ہے کہ وہ عاشق مزاج ہیں، اس لیے نازِ بتاں اٹھانا بھی ان کا مسلک ہے۔

مومن کی مجبوریاں اس شعر میں ملاحظہ فرمایئے ؎

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

کوچۂ عشق میں مومن کو بدنامی کا سامنا کرنا پڑا، اس لیے انھوں نے عہد کر لیا کہ اب وہ محبوب سے ملاقات نہیں کریں گے مگر یہ عہد ان کی فطرت کے خلاف تھا، اس لیے وہ اپنی طبیعت سے مجبور ہو گئے اور محبوب سے پھر ملاقات کرنے لگے۔

مومن اپنی ذہنی کش مکش کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

مانے نہ مانے منع طپش ہائے دل کروں
میں غیر تو نہیں کہ تماشائے دل کروں

غیر ہلکی طبیعت کا انسان ہے۔ وہ تماشائے دل کرتا ہے مگر مومن میں خودداری ہے، ان کو اپنے مرتبے کا خیال ہے، اس لیے وہ اپنے دل کو تماشا بنانے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اپنی طپشِ طبیعت کو ظاہر کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ اب چاہے محبوب ان کی محبت کا اعتراف کرے یا نہ کرے

مومن کی بیچارگی کو بھی ملاحظہ فرمایئے ؎

تاثیر صبر میں نہ اثر اضطراب میں
بے چارگی سے جان پڑی کس عذاب میں

مومن اگر صبر کرتے ہیں تب بھی محبوب پر اثر نہیں ہوتا ہے اور اگر مضطرب ہوتے ہیں تب بھی محبوب ان کی طرف مائل نہیں ہوتا ہے۔ پھر آخر کون صورت نکالی جائے جس سے محبوب ملتفت ہو، بہرحال مومن صبر و اضطراب کے درمیان زندگی گزار رہے ہیں۔ مومن فرماتے ہیں ؎

ہجرِ پردہ نشیں میں مرتے ہیں
زندگی پردہ در نہ ہو جائے

مومن پردہ نشین سے محبت کرتے ہیں، ان کی کوشش یہی ہے کہ رازِ عشق ظاہر نہ ہو مگر ایسا ممکن نہیں ہے، کیونکہ عاشق کی زندگی اک روز پردۂ عشق کو چاک کر دے گی

مومن کی ذہنی کش مکش اس شعر سے بھی ظاہر ہے ؎

خدا کی بے نیازی ہائے مومن
ہم ایماں لائے تھے نازِ بتاں سے

مومن جب نازِ بتاں سے تنگ آ گئے تو انھوں نے خدا کی طرف رجوع کیا، مگر خدا بھی بے نیاز ہے۔ یعنی مومن عشقِ بتاں اور عشقِ خدا کے مابین کش مکش کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

مومن کے مندرجہ ذیل شعر سے قطعی طور پر اُن کی ذہنی کشمکش واضح ہوتی ہے ؎

الله ری گمرہی بُت و بُت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

مومن کا فطری ذوق انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ بُت و بُت خانہ کی طرف جائیں مگر وہ ایک مذہبی انسان ہیں اس لیے وہ ایک پارسا کے ساتھ کعبہ کی طرف جا رہے ہیں، ممکن ہے اس شعر میں پارسا کا اشارہ مولوی سید احمد بریلوی کی طرف ہو، اس سے ملتا جلتا مضمون مندرجہ ذیل شعر میں بھی ہے ؎

کیا حضرت مومن کہیں کعبے کو سدھارے
سنسان ہے گھر کس لیے کیوں آج ہے در بند

مومن فرماتے ہیں ؎

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

مومن کو محبوب سے محبت ہے مگر اس کا بھی خدشہ ہے کہ کہیں غیروں پہ راز نہ کھل جائے۔ عشق کرنا مومن کی فطرت میں داخل ہے مگر خاندانی وقار بھی تو کوئی چیز ہے۔ مندرجہ ذیل شعر میں مومن نے اپنا تقویٰ پیش کیا ہے ؎

مومن یہ لافِ الفتِ تقویٰ ہے کیوں مگر
دلّی میں کوئی دشمنِ ایماں نہیں رہا

معلوم ہوتا ہے کہ دلّی میں کوئی ایسا محبوب نہیں رہا، جو ایمان کا دشمن ہو اسی لیے مومن اپنے زہد و تقویٰ کا اعلان کر رہے ہیں۔ اس شعر میں بھی ایک طرف مومن کا دامن مذہب کھینچ رہا ہے دوسری طرف عشق کھینچ رہا ہے۔ خدا اور صنم کے تصورات کا تصادم مندرجہ ذیل شعر میں ملاحظہ فرمایئے ؎

کیوں سُنے عرضِ مضطرب مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

مومن کو صنم سے عشق ہے مگر ان کو عشق کا صلہ نہیں مل رہا ہے اس لیے مومن گلہ کر رہے ہیں کہ عرضِ مضطرب تو خدا آشنا ہے، صنم کیسے سُنے۔ اس شعر میں مومن نے خدا کی برتری کا بھی اعتراف کیا ہے مومن کے مندرجہ ذیل شعر میں بھی خدا اور بُت کا تقابل ملتا ہے ؎

ہم بندگیٔ بُت سے ہوتے نہ کبھی کافر
ہر جائے گر اے مومن موجود خدا ہوتا

مومن کا قول ہے کہ خدا ہر جگہ موجود نہیں ہے اور اگر موجود بھی ہے تو ہرجائی نہیں ہے۔ اس لیے بندگیٔ بُت سے مومن کبھی کافر نہیں ہو سکتا ہے۔ مومن کا قول ہے ؎

جھجکے ہے ترے ملنے کا گھر والوں میں تیرے
اس واسطے چرچا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

مومن کا عشق ظاہر ہو گیا ہے کیونکہ معشوق کے گھر والوں میں اس کا چرچا ہے۔ لیکن اگر مومن علانیہ کہہ دیں کہ عشق کا الزام غلط ہے تو معشوق کے سر سے الزام ہٹ جائے۔ مگر مومن خاموش ہیں، کیونکہ بولنے میں افشائے راز کا خدشہ ہے۔

مومن کے مندرجہ ذیل شعر سے رسوائی کا خدشہ ظاہر ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

ہو گئی گھر میں خبر ہے منع واں جانا ہمیں!
وہ بھی رُسوا ہو خدا جس نے کیا رُسوا ہمیں

اگرچہ مومن عشق میں گرفتار ہیں، تاہم وہ رُسوائی سے ڈرتے ہیں، کیونکہ ہر وقت ان کو اپنے وقار اور مرتبہ کا خیال رہتا ہے۔

مومن کا مندرجہ ذیل شعر ضرب المثل ہو گیا ہے ؎

عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

اگرچہ مومن نے ساری زندگی عشقِ بتاں میں بسر کی تاہم مسلمان ہونے کی فکر دامن گیر رہی۔ یعنی ان کی زندگی اور شاعری میں عشق اور مذہب میں کشمکش جاری ہے۔

مومن کی شاعری مکمل طور سے عشقیہ ہے۔ ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیت نازک خیالی، مضمون آفرینی اور معاملہ بندی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی شاعری میں جا بجا ذہنی کشمکش کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ اسی ذہنی کشمکش کی بنا پر ان کی شاعری میں کہیں کہیں پیچیدگی

(باقی صفحہ [illegible])

[illegible]
اسعد علی روڈ - دھام پور
ضلع بجنور

اُردو زباں ہماری

ہندستاں کی عظمت اُردو زباں ہماری — عالم کی شان و شوکت اُردو زباں ہماری
ہے میر کی بلاغت اُردو زباں ہماری — رنگِ غزل کی ندرت اُردو زباں ہماری
دہلی کی زیب و زینت اُردو زباں ہماری — ہے لکھنوی لطافت اُردو زباں ہماری
خسرو کے اور ولی کے افکار کا خزینہ — گنجینۂ فصاحت اُردو زباں ہماری
خوشبوئے عودِ ہندی عطرِ مشامِ جاں ہے — غالب کی شانِ رفعت اُردو زباں ہماری
ہے ذوق کا تکلم، دردِ نہاں ظفر کا — ہے داغ کی لطافت اُردو زباں ہماری
شعر العجم کا مضموں دیباچۂ فہم و دانش — شبلی کا علم و حکمت اُردو زباں ہماری
ناسخ کے فن کی عظمت، آتش کے دل کی گرمی — سرشار کی ظرافت اُردو زباں ہماری
بانگِ درا کے نغمے تسکینِ روح و دل ہیں — اقبال کی فصاحت اُردو زباں ہماری
وہ داستانِ دلکش سحر البیانِ رنگیں — میر حسن کی عظمت اُردو زباں ہماری
حالی کے سوزِ دل کی تاثیر کا فسانہ — جذبِ خلوصِ حسرت اُردو زباں ہماری
موجِ نسیمِ فرحت چکبست کی سلاست — اک جلوۂ حقیقت اُردو زباں ہماری
تنویرِ آتشِ گل رنگینیٔ تغزل — سوزِ جگر کی عظمت اُردو زباں ہماری
ہے نوح کی روانی، ہے پریم کی کہانی — ہے جوش کی جلالت اُردو زباں ہماری
آلادخوش رستم کی پروردۂ محبت — سیماب کی نفاست اُردو زباں ہماری
عشاق میں ہیں اس کے بیکل، فراق، بیخود — پروردۂ محبت اُردو زباں ہماری

یارب رہے یہ گلشن شاداب اور شگفتہ
حافظ کا ذوقِ فطرت اُردو زباں ہماری

صاحب حیدرآبادی
۲-۲۳-۷۷۴ مغل پورہ نزد ... گھر
حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۲

رباعیات

پھولوں کی مہک شہد کی لذت بس ہے
لبریز لطافت سے مری نس نس ہے
یارب مرے اشعار میں شیرینی دے
جیسے بدنِ خشک میں نے کے رس ہے

بنیاد ہی دُنیا کی ہے راحت کے بغیر
زندہ ہے یہاں کون جراحت کے بغیر
کنجشک و شتر و مایہ کو آب و دانہ
ملتا ہے کہاں سخت مشقت کے بغیر

مجرم ہوں میں ناکردہ گناہی کی طرح
مطعون ہوں اس دور میں شاہی کی طرح
ہیں نورِ بصیرت سے مرے روشن افکار
پیوست ہوں لفظوں میں سیاہی کی طرح

✱✱

ڈاکٹر مظفر حنفی
شعبۂ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی - ۲۵

شاد عارفی کی رُوداد حیات

انیسویں صدی میں رام پور کا مدرسۃ العالیہ ایک مستند درسگاہ تھا جس میں مولوی فضل حق جیسے اساتذہ موجود تھے۔ افغانستان کے علاقہ یاغستان کے قبیلہ ڈوڈال اور منیٹ سے تعلق رکھنے والے خان سید ولی خاں اور بعد ازاں انھیں کے توسط سے ان کے عزیز خان محمد عارف اللہ خاں مذہبی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے رام پور آئے [۱]۔ مدرستہ العالیہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد سید ولی خاں کو اسی مدرسہ میں منطق اور فلسفہ کے مدرس کی حیثیت سے ملازمت مل گئی اور رام پور کے مشہور پٹھان عثمان خاں رزّڑ نے اپنی بیٹی کا نکاح ان کے ساتھ کر دیا۔ عارف اللہ خاں بھی مدرستہ العالیہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ولی خاں کے ساتھ رام پور ہی میں مقیم رہے۔ اُسی زمانے میں نواب علاء الدین احمد خاں والیٔ ریاست لوہارو رام پور آئے اور اپنے ولی عہد کے لیے ایک مولوی کی فرمائش کی۔ نواب کلب علی خاں نے جو اس وقت حکمران رام پور تھے، سید ولی خاں کی سفارش کی اور نواب علاء الدین احمد خاں انھیں اپنے ہمراہ لوہارو لے گئے، جہاں وہ نواب لوہارو کے بچوں کے آتالیق اور پھر قاضی شہر کے منصب پر فائز رہے۔ عارف اللہ خاں بھی ولی خاں کے ساتھ گئے اور لوہارو میں تھانیدار کی حیثیت سے ان کا تقرر بھی ہو گیا۔ آگے چل کر خان سید ولی خاں نے اپنی بڑی صاحبزادی محمد[illegible] بیگم کا عقد عارف اللہ خاں کے ساتھ کر دیا [۲]۔

ریاست لوہارو میں عارف اللہ خاں اور خورشید بیگم کے ان [illegible] کے پیدا ہوئے ۔ سید احمد خاں، سعید احمد خاں اور احمد علی خاں عرف اللہ [۳]۔ ان میں سے آخر الذکر اُردو ادب کے شاد تھے جو والد کے نام کی رعایت سے خود کو شاد عارفی لکھتے تھے [۴]۔

عبادت بریلوی ان کا سنِ پیدائش ۱۹۰۲ء بیان کرتے ہیں [۵] اور خلیل الرحمان اعظمی نے سنہ ۱۹۰۱ء لکھا ہے [۶] لیکن ہر دو حضرات کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

شاد کی تاریخ پیدائش کہیں دستیاب نہیں ہو سکی۔ سنِ پیدائش کے بارے میں بھی ان کے اپنے بیانات متضاد ہیں۔ بعض مقامات پر اپنی والدہ کے حوالے سے سنہ ۱۹۰۳ء کو اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ زیادہ بوڑھا ہونا کوئی پسند نہیں کرتا [۸] اور کہیں اپنے والد کے بیان کردہ سنِ پیدائش سنہ ۱۹۰۰ء کا حوالہ دیتے ہیں۔ میری تحقیق کے مطابق، جو رامپور میں ان کے اعزا اور بچپن کے دوستوں کی تصدیق پر مبنی ہے، ان کا سنِ پیدائش سنہ ۱۹۰۰ء ہے۔ خود شاد عارفی نے جہاں سنہ ۱۹۰۳ء کا ذکر کیا ہے وہاں والدہ کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ وہ زیادہ بوڑھا ہونا پسند نہیں کرتے اور عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ خواتین اپنی اور اپنے بچوں کی عمریں گھٹا کر بتانے کی عادی ہوتی ہیں۔ سنہ ۱۹۰۰ء کی تائید میں شاد کا ایک شعر ملتا ہے:

ز ہے قسمت ترسٹھ سال کا ہو کر کہا میں نے
نومبر سنہ ۶۳ء میں و[illegible] اقبال کا سہرا [۹]

اور نومبر ۱۹۶۲ء کے ایک [illegible]

"اس وقت میری عمر ۶۲ سال ہے [illegible] میری پیدائش ہے اس [illegible] کے ساتھ ساتھ چل رہا

شاد عارفی کی ایک عزیزہ طاہرہ اختر نے بھی اپنے مضمون "شاد عارفی" میں لکھا ہے کہ وہ ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے تھے نیز اپنے والد کی پنشن (۱۹۰۹ء) کے وقت ان کی عمر نو سال تھی۔[۱۳] وصی اقبال کے مضمون "شاد عارفی" سے ایک ملاقات" سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے عشق کا حادثہ شاد کو تیرہ برس کی عمر میں پیش آیا۔[۱۴] اس عشق کے سلسلے میں ان کے خاصے مبتلا ہونے کی شہادتیں ملتی ہیں۔ بیسویں صدی کے تیرہ سال کے لڑکے سے ایسے سنجیدہ عشق کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اگر ان کی عمر کے متنازعہ فیہ تین سال کا فرق مٹا دیا جائے تو یہ عشق سولہ سال کی عمر میں ہوا ہوگا اور یہ قرین قیاس بھی ہے۔ اس طرح شاد عارفی کا سن پیدائش ۱۹۰۰ء ہی طے پاتا ہے۔

۱۹۰۹ء میں عارف اللہ خاں ملازمت سے سبکدوش ہو کر اہل و عیال کے ساتھ رام پور چلے آئے جو شاد عارفی کی ننھیال تھی۔ ان کے پرنانا عثمان علی خاں رئیس رامپور کے مشہور سردار تھے جن کا ذکر "تذکرہ کاملانِ رامپور" میں موجود ہے اور رامپور کا ایک محلہ آج بھی ان کی مناسبت سے گھیر عثمان خاں کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۰۹ء سے ۸ فروری ۱۹۶۴ء یعنی اپنی تاریخ وفات تک شاد عارفی مستقلاً رامپور ہی میں مقیم رہے۔ باپ اور نانا انھیں مولوی بنانا چاہتے تھے، چنانچہ کلام پاک اور عربی صرف و نحو کی کتابیں انھوں نے خود پڑھائیں۔ بعد ازاں شاد کو حکیم غلام حیدر عرف حقی میاں کے مکتب "دبستانِ حیدری" میں داخل کر دیا گیا جہاں انھوں نے اسمٰعیل میرٹھی کی اردو ریڈروں کے علاوہ فارسی کی "گلستاں"، "بوستاں"، "دستورِ صبیان" وغیرہ بھی پڑھیں پھر حکیم یوسف علی خاں نے انھیں "دیوانِ حافظ" اور رامپور کے مشہور حافظ رحیم اللہ نے "سکندر نامہ" اور "شاہنامہ" پڑھایا۔ شاد عارفی انگریزی تعلیم بھی حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن عارف اللہ خاں اس کے خلاف تھے۔ اپنے ماموں کرامت علی خاں (کوتوال رام پور) کی سفارش سے بڑی لے دے کے بعد شاد نے اسٹیٹ ہائی اسکول (حامد اسکول) میں داخلہ لیا۔[۱۲]

گھر پر عارف اللہ خاں نے شاد عارفی اور ان کے بھائیوں کے لیے چھوٹی چھوٹی تلواریں اور ڈھالیں بنوا رکھی تھیں اور تلوار کے ہاتھ سکھاتے تھے۔[۱۳] ۱۹۱۸ء میں دسویں جماعت میں پہنچے تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ بڑے بھائی ناکارہ ثابت ہوئے اس لیے خاندان کا بوجھ اٹھارہ سال کی عمر میں ہی شاد عارفی کے کاندھے پر آ گیا۔ ریاست لوہارو سے عارف اللہ خاں کی پنشن قدرے کم ہو کر والدہ کے نام منتقل ہو گئی کچھ شاد عارفی ٹیوشن وغیرہ سے کما لیتے۔ گھر کا خرچ لشتم پشتم چلنے لگا۔ ان کی تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ البتہ شاد نے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے الہ آباد کے امتحانات "ادیب" اور "منشی" وغیرہ پاس کر کے اور ہندی زبان کے کچھ امتحانات میں بھی کامیابی حاصل کی بلکہ اپنے مختلف خطوط میں شاد عارفی نے ایف۔ اے کا امتحان دینے اور انٹرنس پاس کرنے کے بارے میں جو باتیں کہی ہیں یا عربی سے گہری واقفیت اور سنسکرت ادب کے مطالعہ کا دعویٰ کیا ہے اسے اکبر علی خاں (عرشی زادہ) نے ان کا کمپلکس بتایا ہے۔[۱۵] بقول مولوی منہاج الدین مینائی عربی ادب سے شاد عارفی کی واقفیت، مولوی اعزاز علی دیوبندی کے ترجموں کے ساتھ شائع شدہ سبع معلقات تک محدود تھی۔[۱۶]

شاد عارفی نے اپنے خالہ زاد بھائی عتیق الرحمٰن خاں پر رعب جمانے کے لیے پہلا شعر آٹھ سال کی عمر میں کہا تھا جو حسب ذیل ہے ؎

ہو چکا ہے خیر سے ہشیار تو
اپنے دشمن پر اٹھا تلوار تو

شاعری میں تلوار اٹھانے کا تصور ان کی فطرت ثانیہ بن گیا۔ انگریزی کی پانچویں کلاس میں راز یزدانی ان کے ہم جماعت تھے اور شاعری سے شغف رکھتے تھے۔ اسکول سے باہر کے دوستوں میں علی حسن ماہر بھی شاعری کرتے تھے چنانچہ ان لوگوں کے مقابلے میں شاد عارفی بھی باقاعدگی سے تک بندیاں کرنے لگے۔[۱۸] ساتویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے یہ شوق سنجیدگی اختیار کر گیا۔ سمندِ شوق پر ایک تازیانہ یہ بھی ہوا کہ شاد کے پڑوس میں امیر مینائی کا خاندان رہتا تھا۔ دونوں گھرانوں میں قریبی تعلقات تھے، اس طرح انھیں بچپن ہی سے محمد احمد سرور مینائی کی ادبی محفلوں میں شرکت کے مواقع ملے۔ سرور کے صاحبزادے اکمل
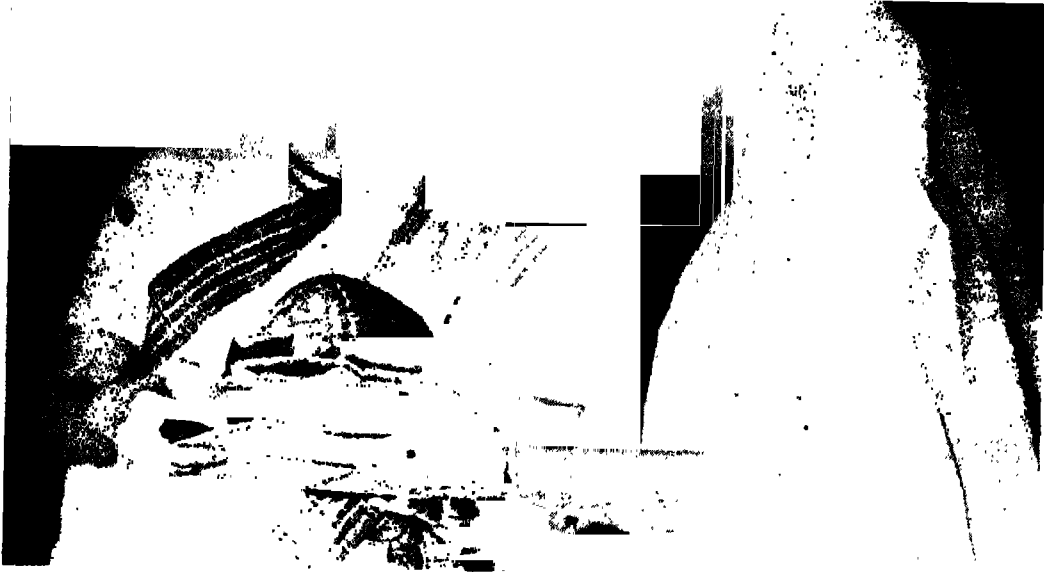
وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی ۱۸ مئی ۱۹۸۳ء کو رویندر الیہ لکھنؤ میں مشہور و معروف
ہندی شاعرہ مہادیوی ورما کو بھارت بھارتی ایوارڈ دیتے ہوئے

وزیر اعلیٰ شری سری پت مشرا انٹرمیڈیٹ اور ہائی اسکول ایجوکیشن بورڈ یو.پی کے
۸۳-۱۹۸۲ء کے امتحان میں اوّلین پوزیشن حاصل کرنے والے طلبا کو انعامات دیتے ہوئے

بمبئی کے مشہور و معروف کلاسیکی گلوکار غلام مصطفےٰ خاں کے فن سے گورنر اتر پردیش شری سی۔ پی۔ این سنگھ

وزیر اعلا شری سری پت مشرا
۱۴؍جون ۱۹۸۳ء کو
ہول باغ ضلع الموڑہ
میں
مربوط دیہی ترقی سے متعلق
کاموں کے لیے
قرض
تقسیم کرتے ہوئے۔

تے ہوئے

وزیراعلا اُترپردیش شری سری پت مشرا ۱۸ جولائی ۱۹۸۳ء کو وِدھان بھون لکھنؤ میں
اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے ۔
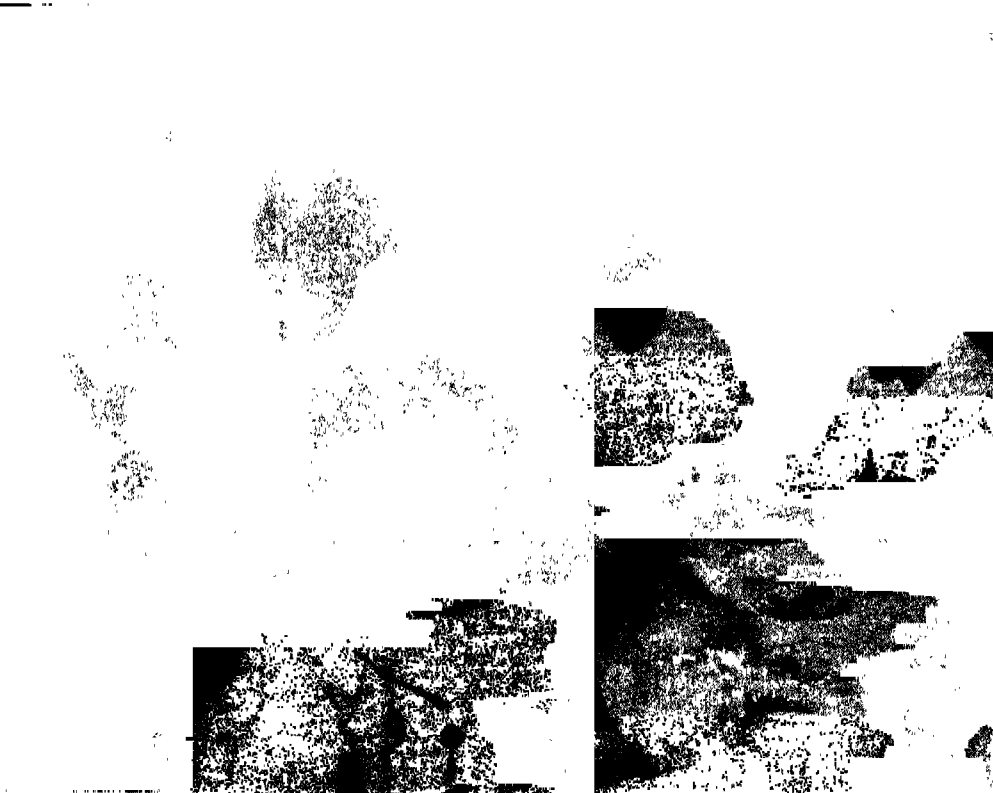
وزیراعلا
شری سری پت مشر
کی رہائش گاہ پر
۱۱ جولائی ۱۹۸۳ء
کو منعقدہ
افطار پارٹی کا ایک منظر
وزیراعلا کے ساتھ
وزیر قومی یک جہتی
ڈاکٹر عمّار رضوی
وزیر ریاست برائے
صنعت شری محمد امین
انصاری اور شری خان
غفران زاہدی ایم ایل اے
بھی نظر آرہے ہیں ۔

وزیر اعلا شری سری پت مشرا
کو سکریٹریٹ انیکسی میں
۹ر جون ۱۹۰۳ء کو
ڈاکٹر جے ڈی شکلا
اخلاقی تعلیم سے متعلق
رپورٹ
پیش کرتے ہوئے

وزیر اعلا شری سری پت مشرا
بزرگ اُردو ادیب اور صحافی
شری امین سلونوی کے انتقال
پر اظہار تعزیت کے لیے اُن کی
رہائش گاہ تشریف لے گئے۔
یہ تصویر اسی موقع کی ہے
جس میں وزیر اعلا امین صاحب
کے صاحبزادے شری حسین امین
اور ان کے بچوں کے ساتھ
نظر آ رہے ہیں۔

وزیر جیل
شری عبدالرحمان خاں نشتر
۱۲ر جون ۱۹۸۳ء کو
آگرہ میں
علاقائی منصوبہ بندی کمیٹی
کے جلسے کی
صدارت کرتے ہوئے

ہے روشنی اور صہبا آغا اور مینا قاضی کی رغبت دلانے والی راہوں نے شاد کے فطری ذوق کو جلا دے کر انھیں سنجیدگی سے شعر و ادب کی طرف مائل کر دیا۔ بعد ازاں اپنے دوست علی حسن طاہر کی رائے سے انھوں نے مولانا شفق رامپوری کی شاگردی اختیار کر لی ہے[18] شفق صاحب صرف غزلوں پر اصلاح دیتے تھے۔ ان سے اصلاح کا یہ سلسلہ تقریباً آٹھ دس سال تک چلا، پھر شفق رامپوری "پیسہ اخبار" میں ملازم ہو کر لاہور چلے گئے۔ اس کے بعد شاد عارفی نے ابوطاہر مجددی کی تحریک سے کچھ غزلوں پر جلیل مانک پوری سے بھی اصلاح لی۔ جلیل سے مشورۂ سخن کا یہ سلسلہ تین سال تک جاری رہا[19] نظموں میں وہ اپنے استاد آپ تھے[20]

شاعری میں اپنی راہ الگ نکالنے کی دھن شاد عارفی کو ابتدا ہی سے تھی۔ والد کے انتقال کے بعد عزیزوں کی لوٹ کھسوٹ نے ان میں بغاوت کا مادہ پیدا کر دیا۔ چنانچہ حقیقت نگاری، ندرت ادا اور طنز کی آمیزش سے لگاتار ایسی تلخ نظمیں اور چونکانے والی غزلیں کہتے رہے جن کے ردِ عمل میں ان کے مخالفین اور حاسدین کی تعداد دن بہ دن بڑھتی گئی۔ اپنی ندرت کی بنا پر رام پور سے باہر بھی ان کی غزلیں اور نظمیں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھیں۔ اس ہندستان گیر شہرت نے ان کے مقامی حاسدین کی تعداد اور بڑھا دی۔

یہ بھی ہوا کہ شاد عارفی نے دو بار عشق کیا اور دونوں مرتبہ ناکامی کا منھ دیکھا۔ پہلا عشق بلوغت سے قبل شروع ہوا اور اس کا سلسلہ دس سال جاری رہا۔ لڑکی ان کے ننہال کی طرف سے دور کی رشتہ دار تھی[21] لیکن خاندانی اعتبار سے ہم مرتبہ نہ تھی، اور شاد عارفی اس گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جہاں ان کے بڑے بھائی ایک ساقط النسب عورت کے ساتھ دوسری شادی کرنے کے جرم میں خاندان سے علاحدہ کر دیے گئے تھے[22] لہٰذا شاد کو اس لڑکی کے ساتھ شادی کی اجازت نہیں مل سکی اور وہ دوسری جگہ بیاہ دی گئی۔ عشق میں اس ناکامی نے ان کے ذہن پر بہت گہرا اثر چھوڑا اور تقریباً تین سال تک ان پر جنونی کیفیت طاری رہی۔ اس کیفیت سے گزر چکنے کے تقریباً تین سال بعد انھیں دوسرا عشق تارا نام کی ایک لڑکی سے ہوا، جس کے پڑوس میں شاد بچوں کو پڑھانے جاتے تھے لیکن یہاں بھی شاد عملاً ناکام رہے کیونکہ مذہب آڑے آتا تھا اور انھیں اس امر کا شدید احساس تھا کہ ان کے کسی غلط قدم سے مسلمانوں پر ہندوؤں کو اعتماد نہ رہے گا۔ اس دوسرے عشق میں ناکامی نے شاد کی رہی سہی سکت چھین لی۔ اب ان کی مایوسیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ طرہ یہ کہ اس دوہرے احساسِ شکست کو تاعمر زندہ و تازہ رکھنے کے لیے شاد کی دونوں محبوبائیں ان کے انتقال تک رامپور ہی میں مقیم رہیں[23]۔

مذکورہ بالا الجھنوں اور پریشانیوں نے کچھ ایسے اثرات قائم کیے کہ شاد عارفی مستقل مزاجی کے ساتھ کہیں ملازمت بھی نہ کر سکے۔ عام طور پر ماتحتوں سے جس خوشامدانہ انداز میں گردن ڈال کر چلنے کی توقع کی جاتی ہے وہ شاد کے بس کی بات نہ تھی۔

"ایک زمانے میں صولت پبلک لائبریری رامپور میں اسسٹنٹ لائبریرین کے فرائض انجام دیے، وہاں مطالعہ کا اچھا خاصا موقع ہاتھ آیا۔ اور یہ مشغلہ ان کے لیے بہت دلچسپ تھا لیکن تنخواہ بہت کم تھی۔ اس کو جلد ہی چھوڑنا پڑا۔"[24] کچھ دنوں مقامی شکر فیکٹری میں اکاؤنٹنٹ رہے پھر مکا مل (میز فیکٹری) میں وِیٹنگ سپروائزری کی۔ وہاں چھوٹے تو ایک بلڈنگ کنسٹرکشن کمپنی میں سائٹ انچارج بنا دیے گئے بعد ازاں رام پور شیر فیکٹری اور سی۔ او۔ ڈی میں لیبر چیکر کی حیثیت سے کام کیا۔ ان کارخانوں میں کام کرنے کی مجموعی مدت تقریباً پندرہ سال ہے[25] اس کے بعد فیکٹریوں کی ملازمت کا سلسلہ ترک کر کے انھوں نے رامپور میونسپل بورڈ میں ٹیکس کلرک کی حیثیت سے ملازمت شروع کی لیکن وہاں بھی زیادہ عرصہ تک نہ ٹک سکے۔ پھر ناصر مسعود، پبلک انفارمیشن آفیسر رام پور کی فرمائش پر انھوں نے نیم سرکاری ہفتہ وار (اور بعد ازاں سہ روزہ) اخبار "اقبال" رام پور کی ادارت سنبھالی مگر ان کے ضمیر میں جو بیقراری شامل تھی، اس نے شاد عارفی کو یہاں بھی جم کر کام نہ کرنے دیا۔ کچھ دن بعد اسٹیٹ پریس رامپور میں انگلش پروف ریڈر ہو گئے اس ملازمت کا سلسلہ تین سال تک چلا اور وہیں سے بجٹ اکاؤنٹنٹ کی جگہ ترقی مل گئی اور وہ دو سال تک بجٹ اکاؤنٹنٹ رہے۔ آگے چل کر ریاست رامپور کا انضمام شاد عارفی کی تنزلی کا باعث ہوا اور انھیں

نائب ناظر کے عہدے پر تحصیل سوار میں منتقل کر دیا گیا جسے رامپور کا سائبیریا کہا جاتا ہے۔ یہاں قیام کے دوران وہ ملیریا میں مبتلا ہو گئے جس کے تباہ کن اثرات نے تمام عمر ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اپنے تبادلے کے لیے انھوں نے بہتیری کوشش کی لیکن ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ آخر تنگ آکر استعفا دے کر گھر بیٹھ رہے، اور پھر کہیں ملازمت نہ کی[25]۔

بحیثیت مجموعی شاد عارفی کی ملازمتوں کا سلسلہ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۸ء تک پھیلا ہوا ہے جس میں تقریباً نو دس سال کے درمیانی عرصے کو چھوڑ کر انھوں نے مندرجہ ذیل خدمات انجام دیں:

اسسٹنٹ لائبریرین صولت لائبریری رامپور: چند ماہ

مقامی کارخانوں کی ملازمتیں: پندرہ سال

ایڈیٹر اور سرکاری پریس میں انگلش پروف ریڈر: تین سال

بجٹ اکاؤنٹنٹ: دو سال

نائب ناظر تحصیل: دس ماہ

آخری ملازمت سے ۵ مئی ۱۹۴۸ء میں مستعفی ہو گئے[26]۔

ضعیف اور نابینا والدہ کی خدمت میں انھوں نے اپنی ساری عمر گزار دی۔ موصوفہ شاد کی وفات سے تقریباً دس بارہ سال پہلے تک زندہ رہیں۔ بڑے بھائی سید احمد خاں کو پہلی بیوی کے انتقال کے بعد غیر کفو میں دوسری شادی کر لینے کی بنا پر ماں نے خاندان سے علاحدہ کر دیا تھا۔ ان کے بچوں کی پرورش و پرداخت شاد عارفی نے ہی کی۔ خود اپنی ذات پر ہزاروں تکلیفیں جھیل کر اپنے بھتیجے فدا احمد خاں اور بھتیجی الیاسی بیگم کی ضروریات زندگی اور تعلیم کا معقول بندوبست کیا۔ فدا احمد خاں کو معلمی کی ٹریننگ دلائی۔ انھیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا، ان کی شادی کا بندوبست کیا۔ لیکن جب وہ اس قابل ہوئے کہ شاد کا سہارا بن سکیں تو شاد از راہ غیرت ان سے علاحدہ ہو گئے۔ اسی طرح الیاسی بیگم کی شادی بھی شاد نے ہی کی اور جب کچھ عرصہ بعد وہ بیوہ ہو گئیں تو شاد عارفی پھر ان کے کفیل ہو گئے اور تادم آخر ان کی اور ان کے بچوں کی مدد کرتے رہے۔ عبدالبشیر عرف ننھو (الیاسی بیگم کے لڑکے) کو تو شاد عارفی بالکل اپنی اولاد کی طرح پیار کرتے تھے۔ اور خود فاقوں میں گزارنے کے باوجود انھوں نے ننھو اور ان کے بھائی کی تعلیم اور ملازمت کا انتظام بھی کیا[27]۔ زندگی کے بالکل آخری دور میں ان کے بڑے بھائی سعید اللہ خاں تقریباً مخبوط الحواس ہو کر شاد کے ساتھ ہی رہنے لگے تھے۔ اس طرح شاد پر ایک بوجھ اور بڑھ گیا، جسے وہ بڑی فراخدلی کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔

ایسا بھی نہیں کہ خوشی کی ٹھنڈی ہوا کا ایک آدھ جھونکا بھی شاد عارفی کو زندگی میں نصیب نہ ہوا ہو۔ اسٹیٹ پریس میں پروف ریڈری کی ملازمت کا دور تھا۔ ان کی والدہ بہت ضعیف ہو چکی تھیں جب وہ سو سال سے زیادہ عمر کی ہو کر بینائی سے تقریباً محروم ہو گئیں تو ان کے اصرار پر ۳۹ یا ۴۰ سال کی عمر میں شاد نے رامپور کی تحصیل شاہ آباد کے منور شیر خاں نامی ایک غریب لیکن شریف خاندانی پٹھان کی لڑکی پری بیگم سے شادی کر لی۔ اور نسبتاً زیادہ آرام دہ مکان میں اٹھ آئے۔ یہ غالباً ان کی زندگی کا سب سے زیادہ آسائش کا دور تھا لیکن قسمت نے یہاں بھی انھیں چین کا لینے دیا اور شادی کے سال ڈیڑھ سال بعد ہی ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا[28]۔ پری بیگم بڑی اطاعت شعار اور نیک بیوی تھیں۔ شاد عارفی نے ان کے انتقال کا گہرا اثر قبول کیا اور عمر کے آخری ایام تک انھیں کسی نہ کسی نہج سے یاد کرتے رہے۔

۱۹۵۱ء میں ان کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا، اور شاد عارفی نے اپنے مکان میں اپنے مکان کی ضمانت پر قرض لے کر ان کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کیا۔ یہ مکان بعد ازاں قرض ادا کرنے کی غرض سے انھیں اپنے ایک رشتہ دار اشفاق احمد خاں کے ہاتھ چھ سو روپیے میں فروخت کرنا پڑا[29]۔

اس کے بعد زندگی کے باقیماندہ بارہ تیرہ سال شاد عارفی نے حد درجہ افلاس اور پریشانی کے عالم میں گزارے جس کے چشم دید گواہ خورشید علی خاں رامپوری کہتے ہیں:

"ان کی یہ جد و جہد حیات سیاسی جد و جہد سے کم نہ تھی جس میں قوم کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے اور

حرکت اور انقلابی روح پھونکنے کے لیے جیلوں اور
دار و رسن تک جانا ہوتا ہے"۳۰

اس عرصہ میں انھیں کم از کم پندرہ کرائے کے مکانات تبدیل کرنے پڑے اور انھوں نے رامپور کے چاروں کھونٹ دیکھ ڈالے کبھی گھیر حسن خاں کو رونق بخشی، کبھی گھیر سیدانی کو اور کبھی گھیر میر باز خاں کو ــــ آج پرانی کھنڈسار میں مقیم ہیں، کل نالے پار میں ہیں تو پرسوں حلقے والی زیارت میں۔ کبھی پیلا تالاب کے قریب فروکش ہیں اور کبھی بیریاں میں۔ آخری ایام مزار شاہ ولی اللہ صاحب کے قریب ایک مکان میں بسر کیے۔

محمد طفیل مدیر "نقوش" لاہور نے ان کے اس طرح بار بار بستر کی تبدیلی سے تنگ آکر لکھا تھا۔

"شاد صاحب! خدا کے لیے آپ میرے اوپر رحم کھائیے۔ اس قدر جلد مکان مت تبدیل کیجیے۔ آپ کی اس قدر تبدیلیِ مکان سے تو پتہ چلتا ہے کہ شاید آپ خانہ بدوش شاعر ہیں"۔ ۳۱

شاد عارفی کے خطوط سے رامپور کے مختلف محلوں میں ان کے قیام کا تعین بڑی حد تک ہو جاتا ہے۔ مثلاً ۲۹ر جولائی ۱۹۵۷ء سے ۱۲ر جولائی ۱۹۵۹ء تک خطوط محلہ بیریاں سے۔ ۱ر جنوری ۱۹۶۰ء سے ۱۶ر ستمبر ۱۹۶۰ء تک حلقے والی زیارت سے، اور ۱۱ر دسمبر ۱۹۶۰ء سے ۲۶ر فروری ۱۹۶۱ء تک گھیر میر باز خاں (جیل روڈ) سے لکھے گئے۔ ۸ر مئی ۱۹۶۱ء کے ایک خط پر کھیت کا پیر (متصل پیلا تالاب) کا پتہ درج ہے۔ ۸ر جولائی ۱۹۶۱ء سے ۱۲ر اگست ۱۹۶۱ء تک درخت کھیت (گھیر سیدانی) میں، ۲۲ر اگست ۱۹۶۱ء سے ۲ر نومبر ۱۹۶۲ء تک گھیر حسن خاں (ریکا باغ روڈ) میں اور یکم جنوری ۱۹۶۳ء سے ۲۷ر جنوری ۱۹۶۴ء تک مکان نزد مزار شاہ ولی اللہ صاحب میں ان کے قیام کا پتہ چلتا ہے۳۲۔ اسی آخری مکان میں ان کا انتقال ہوا۔ اس طرح شہر رامپور میں ہی انھوں نے اتنے سفر کیے کہ بیرونی مقامات کے سفر کے مواقع انھیں زندگی میں بہت کم مل پائے۔ خلیل الرحمان اعظمی، شاہد احمد دہلوی اور صہبا لکھنوی کے نام ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے بالترتیب علیگڑھ

دہلی اور لاہور کے سفر کیے تھے۔

بے روزگاری کے ہاتھوں یہ زمانہ ان پر اتنا سخت گزرا کہ اکثر فاقوں کی نوبت آگئی۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"الیاسی اور رابعہ (بھتیجی اور نواسی جن کے کفیل شاد صاحب تھے) بغیر سحری کا روزہ تین دن سے رکھ رہی ہیں"۔ ۳۳

حالت یہ تھی کہ آخری عمر میں گزر بسر کے لیے حق الاصلاح کے طور پر شاگردوں سے ملنے والی قلیل رقومات پر تکیہ تھا۔ ان سے گزر اوقات نہ ہوتی، تو اعزازی طور پر آنے والے رسائل اور کتابیں اونے پونے داموں فروخت کرکے انھیں اپنی اور اپنے لواحقین کی روٹیوں کا بند و بست کرنا پڑتا تھا۔ شاد عارفی کے خطوط اس تلخ حقیقت کے گواہ ہیں۔ ملا بھائی جنرل مرچنٹ رامپور کے نام لکھتے ہیں،

"اگر 'آبِ رواں' نہ بکا ہو تو اب فروخت نہ کریں، میں منگالوں گا"۔ ۳۴

مکتوب بنام سلطان اشرف کا ایک جزو ہے:۔

"آج 'ساقی' کا میر نمبر آگیا ہے، اس کی قیمت تین روپیہ ہے۔ قاعدے میں آپ سے ۳ر لینا چاہیے مگر میں حالات کے تحت مبلغ دو روپے کی آرزو رکھتا ہوں"۔ ۳۵

ہی مکتوب الیہ کے نام دوسرے خط میں لکھتے ہیں:۔

"امید ہے کہ آپ کو رسائل مل رہے ہوں گے، ملا بھائی سے معلوم کرتے آئیں کہ ان کی بکری ممکن بھی ہے یا ردی کی ٹوکری میں پڑے رہیں گے"۔ ۳۶

اسی زمانے کے حالات بیان کرتے ہوئے مسعود اشعر نے لکھا ہے:۔

"۱۹۵۵ء میں جب میں پاکستان سے رامپور گیا تو دیکھا کہ شاد عارفی اب وہ پہلے جیسا شاد ہی نہیں ہے روایتی استادوں کی طرح انھوں نے بھی شاگردوں کا جم غفیر اپنے گرد جمع کر لیا ہے اور اپنے ذہین اور لائق شاگردوں سے اس لیے ناراض ہو گئے ہیں کہ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے۔ بیماری نے یہ حال کر دیا ہے کہ چارپائی پر

ہر وقت پڑے رہتے ہیں۔ منھ سے حقے کی نے لگی ہے، اور نیچے فرش پر چیسی (غالباً چوسر) کھیلنے والے شاگردوں کو مشورے دے رہے ہیں۔ شاگردوں میں بھی کوئی (ذکی مصطفےٰ آبادی اور جاوید کمال نہیں ہے" وہ لوگ ہیں جنھیں کسی زمانے میں خود قریب نہیں آنے دیتے تھے...... والدہ کا انتقال بھی اسی عرصے میں ہو گیا تھا اگرچہ ان کی خدمت شاد صاحب ہی کرتے تھے، لیکن بہرحال وہ ایک سہارا تھیں، اب وہ بھی نہیں رہیں۔ کبوتر بازی اور پتنگ بازی طاقت کے ساتھ ہی ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ خود ایک کٹی ہوئی پتنگ تھے، جس نے چاہا پکڑ لیا اور جب چاہا چھوڑ دیا۔ ان کی ڈور اب کسی کے ہاتھ میں نہیں تھی جب کبھی وہ محلہ بیریاں میں تھے تو کبھی مزار شاہ ولی اللہ صاحب کے قریب، جس نے ہاتھ پکڑ لیا اسی کے ساتھ ہو لیے"[۸]

حقیقت یہ ہے کہ اس مدت میں شاد عارفی کے ساتھ کہیں کھل کر اور کہیں ہمدردی کی آڑ میں طرح طرح کے ظلم کیے گئے۔ کبھی ان کا اسٹیچو سامنے رکھ کر ان کی عدم موجودگی میں صولت لائبریری رامپور میں "جشن شاد" منانے کا ڈھونگ رچایا گیا[۹] کہیں انھیں اپنی کلیات کی اشاعت کے سبز باغ دکھائے گئے[۱۰] جس کی اشاعت کی کبھی نوبت نہ آئی۔ کسی نے انھیں رجعت پرست مقامی استاد شعراء سے بھڑا دیا، کسی نے ترقی پسندوں سے ٹکرا دیا۔ کوئی ہمدردان کے نام پر سیکڑوں کا چندہ کر کے ڈکار گیا، اور حفظ ماتقدم کے طور پہ تین چار مہینے تیس[۱۱] روپیے ماہوار ان کے سر تھوپ کر ان کی غیرت کو نیلام کرنے کی کوشش کرنے لگا ـــــ اور آخر ۸ر فروری ۱۹۶۴ء کی تپتی ہوئی دوپہر میں: ـــــــ

"کس کا انتقال ہو گیا بھائی۔؟"

دس پندرہ آدمیوں کی مختصر سی جمعیت کے ساتھ جنازہ جاتے دیکھ کر ایک راہرو نے از راہ ترحم پوچھا۔

"شاد عارفی کا ـــ" ان میں سے کسی نے جواب دیا اور پوچھنے والا سوالیہ علامت بن گیا۔

"کون شاد عارفی۔؟"

"شاعر تھے بھئی ایک۔!"

اور یہ شاعر مزار شاہ ولی اللہ کے احاطے میں شاہ صاحب کی تربت سے بائیں طرف آٹھ دس قدم کے فاصلے پر سپرد خاک کر دیا گیا۔

**

حواشی

۱۔ شاد عارفی۔ طاہرہ اختر (مطبوعہ "نقوش" لاہور۔ شخصیات نمبر) حصہ دوم ص ۱۱۳۴

۲۔ مکتوب شاد بنام صہبا لکھنوی مشمولہ "ایک تھا شاعر" مرتبہ مظفر حنفی (ص ۴۳۲، ۴۳۱)

۳۔ اسکول میں غلطی سے شاد کا نام بجائے احمد علی خاں کے لطف علی خاں لکھا گیا تھا، جو بہت دنوں تک چلتا رہا۔ ("اندھیر نگری" ـــ شاد عارفی۔ ص ۰۰۱)

۴۔ "شاد عارفی۔ فن اور شخصیت"۔ عروج زیدی (دو ماہی "محور" دہلی۔ شمارہ ۲ ۱۹۶۲ء)

۵۔ جدید شاعری۔ عبادت بریلوی (ص ۶۰۰) ۶۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ـــ خلیل الرحمٰن اعظمی (ص ۱۸۵)۔

۷۔ شاد مرتبہ عابد رضا بیدار (ص ۲۴) ۸۔ نثر و غزل دستہ۔ مرتبہ مظفر حنفی (ص ۲۷۲)

۹۔ مکتوب شاد بنام جون ایلیا مشمولہ ماہنامہ "انشاء" عالمی ڈائجسٹ کراچی خاص نمبر ۱۹۶۰ء

۱۰۔ شاد عارفی ـــ طاہرہ اختر (مطبوعہ سہ ماہی "نقوش" لاہور۔ شخصیات نمبر) حصہ دوم ص ۱۱۳۴

۱۱۔ شاد عارفی سے ایک ملاقات ـــ وصی اقبال (مطبوعہ ماہنامہ "تحریک" دہلی۔ جون ۱۹۶۴ء ص ۱۲)

۱۲؎ شاد عارفی: ایک تعارف — سلطان اشرف (مشمولہ "ایک تھا شاعر" مرتبہ مظفر حنفی ص ۲۹۲)
۱۳؎ شاد عارفی سے ایک ملاقات — وصی اقبال (ماہنامہ "تحریک" دہلی جون ۱۹۶۴ء ص ۱۱)
۱۴؎ شاد عارفی: ایک تعارف — سلطان اشرف (مشمولہ "ایک تھا شاعر" مرتبہ مظفر حنفی ص ۲۹۳)
۱۵؎ ایک اور گنجا فرشتہ — اکبر علی خاں عرشی زادہ (سہ ماہی "نقوش" لاہور خاص نمبر ۱۹۶۵ء)
۱۶؎ شاد عارفی مرحوم — منہاج الدین مینائی (مطبوعہ "ایک تھا شاعر" مرتبہ مظفر حنفی ص ۴۲۵)
۱۷؎ شاد عارفی سے ایک ملاقات — وصی اقبال (ماہنامہ "تحریک" دہلی جون ۱۹۶۴ء ص ۱۲)
۱۸؎ "میں — شاد عارفی ("ایک تھا شاعر" مرتبہ مظفر حنفی ص ۳۳۷)
۱۹؎ شاد عارفی، ایک تعارف — سلطان اشرف ("ایک تھا شاعر" مرتبہ مظفر حنفی ص ۲۹۵)
۲۰؎ شاد عارفی مرحوم — منہاج الدین مینائی ("ایک تھا شاعر" مرتبہ مظفر حنفی ص ۴۴۵)
۲۱؎ عروج زیدی نے اپنے مضمون "شاد عارفی۔ شخصیت اور فن" (مطبوعہ دو ماہی "محور" دلی شمارہ ۲ ۱۹۶۲ء) میں اشارۃً ان محترمہ کا نام "ص" بیگم درج کیا ہے۔ ۲۲؎ مکتوب شاد بنام علی حماد عباسی ("ایک تھا شاعر" مرتبہ مظفر حنفی ص ۶۵۰)
۲۳؎ شاد عارفی۔ ایک انٹرویو — سلطان اشرف (ہفت روزہ "نصرت" لاہور ماہانہ ایڈیشن ۱۲ نومبر ۱۹۶۱ء ص ۱۴)
۲۴؎ شاد عارفی مرحوم — منہاج الدین مینائی ("ایک تھا شاعر" مرتبہ مظفر حنفی ص ۴۲۷)
۲۵؎ شاد عارفی، ایک تعارف — سلطان اشرف ("ایک تھا شاعر" مرتبہ مظفر حنفی ص ۲۹۳)
۲۶؎ شاد — مرتبہ عابد رضا بیدار (ص ۲۷) ۲۷؎ ایک اور گنجا فرشتہ — اکبر علی خاں عرشی زادہ (سہ ماہی "نقوش" لاہور خاص نمبر ۱۹۶۵ء)
۲۸؎ کٹی پتنگ — مسعود اشعر (سہ ماہی "فنون" لاہور اشاعت خاص ۵-۱۹۶۴ء ص ۳۳۴)
۲۹؎ اپنے مکتوب بنام جون ایلیا ("انشاء" عالمی ڈائجسٹ کراچی، خاص نمبر ۱۹۶۰ء) اور مکتوب بنام علی حماد عباسی (سہ ماہی "نقوش" لاہور، خطوط نمبر ۲) میں شاد عارفی نے لکھا ہے:۔ "میں نے گھر بیچ کر مرحومہ کی تجہیز و تکفین کی۔" اور اکبر علی خاں عرشی زادہ نے اپنے مضمون "ایک اور گنجا فرشتہ" (سہ ماہی "نقوش" لاہور خاص نمبر ۱۹۶۵ء) میں تحریر کیا ہے:۔ "مجھے یقین نہیں آیا جب میں نے سنا کہ شاد صاحب نے اپنا ذاتی مکان جس کے بارے میں ان کا بیان ہے کہ ماں کے انتقال پر انھیں فروخت کرنا پڑا تھا، ماں کے انتقال کے عرصہ کے بعد اپنی دوسری ضرورتوں سے فروخت کیا تھا۔"
راقم الحروف نے رام پور میں سلطان اشرف اور دوسرے متعلقہ افراد سے اس باب میں براہِ راست تحقیقات کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ماں کی تجہیز و تکفین کے لیے شاد نے مکان کی ضمانت پر جو قرض لیا تھا بعد ازاں اسے ادا کرنے کے لیے انھیں مکان فروخت کرنا پڑا۔
۳۰؎ شاد عارفی، بحیثیت عوامی شاعر — خورشید علی خاں رامپوری (روزنامہ "سالار" بنگلور ادبی ایڈیشن ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۶ء ص ۲)
۳۱؎ شاد عارفی۔ ایک انٹرویو — سلطان اشرف (ہفت روزہ "نصرت" لاہور ماہانہ ایڈیشن ۱۲ نومبر ۱۹۶۱ء ص ۱۶)
۳۲؎ مکاتیب شاد۔ مطبوعہ "ایک تھا شاعر" مرتبہ مظفر حنفی (ص ۴۳۱ تا ۶۹۹)
۳۳؎ مکتوب شاد بنام قیصر خاں و طاہرہ اختر ("ایک تھا شاعر" مرتبہ مظفر حنفی ص ۶۴۴)
۳۴؎ مکتوب شاد بنام ملا بھائی جنرل مرچنٹ ("ایک تھا شاعر" مرتبہ مظفر حنفی ص ۵۸۵)

(باقی صفحہ ۸۷ پر)

غزلیں

صلاح الدین نیّر
بازار روپ لال
حیدر آباد

گجر بجا تو زباں چپ تھی ذہن خالی تھا
ہر ایک شخص کا چہرہ یہاں سوالی تھا

قدم کسی کے اٹھے ہوں بنام سیرِ چمن
نصیب سبزۂ گلشن تو پائمالی تھا

ہوا کے دوش پہ بکھرے تھے گیسوئے جاناں
وہ خوشبوؤں کا سفر تھا مگر خیالی تھا

تمہارے گھر کی تو ایک ایک اینٹ باقی ہے
تمہارا گھر بھی تو میری طرح سفالی تھا

رہیں تشنہ لبی سارے مے گسار ملے
یہ مے کدہ تو تمہارا بڑا مثالی تھا

غرور ٹوٹ گیا اپنی کج کلاہی کا
نظر اٹھی تو در بندگان عالی تھا

میں آنسوؤں کا صلہ کس سے مانگتا نیّر
نسیمِ صبح کا دامن ہی خالی خالی تھا

••

شاہد میر
شعبۂ نباتات
گورنمنٹ کالج بانسواڑہ
راجستھان

دل تھا اداس آنکھ تھی نم جاگتے رہے
کیا یاد آگیا تھا کہ ہم جاگتے رہے

کہنے کو منزلوں پہ پہنچ بھی گئے مگر
کچھ فاصلے سے زیرِ قدم جاگتے رہے

خود حُسن ساری رات محافظ بنا رہا
وہ سو گیا تو زلف کے خم جاگتے رہے

صحنِ چمن میں سرد ہوا نوحہ خواں رہی
اک زرد رنگ شاخ پہ غم جاگتے رہے

وہ راہرو تو نیند کی وادی میں سو گیا
صحرا میں اس کے نقش قدم جاگتے رہے

••

بشیر فاروقی
نئی بستی۔ مراد علی لین
لکھنؤ

ابھی کھل جائیں گلابوں کے چمن پانی میں
تم ڈبو دو جو کہیں اپنا بدن پانی میں

پھر بہار آئی لباس اپنا کنارے رکھ کے
کر گئی جست حسیں شوخ کرن پانی میں

مچھلیاں چھوڑ گئیں جھیل کا آنگن جب سے
اب پرندوں کا نہیں لگتا ہے من پانی میں

ابر ایسا ہے کہ برسے تو بڑھے اور بھی پیاس
آگ ایسی ہے کہ جلتے ہیں دہن پانی میں

موجیں چبھنے لگیں پھینکے ہوئے تیروں کی طرح
دیکھ تو اتنا بھی حسّاس نہ بن پانی میں

دیکھتا رہتا ہوں میں خواب ہوئے خوابی ہو
کہیں دیکھا تھا کوئی چندر بدن پانی میں

چھیڑتے رہتے ہیں یونہی رگِ جاں کو افکار
سطحِ دریا پہ پڑے جیسے شکن پانی میں

دل الجھ جاتا ہے میرا کبھی دیکھوں جو بشیر
آتی جاتی ہوئی لہروں کا ملن پانی میں

••

غزلیں

عروج زیدی
کٹ تو یاں۔ رام پور
(یو۔پی)

جرأت آموز اگر آبلہ پائی ہوتی
قُربِ منزل نے یہ دوری نہ بڑھائی ہوتی

قدرِ قیمت نگہ دل نے گھٹائی ہوتی
زندگی ہم نے اگر بھیک میں پائی ہوتی

سنگِ مرمر کی چٹانوں میں رواں ہیں چشمے
تم نے اس خواب کی تعبیر بتائی ہوتی

رُخ کو نین کو چھانا ہے تو چھانا میں نے
جس جگہ میں ہوں وہاں کیسے "خدائی" ہوتی

رہنمائی میں تو جگنو کے مقابل بھی نہیں
آپ کیا کرتے اگر تیرہ فضائی ہوتی؟

سعی تقلید میں اپنی بھی "نوا" کھو بیٹھے
میری آواز میں آواز ملائی ہوتی

خالقِ عشق! مری جرأتِ احساس معاف
حُسن کو قدرِ محبت بھی سکھائی ہوتی

شکر ہے گُل نہ ہوئے بادِ مخالف سے چراغ
عزمِ بیباک پہ انگشت نمائی ہوتی

میرے کردار کو آئینہ دکھانے والے!
اپنے ماتھے کی سیاہی تو مٹائی ہوتی

میں تو اس حُسنِ تغافل کا ہوں بندہ لے دوست
رسمِ بیگانہ روی اور بڑھائی ہوتی

ہر فلک بوس ہے دنیا میں بکھرنے کو عروج
کاش خود سے یہ حقیقت نہ چھپائی ہوتی

●●

اظہر لکھنوی
تکیہ پیر غائب۔ جھوائی ٹولہ
لکھنؤ ۳

کسی کا دوست دلِ بے قرار کیا ہوگا
جو راز بن نہ سکا راز دار کیا ہوگا

ذرا میں غور تو کرلوں سکونِ قلب کے ساتھ
نگاہِ حسن میں میرا وقار کیا ہوگا

جسے گناہ میں آنے لگے ثواب کا لطف
غریقِ رحمت پروردگار کیا ہوگا

یہ جانتا ہوں کہ بابِ قبول بند نہیں
یہ جانتا نہیں روزِ شمار کیا ہوگا

بڑے مزے سے تیری انجمن میں بیٹھا ہوں
خبر نہیں ہے کہ انجامِ کار کیا ہوگا

تیری گلی میں ہی ہوگا جو حشر ہونا ہے
بلند ہو کے ہمارا غبار کیا ہوگا

نظامِ دہر میں تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں
نہ آسکی جو چمن میں بہار کیا ہوگا

کوئی پکار رہا ہے بہار کی لے میں
تڑپ رہا ہوں میں دیوانہ وار کیا ہوگا

اسی خیال سے توبہ نہ کر سکا اب تک
برس پڑا جو پھر ابرِ بہار کیا ہوگا

بدلتی رُت نہ بدل دے تجھے کہیں اظہر
سنک رہی ہے ہوائے بہار کیا ہوگا

●●●

باقی دہلوی
گولہ گنج۔ لکھنؤ

لالۂ و گُل نہ ہوں بہار نہ ہو
میرا دامن جو تار تار نہ ہو

تیرا غم کب مجھے عزیز نہیں
شرط ہے کوئی غمگسار نہ ہو

بے گناہی کی پا رہے ہیں سزا
کوئی ہم سا گناہگار نہ ہو

ہاں وہ ہے اعتبار کے قابل
جس کو اپنا بھی اعتبار نہ ہو

یہ بھی تیری نظر کا پرتو ہے
زندگی کیوں فریب کار نہ ہو

تیری تاکید ضبطِ غم تسلیم
اور اگر دل پہ اختیار نہ ہو

باقی رونے کا لطف تو جب ہے
ایک آنسو بھی آشکار نہ ہو

●●

موہن لال ویشنوی
ٹیکنیکل معاون اُردو
نیشنل بوٹینیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
لکھنؤ

ونیلا خوشبوئیات کا خزانہ

نباتاتی تنسیق (Botanical Toxonomy) کے بعد جس پودے کا نام ونیلا پلینی فولیا اینڈروز (Vanilla Planifolia Andrz) رکھا گیا ہے، اس نے حیرت انگیز طور پہ اپنی قدرتی دین اور مخصوص خصوصیات کی بنا پر نہ صرف اپنے گھر آنگن کو ہی مہکایا ہے، بلکہ آس پاس سے گزرتے ہوے اپنی خوشبو کے بے بہا خزانے سے دنیا کے طول و عرض میں بھی خوشبوؤں کے انبار لگا دیے ہیں۔ یہ وہی پودا ہے جس کا گھر میکسکو ہے لیکن اس کی پھلیوں میں بسی ہوئی خوشبو نے آج ساری دنیا پر اپنا سکہ جما لیا ہے اور شاید ہی ہم میں سے کوئی ایسا ہو، جو کسی نہ کسی صورت میں ونیلا کا استعمال نہ کرتا ہو، چاہے چاکلیٹ ہو یا کیک ہو، شیرینی ہو یا کوئی مشروب، مٹھائی ہو یا پیسٹری یا پھر تازہ دم کر دینے والی آئس کریم ہی کیوں نہ ہو، ان سب ہی چیزوں میں ونیلا کی پھلیوں کی خوشبو سے کیسے انکار ہو سکتا ہے، اتنا ہی نہیں، صابن اور دیگر چیزوں کے بنانے میں بھی اس کا استعمال کیا جاتا ہے، اور یہاں تک کہ کڑوی دواؤں کی کڑواہٹ دور کرنے کے لیے بھی ونیلا پلینی فولیا کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ عطریات میں بھی اس کا استعمال بخوبی کیا جاتا ہے۔

نباتاتی کیفیت

ونیلا لن (Vanilla Linn) بیل دار پودوں کی نوع سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی ایک قسم ونیلا پلینی فولیا (V. Planifolia) ایک لمبی راقیہ (Climber) بیل ہے، جس کے تنے مضبوط اور پتیاں موٹی ہوتی ہیں، اس کی جڑیں سلیٹی اور سفید رنگ کی ہوتی ہیں۔ یہ پودا ہماری سبزیوں میں کھائی جانے والی سیم سے مشابہ ہے۔ یہ میکسکو کا پودا ہے اس کے پھول کم و بیش سبز اور پیلے رنگ کے ہوتے ہیں پھولوں کے ہر گچھے میں ۱۵ تا ۲۰ پھول ہوتے ہیں۔ ایک پودے میں تین ہزار سے لے کر چار ہزار تک پھول نکلتے ہیں۔ قلم لگانے کے بعد پودے کی نشو و نما کا دور شروع ہوتا ہے اور لگ بھگ چار سال کے بعد اس پودے میں پھول نکلتے ہیں۔ پھول دسمبر سے مارچ تک آتے ہیں۔ اس کا کیسہ Capsule ۲۵ سنٹی میٹر لمبا اور ۸ تا ۲۰ ملی میٹر موٹا ہوتا ہے۔ سال بھر میں اس کے لیے نو ماہ تک دو سو سنٹی میٹر کی بارش اور باقی ۳ مہینوں میں خشک اور امس بھرا موسم چاہیے۔ اس پودے کے لیے معیاری درجہ حرارت ۲۵ ڈگری سنٹی گریڈ اور ۸۰ فیصدی اُمس اور نمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ونیلا کو تجرباتی طور پر ہندستان میں مغربی بنگال، بہار، تامل ناڈو، پانڈیچری، کرناٹک، کیرالا اور آسام میں لگایا جا چکا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ میکسکو، امریکہ اور جاوا کے گرم علاقوں میں اس پودے کی پارزیرگی (Cross Pollination) قدرتی طور پہ ہوتی ہے اور ہمارے یہاں اس پودے کو نہ تو وہ قدرتی ماحول ہی مل سکا ہے اور نہ وہ کیڑے ہی میسر آ سکے ہیں جن کی مدد سے یہ کام قدرتاً انجام پاتا ہے مصنوعی پارزیرگی (Hand Pollination) لاکھوں بلکہ کروڑوں پھولوں کے ساتھ انجام دیا جانا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ شاید اسی وجہ سے اب تک ہمارے یہاں اس کی کاشت کے سلسلے میں حوصلہ افزا

نتائج حاصل نہیں ہوئے ہیں لیکن سائنسی تحقیق نے کبھی پیچھے ہٹنا نہیں سیکھا ہے اس لیے امید کی جاسکتی ہے کہ مستقبل قریب میں ہندستان کے متذکرہ علاقوں میں بھی اس پودے کی کاشت بخوبی کی جاسکے گی۔

ونیلا کی پھلیوں کا ابتدائی دور

ونیلا کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ سولھویں صدی میں اسپین کے بادشاہ دوم کے کہنے پر فرانسسکو فرنانڈیز جب نئی دنیا کی تلاش میں نکلے تو میکسیکو پہنچ کر انھوں نے ایک قبیلہ کے لوگوں کو ونیلا کی پھلیوں سے چاکلیٹ کو خوشبودار بنانے کے لیے استعمال کرتے پایا۔ جب فرنانڈیز یورپ واپس لوٹا تو کچھ پھلیاں اپنے ساتھ لیتا گیا۔ اس دن سے یورپ میں کھانے پینے کی چیزوں کو لذیذ اور خوشبودار بنانے کے لیے ونیلا کا استعمال کیا جانے لگا۔

اگرچہ ونیلا پلینی فولیا کا انکشاف سولھویں صدی کے آغاز میں میکسکو اور وسطی امریکہ میں ہوگیا تھا، تاہم تقریباً تین سو سال کے بعد اس کا پودا یورپ آیا اور ۱۸۱۹ء میں یہ پودا جاوا پہنچا۔ اس کے بعد اس کی کاشت دوسری جگہوں کے علاوہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں "پورٹوریکو" میں شروع کی گئی۔ کافی عرصہ تک ونیلا کی کاشت میں لوگ دلچسپی لیتے رہے اور ۱۸۴۷ء میں کسی شخص کی توجہ اس امر کی جانب مبذول ہوئی کہ ونیلا کا سفوف نکال کر استعمال کیا جانا چاہیے۔ سب سے پہلے جوزف برنیٹ نام کے ایک دواؤں کے تاجر نے اس کا سفوف تیار کیا۔ سفوف تیار ہونے سے پہلے ونیلا کی پھلی ہی استعمال کی جاتی تھی۔ چونکہ ونیلا کا پودا ایک راقیہ بیل ہے اس لیے جنگلی حالت میں یہ درختوں، جھاڑیوں اور پتھروں پر پھیل جاتا ہے جب اس کی کاشت کی جاتی ہے تب اسے مخصوص درختوں یا جھاڑیوں پر چڑھاتے ہیں۔ اس بیل میں ہرے پیلے اور سرخی مائل کٹورے رنگ کے پھول نکلتے ہیں۔ ان پھولوں کی شکل گھنٹیوں جیسی ہوتی ہے اور ان کی پنکھڑیاں الگ الگ دکھائی دیتی ہیں۔ یہ بیل ان ملکوں میں جہاں گرمی اور نمی ایک ساتھ پائی جاتی ہے اور ہوا تیز نہیں چلتی، اگائی جاتی ہے اس کے لیے سال بھر میں بارش کی کافی ضرورت ہوتی ہے لیکن ضرورت سے زیادہ بارش بھی اس کے لیے ضرر رساں ثابت ہوتی ہے۔ بارش کی کثرت یا ناوقت بارش سے بھی یا تو یہ پودا مر جاتا ہے یا اس میں پھول ہی نہیں آتے۔ ظاہر ہے کہ اس پودے کی گل کشائی بہت ضروری ہے کیونکہ پھولوں کی بدولت ہی ونیلا کی پھلیاں بنتی ہیں۔

جس طرح سے سیب کے پھول گر جانے کے بعد سیب دکھائی دینے لگتے ہیں اسی طرح سے ونیلا کے پھول گر جانے کے بعد پھلیاں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ ایک بیل میں لگ بھگ تیس پھلیاں ہوتی ہیں۔ یہ پھلیاں گہرے ہرے رنگ کی ہوتی ہیں۔ ان کی لمبائی ۱۵ سنٹی میٹر سے لے کر ۲۰ سنٹی میٹر تک ہوتی ہے۔ اگر موسم اچھا ہو تو یہ پھلیاں چھ ہفتوں میں تیار ہو جاتی ہیں۔ عام طور پر انھیں نومبر کے مہینے میں اکٹھا کیا جاتا ہے۔

یہ بات غور طلب ہے کہ میکسیکو، وسطی امریکہ اور جاوا کے رہنے والے ونیلا کی پھلیوں کو اکٹھا کرنے میں قدیم قبیلوں کے روایتی طور طریقوں کو اب بھی مانتے ہیں، اگرچہ انھیں پورے طور سے اپناتے نہیں ہیں۔ پرانے زمانے میں یہاں مزدوری چاندی کے سکوں میں دی جاتی تھی اور مزدور اپنی آمدنی کا نصف حصہ زمین میں دبا دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ زمین سے جو چیز لی جائے اس کا آدھا حصہ اسے (زمین کو) واپس کر دینا چاہیئے۔

جب ونیلا کی ہری پھلیاں اکٹھا کی جاتی ہیں تو ان میں نہ کسی طرح کا ذائقہ ہی ہوتا ہے اور نہ کوئی خوشبو ہوتی ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ ایک مخصوص طریقۂ عمل سے ان پھلیوں کو ذائقہ دار اور خوشبودار بنایا جاتا ہے۔ یہ کام وہ لوگ نہیں کرتے جو ونیلا کی کاشت کرتے ہیں۔ اس کام کے لیے تو دوسرے لوگ ہیں جو اس کو خرید کر پکاتے (Curing) ہیں۔ یہ پکانے کا عمل تقریباً تین مہینے کا ہوتا ہے۔ اس کے دو روایتی طریقے ہیں۔ ایک میکسکو کا دوسرا بوربورن کا۔ میکسکو کی روایت شمسی طریقۂ عمل کے نام سے مشہور ہے۔ اچھی پھلیوں کو چھانٹ لیا جاتا ہے اور ان کے تنے کے حصے الگ کر لیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد پھلیوں کو دھوپ میں ڈال دیتے ہیں، رات کو سایہ میں ہٹا کر ان پر کمبل ڈھک دیا جاتا ہے تاکہ انھیں پسیجنے کا موقع مل سکے۔

پھلیوں کو بارش یا اس وقت جب آسمان پر بادل چھائے

ہوں، باہر کھلے میں نہیں نکالا جاتا ہے۔ اس صورت میں انھیں اندر ہی اندر سکھایا جاتا ہے۔ اس میں ۲ سے لے کر ۳ دن لگ جاتے ہیں۔ یہ کام نہایت خوبی سے تجربہ کار لوگ ہی انجام دیتے ہیں۔ ان قبیلوں کے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے تجربہ کار لوگ ہی یہ طے کر پاتے ہیں کہ پھلیاں تیار ہوگئی ہیں یا نہیں۔

بوربورن کی روایت پہلے طریقے سے کچھ مشابہ ہے، بس فرق صرف اتنا ہے کہ پھلیوں کو پہلے اُبلتے پانی میں ڈبو دیا جاتا ہے، اس کے بعد پھلیوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے کمبلوں سے ڈھک دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ سوکھ جائیں۔ یہ کمبل سے ڈھکی ہوئی پھلیاں دن میں باہر تیز دھوپ میں رکھ دی جاتی ہیں۔ شام کو انھیں بڑے بڑے ڈبوں میں جن کے اندر اونی گدّے لگے ہوتے ہیں، بھر کر رکھ دیتے ہیں اس طرح آٹھ دن تک یہ عمل جاری رہتا ہے۔ اس کے بعد کمروں میں پھیلا کر سُکھا لیا جاتا ہے۔

میکسکو کی پھلیاں سب سے بہترین

میکسکو کی پھلیاں سب سے بہترین سمجھی جاتی ہیں۔ دوسرے ملکوں کی پھلیاں بھی اچھی ہوتی ہیں لیکن ان میں کچھ فرق پایا جاتا ہے یہ فرق عام طور پر آب و ہوا کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے بوربورن جزیرہ کی پھلیاں بھی اچھی ہوتی ہیں۔ اس کے بعد جاوا، اور مغربی جزیروں کی پھلیوں کو معیاری سمجھا جاتا ہے۔ کچھ ایک علاقوں کی پھلیاں نچلے درجہ کی بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن میکسکو کی ونیلا کی پھلیاں سب سے زیادہ خوشبودار اور اعلا ہوتی ہیں۔ جب اس کی پھلیاں اکٹھا کی جاتی ہیں تو وہ ہری ہوتی ہیں۔ پکانے کے بعد وہ کچھ کالی اور بھوری ہو جاتی ہیں۔ ۵ کیلو کی پھلیاں پکانے اور سکھانے کے بعد ایک کلو باقی رہ جاتی ہیں۔ پھلیوں کو پکانے کے بعد ان کی درجہ بندی کی جاتی ہے۔ ان میں گودے دار، چکیلی اور گہرے رنگ کی پھلیوں کو بہتر مانا جاتا ہے۔ نچلے درجہ کی پھلیاں ٹکڑوں میں کاٹ کر سستے دام پر فروخت کی جاتی ہیں۔ انھیں کٹی ہوئی پھلیوں کے نام سے پکارتے ہیں۔ جو پھلیاں چٹک جاتی ہیں وہ بھی الگ سے فروخت ہوتی ہیں۔ سوکھی پھلیوں کو چھانٹ لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہر بنڈل میں ۵۰ پھلیاں بھر دی جاتی ہیں جن کا وزن تقریباً ۵۰۰ گرام ہوتا ہے۔ یہ بنڈل ٹین کے ڈبوں میں جن کے اندر کاغذ لگا ہوتا ہے، بند کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد بڑے بڑے کنستروں میں ان کو منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اگر پھلیاں اچھی طرح سے سکھائی اور پکائی گئی ہوں تو سال بھر تک محفوظ رہ سکتی ہیں۔ یہ پھلیاں اب باہر بھیجنے کے لیے تیار ہوتی ہیں اور یہیں سے دُنیا کی تجارتی منڈیوں اور بازاروں میں پہنچتی ہیں۔

ونیلا کا سفوف

ونیلا کا سفوف نکالنا زیادہ دلچسپ کام ہے۔ یہ کافی (ایک طرح کی چائے کی پتّی) کی طرح سے نکالا جاتا ہے۔ اس میں پانی کے بجائے پانی ملا ہوا الکوہل استعمال کیا جاتا ہے۔ الکوہل ونیلا کی مہک نکال لیتا ہے اور اس کو جذب بھی کرتا ہے۔ الکوہل کے دھیرے دھیرے اوپر سے نیچے آنے میں پھلیوں کا ذائقہ اور خوشبو الکوہل میں بس جاتی ہے۔ نیچے کی طرف نکلنے والا رقیق ونیلا کا سفوف ہوتا ہے۔ یہ سفوف اب بن کر تیار ہے۔ کارخانوں کے علاوہ رسوئی گھروں تک میں آسے کھانا پکانے، نان خطائی تیار کرنے اور آئس کریم بنانے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کو صابن بنانے اور دوسرے ساز و سامان و گل گونہ وغیرہ کے لیے بھی کام میں لایا جاتا ہے۔ دوائیوں کی کڑواہٹ دور کرنے میں بھی اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔

آج کے نئے سائنسی دَور میں ونیلا پلینی فولیا کی کاشت، فنی طریقوں، نگہداشت، اور سفوف تیار کرنے کے سلسلے میں کافی تبدیلیاں ظہور میں آئی ہیں۔ لیکن بنیادی طور طریقے جو پہلے تھے، اب بھی رائج ہیں۔

فرانسسکو فرنانڈیز نے شاید اس بات پر کبھی غور بھی نہ کیا ہوگا کہ ونیلا کی پھلیوں میں پنہاں خوشبوئیات کے اس خزانے سے کبھی ساری دنیا فیضیاب ہوگی۔

★

ہلالِ عید

صابر ابوہری

۱۵/۸۰۰ اے، فریدآباد ۱۲۱۰۰۶

اے ہلالِ عید تیرا شکریہ، صد شکریہ
تو ہمارے واسطے لایا ہے پیغامِ نشاط
تیری آمد سے ہوئے دل شاد سب اہلِ جہاں
ہر طرف ہے موجزن کیف و سرور و انبساط
رنج و غم تو دیکھنے کو بھی نہیں باقی کہیں
جس کو دیکھو مسکراتا پھر رہا ہے مثلِ گل
بھائی بھائی کی طرح ملتے ہیں آپس میں سبھی

یہ مگر اک خواب ہے اس کی حقیقت کچھ نہیں
ایک دن کا ہے دکھاوا ایک دن کا جوش ہے
آج کے دن بادلِ ناخواستہ سب آدمی
ایک ہی صف میں کھڑے ہو بھی گئے تو کیا ہوا
بغض و نفرت کی ہیں قائم دل میں دیواریں ابھی
فرق باقی ہے ابھی تک رنگ و نسل و قوم کا
ہے عراقی اب بھی کوئی اور ایرانی کوئی
کوئی ہندی، کوئی چینی، کوئی افغانی ابھی
آدمی ڈھاتا ہے اب بھی نوعِ انساں پر ستم
آدمی کے ہاتھ میں ہیں آج بھی تیغ و سناں
آدمی کا دل ہے عاری مہر و الفت سے ابھی
آدمیت سے ہے کوسوں دور اب تک آدمی

اے ہلالِ عید ہم کو یہ بتا بہرِ کرم
آدمی اپنائے گا کب آدمیت کا چلن
احترامِ آدمی کب ہوگا انساں کا اصول
کب چھٹیں گے جنگ کے بادل فضائے دہر سے
ختم ہوگا آدمی پر آدمی کا ظلم کب
کب کدورت دور ہوگی کب مٹے گا مکر و فن
آدمی کے دل میں ہوگی کب محبت موجزن؟

**

"اپاہج"

مومن غازی پوری

ایس ۔ ۱۳۰/۶ اردو بازار
وارانسی

قدرت نے ہر طرح سے نوازا ہے آپ کو
ہر عیب ہر کمی سے بچایا ہے آپ کو
سامانِ جسم و جاں سے سجایا ہے آپ کو
اپنے کو اپنے جسم کی سج دھج کو دیکھئے
پھر اک نظر غریب اپاہج کو دیکھئے

خالی ہیں لطفِ شوق سے گوشے حیات کے
ہیں مستقل شکار غم و مشکلات کے
محتاج ہیں یہ اک نگہ التفات کے
آنکھوں میں ناامیدی ہے حسرت ہے یاس ہے
ان کے لبوں پہ آکے ہنسی بھی اُداس ہے

قدرت نے ہاتھ پاؤں سے معذور کر دیا
قسمت نے ان کو بے بس و مجبور کر دیا
دُنیا کی ہر خوشی سے انھیں دُور کر دیا
اک کش مکش ہے زندگی نامُرادمیں
مصروف ہر نفس ہے مسلسل جہاد میں

یہ بدنصیب عضو بدن مانگتے نہیں!
ناک آنکھ کان لب یہ دہن مانگتے نہیں
آرائشِ بہارِ چمن مانگتے نہیں
کچھ سیم و زر نہ لعل و گہر مانگتے ہیں یہ
حُسنِ سلوک حُسنِ نظر مانگتے ہیں یہ

مجبوریوں پہ ان کی بھی کیجئے ذرا نگاہ
رکھیے معاملات میں ان سے بھی رسم و راہ
ہنگامہ ہائے دہر میں ان کا بھی ہو نباہ
یہ مستحق ہیں ان کو مراعات دیجئے
موقع برائے رفعِ شکایات دیجئے

غزلیں

کمال جائسی
کرنیل گنج۔ کان پور

○

دور کوئی ہے کہ پاس فیصلہ دشوار ہے
جس کو محبت کہیں خوابوں کا سنسار ہے

لب پہ ہنسی کا چمن ہاتھ میں تلوار ہے
آج کے انسان کا کیا یہی معیار ہے

رنگ کی اور عکس کی جلوہ گری دیکھیے
اس کے مرے درمیاں شیشے کی دیوار ہے

خواب چرا لے گئی رات کی الھڑ پری
حسن لٹیرا ہی عشق بھی دلدار ہے

جلتے چراغوں کے آج چہرے اتر سے گئے
میرے خیالوں میں وہ چہرہ گلنار ہے

آج نئے عہد کی لکھے گا، تاریخ یہ
خون میں ڈوبا قلم سوچ میں فنکار ہے

سکۂ فن لیکے آپ نکلے ہیں لیکن کمال
سچ کی دکاں بند ہے جھوٹ کا بازار ہے

انور جلال پوری
جلال پور۔ ضلع فیض آباد

○

تو مصوّر ہے مرا اور تری تصویر ہوں میں
مجھ کو سرسبز بنادے تری جاگیر ہوں میں

تو مصنّف ہے ازل کا، میں تری پہلی کتاب
لوحِ محفوظ پہ لکھی ہوئی تحریر ہوں میں

میرے دو روپ ہیں، تو نے ہی بنایا ہے مجھے
ظالمِ وقت ہوں میں، اصغرِ بے شیر ہوں میں

مجھ کو آنا ہے ترے سمت کماں میں اک دن
تیرے ہاتھوں ہی سے چھوٹا ہوا اک تیر ہوں میں

میں نے ہر عہد کی لفظوں سے بنائی تصویر
کبھی خسرو، کبھی خیام، کبھی میر ہوں میں

میری فطرت ہی میں شامل ہیں تضادات کے رنگ
زہر کا جام ہوں میں شہد کی تاثیر ہوں میں

قمر صدیقی
زیدون۔ فتح پور

○

بھٹکتے رہروں کا آسرا ہوں
میں تاریکی میں اک جلتا دیا ہوں

زمانے نے گلے مجھکو لگایا
میں اب آنسو سے موتی بن گیا ہوں

یہ دنیا کتنا آگے بڑھ چکی ہے
مگر صدیوں سے میں ساکت کھڑا ہوں

دہکتی آگ میں فکر و عمل کی
بہت دن تپ کے اب کندن بنا ہوں

بظاہر اک مکمل جسم خاکی
بباطن ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہوں

مرے رہرو کبھی منزل نہ پائیں
میں صحرا میں بھٹکتا راستا ہوں

سراپا بن گیا آوازِ غم کی
شکستِ سازِ دل کی اک صدا ہوں

بگولوں نے حقیقت کھول دی ہے
قمر کے راز سے اب آشنا ہوں

افسانہ

احمد ابراہیم علوی
۳۰- ہیلتھ اسکوائر
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

ڈوبتے لمحے

ٹرین میں سفر کرتے ہوئے کیسے کیسے خیالات آتے ہیں، کتنی عجیب باتیں یاد آتی ہیں، ان باتوں کا کوئی اور چھور نہیں ہوتا، بے ربط یادیں، بے تکی سی باتیں...

گنگا کے پُل سے جمنا کے ساحل تک جانے والی گنگا جمنا ایکسپریس اپنی پوری رفتار سے پٹریوں پر دوڑ رہی ہے اور ایسے میں اسے یاد آرہے ہیں وہ دن جب ہر پل اور ہر لمحہ جینے کو بہت دل چاہا کرتا تھا۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ وہ دن اور تھے یہ دن اور ہیں تب زندگی کی صبح تھی اب شام ہے اور شام کے بعد یقینی طور سے رات آتی ہے۔ رات چاہے جیسی ہو اندھی اور کالی ہوتی ہے اور دن کے خاتمے کا باعث ہوا کرتی ہے۔ شام کے بعد رات دبے پاؤں آتی ہے پھر بھی لگتا ہے جیسے اچانک آتی ہے۔ مدراس کے میرینا بیچ پر جسے امریکہ کے بعد دنیا کا سب سے بڑا بیچ کہا جاتا ہے ہزاروں لوگ شام سے قبل ہی جوق در جوق اس لیے جمع ہوتے ہیں کہ وہ دیکھ سکیں کہ اچانک سورج کیسے غروب ہوتا ہے۔ دن کی سفیدی ختم ہوتی ہے اور رات کی تاریکی چھانے لگتی ہے جیسے جیسے سورج ڈھلتا جاتا ہے اس کی طرف مرکوز نگاہیں تعداد میں بڑھنی لگتی ہیں۔ سمندر کے اُس پار فٹ بال کے برابر سُرخ سُرخ گولا جیسے لپ سے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ لوگ حیرت سے دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ہیں اس کی زندگی کی رات بھی ایسے ہی اچانک کوئی دم ہو جائے گی۔

...... کتنی حقیر ہے یہ زندگی اور اس کی ساری تگ و دو صبح سے شام تک ہر جائز اور ناجائز طریقے سے زیادہ سے زیادہ آمدنی کی فکر، خوب سے خوب تر کی تلاش..... پھر سوتے میں بھی خواب میں بھی یہی دنیا ــــ لیکن آنکھ بند ہوئی کہ ساری رونقیں ختم ہوئیں۔ ایک زندگی میں بھی کتنی بار مر مر کر جینا ہوتا ہے پھر بھی زندگی کی للک ہے کہ ختم ہونے ہی کو نہیں آتی۔ روز لوگ مرتے ہیں بلکہ ہر لمحہ مرتے ہیں کسی کو شمشان گھاٹ پہنچایا جاتا ہے تو کسی کو قبرستان لے جایا جاتا ہے۔ اس نے خود کتنوں کو کندھا دیا ہوگا کتنوں کو مٹی دی ہوگی کتنوں کو قبر میں اتارا ہوگا لیکن صرف ایک لمحے کے لیے ہی یہ احساس جاگا ہوگا کہ ایک دن میرا بھی یہی انجام ہونا ہے اور اس کے بعد پھر وہی دنیا اور اس کے جنجال۔

یاد آتا ہے آج سے سترہ سال قبل اس نے اپنے باپ کو قبر میں اتارا تھا تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا دل بہت اداس تھا اور سوائے اس ایک احساس کے کوئی اور احساس نہ تھا کہ میں نے جو کھو دیا وہ اب کبھی نہ مل سکے گا۔ دنیا پھر بھی بڑی بے ثبات اور بے کیف نہ نظر آتی تھی جینے کی تمنا اور آرزو پوری طرح باقی تھی پھر جب چند دنوں بعد غم بالکل مندمل ہو گیا تو یہ احساس ہی جاتا رہا کہ مجھے بھی ایک دن مرنا ہے۔ پھر ابھی دو سال پہلے موت نے اپنی حقیقت کو بھرپور احساس کے

تھا اُس سے منوالیا جب وہ ایک بار پھر قبر میں اُترا اور اس کیوڑے اور گلاب کی بوتلوں کو خالی کر کر کے قبر کی مٹی کو معطر کر دیا پھر کافور کی خوشبو میں بسے ہوئے اپنی ماں کے لاغر جسم کو ہر ممکن احتیاط کے ساتھ قبر میں اتارا اس وقت دنیا سے انتہائی حقیر لگ رہی تھی اور اسے جینے کی ذرا بھی خواہش بھی بڑے افسردہ احساسات نے اُسے گھیر رکھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کبھی میری ماں مجھے چھوٹی موٹی سمجھ کر آہستہ سے اٹھا کر گود میں لیتی ہوگی۔ اس وقت وہ میرے لیے گاما دارا کی طرح مضبوط ہاتھ پیر والی رہی ہوگی اس وقت وہ بیٹے دنیا میں اس سے زیادہ طاقتور اور شفیق کوئی اور نہ تھا مگر آج وہ کیسی نحیف و ناتواں ہے کہ میں اس کے مُردہ جسم کو بھی چھوتے ہوئے ڈر رہا ہوں اسی وقت نہ جانے کیوں اس کے دل میں یہ خیال آیا — آج سے پندرہ سال قبل میں نے اپنے باپ کو قبر میں لٹایا تھا۔ بہت ممکن ہے آج سے پندرہ سال بعد میرا بیٹا مجھ کو اسی طرح قبر میں اتارے — لیکن پندرہ سال تو بہت ہوتے ہیں — میں پندرہ سال جینے کی توقع نہیں کر سکتا ہوں پھر کیا ہوگا — پندرہ سال سے قبل تو میرا بیٹا اس قابل نہ ہو سکے گا کہ وہ مجھے قبر میں اتار سکے — لوگ کہتے ہیں خوش نصیب ہوتے ہیں وہ ماں باپ جن کی مٹی اپنے بیٹوں کے ہاتھوں سوارت ہوتی ہے۔ تو کیا میری مٹی سوارت نہ ہو سکے گی — نہ جانے پھر کیا ہو۔ ہو سکتا ہے میری مٹی سے کمہار گھڑے بنائے تو وہ بھی ایسے خراب ہوں کہ پانی ٹھنڈا نہ ہو سکے۔ یاد پڑتا ہے گرمیوں میں بی اماں گھڑے کا پانی پی کر اکثر کہا کرتی تھیں ”نہ جانے کس کی مٹی ہے نیا گھڑا ہے پھر بھی پانی ٹھنڈا نہیں ہوتا“ — شاید جن کی مٹی سوارت تو نہیں ہوتی ان کی مٹی سے بننے والے گھڑوں کا پانی ٹھنڈا نہیں ہوا کرتا ہے — تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میری زندگی دوسروں کے لیے بے فیض رہی اور انجام بھی بے فیض رہے گا یہ احساس اتنی تاخیر سے ہوا کہ

اب وہ کچھ کرنا چاہتا تو بھی نہیں کر سکتا تھا — وہ دنیا کی دوڑ میں شامل ہے جس طرح سب دیوانہ وار دنیا کی تمام آسائشوں اور راحتوں کی طرف لپکے چلے جا رہے ہیں وہ بھی ویسے ہی لپک رہا ہے بلکہ اس کی کوشش تو جھپٹ کر سب کچھ حاصل کر لینے کی ہے۔

پہلے لوگ حیدر آباد چلے جا رہے تھے کہ نظام کی حکومت میں بڑی دولت تھی، ملازمتیں آسانی سے مل جاتی تھیں۔ پھر پاکستان بنا تو اُدھر بھاگے جب اُدھر سے مایوسی ہوئی تو سات سمندر دور واقع برطانیہ بڑا نزدیک لگا اور پڑھے لکھے اَن پڑھ سبھی وہیں جانے لگے چھوٹا سا ملک تھا پھر آدمی صرف ہندستان سے ہی نہیں پاکستان، افغانستان اور برما سبھی جگہ سے جا رہے تھے اس لیے بہت جلدی وہاں کے بھی دروازے بند ہو گئے۔ یار لوگوں نے ایک اور جگہ کھوج نکالی اور کمربستہ ہو گئے کناڈا کے لیے اب وہاں بھی دروازے بند ہیں لیکن پیٹرو ڈالر کا سیلاب خلیجی راستوں میں آیا ہوا ہے۔ وہاں آبادی اتنی کم ہے کہ اتنے زبردست سیلاب کی روک تھام اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے وہاں کے لوگوں کو تحتی براعظم کے مزدوروں کی ضرورت ہے اور صاحب لوگ بھی بہتی دولت کے دہانے اپنے گھروں کی طرف کرنے کے لیے مزدور بن بن کر ہنسی خوشی ہانپتے کانپتے ادھر ہی بھاگے چلے جا رہے ہیں — وہ بھی پوری طرح دنیا کے جنجال میں پھنسا ہوا ہے اسی لیے اسی طرف بھاگا چلا جا رہا ہے — اس کی بیوی نے اپنی جان سے عزیز اپنے زیورات کو بیچ کر اسے ایک جینٹے سے دس ہزار روپے کا ویزا خرید کر دیا ہے خلاف توقع بڑی ہنسی خوشی اس کا اسباب ٹھیک کر کے بڑی خندہ پیشانی سے اسے الوداع کہا۔ وہ ٹرین میں بیٹھا ہوا بھاگا چلا جا رہا ہے اسے کل صبح دہلی پہنچ کر رات کی فلائیٹ سے بحرین پہنچنا ہے جہاں پہنچتے ہی وہ سونے کے انڈے دینے والی مرغی بن جائے گا۔ پہلے

ہی ڈرانٹ میں اس کی بیوی اپنے بیچے ہوئے زیورات کے
عوض اس سے وزنی خالص سونے کے زیورات خرید لے گی۔
پھر گود میں ہمکنے والی بچی کی شادی کے سارے انتظامات پورے
کر لیے جائیں گے۔ جھونپڑی نما ٹوٹا پھوٹا مکان دیکھتے ہی
دیکھتے عالیشان عمارت میں تبدیل ہو جائے گا۔ گھر میں کھانے
کے لیے وہ ڈنر سٹ استعمال ہو گا جس کی خصوصیت یہ ہے کہ
گرنے سے اس میں بال بھی نہیں پڑتا ہے۔ پھر اس میں ہر
موسم میں کھانا گرم اور تازہ ہی رہتا ہے۔ اس کے گھر میں جاپانی
کار نگین ٹی۔ وی آئے گا وہ کبھی تفریح ان دنوں ہیں ۔۔ جب
یہ سب کچھ ہو جائے گا تو رفتہ رفتہ اس طرح خاندان کی ہر لڑکی
کو سونے سے پیلا کر دیا جائے گا۔ یہی سب کچھ تصور کرتے ہوئے
اس کی بیوی اسے رخصت کرتے وقت خلافِ معمول ذرا بھی
مغموم نہیں ہوئی جبکہ اس کا دلی تک جانا بھی اس کے لیے ملال
کا باعث ہوا کرتا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا۔

" میں بکاؤ مال کی طرح ایکسپورٹ کیا جا رہا ہوں۔ مجھ
سے وابستہ ہر فرد اپنے مستقبل کو سنورتے دیکھ رہا ہے مگر میں
خود کچھ نہیں سوچ پا رہا ہوں ۔۔ میں نے اس بستی کو انسانوں کی
بستی سمجھا تھا اسی لیے انسانوں کے درمیان انسان ہی بن کر
رہنا چاہا تھا مگر لوگ مجھے سونے کے انڈے دینے والی مرغی
یا بکاؤ مال بنا کر رکھنا چاہتے ہیں اس لیے مجھے اس دنیا کی
چکاچوند میں کوئی کشش نہیں نظر آ رہی ہے۔ مجھے ہر چیز
بڑی حقیر، بڑی بے ثبات اور بڑی بھدی دکھائی دے رہی
ہے۔ میں نہ کچھ دیکھنا چاہتا ہوں اور نہ کچھ سننا اور شاید مرنے
سے پہلے آدمی اسی طرح کی کیفیت کا شکار ہوا کرتا ہے۔ مجھے
موت بہت قریب سے آواز دے رہی ہے۔ میں اس کی آواز
پر لبیک کہنے کے لیے اپنے کو آمادہ کر رہا ہوں ۔۔ کچھ عجیب سا
احساس ہو رہا ہے ۔۔ میں نے اجنتا اور ایلورا کے غاروں میں
زندگی کی رمق دیکھی ہے۔ گولکنڈہ کے قلعے پر محیط زندگی کی معنویت
کو سمجھا ہے کشمیر کی برفیلی وادیوں میں حُسن کے نظارے کیے ہیں،
راجستھان کے ریگزاروں میں زندگی کی حرارت پائی ہے۔۔۔۔
قطب مینار کی بلندیوں سے دنیا کو دیکھا ہے۔ امریکہ کے اسکائی
اسکریپرس کو دیکھ کر انسان کی عظمت کا یقین کیا ہے۔ نیاگرا فالس
پر قدرتی حُسن کے مسحور کن مناظر کو آنکھوں میں بھر لینے کی بھرپور
کوشش کی ہے، ماسکو کی دنیا کی سب سے زبردست انڈر گراونڈ
ٹرینوں میں سفر کیا ہے، ٹوکیو اور شنگھائی میں انسانوں کے جنگل
دیکھے ہیں، کہیں زندگی کی رمق معدوم ہوتی نہیں دیکھی، مایوسی
اور احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوا، مگر اب مایوسی مجھ پر مسلط
ہو گئی ہے ۔۔ لوگوں کو آخر کیا ہو گیا ہے کیوں خواہ مخواہ خام خیالی
کے شکار ہو رہے ہیں کیوں مجھ سے امیدیں لگائے بیٹھے ہیں وہ
کیوں یہ نہیں سوچتے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ میری ٹرین کو حادثہ
پیش آ جائے اور میں راستے ہی میں دم توڑ دوں یا جہاز ہی ڈوب
جائے اور اگر ایسا نہ ہو تو یہ بھی ممکن ہے کہ ہوائی اڈے پر اترتے
ہی میرا ہارٹ فیل ہو جائے ۔۔ تب تب تب پھر کیا ہو گا۔
سونے کے انڈے دینے والی مرغی اور بکاؤ مال کا کیا ہو گا ۔۔
کیسے ہیں لوگ چند سکوں کی خاطر کیسے کیسے وہموں کے شکار
ہو جاتے ہیں اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتے ہیں اپنے خواب بھی
بیچ دیتے ہیں اپنے خیالوں کو ادھار دے دیتے ہیں۔"

سکوت ۔۔ چند لمحے سکوت اور پھر خیالات کا لامتناہی
سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

اُسے یاد آ رہے ہیں وہ دن جب وہ بھی معمولی معمولی
باتوں سے خوش فہمیوں کا شکار ہو جایا کرتا تھا۔

گنگا کے پل سے جمنا کے ساحل تک جانے والی گنگا جمنا
ایکسپریس پوری رات دوڑتی رہنے کے بعد تھک سی گئی ہے
اب جمنا پل پر سستا سستا کر چل رہی ہے۔ وہ بھی تمام
رات طرح طرح کی باتیں سوچتے سوچتے تھک چکا ہے اور
اب مزید کچھ نہیں سوچنا چاہتا ہے اس لیے وہ عہد کرتا ہے
اب اسے کچھ کر گزرنا ہے۔ وہ اپنا بریف کیس اٹھاتا ہے اسے

(باقی صفحہ ۹۶ پر)

غزلیں

قاسم شبیر نقوی نصیر آبادی
شبیر منزل۔ قصبہ نصیر آباد۔
ضلع رائے بریلی

دادیٔ غم میں ہوں تنہا کوئی ساتھی بھی نہیں
آفتیں آئی تھیں دل پر گر اتنی بھی نہیں

کم ہی ہو جاتی تری یاد کی الجھن لیکن
میں نے یہ بات کسی حال میں سوچی بھی نہیں

ابتدائے محبت کی بہت نازک ہے
یعنی محسوس یہ ہوتی بھی ہے ہوتی بھی نہیں

دل ہے اور کیفیت کشمکشِ یاس و امید
ایک کشتی ہے جو ڈوبی بھی ہے ڈوبی بھی نہیں

سوچتا ہوں کہ بس اب اُن سے کہوں کچھ لیکن
سوچتا یہ ہوں کہ ایسی کوئی جلدی بھی نہیں

عقل کے کتنے ہی طوفان فلک تک پہونچے
اب تک اک موجِ جنوں ہے کہ جو اٹھی بھی نہیں

رضا امروہوی
پی۔ ٹی ۲۴۔ جی پوائنٹ
نئی دہلی ۱۱

شکستہ دل ہوں کہوں تم سے حال کیا دل کا
بجھا بجھا سا ہے گویا چراغ محفل کا

مرے لبوں پہ تبسم کی اک کرن بھی نہیں
ہجوم ہے مرے چاروں طرف مسائل کا

کہاں کہاں نہ ہوا خونِ آرزوئے حیات
کہاں کہاں نہ لٹا قافلہ مرے دل کا

یہ زحمتیں، یہ مصائب، یہ الجھنیں توبہ
غمِ حیات سے بچنا محال ہے دل کا

خدا کرے کہ نہ ہو میری گمرہی کو خبر
کشاں کشاں لیے پھرتا ہے شوق منزل کا

حسیں ہے شہرِ غزالاں، حسین راہ گزر
قدم قدم ہے مگر سامنا مراحل کا

رضاؔ کے سر پہ تو مشکلکشا کا سایہ ہے
اُسے نہیں ہے تردد کسی بھی مشکل کا

سیّد اظہر حسین ہاشمی
نعمت اللہ روڈ۔ امین آباد،
لکھنؤ

جوشِ نمو پہ فصلِ بہاراں ہے آج کل
زنگینیوں پہ اپنی گلستاں ہے آج کل

شاید کہ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
دامن ہے چاک ٹکڑے گریباں ہے آج کل

کچھ منحصر ہم اہلِ جنوں ہی پہ یہ نہیں
ہر شخص زندگی سے پریشاں ہے آج کل

اس دورِ کش مکش میں فراغت جسے ملے
بس اپنے عہد کا وہ سلیماں ہے آج کل

ڈرتا ہوں رک نہ جائے کہیں نبضِ کائنات
حسنِ اثر دعا سے گریزاں ہے آج کل

نوکِ مژہ پہ اشک ہیں ہم شکلِ مہر و ماہ
اک ایک داغ دل کا نمایاں ہے آج کل

وہ خونِ دل تھی جس کی نہ قیمت زمانہ میں
وہ بھی دیارِ شوق میں ارزاں ہے آج کل

اظہرؔ فسانۂ غمِ دل اور کیا کہوں
سینہ میں جیسے آگ فروزاں ہے آج کل

اظہار صہبائی
انصاری منزل
بازیر خیل۔ شاہجہانپور
۲۴۲۰۰۱

نئی دھرتی نئے لوگ

گاؤں بستی کے لوگوں میں وہ ڈونکر کے نام سے مشہور ہے۔ موہن پور کے باسیوں کے لیے یہ کوئی نیا نام نہیں ہے۔ وہاں کے ہر بزرگ اور بوڑھے شخص کو اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ بلکہ اس کے اصل نام میں ڈونکر کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ مقھوری ڈونکر بھی ایک طویل عرصے سے اسی پہچان کا شکار ہے۔ اسے اچھی طرح یاد ہے جب کھیت پر ایک شام اسے اپنے سر کے پہلے سفید بال کا احساس ہوا تھا۔ دھول سے اٹے سر کے اس سفید بال کا احساس اسے ننکا بوا نے دلایا تھا جو ایک قریبی کھیت کی مینڈ پر بیٹھی اپنے پوپلے منھ سے گانجا بھری چلم کے گہرے کش کھینچ رہی تھی۔ ننکا بوا کی بات سن کر وہ یوں دھیمے سے مسکرا اٹھا تھا جیسے کسی بیمار کے افسردہ چہرے پر مسکراہٹ رینگ اٹھتی ہے۔ اگلے ہی دن اس نے سنا تھا کہ گونر کھانے کی غرض سے کسی آن گاؤں جاتے ہوئے ننکا بوا نے لہڈ دے گر کر دم توڑ دیا یوں پہلے سفید بال کی دکھ بھری کہانی جنم لینے ہی اچانک اس کے سارے بالوں کو پکا ڈالتی ہے۔ اب تو اس سفید کی پلکوں کی سیاہی کو بھی شکست دینی شروع کر دی ہے۔ پستہ قد مریل جسم چھوارے کی مانند بٹ سکڑا اور سوکھا جھریوں دار چہرہ۔ پتلی گردن پر رکھا ہوا بے ڈھنگا سر جو اکثر اسپرنگ لگے کھلونے کی مانند ہلتا رہتا ہے۔ غربت و افلاس کے تھپیڑے کھایا ہوا مقھوری ڈونکر صرف تین بیگھا بھوئیں (بھوم) اور ایک عدد بھورے کمزور بیل کا مالک ہے —— جوت کے سمے اسے دوسرے بیل کے لیے گاؤں کے لوگوں کی خوشامد کرنا پڑتی ہے۔

بیا اور ماہ تاری (باپ۔ ماں) بچپن میں ہی پرلوک سدھار چکے ہیں ورنہ اب تک کبھی کا اس کا بیاہ رچ گیا ہوتا ایسا ڈونکر کا وشواس ہے۔ اس کی زندگی میں سمندر کی ریت کی مانند دور تک پھیلی ہوئی تنہائی کے علاوہ اور ہے ہی کیا؟ کبھی کبھی تو اس تنہائی کی شدت کی بنا پر اسے اپنا جیون بالکل اوسر کھیت کی طرح محسوس ہونے لگتا ہے۔ معمولی زمین سے بیوی بچوں کا پیٹ تو پلنے سے رہا یہی سوچ کر اس نے خود کو تنہائی کا خول پہنا لیا ہے۔ اس کے کھیت کی اوسر مٹی میں دھان تو پیدا ہونے سے رہا۔ ربیع کی فصل میں وہ اپنا سب کچھ ایشور پر سونپ دیتا ہے۔ گاؤں میں پانی کا کوئی سادھن نہیں ہے اس لیے گیہوں کی بوائی کے بعد اسے ورشا کی راہ دیکھنا ہوتی ہے۔ اکثر سوکھے کے کارن وہ گنگا جی پر ورشا کے لیے کتھا بول آتا ہے۔ اگر ایشور مہربان ہو گیا تو تھوڑا بہت غلّہ اس کے بھاگیہ میں آجاتا ہے۔ غلّہ پاکر وہ خوشی سے یوں دیوانہ ہو اٹھتا ہے جیسے گیہوں کی کچی بالیاں ہوا کے تیز جھونکوں کی تاب نہ لاکر پاگل پن سے رقص کرنا شروع کر دیتی ہیں۔

ڈھولا اور بارہ ماسی وہ صرف انھیں دنوں گنگناتا ہے۔ غلّہ پیدا نہ ہونے کی صورت میں اسے مسلسل فاقوں کے بھرپور طمانچے کھانے پڑتے ہیں۔ ان برے دنوں میں وہ اکثر گوبر کے کنڈے تھاپ کر شہر بیچ آتا ہے لیکن اب اس کے جسم میں اتنی طاقت نہیں رہی۔ کبھی کبھی تو آنکھوں کے سیاہ حلقوں میں دھنسی اس کی ویران اور بے نور آنکھیں یوں آسمان میں تیرتے ہوئے

بادلوں کے مختلف ٹکڑوں پر جم جاتی ہیں جیسے اس کے رنگوں میں ڈنکر کو کسی مخصوص رنگ کی تلاش ہو۔ وہ رنگ ـــــ جو اب تک اسے نہیں مل سکا ہے لیکن بادلوں کے ٹکڑوں میں ڈوبے رہنے کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہیں چلتا ہے کیونکہ کھیتوں کی مینڈ پر کھیلتے ہوئے گاؤں کے ننگ دھڑنگ اور شرارتی بچے اسے "آکاش بنیا" کہہ کر چڑانا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ جھنجھلا کر زنگ آلود ڈبیہ سے چونا ملی تمباکو نکال کر ہتھیلی پر ملنے لگتا ہے ـ یہ اس کی عادت میں شامل ہے۔ اس حرکت سے شاید وہ اپنی جھینپ مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن شریر گنوار بچے بھلا کب ماننے والے؟ اچانک ایک خیال اس کے دماغ میں بری طرح مچلنے لگتا ہے۔ وہ گھنٹوں اپنی اندھیری جھونپڑی میں پڑا رات کے سناٹے میں چپ چاپ سوچتا رہتا ہے۔ کاش! دوسرے دیہاتوں کی مانند میرے گاؤں میں بھی سرکار کی طرف سے کوئی ٹیوب ویل ہوتا، جھلملاتے سفید پانی کی نہر کی کھدائی ہوتی تو ہم جیسے غریب کسانوں کی کھیتیاں ہمیشہ ہری بھری بنی رہتیں۔ ہم درشا پر نربھر نہیں رہتے۔ ہمارے کھیت سوکھنے سے بچ جایا کرتے ـــ بادلوں کا بھر دسہ ہی کیا۔ برسے یا پھر بن برسے ہی نکل گئے۔ ـــ وہ زیر لب بڑبڑانے لگتا۔ "ہے پرماتما! تو ایک بار میری بنتی اور سن لے"۔ لیکن آج تک ایشور نے اس کی بنتی نہیں سنی، کبھی کبھی تو وہ اپنی اس بنتی پر کھسیانی بلی کی مانند جھنجھلا کر رہ جاتا اور سوچتا ایشور سا تویں آسمان پر نہ جانے کس کھوہ میں چھپا بیٹھا ہے اس نے میری بنتی ان سنی کرنے کی قسم کھا لی ہے پچھلے سال جب اس کے گیہوں ورشا کی کمی کے کارن سوکھنے لگے تھے تو وہ کئی بار پانی کی ضرورت سے بھکاری سنگھ کے پاس بھی گیا تھا۔ لیکن ٹھاکر نے اسے جلی کٹی سنا کر چلتا کر دیا۔ بھکاری سنگھ کی جلی کٹی سن کر اس کا گلا ریت کی مانند خشک ہو گیا تھا۔ لیکن وہ لہو کے گھونٹ پی کر مغموم اور اداس چپ چاپ سر نیچا کیے وہاں سے لوٹ آیا تھا۔ جب کبھی وہ شام کو تولے مہتا کے چوپال پر بیٹھتا ہے تو اس کی زبان پر صرف پانی کا ہی ذکر ہوتا۔ ـ ہر کوئی اس کی رائے سے متفق ہے۔ آخر کار اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو ہی گیا۔

آج سپیدئ سحر نمودار ہونے کے کچھ دیر بعد ہی دھول اڑاتی ایک جیپ کی آواز سن کر گاؤں بستی کے سبھی لوگ چونک اٹھتے ہیں یہ جیپ شاردا نہر کھنڈ کی ہے۔ جیپ میں محکمۂ نہر کے اعلیٰ افسران بیٹھے ہیں۔ جیپ رکتے ہی گاؤں کے باشندے افسران کے چاروں طرف ایک دائرے کی شکل میں جمع ہو جاتے ہیں۔ افسران کا کہنا ہے کہ وہ نہر کھدوانے کے لیے اس حلقہ میں سائٹ دیکھنے آئے ہیں۔ نہر منظوری کی یہ خبر جلد ہی سارے گاؤں میں لہسن کی خوشبو کی مانند پھیل جاتی ہے۔ گاؤں کا ہر شخص خوشی سے پاگل ہو اٹھتا ہے۔ سائٹ کا معائنہ اور پیمائش کے بعد افسران کہتے ہیں۔ نہر کی زد میں آکر کچھ لوگوں کے کھیت کٹ جائیں گے۔ بغیر اس کے نہر کی نکاسی ممکن نہیں۔ ان کا کہنا ہے جن لوگوں کے کھیت نہر کی زد سے کٹیں گے ان سارے لوگوں کو سرکار زمینوں کا معقول معاوضہ دے گی۔ ضلعدار فوراً ایسے ناموں کی فہرست تیار کرتا ہے۔ ممبردار بھکاری سنگھ۔ تلسی ڈونکر۔ رتے۔ ہریا۔ جوگ راج۔ بیکو لال۔ بھگو۔ دیارام اور مغفوری ڈونکر کاغذی کارروائی مکمل ہونے کے بعد جیپ واپس لوٹتی ہوئی دوبارہ دھول کے سمندر میں گم ہو جاتی ہے

اگلے ہی دن سے نہر کی کھدائی کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ پھاوڑوں سے پیلی پیلی سوندھی اور خوشبودار مٹی کے اونچے ڈھیر لگاتی مزدوروں کی طویل قطار دل و جان سے اپنے کام میں جٹ گئی ہے۔ مینڈوں کو دونوں طرف مٹی ڈال کر برابر کیا جانے لگا ہے۔ شہر سے پائپ اور اینٹیں ڈھونے والے ٹرک برابر چکر لگا رہے ہیں۔ مغفوری ڈونکر کی بھی دو بیگھے کی ٹکڑیا نہر کی زد میں آگئی ہے۔ وہ سوچتا ہے اب صرف باقی کی ایک بیگھا بھوئیں ہی میری زندگی کی جنت ہوگی۔ ٹھیک تین ماہ بعد نہر کا جھلملاتا اور شفاف پانی گاؤں کے لوگوں کا استقبال کرتا ہے۔ اس دن گاؤں میں خوب ہو ہلا ہوتا ہے۔ برگد کے تلے جنید بابا کے چونا پتے سفید مزار پر چادر

چڑھائی جاتی ہے۔ گاؤں کے غریب کسان گاتے بجاتے رات گئے تک گانجہ اور تمباکو کی چلمیں خالی کرتے رہتے ہیں۔ اور پھر پرشاد بانٹ دیا جاتا ہے۔ اگلے ہی دن سے نہر کے ذریعے دھان کے بلیوا کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔

جو ماس کی شام ہے۔ کینال کے ڈپٹی ریونیو آفیسر گرام پردھان بھکاری سنگھ کی چوپال پر بیٹھے ان کاشتکاروں کی شناخت کرا رہے ہیں جن کے کھیتوں کو نہر سے نقصان پہنچا ہے۔ ڈپٹی کا کہنا ہے لینڈ کیس کی منظوری ہو گئی۔ سرکار نے کسانوں کو ان کی نہر سے کٹی زمینوں کا معاوضہ بھیجا ہے۔ باری باری انگوٹھے کا نشان کاغذ پر جماتے ہوئے ایک ایک کاشتکار کو معاوضہ کی رقم دی جا رہی ہے۔ سب سے آخر میں منگوری ڈونکر کی باری آتی ہے جو ایک طرف دھرتی پر اکڑوں بیٹھا چلم کے گہرے کش کھینچ رہا ہے اپنا نام سنتے ہی وہ چلم کی جلتی تمباکو زمین پر پلٹتے ہوئے کہتا ہے "ہجور!! ہمرے نا ہیں (نام) کا روپیہ لوٹائی دیں۔ کا ہم لٹے لوگ اپنے گام کے لیے اتنو نائیں کر سکت کہ تھوڑے کے پھایدہ (فائدہ) کے لیے دو بیگھا جمین دئی سکیں۔ سرکار کے کام کے ساتھے ساتھ ہمارو بھی تو کچھو پھرج (فرض) ہے۔ نہر سے تو سبھی لوگن کو لابھ پہنچئے گا۔"

منگوری کی بات سن کر ڈپٹی ڈونکر کی طرف یوں دیکھنے لگتا ہے جیسے اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ جھریوں کے جال سے بھرا اداس چہرہ، پھٹی گندی بوسیدہ دھوتی جو جھول جھول کر چیتھڑوں کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ منگوری ڈونکر ڈپٹی کی نگاہوں کی پرواہ کیے بغیر اپنی سیاہ خالی چلم کو ٹھنڈے کرتے کی جیب میں رکھتے ہوئے آہستہ سے اٹھ کر چل دیتا ہے۔ ڈپٹی دیر تک اسے گھورتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ باجرہ کی سرمئی جھومتی بالیاں اور اونچے کھیت اس کے وجود کو یوں اپنے اندر سمو لیتے ہیں۔ گویا کسی تھکے ہارے نیل کنٹھ کو درخت کی سبز پتیوں نے اپنے اندر سمیٹ لیا ہو۔

●●

غزلیں

غلام مرتضیٰ کیف کاکاروی
[illegible] دہلی

شام سے سویا سویا تھا صبح ہوئی تو جاگا عشق
چھیل چھبیلا شوخ رسیلا مستی کا اک دریا عشق
بجلی بن کر چمکا اور بادل بن کر چھایا عشق
کھلتے ہیں شگوفے گل بوٹے جھم جھم جھم برسا عشق
دل کے محل میں راج رچانے خاک وتنوں کے ناچ نچائے
زخموں پر مرہم رکھے ٹوٹے دلوں کا مونس عشق
جذب جنوں کی لاج سلامت حسن کے سر پر تاج سلامت
کل عالم سجدہ میں گرا پردہ اٹھا اور آیا عشق
کس نے سمجھا کس نے جانا کس نے پرکھا کس نے پایا
جتنے منھ ہیں اتنی ہی باتیں ایسا عشق اور ویسا عشق
ہے سامنے منزل راہ نہیں دریا ہے پر اس کی تھاہ نہیں
بس کیفؔ یہی کیف ہے عالم میں کیسا حسن اور کیسا عشق

اقبال احمد قادری
قادری منزل
۲۵۰ دریبہ، جون پور

جنوں کی بات بھی ہوتی ہے ہوشمندانہ
سنبھل سنبھل کے قدم رکھ رہا ہے دیوانہ
یہ سوچتا ہوں ترے میکدے کا کیا ہوگا
بدل گیا جو کہیں مے کشوں کا پیمانہ
جنوں کی حوصلہ افزائیاں معاذ اللہ
اب اپنے آپ کو بھی کھو چکا ہے دیوانہ
ٹھکانہ موج بلا آج ان کا کیا ہوگا
جو ناخدا سے ہیں بدظن خدا سے بیگانہ
مٹے گی خون تمنا کی کس طرح شوخی
حقیقتوں کو بنا دو ہزار افسانہ
ملا جنوں بھی تو ہوش و حواس کھو کے ملا
اب اور کچھ نہیں کہتا کسی سے دیوانہ
ہے بے نیاز خلوص و وفا مرا اقبالؔ
ترا غرور ہے محتاج آئینہ خانہ

اترپردیش شاہراہِ ترقی پر!!

ادارہ جاتی مالیات

سال ۸۳-۱۹۸۲ء میں ہماری ریاست میں بینکنگ کو ہمہ گیر فروغ حاصل ہوا۔ اس سال ریاست میں کاروباری بینکوں کی ۴۲۹ شاخیں کھولی گئی ہیں جس کے نتیجہ میں مارچ ۱۹۸۳ء کے آخر میں ریاست میں بینک شاخوں کی تعداد بڑھ کر ۵۲۰۰ ہو گئی ہے اور فی بینک شاخ آبادی کا تناسب کم ہو کر ۲۱۰۰۰ پر آ گیا۔ بینکوں کی تین چوتھائی شاخیں دور افتادہ دیہی علاقوں اور نیم شہری علاقوں میں ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ مارچ ۱۹۸۵ء تک یہ تناسب کم ہو کر ۱۷۰۰۰ پر آ جائے تاکہ عوام کی بینکنگ کی ضرورتیں بآسانی پوری کی جا سکیں۔

مسلسل کوششوں کے نتیجہ میں ریاست میں ۸۳-۱۹۸۲ء کے دوران مختلف سرکاری اور امداد باہمی اداروں کے پراجکٹوں اور ریاست کے ترقیاتی پروگراموں کے لیے ۹۱۶ر۴ کروڑ روپے کی رقم ادارہ جاتی مالیاتی وسائل سے فراہم کی گئی جس میں زرعی و امداد باہمی زمرہ میں ۴۵۱ر۳ کروڑ روپیہ، شکر صنعت اور گنا ترقی کے زمرہ میں ۱۵۹ر۸ کروڑ روپیہ، بجلی اور آبپاشی کے زمرہ میں ۱۰۱ر۷ کروڑ روپیہ، غذا اور رسد کے زمرہ میں ۱۰۰ر۳ کروڑ روپیہ اور صنعتی زمرہ میں ۸۱ر۸ کروڑ روپیہ حاصل ہوا۔

اس سال کی کامیابیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمیں یقین ہے کہ سال ۸۴-۱۹۸۳ء میں ہم ایک ہزار کروڑ روپئے سے زیادہ رقم ادارہ جاتی مالیاتی وسائل سے فراہم کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

جن بڑے صنعتی پراجکٹوں کے لیے رقم فراہم کی گئی ان میں اترپردیش ریاستی کپڑا کارپوریشن کی کتائی ملیں، اترپردیش ریاستی شکر کارپوریشن و اترپردیش امداد باہمی شکر فیڈریشن کی شکر ملیں، اور اترپردیش الکٹرانکس کارپوریشن کے پراجکٹ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ریاستی حکومت اور بینکوں کے درمیان رابطہ قائم رکھنے اور غریبی دور کرنے کے پروگراموں میں ان کا زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل کرنے کے لیے ترقیاتی افسروں کے مشترکہ تربیتی پروگرام کا سلسلہ شروع کیا گیا جس کے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے۔ سال ۸۳-۱۹۸۲ء میں ترقیاتی اسکیم کے تحت غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے ۵ر۱۳ لاکھ خاندانوں کے نشانہ کے مقابلہ میں ۵ر۶ لاکھ خاندانوں کو ۱۶۰ر۵ کروڑ روپے کی مالی امداد فراہم کی گئی جس میں سے ۶۸ فیصد رقم کاروباری بینکوں نے اور ۳۲ فیصد رقم امدادی بینکوں نے فراہم کی۔

یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ سال ۸۲-۱۹۸۱ء کے مقابلہ میں اس سال فراہم کی گئی رقم ساٹھ کروڑ روپے زیادہ ہے۔

اسی طرح اسپیشل کمپوننٹ پلان کے تحت بھی موصولہ اطلاعات کے بموجب مالیاتی سال رواں کے دوران نومبر ۱۹۸۲ء کے آخر تک ۱ر۵۴ لاکھ خاندانوں کو ۴۵ کروڑ روپے کی مالی امداد فراہم کی جا چکی ہے۔

اس سال قرض تقسیم کیمپ منعقد کرنے کا بھی ایک وسیع پروگرام شروع کیا گیا جس کے نتیجہ میں کاروباری بینکوں نے تقریباً دو لاکھ

ازادکو ۰ کروڑ روپے کی مالی امداد فراہم کی۔

مربوط دیہی پروگرام کے تحت مختلف ماڈل اسکیموں مثلاً ریشم کے کیڑے پالنے کے لیے اور ہینڈلوم نیز قالین بنکروں اور چمڑا صنعت کے کاریگروں کو مالی امداد فراہم کرنے کا بندوبست کیا گیا۔

دیہی علاقوں کی مالی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے اس سال ۴ نئے علاقائی دیہی بینک بجنور، مظفر نگر، سہارن پور اور نینی تال میں قائم کیے گئے۔ اس طرح علاقائی دیہی بنکوں کی تعداد بڑھ کر اب ۳۴ ہو گئی۔ یہ جو ریاست کے ۴۰ اضلاع کا احاطہ کرتے ہیں۔ دسمبر ۱۹۸۲ء کے آخر تک ان کی مجموعی جمع شدہ رقم ۱۳۹۲۲ کروڑ روپے تھی اور واجب الادا پیشگی رقم ۱۰۵۵ کروڑ روپے تھی، جو تقریباً چھ لاکھ چھوٹے اور معمولی کسانوں، بے زمین مزدوروں، دیہی کاریگروں اور بے روزگار کسانوں کو دی گئی۔

چھٹے پنج سالہ منصوبہ کے دوران پانچ نئے علاقائی دیہی بینک آگرہ، لکھیم پور کھیری، مظفر نگر، سہارن پور، اور دہرہ دون میں قائم کرنے کی تجویز ہے۔

ڈوبتے لمحے صفحہ ۳۹ کا بقیہ

کھولتا ہے اور اس میں سے اپنا پاسپورٹ نکال کر خود سے سرگوشی کرتا ہے — "یہ ہے میرا پاسپورٹ اور یہ نکلا — ویزا — دس ہزار روپے کا ویزا جس سے مجھے مزدوری ملے گی اور میں لاکھوں کماؤں گا۔ اپنا گھر بھروں گا اپنے رشتہ داروں کا گھر بھروں گا۔

طنز بھری مسکراہٹ اس کے چہرے پر چھا جاتی ہے۔ لوگوں کو آخر ہو کیا گیا ہے کیا خوش فہمی ہے۔ لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ میں آج بھی اپنی جگہ اٹل ہوں۔ میرا فیصلہ اٹل ہے — میں زندہ رہوں گا تو اپنے طور سے انسانوں کی طرح — بکاؤ مال بن کر نہیں — تمام خوش فہمیوں کی جڑ یہ ویزا ہے — میں ابھی اس ویزے کو پھاڑ کر دریا برد کیے دیتا ہوں"

دوسرے ہی لمحے اس نے ویزا پھاڑ کر ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال کر پرزوں کو جمنا میں پھینک دیا — اب اس کے چہرے پر بشاشت تھی۔

●●

مومن کی شاعری میں کش مکش صفحہ ۲۱ کا بقیہ

نظر آتی ہے۔ اسی وجہ سے کچھ لوگوں نے مومن کی شاعری کو چیستاں بھی کہا ہے۔ **

حواشی

۱ Individual Behaviour by Arthar W. Cowls and Donald Snygg P. 239

۲ Psychology by Stagner and Korwoski P. 493

۳ مضامین فرحت۔ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی۔ مرتبہ عزیز احمد ص ۱۵۲-۱۵۳

۴ تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ ص ۳۰۵-۳۰۶ ۵ گلشن بے خار۔ نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ ص ۱۲۳-۲

بقیہ حواشی — شاد عارفی — صفحہ ۲۹ سے آگے

۳۵ مکتوب شاد بنام سلطان اشرف ("ایک تھا شاعر" مرتبہ مظفر حنفی۔ ص ۵۸۵)

۳۶ " " " ("ایک تھا شاعر" " " ص ۵۲۳)

۳۷ کٹی پتنگ۔ مسعود اشعر ("فنون" لاہور۔ اشاعت خاص ۵ ۱۹۶۴ء، ص ۳۲۵-۳۲۶)

۳۸ مکتوب شاد بنام خاں امانت کمال ("ایک تھا شاعر"۔ مرتبہ مظفر حنفی۔ ص ۵۵۹)

۳۹ حامد علی خاں آنت ریوڑی کا گراں قدر عطیہ — ایک خبر (پندرہ روزہ "نیا خواب" رامپور یکم نومبر ۱۹۶۲ء ص ۸)

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں۔

نام کتاب: "زیتون کے پیڑ"

شاعر: —— ایم۔ کوٹھیاوی راہی

ملنے کا پتہ: ایڈیٹر 'اشتراک' قاضی پور خورد۔ گورکھپور

قیمت:

ہڈسن کا قول ہے کہ Litrature is The Product of Society۔ اس قول میں بڑی صداقت ہے۔ ہر عہد کا ادب اور ہر ملک کا ادب اپنے ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ زمانے کی تحریکات کا اثر ادب پر پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف واقعات اور حادثات کی جھلکیاں ادب میں نظر آتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ عالمی واقعات کا اثر بھی مختلف ملکوں کے ادب میں جلوہ ریزی کرتا ہے۔

ہندستان کے شعرا بھی اپنے عہد اور اپنے ملک سے متاثر ہوئے ہیں خصوصًا اقبال کی شاعری میں عالمی سیاست کی جھلک موجود ہے۔ جب یورپ کے ممالک ترکی کو تباہ کر دینا چاہتے تھے تو اقبال کو سخت صدمہ پہنچا۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں انھوں نے اپنی مشہور نظم "خضر راہ" کی تخلیق کی۔ اس کے بعد جب ترکی کو مصطفےٰ کمال پاشا کی قیادت میں عروج حاصل ہوا تو اقبال نے اپنی معرکۃ الآرا نظم "طلوع اسلام" کی تخلیق کی۔ جوش ملیح آبادی کے کلام میں بھی ہندستان کی سیاست کی جھلک موجود ہے۔ وہ بھی اپنے عہد سے متاثر ہوئے ہیں۔ فراق گورکھپوری کی نظم "پرچھائیاں" میں دوسری جنگ عظیم کے ہلکے ہلکے سائے نظر آتے ہیں۔ ہندستان کے دیگر شعرا نے بھی اپنے عہد کی عکاسی کی ہے۔

ایم۔ کوٹھیاوی راہی صاحب کے مجموعۂ کلام "زیتون کے پیڑ" کا تعلق بھی ان کے عہد سے ہے۔ چنانچہ "زیتون کے پیڑ" نظم میں بھی جنگ کا منظر پیش کیا گیا ہے ؎

اتنے میں اک ایسا شور اٹھا
ہر سمت سے چیخیں اٹھنے لگیں
اور سن سن گولیاں چلنے لگیں
جو دوڑا وہ بھی شہید ہوا
جو ٹھہرا وہ بھی شہید ہوا
جو چیخا وہ بھی شہید ہوا

اس مجموعے کی مختلف نظموں میں جنگ کے مناظر نظر آتے ہیں۔ اسرائیلیوں کے خوں ریز حملوں کے بعد بیروت پر کس طرح تباہی آئی، اس کا ذکر راہی صاحب نے نہایت موثر انداز میں کیا ہے۔

"زیتون کے پیڑ" کتاب کا مطالعہ ہم دو نقطۂ نظر سے کر سکتے ہیں۔ ایک تو اس کی ادبی حیثیت سے، اس میں راہی صاحب نے بہت سی اچھی نظمیں یکجا کر دی ہیں، اس مجموعے میں زیادہ تر نثری نظمیں ہیں اور نثری نظمیں عام طور سے بے کیف، بے رنگ اور سپاٹ ہوتی ہیں مگر راہی صاحب نے موضوع کی اہمیت کی مدد سے ان نظموں میں خلوص کا رنگ بھر دیا ہے۔

ادبی حیثیت کے علاوہ اس کتاب کی تاریخی حیثیت بھی ہے۔ اگر کوئی مورخ جنگ فلسطین کی تاریخ مرتب کرنا چاہے تو یہ نظمیں اس کام میں بھی معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

(ڈاکٹر) سلام سندیلوی

نام کتاب: "طلسم غزل"

شاعر: ظفر کلیم — قیمت: پندرہ روپئے ۱۵

ملنے کا پتہ: احباب اردو اکیڈمی۔ مومن پورہ۔ ناگ پور

ناگپور (مہاراشٹر) کی سرزمین سے ایک تخلیقی آواز ظفر کلیم کے عنوان سے ابھری اور حلق سے خلق تک پھیل گئی۔ "طلسم غزل" انھیں کے سحر آفریں احساسات کی سند ہے۔ بہت کم ایسے شاعر

ہوتے ہیں جن کا ظاہر و باطن دوہرے پن کا شکار نہ ہو، ظفر کلیم کی ذات اس الزام سے آزاد ہے۔

ان کے یہاں عصریت، جدت اور ماضی کے رنگ و روغن کی امتزاجی لو روشن ہے۔ ان کی شاعری میں جدید دور کی بہترین تہذیب بھی ہے اور عہدِ گزشتہ کی شاہکار تصویر بھی۔ ان کے یہاں علامتوں کا دھندلاپن یا ترسیل و تمثیل کی بے سمتیاں نہیں ہیں۔ موصوف ایک صاحب طرز شاعر کا درجہ رکھتے ہیں اور ایسے لوگ عموماً اپنے نظریات و مقاصد کی مسند سے ٹک کر ہی کچھ سوچنے کا عمل اختیار کرتے ہیں۔ اس کا اظہار ان کے ان اشعار سے بھی ہوتا ہے ؎

مرا وجود غنیمت ہے صبحِ نو کے لیے
نئی سحر کے اُجالوں سے ہے لگاؤ مجھے

جانے کس موڑ پہ ہے معرکۂ جہدِ حیات
پاؤں انگاروں پہ پڑتے ہیں نظر پھول پہ ہے

اس کتاب کی داخلی اساس کچھ ان کے حُزن شدید کی غماز بھی ہے جو کہ ان کی شریکِ حیات کے داغِ مفارقت کی دین ہے بقول شاعر ؎

قسمت نے مجھ سے چھین لیا جس رفیق کو
صدقہ ہے بس اسی کا مری شاعری تمام

مجموعی طور پر "طلسمِ غزل" ایک لطیف تلاش ہے۔ اُمید ہے اسے اُردو کے سخن فہم اور دانش ور طبقوں میں ضرور مقبولیت حاصل ہوگی۔

تسنیم فاروقی

نام کتاب: **"موجِ صبا"**

شاعر: اختر مسلمی   قیمت مجلد۔ بارہ روپیے

ملنے کا پتہ: اختر مسلمی۔ سرائے میر (اعظم گڑھ) یو۔ پی

اختر مسلمی ان آثار و امکانات کے شاعر ہیں جنھیں عرفِ عام میں تغزل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے دل میں حرارتِ عشق اور گرمیٔ حیات کا گداز ہے۔ اسی گداز نما سوز سے وہ ساز کو ہمنوا کرتے ہیں۔ فن کی پختگی اور مرقع کاری سے انھوں نے اپنے سخن کو فروغ آشنا کیا ہے۔ ان کے یہاں زندگی کی تلخیاں بھی ہیں اور سرشاریاں بھی۔

وہ دوسروں کے درد کو اپنی میراث تصور کرتے ہیں۔ ان کے یہاں غمِ دیار بھی ہے اور خلشِ روزگار بھی۔ اظہار کی شیریں بیانی تو بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اچھوتا اور عزم نواز لب و لہجہ، ندرتِ تخیل، شگفتہ گوئی اور جذبات کی لالہ کاری کی آمیزش نے ان کے کلام کو گلستاں و بوستاں بنا دیا ہے۔ موصوف تلوار سے شاخِ گل کا اور شاخِ گل سے تلوار کا کام لینا خوب جانتے ہیں، جابجا ان کے اشعار میں طنز و پند کی تیز چٹکیاں معاشرے کی تجسیم کو غلش سے بیداری تک پہنچانے کا کام انجام دے رہی ہیں۔

"موجِ صبا" اختر مسلمی کا دوسرا مجموعہ ہے، یقیناً لائقِ مطالعہ ہے۔

تسنیم فاروقی

نام کتاب: **"مجسمِ غزل"**

شاعر: نور اندوری   قیمت: بیس روپیے

ملنے کا پتہ: نور اندوری۔ سادھو ٹوڈا۔ اندور۔ مدھیہ پردیش

نور اندوری اُردو کے ان مقبول شعرا میں ہیں جو مشاعروں کے وسیلے سے برصغیر کے ہزار ہا حساس دلوں کو اپنے سیدھے سادے اشعار سے گدگدا رہے ہیں۔ "مجسمِ غزل" نور اندوری کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو بڑے ہی اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

نور کی شخصیت کی طرح ان کا کلام بھی تکلف اور تصنع سے مبرا ہے۔ ان کے شعری مجموعہ کا مطالعہ اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ شاعر نے اپنے کلام میں نہ تو کہیں فکرِ بلیغ کا دعویٰ کیا ہے اور نہ ہی آشوبِ آگہی کی رمز شناسی کی بات کی ہے بلکہ محسوسات کو آسان اور سہل زبان میں بیان کرنے ہی کو اپنا شعار بنایا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی حساس دل اپنے گرد و پیش کے حالات اور واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اقدار کے تغیر و تبدل کا تاثر فکر میں نمایاں ہونا لازمی ہے۔ نور نے بھی یہ تاثر شعوری یا غیر شعوری طور پر قبول کیا ہے اور زندگی کے جن تلخ حقائق کو انتہائی سادگی اور برجستگی کے ساتھ بیان کر دیا ہے ان میں شاید رمزیت، اشاریت یا علامت سے اس درجہ تاثر پیدا نہ ہوتا۔ نور کا ذہن بنیادی طور پر تغزل پرست ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے

اشعار میں [illegible]ب گفتن کی دلکشی بھی ہے اور زبان کا لطف بھی ہے

دھنک ہو شفق ہو کہ وہ کہکشاں ہو
بڑا ربط ہے تیری انگڑائیوں سے

کہوں کچھ تو مشکل، رہوں چپ تو مشکل
انھیں ہر طرح بدگمانی رہے گی!

مرا افسانہ کب تک سن سکو گے
یہ قصۂ داستاں دردِ داستاں ہے

مری انگلیاں نبضِ حالات پر ہیں بہت سوچ کر میں غزل کہہ رہا ہوں

اگر جھوٹ بولوگے پوجے گی دُنیا!
زمانے کو نفرت ہے سچائیوں سے

مرا گھر اُجڑے یا اُجڑے گھر آپ کا آندھیوں کو تو بس راستہ چاہیے

ہم نے عزم و عمل کے تیشے سے
اپنی تقدیر خود بنائی ہے

نور اندوری قومی یک جہتی کے پیامی ہیں اور مذہب کو اصولِ حیات سمجھتے ہیں ؎

جتنے مذہب ہیں سب زندگی کے لیے
چند آداب ہیں، چند دستور ہیں

مختصر یہ کہ "مجسم غزل" صوری اور معنوی خوبیوں سے مزین، نور اندوری کا ایسا شعری مجموعہ ہے جو ان کو ادبی حلقوں میں بھی مقبول بنا لے گا۔

———— ساحر لکھنوی

نام کتاب: "رُسوا سرِ بازار"
مصنف: فضلِ حسنین قیمت: آٹھ روپے
ملنے کا پتہ: کتابستان، چک، الہ آباد (یوپی)

"رسوا سربازار" جناب فضل حسنین کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جس میں کل پندرہ مضامین شامل ہیں۔ مضامین کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اتنی بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مصنف طنز و مزاح کی رُوح سے واقف ہے۔ بیشتر مضامین میں نشتریت، لطافت، نزاکت اور معنویت کے عناصر بہت نمایاں ہیں اور گرد و پیش کے ماحول، انسانی عادات و اطوار، جذبات و نفسیات پر مصنف کی گرفت مضبوط ہے۔ نیز معاشرہ میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں اور بدکاریوں کا اسے گہرا شعور ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں شامل مضامین کا عمیق نظر سے جائزہ لینے پر یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ مصنف نے طنز برائے طنز یا مزاح برائے مزاح کے فرسودہ تصور سے احتراز کیا ہے۔ اور طنز و مزاح میں اعتدال قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب میں شامل پہلا مضمون ہی (قصہ ادیب بننے کا) اپنے موضوع کی افادیت اور ندرت کے اعتبار سے ایک اہم تخلیق ہے۔ اس میں دورِ جدید میں پائے جانے والے ادیبوں اور شاعروں کے ایک ایسے گروہ پر کاری ضرب لگائی گئی ہے جو فن کارانہ صلاحیت اور تخلیقی ذہن سے محروم ہوتا ہے، لیکن شعر و ادب کی دُنیا میں راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پرواز کرنے کا آرزومند ہوتا ہے اور اپنی آرزو کی تکمیل کے لیے وہ غیر علمی اور غیر ادبی حربے استعمال کرتا ہے، اور مجنونانہ حرکتیں کرتا رہتا ہے۔

مختصر یہ کہ "رُسوا سربازار" مجموعی اعتبار سے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں اس حیثیت سے ضرور ایک اضافہ کا درجہ رکھتی ہے کہ اس میں شامل اکثر مضامین آج کی پیچیدہ سماجی زندگی اور انسانی نفسیات، عادات و کردار کو بنیاد بنا کر تخلیق کیے گئے ہیں اور جناب فضل حسنین نے ایک کامیاب طنز و مزاح نگار کی طرح ان مضامین میں طنز و مزاح کے پردے میں زندگی کے تلخ و شیریں حقائق کو بے نقاب کیا ہے، اور سب سے زیادہ قابلِ تعریف بات اس میں یہ ہے کہ مصنف نے کسی نامی گرامی ادیب و نقاد سے حوصلہ افزائی کے نام پر ایک حرف بھی نہیں لکھوایا ہے۔

———— جعفر عسکری

Vol. 38 No. 4
JULY 1983
50 paisa

NAYA DAUR

(Urdu Monthly)
POST BOX No. 146 LUCKNOW-226001

REGD. No. LW/NP.17
Annual Subs.
Rs. 5/-

ڈاکٹر صفدر آہ

۲۰ اگست ۱۹۰۵ء ـــــــ ۲۹ جولائی ۱۹۸۰ء

عنوانات

جلد ۳۸ نمبر ۵

اگست سنہ ۱۹۸۳ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: گنگا دھر پرشاد شکلا

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو.پی

مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے

زرِ سالانہ: پانچ روپے

ترسیلِ زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلیکیشن پبلک انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو.پی. لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ - لکھنؤ

رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو.پی لکھنؤ

اپنی بات

ہم نے اس سال اپنی آزادی کے ۳۶ سال پورے کر لیے ہیں اور اس عرصے میں ترقی کی متعدد منزلیں سر کر کے اقوام عالم میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا ہے۔ پندرہ اگست ہمیں اپنے ان عظیم رہنماؤں اور جاں نثاران وطن کی یاد ہی نہیں دلاتا ہے جن کی قربانیوں اور انتھک جدوجہد نے ملک کو آزادی کی نعمت عظمیٰ سے بہرہ مند کیا بلکہ ہمیں اپنی کامیابیوں اور ترقیاتی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کا ایک نادر موقع بھی فراہم کرتا ہے۔ ہمارا ملک ہماری محبوب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی فعال قیادت میں ہر محاذ پر ترقی کر رہا ہے اور ہماری ریاست اتر پردیش ترقی کے اس سفر میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ اتر پردیش نے وزیر اعلا شری سری پت مشرا کی رہنمائی میں گذشتہ ایک سال کی مدت میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان کا اس موقع پر ایک مختصر سا جائزہ لینا بے محل نہ ہوگا۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا بیس نکاتی پروگرام اداروں اور کمزور طبقوں کی فلاح و بہبود اور ہمہ گیر معاشی اور سماجی ترقی کا ضامن ہے۔ اتر پردیش اس پروگرام کی عمل آوری میں پیش پیش ہے اور خط افلاس سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کا معیار زندگی بلند کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ ملک بھر میں اس سال ۴۰ لاکھ ٹن گیہوں زیادہ پیدا ہوا جس میں ۲۰ لاکھ ٹن یعنی ۵۰ فیصد سے بھی زیادہ حصہ تنہا اتر پردیش کا ہے۔ سال ۸۳-۱۹۸۲ء میں اناج کی مجموعی پیداوار دو کروڑ ۳۶ لاکھ ۶۲ ہزار ٹن تھی جو سال ۸۲-۱۹۸۱ء کی پیداوار سے بیس لاکھ ٹن زیادہ ہے۔

زیر نظر سال کے دوران خصوصی کوششوں کے نتیجے میں ریاست کی مجموعی آبپاشی صلاحیت بڑھ کر ۹۸ لاکھ ۴۵ ہزار ہیکٹیر ہو گئی۔

اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ کی تنصیبی صلاحیت ۸۳-۱۹۸۲ء کے آخر تک بڑھ کر ۳۶۹۴ میگا واٹ ہو گئی اسی طرح اہم تھرمل بجلی گھروں کے پلانٹ لوڈ فیکٹر میں ۲.۶ فیصد اضافہ ہوا۔ ریاستی حکومت کی خصوصی کوششوں کے نتیجے میں اتر پردیش میں مرکزی زمرہ کے پراجیکٹوں کے قیام کے لیے ...۳ کروڑ روپے سے زیادہ کی سرمایہ کاری کی منظوری حاصل ہوئی جس کے تحت گیس پر مبنی چار کیمیاوی کھاد کے کارخانے، ایک آئی۔ ایم۔ ٹی گھڑی کا یونٹ، انڈین ٹیلی فون انڈسٹریز کا ایک یونٹ، ہندستان فوٹو فلم کا ایک یونٹ، بھارت الکٹرانکس فیکٹری کا ایک یونٹ اور ایرونانکس کا ایک کامپلکس قائم کرنے کی تجویز ہے۔

۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت گزشتہ سال اتر پردیش میں ۱۲۶۱۱ چھوٹے واحدے قائم کیے گئے جس کے نتیجے میں ۸۴ ہزار افراد کو روزگار حاصل ہوا۔ اسی پروگرام کے تحت مالیاتی سال رواں کے دوران ۱۲۸۱ دیہی اور چھوٹی صنعتیں قائم کی گئیں جس میں ۱.۸۱۵۔۱ افراد کو روزگار کے مواقع حاصل ہوئے۔

ریاست میں کاروباری بینکوں کی ۵۳۹ نئی شاخیں قائم کی گئیں جس کے نتیجے میں مارچ ۱۹۸۳ء کے آخر تک ان شاخوں کی تعداد بڑھ کر ۵۲۰۱ ہو گئی۔ زیر نظر سال کے دوران مختلف سرکاری اور امداد باہمی زمرہ کے پراجکٹوں اور ریاستی ترقیاتی پروگراموں کے لیے ادارہ جاتی مالیاتی وسائل سے ۹ ارب ۶۱ کروڑ ۴۰ لاکھ روپیہ کی رقم فراہم کی گئی۔ اس سال قرضہ دینے کے لیے خصوصی کیمپ منعقد کرنے کا باقاعدہ پروگرام شروع کیا گیا جس کے تحت کاروباری بینکوں نے دو لاکھ افراد کو ۷ کروڑ روپے کی مالی امداد فراہم کی۔ ریاست میں ۸۳-۱۹۸۲ء کے دوران دیہی ترقی کے خصوصی پروگراموں کے تحت ۵.۵۶ لاکھ خاندانوں کو مربوط دیہی ترقیاتی اسکیم سے مستفید کیا گیا۔ اتر پردیش میں سال ۸۳-۱۹۸۲ء کے دوران ریاستی منصوبہ سازی میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا اور مرکزی منصوبہ بندی کے ذریعہ نچلی سطح سے منصوبہ کے نشانوں کی تکمیل پر زور دیا گیا۔ اتر پردیش میں امداد باہمی عوامی نظام تقسیم کے تحت جنوری ۱۹۸۱ء سے جون ۱۹۸۳ء تک چھ ارب ۳۰ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے کی کنٹرول اور غیر کنٹرول کی اشیاء صارفین کو تقسیم کی گئیں اور گذشتہ ایک سال میں سستے غلے کی ۱۳۰۲ دکانیں قائم کی گئیں۔

ان اعداد و شمار سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ گذشتہ ایک سال کے اندر ہماری ریاست نے ہر شعبۂ حیات میں نمایاں ترقی کی ہے۔

ایڈیٹر

نازش پرتاپ گڑھی
بیگم وارڈ۔ پرتاپگڑھ

جہادِ آزادی کے دو[1] سپہ سالار

مولانا احمد اللہ شاہ:

ساتھ تیرے وہ چلا مردِ مجاہد بن کر
جس نے اک بار بھی دیکھا تری گفتار کا ڈھنگ
سرِ میدانِ وغا کہتے تھے دشمن تیرے
برق کو مل نہ سکے گا تری رفتار کا ڈھنگ
ماننا ہی پڑا افرنگ کو لوہا تیرا
کچھ عجب تھا تری چلتی ہوئی تلوار کا ڈھنگ
بسکہ آسان تھا ہر جادۂ مشکل تجھ کو
راہرو کہتے تھے خضرِ رہِ منزل تجھ کو
راہ ملتی نہ تھی انگریزی کمانداروں کو
تنہا ہو کر بھی بڑا کام کیا تھا تو نے
اٹھنے لوگوں نے ترے ساتھ دغا کی ورنہ
وقت کے دھارے کا رُخ موڑ دیا تھا تو نے
رہِ تاریخ میں قندیل جلائی تو نے
پئے ناموسِ وطن جان لٹائی تو نے
گونجتا تھا ترے نعروں سے اودھ کا خطہ
لینے آتی تھی سبق جرأت و ہمت تجھ سے
تو جدھر لپکا اُدھر فوجِ فرنگی نہ رہی
تو جہاں پہنچا بڑھی شانِ قیادت تجھ سے
تیری حب الوطنی کر گئی بے خوف تجھے
جنگِ آزادی میں تھی تابِ شجاعت تجھ سے
رہ گیا پھر نہ کوئی راہنما تیرے بعد

[1] لکھنؤ کے متعدد محاذوں پر دادِ شجاعت دینے کے بعد شاہ صاحب شاہجہانپور کی طرف بڑھے وہاں مضافات کے ایک ٹھاکر راجہ نے دھوکا دے کر شاہ صاحب کو شہید کرا دیا۔

بیگم حضرت محل:

لکھنؤ چھٹ نہ سکا چھوڑ دیا اختر[2] کو
تجھ کو شوہر سے زیادہ تھا عزیز اپنا وطن
بچے بوڑھے بھی نکل آئے گھروں سے باہر
ہو کے زن قوم کو جب تو نے دیا حکمِ بزن
دشمنِ ہند کمیں گاہ میں روپوش ہوا
نکلی میدان میں تو باندھ کے جب سر سے کفن
تیرے آنچل کی جھپک جنگ پہ مہمیز ہوئی
تیری چوڑی کی کھنک نعرۂ برخیز ہوئی
کوندجاتی تھی جو تو برقِ بلا کی صورت
خود بخود آنکھ جھپک جاتی تھی بلواؤں کی
اب بھی تاریخ ہے شاہد کہ تری ہیبت سے
سانس رک جاتی تھی افرنگ کی تلواروں کی
آن کی آن میں کرتی تھی کئی دستے تباہ
ایک پیغامِ فنا تھی تری گوریلا سپاہ
تو نے کچھ اور کیا ہند کی عورت کو بلند
چاند بی بی کی طرح تو نے بھی کی ڈٹ کر جنگ
دیکھ کر حوصلہ تیرا۔ تری حکمت عملی
تجربہ کار و جواں مرد بھی ہو جاتے تھے دنگ
تیری جی داری سے دشمن کو ملی مات پہ مات
سخت عاجز تری چالوں سے ہے اہلِ فرنگ
نہ رہا پھر ترا اندازِ وفا تیرے بعد

[2] والیٔ اودھ نواب واجد علی شاہ اختر

جمیل مہدی
روزنامہ عزائم
امین آباد لکھنؤ

پندرہ اگست کی اہمیت

اب وہ نسل اپنی عمر پوری کرنے کے قریب ہے، جس نے آج سے ۳۶ برس پہلے ۱۵ اگست کے دن کو، ایک طویل جنگ کے ولولہ انگیز انجام کی شکل میں اپنی آنکھ سے دیکھا تھا، اور پورے شعور اور وضاحت کے ساتھ اس بات کو سمجھا تھا کہ کیسی زبردست فتح اس نے حاصل کی ہے، اور آزادی کی صورت میں کیسی عظیم اور خداداد نعمت اس کے ہاتھ آئی ہے۔

وہ لوگ غالباً سب کے سب زندہ اور موجود تھے جنھوں نے عدم تشدد کے ایک ایسے ہتھیار سے جو سیاست میں دنیا میں پہلی مرتبہ استعمال ہوا تھا، فوجی طاقت اور عالمی سیاست کی مالک ایک ایسی سامراجی حکومت کو شکست دے دی تھی، جس کے اقبال و سطوت کا یہ حال تھا کہ اس کے دائرہ اقتدار میں سورج کبھی غروب نہ ہوتا تھا۔ اور دنیا یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی تھی کہ ایک ایسی بے مثال حکومت کو، جس نے دو عالم گیر جنگوں میں، اپنے وقت کی سب سے زیادہ مسلح اور خوف ناک قوتوں کو شکست دے کر، انھیں ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ ۴۰ کروڑ آبادی رکھنے والے ایک ملک نے اس طرح ہرا دیا کہ کسی وقت کسی کو بندوق داغنے تک کی نوبت نہیں آئی۔

ہندستان کی آزادی نے صرف اتنی ہی بات ثابت نہیں کی کہ جب کوئی قوم اٹل فیصلے اور متحدہ قوت کے ساتھ غلامی کا جوا اپنے گلے سے اتار دینے کے لیے کھڑی ہو جاتی ہے تو فولاد اور بارود کی ساری تباہ کن طاقت، سنتے اور گاندھی کے انسانوں کے سامنے بیکار ہو کر رہ جاتی ہے، بلکہ یہ بات بھی پوری طرح دنیا پر ثابت کر دی تھی کہ اخلاقی قوت سے بڑی قوت، سیاست کی اس دنیا میں بھی موجود نہیں جہاں بد اخلاقی کو ایک عام عادت بلکہ ضرورت کے تحت قبول کرنے کی تبلیغ، سیاست کے بڑے بڑے ماہرین اور فلسفی کرتے چلے آ رہے تھے۔

جن لوگوں نے اپنی بے مثال محنتوں، بے نظیر قربانیوں اور لرزہ خیز آزمائشوں کی بدولت، آج سے ۳۶ سال پہلے یہ آزادی حاصل کی تھی، انھوں نے اس حقیقت کو اہل ملک پر واضح کر دیا تھا کہ صرف اقتدار کی تبدیلی سے آزادی کا مقصد پورا نہیں ہو گیا ہے بلکہ یہ ایک مرحلہ ہے جہاں سے حقیقی آزادی کا سفر قوم کو شروع کرنا چاہیے۔

گاندھی جی نے، جن کی قیادت، اور جن کے عدم تشدد کے ہتھیار سے آزادی کی جنگ لڑی گئی تھی اور جیتی گئی تھی، صاف طور پر کہا تھا کہ

> "سیاسی آزادی کے معنی حقیقی آزادی کے نہیں ہیں جب تک اقتدار کو عام آدمیوں کی فلاح اور خوشحالی کے لیے اس طرح استعمال نہ کیا جائے کہ دور گاؤں میں رہنے والا ہر شخص بھی یہ محسوس کر لے کہ وہ آزاد ہو گیا ہے، تب تک ملک اور قوم کے آزاد ہونے کا کوئی مفہوم نہیں"۔

گاندھی جی کے بے وقت اور مظلومانہ قتل کے حادثہ کی بدولت، یہ تو ممکن نہ رہا کہ جد و جہد آزادی کی طرح، قومی تعمیر کی جد و جہد میں بھی قوم کو ان کی خداداد صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا۔ لیکن ان کی وفات

کے بعد جواہر لال نہرو، جنھیں ہندستان کی سیاسی اور قومی قیادت کی مشترکہ ذمہ داری کو اٹھانے کا موقع سترہ سال تک حاصل رہا، ملک میں شہروں شہروں، قصبوں قصبوں، گاؤں گاؤں میں لوگوں کو سمجھاتے پھرے کہ — "سیاسی آزادی اقتصادی آزادی کے بغیر بے معنی ہے"۔ کئی بار انھوں نے کہا کہ: ——

"سیاسی اعتبار سے محض آزاد کہلانے والے کتنے ہی ملک اقتصادی بدحالی کی وجہ سے اس حالت کو پہنچ گئے ہیں کہ ان کے عوام سیاسی غلامی سے زیادہ بدتر اقتصادی غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں"۔

مولانا آزاد نے بحیثیت ایک رہنما اور سیاسی فلسفی کے، اور بطور وزیر تعلیم کے، کتنی ہی بار لوگوں کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ ——

"حقیقی آزادی وہ ہے، جو آزاد قوموں میں اعلیٰ اخلاقی خصائل پیدا کر دے۔ اخلاقی قوتوں سے محروم کوئی قوم آزادی کے تحفظ میں زیادہ دنوں تک کامیاب نہیں رہ سکتی — بدکرداری کی خرابی ایک ایسی تباہ کن بیماری ہے، جو سیاسی غلامی سے ہزار درجہ بدتر حالت تک قوموں کو پہنچا دیتی ہے"۔

ان خیالات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ سبھی لوگ جنھوں نے انگریزوں کے خلاف سیاسی جنگ میں، بے مثال اور ولولہ انگیز کامیابی حاصل کی تھی اور غیر ملکی حکومت کا جوا، ملک کی گردن سے اتار کر پھینک دیا تھا — صرف اتنی بات سے مطمئن نہ تھے کہ سیاسی اقتدار غیر ملکی اور سفید فام قوم کے بجائے، ملک کے اپنے لوگوں کے پاس آگیا۔ بلکہ آزاد ہونے کے بعد وہ اس بات کے لیے زیادہ فکرمند نظر آنے لگے تھے کہ پچاس برس کی خوفناک آزمائشوں اور طویل جنگ کے ذریعہ حاصل ہونے والی اس آزادی کے تحفظ کی صورت کیا ہو۔ انھیں معلوم تھا کہ سیاسی اقتدار صرف ان ہی قوموں کو زیب دیتا ہے، جو اس سے فائدہ اٹھا کر اچھے آپ اخلاقی خصائل، اقتصادی استحکام، عوامی خوشحالی اور عوام

لوگوں میں حب الوطنی اور آزادی کو قائم رکھنے کے فرض کو عام کرنے کے ہتھیاروں سے لیس کر لیں۔

وہ ہندستان کے سماج کی رنگارنگی، اور علاقائی قومیتوں کی موجودگی کے فائدوں اور خطروں سے بھی پورے طور پر واقف تھے اور انھیں یہ بات معلوم تھی کہ اگر ہندستان کی — رنگارنگی میں یک رنگی — اور بے شمار قومیتوں پر مشتمل ایک قوم — کی فطری قوت اور خصوصیت کو صحیح راستے پر لگایا جائے، تو یہ ملک مختلف کڑیوں سے بنی ہوئی ایک ایسی مضبوط زنجیر میں تبدیل ہو سکتا ہے، جو قومی تحفظ کے لیے ناقابل عبور فصیل اور باڑھ کے بطور استعمال ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ رنگارنگی میں یک رنگی — کے قدرتی مزاج اور فطری راستے کو چھوڑ کر یہ ملک، اختلاف اور بگاڑ کے راستے پر چل پڑا تو اس کی شکل و صورت ایک ایسے گلدستہ کے بجائے جس میں مختلف اور دلفریب رنگوں کے پھول اپنی بہار دکھا رہے ہوں، ایک ایسی نوعیت اختیار کر لے گا، جس میں مختلف رنگوں کے تصادم کی بدولت بے رنگی اور بے رونقی اور مختلف قومیتوں کے ٹکراؤ سے ایک ایسے چمن کا منظر ابھر آئے گا جس میں دیکھ بھال سے محرومی کی بدولت جھاڑ جھنکار کے سوا کوئی چیز واضح اور نمایاں نہیں رہتی۔

آج اس پرانی نسل میں سے کوئی ممتاز رہنما، قومی قیادت کے منظر پر موجود نہیں ہے، جو خواب دیکھنے اور خوابوں کو حقیقت میں بدل دینے کی حیرت ناک صلاحیتوں کے مالک تھے اور صورت یہ بن گئی ہے کہ خواب باقی رہ گئے ہیں، خواب دیکھنے والے اپنی عمر کی مہلت پوری کر کے دوسری دنیا کو سدھار گئے ہیں، وہ شخصیتیں باقی نہیں ہیں جنھوں نے مولوں کو شہبازسے لڑانے اور نہتے لوگوں کو دنیا کی سب سے بڑی اور خوفناک سامراجی قوت سے بھڑ جانے کا حوصلہ دیا تھا اور کامیابی حاصل کی تھی، لیکن ان کے خیالات موجود ہیں جن کی روشنی میں آج کی نسل، ان کے خوابوں کو مکمل اور آزاد ہندستان کی تعمیر کا ادھورا کام پورا کر سکتی ہے — اور ایسے لوگ جو عظیم ہوتے ہیں عظیم خیالات کو اپنے پیچھے رہنمائی کے لیے چھوڑ جاتے ہیں، مر کر بھی کرتے وہ لوگوں کے ذہنوں اور قوم کے تعمیری نقشوں میں زندہ رہتے ہیں۔

غزلیں

فضا ابن فیضی
مئو ناتھ بھنجن یوپی

دکھ کے بگولے، درد کی آندھی میں بھی کیا گرد ہوا
جس نے میرا چہرا دیکھا، اس کا چہرا گرد ہوا

دن میں تمہارے، شمر تمہاری، دھوپ سنہری، چھاؤں گھنی
تم کیوں خاک بسر ہو پیارے میں جو ہوا تھا گرد ہوا

جتنا تیز تلاطم اٹھا، اس سے زیادہ خاک اڑی
آوارہ موجوں سے پوچھو! کیا کیا دریا گرد ہوا

سانسیں روکے دیکھ رہے ہیں خود اپنے بکھراؤ کو سب
آندھی کتنی تیز تھی لوگو! ذات کا صحرا گرد ہوا

رسوائی کا موجب ٹھہری، وضع پریشاں نظری بھی
سب کا چہرا تکتے تکتے، خود آئینا گرد ہوا

جیون سارا بیت گیا، خوشبو کا تعاقب کرنے میں
اب کیا ہے ہم جس کو سمیٹیں، سب کچھ اپنا گرد ہوا

بات ہے اتنی، راس نہ آیا موسم کا آشوب مجھے
میں تھا برگ زرد کی صورت، ٹوٹا بکھرا، گرد ہوا

آنکھیں کھول کے جینا سیکھو، خوابوں پر تکیہ نہ کرو
دھند میں کرنیں بونے والو! کب کا اجالا گرد ہوا

اس سے زیادہ اور فضا اب فن کی اہانت کیا ہوگی
ہم جیسوں نے جو کچھ سوچا، جو کچھ لکھا، گرد ہوا

بشیر بدر
ڈی۔۲۰، شاستری نگر
میرٹھ

ہونٹوں پہ محبت کے فسانے نہیں آتے
ساحل پہ سمندر کے خزانے نہیں آتے

پلکیں بھی چمک اٹھتی ہیں سوتے میں ہماری
آنکھوں کو ابھی خواب چھپانے نہیں آتے

دل اجڑی ہوئی ایک سرائے کی طرح ہے
اب لوگ یہاں رات بتانے نہیں آتے

اڑنے دو پرندوں کو ابھی شوخ ہوا میں
پھر لوٹ کے بچپن کے زمانے نہیں آتے

یا رو نئے موسم نے وہ احسان کیے ہیں
اب یاد مجھے درد پرانے نہیں آتے

کیا سوچ کے آئے ہو محبت کی گلی میں
جب ناز حسینوں کے اٹھانے نہیں آتے

احباب بھی غیروں کی ادا سیکھ گئے ہیں
آتے ہیں مگر دل کو دکھانے نہیں آتے

جعفر ملیح آبادی
دبیر الدولہ گنج۔ چوپٹیاں
لکھنؤ - ۳

جنگِ آزادی میں

ملیح آباد کے پٹھانوں کا حصہ

خوش ذائقہ اور خوش رنگ آموں کے لیے ساری دنیا میں مشہور قصبہ ملیح آباد، شہر لکھنؤ سے پندرہ میل کے فاصلے پر، مغرب کی جانب ہردوئی روڈ پر واقع ہے۔ قصبے اور قصبے کے گردو نواح میں مختلف فرقوں اور ذاتوں کے لوگ آباد ہیں جو شروع ہی سے بھائی چارے اور آپسی میل جول کے ساتھ رہتے آرہے ہیں۔ یہ سرزمین ہمیشہ سے فرقہ وارانہ تعصب سے پاک اور اتحاد و رواداری کی آئینہ دار رہی ہے۔ یہ بات فخر کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جب تقسیم ہند کے موقع پر ملک کے مختلف گوشوں میں بھیانک فسادات پھوٹ پڑے تھے اس وقت بھی یہاں کے ہندو مسلمان امن و محبت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔

ہر چند کہ اس علاقے میں، علماء فضلاء، شعراء و ادباء، رؤساء و امراء پیدا ہوتے رہے ہیں مگر اس کے باوجود یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ اس مشہور و قدیم قصبے کی تاریخ قلم بند کرنے کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی جس کے باعث یہاں کے بہت کچھ حالات و واقعات اندھیرے میں گم ہو چکے ہیں۔ چند پرانی دستاویزات، شاہی فرامین، گزیٹیر، واجب العرض (دستور دیہی) کے مطالعہ سے جسے برٹش گورنمنٹ نے اپنے تسلط کے بعد ۱۸۶۲ء میں تحریر کرایا تھا، اس قصبے کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ عہد قدیم میں یہ علاقہ زیادہ تر بیہڑ اور جنگلات سے گھرا ہوا تھا۔ یہاں ملیہ نام کے ایک پاسی کی عملداری تھی جس نے ایک چھوٹی سی بستی آباد کرلی تھی۔ کچھ عرصہ بعد جب پاسیوں کا اقتدار یہاں سے ختم ہوا تو بعض راجپوت خاندانوں کا عمل دخل شروع ہوا۔ سید سالار مسعود غازی رح کے عہد سے یہاں مسلمانوں کی آمد کی ابتدا ہوئی۔ سید صاحب جب اپنے لشکر کے ساتھ اس علاقے میں وارد ہوئے تو ان کا مقابلہ راجہ کنس سے بمقام کسمنڈی کلاں ہوا، اور یہ سارا علاقہ سید صاحب کے قبضے میں آگیا۔ سید صاحب اپنے ایک معتمدِ خاص قاضی بدیع الدین کو اس علاقے کا نگراں بنا کر یہاں سے روانہ ہو گئے — قاضی بدیع الدین، تاشقند کے قریب فلشور نام کی ایک بستی کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام محمد ملیح تھا، چنانچہ قاضی بدیع الدین نے اپنے والد کے نام پر اس جگہ کا نام ملیح آباد رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ جس جگہ یہ قصبہ آباد ہے، قاضی بدیع الدین کی آمد سے پہلے یہاں ایک چھوٹی سی آبادی تھی جو "گرونڈی" کے نام سے مشہور تھی۔ جسے قاضی صاحب نے وسعت دے کر ملیح آباد نام رکھ دیا۔ اس وقت سے آج تک یہی نام چلا آرہا ہے۔

قاضی بدیع الدین اور ان کے بعد ان کی اولاد مدتوں اس علاقے کی مالک و قابض رہی۔ پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مختلف فرقے اور خاندان یہاں برسرِ اقتدار ہوتے رہے۔ عہد شاہجہاں اور اورنگ زیب میں پٹھان قبائل کی آمد شروع ہوئی جو قصبہ کے گرد و نواح میں آباد ہوتے گئے۔ پٹھانوں کی آبادیاں بارہ بستیوں پر مشتمل تھیں سب سے پہلے بازید خیل پٹھانوں کا قبیلہ آیا۔ اس نے یہاں اقتدار حاصل کیا۔ پھر ایمن زئی پٹھان آئے اور ان کا تسلط ہوا۔ ان کے بعد اٹھارہویں صدی عیسوی کی آخری دہائی میں آفریدی اور قندھاری پٹھان قبائل

وارد ہوئے۔ قندھاریوں نے قصبے سے چند میل کے فاصلے پر موضع خالص پور میں اور آفریدیوں نے، جو نواب صفدر جنگ والیٔ اودھ کے ساتھ دہلی سے آئے تھے، ان کی ایما پر قصبے کے ایک محلہ کنول ہار میں بود و باش اختیار کی۔

ملیح آباد کے یہ پٹھان صرف اپنی زمیندارانہ شان و شوکت، جاگیردارانہ رعب و داب اور افغانی آن بان ہی کے لیے مشہور نہیں ہیں بلکہ ان لوگوں نے زندگی کے مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دے کر بھی شہرت حاصل کی ہے۔ اگر میدان جنگ میں ان کی شمشیر خارا شگاف نے خون کے دریا بہائے ہیں تو بزم ادب میں ان کے قلم نے لعل و گہر بھی لٹائے ہیں۔ دکھ درد میں یہ وطن کے کام بھی آئے ہیں اور قوم کے غم میں انھوں نے آنسو بھی بہائے ہیں۔ عیش و عشرت کی زندگی کو خیرباد کہہ کر، ملک کی آزادی کی خاطر بے دریغ قربانیاں بھی دی ہیں۔ جیلوں کی سختیاں اور انگریزوں کے مظالم بھی برداشت کیے ہیں۔ جنگ آزادی کے دوران ملیح آباد کے پٹھانوں ہی نے اس علاقے کے عوام میں آزادی کی روح پھونکی، ان میں بیداری پیدا کر کے انھیں بدیسی حکومت کے خلاف صف آرا کیا۔ ان کے جوش و خروش اور جذبہ حب الوطنی سے متاثر ہو کر اس دور کے بڑے بڑے لیڈر، مثلاً مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ یہاں آتے اور اپنی جوشیلی تقریروں سے عوام کے حوصلے بڑھاتے رہتے تھے۔

ملیح آباد کے پٹھانوں میں سیاسی بیداری، آزادی کا تصور اور انگریزوں سے بیزاری کے رجحانات پیدا کرنے کا سہرا آفریدی قبیلے کے ایک سربراہ اور انیسویں صدی کے مشہور سالار اودھ نواب فقیر محمد خاں گویا کے سر ہے۔ ان کے بعد ان کی اولاد ہی نے جنگ آزادی کی ہر تحریک میں یہاں کے عوام کی رہنمائی کی اور ملک و قوم کے لیے طرح طرح کی مصیبتیں جھیلیں۔

نواب فقیر محمد خاں گویا۔ محمد بلند خاں آفریدی (علی خیل) کے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کا خاندان برسہا برس سے سیاسی و عسکری میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیتا آیا تھا۔ ان کے نامور اسلاف میں میاں نجا یار بیگ خاں بخشی، محمود خاں مدار المہام فرخ آباد اور قائم خاں بنگش والیٔ فرخ آباد وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ قدرت نے فقیر محمد خاں کی شخصیت کو گوناگوں اوصاف سے سنوارا تھا۔ وہ وجیہہ و شکیل بھی تھے اور جری و شجاع بھی۔ کامیاب سیاست داں بھی، ناقابل تسخیر سپاہی بھی، بلند پایہ شاعر و ادیب بھی، ادب نواز رئیس بھی، نیک طینت انسان بھی، پاک باطن مسلمان بھی، مظلوموں کے حامی و مددگار بھی اور ظالموں کے لیے ننگی تلوار بھی۔ نیز ان سے ایک ایسے خاندان کا سلسلہ بھی چلا، جس کی ہر پیڑھی میں جلیل القدر رؤسا، نامور ادبا و شعرا اور سرفروش مجاہدین آزادی پیدا ہوتے رہے ہیں۔

۱۲۲۰ھ میں فقیر محمد خاں جبکہ ان کے ابتدائے شباب کا زمانہ تھا، قسمت آزمائی کے لیے دکن روانہ ہوئے۔ وہاں راجہ ہلکر راؤ سے ملاقات ہوئی۔ ہلکر راؤ نے ان کو اپنے لشکر میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز کر دیا۔ صرف تین ماہ ہلکر کے ساتھ رہے۔ پھر امیر خاں والیٔ ٹونک کے اصرار پر ان کے رفیق خاص و دست راست بن گئے۔ اپنی لیاقت و شجاعت سے انھوں نے ریاست ٹونک کے انتظام و استحکام کے سلسلے میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ قیام ٹونک کے دوران زیادہ وقت میدان کارزار میں گزرا۔ اور ہر بار فتح و نصرت کے ڈنکے بجاتے واپس ہوئے۔ ٹونک کے تحفظ و استحکام کی طرف سے جب قدرے اطمینان ہوا تو ہندوستان کے بگڑتے ہوئے سیاسی حالات کی طرف متوجہ ہوئے۔ اپنے ملک میں غلامی کی جڑوں کو مضبوط ہوتے دیکھ کر وہ بہت فکرمند تھے۔ آخر ان حالات نے ان کے دماغ میں انگریزوں کے خلاف ایک منصوبۂ جنگ کو جنم دے دیا۔ جس کا مقصد ایک عظیم فوج تیار کر کے انگریزوں سے فیصلہ کن جنگ کرنا اور ہندوستان کو غلامی کے چنگل سے نکال کر ملک میں ایک پائدار حکومت قائم کرنا تھا۔ اس منصوبے کو امیر خاں کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اودھ کے نواب سعادت علی خاں بھی اس منصوبے میں در پردہ شریک تھے۔ (انھیں سے تبادلۂ گفتگو کے لیے فقیر محمد خاں نے ۱۲۲۹ھ میں بظاہر سفیر ٹونک کی حیثیت سے لکھنؤ کا سفر اختیار کیا، جس کا ذکر لکھنؤ گزیٹیر کے صفحہ ۹۲ پر بیان کیا گیا ہے۔

"...... امیر خاں کی رفاقت میں انھوں نے (فقیر محمد خاں) اپنی خدمات کی بدولت بہت عروج حاصل کیا وہ سفیر کی حیثیت سے نواب سعادت علی خاں کے پاس بھیجے گئے، سواری کے لیے ہاتھی اور چھ ہزار روپے سفر خرچ کے لیے نواب ٹونک نے فقیر محمد خاں کو دیے۔ جب وہ کان پور پہنچے تو ان کو سعادت علی خاں کی موت کی خبر ملی۔ لہٰذا وہ کان پور سے ملیح آباد کی طرف روانہ ہو گئے۔"

کان پور پہنچکر جب فقیر محمد خاں کو اطلاع ملی کہ نواب سعادت علی خاں کو انگریزوں کی سازش سے زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا تو ان کے دل کو سخت دھچکا لگا، کیونکہ اس خبر نے ان کے سارے منصوبے پر پانی پھیر دیا تھا۔ پھر بھی وہ ہمت نہیں ہارے۔ سوچا کیوں نہ اودھ کے نئے حکمران کو اس سلسلے میں ٹٹولا جائے۔ اس خیال کے تحت ٹونک واپس جانے کے بجائے انھوں نے اپنے وطن ملیح آباد جانا بہتر سمجھا تاکہ کچھ دن آرام کر کے اودھ کے نئے حکمران شاہ غازی الدین حیدر سے رابطہ قائم کیا جائے ۔۔۔ چنانچہ کچھ ہی دن بعد انھوں نے نواب آغا میر کے ہمراہ شاہ غازی الدین حیدر سے ملاقات کی۔ آغا میر نے بادشاہ سے فقیر محمد خاں کے حالات اور ریاست ٹونک کی ملازمت کے دوران اُن کے عظیم الشان کارناموں کا ذکر کیا۔ بادشاہ بہت مسرور ہوئے اور فقیر محمد خاں سے کہنے لگے:- خاں صاحب! ہمارے آپ کے خاندانی تعلقات ہیں۔ آپ کے بزرگوں نے ہمارے بزرگوں کی ہمیشہ رفاقت کی ہے۔ یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہمارے ہوتے آپ غیروں کے دہاں جائیں۔ ہمیں آپ سے بہادر اور تجربہ کار لوگوں کی سخت ضرورت ہے۔ فقیر محمد خاں نے بھی بادشاہ کی اس دعوت کو قرینِ مصلحت سمجھا۔

دربار اودھ سے وابستہ ہو کر فقیر محمد خاں کے عروج کی کوئی انتہا نہ رہی۔ نامہ مظفری حصہ دوم کے صفحہ ۲۲ پر درج ہے کہ:۔۔۔

"حسام الدولہ فقیر محمد خاں صاحب بہادر تہور جنگ رسالدار المتخلص بہ گویا تعلقدار ملیح آباد، جن کی شان و شوکت اور قدر و منزلت کی عام شہرت محتاج بیان نہیں ہے ..... خاں صاحب کی عنایت اور فیض صحبت کوئی معمولی بات نہ تھی، ان کی لیاقت اور جاہ و جلالت اظہر من الشمس ہے۔ دو ہزار روپے ماہوار تنخواہ تھی، بہت سی خدمتیں مثل تقسیم تنخواہ محلات شاہی ان کے متعلق تھیں۔ نظم و نسق ملکی و مالی میں وہ دخیل تھے ..... اس کے علاوہ چار سو گھوڑے سوار بارگیر جن کی اسامی تین تین سو روپے تھی، خاں صاحب کی ذاتی ملکیت میں تھے"......

اسی طرح تاریخ آفتاب اودھ میں لکھا ہے:۔۔۔

"غضنفر الدولہ فقیر محمد خاں بہادر کے ماتحت سترہ سو سوار تھے اور اسی قدر مشاہرہ تھا۔ نظامت ہائے بسواڑہ و سلطان پور وغیرہ ان کے پائے نام کی گئیں۔"

اس کے علاوہ متعدد دیگر کتب میں بھی فقیر محمد خاں کی شان و شوکت اور قدر و منزلت کا ذکر ملتا ہے جسے طوالت کے خوف سے نظر انداز کر رہا ہوں۔

اودھ میں اس تمام قدر و منزلت اور عروج کے باوصف فقیر محمد خاں انگریزوں کے خلاف اپنے منصوبۂ جنگ کو عملی شکل نہ دے سکے جس کا سبب یہ تھا کہ اس وقت اودھ کے سیاسی حالات اتنے ابتر اور شاہ اودھ انگریزوں کے چنگل میں پھنس کر اتنے بے بس ہو چکے تھے کہ اس نوع کے منصوبوں کی کامیابی کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ پھر بھی فقیر محمد خاں انگریزوں کی ریشہ دوانیوں پر برابر کڑی نظر رکھتے تھے اور ان کی چالوں کو ناکام بناتے رہے۔ اس زمانے میں انگریزوں کے خلاف جو تحریکیں چلیں ان میں وہ درپردہ حصہ لیتے رہے ۔۔ سید احمد شہید کی مشہور تحریک کو برابر ان کا تعاون حاصل رہا۔ غرض کہ فقیر محمد خاں نے اپنی زندگی میں اودھ میں انگریزوں کے قدم جمنے نہیں دیے۔ ان کا انتقال ۱۸۵۱ء میں ہوا۔ ان کی وفات کے بعد ہی انگریزوں کو کھل کھیلنے کا موقع مل سکا۔ دربار اودھ میں انگریزوں کے پٹھوؤں کی کمی نہ تھی۔ ایک سے ایک غدار موجود تھا۔ آخر انگریز اپنی چالوں میں کامیاب ہو گئے اور ۱۸۵۶ء میں اودھ کے

آخری تاجدار واجد علی شاہ کو تخت سلطنت سے محروم کر دیا گیا۔

واجد علی شاہ کی معزولی کی خبر سن کر نقیر محمد خاں کے بڑے صاحبزادے محمد احمد خاں احمد تعلقدار ریاست کسمنڈی خورد اپنے چھوٹے بھائی محمد نسیم خاں تعلقدار ریاست سہلامئو کو ہمراہ لے کر واجد علی شاہ سے ملنے لکھنؤ آئے اور ان سے کہا کہ آپ کے ساتھ انگریزوں نے جو ناانصافی اور ظلم کیا ہے اس سے ہمارا خون کھول رہا ہے۔ اگر ارشاد عالی ہو تو ہم انگریزوں سے بزور شمشیر تخت اودھ واپس لے لیں۔ واجد علی شاہ یہ پرخلوص و پرجوش الفاظ سن کر بہت متاثر ہوئے اور فرمایا: میرے بہادر نوجوانوں میں تمھارے اس جذبہ کی قدر کرتا ہوں۔ مگر تم جس امر کی مجھ سے اجازت طلب کر رہے ہو حالات اس کے مقتضی نہیں ہیں اس قسم کا کوئی بھی اقدام بھیانک نتائج کا حامل ہوگا۔ جو کچھ ہوا اس پر صبر کرو اور اللہ سے میرے حق میں دعائے خیر کرتے رہو۔ اس کے بعد آبدیدہ ہو کر فرمایا۔ کاش! آج میرا شیر نقیر محمد خاں زندہ ہوتا۔ واجد علی شاہ کے سمجھانے بجھانے پر محمد احمد خاں خاموش تو ہو گئے مگر ان کے دل میں انگریزوں سے جو تنفر پیدا ہو چکا تھا وہ کم نہ ہو سکا۔ کم ہوتا بھی کیسے۔ یہ تنفر تو ان کو اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء میں جب بیگم حضرت محل نے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کیا تو محمد احمد خاں اپنے چھوٹے بھائی اور جنگجو پٹھانوں کے لشکر کے ساتھ حضرت محل کی مدد کے لئے لکھنؤ پہنچ گئے اور کئی مقامات پر خصوصاً بشیرت گنج اور بیلی گارد کے مورچوں پر داد شجاعت دی اور بے شمار انگریزوں کو تہ تیغ کیا۔ "لکھنؤ جن پد کا راشٹریہ اتہاس" نامی کتاب کے صفحہ ۱۳ پر اس واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے محمد احمد خاں کا تعارف یوں کرایا گیا ہے: ——————

> "محمد احمد خاں شاہی فوج کے رسالدار تھے۔ ۱۸۵۷ء کی لڑائی میں بشیرت گنج کے مورچے پر بڑی ویرتا (بہادری) کے ساتھ وہ انگریزی سینا (فوج) سے لڑے۔ سب تلنگے بھاگ گئے پر وہ اکیلے میدان میں ڈٹے رہے۔ جب وہ اپنی تلوار انگریزی سینا نائک (انگریزی فوج کے جنرل) کو دینے لگے تو اس نے وہ تلوار انھیں کی کمر میں سمان پوروک (پورے اعزاز کے ساتھ) باندھ دی۔ ان کی ویرتا کی پرشنسا (تعریف) کی۔ محمد احمد خاں ملیح آباد کے نواب نقیر محمد خاں گویا کے سپتر (بیٹے) تھے۔"

اسی زمانے کا ایک اور واقعہ سننے میں آیا ہے کہ علاقہ مال کے کسی مقام سے گزرتا ہوا انگریزوں کا ایک فوجی دستہ ۱۸۵۷ء کی لڑائی میں حصہ لینے لکھنؤ جا رہا تھا جب محمد احمد خاں کو اطلاع ملی تو وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر اس دستے پر حملہ آور ہوئے اور سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ —— یہاں لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دوں کہ محمد احمد خاں، بیگم حضرت محل کے مشہور ساتھی داروغہ ممّو خاں کے، جنھیں کالے پانی کی سزا دی گئی تھی، بہنوئی تھے۔ ممّو خاں ملیح آباد کے موضع خالص پور ہی کے رہنے والے تھے۔

لکھنؤ گزیٹیر کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اودھ پر انگریزوں کا مکمل تسلط ہو جانے کے بعد بھی ملیح آباد کے آفریدی پٹھانوں نے دو تین ماہ تک انگریزی فوج کو اس علاقے پر قابض نہ ہونے دیا۔ وہ ہتھیار باندھے پورے علاقے کا گشت لگاتے رہتے تھے۔

محمد احمد خاں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بدلے ہوئے حالات سے مجبور ہو کر انھوں نے انگریزوں کے خلاف اپنی سرگرمیاں ختم تو کر دیں مگر دل سے انگریزی حکومت کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ جب تک زندہ رہے انگریزوں سے اظہار بیزاری ہی کرتے رہے۔ اس سلسلے میں ایک روایت مشہور ہے کہ جب کوئی انگریز افسر ان سے ملاقات کے لیے ان کے پاس آتا تو یہ خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرتے اور گرمجوشی سے مصافحہ بھی کرتے۔ مگر جب وہ چلا جاتا تو خادموں سے مصافحہ والے ہاتھ کو کئی کئی پانیوں سے دھلوا کر پاک کیا کرتے۔ محمد احمد خاں کے بعد برطانوی سامراج کے خلاف یہی جذبہ اور رویّہ ان کی اولاد کا بھی رہا۔ چنانچہ جب ۲۱-۱۹۲۰ء میں خلافت تحریک شروع ہوئی اور سارے ملک میں بیداری کی لہر دوڑ گئی تو اس صدائے حریت پر لبیک کہنے والے محمد احمد خاں کے ایک جیالے فرزند خواجہ احمد خاں تھے، جو عیش و آرام کی زندگی ترک کر کے اور سر سے کفن باندھ کر

جنگِ آزادی کے میدان میں اپنے کنبے کے ساتھ کود پڑے۔ اس سے پہلے بھی ۱۹۰۵ء میں وہ کسی بنگالی تحریک میں حصہ لے چکے تھے۔

قصبہ ملیح آباد اور اس کے اطراف میں دُور دُور تک خواجہ احمد خاں نے عوام کو جنگِ آزادی میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ ان کی جدّوجہد سے ہزاروں افراد آزادی کی تحریکوں میں شریک ہو گئے۔ جن میں خواجہ احمد خاں کے اعزا و اقربا بھی تھے۔ دوسرے پٹھان قبائل کے افراد بھی تھے اور کسان مزدور بھی جنھوں نے جیل کی سختیاں بھی جھیلیں، برٹش حکومت کے مظالم بھی برداشت کیے مگر قدم پیچھے نہیں ہٹائے۔

ملیح آباد میں خلافت کمیٹی ۱۹۱۹ء میں قائم کی گئی۔ اس کے قائم کرنے والے محمد احمد خاں کی نواسی کے شوہر غالب علی خاں (موضع بختیار نگر) اور یٰسین علی خاں تھے۔ تحریک خلافت میں سب سے پہلے خواجہ احمد خاں کے نواسے ڈاکٹر عبدالسمیع خاں آزاد گرفتار ہوئے انھیں دو سال کی سزائے قید بامشقت دی گئی۔ ۱۹۲۱ء کے شروع میں تحصیل کانگریس کمیٹی قائم کی گئی جس کے صدر خواجہ احمد خاں اور سکریٹری ان کے نواسے عبدالوحید خاں منتخب ہوئے۔ عدم تعاون تحریک کے سلسلے میں روز ملیح آباد میں جھنڈا اور جلوس نکالا جاتا اور جگہ جگہ بدیسی کپڑا جلانے کا مظاہرہ کیا جاتا جس میں پٹھان خصوصیت سے اپنے قیمتی سے قیمتی کپڑے کو نذرِ آتش کر دیتے تھے۔ محلہ کنول ہار کے باشندے عبدالکبیر خاں پولیس کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر تحریک عدم تعاون میں شامل ہو گئے۔ موضع گڑھی کے رہنے والے سعید احمد خاں کانگریس سے ہمدردی کے الزام میں سرکاری نوکری سے نکال دیے گئے۔ خواجہ احمد خاں اور ان کے خاندان کے افراد کی کوششوں سے بہت جلد سیکڑوں کی تعداد میں لوگ کانگریس کے والنٹیر بن گئے۔ خواجہ احمد خاں کے چھوٹے بھائی محمد سعید خاں کو کانگریس والنٹیر کور کا کپتان بنایا گیا۔ والنٹیر کور کو حکومت نے غیر قانونی قرار دیا اور دفعہ ۱۴۴ لگا دی مگر اس کے باوجود والنٹیروں کی بھرتی نہ رک سکی اور عوام کے جوش میں کمی نہ آ سکی۔ اس جوش و خروش سے خوف زدہ ہو کر لکھنؤ کے انگریز ڈپٹی کمشنر نے شیخ نصر اللہ ڈپٹی کلکٹر کے ذریعے خواجہ احمد خاں کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ اگر آپ کانگریس چھوڑ دیں تو ایک لاکھ روپے نقد اور جاگیر بطور عطیہ برٹش حکومت دے گی۔ لیکن خواجہ احمد خاں نے صاف انکار کر دیا کہ ہم ملک سے غداری نہیں کر سکتے

دسمبر ۱۹۲۱ء میں تحصیل کانگریس کمیٹی پرنس آف ویلز کے خلاف مظاہرہ کرنے کی پر زور تیاری کر رہی تھی کہ محلہ مرزا گنج میں پولیس لگا دی گئی۔ پرنس آف ویلز ۹ دسمبر ۱۹۲۱ء کو لکھنؤ آنے والے تھے۔ مگر کئی دن پہلے لکھنؤ سے ڈپٹی کمشنر اور کپتان پولیس ہتھیار بند پولیس لے کر کانگریس کمیٹی کے دفتر پہنچے اور دفتر کی تلاشی لے کر سارے کاغذات اپنے قبضے میں لے لیے۔ اس کے بعد خواجہ احمد خاں اور آٹھ دوسرے کارکنان کو گرفتار کر لیا گیا۔ خواجہ احمد خاں کی گرفتاری کے بعد عبدالودود خاں تحریک کے رہنما چنے گئے۔ ان کی قیادت میں دوسرا جتھہ گرفتار ہوا۔ اس کے بعد پوری تحصیل سے مختلف جتھے لگاتار گرفتار ہوتے رہے۔ جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ یہ گرفتاریاں جن لوگوں کی قیادت میں ہوئیں ان کے نام اس طرح ہیں:— خواجہ احمد خاں۔ محمد زماں خاں۔ محمد سعید خاں۔ عثمان خاں (مرزا گنج) غالب علی خاں (بختیار نگر) امیر حسن خاں (کنول ہار) غنی احمد خاں (محمد نگر)۔ انوار احمد خاں (محمد نگر)، عبدالوحید خاں (مرزا گنج) محمد جان خاں (بڑی گڑھی) احمد خاں (بختیار نگر) تکیل خاں۔ محمد زبیر خاں۔ عبدالوہاب (انصار)۔ سورج بلی اور عبدالودود خاں وغیرہ۔ ان گرفتار شدگان میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی بھی بہت بڑی تعداد شامل تھی۔ اس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے قریبی ساتھی اور خواجہ احمد خاں کے رشتے کے نواسے مولانا عبدالرزاق خاں کلکتے میں گرفتار کر لیے گئے۔

۲۱-۱۹۲۰ء کی تحریک آزادی کے بعد بھی خواجہ احمد خاں متعدد بار گرفتار کر کے جیل بھیج دیے گئے اور ان کو کڑی سزائیں دی گئیں۔ ۱۹۲۲ء کے ایجی ٹیشن میں پہلے چودھری خلیق الزماں قائد بنائے گئے مگر وہ کسی سبب سے انڈر گراؤنڈ ہو گئے۔ اسی دن اتفاقاً کسی نجی ضرورت سے خواجہ احمد خاں لکھنؤ گئے وہاں خلیق صاحب کی جگہ ان کو قیادت سونپ دی گئی۔ اور یہ کانگریسیوں کے بڑے جتھے کے ساتھ گرفتار

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

نذرِ وطن

حفیظ بنارسی
صدر شعبۂ انگریزی، مہاراجہ کالج
آرہ

بہشت جس پہ تصدق تو وہ گلستاں ہے
تری فضاؤں میں تسکینِ دل کا ساماں ہے
تری ہواؤں میں کیفیتِ بہاراں ہے
خرام تجھ پہ ترے خوش خرام کرتے ہیں

ہمیں لگے ہے تو اک یارِ مہرباں کی طرح
تری صدا ہمیں محبوب ہے اذاں کی طرح
ادا ادا ہے تری اک شفیق ماں کی طرح
تری ہی گود میں ہم صبح و شام کرتے ہیں
زمینِ ہند تجھے ہم سلام کرتے ہیں

کبیر و نانک و گوتم تجھی پہ اترے تھے
یہ رہنمائے مکرم تجھی پہ اترے تھے
فلک سے حضرتِ آدم تجھی پہ اترے تھے
غرور اس پہ یہ تیرے غلام کرتے ہیں
زمینِ ہند تجھے ہم سلام کرتے ہیں

کہیں کتھائیں سناتے ہیں بھولے شنکر کی
کہیں حدیث بیاں کرتے ہیں پیمبر کی
عجب فضا ہے عجب بات ہے ترے گھر کی
خدا خدا تو کہیں رام رام کرتے ہیں
زمینِ ہند تجھے ہم سلام کرتے ہیں

یہ تاج اور اجنتا کے موہنی چہرے
یہ لکھنؤ یہ بنارس کے دلنشیں جلوے
یہ شہرِ دلی و ارضِ دکن کے آئینے
ہمارے دل سے ہزاروں کلام کرتے ہیں
زمینِ ہند تجھے ہم سلام کرتے ہیں

یہ سربہ کوہِ ہمالہ کا تاجِ پر تنویر
یہ حسنِ وادیٔ پنجاب و جنتِ کشمیر
جمالِ گیسوئے بنگال جادوئے دلگیر
دل و نظر کو گرفتارِ دام کرتے ہیں
زمینِ ہند تجھے ہم سلام کرتے ہیں

ہیں تابناک تری شکلِ تابناک سے ہم
جبیں پہ ٹیکہ لگائے ہیں تیری خاک سے ہم
وضو بھی کرتے ہیں تیرے ہی آبِ پاک سے ہم
طرح طرح سے ترا احترام کرتے ہیں
زمینِ ہند تجھے ہم سلام کرتے ہیں

تری نگاہ میں الفت ہے اور کچھ بھی نہیں
تو پاسبانِ حقیقت ہے اور کچھ بھی نہیں
ترا پیام محبت ہے اور کچھ بھی نہیں
ترا پیام زمانے میں عام کرتے ہیں
زمینِ ہند تجھے ہم سلام کرتے ہیں

جو بات کہنے کی ہے برملا کہیں گے ہم
ہر ایک حال اب متحد رہیں گے ہم
تری خوشی کے لیے سارے غم سہیں گے ہم
متاعِ زیست کو ہم تیرے نام کرتے ہیں
زمینِ ہند تجھے ہم سلام کرتے ہیں

چمن چمن تری عظمت کے گیت گائیں گے
لہو سے اپنے تری مانگ ہم سجائیں گے
ترا وقار تری آبرو بچائیں گے
یہ عہد تجھ سے بصد احترام کرتے ہیں
زمینِ ہند تجھے ہم سلام کرتے ہیں

محمد اسحٰق صدیقی
۱۰۵ اے۔ گوئن تالاب،
لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

مشہور ماہرِ حیوانات

کہتے ہیں علم کی دیوی سرسوتی اور دولت کی دیوی لکشمی میں بیر ہے۔ دونوں کا کسی پر ایک ساتھ مہربان ہونا محال ہے۔ چنانچہ جس کے پاس دولت ہوتی ہے اس کے پاس علم نہیں ہوتا اور جس کے پاس علم ہوتا ہے اس کے پاس دولت نہیں ہوتی۔ عالموں کو اکثر غریبی کی حالت میں زندگی بسر کرتے دیکھا گیا ہے اور تاجروں کو اتنی فرصت کہاں کہ علم حاصل کریں لیکن ہر کلیے میں چند مستثنیات بھی ہوتے ہیں۔ انہی میں ایک مستثنیٰ شخصیت کا نام ہے۔ ہمایوں عبدالعلی — جو ردّی لوہے اور معدنیات فضلات کا کاروبار کرنے والی ببمئی کی ایک بڑی فرم فیض اینڈ کمپنی لمٹیڈ کے مالک ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ عالم بھی ہیں۔ ان کی دلچسپی اور تحقیق کا خاص موضوع ہندستان کے حیوانات ہیں۔ تاجر ہوتے ہوئے بھی ان کے غیر معمولی علمی انہماک نے مجھے ان کے حالاتِ زندگی جاننے اور اردو داں طبقے کو ان کی علمی خدمات سے روشناس کرانے پر آمادہ کیا۔

ہمایوں عبدالعلی صاحب کا تعلق بمبئی کے ایک اعلا خاندان سے ہے جس میں کئی نامور ہستیاں گزری ہیں۔ ان میں سرِ فہرست بدرالدین طیب جی کا نام ہے، جو مشہور بیرسٹر تھے اور بعد میں بمبئی ہائی کورٹ کے پہلے مسلم جج ہوئے۔ وہ انڈین نیشنل کانگرس کے صدر بھی تھے۔ ہمایوں عبدالعلی صاحب کی رفیقہ حیات رفیعہ انھیں بدرالدین طیب جی کی پوتی ہیں۔ ان کی والدہ لولو نذر محمد فتح علی پرندوں کے مشہور عالم ڈاکٹر سالم علی (پورا نام سالم معیز الدین عبدالعلی) کی پھوپھی زاد بہن ہیں۔ ان دونوں نامور عالموں کا سلسلۂ نسب جیوا بھائی عبدالعلی تک پہنچتا ہے، جو ان حضرات کے پردادا تھے۔

ہمایوں عبدالعلی کے دادا فیض الحسین عبدالعلی کیمبے (گجرات) میں کسٹم کے داروغہ تھے۔ ان کے والد نجم الدین فیض الحسین عبدالعلی کا جاپان میں بڑا کاروبار تھا۔ وہ پہلی جنگِ عظیم سے پہلے ردّی لوہا درآمد کرتے تھے۔

ہمایوں عبدالعلی اپنے والدین کی دوسری اولاد ہیں۔ ان سے بڑی ایک بہن، دو چھوٹے بھائی اور ایک چھوٹی بہن ہیں۔ وہ کوبے (جاپان) میں ۱۹ مئی ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کوبے کے انگلش مشن اسکول میں پائی۔ ۱۹۲۴ء میں وہ اپنے والدین کے ساتھ جاپان سے ہندستان واپس آئے۔ بمبئی کے سینٹ زیویرس ہائی اسکول میں نام لکھایا گیا۔ دسواں پاس کرنے کے بعد وہ سینٹ زیویرس کالج میں داخل ہوئے جہاں سے انھوں نے ۱۹۳۶ء میں بی، اے (آنرس) پاس کیا۔ ان کا خاص موضوع انگریزی ادب تھا اور ثانوی مضامین علم نباتات اور علم حیوانات تھے۔ آخرالذکر سے انھیں آگے چل کر اپنے تحقیقی کام میں بڑی مدد ملی۔ تجربے اور مشاہدے کے ساتھ ساتھ ان کا علم وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ طالب علم سے خود ایک عالم متبحر بن گئے۔

بچپن سے انھیں پرندوں کے مشاہدے اور شکار کا شوق تھا۔ وہ پرندوں کے انڈے جمع کیا کرتے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں ۱۷ سال کی عمر میں وہ حیوانات پر تحقیق کرنے والے شہرۂ آفاق ادارے بمبئی نیچرل ہسٹری سوسائٹی (Bombay Natural History

(Society) کے ممبر بن گئے اور اسی سال سوسائٹی کے جرنل میں ان کا پہلا مراسلہ شائع ہوا "کوّے کے ایک گھونسلے میں کویل کے گیارہ انڈے۔"

جب سالم علی صاحب نے ہندستانی پرندوں کی تحقیق کے سلسلے میں ملک کا سروے شروع کیا تو ہمایوں عبدالعلی نے ان کے ساتھ کالج کی تعطیل کے کئی مہینے گزارے۔ ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں دو بار حیدرآباد (دکن) اور ۱۹۳۳ء میں ٹراونکور کے سروے میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ اور اس طرح "فیلڈ ورک" کا عملی تجربہ حاصل کیا۔

۱۹۳۶ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد وہ اپنے والد کے کاروبار میں شریک ہو گئے۔ لیکن کاروباری مصروفیات کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں پرندوں کا مشاہدہ بھی جاری رکھا۔ کالج کی تعلیم کے دوران انھوں نے بمبئی کے قرب و جوار میں پائے جانے والے پرندوں کی بیشتر اقسام کو مار کر ان کی کھالیں محفوظ کی تھیں۔ اس ذخیرے کی بنا پر انھوں نے سالم علی صاحب کے ساتھ مل کر ایک طویل مقالہ لکھا "بمبئی اور سالسیٹ کے برڈز" (Birds of Bombay and Salsette)۔ جو بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے جرنل میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک چھ قسطوں میں شائع ہوا۔ بعد میں اس مقالے کو بمبئی کے پرنس آف ویلز میوزیم نے کتابی صورت میں شایع کیا۔ لیکن اب یہ کتاب نایاب ہے۔

جب ہندستان آزاد ہوا اور بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے انگریز ممبر ایک ایک کرکے اپنے وطن واپس چلے گئے تو سوسائٹی کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ باذوق اور صاحب حیثیت ممبران کی مالی امداد کے بغیر سوسائٹی کا چلنا مشکل نظر آنے لگا۔ ایسے مایوس کن حالات میں ہمایوں عبدالعلی (جو ۱۹۴۲ء سے سوسائٹی کی مجلس عاملہ کے رکن تھے) اور سالم علی صاحبان نے سوسائٹی کے آنریری سکریٹری شپ کا عہدہ سنبھالا۔ وہ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۲ء تک (چودہ سال) سوسائٹی کے معتمد اعزازی رہے۔

ہندستان کے انواع واقسام کے حیوانات کی بقا اور تحفظ کے لیے وہ مسلسل جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ بمبئی کے جنگلی جانوروں اور جنگلی پرندوں کے تحفظ کے قانون کا مسودہ تیار کرنے میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا، جسے ۱۹۵۱ء میں بمبئی کی حکومت نے پاس کر دیا۔ یہ ہندستان میں جنگلی جانوروں کی حفاظت کے لیے عملاً پہلا قانون تھا۔

۱۹۵۲ء میں انڈین بورڈ فار وائلڈ لائف قائم ہوا، تب سے لے کر ۱۹۸۱ء تک وہ اس بورڈ میں سوسائٹی کی نمائندگی کرتے رہے۔ اس کے علاوہ مہاراشٹر وائلڈ لائف ایڈوائزری بورڈ اور بمبئی کے مشہور پرنس آف ویلز میوزیم کے بورڈ آف ٹرسٹیز میں بھی سوسائٹی کی نمائندگی کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ وہ وائلڈ لائف ایکٹ کے تحت اعزازی گیم وارڈن (Game Warden) یعنی شکار کے نگراں بھی رہ چکے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں اور بغیر اجازت نامے کے بمبئی کے قرب و جوار میں شکار کرنے والے سیکڑوں افراد کو پکڑوانے میں مدد کی۔

بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی کا موجودہ دفتر ہارن بل ہاؤس (Hornbill House) شہید بھگت سنگھ روڈ پر بمبئی میں ہے یہ عمارت پرنس آف ویلز میوزیم کی زمین پر تقریباً ۴ لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر ہوئی۔ ۱۹۶۲ء کے آخر میں تعمیر کا کام شروع ہوا اور مارچ ۱۹۶۵ء میں عمارت کا افتتاح ہوا۔ اس شاندار اور وسیع عمارت کی تعمیر ہمایوں عبدالعلی صاحب کی کوششوں سے ہی ممکن ہو سکی۔ جس کے لیے انھوں نے حکومت ہند کی وزارت تعلیمات سے مالی امداد حاصل کی۔ اسی سلسلے میں ایک قانونی گتھی کا ذکر ضروری ہے۔ پرنس آف ویلز میوزیم کی زمین پر اس عمارت کی تعمیر کی سوسائٹی کو اجازت دینا ناممکن تھا۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ قانونی طور پر یہ عمارت میوزیم کی ملکیت ہے اور اسے سوسائٹی کو ایک روپیہ سالانہ پٹے پر دیا گیا ہے۔

ہمایوں عبدالعلی ہندستان کے حیوانات کے بارے میں اپنے مشاہدات مختصر یادداشتوں اور مضامین کی صورت میں جرنل آف بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی میں برابر شائع کراتے رہے ہیں۔ ان کی ایسی یادداشتوں اور مضامین کی تعداد تقریباً دو سو ہے۔ یہ نگارشات بیشتر پرندوں کے بارے میں ہیں لیکن سانپوں، چھپکلیوں اور

مینڈکوں ایسی ناپسندیدہ مخلوقات کو بھی نظرانداز نہیں کیا گیا ہے
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی دلچسپی محض پرندوں تک محدود نہیں
ہے بلکہ ہر طرح کے جانداروں میں ہے۔ وہ سوسائٹی کے بلندپایہ
علمی جریدے جرنل آف بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے جولائی ۱۹۶۰ء
سے مارچ ۱۹۶۲ء تک (جلد ۵۷ تا ۵۹) کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔
بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی نے ۱۹۸۱ء میں ان کے حسب ذیل
دو کتابچے شایع کیے ہیں:۔

(1) CHECKLIST OF THE BIRDS
OF MAHARASHTRA

(2) CHECKLIST OF THE BIRDS
OF BORIVLI NATIONAL PARK

پہلا کتابچہ مہاراشٹرا اور دوسرا کتابچہ بوربولی نیشنل پارک
میں پائے جانے والے پرندوں کی مکمل فہرست ہے۔ یہ فہرستیں مذکورہ
بالا مقامات پر نظر آنے والے پرندوں کا مشاہدہ کرنے والوں کے لیے
مفید ہیں۔ ان کے علاوہ ایک کتابچہ خود انھوں نے ۱۹۷۸ء میں شایع
کیا تھا جس کا نام ہے۔

CHECKLIST OF THE BIRDS
OF DELHI, AGRA AND BHARATPUR

یہ ان پرندوں کی فہرست ہے جو دہلی، آگرہ اور بھرت پور میں
دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ کتابچہ انھوں نے ایک دوسرے محقق جمشید
ڈی پانڈے کے اشتراک و تعاون سے لکھا تھا۔

ہمایوں عبدالعلی صاحب نے ۱۹۶۲ء میں بامبے نیچرل
ہسٹری سوسائٹی کے معتمد اعزازی کے عہدے سے استعفا دے دیا
اور انڈمان اور نکوبار کے پرندوں کے بارے میں باقاعدہ تحقیق
کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس وقت تک کسی نے اس کام کی طرف توجہ
نہ کی تھی۔ وہ ۱۹۶۶ء اور ۱۹۶۷ء کے درمیان آٹھ بار مذکورہ بالا
جزائر کے پرندوں کا سروے کرنے اور ان کے نمونے جمع کرنے گئے
اس سفر اور تحقیق کے اخراجات کسی حد تک انھوں نے برداشت کیے،
کچھ بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی نے اور کچھ پرنس آف ویلز میوزیم
نے۔ نیویارک کے امریکن میوزیم آف نیچرل ہسٹری نے بھی اس
کام میں ان کی مالی امداد کی۔ ۱۹۷۷ء میں وہ زولاجیکل سروے آف
انڈیا کی ایک تحقیقی جماعت کے ساتھ گئے تھے۔

انڈمان اور نکوبار کے پرندوں کے بارے میں انھوں نے اپنے
تحقیقی مضامین بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے جرنل میں شائع کرائے
یہ مضامین جرنل کی جلد ۶۱ (۱۹۶۵ء)، جلد ۶۴ (۱۹۶۷ء)، جلد ۶۸
(۱۹۷۱ء)، جلد ۷۱ (۱۹۷۴ء)، جلد ۷۵ (۱۹۷۹ء) اور جلد ۷۸ (۱۹۸۱ء)
میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کی چھان بین سے انڈمان اور نکوبار میں پرندوں
کی ۱۶ نئی نسلوں (جن میں ۱۱ نئی ذیلی انواع بھی شامل ہیں) کا پتہ چلا۔
یہ فخر غالباً کسی بھی معاصر محقق کو حاصل نہیں ہے۔ یہی نہیں دو پرندوں
ایک سانپ اور ایک مینڈک کے علمی ناموں کے ساتھ (جو لاطینی زبان
میں ہوتے ہیں) ہمایوں عبدالعلی صاحب کا نام جڑا ہوا ہے۔

یہ نام مختلف ماہرین حیوانات نے رکھے ہیں:

۱۹۵۱ء میں وسطی ہند کے گل دُم CENTRAL
INDIAN RED-VENTED BULBUL کو نام دیا گیا:
PYCNONOTUS CAFER HUMAYUNI.

۱۹۵۵ء میں جھریوں دار مینڈک WRINKLED
FROG کو نام دیا گیا:
NYCTIBATRACHUS HUMAYUNI.

۱۹۷۳ء میں نکوبار کے بڑے سانپ GREAT
NICOBAR SNAKE کو نام دیا گیا:
DENDRELAPHIS HUMAYUNI.

۱۹۸۰ء میں انڈمان کے بلیسر (شکرہ) ANDAMAN'S
SPARRO-HAWK کو نام دیا گیا:
ACCIPITER GULARIS ABDUL ALI

ہمایوں عبدالعلی صاحب نے قدرت کی ایک بظاہر ادنیٰ لیکن
نہایت مفید مخلوق یعنی مینڈک کی جان بچانے کے لیے بڑی جانفشانی
کی ہے۔ غالباً کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ یورپ اور امریکہ میں
مینڈک کی ٹانگوں کا گوشت بہت مقبول ہے۔ مینڈک کی ٹانگوں کے

کاروبار کے دو بڑے مرکز بمبئی اور مدراس ہیں، بمبئی سے بیشتر گوپال مینڈک[2] (BULL FROG) کی ٹانگیں باہر بھیجی جاتی ہیں اور مدراس سے تالاب کے مینڈک[3] (POND FROG) کی۔ ان کا گوشت غیر ممالک میں ۲۵ روپے کیلو تک بکتا ہے اور اس سے سالانہ دس پندرہ کروڑ روپے کا زرمبادلہ کمایا جاتا ہے۔ اس کے لیے تقریباً ۹، ۱۰ ہزار ٹن مینڈک ہر سال مارے جاتے ہیں اور چار پانچ ہزار ٹن گوشت باہر بھیجا جاتا ہے۔

مینڈک کے اس اندھا دھند شکار سے نظام قدرت میں جو خلل پیدا ہوتا ہے اس کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہے۔ ہمایوں عبدالعلی صاحب نے اس سلسلے کی طرف ارباب حکومت کی توجہ مبذول کی۔ انڈین کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ نے اس معاملہ کی چھان بین کے لیے ایک منصوبہ بنایا جسے عملی جامہ پہنانے کے لیے خود موصوف کو خاص محقق (پرنسپل انویسٹی گیٹر) مقرر کیا۔ ۱۵ مئی ۱۹۷۶ء سے ۱۴ مئی ۱۹۷۹ء تک تین سال کی گہری چھان بین کے بعد انھوں نے اپنی رپورٹ داخل کی۔ اس رپورٹ میں مینڈک کے گوشت کی برآمد پر پابندی عائد کرنے کی پرزور سفارش کی گئی۔ اور اس دعوے کے لیے کافی شواہد فراہم کیے گئے کہ مینڈکوں کے مارنے سے کیکڑوں اور بہت سے ایسے کیڑوں کی تعداد میں بھاری اضافہ ہوتا ہے، جو اس سے کہیں زیادہ نقصان پہونچاتے ہیں جتنا نفع مینڈکوں کی ٹانگوں کی تجارت سے ہوتا ہے۔ انھوں نے اس کام کے لیے کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا۔

انڈین کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ نے انھیں اس اعزازی خدمت کے لیے مبارک باد تو دی لیکن ان کی تجاویز پر عمل نہ کر سکی، کیونکہ کونسل کا دائرہ اختیار محض سفارش تک محدود ہے اور تجاویز پر عمل درآمد کے لیے وزارت تجارت (منسٹری آف کامرس) کی اجازت ضروری ہے۔

بہر حال حکومت ہند نے ۱۹۷۲ء کے جنگلی جانوروں کے تحفظ کے قانون کے تحت گوپال مینڈک کے مارنے اور اس کی پیکنگ کے لیے لائسنس حاصل کرنا ضروری قرار دیا۔ اس کے علاوہ حیوانات پر ظلم و ستم روکنے والی عالمی انجمن[4] نے بھی حکومت ہند کی توجہ اس سلسلے کی طرف مبذول کی۔ مینڈکوں پر کتنا ظلم ہوتا ہے اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ پکڑنے کے بعد زندہ مینڈک بوروں میں بھر کر اور ٹرک پر لاد کر سو دو سو میل دور پیکنگ کرنے کے مرکز پر لے جائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے مینڈک راستے ہی میں دم گھٹنے سے مر جاتے ہیں۔ منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد مینڈک کو پچھلی ٹانگوں سے پکڑ کر جسم کا اگلا حصہ چاقو سے کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ پھر ٹانگوں سے کھال اتار کر پیک کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طریقے سے جسم کے دونوں حصے الگ الگ تڑپ تڑپ کر مرتے ہیں۔ ایک نہیں دو نہیں بلکہ نو دس ہزار ٹن (ایک مینڈک کا وزن اوسطاً چار اونس ہوتا ہے)

ہمایوں عبدالعلی صاحب کی ایک زبردست علمی خدمت ان پرندوں کی مفصل فہرست تیار کرنا ہے جن کی کھالیں بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی میں محفوظ ہیں۔ غالباً کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ پرندوں کی لاشیں محفوظ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے جسم سے گوشت الگ کر دیا جاتا ہے۔ چونچ اور ٹانگوں سمیت کھال مع پروں کے باقی رکھی جاتی ہے۔ اس پر سنکھیا کا سفوف (ARSENIC POWDER) چھڑکا جاتا ہے تاکہ کیڑے اسے نقصان نہ پہنچا سکیں۔ پھر کھال کے اندر روئی بھر کر اسے اصل کے مطابق بھرے بدن کا بنا لیا جاتا ہے۔ پرندوں کی لاشوں کو محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ ساری دنیا کے مردہ عجائب گھروں اور حیوانات کے بارے میں تحقیق کرنے والے اداروں میں کام میں لایا جاتا ہے۔ اس طرح محفوظ کرنے پر پرند کی ناپ آسانی سے لی جا سکتی ہے، جو علمی تحقیق کے لیے نہایت ضروری ہے۔ سوسائٹی میں پرندوں کی تقریباً ۲۶ ہزار کھالیں محفوظ ہیں۔ اور ان میں قدیم ترین نمونہ سو سال سے زیادہ پرانا ہے۔

ہمایوں عبدالعلی صاحب گذشتہ ۱۷ سال سے مذکورہ بالا پرندوں کی فہرست تیار کرنے میں لگے ہیں۔ اب تک اس فہرست (کیٹلاگ[5]) کے ۲۲ حصے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے ۳۹۱ صفحات میں پرندوں کی ۱۰۶۱ انواع اور ذیلی انواع کا ذکر ہے۔ ان میں سے

بعض پرند دیگر ممالک مثلاً ایران، عراق، ملا، برما وغیرہ کے ہیں۔ اب تک اس فہرست کو تیار کرنے میں انھیں تقریباً ۱۲ ہزار پرندوں کا معائنہ کرنا پڑا۔ ہر پرند کے جسم کی چار ناپیں لی جاتی ہیں۔ بازوؤں کی لمبائی دم کی لمبائی، ٹانگ کی لمبائی اور چونچ کی لمبائی۔ پرند کے دونوں بازو (پنکھ) ناپے جاتے ہیں، جو زیادہ لمبا ہوتا ہے اس کی لمبائی نوٹ کی جاتی ہے۔ ایک دن میں دس پندرہ پرندوں سے زیادہ کی ناپ نہیں لی جا سکتی۔ اگر کوئی معاون ہو تو پچیس تک پرند ناپے جا سکتے ہیں۔ تعداد کی کمی بیشی کا انحصار نمونے کی حالت اور جسامت پر ہے۔ اس کام کے لیے وہ روزانہ سوسائٹی میں باقاعدہ ڈیڑھ گھنٹہ سے لے کر ڈھائی گھنٹے تک گزارتے ہیں۔ اس کے علاوہ گھر پر یا اپنے دفتر میں موقع ملنے پر یادداشتیں تیار کرتے ہیں۔ اوسطاً اس کام کے لیے انھوں نے تین گھنٹے وقف کر دیے ہیں۔ ہر پرند کی شناخت کے سلسلے میں پرندوں سے متعلق پرانی اور نئی کتابوں اور علمی جریدوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ زیر تحقیق پرند کا نام صحیح بیان کیا گیا ہے یا نہیں اور بیان کی ہوئی خصوصیات کہاں تک صحیح ہیں۔ مختلف ذیلی انواع میں جو فرق بیان کیے جاتے ہیں ان کی موجودہ نمونوں سے تصدیق ہوتی ہے یا نہیں۔ اس چھان بین سے بعض حیرت انگیز اور دلچسپ حقائق سامنے آئے ہیں۔

موصوف سے معلوم ہوا کہ وہ اب تک مذکورہ بالا فہرست کے ۲۸ حصے تیار کر چکے ہیں اور پرندوں کا بیان ۱۲۰۱ انواع اور ذیلی انواع تک پہونچ چکا ہے۔ ہندستان، پاکستان، نیپال، بھوٹان، بنگلہ دیش اور سری لنکا وغیرہ پر مشتمل اس تمام علاقے میں پرندوں کی تقریباً ۲۰۶۰ انواع اور ذیلی انواع پائی جاتی ہیں۔ اس عظیم کام کو جلد سے جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے سوسائٹی نے موصوف کو گزشتہ چند برسوں سے ایک مددگار بھی مہیا کر رکھا ہے۔ موجودہ رفتار سے اس کام کے مکمل ہونے میں تقریباً پانچ سال لگیں گے۔

آخر میں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ ہمایوں عبدالعلی صاحب کو قدرت نے مال و منال اور علم و فضل کے علاوہ صالح اولادیں بھی عطا کی ہیں۔ بڑے صاحبزادے اکبر (ہمایوں) عبدالعلی (عمر ۲۸ سال) اپنے والد کے کاروبار میں شریک ہیں، اور چھوٹے سلمان (ہمایوں) عبدالعلی (عمر ۲۵ سال) ایم۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد نیویارک میں ریاضی میں تحقیق کر رہے ہیں۔

★

حواشی: [1] پتہ: عبدالرحمٰن اسٹریٹ بمبئی۔ ۴۰۰۰۰۳، اس کی بنیاد ان کے والد نے ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ ڈالی تھی۔

[2] لؤلؤ عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "بڑا آبدار موتی"۔ عمر تقریباً ۹۶ سال، جیوا بھائی عبدالعلی کی نواسی ہیں، جیوا بھائی کا آگے ذکر ہے۔

[3] جیوا بھائی عبدالعلی بہ سلسلۂ تجارت ۱۸۴۵ء میں ہانگ کانگ چلے گئے تھے۔ ہانگ کانگ پر انگریزی تسلط ۱۸۴۱ء میں ہوا تھا۔

[4] افسوس کہ نجم الدین صاحب ۱۹۵۲ء میں دہلی اور نئی دہلی کے درمیان فرنٹیئر میل میں سفر کرتے ہوئے مزاحمت کرنے پر ایک دہشت گرد کی گولی کا نشانہ بن گئے تھے، قاتل کو پولیس نے گرفتار تو کر لیا، لیکن اس کا انجام کیا ہوا، اس کا علم نہیں۔

[5] پہلا ایڈیشن پہلی بار ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا تھا، دوسری بار ۱۹۸۱ء میں چھپا۔

[6] RANA TIGRINA [7] RANA HEXADACTYLA

[8] WORLD SOCIETY FOR PREVENTION OF CRUELTY TO ANIMALS

[9] A CATALOGUE OF THE BIRDS IN THE COLLECTION OF THE BOMBAY NATURAL HISTORY SOCIETY

غزلیں

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
قطب پور، ڈالی گنج
لکھنؤ

(فراق کی زمین میں)

کیا ہے وعدہ نہ آؤ گے تم مگر پھر بھی
تکیں گے ہم تو تری راہ عمر بھر پھر بھی

وہیں سکون ملے گا جہاں سے آئے تھے
ہزار عیش سفر میں ہو گھر ہے گھر پھر بھی

یہ راگ و رنگ کی پُرلطف داستانِ حیات
شنیدنی سہی ، افسانہ ہے مگر پھر بھی

وہ بے نیاز سہی بے وفا سہی لیکن
ہمارے حال سے رہتا ہے باخبر پھر بھی

طرح طرح سے شب و روز دل کو بہلایا
یہ زندگی رہی ہر حال دردِ سر پھر بھی

یہ جانتا ہوں کہ اس کا نشاں ملے گا نہیں
پھرا رہا ہے کوئی مجھ کو در بدر پھر بھی

زمانہ گزرا کھلی تھی جب آنکھ انساں کی
نئی نئی سی لگے ہے ہر اک سحر پھر بھی

یہی بہت ہے ہمارے لیے کہ محفل میں
وہ دیکھ لیتا ہے بیگانہ وار ادھر پھر بھی

جبیں پہ اُن کے شکن آ گئی غنیمت ہے
ہماری آہ میں ہے کچھ نہ کچھ اثر پھر بھی

ڈسے ہزار یہ ناگن کی طرح کالی رات
ہر ایک شب کی ہوا کرتی ہے سحر پھر بھی

نہ بات کرنے کی طاقت نہ اہلیت نہ شعور
یہ ہاشمی ہے عجب مردِ باہنر پھر بھی

ڈاکٹر ولی الحق انصاری
صدر شعبۂ فارسی
لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

(نذرِ فراق)

کھینچ رہا ہے اپنی جانب اب بھی بتِ طنازِ غزل
موہ رہا ہے اب بھی دل کو حسنِ کرشمہ سازِ غزل

یہ تو نہیں ہے بعدِ فراق اب نہیں کوئی ہمرازِ غزل
اب بھی ترانہ ساز بہت ہیں، اب بھی ہیں دمسازِ غزل

نئے ترانے چھیڑے ہم نے اب جو ہوا خاموش فراق
سونے لگے جب اس کے نغمے ہم نے سنبھالا سازِ غزل

کرتے ہیں پیش ایک نئے انداز سے اپنے دل کا خور
ایک نئی آواز سے اب ہم کرتے ہیں آغازِ غزل

نے میں کمی نہ آئے گی نہ اس کی مٹ نہ سکیں گے زیر و بم
دب نہ سکے گی شورشِ پیہم سے بھی کبھی آوازِ غزل

تار چھیڑے جائیں گے اس کے خواہ کوئی بھی ہو مضراب
ہاتھ میں فنکاروں کے رہا ہے اور رہے گا سازِ غزل

اب بھی اہلِ نظر ہیں کافی اب بھی دل والے ہیں بہت
جیسے اٹھا کرتے تھے پہلے اب بھی اٹھیں گے سازِ غزل

اب بھی وہی ہے اس کی وقعت اب بھی وہی ہے اس کی شان
جیسا پہلے تھا اب بھی ہے زور پہ پروازِ غزل

دام میں اب بھی اہلِ سخن کے مشکل ہی سے آتا ہے
رہتا ہے تخیل کی چوٹی پر اب بھی شہبازِ غزل

اس کے ہزاروں تاج محل ہیں، اس کے ہزاروں شاہجہاں
کون مٹا سکتا ہے اس کو جب ہے امر ممتازِ غزل

اٹھے تھے جو قتلِ غزل کو، دم سے غزل کے زندہ ہیں
دیکھو قدرت کا یہ کرشمہ دیکھو یہ اعجازِ غزل

طرزِ فراق الگ ہے سب سے جدا ہے اس کا رنگ
اس کی طرح تیرا بھی ولی ہے سب سے جدا اندازِ غزل

ڈاکٹر آصفہ زمانی
شعبۂ فارسی
لکھنؤ یونیورسٹی

شمس العلماء مفتی میر عباس

آصف الدولہ سے لے کر واجد علی شاہ تک کا لکھنؤ عظمتِ پارینہ کا ایک ایسا زریں عہد ہے جو نہ صرف تاریخی، تمدنی، تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے اہم ہے بلکہ ادبی اعتبار سے بھی ایک ممتاز مقام کا حامل ہے۔ ہندستان اور ایران کے دوستانہ تعلقات کی بنیاد تو مغلیہ عہد ہی میں استوار ہو چکی تھی اور مغلیہ داد و دہش کی وجہ سے نہ معلوم کتنے ایرانی شعراء کھنچ کھنچ کر ہندستان پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ انعام و اکرام کی فیاضیوں کا یہ سلسلہ نوابین اودھ تک جاری و ساری رہا۔ آصف الدولہ کے عہد تک پہنچتے پہنچتے سیاسی قوت برائے نام رہ گئی تھی جس کی وجہ سے اگرچہ انگریزی عمل دخل کافی بڑھ چکا تھا، تاہم آصف الدولہ کی داد و دہش کا ملک اور بیرونِ ملک میں ایسا چرچا ہوا کہ جسے سن کر گوشے گوشے سے ماہرینِ فن دربارِ اودھ میں سمٹ آئے۔ ان نو واردین کی فہرست میں مفتی میر عباس کے جدِ امجد سید محمد جعفر بھی شامل ہیں جو آصف الدولہ کے آخری عہد (۱۲۱۱ھ) میں شوستر سے لکھنؤ آئے اور نواب سعادت علی خاں کے مصاحبِ خاص مقرر ہوئے۔

آپ کے دو بیٹے تھے، بڑے سید علی اکبر اور چھوٹے سید عباس۔ سید علی اکبر کا شمار اپنے وقت کے فارسی کے مشہور عالموں میں ہوتا ہے۔ شعر و سخن کا ذوق خداداد تھا۔ مفتی میر عباس آپ ہی کے فرزندِ رشید ہیں۔ آپ ۱۲۲۴ھ میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ لکھنؤ کے شہرت یافتہ گھرانوں میں غفراں مآب (مولانا دلدار علی) اور مفتی میر عباس شوستری کا خاندان اپنے علم و فضل کے اعتبار سے بے حد مشہور ہے۔

مفتی میر عباس ابتدا ہی سے انتہائی سریع الفہم اور ذکی الطبع تھے۔ اپنے وقت کے ذی علم حضرات مولوی عبد القوی، مولوی عبد القدوس اور مولوی قدرت علی صاحب سے طب، معقولات، حساب، فلسفہ، ہیئت و ہندسہ کی تعلیم حاصل کر کے چودہ سال کی چھوٹی سی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے اور اٹھارہ سال کی کم عمری میں آپ کا شمار عربی و فارسی کے زبردست عالموں میں ہونے لگا۔ آپ کی عربی دانی کا تو یہ عالم تھا کہ اپنے وقت کے سید العلماء و سلطان العلماء کے پاس عراق و عرب و عجم سے آئے ہوئے خطوط کے جوابات آپ ہی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہوتے۔ عربی لغت پر عبور کا یہ عالم تھا کہ ایک لاکھ سے زیادہ ذخیرۂ لغت ان کے حافظہ میں موجود تھا جس کا بین ثبوت آپ کی عربی کی کثیر تصانیف ہیں۔ جو آج عربی کے طلباء کے لئے تحقیق کا دروازہ کھولتی ہیں۔

آپ کا زمانہ محمد علی شاہ اور واجد علی شاہ کا زمانہ رہا ہے۔ آپ اگرچہ کسی دربار سے کبھی وابستہ نہ ہوئے تاہم محمد علی شاہ کی طرف سے علمی قدر دانی کے طور پر آپ کو وظیفہ ملتا رہا۔ نواب امین الدولہ بہادر نے محکمۂ وزارت میں فتویٰ کا حکم صادر کرنے پر مفتی کا خطاب عطا فرمایا۔ اور ملکۂ وکٹوریہ کی پنجاہ سالہ جبلی کے موقع پر گورنمنٹ کے عطا شدہ خطابات میں آپ کو شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا، اور

[illegible] نے آپ کے تبحرِ علمی سے متاثر ہوکر "استاذالاساتذہ" "استادِ اکمل" کے لقب سے یاد کیا۔

جس طرح مفتی صاحب کو عربی زبان پر عبور کامل تھا، فارسی میں بھی ایسی مہارتِ تامہ رکھتے تھے کہ ان کی فارسی تحریروں اور فارسی کلام پر اہلِ زبان کا شبہ ہوتا ہے۔ مفتی صاحب نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور جس ماحول میں ان کا ذہنی ارتقا ہوا اس پر "سبک ہندی" کا لیبل لگا ہوا تھا۔ یہ وہ سبک ہے جو امیر خسرو سے شروع ہوکر غالب تک پہنچتا ہے، اور معنی آفرینی، پیچیدگیِ بیان، دقتِ خیال اور اغراق و غلو کے لیے مشہور ہے۔ ملک الشعرا بہار کے الفاظ میں ــــــــ

"ہندوستان کے علما و فضلا نے اپنی فضیلت ظاہر کرنے کے لیے ایران کے لکھنے والوں سے بھی زیادہ کوشش کی ہے۔ ... ہندوستان کے رہنے والے صاحبِ تصنیف زیادہ سے زیادہ اپنے فضل کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں ..... یہی حالت ہندوستانی اشعار کی ہے۔ بجز صائب کے جو کبھی کبھی واقعہ گوئی سے کام لیتے ہیں، بقیہ تمام شعرا خاص کر بیدل اور غنی جیسے شعرا کی اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ ایسی عبارت لکھیں جو صنعت اور مضمون آفرینی سے پُر ہو، چاہے اصل مقصد سے مناسبت رکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو"۔ [1]

لیکن عجیب اتفاق ہے کہ غالب کے ہم عصر مفتی صاحب کا طرز "سبک عراقی" اور "سبک ہندی" کے بین بین ہے۔ اگر ایک طرف مولانا کا کمال اور ان کی علمی قابلیت کا نمونہ مشکل اور پیچیدہ عبارات میں نظر آتا ہے اور وہ خطِ بے نقط اور صنعتِ منقوطہ کا استعمال کرکے ذہنی ورزش کا سامان بہم پہنچاتے ہیں تو دوسری طرف ان کے نرم و لطیف سادہ اور رواں الفاظ و جملے سعدی کی یاد دلاتے ہیں اور عام ذہنوں کو بھی دعوتِ فکر و نظر دیتے ہیں۔

مولانا کا فارسی کلام، قصیدہ، مثنویات، رباعیات، قطعات اور غزلیات پر مبنی ہے۔ مدحات، اموات و واقعات اور ولادت پر کہی گئی تاریخیں بھی ہیں۔ فارسی نثر میں جا بجا اشعار کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ قصائد عموماً منقبت کی صورت میں یا نواب ین اودھ کی مدح میں ہیں۔ مثنویات کی تعداد انیس [19] ہے جس پر انھیں فخر ہے ــــ فرماتے ہیں ــــــ

"شعرائے سابقین نے مختلف مذاق میں مثنویاں تصنیف کیں اور خوب زورِ طبع دکھایا۔ یہاں تک کہ بعض نے پانچ پانچ مثنویاں نظم کیں۔ مثلاً "خمسۂ نظامی" اور "خمسۂ جامی" لیکن میں نے انیس [19] مثنویاں لکھیں"۔

مفتی صاحب نے شاعری میں کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ نہ کیا، خود فرماتے ہیں ؎

بود ذوقِ خدا دادم باین فن
نہ شاگردم نہ استادم درین فن
در فنِ شعرم زکس امداد نیست
کار بی استاد را بنیاد نیست

سید تخلص اختیار کیا۔

غزلیں زیادہ تر واقعاتی ہیں۔ چونکہ مزاج میں زہد و تقویٰ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے لہٰذا کلام کا معتد بہ حصہ حق و معارف اور خوف و خشیت پر مبنی ہے۔ یہی ان کی شاعری کا خاص رنگ ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

خوب است در فراق تو شبہا گریستن
از خلق دور رفتن و تنہا گریستن
چاکے زدن بجیب و گریبان ز اضطراب
دستی زدن بدامن صحرا گریستن!

ــــــــ

دل کامیاب وصل نگشت آہ آہ آہ
عمر طویل بی تو گذشت آہ آہ آہ

ــــــــ

شکر احسانِ تو چسان بکنم
بکدامی لب و لسان بکنم

لیکن مفتی صاحب ترے زاہدِ خشک نہیں ہیں۔ ان کے اشعار سے ان کی رنگینیٔ طبع کے بھی جوہر کھلتے ہیں۔ خود فرماتے ہیں ؎

با ہمہ دعوی و تقوی و فضیلت تبید
این عشر بخوانیٔ رندانہ شما را نرسد

اور "مثنوی گوہر شاہوار" تو گویا اس کی مثال ہے۔ اس کا قصہ کچھ اس طرح ہے کہ مفتی صاحب ایک مرتبہ کوئی کتاب پڑھنے میں مشغول رہتے کہ چودہ سال کی ایک الھڑ دوشیزہ پیروں میں پائل پہنے چھم چھم کرتی ادھر آنکلتی ہے پردہ اٹھا کر ایک ناز و ادا سے دیکھتی ہے۔ مولانا کی نظریں بدستور کتاب پر جمی ہیں لیکن پازیب کی جھنکار ان کے دل میں ایک عجیب اختلال پیدا کر دیتی ہے۔ اس وقت ان کے دل پر کیا گذرتی ہے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خدا دادہ بودش بآن سیم و زر — دو تا دخترِ دلبرِ سیم بر
دو پاکیزہ دوشیزۂ خرد سال — دو ناسفتہ گوہر زکانِ جمال
دو خاتون لیلیٰ وش نازنین — دو غارتگر صبر و تقویٰ و دین
دو باغ بہار خیابان حسن — دو چشم و چراغ شبستان حسن
مگر آن بتانِ خجستہ دختن — بشوخی رسیدند تا جامی من
چو دیدند آن پردہ را درمیان — ستادند ناچار بیرون آن
ولی گرم انداز خوبان شدند — بودی زمین پای کوبان شدند
دلم از صدای کہ خلخال داشت — عجب اختلال و عجب حال داشت
ز مژگان خدنگی درونم زدند — کہ در پردہ چنگی بخونم زدند
اگرچہ ندیدم ولی زان صدا — پراگندہ شد، دل جدا جاں جدا
ز عقل و ہوس کار مشکل فتاد — نزاعی میان من و دل فتاد
ز رخسارۂ آن دو زہرہ جبین — ندیدم بجز پرتوی بر زمین

نگاری کہ من پیش رو داشتم
ہمہ تن توجہ باو داشتم

آپ نے متقدمین کے رنگ میں بھی غزلیں کہی ہیں لیکن یہاں مشاہدہ، واقعات اور تمثیلات ان کے اپنے ہیں۔ مثال کے طور پر خسرو کی ایک غزل ہے ؎

چہ بلاست از دو چشمت نظر بناز کردن — مژہ را گشاد دادن در فتنہ باز کردن

اسی ردیف و قافیہ میں نظیری کی ایک مشہور غزل ہے ؎

چہ خوش است از دو یکدل سر حرف باز کردن
سخنِ گذشتہ گفتن گلہ را دراز کردن

اور اسی زمین میں غالب نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی غزل کا مقطع ہے ؎

چہ غم ار بہ جد گرفتی ز من احتراز کردن
نتوان گرفت از من بگذشتہ ناز کردن

اسی ردیف و قافیہ اور اسی بحر میں اب مفتی صاحب کا اپنا رنگ ملاحظہ ہو ؎

چہ خوش است نیم شبہا در توبہ باز کردن
غم دل بدوست گفتن گلہ ہا دراز کردن

عرفی کا مشہور قصیدہ "ترجمۃ الشوق" جو آقا محمد علی داعی الاسلام کے کہنے کے مطابق حضرت امیر المومنین سے معذرت کے طور پر کہا گیا ہے جس کا مطلع ہے ؎

جہان بگشتم و دردا کہ ہیچ شہر و دیار
نیافتم کہ فروشند بخت در بازار

کے جواب میں مفتی صاحب کا مشہور قصیدہ ہے ؎

ترا کہ نیست بکف ہیچ درہم و دینار
چہ سود از ین کہ فروشند بخت در بازار
خدا غنی ست اگر تو فقیر می باشی
مہر تو درہم و دینار پیش او دین آر
دو رکعتی کہ کنی نیم شب بعجز و نیاز
دہند در عوضش بہتر از دو صد قنطار
دو روزہ عیش زمال و منال می باشد
نہ وقت مرگ بکار آید و نہ روز شمار
بسیم و زر ملک الموت بر نمی گردد
نہ نہ خور خلد بود طالبش ز تو زنہار

جہاں تک رباعیات کا تعلق ہے "لذتِ غم" اور "عبرت" جیسے مضامین پر مشتمل ہیں لیکن کہیں کہیں صاف عمر خیام کی

آواز بازگشت معلوم ہوتی ہے. مثلاً خیام کہتا ہے ؎

ناکردہ گناہ در جہان کیست بگو
آنکس کہ گنہ نکرد چون زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی
پس فرق میان من و تو چیست بگو

اور مفتی صاحب کہتے ہیں ؎

عفو و کرم از خدا مگر نیست. بگو
ور ہست پس اعتراض تو چیست بگو
گر در عوض ستم نکو می بکند
پس عدل چہ چیز و صاحبش کیست بگو

مفتی صاحب کو اپنے مولد، لکھنؤ سے والہانہ عقیدت ہے۔ زندگی میں کئی بار لکھنؤ سے باہر جانے کا اتفاق ہوا لیکن لکھنؤ سے باہر ان کا دل کبھی نہ لگا۔ ۱۲۷۵ھ میں نواب علی نقی خاں نے انھیں کلکتہ آنے کی دعوت دی۔ آپ پہلی بار تقریباً وہاں ایک سال مقیم رہے لیکن کسی لمحہ لکھنؤ کی یاد ان کے دل سے فراموش نہ ہوئی۔ جائے پیدائش کا تو ہر ذرہ دیوتا ہوتا ہے اس خاک میں تو اتنی کشش ہوتی ہے کہ اس کی یاد آجانے پر نصر بن احمد بغیر موزہ پہنے ہوئے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر سرپٹ بخارا روانہ ہو جانے پر مجبور ہیں۔ کچھ ایسی ہی تڑپ اور ایسی ہی خوشی کا اظہار مفتی صاحب کے اس قطعہ سے بھی جھلک رہا ہے جب وہ لکھنؤ واپس آرہے ہیں ؎

للہ الحمد کہ سید بوطن باز آمد
رفت با محنت و افلاس و باعزاز آمد
لکھنؤ باد صبا یش نفس عیسیٰ بود
کز تنم جان برون رفتہ باعجاز آمد
سالہا ہفت طبق بود پر از نغز تیم
وینکہ در تہنیت از شش جہت آواز آمد
شوخ بیباک کہ ہموارہ بمن می جنگید
بر سر آشتی و دلبری و ناز آمد

لطفہا گشت عیاں در سفر از پردۂ غیب
کیست جز دل کہ دران بادیہ ہمراز آمد
خوش نیامد روشش مردم بنگالہ را
بیشتر در نظرم مرد سخن ساز آمد

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد لکھنؤ کا شباب اگرچہ اُجڑ چکا ہے لیکن اس ویرانے میں بھی مفتی صاحب کو دلی سکون حاصل ہے وہ اس کی تعریف میں اس طرح رطب اللسان ہیں ؎

گرچہ زائل شد شبابِ لکھنؤ	عشوہ ہا دارد جنابِ لکھنؤ
ہست در کلکتہ گر سیم و زری	کیمیا باشد ترابِ لکھنؤ
غیرت معمورہ ہای عالم است	شہر ویران خرابِ لکھنؤ
ہم صفیر بلبل شیراز ہست	در نوا سنجی عنابِ لکھنؤ
لب فرو بستی اگر گشتی ظہیر	باریابِ فاریابِ لکھنؤ
مید ہد یاد از نعیم ہشت خلد	لطف و عیش بی حسابِ لکھنؤ

ہر کہ رفت از لکھنؤ خوابش نبرد
در خیال خور و در خوابِ لکھنؤ

فارسی شاعری میں اپنے وطن اور اپنی سرزمین ہندستان سے والہانہ عشق کا سب سے زیادہ اظہار خسرو کے یہاں ملتا ہے۔ ان کے نزدیک ہندستان کے رنگ و حسن میں آب حیات کی سی تاثیر ہے جس پر سمرقند، مصر و روم کا حسن قربان ہے۔ یہاں کے چمپا و چنبیلی کے پھولوں پر روم و شام کے پھولوں کی مہک نثار ہے۔ یہاں کے جانوروں میں طوطے، کوّے اور طاؤس دیگلے دلہن جیسی رعنائی رکھتے ہیں۔ یہاں کے پھلوں میں آم کے تو وہ عاشق ہیں اور خربوزہ کو ثمر بہشت پر ترجیح دیتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

خربزہ گوی کہ صحرا و کشت
گوی ز بود از ثمرات بہشت
از مزہ گرد آمد دردی نبات
خام خضر پختہ چو آب حیات

مفتی صاحب نے بھی یہاں کے موسم، یہاں کی عمارات اور یہاں کے پھلوں سے والہانہ جذبات کا اظہار کیا ہے۔ خربوزے کے متعلق

مفتی صاحب کا خیال ہے کہ ؎

نیر تم آمی کوزۂ از قند بود ۔۔۔ یا سبدِ خربزۂ چند بود

بود مسلّم ہمہ بدر کمال ۔۔۔ تیغ زدم سر زدہ چندین ہلال

سر نکشید از چہ من آزردمش ۔۔۔ بوی وفا داشت چو بو کردمش

گر حلاوت چو لب یار داشت ۔۔۔ رنگ رخ عاشق بیمار داشت

فاش کنیمی زدل خستہ است

فاش چہ گویم کہ نہم بستہ است

لکھنؤ کی تاریخی عمارات کی سیر کرنا ہو تو مفتی صاحب کا کلام ہاتھ میں اٹھا لیجئے اور گھر بیٹھے لکھنؤ کی سیر کیجئے۔ چلیے سر دست حسین آباد کے امام باڑے چلتے ہیں ؎

ہمنام مصطفےٰ و علی بادشاہ عصر!

کا وصاف اوز حاتم و کسریٰ توان شنید

آوازۂ بنای عزاخانۂ کہ ساخت

در شش جہت فتادۂ و ہفت آسمان شنید

سید در آن مقام رسید و بچشم دید

کیفیتی کہ از ارم واز جناں شنید

چوں بر ضریح پاک نگاہ من اوفتاد

آہی زدم کہ گوش کہ آسمان شنید

یا حبذا عجیب مقامی کہ از ازل

نی چشم چرخ دید و نہ گوش جہاں شنید

سالِ بناش را چو دلم کرد جستجو

آواز گریہ از ملک پاسباں شنید

گفتا ہمیں بہ مرقدِ انور نوشتہ ایم

این جا نوای نالۂ زہرا تواں شنید

۱۲۵۲ھ

مفتی صاحب کو لکھنؤ کے نوابین میں واجد علی شاہ سے خاص التفات رہا ہے۔ چنانچہ ان کے حالات اُن کی نظم و نثر میں دوسرے نوابین سے زیادہ نظر آتے ہیں۔ خود واجد علی شاہ کو بھی مفتی صاحب سے بے حد عقیدت تھی۔ جس وقت واجد علی شاہ مٹیا برج کلکتہ میں تھے، آپ نے کلکتہ سے لکھنؤ آنے کی اجازت چاہی تو واجد علی شاہ نے فرمایا: "آپ میرے نزدیک مثل دل کے ہیں اور دل کو سینہ سے جدا نہیں کر سکتا۔" انھوں نے لکھنؤ کے ہم عصر شعرا میں سب سے زیادہ ذکر میر انیس کا کیا ہے۔ وہ ان کی وفات پر یوں آبدیدہ نظر آتے ہیں ؎

در بزم عزا آئنہ دار شہدا بود

تصویر کش معرکۂ کرب و بلا بود

با خلق حسن بود انیس الغربا بود

در مرثیہ گوی خضر راہنما بود

او رفت کہ سرچشمۂ حیوان سخن رفت

یہ تو مفتی صاحب کی فارسی شاعری کا مختصر سا خاکہ ہے۔ اردو فارسی اور عربی کے میدان میں ان کی حیثیت ایک دریائے ناپیدا کنار سے کسی طرح کم نہیں جس کی پوری وسعت پر نظر ڈالنے کے لیے ایک عمر درکار ہے۔ مفتی صاحب کی مطبوعہ تصانیف کی تعداد تین سو سے زائد ہے۔ مسودات اور لاتعداد کتب پر تحریر کردہ حواشی اس کے علاوہ ہیں۔

۲۵ رجب ۱۳۰۶ھ کو ۸۲ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔ اگر ان کی تصانیف کے مجموعی صفحات کو ان کی عمر پر تقسیم کر دیا جائے تو بلاشبہ ہر گھنٹے پر ایک معتدبہ خزانہ ہاتھ آئے گا۔

**

حواشی:

۱؎ "سبک شناسی" ج ۳ ص ۲۶ ۲؎ دیوان "وسط الحیات" ۳؎ قران السعدین ص ۱

محسن ہاشمی
نزد مسجد بلاری، مراد آباد

ٹیپو سلطان

پیکرِ مردانگی پروانۂ شمعِ وطن — بوستانِ حریت کا نازپروردہ سمن
مردِ میدانِ وغا صفدر جری ناوک فگن — جس کو لکھتا ہے مورخ کا قلم "شیرِ دکن"

غازیِ ہندوستاں ٹیپو! بہت مشہور تھا
جانشینِ حیدر علی کا والیِ میسور تھا

مادرِ گیتی کے حلقہ ہائے گیسو کا اسیر — قائدِ ملت گروہِ سرفروشاں کا امیر
رستم و سہراب و دارا کو سمجھتا تھا حقیر — باحیا خاتونِ مشرق کا پیا تھا جس نے شیر

نذرِ ناموسِ وطن کو نقدِ جاں کہتا تھا وہ
دل میں سوزِ الفتِ ہندوستاں رکھتا تھا وہ

اس کے اسپِ صدق نے ٹھوکر کبھی کھائی نہ تھی — گردِ راہِ غم کی چہرے پر کبھی چھائی نہ تھی
پائے استقلال میں لغزش کبھی آئی نہ تھی — بزدلی نے زلف روشن رخ پہ لہرائی نہ تھی

جذبۂ ناقابلِ تسخیر سے کچھ کم نہ تھا
کون کہتا ہے کہ وہ اک عزمِ مستحکم نہ تھا

دوستوں کی بیوفائی مختصر سامانِ جنگ — پھر بھی دل میں تھا جواں فرنگ سے ارمانِ جنگ
جب یہ دیکھا! ہاتھ سے جانے لگا میدانِ جنگ — دونوں بیٹے دے کے پورا کر دیا تاوانِ جنگ

حل نہ ہو سکتا تھا جو شمشیر و نوکِ تیر سے
عقدۂ مشکل وہ کھولا ناخنِ تدبیر سے

غیظ چہرے سے عیاں دل میں غضب کا جوش تھا — زخم خوردہ جب گرا مرکب سے تو بیہوش تھا
سر بہ زانو مادرِ گیتی سے ہم آغوش تھا — ایک ہچکی لی کراہا اور پھر خاموش تھا

توڑ کر دم ہو گیا صد حیف پیوندِ زمیں
وہ علمبردارِ آزادی محبت کا امیں

خضر برنی
ایڈیٹر پندرہ روزہ لہریں
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

غزل

گلشن میں سکوں آیا اک روحِ وفا آئی
کلیوں کو جواں دیکھا غنچوں میں ادا آئی

اک قبر سے ایسی بھی مغموم صدا آئی
محرومِ تمنا کو بے وقت قضا آئی

مشکل میں زمانے کا اندازِ ستم توبہ
بس کام مصیبت میں اک دل کی دعا آئی

ساقی کی نظر اٹھی زلفوں کا ہوا سایہ
پیمانے لبالب ہیں گھنگور گھٹا آئی

گلشن کے تصور کو پامال کیا اس نے
تقدیر مجھے اک دن کانٹوں پہ سلا آئی

ہر نقش کو تکتا ہوں ہر موڑ پہ ٹھہرا ہوں
تقدیر جوانی کو کس سمت لٹا آئی

وہ سامنے آ کر بھی نظروں کو چراتے ہیں
بے پردہ ہوئے لیکن پھر بھی تو حیا آئی

کی میرے گناہوں پر رحمت کی نظر اس نے
نیکی تو رہی نیکی بس کام خطا آئی

وہ آئے خضرؔ دیکھو اک رقصِ بہاراں ہے
شاید کہ مرے گھر میں جنت کی ہوا آئی

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی یکم اگست کو الہ آباد میں ٹیلی ویژن سنٹر کا سنگ بنیاد رکھتے ہو۔

گورنر اتر پردیش شری سی، پی
این سنگھ ۱۴ اگست ۱۹۸۳ء
کو لکھنؤ یونیورسٹی میں تلسی
داس جینتی تقریبات
کا افتتاح کرتے ہوئے۔
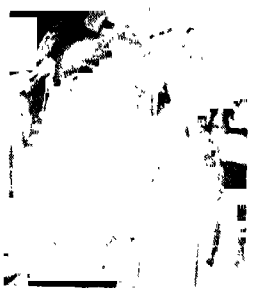
گورنر اتر پردیش شری سی

یوم آزادی کی تقریب کے

لہرا۔

روس کے نائب صدر اور ازبکستان کے صدر شری عثمان [illegible] ۱۸ اگست ۱۹۸۳ء کو آگرہ آئے اور انھوں نے تاج محل دیکھا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے جس میں اتر پردیش [illegible] ڈاکٹر [illegible] بھی ان کے ساتھ ہیں

مرکزی وزیر تجارت شری

وشوناتھ پرتاپ سنگھ

۷ اگست ۱۹۸۳ء کو پوران پور

(پیلی بھیت) میں کسان

امداد باہمی شکر مل کا سنگِ بنیاد

رکھتے ہوئے

وزیر اعلا شری سری پت مشرا ۱۸ر اگست ۱۹۸۳ء کو سکریٹریٹ (انیکسی) میں محکمہ تعلیم کے ترقیاتی کاموں کا جائزہ لیتے ہوئے۔ وزیر تعلیم شریمتی سروپ کماری بخشی بھی اس موقع پر موجود تھیں۔

وزیر اعلا شری سری پت مشرا
سکریٹریٹ (انیکسی) میں
محکمہ جنگلات کے پروگراموں کی
رفتار ترقی کا جائزہ لیتے ہوئے
اس موقع پر
وزیر جنگلات شری سنجے سنگھ
بھی موجود تھے

راجیندر بہادر موج
شاہ گڑھ۔ یوپی

پیغام بہ لب گنگ وجمن دیکھ رہا ہوں

امید کے سورج کی کرن دیکھ رہا ہوں
ہنستا ہوا سونے کا گگن دیکھ رہا ہوں
رخسار پہ کلیوں کے ہیں آثار ہنسی کے
بھونروں کو نئے رس میں مگن دیکھ رہا ہوں
جس نور میں کھو جائے گنا ہوں کی سیاہی
اس نور کو پھر جلوہ فگن دیکھ رہا ہوں
موجوں میں نیا عزم ہے لہروں میں جوانی
پیغام بہ لب گنگ وجمن دیکھ رہا ہوں
ہونے کو ہے اب ختم ستم کاری اغیار
بدلا ہوا اب رنگِ چمن دیکھ رہا ہوں
مٹنے کو ہیں اب ظلم کے ظالم کے فسانے
کچھ ایسے ہی دنیا کے چلن دیکھ رہا ہوں
ہر خار کی صورت ہے نمودار ہے ہمّت
ہر شاخ کے سینے میں چبھن دیکھ رہا ہوں
طوفاں کا بھی منہ پھیر دیں اب حوصلہ یہ ہے
پر جوش ہیں اب اہلِ وطن دیکھ رہا ہوں
تیار ہیں رکشا کے لیے دیس نواسی
شمشیر بکف سرو سمن دیکھ رہا ہوں
ہے جذبۂ ایثار ہر اک پیر و جواں میں
ہے راہِ ترقی پہ وطن دیکھ رہا ہوں
اے موج یہ پھیلا ہوا طوفانِ ترقی
ہر فن کے یہاں ماہرِ فن دیکھ رہا ہوں

احسان نانپاروی

غزل

فروغِ وقت کی تازہ کتاب لیتا جا
مرے قلم مرے خوں کا حساب لیتا جا

ہیں زرد زرد ترے مہر و ماہ کے چہرے
زمیں نژاد نیا آفتاب لیتا جا

متاعِ موسمِ گل اب ہے برگ اُفتادہ
بدستِ بادِ صبا یہ گلاب لیتا جا

ہوئے ہیں جلوے کبھی عریاں حقیقتوں کی طرح
ہمارے ذوقِ نگہ کا حجاب لیتا جا

عطا ہوا ہے اگر پھر مذاقِ دیدہ وری
تو چشمِ نرگسِ شہلا سے خواب لیتا جا

قدم قدم پہ ہے آگے جمود کی ظلمت
چراغِ آگہی انقلاب لیتا جا

طفیل احمد انصاری
مفتی محلہ ۔ جون پور

شاہ محمد عبد العلیم آسی

حیات و فن

جون پور ارباب علم و کمال کا گہوارہ، صوفیا کا مسکن اور شیراز ہند رہا ہے۔ اس کی خاک سے ایسے ایسے علمار، کاملین، مشائخ کبار و صوفیائے عظام پیدا ہوئے جن کے رشد و ہدایت کی شمع سے ایک عالم روشن ہو گیا۔ حضرت دیوان شیخ محمد رشید جون پوری بھی انھیں باکمال بزرگوں میں تھے جن کے بوریائے فقر کی بلندی مسند شاہی سے کم نہ تھی — "آپ نے فن مناظرہ میں رشیدیہ لکھی جو ہمارے نصاب درس میں داخل ہے۔ شاہجہاں کے بار بار اصرار پر بھی خلوت خانۂ قناعت سے باہر قدم نہیں رکھا۔"[1] آپ نے مسند درس و ارشاد پر بیٹھ کر ہزاروں تشنگان علم کو فیضیاب فرمایا۔ حضرت دیوان جی کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادے شیخ محمد ارشد جون پوری نے مسند ارشاد پر متمکن ہو کر علم و معرفت کے چراغ روشن کیے۔ "دور شاہجہانی کے علمار میں ملا محمد ارشد جون پوری کو علمی حلقوں میں بڑی شہرت حاصل تھی۔"[2] صدیوں تک خانقاہ رشیدیہ کے ظاہری و باطنی فیوض و برکات سے ایک عالم فیض یاب ہوتا چلا آرہا ہے۔

شیخ عبد العلیم آسی بھی خانقاہ رشیدیہ کے آستانۂ فیض سے وابستہ تھے۔ آپ آخری مشہور سجادہ نشین ہوئے۔ آسی ایک صاحب کشف و کرامت بزرگ نیز اردو زبان کے عظیم صوفی شاعر تھے۔ آپ ۱۹ رشعبان ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء کو سکندر پور ضلع بلیا میں پیدا ہوئے — عربی و فارسی کی ابتدائی کتابیں سیوان میں اپنے نانا مفتی احسان علی سے پڑھیں۔ تقریباً اٹھارہ سال کی عمر میں مزید تعلیم کے لیے جون پور تشریف لائے اور خانقاہ رشیدیہ کے سجادہ نشین قطب الہند شاہ غلام معین الدین امیری سے بھی کچھ درسی کتابیں پڑھیں۔ اسی دوران مولانا کرامت علی جونپوری کی تجویز و مشورہ سے رئیس شہر منشی امام بخش نے مدرسہ حنفیہ کی بنا ڈالی جس کے پہلے مدرس اعلا مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی ہوئے — چنانچہ معقول و منقول کی تمام کتابیں مولانا فرنگی محلی سے پڑھیں۔ مولانا آپ کی ذہانت پر بہت فخر کرتے تھے۔ آسی سلسلۂ قادریہ میں حضرت غلام معین الدین امیری سے مرید ہوئے۔ اور تقریباً پچاس سال تک اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں رہے۔ "اسی اثنا میں وقتاً فوقتاً اشغال و اذکار کی تعلیم ہوتی رہی حتیٰ کہ جمیع سلاسل کی خلافت و اجازت سے شرفیاب و بہرہ اندوز ہوئے۔"[3] جب تک سجادہ نشینی کی خدمت آپ کو نہیں عطا ہوئی تھی، اس وقت تک تکمیل مراتب ظاہری و باطنی و تحصیل اجازت و خلافت کبھی کسی کو مرید نہیں کیا اور اپنے آپ کو طبابت کے پردے میں پوشیدہ رکھا کہ بجز اہل نظر کوئی پہچان نہ سکا۔ اواخر عمر میں آپ پر چشتیت غالب آگئی تھی۔

۲ رجمادی الاوّل ۱۳۳۵ھ مطابق ۲ رفروری ۱۹۱۷ء کو شہر غازی پور میں آپ کا انتقال ہوا اور محلہ نور الدین پورہ میں مدفون ہوئے۔ مولوی محمد احمد امین سکندر پوری نے "لقد رضی اللہ عنہ" سے تاریخ وفات نکالی (۱۳۳۵ھ)۔ اس کے علاوہ سیکڑوں تاریخ وفات کہی گئیں۔ مولوی سبحان اللہ رئیس گورکھپوری نے مزار سے متصل چہار دیواری تعمیر کرادی جس کے دروازے پر حکیم فرید الدین احمد فرید کا یہ قطعہ کندہ ہے ؎

یہ جو شاہ دلا کی چوکھٹ ہے
آسیؔ رہنما کی چوکھٹ ہے
مانگ لو جو مراد ہے دل کی
کنزِ حسنِ سخا کی چوکھٹ ہے

حضرت آسیؔ کی حیاتِ بابرکات کے مختلف گوشوں کے تذکرے کا یہ مقالہ متحمل نہیں ہو سکتا اس لیے آپ کے فضل و کمال و کرامات کا ذکر کیے بغیر آپ کی شاعرانہ عظمت پر اظہار خیال کروں گا۔

زمانۂ طالب علمی کے دوران جونپور میں آپ کو اچھا ادبی ماحول ملا اور یہاں کے شعر پرور ماحول نے آپ کو شعرگوئی کی طرف مائل کیا۔ فی الحقیقت آپ کی روانیٔ طبع اور خداداد صلاحیتوں نے آسیؔ کو بہت جلد ایک قادر الکلام شاعر بنا دیا۔ شاعری میں آپ شاہ غلام اعظم افضل الہ آبادی سجادہ دائرہ شاہ اجمل کے شاگرد تھے۔ افضل صاحب ناسخ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ نواب غازی الدین حیدر کے خوف سے ناسخ کو جب لکھنؤ کو خیرباد کہنا پڑا تو ان کا قیام اسی دائرہ اجمل میں رہتا تھا۔ چنانچہ ناسخ نے ایک شعر میں اس کا اس طرح ذکر کیا ہے ؎

ہر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں

آسیؔ کی چند غزلوں کو دیکھنے کے بعد ہی شاہ صاحب نے یہ کہہ دیا تھا کہ اب تمھیں اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر آپ ادباً اپنی غزلیں اصلاح کے لیے بھیجتے رہے اور شاہ صاحب یہ لکھ کر واپس کر دیتے کہ کہیں اصلاح کی گنجائش نہیں ہے۔ حضرت آسیؔ اور شاہ افضل صاحب میں باہم بڑا اخلاص تھا۔ شاہ صاحب اکثر خانقاہ رشیدیہ تشریف لاتے رہتے تھے۔

سید شاہ علی سبز پوش نے آسیؔ کی وفات کے بعد خانقاہ کے کاغذات وغیرہ کی انتہائی جانفشانی و کاوش کے بعد چھان بین کر کے دیوان آسیؔ کو مرتب کرنے کا کارنامہ انجام دیا اور اسے آسیؔ پریس گورکھپور سے طبع کرا کے اہلِ دل و صاحبِ نظر کے لیے سامانِ نشاطِ روح فراہم کر دیا۔ فدائی جونپوری نے طبع دیوان آسیؔ پر ایک قطعہ لکھا جس کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں ؎

حضرت آسیِ مرحوم کا دیوان شریف
حسن و خوبی سے ہوا جمع کہ سبحان اللہ
عالم حسن و معانی میں ہے خورشید کمال
بزم لفظی میں ہے اک شمع کہ سبحان اللہ
سال طبعش ز سرِ وجد بگفتا ہاتف
خوب و نایاب شدہ طبع کہ سبحان اللہ

آسیؔ کا بیشتر مجموعۂ کلام سیوان میں تلف ہو گیا تھا۔ پھر بھی جو سرمایہ زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر شائع ہوا ہے وہ اہلِ ذوق کے لیے

چشم ما روشن و دلِ ما شاد

کے مصداق ہے۔ غزلیات کا یہ سرمایہ کم ہونے کے باوجود بھی اہلِ دل و صاحبِ نظر کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی خاص کشش رکھتا ہے۔

ناسخ نے تحریکِ اصلاحِ زبان کا کارنامہ انجام دیا تھا۔ ناسخ اور رشک کے جملہ قواعد پر آسیؔ سختی سے پابند تھے۔ آپ کے یہاں "کا" کا الف بھی دبنا ناجائز تھا۔ متروکاتِ ناسخ پر آپ نے کچھ مزید اضافے بھی فرمائے تھے۔ حضرت آسیؔ فرماتے تھے: "ہم لوگ دو حرفوں کے مخارج میں ثقالت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔" مثال کے طور پر آتشؔ کا یہ شعر پڑھتے تھے ؎

کیا دیکھیے گا عاشقِ دلگیر کا جواب
خاموشی کے سوا نہیں تقصیر کا جواب

یہاں "دیکھیے گا عاشق" میں گاف کے بعد عین کا مخرج ہمارے خاندان کے قواعد کی رو سے قابلِ احتراز ہے اور "خاموشی" فارسی لفظ ہے اس کی "ی" کا گرنا جائز نہیں۔ آتشؔ کے خاندان میں جائز ہے، میں کہتا تو اس طرح کہتا ؎

کیا دیں گے آپ عاشقِ دلگیر کا جواب
چپ رہنے کے سوا نہیں تقصیر کا جواب

اصلاحِ زبان کے سلسلے میں ناسخ نے ہندی زبان کے نرم اور شیریں الفاظ کو متروک نہیں کیا تھا بلکہ ایسے الفاظ جن کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے دیوانِ ناسخ میں موجود ہیں۔ آسیؔ نے ایسے

الفاظ کے علاوہ بھی ہندی کے ان غیر مانوس الفاظ کو جو آج متروک ہیں مثلاً مُوا، کنٹھا، بھبھوکا، برّانا وغیرہ کو بھی اس طرح شعریت کا جامہ پہنایا ہے کہ ان کے حسن و دلکشی میں کوئی کمی نہیں آتی ؎

کبھی روتے روتے گیا ہے جی کبھی مر کے کاٹی ہے زندگی
مری جان پر کبھی رحم بھی کرو اسی طرح سے مُوا کروں

وہ ہیں سوارِ سمندِ خوبی، ہلالِ شوّال کی یہ شوخی
گلے لگا ان کے ہو کے کنٹھا، قدم لیے ہیں رکاب ہو کر

ہاتھ مہندی سے بھبھوکا جو بنایا تو کیا
آپ ہیں آگ کلیجوں میں لگانے والے

جو برّاتا ہے سوتے میں بھی آسی تو یہ کہتا ہے
الٰہی اب تو ان کی پارسائی جان لیتی ہے

غازی پور میں حضرت آسی کے زمانۂ قیام میں وہاں چند کاملین فن جمع ہو گئے تھے جن میں شمشاد لکھنوی، کاشف لکھنوی، حاذق مولئ ہنر غازی پوری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ شعر و سخن کی خوب محفلیں منعقد ہوتیں اور مشاعرے ہوتے۔ مومن کے ارشد تلامذہ صغیر بلگرامی بھی شریکِ محفل ہوتے۔ صغیر ان دنوں ڈمراؤں ضلع آرہ میں رہتے تھے جو غازی پور سے قریب ہے۔ آسی کی ان سے چشمک رہا کرتی تھی۔ اس کا احوال ملاحظہ کیجیے۔

ایک محفل مشاعرے کی زمین 'آتے ہیں کیوں، جاتے ہیں کیوں' تھی لیکن آسی کے پاس مصرعۂ طرح غلط بھیجا گیا اور زمین 'آتا ہوں کیوں، جاتا ہوں کیوں' بتائی گئی۔ آپ جب مشاعرے میں پہنچے تو اس بات کا علم ہوا اور یہ حرکت سخت ناگوار گزری۔ آپ نے برجستہ مقطع میں اس کا اشارہ یوں فرمایا ؎

طرح کا مصرعہ ہوا ہے جمع کے صیغے کے ساتھ!
میں غزل معزز میں لے آسی پڑھے جاتا ہوں کیوں

پھر فوراً آپ نے اسی زمین میں ایک لاجواب غزل کہہ کر پڑھ دی۔ حاضرینِ محفل دم بخود ہو کر سنتے رہے۔ ایک شعر میں مخالفین پر یوں چوٹ کی ہے ؎

شمع کے مانند ہے اپنا بھی کیا سوز و گداز
صورتِ پروانہ دشمن ہم سے جل جاتے ہیں کیوں

(اس واقعہ کے بعد صغیر بلگرامی کی طرف سے ایک دوسری طرح کا اعلان ہوا جس کی زمین تھی 'آتے کیوں ہو، جاتے کیوں ہو'۔ اسی زمین میں مومن کی بھی ایک مشہور غزل ہے جس کا ایک شعر ہے ؎

کھول دو وعدہ کر تم پر وہ نشیں ہو نہ وصال
اپنی زلفوں کی طرح بات بناتے کیوں ہو

'کھول دو وعدہ' خلافِ محاورہ ہے۔ جب اس زمین میں آسی غزل پڑھنے لگے تو صغیر سے آنکھ ملا کر یہ شعر پڑھا کر دیکھیے محاورہ یوں نظم کرتے ہیں ؎

تم پری زاد ہو، وعدہ تو پری زاد نہیں
آپ اُڑتے ہو اُڑو، بات اُڑاتے کیوں ہو

اس شعر میں تکرارِ لفظی ضرور ہے لیکن باوجود اس کے محاورے کو اس طرح نگینہ کی طرح بٹھا دیا ہے کہ روانی کے ساتھ الفاظ کی تکرار گراں نہیں گزرتی۔ اسی غزل کا ایک شعر اور ملاحظہ کیجیے جو تصوّف کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے ؎

تم نہیں کوئی تو سب میں نظر آتے کیوں ہو
سب تمہیں ہو تو پھر منھ کو چھپاتے کیوں ہو

حضرت آسی کا کلام پردۂ مجاز میں حقیقت کا جلوہ دکھاتا ہے۔ حقائق و معارف اور تصوّف کے رموز و نکات شعریت کے لباس میں جلوہ گر ہیں۔ فارسی تراکیب کے برملا استعمال سے آپ کے اشعار میں یہ تمام خصوصیات اور بھی زیادہ نمایاں اور دلآویز ہو جاتی ہیں ؎

حرص دولت کی نہ عز و جاہ کی
بس تمنّا ہے دلِ آگاہ کی

پہلے مصرعہ میں سامانِ دنیا کی نفی ہے اور دوسرے میں دلِ آگاہ کی

تمنا کی جا رہی ہے۔ ایسے دل کی جو خدائے واحد کے قبضۂ قدرت میں ہو۔ "دلِ آگاہ" میں بڑی بلاغت ہے اور یہ ترکیب بھی خوب تر ہے۔ آسی غزل کا مقطع ملاحظہ کیجیے اور "حق آگاہ" کی دل کش ترکیب کا لطف لیجیے ؎

راہِ حق کی ہے اگر آسی تلاش
خاکِ رہ ہو مردِ حق آگاہ کی

حضرت آسی فرماتے ہیں ؎

شعر گوئی نہ سمجھنا کہ میرا کام ہے یہ
قالبِ شعر میں آسی فقط الہام ہے یہ

اگر بیانِ حقیقت نہ ہو مجاز کے ساتھ
وہ شعر لغو ہے آسی کلام ناکارہ

حضرت آسی ایک صاحبِ دل اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے جو بادۂ تصوف میں سرشار و مست رہتے تھے۔ آپ کے ہر شعر میں ایک تہہ نکلتی ہے اور مجاز کے پردے میں حقیقت نمایاں ہوتی ہے۔ واردات قلبی کو آپ نے ایک خاص پیرائے میں ندرت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی تصوف کے دقیق مسائل کو اختصار کے ساتھ نہایت خوبی اور صفائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ تصوف کے دقیق مسائل کو بیان کرنے میں کلام کی رنگینی، دل آویزی اور رعنائی متاثر ہونے نہیں پاتی۔ اندازِ بیان کی پختگی، خیالات کی پاکیزگی و لطافت مضامین کی علوِ شان حضرت آسی کی نمایاں خوبیاں ہیں۔

چند مثالیں ملاحظہ کیجیے ؎

پوچھتے ہو کہ سرِّ وحدت کیا ماسوا کی بھلا حقیقت کیا
نقدِ ہستی نثار کیا کرے یہ نہیں ہے تو پھر محبت کیا

ہو مسلم وسعتِ ذوقِ نظر
قطرے میں جب سیرِ دریا کیجیے

سلوکِ راہِ وفا میں فنا کے طور ہیں اور
جو آپ مار کے تیشہ مرا تو کچھ نہ مارا

انا الحق اور مشتِ خاکِ منصور!
ضرور اپنی حقیقت اس نے جانی

کس کی حسرت نے جگایا تھا کہیں نیند سوئے قبر میں نوشاہ کی

حضرت آسی کے کلام کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ ان کے یہاں بھرتی کے اشعار بالکل نہیں ہیں نیز عامیانہ مذاق سے بھی کلام یکسر پاک ہے۔ آپ کے کلام کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ بڑے سے بڑے مضامین کو چند الفاظ میں سمو دیا ہے۔ لطفِ زبان کے ساتھ ساتھ بندش کی بے ساختگی، تراکیب کی چستی اور سلاست و روانی نے آپ کے کلام میں حسن و رعنائی کی شان پیدا کر دی ہے نیز مقاماتِ تصوف کے بیانِ دل پذیر نے آپ کے کلام کو وجد آفریں بنا دیا ہے ؎

رات تو رات ہے بس مردِ خوش اوقات کی رات
گریۂ شوق کی یا ذوقِ مناجات کی رات

اب تو پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسی
ہے شبِ گور بھی اس گل کے ملاقات کی رات

آشنا تو جانتے ہیں کہ عاشق فنا ہوا
اور اس کے آگے بڑھ کے خدا جانے کیا ہوا

نورِ خورشید ستاروں کو مٹا دیتا ہے
تم ہو پہلو میں تو محفل بھی ہے خلوت مجھ کو

میں تصور سے اٹھا دیتا ہوں پردہ بیچ کا
ہجر کی شب آپ بھی میرا ہنر دیکھیے

مجاہدِ آزادی، صحافی، ادیب اور شاعر حضرت عارف ہسوی آسی کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:-

" تصوف میں بھی حضرت آسی کا مذاق وحدت الوجود
کا ہے۔ اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس مسئلہ پر وہ
مخلف والہانہ اور مستانہ انداز سے اپنے واردات قلب
کو قالب شعر میں ڈھال کر پیش کر جاتے ہیں جن کو سنتے
ہی سامع پر ایک بیخودی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے
اور مذاق سلیم پہروں سر دُھنتا ہے"۔[۵]

یہ کریمہ سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود کی روشنی
میں معرفت کے دو لطیف اشعار سے لطف اندوز ہوئیے ؎

صدرے نور سجدۂ شوق   مہ رو تم ہو تو مہ جبیں ہم
عاشق سے تو رنگ رُخ نہ سنبھلا   ان کو دعوئی کہ نازنیں ہم

آب حیات میں محمد حسین آزاد تحریر فرماتے ہیں:۔
" خواجہ میر درد صاحب کی غزل سات شعر، نو شعر
کی ہوتی ہے مگر انتخاب ہوتی ہے۔ خصوصاً چھوٹی چھوٹی
بحروں میں جو اکثر غزلیں کہی ہیں، گویا تلواروں کی آبداری
نشتر میں بھر دیتے ہیں"۔

حضرت آسی کے یہاں بھی چھوٹی بحروں میں طویل غزلیں ملتی ہیں جہاں
تصوف کی چاشنی بھی ہے اور تلواروں کی آبداری بھی، نیز ہر شعر
انتخاب کے قابل۔ آئیے خواجہ میر درد کے رنگ میں آسی کو ملاحظہ
کیجیے ؎

کچھ کہوں میرا جو کہنا کیجیے   چاہنے والوں کو چاہا کیجیے
حوصلہ تیغ جفا کا رہ نہ جائے   آئیے خون تمنا کیجیے!
کس کو دیکھا ان کی صورت دیکھ کر   جی میں آتا ہے کہ سجدہ کیجیے
ہو مسلم وسعت ذوق نظر   قطرے میں جب سیر دریا کیجیے
حور جنت ان سے کچھ بڑھ کر سہی   ایک دل کیا کیا تمنا کیجیے
مل چکے اب ملنے والے خاک کے   قبر پر جا جا کے رویا کیجیے

راہ تکتے تکتے آسی چل بسا
کیوں کسی سے آپ وعدہ کیجیے

اب ایک دوسری غزل کے چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیے ؎

پوچھتے ہو کہ سر وحدت کیا   ماسوا کی بھلا حقیقت کیا
واعظو! اس کو دیکھ لو پہلے   پھر کہو حور کیا ہے جنت کیا
نقد ہستی نثار یار کرے   یہ نہیں ہے تو پھر محبت کیا

جس میں چرچا نہ کچھ تمھارا ہو
ایسے احباب کی صحبت کیا

اس آخری شعر کے ضمن میں ریاض خیرآبادی کا ایک رنگین اور رندانہ شعر
ملاحظہ کیجیے ؎

ہم رند سمجھتے ہیں اسے انجمن وعظ
جس بزم میں ذکر مے و مینا نہیں ہوتا

سید شاہ علی سبز پوش دیوان آسی کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں:
" حضرت (آسی) نے اپنی چند نکالی ہوئی غزلیں
مولوی عبدالصمد کو دے دی تھیں۔ مولوی صاحب خود
دہلی گئے تھے تو غالب سے ملے اور وہ غزلیں سنائیں
غالب دم بخود سنتے رہے۔ اس کے بعد فرمایا" اللہ اللہ
ایسے لکھنے والے اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں"۔[۶]

غالب کی غزلوں پر آسی نے بھی چند غزلیں کہی ہیں۔ بلاشبہ
یہ غزلیں غالب کے رنگ کا پرتو ہیں۔ غالب کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

سادگی پر اس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل میں ہے

اب آسی کا مطلع ملاحظہ کیجیے ؎

وائے محرومی یہاں شوق شہادت دل میں ہے
جوش آب زندگانی خنجر قاتل میں ہے

غالب کی ایک دوسری غزل کا مطلع ہے ؎

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

آسی کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے اور غالب کے رنگ کا پرتو دیکھیے ؎

قطرہ وہی کہ روکش دریا کہیں جسے
یعنی وہ میں ہی کیوں نہ ہوں تجھ سا کہیں جسے

وہ اک نگاہ اے دل مشتاق الاماں
آشوب گاہِ حشر تمنا کہیں جسے
پیمانۂ نگاہ سے آخر چھلک گیا
سر جوش ذوقِ وصل تمنا کہیں جسے
اے حسن جلوۂ رخ جاناں کبھی کبھی
تسکین چشم شوق نظارا کہیں جسے

استاد ذوق کا ایک مشہور شعر ہے ؎

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند
جو گنہ کیجے ثواب ہے آج

حضرت آسی نے اس پر کتنا لطیف اور پیارا مصرعہ لگایا ہے ؎

جو گنہ کیجیے ثواب ہے آج !
کیسی بارش ہے ابرِ رحمت کی

باوجود اس کے کہ حضرت آسی کی تمام غزلیں دل کے حقائق و معارف سے پُر ہیں پھر بھی ان کے کلام میں کہیں کہیں تغزل کا رنگ بھی شامل ہے۔ آپ کے اشعار میں وجدان و عرفان کی ملی جلی کیفیت پنہاں ہوتی ہے جس سے قاری ایک سرخوشی کے عالم میں ڈوب جاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے ؎

ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا
بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

وہاں پہنچ کے یہ کہنا صبا سلام کے بعد
کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد
پیامبر کو روانہ کیا تو رشک آیا
نہ ہم کلام ہوا اس سے مرے کلام کے بعد

اگرچہ وعدۂ فردا ہے بے خلاف ضرور
مگر وہ چاہے تو امروز کر دے فردا کو

صورتِ نقشِ قدم بیٹھے ہیں کوچے میں ترے
دیکھیں کس طرح اٹھاتے ہیں اٹھانے والے

حضرت آسی صوفی منش بزرگ تھے جو محبتِ الٰہی میں سرشار و بیخود رہتے تھے۔ حضرت علی رضؓ کی ذاتِ اقدس بالاتفاق صوفیوں کے امام اوّل کی ہے۔ اسلام میں تصوف کوئی بعد کی پیدا شدہ شے نہیں ہے بلکہ پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے میں ہی مخصوص صحابہ کرام رضؓ اس نعمتِ عظمیٰ سے بہرہ یاب ہو چکے تھے۔ ان میں حضرت علی رضؓ کی شخصیت ممتاز ہے آسی نے اپنی غزلوں میں اس امر کی جانب بھی کہیں کہیں اظہار خیال کیا ہے ؎

پیچیدہ تھی جو سر میں ہوائے رضائے دوست
آسی مریدِ سلسلۂ مرتضےٰؓ ہوا

جو الزامِ محبت میں گرفتار ہوا
قیدیٔ حیدرِ کرارؓ ہوا

چار یارانِ نبیؐ میں آسی — تبعیت مجھے ہر یار کی ہے
طلبِ راہِ خدا میں لیکن — پیروی حیدرِ کرارؓ کی ہے

آسی جملہ اصنافِ سخن میں قدرت رکھتے تھے۔ وہ بے مثل نعت گو بھی تھے۔ قصیدہ نگاری آپ کے مذاق کی چیز نہ تھی پھر بھی اس کے تمام لوازمات کے ساتھ زبان و بیان کے جوہر دکھائے ہیں۔ دیوان میں دو عدد قصیدے بھی موجود ہیں جن میں ایک نامکمل ہے۔ نواب کلب علی خاں بہادر کی مدح میں ایک سو سولہ اشعار کا قصیدہ ہے جو کسی وجہ سے نواب ممدوح کے روبرو دربار میں پیش نہ ہو سکا تھا۔ اس کی تمام تفصیلات اور حضرت امیر مینائی کا خط جو انھوں اس سلسلے میں انھوں نے آسی کو تحریر کیا تھا، دیوانِ مذکور کے صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ بطور نمونہ قصیدے کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں تاکہ قارئین اس سے لطف اندوز ہوں اور اس کے علوِ تخیل کا بخوبی اندازہ لگا سکیں ؎

کہاں تغیر اکو تجھا بجز وجود میں ثانی — حباب دیدۂ اہل نظر میں ہے پانی
نہ فرق سوجھے اگر ظاہر و مظاہر میں — کسے کہے کوئی باقی کسے کہے فانی

بسلسلہ کوکب نواب آفتاب جناب
جناب کلب علی خاں محب سبحانی
اگرچہ جذب دلِ زار کھینچتا ہے ادھر
پکڑ کے دستِ ارادت سے موئے پیشانی

نہ جان شعر یہ میرے جگر کے ٹکڑے ہیں
نثار فرقِ مبارک کو ہیں جو ارزانی
بس اب دُعا کے لیے ہاتھ اٹھاؤ اے آسی
ہے اہتزاز میں اس وقت عرشِ ربّانی
تو حکمراں رہے لاکھوں برس مگر وہ برس
کہ جن کے دن ہوں قیامت کے دن سے طولانی
شفق میں آگ ہو جب تک خطِ صنم میں غبار
ہوا دلوں میں حیا کی نگاہ میں پانی
رہیں عناصر پر نور اعتدال کے ساتھ
بجادہ حشمت و فیروزی و جہاں بانی

سکندر پور آسی کا مولد تھا۔ جون پور کی طرح یہاں بھی گلاب، چنبیلی وغیرہ کی کاشت ہوتی ہے۔ دریائے گھاگھرا بھی قریب سے ہی بہتا ہے۔ صحرائے ختن کی مشک بوئی کی تعریف تو شعرائے کرام نے خوب خوب کی ہے لیکن حضرت آسی نے اسی مناسبت سے "صحرائے سکندر پور" کی جو تعریف کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، ملاحظہ ہو شعر ؎

پرتوِ عارض ہے دریا نور کا
زلف صحرا ہے سکندر پور کا

تلمیح کا ایک شعر اور دیکھیے۔ جون پور کا شاہی پل، گومتی کا تاج، اپنے استحکام میں بے نظیر ہے۔ یہ پل حضرت شاہ شیخو مجددؒ کی دُعاؤں سے عہد اکبری میں تعمیر ہوا تھا، جس کا مادہ تاریخ "صراط المستقیم" ۹۸۱ھ ؎

پل بھی ہے تعمیر جون پور آسی
خواب گاہ جناب شیخو ہے

حضرت آسی کی عمر کا زیادہ حصہ جونپور میں ہی گزرا، اسی لیے آپ آسی جونپوری کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ تذکرہ نگاروں نے آسی سکندرپوری و آسی غازی پوری بھی لکھا ہے۔ روزنامہ قومی آواز کے اداریہ پر آپ کا مندرجہ ذیل شعر آسی جونپوری کے نام سے نقل کیا گیا ہے ؎

اپنی عیسیٰ نفسی کی بھی تو کچھ شرم کرو
چشمِ بیمار کے بیمار ہیں بیمار ہنوز [۵۸]

مولوی عبدالمجید صاحب کاتب سکندرپوری لکھتے ہیں :-

" آپ کو شہرت سے نفرت تھی اور گمنامی زیادہ پسند تھی اسی وجہ سے نہ آپ کی تصانیف چھپ سکیں نہ آپ کا کلام آپ کی حیات میں شائع ہو سکا۔ یہاں تک کہ غزلوں کی نقل بجز خاص لوگوں کے عام لوگوں کو دینا گوارا نہ تھا۔ [۵۹]

" لیکن یہی احبابِ خاص و مخلصین آپ کی غزلوں کو تبرکاً اشاعت کے لیے بھیج دیتے تھے، چنانچہ ماہنامہ اردوئے معلیٰ میں غزلیاتِ آسی کے عنوان سے آپ کی غزلیں مارچ ۱۹۱۰ء سے اکتوبر ۱۹۱۱ء تک مسلسل شائع ہوتی رہی ہیں"۔ [۶۰]

حضرت آسی کے تلامذہ کی تعداد کثیر تھی۔ اکثر صاحبِ نظر تبرکاً حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو کر آپ کے کلام کے معتقد بن گئے تھے۔ شمشاد لکھنوی، مولوی عبدالصمد غازی پوری، ایمن سکندرپوری، لبیب سکندرپوری، فانی گورکھپوری اور فدائی جونپوری وغیرہ ممتاز تلامذہ میں تھے۔ شمشاد لکھنوی پہلے حضرت قلق لکھنوی کے شاگرد تھے لیکن قلق کی وفات کے بعد کاشف لکھنوی کی وساطت سے شمشاد نے ایک غزل حضرت آسی کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کی۔ آسی کی اصلاح سے شمشاد ایسے گرویدہ ہوئے کہ فوراً شاگردی کی درخواست کی۔ شمشاد لکھنوی کا دیوان اوّل جو قلق لکھنوی کا اصلاح شدہ تھا، اس کو آسی نے قواعدِ آسی کے مطابق درست کیا اور اس دیوان کے طبع کی تاریخ بھی کہی۔ مادۂ تاریخ ہے "بہار گلشن"

شمشاد دیکھی"۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابلِ تحریر ہے کہ حسرت موہانی نے اُردوئے معلیٰ میں شمشاد لکھنوی کا انتخاب کلام بھی شائع کیا تھا۔

جون پور سے شائع ہونے والے مشہور ہفتہ وار اخبار "جادو" کا جب ادبی ضمیمہ شائع ہوا تو اس سلسلے میں حفیظ جونپوری نے ایک نظم کہی تھی جس میں حضرت آسی کی شاعرانہ عظمت کا یوں اعتراف کیا ہے ؎

کلام اس میں آسی کا ہوگا اگر
لگائیں گے آنکھوں سے اہلِ نظر

تاریخ شیراز ہند جونپور" کے مصنف تحریر کرتے ہیں : ۔
"حضرت آسی ہندوستان کے ان باکمال شعراء میں گذرے ہیں جن کے کلام پر بڑے بڑے نقاد نے قلم نہیں اٹھایا۔ حیرت ہے کہ مجنوں گورکھپوری جن کے قلم سے کوئی نہ بچ سکا، انھوں نے بھی حضرت آسی کو بہت سراہا ہے"۔ [۱۱]

حضرت آسی جیسے باکمال شاعر کا تعارف کرانے کا مقصد یہی ہے کہ نئی نسل اُردو ادب کے ان قدیم شعراء کے فکر و فن سے روشناس ہوتی رہے جنھوں نے اپنے فکر و فن سے اُردو شاعری کو آراستہ کیا ہے۔ ایسے شاعروں کی یاد باقی رکھنا ہمارا مقدس ادبی فریضہ ہے۔ آخر میں علامہ کیفی چڑیا کوٹی کی رائے سے متفق ہوتے ہوئے اس مقالہ کا اختتام کرتا ہوں :۔

"حضرت آسی اپنے وقت کے سجادۂ شاعری کے شیخ اعظم تھے۔ تصوف کی شاعری میں ان کا جو رنگ ہے ان سے پہلے اور ان کے بعد کوئی ان کا مثل نظر نہیں آتا"۔ [۱۲]

★

حواشی:۔ [۱] حیات شبلی ص ۴۳ ، [۲] ماہنامہ القاسم دیوبند۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء ، [۳] سمات الاخیار ص ۱۷۵ مطبوعہ اکلیل المطابع بہرایچ ، [۴] دیباچہ دیوان آسی ص ۱۵ ، [۵] دیباچہ دیوان آسی ص ۲۳ ، [۶] ماہنامہ نگار لکھنؤ بحوالہ سمات الاخیار ص ۱۸۷ ، [۷] عین المعارف ص ۳۷ ، [۸] روزنامہ قومی آواز لکھنؤ مورخہ ۷ رجون ۱۹۸۱ء ، [۹] سمات الاخیار ص ۱۸۵ [۱۰] بحوالہ ماہنامہ آج کل نئی دہلی حسرت موہانی نمبر ص ۷۳۔۷۰ [۱۱] تاریخ شیراز ہند جونپور ص ۴۸۱ ، [۱۲] مقدمہ دیوان فدائی جونپوری ص ۳۸ ۔ ★★

بقیہ: پندرہ اگست کی اہمیت صفحہ ۵ کا

اور اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے منارۂ نور کی طرح خطروں سے آگاہ کرنے اور صحیح سمت میں رہنمائی کا کام انجام دیتے رہتے ہیں۔

آج جو نسل ان کی جانشین کی صورت میں سماجی، اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی رہنمائی کی ذمہ دار بنی ہے، اس کا فرض ہے کہ اپنے بزرگوں کی محنتوں کو ضائع نہ کرے اور اس نصب العین کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھے، جس کے تحت ہندستان میں دنیا کی بے نظیر سیاسی جنگ لڑی گئی تھی، دنیا کی قوموں نے آزادی کے دن اور قومی تہواروں کا رواج اسی مقصد کے لئے ڈالا تھا کہ وہ سال بھر میں ایک دن، اس نصب العین، ان اصولوں اور آدرشوں کی یاد تازہ کرلیں جن کی بدولت ان قوموں کو خوش بختی کی دولت نصیب ہوئی تھی۔ ہندستان میں بھی ۱۵ اگست کی، یوم آزادی کی تقریب اسی فرض کی ادائیگی کا تقاضہ کرتی ہے۔ اس لیے اس دن کو محض رسمی اور روایتی جشن کے بجائے فرد عمل کے حساب کے دن کے طور منانا چاہیے۔

★★

منور رانا
۲۱، زکریا اسٹریٹ کلکتہ ۳

سفر میں جو بھی ہو رختِ سفر اٹھاتا ہے
پھلوں کا بوجھ تو ہر اک شجر اٹھاتا ہے

ہمارے دل میں کوئی دوسری شبیہہ نہیں
کہیں کرائے پہ کوئی یہ گھر اٹھاتا ہے

بچھڑ کے تجھ سے بہت مضمحل ہے دل لیکن
کبھی کبھی تو یہ بیمار سر اٹھاتا ہے

وہ اپنے کاندھے پہ کنبے کا بوجھ رکھتا ہے
اسی لیے تو قدم سوچ کر اٹھاتا ہے

میں نرم مٹی ہوں تم روند کر گزر جاؤ
کہ میرے ناز تو بس کوزہ گر اٹھاتا ہے

رئیس انصاری
ہینڈلوم کارنر، نزد بادر ہاؤس
امین آباد لکھنؤ

جس سے بدنام ہو فن ایسی عبادت نہ کرو
یوں ہر اک شہر میں غزلوں کی تجارت نہ کرو

اس کی مٹی میں بزرگوں کا لہو شامل ہے
چند سکوں پہ یہ نیلام عمارت نہ کرو

جن چراغوں کو ہواؤں نے کیا ہو روشن
اُن چراغوں کو بجھانے کی جسارت نہ کرو

تم بھی ہو جاؤ گی بدنام چمن والوں میں
تتلیوں باغ میں پھولوں سے شرارت نہ کرو

یہ نہ بھولو کہ یہاں چاروں طرف پانی ہے
تم جزیرہ ہو سمندر سے عداوت نہ کرو

جو بھی دیکھے گا وہ ہو جائے گا مشکوک رئیسؔ
اس طرح دن کے اجالوں میں عبادت نہ کرو

مہدی پرتاپگڈھی
معرفت ایگزیکیٹو انجینیر
ایری گیشن ڈویژن
پرتاپگڈھ

صدیوں کی جستجو ہے اگست

اگست آیا ہے لے کر نویدِ فصلِ بہار
ہر ایک سینے میں احساسِ نو کریں بیدار
چمن میں پیدا ہوئے صبحِ نو کے پھر آثار
مسرتوں کے لگے کھلنے زیست پہ در اسرار
روش روش پہ سجی ہے چمن میں بزمِ طرب
کلی کلی میں نمایاں نئی حیات کا ڈھب
تمام قوم مناتی ہے جشنِ آزادی
تمام ملک میں ہے آج عام بیداری
اگست عیش و مسرت کا لایا ہے پیغام
اگست ہی سے ہوا سارے ملک کا اکرام

اگست نے کیے تعمیر کے کئی در باز
اگست نے دیے ہم کو حیات کے انداز
اگست وسعتِ فکر و نظر کا ضامن ہے
اگست رونقِ شام و سحر کا ضامن ہے

اگست ماضی کی خوں بار داستاں بھی ہے
اگست حال کی ضو بار کہکشاں بھی ہے
اگست زخم بھی ٹھہرا، اگست مرہم بھی
اگست آگ بھی ٹھہرا، اگست شبنم بھی
اگست پھول بھی، خوشبو بھی اور خار بھی ہے
یہ تیرہ ذہنوں کے شانوں پہ سخت بار بھی ہے

کبھی نہ بغض و کدورت کے شر کو راہ دیں ہم
نہ دل میں جذبۂ تخریب کو پناہ دیں ہم
ہر ایک فرقہ و مذہب کی آبرو ہے اگست
یقین مانیے صدیوں کی جستجو ہے اگست

ساغر وارثی
املین زئی، شاہجہاں پور

شہیدانِ وطن

اک ایسی شمع جلا کر گئے وطن کے شہید
کہ جس کے نور سے روشن ہے بزمِ آزادی
جنھوں نے مادرِ گیتی کی لاج رکھنے کو
رہِ طلب میں لگا دی تھی جان کی بازی

چڑھا کے پھول عقیدت کے ان کی یادوں کو
کہ جن کی ذات تھی وجہِ حصولِ آزادی
خلوصِ دل سے سبھی کو یہ عہد کرنا ہے
پڑا جو وقت لگا دیں گے جان کی بازی

تغیرات کی آندھی تو اٹھتی رہتی ہے
تغیرات میں ثابت قدم جو رہتے ہیں
انھیں جیالوں کو تاریخ یاد رکھتی ہے
انھیں سپوتوں کو ہم سب عظیم کہتے ہیں

جو زندہ رکھتی ہیں اجداد کے اصولوں کو
جو اُن کے نقشِ قدم پر قدم اٹھاتی ہیں
انھیں سے وقت کا ہر انقلاب ڈرتا ہے
جہاں میں کچھ وہی قومیں فروغ پاتی ہیں

بدلتے وقت کی قدروں کا یہ تقاضا ہے
کہ اُن کے کام سے واقف ہوں یہ نئی نسلیں
تغیرات کے بادل نہ ان پہ چھا جائیں
شعاعِ مہر کو ترسیں نہ یہ ہری فصلیں

روایتوں کے تقاضے یہ ہم سے کہتے ہیں
کہ ان کا طرزِ عمل آج ہم بھی اپنائیں
بجھا کے اپنے دلوں سے چراغ نفرت کے
جہاں میں مادرِ گیتی کا نام چمکائیں

سیماب رشیدی
۱۳-۲۵ [illegible]
شاہجہاں پور

ایک سال — ایک آئینہ
اور کچھ روشن عکس

جائزہ دردِ شب خوش گوار تاریخ کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ پہلا تو یہی ہے کہ ہماری کاوشیں کس حد تک کارآمد ہوئی ہیں اور ہم کتنا آگے بڑھے ہیں یا پیچھے ہٹے ہیں اور دوسرا یہ ہے کہ لوگوں کو ہماری خوبیوں یا خامیوں کا تجزیہ کرنے کے مواقع بھی ملتے ہیں۔ عوامی زندگی میں اپنی کارگزاریوں کو نمایاں کرنا خود کو ایک امتحان میں ڈالنے سے کم نہیں اس لیے کہ جو کچھ کہا جاتا ہے (نہ صرف زبانی بلکہ تحریری طور پر بھی) تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے اردگرد نظر ڈالتا ہے کہ زندگی کے جن شعبوں میں پیش رفت کا باآگ دہل اعلان کیا گیا ہے ان کی صورتِ حال کیا ہے آیا کل کے مقابلے میں آج بہتری کے آثار ہیں یا کل سے بھی آج کی حالت بدتر ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں موجودہ حکومت اتر پردیش کے ایک سال کی سعی و کاوش کا تجزیہ پیش کرنا واقعی جرأت و ہمت کا کام ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جن محاذوں پر شری اسری پت مشرا کی زیرِ قیادت حکومت نے اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں ان کی کیا اہمیت ہے اور ساتھ ہی ساتھ اگر اطمینان کی لہر ہمارے دلوں میں پیدا ہوتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ایسی قیادت کے ہاتھ مضبوط نہ کیے جائیں۔

یہ ہماری ریاست کی موجودہ فعال قیادت ہی ہے جس کی بدولت اتر پردیش نے اپنے متعدد مسائل حل کرنے کی راہ میں آزادی کے ۳۶ ویں سال بھی سماجی اور معاشی میدان میں نئے ریکارڈ قائم کیے

اتر پردیش تعمیر و ترقی اور خوشحالی کی منزل کی جانب مسلسل گامزن ہے۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ ترقیاتی پروگراموں کا فائدہ عام آدمی کو پہنچے۔

گذشتہ ایک سال کی مدت میں وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ۲۰ نکاتی پروگرام پر موثر عمل درآمد کی راہ میں خاصی پیش رفت ہوئی۔ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے خصوصی کوششیں کی گئیں۔ امن و قانون کی صورتِ حال میں سدھار ہوا، جرائم میں کمی واقع ہوئی اور ریاست میں عام طور پر سبھی زمروں اور شعبوں میں امن و امان برقرار رہا۔

○ —— ملک بھر میں اس سال چالیس لاکھ ٹن گیہوں زیادہ پیدا ہوا، اس ۴۰ لاکھ ٹن میں سے تنہا اتر پردیش میں ۲۵ لاکھ ٹن گیہوں پیدا ہوا۔ سال ۸۳-۱۹۸۲ء میں اناج کی مجموعی پیداوار دو کروڑ ۶۳ لاکھ ۵۲ ہزار ٹن تھی جو سال ۸۲-۱۹۸۱ء کی پیداوار سے بیس لاکھ ٹن زیادہ ہے۔

ریاست میں زیرِ نظر سال کے دوران ۵۵ لاکھ ۲۶ ہزار ٹن چاول پیدا ہوا۔ سال رواں کے لیے ۶۵ لاکھ ٹن چاول کی پیداوار کا نشانہ ہے۔

○ —— موجودہ پیرائی سیزن میں محمود آباد کی شکر مل کے پیرائی شروع کرنے کے بعد ریاست میں شکر ملوں کی مجموعی تعداد ۹۲ ہو گئی ہے۔ آئندہ سال تک سات اور سال ۸۵-۱۹۸۴ء میں دو مزید شکر ملوں کی تعمیر متوقع ہے۔

○ —— حکومت اتر پردیش اور ریاستی بجلی بورڈ کی مشترکہ

کوششوں سے سال ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۱۲۵۸۴ ملین یونٹ بجلی پیدا ہوئی جو سال ۸۱-۱۹۸۰ء سے ۲۳ فیصد اور سال ۸۲-۱۹۸۱ء سے ۱۱ فیصد زیادہ ہے۔

ریاست میں سال ۸۳-۱۹۸۲ء کے دوران ۵۸۴۲ مواضعات اور ۴۳۸۴ ہریجن بستیوں کی بجلی کاری کی گئی۔ اس وقت ریاست کے ۴۹۴۳۴ مواضعات میں بجلی موجود ہے۔ بجلی کی سہولت سے آراستہ مواضعات کی یہ تعداد ملک کی کسی بھی ریاست سے زیادہ ہے۔ اب تک ۲۲۷۹۱ ہریجن بستیوں کی بجلی کاری کی جا چکی ہے۔

○ ــــ اتر پردیش میں امداد باہمی عوامی نظام تقسیم کے توسط سے جنوری ۱۹۸۱ء سے جون ۱۹۸۳ء تک چھ ارب ۳۷ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے کی کنٹرول اور غیر کنٹرول اشیا صارفین کو تقسیم کی گئیں۔ گذشتہ ایک سال میں ۱۳۰۲ سستے غلہ کی دکانیں قائم کی گئیں۔ جس سے ان کی تعداد جون ۱۹۸۳ء میں بڑھ کر ۲ ہزار ۵ سو ۲۹ ہو گئی۔

○ ــــ ریاستی حکومت نے اقوام مندرجہ فہرست کی تیز رفتار ترقی کے لیے اس سال متعدد پروگرام شروع کیے۔ اقوام مندرجہ فہرست کے ایسے افراد جو فٹ پاتھ پر بیٹھ کر جوتے بناتے اور مرمت کرتے ہیں، جن کے لیے دھوپ اور بارش سے بچاؤ کا کوئی بندوبست نہیں ہے، ان کے لیے گمٹی تیار کرنے کا کام شروع کیا گیا ہے۔

○ ــــ اتر پردیش روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن نے گذشتہ ایک سال کی مدت میں ۴۰۰ بسیں خریدیں۔ نویں ایشیائی کھیلوں کے موقع پر نقل و حمل میں تعاون دینے کے لیے دو سو بسیں دہلی بھیجی گئیں۔ ٹرانسپورٹ سروس کے لیے تقریباً ۶۰۰ نجی بسیں بھی حاصل کی گئی ہیں۔ امرت نگر (غازی آباد) اور صاحب آباد کی [illegible] اور [illegible] پور میں ملازمین کے لیے مکانات کی تعمیر کا کام مکمل کر لیا گیا۔

○ ــــ ابتدائی تعلیم کو عام کرنے کے لیے بیس نکاتی پروگرام کے تحت گذشتہ سال طلبا کی تعداد میں اضافہ کرنے کی مہم شروع کی گئی جس کے تحت تقریباً ۱۰ لاکھ بچوں کو اسکولوں میں بھرتی کیا گیا۔ اب پرائمری سطح پر طلبا کی تعداد ایک کروڑ ۸ لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔

ریاست میں گذشتہ سال آٹھ نئے سرکاری اسکول کھولے گئے اور ۱۱ سرکاری ہائی اسکولوں کا درجہ انٹر تک بلند کیا گیا۔ گذشتہ سال اوبرا (مرزاپور)، مہوبہ (ہمیرپور) اور نوئیڈا (غازی آباد) میں تین ڈگری کالج کھولے گئے۔ اس سال میدانی اور پہاڑی علاقوں میں دو، دو سرکاری ڈگری کالج کھولنے کی تجویز ہے۔

○ ــــ اتر پردیش میں سال ۸۳-۱۹۸۲ء کے دوران ۲۳ء۴ لاکھ افراد نے نس بندی کرائی۔ یہ تعداد اس سلسلے میں گذشتہ پانچ برسوں کی کامیابیوں سے کہیں زیادہ ہے۔ ریاستی حکومت نے دوربین طریقہ سے آپریشن کی مقبولیت کے پیش نظر ریاست کے سبھی ضلع اسپتالوں میں دوربین آلات فراہم کر دیے ہیں۔

○ ــــ ریاست میں گذشتہ سال بچوں کے امراض کے ۲۵ شعبے، دانتوں کے علاج کے ۱۴ شعبے، امراض چشم کے ۱۵ شعبے، ناک، کان اور گلے کے امراض کے ۱۱ شعبے اور پیتھالوجی کے پانچ شعبے ضلع اسپتالوں میں کھولے گئے۔

○ ــــ لکھنؤ۔ رائے بریلی روڈ پر ۵۲۷ ایکڑ رقبے میں سنجے گاندھی انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز کے قیام کا کام شروع ہو گیا ہے۔ ریاستی حکومت نے کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ کو صوبائی درجہ دینے کے سلسلے میں تمام رسمی کارروائیاں مکمل کر لی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آگرہ میڈیکل کالج کو گھنی آبادی والے علاقے سے ہٹا کر اسے نئی جگہ قائم کرنے کی منظوری دے دی گئی ہے۔

★

ایک اہم اعلان

فراق نمبر حصہ دوم، جس کے ستمبر میں شائع ہونے کا اعلان کیا گیا تھا، اب بعض وجوہ کی بنا پر نومبر، دسمبر ۱۹۸۳ء میں شائع ہوگا۔

ایڈیٹر

معجز سنبھلی

۱۵ راگست کا ترانہ

چھتیس سال پہلے تاریخ داں ہمارا
پرچم پہ لکھ چکا ہے "ہندوستاں ہمارا"
دنیا سے آج پوچھو پیچھے نہیں ہٹے ہم
انگریز لے رہا تھا جب امتحاں ہمارا
زد میں کبھی گولیوں کی مقصد نہ ہم نے چھوڑا
قیدوں سے بھی نہ بدلا عزم جواں ہمارا
ریلوں میں راستوں میں جیلوں میں محفلوں میں
نعرہ تھا ہم کو دیدو "ہندوستاں ہمارا"
جس کارواں کا مقصد آزادئ وطن تھا
کن سختیوں سے گزرا وہ کارواں ہمارا
قربان ہو رہے تھے ہم مادر وطن پر
کیسے یہ خون جاتا پھر رائیگاں ہمارا
آخر وہ دن بھی آیا اور آج ہی کا دن تھا
ہندوستاں کے ہم تھے ہندوستاں ہمارا
فضل خدا سے اب ہم مالک ہوئے چمن کے
گلچیں بھی ہے ہمارا اور باغباں ہمارا
جس جس نے ظلم سہہ کر آزادیاں دلائیں
یاد آ رہا ہے ہم کو ہر پاسباں ہمارا
قربانیوں کا ان کی بدلہ یہ مل رہا ہے
سارے جہاں کے ہم ہیں سارا جہاں ہمارا
اب قدر ہے ہماری دنیا کے ہر وطن میں
ہر ملک میں ہے گویا سکہ رواں ہمارا
معجز خلوص دل سے ہر دم یہی دعا ہے
اونچا ہو اور اونچا نام و نشاں ہمارا

احمد مقبول

اپنا راج

یہ زندگی کے ولولے بہادری کے حوصلے
بھرا دلوں میں جوش ہے ہر ایک سرفروش ہے
یہ جراتیں شجاعتیں جواں جواں یہ ہمتیں
عجب دلوں کا رنگ ہے ترنگ پر امنگ ہے
نگر نگر گلی گلی! منا رہے ہیں سب خوشی
خوشی کا یوم آج ہے
وطن پہ اپنا راج ہے

یہ حسن یہ جوانیاں یہ عشق کی کہانیاں
یہ رنگ و نور کی امیں ہمارے دلنشیں کی زمیں
ہے اس کے سینے میں نہاں بہادری کی داستاں
ہے اس کے ذرہ ذرہ میں ہمارے دل کی دھڑکنیں
مسرتوں کی ترجماں یہ کہہ رہی ہے ہر زباں
خوشی کا یوم آج ہے
وطن پہ اپنا راج ہے

یہ کوہسار، ندیاں یہ لہلہاتی کھیتیاں
یہ دلفریب وادیاں یہ برف پوش چوٹیاں
دولہن کی طرح سے سجی یہ سرزمین ہند کی
یہ بیل، ہل کسان سب وطن کے نوجوان سب
بڑی ہی آن بان سے یہ گا رہے ہیں شان سے
خوشی کا یوم آج ہے
وطن پہ اپنا راج ہے

یہ گرودوارے، گرجا گھر ہر ایک قوم کے بشر!
یہ مسجدوں کے پاسباں صنم کدوں کے نگہباں
بھلا کے اختلاف سب بہم ہوئے ہیں ایک اب
لگا رہے ہیں یہ صدا زمانے بھر کو دو بتا
خوشی کا یوم آج ہے
وطن پہ اپنا راج ہے

افسانہ

عائشہ صدیقی
فلیٹ نمبر ۶۔ احاطہ ناظر
قیصر باغ بھاٹیہ
لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۱۸

پتھرائی آنکھوں کا خواب

وہ کب سے شہروں شہروں خاک اُڑاتا پھر رہا ہے، کسی کو معلوم نہ تھا اور یہ معلوم کرنے کی فکر بھی کسے تھی۔ انسانوں کے ٹھاٹیں مارتے سمندر میں کوئی اپنا آپ ہی سمیٹ کر رکھ لے تو بڑی بات ہے ایک ایک قطرہ کا حساب کون رکھ سکتا ہے۔ کسی زمانے میں وہ غائب ہوتا تو اس طرح کہ مہینوں شکل ہی دکھائی نہ دیتی۔ لوگوں کو یقین ہو جاتا کہ وہ ضرور کسی حادثہ کا شکار ہو گیا ہوگا۔ روز ہی بستیوں میں طوفان اٹھا کرتے ہیں۔ کبھی ویرانے آبادیوں کو نگل لیتے ہیں کبھی آبادیاں خود ویرانوں میں پناہ لینے پہنچ جاتی ہیں۔ کبھی زندگی غرقِ آب ہو جاتی ہے، کبھی ہرے بھرے جنگلوں میں آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اس سیلِ حوادث میں کون کس کے چنگل میں پھنس گیا، کیا کہا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ ہر قیاس کو جھوٹا ثابت کر دیتا اور پھر یقین کی طرح سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا۔ دن بھر وہ ادھر اُدھر بھٹکتا پھرتا۔ کبھی پُر رونق بازاروں میں گھنٹوں بے مقصد چکر لگاتا۔ کبھی باتیں کرتے ہوئے لوگوں کے بیچ میں گھس کر کھڑا ہو جاتا اور احمقوں کی طرح منہ کھولے گھنٹوں انھیں تکا کرتا — کبھی ٹکٹکی باندھے کسی عورت کو تکتا رہتا۔ گھنٹوں بیت جاتے اور وہ مٹی کے بے جان تودے کی طرح اپنی جگہ جما کھڑا رہتا۔ ہاں میلی میلی آنکھوں میں چمک بڑھ جاتی۔ جیسے بہت سے جگنوؤں نے ان غیر آباد گوشوں میں بسیرا کر لیا ہو۔ دھول کی موٹی تہہ کے نیچے سے ایک معصوم سا چہرہ جھانکنے لگتا، اور وہ جیسے خوابوں کے جزیرے میں قدم رکھتا ہوا آگے بڑھنے لگتا۔

"ماں" وہ اس طرح پکارتا جیسے اس کے لب نہیں رُواں رُواں پکار رہا ہو، تب ہی غلیظ گالیوں کی بوچھار اس پر برسنے لگتی اور وہ خواب سے جاگ جاتا۔ لوگ اسے دوڑاتے ہوئے دور تک کھدیڑ آتے اسی طرح جیسے انسانوں کے بیچ گھس آنے والے سانڈ کو بھگا دیا جاتا ہے۔ وہ پھولی پھولی سانسیں لیے بھاگ کھڑا ہوتا۔ چہرے پر خوف کے سائے لیے وہ کسی ویران گوشے میں سمٹ کر بیٹھ جاتا۔ گھنٹوں وہ سوچا کرتا کہ آخر اس سے کون سی غلطی سرزد ہو گئی ہے لیکن سمجھ نہ پاتا۔ آخر اپنی الجھی الجھی سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر پھر آبادیوں کا رُخ کرتا۔ وہ کسی کونے میں چھپ کر کھڑا ہو جاتا، اور پاس سے گزرنے والوں کو تکا کرتا۔ نہ جانے کتنی بار ایسا ہو چکا تھا۔ وہ کونے میں سمٹا کھڑا ہے۔ پاس سے مسکراتا ہوا کوئی نوعمر لڑکا جا رہا ہے اور وہ ایک دم بانہیں پھیلا کر راستے میں کھڑا ہو گیا۔

"ابے ہٹ۔ کہاں گھستا چلا آ رہا ہے۔"

"میرا بھیا، کب سے تجھے ڈھونڈ رہا ہوں"۔ وہ اپنی بانہیں اس کے کاندھوں پر رکھ دیتا۔

"چل بھاگ بڑا آیا بھائی بن کر۔ میرا کوٹ گندا کر دیا۔ کبھی اپنی صورت دیکھی ہے۔؟" وہ اسے دھکا دیتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔

یہ کوئی نئی بات تو تھی نہیں۔ روز ہی لوگ اسے دھکے دے کر گزر جاتے اور وہ منہ کھولے انھیں دیکھتا رہ جاتا — "کیا ہے میری صورت میں —؟" وہ ٹوٹے ہوئے آئینے کے ٹکڑے کو ہر طرف سے گھما کر دیکھتا اور ہر طرف سے دھول میں اَٹا ہوا ایک ہی چہرہ نظر آتا، زندگی کے اجالوں سے محروم دُھندلا دُھندلا مٹا مٹا سا۔ میلی میلی بے خواب آنکھیں

وحشت سے پھٹی ہوئی۔ وہ آئینہ دور اُچھال دیتا، اور تب فضا میں بڑی دلدوز چیخیں سُنائی دیتیں۔

"مجھے کس نے مار دیا۔ یہ میں نہیں ہوں۔ میرا چہرہ کون لے گیا۔ میرا چہرہ۔ میرا چہرہ۔"

وہ گم صم سا اپنے وجود کے کھو جانے کا غم منایا کرتا، اور اب تو جیسے یہ اس کا انداز ہی بنتا جا رہا تھا۔ ادھر کئی برسوں سے اس نے لوگوں سے بات کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ تو دن میں کہیں نظر بھی نہ آتا تھا جیسے روشنیوں سے خوف زدہ ہو۔ جب دن تیز دھوپ میں تپ کر دُھواں دُھواں اندھیروں میں ڈوب جاتا۔ لوگ اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیتے۔ سڑکوں پر رواں دواں ہجوم چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر محفوظ کونوں میں سمٹ جاتے تو اس کا تنہا سایہ ویران شاہراہوں پر دکھائی دیتا۔ رات گئے تک وہ تنہا مارا مارا پھرتا۔ کبھی ایک سڑک پر کبھی ایک گلی میں۔ وہ منہ اٹھا اٹھا کر مکانوں سے پھوٹتی ہوئی روشنی کو تکا کرتا گھروں کا طواف کرتا۔ دروازوں پر دستک دیتا، اور جب کوئی آواز جواب میں نہ ابھرتی تو پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیتا۔ اس کی چیخیں اتنی بھیانک ہوتیں کہ لوگ کانوں میں انگلیاں دے لیتے۔ وہ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالتا۔ دیواروں سے ٹکریں مارتا اور خود کو لہولہان کر لیتا۔ ہر چوٹ کے ساتھ ایک تیز چیخ فضا میں ابھرتی۔ وہ بلک بلک کر سب کو مدد کے لیے بلاتا۔ "مجھے بچالو، مجھے بچالو۔"

"میں مر جاؤں گا۔ سب چھوڑ کر کہاں چلے گئے ــــ دیکھو کتنا خون بہہ رہا ہے۔"

لیکن کوئی اسے بچانے کے لیے آگے نہ بڑھتا۔ ہاں اس کے خون کے بارے میں لوگ اکثر سرگوشیاں کرتے تھے۔

اس کا نام کیا ہے۔ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے خاندان والے کہاں ہیں۔

دماغی توازن ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے وہ کسی سوال کا تسلی بخش جواب نہ دے پاتا تھا، یا شاید ان سوالوں نے ہی اس کا دماغی توازن بگاڑ دیا تھا۔ اس کی راتوں کی نیند اڑا دی تھی۔ وہ سوچا کرتا لیکن سمجھ میں نہ آتا کہ کس طرح ان کو مطمئن کرے۔ اب تو وہ پوری بستی سے مایوس ہو چلا تھا۔ ایک آدمی بھی تو ایسا نہ تھا جو اس کے درد کو سمجھ سکے۔ اسے سہارا دے۔ اس کی آواز سن کر ہی لوگ اپنے گھروں کی کھڑکیاں بند کر لیتے جیسے وہ زبردستی اندر گھس آئے گا۔ جاڑے کی سرد راتوں میں وہ ٹھٹھرتا پھرتا اور کوئی سائبان اس پر سایہ نہ کرتا۔

شاید وہ موسم کی سرد ترین رات تھی۔ لیکن یخ بستہ ماحول سے زیادہ اسے لوگوں کی سرد مہری جان لیوا لگ رہی تھی۔ آج تو اس کی آواز پر کوئی کھڑکی تک بند ہونے کی آواز نہ آئی۔ شاید وہ اس کے وجود ہی سے منکر ہو گئے تھے یا شاید اسے انسانوں سے الگ کوئی بھیانک مخلوق سمجھ کر لوگوں نے اس کی طرف سے نگاہیں پھیر لی تھیں۔

وہ لگاتار لوگوں کے دروازے کھٹکھٹاتا رہا۔ بار بار گھروں کی کال بل بجا کر بے رحم سناٹے کو مجروح کرتا رہا۔ چیخ چیخ کر سب کو پکارتا رہا۔ شاید وہ ساری رات یہی کرتا، لیکن اچانک شروع ہو جانے والی بارش نے اسے قریب کی عمارت کے پورٹیکو میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا سامنے نظر آنے والی کھڑکی سے دودھیا روشنی جھانک رہی تھی۔ اس نے دھکا دے کر بھڑے ہوئے پٹوں کو کھول دیا۔ کھڑکی کے قریب ہی اُلجھے الجھے بالوں والا ایک بچّہ سر جھکائے اپنے کھیل میں مصروف تھا۔ سامنے کے پلنگ پر ایک عورت جو صورت اور لباس سے آیا نظر آتی تھی، بے خبر سو رہی تھی۔

اس کی آہٹ سے چونک کر بچّے نے سر اُٹھایا۔ اسے دیکھ کر اپنائیت بھری معصوم مسکراہٹ ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"یہاں آجاؤ نا، بارش میں کیوں بھیگ رہے ہو۔ ؟"

اس کی آنکھیں حیرت سے جیسے پھٹنے لگیں، اور قدم آپ ہی آپ کھڑکی کی طرف بڑھ گئے۔

"تم ـــ تم نے مجھے پکارا ــــ مجھے۔ ؟!"

"ہاں اور کیا۔ تم نے میری آواز نہیں سُنی۔ ؟"

"مجھے پہچانتے ہو تم۔ ؟" اس نے ہزاروں لوگوں سے پوچھا ہوا سوال پھر دہرا دیا۔

"ہاں۔ !" بچّے کی نیلی شیشے کے ٹکڑے جیسی آنکھیں کچھ اور چمک

دیکھیں۔

"کون ہوں میں۔ بتاؤ میرا نام کیا ہے۔؟" ساری زندگی کی بیتابی کو جیسے زبان مل گئی ہو۔

"تم آدمی ہو۔" بچے نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔

"میں آدمی ہوں۔ ــــ آدمی۔ تم نے مجھے پہچان لیا۔ کہاں سے پائی تم نے یہ سمجھ۔؟!" خوشی سے اس کی آنکھیں چھلک آئیں ــ "مجھ سے دوستی کرو گے ــ؟" اس نے اپنا میلا کچیلا ہاتھ آگے بڑھایا جسے بچے نے بڑی بے تکلفی سے تھام لیا۔

"کیا تمہارے گھر میں سب سو گئے۔؟"

"نہیں ابھی کوئی نہیں سویا۔ وہ تو میں نے لائٹ بجھا دی تھی" یہ کہہ کر وہ نیچے جھکا اور ایک بٹن دبا دیا۔ چھوٹا سا گھر وندہ روشنی سے جگمگا اٹھا ــ "میرا گھر تو یہ ہے۔ ابھی تو سیتا۔ رضیہ۔ ڈولی سب ہی جاگ رہی ہیں۔ احمد اور اشوک کیرم کھیل رہے ہیں"۔

"تمہارے گھر میں اتنے بہت سے لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں۔ تم نے احمد اور اشوک کو ایک ہی گھر میں کیسے بسا لیا۔"

"کیوں ساتھ کیوں نہیں رہ سکتے۔ دونوں ہی آدمی ہیں۔ اگر ایک رہ سکتا ہے تو دوسرے کو کیوں جگہ نہ دوں۔ میں تو سب کو ایک ہی میز پر کھانا دیتا ہوں ــ ارے تم ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ تھوڑی دیر آنکھیں جھپکا جھپکا کر اسے دیکھتا رہا۔

"اب سمجھا۔ ممی کی طرح تم بھی سمجھتے ہو کہ رابرٹ۔ کریم اور وشنو ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ نہیں بھائی۔ میرے گھر میں سب کو ساتھ ہی رہنا پڑے گا۔ کام بھی کرنا پڑتا ہے سب کو۔ دیکھو یہ آدمی مالی ہے۔ یہ عورت برتن صاف کرتی ہے۔"

"یہ سب کہاں سوئیں گے۔؟"

"یہیں، ساتھ ساتھ۔ کام کے بعد سب لوگ گائیں گے، کھیلیں گے پھر سو جائیں گے۔"

وہ بچے کا ہاتھ تھامے کھڑکی سے سر ٹکائے اس گھر وندے کو دیکھ رہا تھا جس میں پوری دنیا آباد تھی۔ ذات، مذہب، حیثیت اور مرتبے سے الگ ایک نرالی دنیا۔

"کیا تم مجھے بھی رہنے کا ٹھکانہ دو گے۔؟ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ کوئی اپنا نہیں۔ بھائی، بہن، ماں باپ سب پتہ نہیں کہاں کھو گئے میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ بہت اکیلا" اس نے اپنے درد کو اس چھوٹے سے انسان کے سامنے انڈیل دیا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ جتنے لوگوں کے پاس گھر نہیں ہے میں ان سب کے رہنے کا انتظام کر دوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے گتا کھٹے پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جوڑ کر بہت سے کمرے کھڑے کر دیئے۔ "ایک کمرہ تم لے لو، باقی میں دوسرے لوگ رہیں گے۔ اور ہاں چلو میں تم کو سب سے ملوا دوں۔ شیلا تمہاری بہن بن جائے گی۔ احمد کو تم بھائی بنا لینا۔ موٹی بہن ڈکی سوزا کو ممی کہہ کر بلا لینا"۔

خوشی سے اس کی آنکھیں بھر آئیں، اس نے بے اختیار ان چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو چوم لیا۔

"میں برسوں سے نہیں سویا ہوں۔ اس دنیا کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے میری بے خواب آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ میں تو سمجھا تھا زمین پر برپا ہونے والے طوفانوں نے اسے تباہ کر دیا ہے اور مجھ جیسے بے سہارا لوگوں کو کوئی چھت سایہ نہ دے گی۔ میرے شہزادے تم اپنی دنیا کو چاروں طرف پھیلی زہریلی ہواؤں سے بچا کر رکھنا۔ اسے پھیلاتے جانا، بڑھاتے جانا، اپنے ہاتھوں سے سجاتے جانا ــ اس دنیا پر تمہارے علاوہ اور کوئی حکومت نہیں کر سکتا۔ یہ تمہاری ہے! ــ آج مجھے سکون کی نیند آئے گی۔"

اس کی جلتی ہوئی بے خواب آنکھیں آپ ہی آپ بند ہونے لگیں اور وہ کھڑکی کی چوکھٹ سے سر ٹکا کر گہری نیند سو گیا۔ اپنے ادھورے سپنوں کو پھر سے اپنی آنکھوں میں سجانے کے لیے ــــ!

**

نصر قریشی

"اے نگارِ وطن"

اے نگارِ وطن! تیرے فنکار ہم، مثلِ ابرِ رواں سب پہ سایہ فگن
لے کے سیف و قلم، عظمتوں کے علم، ذکر تیرا کریں انجمن انجمن
جلتی صدیوں میں خوشبو کا پیکر بنے، یوں ہی بن کر رہے غازۂ فکر و فن
رات کی اجڑی سی راہوں میں بن کر ضیا صبح کو ہم نے بخشا نیا پیرہن
اے نگارِ وطن!

تجھ کو معلوم ہے ہم ترے واسطے طنز کے تیر ہنس ہنس کے سہتے رہے
تیرے نغمات ہونٹوں پہ مچلے سدا عظمتوں کے فسانوں کے عنواں بنے
دشت و کہسار اور وادیٔ خار میں موسمِ گل کا پیغام لے کر چلے
خونِ دل سے چراغوں کو روشن رکھا اور سجاتے رہے تیری راتوں کا بن
اے نگارِ وطن!

تو نے دیکھا کبھی ہم کو تیشہ بکف اور کبھی زہر کا جام پیتے ہوئے
ہم کہ مغلوب ہو کر بھی فاتح رہے کر گئے نام ہر سمت جیتے ہوئے
دھجیاں جیب و دامن کی اپنے اڑیں سب کا دامن لیے پھر بھی سیتے ہوئے
زندگی مختصر راستے پر خطر پھر بھی چلتے رہے ہم اسیروں کے تن
اے نگارِ وطن!

تیرا پیغام ہے امن اور آشتی صلحِ کل ساری انسانیت کے لیے
تیرے رہبر بنے ہر عصرِ نو، آندھیوں میں بھی روشن ہیں تیرے دیے
تیرے دریاؤں نے پیاسے صحراؤں کی پیاس بجھنے کے ساماں مہیا کیے
ذہن و دل، روح کی رفعتوں کے لیے مسجدوں میں اذاں مندروں میں بھجن
اے نگارِ وطن!

آج بھی عہد کرتے ہیں ہم ہر گھڑی، تیری راہوں میں سر کو کٹا جائیں گے
جلتے ماحول کے جلتے لمحات میں فصلِ گل کی فضا تا فلک کر لائیں گے
تیرہ و تار راہوں میں شمعیں بنے ظلمتوں کو کفن یوں ہی پہنائیں گے
تجھ کو رشکِ فردوس بنا کر رہیں اب یہی ہے ہمارے دلوں کی لگن
اے نگارِ وطن!

ہم قلمکار و فنکار تیرے لیے روشنی کے خزانے لٹاتے رہیں
اپنی تحریروں سے زندگی کے لیے آگہی کے دیے ہم جلاتے رہیں
اے زمینِ وطن، تیری تخلیق ہم تیری مٹی کی خوشبو بڑھاتے رہیں
سر پہ ہر دم رہے تیرا دستِ کرم، ہر نفس میں ڈھلے عظمتوں کا چلن
اے نگارِ وطن!
اے نگارِ وطن!!

نصیر پرواز

اے میرے وطن

اے میرے وطن اے میرے وطن
گہوارۂ تہذیب عرفاں آئینۂ صبحِ علم و فن
اے حسنِ ازل کی رعنائی اے خیمۂ موجِ گنگ و جمن
اے میرے وطن اے میرے وطن

تو نے ہی شعورِ ہستی کو ادراک کا روشن باب دیا
تیرے ہی سبو پر منھ رکھ کر تہذیبِ خودی نے گھونٹ پیا
تیرے ہی عمل سے قائم ہے احساسِ یقیں عرفانِ سخن
اے میرے وطن اے میرے وطن

کتنے مذہب کتنی قومیں تیری آغوش میں زندہ ہیں
کتنے نغمے کتنے لہجے تیری ضو سے تابندہ ہیں
تیری تاریخ کا ہر ذرہ خورشید کی صورت ہے روشن
اے میرے وطن اے میرے وطن

ہر بات میں تیری رعنائی تو ہر اک رنگ میں شامل ہے
حالات ترے بتلاتے ہیں تو غور و فکر کا حامل ہے
اس دہر میں تیرے دم سے الفت کا عمل راحت کا چلن
اے میرے وطن اے میرے وطن

قرآں تجھ میں گیتا تجھ میں انجیل کی خوشبو ہے تجھ میں
ہیں بودھ جین اور سکھ تیرے ہر دھرم کا پہلو ہے تجھ میں
ذرہ ذرہ اس مٹی کا بیدار ہوا دھڑکن دھڑکن
اے میرے وطن اے میرے وطن

ظفر مرزاپوری
تحصیلداری لائن
مرزاپور ۲۳۱۰۰۱

آہ! حرمت الاکرام

بوجھ غم کا ذہن پر رنجیدہ دل آنکھیں اداس
آج کس کو سب کی نظریں ڈھونڈھتی ہیں آس پاس
کھو گیا آخر کہاں وہ سادہ دل سادہ لباس
بات یوں کرتا تھا جیسے آتی ہو پھولوں سے باس
بادۂ علم و ادب کا اک انوکھا جام تھا
وہ صفِ اول کا شاعر حرمت الاکرام تھا

اک صحیفہ ہی نہ تھا وہ صرف مرزاپور کا
جو نہ مرجھائے وہ غالب کے چمن کا پھول تھا
ہائے! وہ مہرِ منور وقت کا تھا کیا ہوا
کیوں اچانک سارے عالم پر اندھیرا چھا گیا
بادۂ علم و ادب کا اک انوکھا جام تھا
وہ صفِ اول کا شاعر حرمت الاکرام تھا

فکر کی گہرائیوں میں ڈوبنے جائے گا کون
قلزموں میں ڈوب کر موتی نئے لائے گا کون
عظمتِ فن کے لیے تا عمر غم کھائے گا کون
ایک گوشے سے جہاں میں نام پھیلائے گا کون
بادۂ علم و ادب کا اک انوکھا جام تھا
وہ صفِ اول کا شاعر حرمت الاکرام تھا

جس کے نقشِ پا سے روشن راہ ہوتی جائے ہے
ہر کتاب اس کی جہاں رہنما کہلائے ہے
وہ خیالوں میں قلم کاروں سے کھنچے آئے ہے
"فن کے نبضوں میں لہو دل کا نچوڑا جائے ہے"؎
بادۂ علم و ادب کا اک انوکھا جام تھا
وہ صفِ اوّل کا شاعر حرمت الاکرام تھا

؎ یہ مصرعہ حرمت الاکرام صاحب کا ہے۔

ضیا فتح آبادی
جے ۵/۱۲ راجوری گارڈن۔ نئی دہلی
۱۱۰۰۲۷

اٹھ گیا امن بھی

اٹھ گیا امن بزمِ ہستی سے
شمعِ اردو بجھی بجھی سی ہے
کوئی جا کر ہوا نہیں واپس
دل نے آواز بارہا دی ہے

بند ہوتے ہی امن کی آنکھیں
بچھ گئی ہر طرف صفِ ماتم
کیا گیا بندۂ خلوص و وفا
امن سے ہو گیا تہی عالم

تھا سیاست میں دخل اسے کہ وہ تھا
مردِ میدانِ جنگِ آزادی
شعرِ اردو کو ناز تھا اس پر
مانتے تھے سب اس کی استادی

امن کی بات اب کرے گا کون
کون جینے کا گر سکھائے گا
کون دھو کر کدورتوں کے داغ
دامنِ انساں کا جگمگائے گا

تھا بجز امن کس کو امن کا پاس
ہائے وہ پاسدارِ امن گیا
اس نے بھی ہم سے بیوفائی کی
اے ضیا اعتبارِ امن گیا

عصمت حسین
معرفت پروگلز
گورکی سدن کیمپس
وکٹوریہ ٹیرس، کلکتہ ۱۶

مکالمہ

وہ میرے ڈرامے "تین پیسے کا کھیل" کی ایک ایکٹریس کے ساتھ آئی تھی۔ سلیم سگریٹ کے دھویں کی زنجیر بناتا ہوا لکشمی کو مشکوک نظروں سے دیکھتا جاتا تھا۔ راشد صاحب بھی پھولے ہوئے تھے کیونکہ میں بے شری کو پارٹ سمجھانے کے بجائے لکشمی کے پیچھے پڑا ہوا ہوں۔ ان کی ناگواری بھی درست تھی کیونکہ ہم لوگ سرگوشی میں باتیں کر رہے تھے اور وہ ان باتوں کو سن نہیں پا رہے تھے۔ وہ بے شری کو پارٹ سمجھانے میں لگ گئے۔

میں لکشمی سے باتوں میں مشغول تھا۔ لکشمی کی باتیں وہی تھیں جو کبھی مشتری اور انسری کی امانت تھیں۔ اس کی روح میں دو منظر کر دلدل ایک ساتھ سما گئے تھے اور میں بت بنا اس کی آنکھیں دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں نرگسی تو تھیں مگر ان میں ایک ——— بے قراری بھی نظر آ رہی تھی اور کچھ اندیشے بھی نمایاں تھے۔ وہ اپنے بارے میں کہنے لگی۔ "میں پاگل ہو جاؤں گی، مجھ سے اتنا دکھ، اتنی پریشانی، اتنی مایوسی، اتنی اداسی اور بے چارگی برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ تم مجھ سے کہو گے کہ میں اپنے آپ کو سنبھالوں زندگی کے اچھے پہلوؤں پر نظر ڈالوں، مگر مسٹر رحمت زندگی کے اچھے پہلو صرف ان کے لیے ہوتے ہیں جو صوفے پر بیٹھ کر پنکھے کی ہوا کھاتے ہیں۔ یہ ان کے لیے نہیں ہیں جو آدھی رات کو بوسیدہ ٹاٹ پاروں سے کھٹمل نکال نکال کر مارتے ہیں۔"

اس کی باتیں سن کر میں مسکرا دیا۔ لیکن اچانک سہم بھی گیا کیونکہ وہ غریبا کی باتیں کر رہی تھی اور یہ تو ایک مسکرانے کا نہیں تھا۔

وہ پوچھ بیٹھی۔ "آپ کچھ بول نہیں رہے ہیں، کیوں! میں بور تو نہیں کر رہی۔؟"

"نہیں نہیں۔ تم بولتی جاؤ میں سن رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"میرے پتاجی ایک جواری اور شرابی شخص ہیں۔" وہ بولنے لگی۔ "ساری کمائی جوئے اور شراب میں لٹا دیتے ہیں اور سونے پر سہاگا یہ کہ وہ ایک عورت بھی رکھے ہوئے ہیں۔"

سلیم ہم لوگوں پر توجہ دیے بغیر اپنے ڈرامے کے مکالمے زور زور سے دہرانے لگا۔ "ہم سماج کو بدلنا چاہتے ہیں۔ لوگوں کو برائیوں، جوئے اور شراب سے دور رکھنا چاہتے ہیں تاکہ ان کے بچے بھوکے نہ مریں ——— مگر کیا بھوکی پیاسی روحوں میں تبدیلی آ سکتی ہے؟؟ ——— اور پھر چار گلاس "چلو" اور نمبر سترہ میں لگتا ہی کتنا ہے؟ ایک روپیہ چار آنے۔ کیا ایک روپیہ چار آنے میں چار آنتوں کی بھوک مٹ سکتی ہے۔؟ نہیں! نہیں! نہیں! ——— ہاں اس سے خواب بنے جا سکتے ہیں، مگر وفادار چہرے خوبصورت نہیں ہو سکتے۔"

دوسری طرف راشد بلند آواز میں اداکاری کے ساتھ بولتا ہے۔ "تمہارا مطلب ہے انہیں شراب پینے دو، جوا کھیلنے دو، تاکہ یہ مر جائیں اور ان کے بچے مہلک بیماریوں کے شکار ہو کر مر جائیں سب کے سب مر جائیں اور پھر اس کے بعد صرف ہم باقی رہیں گے، ہم جو شائستہ، مہذب اور آئیڈیلسٹ لوگ ہیں ——— تمھی بڑی بڑی

خوبصورت باتیں سوچ سکیں گے۔"

لکشمی اس کی طرف سے نظر ہٹا کر میری طرف دیکھتے ہوئے پھر اپنی باتیں شروع کر دیتی ہے۔ "آج ہمارے گھر میں افراتفری مچی ہوئی ہے۔ میری ماں، میری دادی سب رو رہی ہیں۔ ان کے آنسوؤں کو دیکھ کر میرا دل دہلا جا رہا ہے۔ میری بہن کو میرے چچا نے پٹرول چھڑک کر جلا دیا ہے کیونکہ اس کے نام دادا نے بہت سے روپے بینک میں جمع کر رکھے تھے اور وہ چیک پر دستخط کرنے سے انکار کر رہی تھی۔"

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

میں اس کی لبریز آنکھیں دیکھنے لگا۔ "کیا ظلم پر آدمی صرف رو سکتا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا۔؟"

جے شری اپنا ڈائیلاگ دوہرا رہی تھی۔۔۔ "آنسو غم کا مداوا نہیں ہوا کرتے اور الفاظ مسائل کا حل نہیں ہیں۔ کچھ نہیں تو ایک وار ہی کرو اور ان کا کام تمام کر دو مگر ان زندہ لاشوں کو زندگی کی اور سزا نہ دو"۔

سلیم کہتا ہے: "مگر انھیں انقلاب لانا ہے، اس سماج کے پورے ڈھانچے کو بدلنا ہے"۔

جے شری اس کے ڈائیلاگ کو کاٹتے ہوئے بولی۔ "مگر انقلاب کے بعد کیا ہوگا۔؟"

سلیم: "انقلاب کے بعد ہم راج کریں گے...... ہم دانشمند لوگ"۔

راشد: "جب تک انسان انسان پر راج کرتا رہے گا، تب تک کسی بھی تہذیب سے بے انصافی اور خود پرستی دور نہیں ہو سکتی"۔

لکشمی ان سب مکالموں کو سن کر ایسا لگا جیسے کچھ کھو سی گئی۔ مگر پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی۔ "اس ڈرامے کے مکالمے تو بہت اچھے ہیں"۔

میں نے کہا، "ہاں! مگر یہ مکالمے جو تم اتنی دیر سے سن رہی تھیں ان کو ڈرامہ کمپنی کے منیجر نے ڈرامے سے نکال دینے کی ہدایت کی ہے"۔

*

جنگِ آزادی میں ملیح آباد کے پٹھانوں کا حصہ

ص ۱۱ کا بقیہ

کر کے جیل بھیج دیے گئے۔ اسی طرح ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک میں ملیح آباد کے مجاہدین آزادی میں صرف خواجہ احمد خاں اور ان کے ساتھ رہنے والے ان کے بھتیجے محمد عثمان خاں کو جیل بھیجا گیا ان تحریکوں کے علاوہ بھی کئی بار خواجہ احمد خاں کو گرفتار کیا گیا کیونکہ برٹش حکومت ملیح آباد کے سیاسی لیڈروں میں سب سے زیادہ دہشت زدہ خواجہ احمد خاں سے تھی۔ ان کی نقل و حرکت کی کڑی نگرانی کرتی اور ذرا سے شک و شبہ پر ان کو گرفتار کر لیتی تھی۔ الغرض خواجہ احمد خاں حصولِ آزادی تک کانگریس کے سرگرم کارکن اور جنگِ آزادی کے قائد رہے۔

ملیح آباد کے ان مجاہدین آزادی کے ساتھ ساتھ خاندان فقیر محمد خاں گویا کے شعراء نے بھی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ اور اپنی ولولہ انگیز نظموں سے قوم کے حوصلوں کو بڑھایا۔ ان شعراء میں سرفہرست شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کا نام آتا ہے۔ ان کے علاوہ شاد ملیح آبادی۔ اثر ملیح آبادی، خطیب احمد خاں خطیب، جلال ملیح آبادی۔ سرخوش ملیح آبادی۔ اظہار ملیح آبادی اور خود راقم الحروف کا نام بھی ان شعراء میں شامل ہے، جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ جنگ آزادی کو طاقت پہنچائی۔

*

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں۔

نام کتاب: انگاروں کا شہر

مصنف: ظہیر انور ، قیمت: پندرہ روپے

ملنے کا پتہ: شرجیل آرٹس ۱۱۔ ایری پوکھر فرسٹ لین۔ کلکتہ ۔ ۱۹

پارسی تھیٹر کے ڈرامے عموماً طلسماتی، تخیلی اور دور از حقائق داستانوں پر مبنی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پارسی اسٹیج "تخلیقی اسٹیج" نہ بن سکا۔ یہ زوال پذیر اس وجہ سے بھی ہوا کہ وقت کے تقاضوں کا بخوبی ساتھ نہ دے سکا، اور اس طرح ہمارے ادب میں تھیٹر کی صحت مند روایت کی بنیاد ہی نہ پڑ سکی

اس کے بعد عرصۂ دراز تک ادبی ڈرامے لکھے گئے۔ ان ڈراموں کے مصنف اسٹیج کے تقاضوں سے آگاہ نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عبدالماجد دریابادی کا "زود پشیماں"۔ عبدالحلیم شرر کا "میوۂ تلخ"۔ ظفر علی خاں کا "جنگ روس و جاپان" اور بعد میں برج موہن کیفی اور ڈاکٹر اعجاز حسین کے ڈرامے صرف کتب خانوں کی زینت بن کر رہ گئے۔ یوں وقتاً فوقتاً ایک آدھ ڈراما اسٹیج بھی ہوا جیسے انصار ناصری کا "شجرۂ نوری"۔ لیکن اس دور میں بمبئی اور دلی میں پرتھوی راج کپور اور بلونت گارگی نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔

آج اردو اسٹیج کی دنیا میں القاضی، حبیب تنویر، ساگر سرحدی، شہاب جعفری اور امجد علی خاں کے بعد سب سے زیادہ روشن اور تابناک نام ظہیر انور کا ہے۔ "انگاروں کا شہر" ان کے تین ڈراموں کا مجموعہ ہے جنھیں کلکتہ میں اسٹیج پر کامیابی کے ساتھ پیش کر کے وہ عوام و خواص سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ظہیر انور دور حاضر کے اسٹیج اور اس کی فنی نزاکتوں سے مکمل طور سے آشنا ہیں اور ان کا حساس، شاعرانہ اور درد مند دل ہر منظر میں دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ انھوں نے بنگالی، مراٹھی اور ہندی تھیٹر کے جدید رجحانات کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ بادل سرکار، اتپل دت، شمبھو مترا، تندولکر اور موہن راکیش کے کارناموں سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔

"انگاروں کا شہر" ظہیر انور کا کامیاب ترین ڈراما ہے اور اس میں مصنف کا فن بام عروج پر ہے۔ اس کا کینوس وسیع ہے اور یہ دور حاضر کے انسان کی تنہائی، تشکیک اور ذہنی کرب کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ وشال کی چیخ احتجاج کی علامت بن گئی ہے۔

"میں اس سماج کا حصہ نہیں ..... میں نے
یہاں بے پناہ خون ہوتے دیکھے ہیں ..... یہاں سچائی
نہیں ہے ..... یہاں سچائی نہیں ہے!"

"I Will Never be a Party
to Your World."

اور جب وہ اپنے کرب اور گھٹن کا اظہار کرتا ہے تو ہم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ـــ

"ہمارے عہد میں اب کوئی رنگ بچا ہی نہیں کمار صاحب
.... دیکھیے نا یہ نئی تصویر رنگوں کے بغیر کس
طرح اداس ہو گئی ہے ..... درد کی تصویر بناتے
بناتے میں تھک سا گیا ہوں کمار صاحب!"

"انتظار اور ابھی" میں سماجی ناانصافی اور بے روزگاری کا مسئلہ ہے۔ مصنف نے یہاں بھی طنز کے تیکھے نشتر معاشرے کی رگوں میں پیوست کر دیے ہیں۔ طنز کی یہ دھار بہت تیز ہو جاتی ہے جب اچانک اوینا ش ٹیگور کی تصویر کی طرف گھوم جاتا ہے۔

" دیکھ رہے ہو گرو جی! یہ تمھاری دھرتی کے سینے

پر کیا ہو رہا ہے۔ ندی، ساگر، پیار اور خوبصورتی، کیا
سپنا دیکھا تھا تم نے ..... گرو جی، میری ایک
بات مانو گرو جی، اپنی آنکھیں بند کر لو، بند کر لو اپنی
آنکھیں ..."

اور پھر ادیب اس کارل مارکس کی تصویر کی طرف مڑتا ہے:
"کان کھول کر سن لو، سماج کی یہ دیواریں کل بھی
تھیں، آج بھی ہیں اور کل بھی رہیں گی، ہو نہہ .....
کلاس لیس، سوسائٹی، یہ خواب تمہارے ساتھ گیا۔
آج بھی سچائی کے ماتھے پہ دھول اڑتی ہے نہ سمجھے
..... کہیں کچھ نہیں، ہاں کہیں کچھ نہیں ...."

"سحر ہونے تک" میں مزدوروں کے مسائل اور ان کی درد ناک
زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ اپنے غیر مربوط پلاٹ کی وجہ سے یہ
ڈرامہ نسبتاً کمزور ہے لیکن شیطان اور خضر کے مکالمے جاندار ہیں۔
کتاب میں زبان و بیان کی بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔
امید ہے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کے وقت ان پر نظر ثانی
کی جائے گی۔

بحیثیت مجموعی ظہیر انور کی کوشش قابل تحسین ہے۔ اور
"انگاروں کا شہر" ان کے درخشاں مستقبل کی ضمانت ہے۔

—— غلام رضوی گردش

نام کتاب: "عکس تخیل"

شاعر: کوثر سیوانی۔ ہاسپٹل روڈ۔ سیوان، بہار
قیمت: پندرہ روپئے
ملنے کا پتہ: ہاسپٹل روڈ۔ سیوان۔ بہار

"عکس تخیل" کوثر سیوانی کا شعری مجموعہ ہے، جو بہار
اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا ہے۔ کوثر
سیوانی نے عام فہم اور روزمرہ کے الفاظ میں روح فن پھونک کر
جاندار بنا دیا ہے جو قاری کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو جاتے ہیں۔
کوثر اپنی ذاتی زندگی کی ساری سچائیاں اور اچھائیاں اپنی شاعری میں
سموئے ہوئے ہیں۔ شاعری کو انھوں نے پیشہ کے طور پر نہیں اختیار
کیا۔ ان کی شاعری کا مقصد "وجدانی سرور" بخشنا ہے۔ اس لیے
ان کے مشاہدہ اور احساس کو خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا ہے۔
کوثر پر اقبال کے شعری آہنگ کا بھی گہرا اثر ہے۔ انھوں نے اپنی
نظموں میں قومی اور ملی جذبات کی ترجمانی بہت اچھی طرح کی ہے۔
وطن دوستی، قومی یکجہتی اور سماجی اصلاح کا جذبہ ان کی نظموں میں
بدرجہ اتم موجود ہے۔ انھوں نے قطعات بھی بڑے پر کیف کہے ہیں۔
نمونۂ کلام پیش خدمت ہے ؎

ناسور جو کرید سکے جسم قوم کا
احساس کی رگوں سے وہ نشتر تراشیے

جوش انا میں ظرف کا ساغر نہ پھینکیے
اپنے کو اپنے جسم سے باہر نہ پھینکیے

فطرت کے ناگہاں کبھی تیور جو چڑھ گئے
آغوش حادثات میں دنیا اتر گئی

بھول جائیں گے کانٹے بھی اپنی چبھن
ساتھ رہنا تو سیکھو کلی کی طرح

کتاب کی ظاہری صورت یعنی کاغذ اور کتابت و طباعت بھی بہت
اچھی ہے۔

—— (ڈاکٹر) خلیل اللہ خاں

نام کتاب: "اقبال - کچھ مضامین"

مرتب: خلیق انجم ، قیمت: پندرہ روپے
ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، راؤز ایونیو۔ نئی دہلی

"اقبال - کچھ مضامین" میں خلیق انجم صاحب نے موضوع کی
نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے پورے انصاف سے کام لے کر علامہ اقبال
سے متعلق گنجلک عقدوں کو وا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

"حرفِ آغاز" میں خلیق انجم صاحب کی اس رائے سے کوئی شخص انکار نہیں کرے گا کہ علامہ اقبال دنیا کے ان چند خوش نصیب شاعروں میں ہیں جن کے فن اور شخصیت پر بے شمار کتابیں شائع ہونے کے باوجود آج بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے پہلو اب بھی ایسے ہیں جن پر تحقیق ہوسکتی ہے اور بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ زیرِ تبصرہ مجموعہ مضامین اقبال کے فکر و فن اور شخصیت و حیات کے کچھ نئے پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی ایک قابلِ تحسین کوشش ہے۔

اقبال پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ انتہائی سودمند ثابت ہوگا۔ اس میں محمد عظیم فیروزآبادی کا مضمون کافی اہم ہے، جس میں اقبال کی ابتدائی زندگی اور ان کے آباو اجداد کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ حتیٰ کہ ان کے رہن سہن، کھانے پینے، نوکر چاکر اور فیملی ڈاکٹر تک کا ذکر موجود ہے۔ اسی مضمون کے سلسلے میں چند ممتاز خاتون ادیبوں مثلاً انیس قدوائی، صالحہ عابد حسین اور قرۃ العین حیدر کے تردیدی مضمون کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

اسی طرح قاضی عبدالغفار صاحب کا مضمون "پیامِ اقبال" یہ واضح کرتا ہے کہ اقبال کی شاعری میں تغزل بھی ہے اور ترنم بھی۔ شوکتِ الفاظ بھی ہے اور بلند خیالی و حقیقت بینی بھی۔

شیخ حبیب اللہ نے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ اقبال اور گوئٹے دونوں دانائے رموزِ کائنات ہیں، دونوں کا پیغام مردہ دلوں کے لیے آبِ حیات ہے۔ بڑے مدلل انداز میں اپنے مضمون "اقبال اور گوئٹے" میں یہ ثابت کردیا ہے، کہ اقبال کا کلام گوئٹے سے کہیں زیادہ بلند و بالا اور اعلا و ارفع ہے۔

ابراہیم اشک نے اپنے مضمون میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اقبال نے شاعر ہوکر اردو ادب کو ایک عظیم ڈرامہ نگار سے محروم کردیا۔ اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو یقیناً بہت کامیاب ڈرامہ نگار ہوتے اور بحیثیت ڈرامہ نگار شیکسپیئر سے بھی دو قدم آگے نکل جاتے۔

اقبال کی تاریخ گوئی کی خداداد صلاحیت کے چند نمونے پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالغفار شکیل نے اپنے مضمون "اقبال کی تاریخ گوئی" میں اقبال کی علمی استعداد، باریک بینی اور ذہن رسا پر روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور ڈاکٹر وزیر آغا کے مضامین بھی کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ عبدالقوی دسنوی نے "ہندستان میں اقبالیات" کے تحت اشاریہ سازی کا جو کام انجام دیا ہے وہ اقبال سے دلچسپی رکھنے والوں اور بالخصوص اقبال پر ریسرچ کرنے والوں کے لیے بے حد کارآمد ثابت ہوگا۔

سلطان خاں

نام کتاب: **گونگی توپ** (فلسطینی افسانے)

مترجم و مرتب: قطب اللہ / قیمت: پندرہ روپے

ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز۔ حیدری مارکیٹ، امین آباد۔ لکھنؤ

"گونگی توپ" ۱۳ فلسطینی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کہانیاں فلسطینیوں کی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ ان کہانیوں میں اس قوم کے تیور کی جھلک ملتی ہے جو عام انسانوں کی طرح آزادی و خود مختاری سے جینے کا حق مانگ رہی ہے۔ ان کہانیوں میں فلسطینیوں کے کرب و احساسات اور خودداری و خود اعتمادی کے جذبے کی بھرپور عکاسی ملتی ہے اس سلسلے میں مجموعہ کی پہلی کہانی "اصحابِ کہف" کا اقتباس دیکھیے:۔

"اس نے پھر اندھیرے میں ٹٹولا۔ خون! اُف غار بھر رہا ہے۔ وہ خون میں ڈوب کر دم نہ توڑ دے۔ اس نے اپنا دل ٹٹولنا شروع کیا۔ اپنی جگہ دل ٹھیک کام کر رہا تھا۔ لیکن اس میں یہ کیا ہے؟ ارے ایک چھوٹا سا سورج تو یہاں بھی موجود ہے۔ وہ خوشی سے ناچنے لگا، میرے دل میں... لوگو! سنتے ہو مجھے اب تمھاری خوشامد نہیں کرنی ہے۔ اب تو میں غاروں کے اندھیروں کو پی جاؤں گا، اس چنگاری سے تمھارے ہرے بھرے جزیرہ کو جلا سکتا ہوں۔"

محض اخبارات میں شائع ہونے والی کہانیوں پر اکتفا کرنے کے بجائے اگر اس سلسلے میں عربی کے اہم ادبی رسائل کا مطالعہ بھی کرلیا جاتا تو یہ مجموعہ اور بہتر نیز ایک نمائندہ مجموعہ ہوسکتا تھا۔

نہال الدین عثمانی

Vol. 38, No. 5
AUGUST, 1983
50 Paisa

Urdu Monthly

REGD. No. LW/NP-17
Annual Subs.
Rs. 5/-

NAYA DAUR

POST BOX No. 146 LUCKNOW-226001

جلد ۳۸ نمبر ۶
ستمبر ۱۹۸۳ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی
جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: گنگا دھر پرشاد شکلا
ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

پرنٹر: اشوک ڈر
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلیکیشنز، ڈپارٹمنٹ آف انفارمیشن، یو پی، لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

ملنے کا پتہ: نیا دور، پبلیکیشنز ڈپارٹمنٹ، یو پی، لکھنؤ

عنوانات

بہت بارش کے نتیجے میں اترپردیش اس سال بھی سیلاب کی تباہ کاریوں سے دوچار ہے۔ پچاس سے زیادہ اضلاع سیلاب زدہ قرار دیے جا چکے ہیں جن میں لکھنؤ بھی شامل ہے۔ کیونکہ گومتی کی سطح آب میں اضافہ ہو جانے کے سبب لکھنؤ کی آبادی کے ۱۰ مضافات بھی سیلاب کی لپیٹ میں آ گئے ہیں۔ اس طرح ان ۵۰ اضلاع کے ۲۰ ہزار ۵۰۰ گاؤں سیلاب کی مصیبت سے دوچار ہیں، جن سے ایک کروڑ ۲۰ لاکھ ۷۰ افراد متاثر ہوئے ہیں۔

اترپردیش کی ۱۲ لاکھ ۴۴ ہزار ہیکٹر اراضی سیلاب سے زیرآب ہے، جس میں ۱۹ لاکھ ۸۳ ہزار ہیکٹر اراضی پر فصلیں بوئی جا چکی تھیں۔ اس سیلاب سے ایک لاکھ ۲۷ ہزار مکانات کو نقصان پہنچا ہے اور ستمبر کی آخری تاریخوں میں حاصل ہونے والی اطلاعات کے مطابق سیلاب سے ۴۰۳ افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ اس مصیبت میں لوگوں کو راحت اور امداد مہیا کرنے کے سلسلے میں ریاستی حکومت پوری طرح کوشاں اور سرگرم عمل ہے۔ موٹر بوٹ اور کشتیوں کے ذریعہ سیلاب زدہ علاقوں میں (وہ چاروں طرف سے پانی سے گھرے ہوئے لوگوں کو راحت اور امداد پہنچائی جا رہی ہے۔ راحت رسانی اور امداد کی فراہمی کا کام جنگی پیمانے پر انجام دیا جا رہا ہے۔

وزیراعلا اترپردیش شری سری پت مشرا نے مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ اترپردیش کو پانچ ارب روپے کی رقم فراہم کی جائے۔ تاکہ سیلاب زدہ اضلاع کی فوری ضرورتیں پوری کی جا سکیں اور راحت رسانی نیز امداد مہیا کرنے کا جو کام جنگی پیمانے پر ہو رہا ہے، اس میں کسی طرح کی کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہونے پائے۔ (مرکزی حکومت نے پچاس کروڑ روپے کی امداد فوری طور پر مہیا کرنے کے لیے اپنی رضامندی ظاہر کر دی ہے)۔

وزیراعلا نے بجا طور پر کہا ہے کہ سیلاب سے ہونے والے نقصانات ابتدائی اندازے سے کہیں زیادہ ہوں گے۔

انھوں نے بتایا کہ سیلاب سے صرف فصلوں کو جو نقصان پہنچا ہے وہ تقریباً سات ارب روپے کا ہے۔ اس کے علاوہ ریاست میں ریلوے پلوں کو بھی نقصان پہنچا ہے اور ریل کی پٹریاں کٹ گئی ہیں۔ وزیراعلا شری سری پت مشرا نے اس سلسلے میں وزارت ریلوے سے بات چیت کی ہے۔ اس سیلاب سے ریاست کا بلیا ضلع سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے۔ چنانچہ بلیا کو اس تباہ کاری سے آئندہ محفوظ رکھنے کے لیے دریائے گھاگھرا پر پانی کی نکاسی کے لیے ایک ریگولیٹر بنانے کی اسکیم ہے۔ اور ترتی پار (چاند پور) کے قریب ایک فاضل باندھ کی تعمیر بھی زیر غور ہے۔

* نیا دور کے فراق نمبر کی اشاعت میں جتنا وقت لگ گیا، اس سے عام شماروں کی اشاعت میں بھی غیر معمولی تاخیر ہو گئی ہے۔ لیکن ہم پوری طرح کوشاں ہیں کہ آئندہ ماہ سے اس کی اشاعت معمول پر آ جائے۔ اس سلسلے میں ہمارے قارئین کو انتظار کی جو زحمت اٹھانا پڑ رہی ہے، اس کے لیے ہم ان سے انتہائی معذرت خواہ ہیں۔

[illegible]

کہ اشاعت [illegible] سے وابستہ ہیں، وہ بخوبی واقف ہیں کہ اس طرح کے ضخیم نمبروں کی اشاعت میں آنا وقت لگ جاتا ہے کیونکہ نمبروں کے لیے [illegible] اور تخلیقات حاصل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ جتنا کہ سمجھا جاتا ہے لیکن بہرحال فراق نمبر کی جو پذیرائی ہوئی اور ہو رہی ہے۔ وہ ہمارے لیے بہت حوصلہ افزا ہے۔

اس سلسلے میں ہمیں تعریفی خطوط برابر موصول ہو رہے ہیں جس کے لیے ہم اپنے قارئین اور معاونین کے شکرگزار ہیں۔

فراق نمبر حصہ دوم فراق صاحب کی برسی کے موقع پر شائع کرنے کی تجویز ہے۔

نیا دور کے اس خصوصی نمبر کو بھی فراق صاحب کے شایان شان شائع کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔

— ایڈیٹر

غلام ربانی تاباں

دریا تھا یا سراب دھندلکوں میں کھو گیا
اک آسرا تھا وہ بھی سرِ شام سو گیا

پھر یوں ہوا کہ پھول کھلے دل کے آس پاس
ایسا لگا کہ دشت چمن زار ہو گیا

موجوں کا اضطراب بھی تھا، ناخدا بھی تھا
اب کیا بتائیں کون سفینہ ڈبو گیا

دیوار و در پہ لکھی ہیں کتنی کہانیاں
صدیوں کا درد شہر کی پہچان ہو گیا

لگتا ہے صحنِ باغ میں رقصِ شرر کے بعد
ہر مرحلہ بہار کا آسان ہو گیا

تاباںؔ شراب خانے میں کچھ روشنی تو ہے
مسجد بھی سو گئی ہے شوالا بھی سو گیا

فضا ابنِ فیضی

سب ترے شہر میں ہیں دیدہ وری کا پتھر
کس سے اٹھتا مری سادہ ہنری کا پتھر

دھند میں ڈوب گیا، سامنے جو کچھ بھی تھا
آنکھیں چہرے پہ ہیں یا بے بصری کا پتھر

چوٹ کھا جاؤ گے، آساں نہیں تہذیبِ انا
لو، سنبھالو یہ مری خود نگری کا پتھر

ایک دن ہے مجھے سرمایۂ خوشبو ہونا
چن رہا ہوں ابھی بادِ سحری کا پتھر

کس قدر اس کے بچھڑنے سے میں ہلکان ہوا
اب کہاں دوش پہ وہ ہمسفری کا پتھر

ہر دعا اپنی جگہ بے اثری کی فریاد
ہر شجر اپنی جگہ بے ثمری کا پتھر

شیشہ شیشہ، وہی آوارہ نگاہی کا غبار
تیشہ تیشہ وہی شوریدہ سری کا پتھر

چاہتا میں بھی ہوں، تجھ سے کبھی ملنے آؤں
راستے سے تو ہٹے دربدری کا پتھر

منضمن ہو گئے غالبؔ کے قوی بھی اے فضاؔ
کس سے اٹھتا یہ تری نکتہ وری کا پتھر

مشتاق الحق عمر [?]

اُردو میں ہندی سے ترجمہ کرنے کے مسائل

ترجمے کی افادیت ایک مسلمہ امر ہے اور اس کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ اُردو کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ اپنی چھوٹی سی عمر ہی میں اس نے دوسری زبانوں کے جواہر پاروں سے اپنے خزانے کو مالا مال کر لیا ہے۔ عربی اور فارسی سے تو بہ کثرت ترجمے ہوئے ہی، اٹھارویں صدی کے نصف اول سے انگریزی زبان کی بعض کتابوں کے بھی ترجمے ہونا شروع ہو گئے۔ انیسویں صدی میں ان کی رفتار بڑھی اور بیسویں صدی میں تو مختلف زبانوں سے مختلف اصناف ادب ہی کے اُردو ترجمے نہیں ہوئے بلکہ سائنس اور دیگر علوم و فنون کی کتابوں کو اُردو کا جامہ پہنایا گیا۔ ہندوستان میں پائے جانے والے ہر مذہب کی کتب مقدسہ کے بھی اُردو تراجم ہوئے، نظم میں بھی اور نثر میں بھی۔ ان کے علاوہ کالی داس وغیرہ کے سنسکرت ڈراموں کے ترجمے اور وہ بھی منظوم، کثرت سے ہوئے اور آج بھی ہو رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان تمام کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کرنے میں مترجموں کو دقتیں درپیش ہوئی ہوں گی، جیسا کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے والے ہر مترجم کو پیش آ سکتی ہیں اور آتی ہیں۔ لیکن ترجمے ہوئے اور ترجموں میں پیش آنے والی دقتوں پر بھی غور کیا گیا۔ مختلف حضرات نے تراجم کے سلسلے میں مضامین لکھے، ترجمے کا مقصد بتایا اور ترجمہ کرنے کے کچھ اصول بھی بتائے۔ لیکن مغرب میں ترجمے کے فن اور ترجمے کے مسائل پر جتنا غور کیا گیا اور جتنی کتابیں لکھی گئیں اتنی محنت اور توجہ اُردو میں ترجموں کے بارے میں نہیں کی گئی۔ نہ کوئی مبسوط کتاب ہی لکھی گئی اور نہ ترجمے کے کچھ خاص اصول وضع کیے گئے۔

حصول آزادی اور ہندی کو سرکاری زبان قرار دیے جانے کے بعد ہندی سے اُردو میں اور اُردو سے ہندی میں ترجمہ کرنے کی ایک نئی تحریک شروع ہوئی۔ یہ تحریک اتر پردیش میں خاص طور سے نمایاں ہے۔ ادبی کتابوں کے ترجموں کے علاوہ، ایک نیا سلسلہ حکومت کی نصابی کتابوں اور ہندی گزٹ کے اُردو ترجموں کا شروع ہوا ہے۔ حکومت کے کم سے کم دو محکمے ایسے ہیں جن میں ہندی سے اُردو میں ترجمے ہو رہے ہیں۔ ان میں سے ایک محکمہ ہے اطلاعات و رابطۂ عامہ یعنی انفارمیشن ڈپارٹمنٹ کا اور دوسرا ہے بھاشا وبھاگ یا لینگویج ڈپارٹمنٹ۔ انفارمیشن ڈپارٹمنٹ میں سرکاری سرگرمیوں کی خبروں کا اصل ہندی سے اُردو میں ترجمہ کر کے اُردو اخباروں کو بھیجا جاتا ہے اور کبھی کبھی ان سرگرمیوں کے بارے میں کتابچوں یا پمفلٹوں کا ہندی سے اُردو میں ترجمہ کیا جاتا ہے۔ بھاشا وبھاگ کے صیغۂ اُردو کا خاص کام ہندی گزٹ کا اُردو ترجمہ کر کے اسے شائع کرانا ہے۔ میں یہاں ایسے ہی سرکاری ترجموں کے بارے میں بہت مختصر طور سے کچھ عرض کروں گا۔

تقریباً چھ سات سال ہوئے جب سرکاری طور پر اتر پردیش اُردو اکادمی کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ چھٹے، ساتویں اور آٹھویں درجات میں پڑھائی جانے والی منظور شدہ تمام کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کرایا جائے۔ ہندی میں یہ کتابیں نظامت تعلیمات نے تیار کرا کے شائع کی تھیں مگر چونکہ زبان کے علاوہ دوسرے مضامین پڑھانے کی اُردو کتابیں ہی موجود نہ تھیں اس لیے پہلے درجے سے آٹھویں درجات تک بچوں کو اُردو میڈیم یا اُردو ذریعۂ تعلیم سے پڑھنے کی سہولتیں حاصل نہ تھیں۔ غیر سرکاری اسکولوں میں وہ اُردو میڈیم سے پڑھتے بھی تھے تو غیر منظور شدہ کتابوں

کے ذریعے۔ بہرحال جب یہ طے کیا گیا کہ چھٹے درجے سے آٹھویں درجے تک ہر مضمون کی منظور شدہ سرکاری کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرد یا جائے تو دوسرے مضامین کی کتابیں آسانی سے اردو میں منتقل ہو گئیں لیکن چھٹے، ساتویں، آٹھویں درجات میں جغرافیہ اور سائنس کی کتابوں کا ترجمہ کرانے میں کچھ مشکلیں پیش آئیں۔

پہلی مشکل یہ مسئلہ تھا کہ جغرافیہ کی کتابوں کا ترجمہ ان حضرات کو سونپا جائے جن کا کم سے کم بی۔ اے کے درجات میں جغرافیہ ایک مضمون رہا ہو۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ جغرافیہ کی ہندی اور اردو اصطلاحات دونوں سے وہ واقف ہوں ورنہ وہ اصطلاحی الفاظ کا اردو میں صحیح ترجمہ نہ کر پائیں گے۔ جغرافیہ کی اردو اصطلاحات سے عدم واقفیت کے نتیجے میں ممکن ہے ان اصطلاحات کا کیا نیا ترجمہ ہو جائے جو ممکن ہے غلط ہو۔ خوش قسمتی کی بات ہے کہ ایسے حضرات کا پتہ چل گیا اور جغرافیہ کی کتابوں کا صحیح اور اچھا ترجمہ ہو گیا۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر چالیس پچاس برس بعد جغرافیہ کی کچھ اعلیٰ سطح کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا جائے تو ایسے حضرات مل سکیں گے جو ان کا ترجمہ کر سکیں اور ہندی الفاظ کی جگہ صحیح اردو مترادفات لکھ سکیں۔؟

سائنس کی کتابوں کے ساتھ یہی مسئلہ درپیش ہوا۔ سائنس کی ہندی کتابوں میں سائنسی اصطلاحات صرف ہندی زبان میں لکھی ہوئی تھیں۔ ہمارے مترجموں کے سامنے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ ان اصطلاحات کا صحیح اردو ترجمہ بھی کیا جائے اور اس کا بھی خیال رکھا جائے کہ جب چھٹے ساتویں اور آٹھویں درجوں میں اردو میڈیم سے پڑھا ہوا سائنس کا طالب علم آگے کے درجات اور یونیورسٹی میں پہنچے گا تو اسے سائنس کی انگریزی اصطلاحات بھی معلوم ہوں اور ہندی اصطلاحات بھی تاکہ اسے اگر ہندی یا انگریزی زبان میں سائنس پڑھنا پڑے تو وہ ان اصطلاحات سے واقف ہو ورنہ وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکے گا۔ خوش قسمتی سے سائنسی کتابوں کے یہ مترجم حضرات تینوں زبانوں سے بخوبی واقف تھے پھر بھی ہندی اصطلاحات کے مقابلے میں تسلیم شدہ اردو اصطلاحات درج کرنے میں انھیں دارالترجمہ حیدرآباد اور ترقی اردو بورڈ کے وضع کیے ہوئے اصطلاحات سے استفادہ کرنے کے علاوہ اپنی دماغی اپج سے کام لینا پڑا اور اردو کی ان سائنسی کتابوں کی تیاری میں انھوں نے احتیاطاً اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں کے اصطلاحات لکھ دیے لیکن یہاں پھر یہی مسئلہ سامنے آتا ہے کہ نوجوان نسل میں اس وقت تک تو ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو تینوں زبانوں سے واقف ہیں، نفس مضمون سے واقف ہیں اور ہندی سے اردو ترجمہ بخوبی کر سکتے ہیں۔ لیکن کیا چالیس پچاس سال کے بعد بھی ایسے لوگ مل سکیں گے۔؟

ترجمہ خواہ ادبیات کا ہو یا فلسفے کا یا سائنس کا مترجم کو صرف دونوں زبانوں اور ان کے مزاج و تہذیب سے اچھی طرح واقف ہونا ضروری ہے بلکہ اردو پر اسے اتنا عبور ہونا چاہیے کہ وہ صحیح مترادفات پیش کر سکے۔ مگر صورت یہ ہے کہ اردو پڑھنے والے کم ہوتے جا رہے ہیں اور ان کا تعلیمی معیار بھی گرتا جا رہا ہے۔ وہ زمانہ اب نہیں رہا جب انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے والے انگریزی کے علاوہ مقابلے کے عربی اور فارسی الفاظ سے بھی واقف ہوتے تھے۔ اب انگریزی میں لکھی ہوئی تنقید یا فلسفے وغیرہ کے مترادف اور برمحل الفاظ سے لوگ کم واقف ہوتے جاتے ہیں۔ اندیشہ ہے کہ ایک زمانہ ایسا نہ آجائے جب انگریزی تو انگریزی اردو موضوعات کی ہندی کتابوں کا بھی اردو میں صحیح ترجمہ نہ ہو سکے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو میرے خیال میں نظرانداز نہ کرنا چاہیے۔ ہمیں آج کی نہیں پچاس برس آگے کی بات سوچنا ہے۔

اب سرکاری پریس نوٹوں کی سنیے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ ہندی اخبارات میں جو خبریں بالخصوص کسی کی تقریر شائع کرتے ہیں یا جو پریس نوٹ محکمہ اطلاعات کی جانب سے شائع ہوتے ہیں ان کی عبارت کا انداز انگریزی انداز کی ہوتی ہے۔ نمونے کے طور پر کسی وزیر کی تقریر کے بارے میں خبر کی عبارت سنیے :۔۔۔۔۔

दिनांक 20 जून को सचिवालय के
तिलक हाल में आयोजित विभागीय
सचिवों एवं मंडलों के आयुक्तों
की एक बैठक में मुख्य मंत्री द्वारा
दिये गये एक भाषण में इस बात
पर बल दिया गया कि

(جو تک ۲۰ جون کو سچیوالیے کے تلک ہال میں آیوجت ویبھاگیے سچیووں ایوم منڈلوں کے آیکتوں کی ایک بیٹھک میں مکھیہ منتری دوارا دیے گئے ایک بھاشن میں اس بات پر بل دیا گیا کہ .....")

میں اگر اس کا بالکل لفظی ترجمہ کیا جائے تو کچھ اس قسم کا

بتاریخ ۲۰ جون، سکریٹریٹ کے تلک ہال میں منعقدہ محکمہ جاتی سکریٹریوں اور ڈویژنوں کے کمشنروں کی ایک نشست میں وزیر اعلیٰ کے ذریعہ کی گئی ایک تقریر میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ..."

ظاہر ہے کہ یہ لفظی ترجمہ اُردو کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اُردو کی تہذیب سے ملتا ہوا ترجمہ کچھ اس طرح کا ہوگا۔

"محکمہ جاتی سکریٹریوں نیز ڈویژنوں کے کمشنروں کے ایک جلسے میں، جو سکریٹریٹ کے تلک ہال میں ۲۰ جون کو منعقد ہوا تھا، وزیر اعلیٰ نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ ....."

انگریزی یا دوسری مغربی زبانوں سے اُردو ترجمہ کرنے کے مقابلے میں ہندی سے اُردو میں ترجمہ کرنا یقیناً آسان ہے۔ لیکن اوپر کی مثال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آسان سے آسان ہندی کا اُردو میں ترجمہ کرنے کے لیے غور ضرور کرنا پڑتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندی جملوں کی ترکیب اور ساخت اُردو سے مختلف ہے۔ اسی ترجمے کو دیکھ کر ایک اور مسئلہ یہ سامنے آتا ہے کہ ہندی الفاظ مثلاً سچیوالیے، منڈل، آیکت وغیرہ کا ترجمہ کرتے وقت انگریزی کے الفاظ رکھے جائیں یا بجنسہ ہندی کے لفظ رہنے دیے جائیں یا ان کا بھی فارسی آمیز اُردو میں ترجمہ کیا جائے؟ عام طور سے اُردو میں ابھی تک ایسے ہندی ناموں کی جگہ انگریزی کے پُرانے نام یعنی سکریٹری، ڈویژن، کمشنر وغیرہ لکھے جاتے ہیں۔ اسمبلی کو "ودھان سبھا" نہیں بلکہ اسمبلی ہی کہا جاتا ہے "کھنڈ وکاس ادھیکاری نہیں" بلاک ڈیولپمنٹ آفیسر ہی لکھتے ہیں یہاں تک کہ بھاشا وبھاگ کے صیغہ اُردو میں بھی یہی الفاظ رائج ہیں کیونکہ اُردو والوں کے کان "سچیو" کے مقابلے میں سکریٹری "سچوالے" کے مقابلہ میں سکریٹریٹ وغیرہ ہی سے آشنا ہیں۔ ہمیں یہ سوچنا ہے کہ اُردو ترجموں میں ایسے الفاظ یا عہدوں کے نام انگریزی کے مطابق لکھے جائیں، یا ہندی کے مطابق یا اُردو کے نئے ناموں سے انھیں یاد کیا جائے؟ کسی انجمن کے سکریٹری کو اکثر "معتمد" لکھ دیا جاتا ہے لیکن کیا حکومت کے سکریٹری یا سچیو کے لیے "معتمد" لکھنا مناسب ہوگا؟ میرے خیال میں نہیں۔ پھر سچیو کو سکریٹری لکھا جائے تو کیوں؟ سچیو کو سچیو ہی کیوں نہ کہا جائے؟

ہندی میں سرکاری طور سے بھی جو خبریں تیار کی جاتی ہیں ان میں اکثر اوقات پورا فعل نہیں لکھا جاتا۔ شلاً محکمۂ اطلاعات اتر پردیش کے ایک ہندی پریس نوٹ مورخہ ۲۲ جون ۱۹۸۲ء کا ایک جملہ یہ ہے:-

"सार्वजनिक निर्माण मंत्री ..... ने आज यहां जारी एक वक्तव्य मे कहा है कि ....."

اب اُردو میں ترجمہ کرتے وقت "جاری ایک بیان میں" نہیں کہا جا سکتا اس جملے کا اُردو ترجمہ اس طرح کیا جائے گا:-

"وزیر تعمیرات عامہ ..... نے ایک بیان میں، جو آج جاری کیا گیا ہے، کہا ہے کہ ....."

اس مثال کو پیش کرنے سے میرا مقصد یہ دکھانا ہے کہ ہندی سے اُردو ترجمہ کرنے والے کو ان دونوں زبانوں کے مزاج اور ترکیب سے اسی طرح آشنا ہونا چاہیے جس طرح ابھی تک انگریزی سے اُردو ترجمہ کرنے والوں کو انگریزی اور اُردو دونوں کے مزاج سے آشنا ہونا ضروری تھا مگر اب تو یہ رواج اُردو میں بھی چل پڑا ہے۔ اُردو کے ایک اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ "سیتا پور سے آئے ایک صاحب یہاں پہنچے۔ یعنی اُردو میں بھی "آئے ہوئے" یا "آنے والے" نہیں لکھا گیا۔

حکومت اتر پردیش کے بھاشا وبھاگ کے صیغۂ اُردو ("انو بھاگ" کا ترجمہ یہاں "صیغہ" کیا گیا ہے) کا خاص کام ہفتے وار ہندی گزٹ کا اُردو میں ترجمہ کر کے اُردو گزٹ کے نام سے اسے شائع کرنا ہے۔ ہندی گزٹ کئی سو صفحات پر مشتمل ہوتا ہے اور اس میں ایک لاکھ سے زیادہ

الفاظ ہوتے ہیں۔ صیغۂ اُردو میں اس وقت صرف سات مترجم کام کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سات آدمی ایک لاکھ سے زیادہ الفاظ کا ترجمہ ایک ہفتہ میں نہیں کر سکتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اُردو گزٹ، ہندی گزٹ کے مقابلے میں مہینوں پچھڑا ہوا ہے۔ پھر بھی صیغۂ اُردو میں گوٹ کے تقریباً چھ سات ہزار الفاظ کا ترجمہ روزانہ ہو رہا ہے۔ ان مترجموں کو سب سے زیادہ دقت اصطلاحات کا ترجمہ کرنے میں ہوتی ہے۔ بھاشا وبھاگ نے ہندی انگریزی میں ایک لغت " شاسن شبداولی " ۱۹۷۰ء میں شائع کی تھی۔ اس میں ہندی اور انگریزی کے مترادفات مل جاتے ہیں۔ لیکن اُردو کے نہیں۔ اس لیے اُردو مترجموں کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ پہلے وہ ہندی لفظ کا انگریزی مترادف دیکھتے ہیں اور پھر اس انگریزی لفظ کا اُردو مترادف۔ ایک اور دقت یہ ہے کہ اُردو ۔ انگریزی ڈکشنری شائع کردہ انجمن ترقی اُردو اور بعض دوسری ڈکشنریاں پرانی ہو چکی ہیں اور وہ آج کی ضرورتیں پوری نہیں کرتیں۔ بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو ان ڈکشنریوں میں نہیں پائے جاتے۔ بعض الفاظ کا ترجمہ ایک لفظ یا مرکب الفاظ میں نہیں کیا گیا ہے بلکہ پورے جملوں میں ان کی تشریح کی گئی ہے۔ اس طرح ایسے الفاظ کا مطلب تو سمجھ میں آجاتا ہے لیکن ترجمے کے لیے لفظ نہیں ملتا۔

دفتروں میں استعمال ہونے والے ایسے متعدد الفاظ ہیں جن کا انگریزی سے ہندی میں ترجمہ ہو گیا ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ ہندی ترجمہ اچھا ہے یا نہیں مگر وہ موجود ہے۔ اُردو میں ایسے الفاظ کا ترجمہ عام نہیں ہوا ہے مثلاً — Dead Language کا ہندی ترجمہ मृत भाषा ہے اور اُردو میں " مُردہ زبان "۔ لیکن ایک اور اصطلاح ہے :— Dead Account. اس کا ہندی ترجمہ मृत लेखा کر دیا گیا ہے۔ اُردو میں اسے کیا کہیے گا۔؟ " مُردہ اکاؤنٹ " یا " مُردہ حساب کتاب " ؟ کیا یہ مناسب ترجمہ ہوگا؟ اسی طرح ایک اور لفظ ہے Earned Leave. ہندی میں اسے अर्जित अवकाश (اَرجت اوکاش) کہا جاتا ہے۔ اُردو میں اکتسابی رُخصت اور استحقاقی رُخصت تک کہا جاتا ہے۔ میرے خیال میں — Earned Leave — کے لیے کوئی خاص اُردو ترجمہ ابھی تک عام نہیں ہوا ہے۔ اسی طرح بلاک ڈیولپمنٹ آفیسر (Block Development Officer) کو ہندی میں " کھنڈ وکاس ادھیکاری " (खंड विकास अधिकारी) کہا جاتا ہے۔ اُردو میں کیا کہا جائے۔؟ انگریزی نام ہی سے یاد کیا جائے یا ہندی نام سے؟ اُردو میں عام طور سے " بلاک ڈیولپمنٹ آفیسر " ہی لکھا جاتا ہے مگر یہ کیوں لکھا جائے۔؟ ہندی کا نام لکھا جائے تو شاید اُردو والے سمجھ نہ سکیں۔ لیکن خالص اُردو میں اس کا کوئی ترجمہ کیا جائے تو دوسرے تو الگ رہے شاید اُردو والے بھی نہ سمجھیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ایسے الفاظ کا ترجمہ کیا کیا جائے اور ایسے عہدوں کا اُردو میں ترجمہ کرتے وقت ان کا ہندی نام لکھا جائے یا انگریزی۔؟

یہ تو سرکاری ترجموں کی بات ہوئی۔ دوسرے موضوعات پر ہندی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کے مسائل پر میں زیادہ نہیں کہنا چاہتا۔ میں صرف یہ عرض کروں گا کہ آزادی سے پہلے تو ہندی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کی اتنی ضرورت نہیں سمجھی گئی لیکن بدلے ہوئے حالات میں، جب کہ ہندی ادب میں کافی اضافہ ہو رہا ہے، ضرورت ہے کہ ہندی کی اہم کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کیا جائے۔ لیکن اس سلسلے میں ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوگا کہ پہلے تو اچھی انگریزی اور اچھی اُردو بلکہ فارسی، عربی جاننے والے حضرات انگریزی سے ترجمہ کر لیتے تھے لیکن ہندی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کے لیے انگریزی سے کہیں زیادہ ہندی بلکہ سنسکرت جاننا اور ان دونوں زبانوں کے مزاج سے آشنا ہونا ضروری ہے۔ ساتھ ہی فارسی اور عربی سے بھی، تاکہ مشکل موضوعات مثلاً فلسفہ وغیرہ کی ہندی کتابوں کا اچھا ترجمہ ہو سکے۔ صورت یہ ہے کہ اچھے ہندی داں تو ہماری نوجوان نسلوں میں مل جائیں گے لیکن وہ عربی فارسی سے کس قدر واقف ہیں یہ ٹیڑھا سوال ہوگا اور میرے خیال میں اگر یہ نوجوان عربی فارسی سے زیادہ واقف نہیں تو ممکن ہے کہ بعض موضوعات کی کتابوں کو ہندی سے اُردو میں منتقل کرنے میں ترجمے کا حق ادا نہ کر سکیں —— یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر اُردو کے اربابِ فکر کو غور کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

★

تسنیم فاروقی

۲۰ نُکتے

چراغوں سے وطن کو جگمگانے کا زمانہ ہے
اجالوں کو اندھیروں سے ملانے کا زمانہ ہے
کسانو نوجوانو مقاصد سنت کرو اٹھو
یہ ہاتھوں کا مقدر آزمانے کا زمانہ ہے

وہ جن کی محنتوں سے دوسرے پھل توڑ لیتے تھے
نجات ان کو غریبی سے دلانے کا زمانہ ہے
کبھی جو ہند کے نقشے پہ کچھ خونیں لکیریں تھیں
ہمیشہ کے لیے ان کو مٹانے کا زمانہ ہے

جو سچ پوچھو تو اب حاصل ہوئی ہے کامل آزادی
جو رنجیدہ تھے ان کے مسکرانے کا زمانہ ہے
زمینیں تنگ تھیں جن پر ملے گی اب زمیں ان کو
جو بے گھر تھے یہ ان کے گھر بسانے کا زمانہ ہے

مسائل بنکروں کے ہوں کہ وہ کپڑے کی صنعت ہو
امور دستکاری کو بڑھانے کا زمانہ ہے
وہ ہر منصوبۂ تعمیر میں اب مشترک ہوں گے
یہ مزدوروں کو ان کا حق دلانے کا زمانہ ہے

رہِ تعلیم میں ہر قسم کی آسانیاں ہوں گی
یہ عہدِ علم ہے پڑھنے پڑھانے کا زمانہ ہے
گئے وہ دن کہ ناکافی تھی پیداوار بجلی کی
یہ برق و نور کی بزمیں سجانے کا زمانہ ہے

زراعت کر کے بھی جو فصلِ گندم کو ترستے تھے
انھیں ہر غم سے چھٹکارا دلانے کا زمانہ ہے
سماجی طور پر اب تک جو کچھ کمزور طبقے تھے
انھیں شائستہ کرنے اور سکھانے کا زمانہ ہے

قریۂ شاہراہوں پر جو تھا رسل و رسائل کا
اسے کچھ قاعدوں سے قومیانے کا زمانہ ہے
جہاں ویرانیوں کا رقص تھا اب ان زمینوں پر
نئے پودے نئی فصلیں اگانے کا زمانہ ہے

جو قیمت کم دکھائیں اپنی شہری جائدادوں کی
سزا اُن جرم والوں کو دلانے کا زمانہ ہے
کسی زردار کا قیدی نہ ہوگا کوئی محنت کش
یہ سب کو ایک ہی منزل پہ لانے کا زمانہ ہے

جو اسمگلنگ سے ملک و قوم کو نیلام کرتے ہیں
نقابیں ان کے چہروں سے ہٹانے کا زمانہ ہے
قلم کارو ادیبو شاعرو محرومِ فنکارو
تمہارا بھی سنہری وقت آنے کا زمانہ ہے

معاشی انقلاب آیا ہے دھرتی پر گلابوں کی
خبر کر دو کہ جشنِ گل منانے کا زمانہ ہے
ہمارا فرض ہے تسنیمؔ مٹی سے وفا کرنا
یہ ہے دورِ عمل کچھ کر دکھانے کا زمانہ ہے

حالی بڑے ہی سادہ مزاج اور سادگی پسند انسان تھے۔ ان کی نظم ہو یا نثر، دونوں میں ان کی یہ روش نمایاں نظر آتی ہے۔ جذبہ کا خلوص ان کی ہر تحریر میں نمایاں ہے۔ جذبہ کے خلوص اور صداقت ہی کو وہ شاعری کی جان سمجھتے تھے۔ دل سے نکلی ہوئی بات دل پر اثر کرتی ہے اور اسی کے بھرپور نمونے ان کی شعری اور نثری تصنیفات میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔

خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء کو پانی پت (ہریانہ) میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۴ء میں اس دار فانی سے رحلت کی۔ انھوں نے اپنے وطن ہی میں رواج زمانہ کے مطابق ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ اعلا تعلیم کے حصول کے لیے دہلی کی سکونت اختیار کی۔ دہلی آنے سے پہلے ہی ان کی شادی ہو چکی تھی اور گھر والے چاہتے تھے کہ وہ اب نوکری کریں اور کسب معاش کا ذریعہ پیدا ہو۔ مگر حالی کو تو تحصیل علم کی لگن تھی۔ گھر والوں سے روپوش ہو کر دہلی چلے آئے۔ دہلی کے مختصر سے زمانہ قیام میں اعلا تعلیم کے مدارج طے کیے۔ وہاں انھیں مرزا غالب سے فیض اٹھانے کا بھی موقع ملا۔ کچھ عرصہ بعد دہلی سے پانی پت واپس گئے اور ۱۸۵۶ء میں کلکٹر حصار کے دفتر میں ملازمت کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے زمانہ میں وہاں کے حالات خراب ہوئے تو پھر پانی پت چلے آئے اور تقریباً چار سال وہیں رہے۔ اس پوری مدت میں تحصیل علم سے کبھی غافل نہیں رہے۔ تفسیر، حدیث، منطق، فلسفہ وغیرہ علوم کی بلند پایہ کتابیں پڑھیں اور علم ادب کا خاص طور پر مطالعہ کیا۔

کسب معاش کے لیے پھر وطن سے نکلے تو نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، رئیس جہانگیر آباد سے شناسائی پیدا ہو گئی اور تقریباً آٹھ سال تک انھی کے مصاحب کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہے۔ شیفتہ نہ صرف علوم اسلامیہ میں تبحر رکھتے تھے بلکہ فارسی اور اردو کے اچھے شاعر تھے اور ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ شیفتہ کی صحبت میں رہ کر حالی کا مذاق شاعری نکھرا، ذوق تنقید ابھرا اور ان کی خداداد ادبی صلاحیتوں پر جلا ہو گئی۔ دبی ہوئی چنگاریاں ہوا لگتے ہی بھڑک اٹھیں۔

شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں انھیں ایسی ملازمت مل گئی جس میں انھیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی عبارتوں کی تصحیح کرنا ہوتی تھی۔ یہ کام بھی ان کے ذوق کا تھا کیونکہ اس طرح ایک طرف تو انھیں مطالعہ کتب کا موقع ملا اور دوسری طرف اسی بنا پر کچھ انگریزی ادب سے بھی واقفیت ہو گئی۔ لاہور ہی کے زمانۂ قیام میں انھوں نے مولانا محمد حسین آزاد کے قائم کردہ ایسے مشاعروں میں شرکت کی جس میں مصرع طرح کے بجائے مختلف عنوانات پر نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ حالی نے بھی وہاں متعدد ایسی نظمیں کہیں جو اردو ادب میں اپنی سادگی، روانی، موضوعات اور خیالات کے لحاظ سے بڑی اہم سمجھی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم یوں رقمطراز ہیں:

> "اردو شعر و ادب کو قومی شاعری، تنقید نگاری اور سوانح نویسی سے متعارف کرانے کا سہرا حالی کے سر ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اردو میں جدید نظم کی ابتدا لاہور میں سرکاری تحریک و سرپرستی میں غالباً ۱۸۷۴ء میں ہوئی اور حالی نے اس طرح کی نظم نگاری میں حصہ لیا۔ یہاں ان کی وہ شاعری خصوصیت کے ساتھ مدنظر ہے جو ہمارے ملی اور قومی عروج و زوال کی تفسیر ہے اور اسلامی اقدار اعلیٰ کے حصول و حمایت کی تلقین کرتی ہے۔" [۵۲]

حالی کی شاہکار نظموں میں "مرثیۂ غالب" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جس نے اردو ادب میں 'مرثیہ نگاری' کے لیے نئی راہ متعین کی۔ بقول رشید احمد صدیقی:-

> "حالی نے غالب کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ مرثیہ حالی، غالب اور دہلی پر آخری نقطہ ہے۔ شرافت و انسانیت اور صبر و سکوت کے حالی کو میں نے اس طرح بے اختیار و بے قرار ہوتے کبھی نہیں پایا جب کبھی اس مرثیہ کو پڑھتا ہوں تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے غالب کی وفات نے حالی کی تمام خفیہ و خوابیدہ صفات کو جنھیں حالی کبھی ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے، دفعتہً اس دھاکے سے ہر طرف بکھیر دیا ہو جیسے بڑی طاقتور

بار سے بھری ہوئی کوئی سرنگ پھٹ جائے۔ اس مرثیہ میں حالی نے اپنے کرب کا اظہار الفت وعقیدت وافتخار کے ان تمام رشتوں سے ٹوٹنے سے کیا ہے جن سے حالی جیسا انسان ملک، معاشرہ، خاندان، اشخاص اور اقدار سے اپنے آپ کو وابستہ سمجھتا تھا۔ حالی کا "مرثیہ غالب" اور اقبال کی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" ایسی نظموں کی یاد دلاتے اور نمونے پیش کرتے ہیں جہاں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مرحوم کی مفارقت کے کرب کے سوا مرحوم نے کوئی اور وسیلۂ اظہار مثلاً زبان وبیان، صنائع وبدائع، صوت وصورت نقل وحرکت اختیار کیا ہو۔ اظہار وابلاغ کی کامیابی کی یہ معراج ہے۔ فن کا کمال ہی یہ ہے کہ فن کے سارے وسائل کام میں لائے گئے ہوں لیکن ان میں ایک بھی توجہ پر بار نہ ہو۔ مرثیہ نگاری کی انجیل میں یہی ہدایت ملے گی اور مرثیہ کی برتری اور بقا اسی میں مضمر ہے۔[۲۲]

سرسید کی قومی تحریکات میں حالی ان کے سرمایۂ کار اور بے حد معاون رہے۔ انھوں نے سرسید کی اصلاحی اور علمی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حالی نے اس عظیم الشان مہم کو سر کرنے کے لیے قلم کے میدان کو سنبھالا اور اپنی تحریروں کے ذریعہ قوم کی اصلاح کے ساتھ شعر وادب کی اصلاح کا بھی مہتم بالشان کام انجام دیا۔ وہ زمانے کی ناسازگاری اور قوم کی بدحالی پر صرف ماتم نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کی درستی کی بھی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اسلام کے شاندار اور زرّیں ماضی نیز اپنے محترم اسلاف کی بلند اور پاکیزہ روایات کے تحفظ کی کوشش کی۔ ان کے نزدیک قوم کی بہت سی مصیبتوں کا تدارک اسی طرح ممکن تھا۔ وہ ماضی کی عظمت رفتہ کی روشنی میں مستقبل کو دیکھتے تھے اور حال کو سدھارنے کی جدوجہد کرتے تھے۔

اُردو کے بلند پایہ نقاد اور صاحب قلم انشاپرداز پروفیسر رشید احمد صدیقی ان کے عظیم کاموں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"حالی اپنی شاعری میں اسلاف اور ان کے کارناموں ہی کا واسطہ نہیں دیتے بلکہ ہندوستان اور اس میں رہنے بسنے والے جس پستی اور غفلت کے شکار نیز بدلے ہوئے حالات میں زندگی اور زمانے کے جن مصائب ومطالبات سے دوچار یا غافل تھے، ان سے بھی عہدہ برآ ہونے کا راستہ دکھانے اور حوصلہ دلاتے ہیں۔ حالی نے مسلمانوں کو "مسدس حالی" اور "شکوۂ ہند" میں ان کا ماضی یاد دلانے کے علاوہ اپنی دوسری نظموں، تحریروں اور تقریروں میں حال کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی جس دل سوزی اور دلیری سے تلقین کی ہے، ان کے عہد کے کسی دوسرے شاعر نے نہیں کی۔"[۲۳]

"مسدس حالی" کی زبان، طرز بیان اور مضمون اتنا دلکش اور پُراثر اور جاذب توجہ ہے کہ اسے اُردو نظم کا بہترین شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف دہلی ہی کے زمانۂ قیام میں سرسید احمد خاں کی تحریک پر ہوئی تھی۔ اسلام کے عروج وزوال کا یہ بہترین مُرقّع ہے جو نہ صرف ادب کا شاہکار ہے بلکہ حالی کے خلوص، جذبے اور مذہبی تڑپ کا بہترین ترجمان ہے۔ خود سرسید احمد خاں اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"یہ کہنا بالکل مناسب ہوگا کہ اس کتاب نے ہماری صنف نظم میں ایک نیا دور پیدا کر دیا۔ اس کی عبارت کی خوبی اور صفائی اور روانی کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ امر کچھ کم تعجب خیز نہیں کہ اتنا مہتم بالشان مضمون اس قدر واقعیت کی پابندی کے ساتھ اور بلا اغراق ومبالغہ اور تمثیل واستعارہ کے جو کہ ہماری شاعری کی جان اور شاعروں کا ایمان ہے، اور پھر اس قدر مؤثر اور سلیس اور فصیح طریقے سے بیان کیا جائے۔ اس کے بہت سے بند تو ایسے ہیں کہ ان کو پڑھ کر سخت سے سخت دل کے لوگ بھی بغیر آنسو بہائے

نہیں رہ سکتے۔ کیوں نہ ہو جو چیز دل سے نکلتی ہے وہ
ضرور دل میں گھر کر جاتی ہے۔" ؎

سرسید مسدس حالی کو اپنی نجات کا ضامن تصور کرتے تھے اور مسلمانوں کی پسماندہ اور شکست خوردہ قوم اسے اپنے مہلک امراض کا واحد علاج قرار دیتی تھی۔ بقول محمد اکرام :—

"مسدس نے قوم کی بیداری کا پیغام اس حلقہ تک پہنچایا جہاں علی گڑھ کالج یا کانفرنس کی رسائی نہ تھی۔ ان دونوں کا حلقہ تعلیم یافتہ طبقہ تک محدود تھا۔ لیکن مسدس کی سادہ زبان اور سیدھے سادے خیالات جتنے خواص کو مرغوب تھے، اتنے ہی عوام کو عزیز تھے۔ جو لوگ علی گڑھ کالج کے مخالف بھی تھے لیکن مسدس سے مخالفت کون کرتا۔ یہ کسی نئے مذہب کا پرچار نہ تھا، اس میں شہد کے ساتھ سرکہ نہ ملایا گیا تھا۔ حالی کے آنسو خاص آب حیات کے چھینٹے تھے، دل سے نکلے ہوئے، درد سے بھرے ہوئے۔ کون ایسا سنگ دل تھا جو ان کی قدر نہ کرتا اور انھیں زمین پر پامال ہونے دیتا۔" ؎

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری نے "وید مقدس" اور "دیوان غالب" کو الہامی کتابیں قرار دیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر رام بابو سکسینہ "مسدس حالی" کو ایک الہامی کتاب قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"مولانا حالی کی یہ سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ مشہور تصنیف ہے، یہ ایک نیا دور پیدا کرنے والی کتاب ہے، اس کی مقبولیت اب بھی ویسی ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ یہ ایک "الہامی کتاب" ہے اور اس کو تاریخ ارتقائے ادب اردو میں ایک "سنگ نشان" سمجھنا چاہیے۔ یہ ایک نیا تارہ ہے جو اردو کے افق شاعری پر طلوع ہوا۔ اس سے ہندوستان میں قومی اور وطنی نظموں کی بنیاد پڑی اور اس نے یہ ثابت کر دیا کہ ایسی پر اثر اور پر درد نظموں کے واسطے مسدس نہایت
موزوں چیز ہے۔ اس کے بہت سے نقال پیدا ہوئے مگر کوئی شخص اس تک بہ لحاظ جوش اور زور تخیل اور طرز ادا کے مولانا تک نہیں پہنچا۔ اس میں اسلام کی گذشتہ عظمت، مسلمانان سابق کے کارنامے، ان کے بلند خیالات اور اولوالعزمیاں اور برخلاف اس کے زمانۂ موجودہ میں ان کی پستی و زوال اور سستی و کاہلی کا ذکر ہے۔ آخر میں مسلمانوں سے اپیل کی گئی ہے کہ تاریخ عالم میں جو ان کا مرتبہ پہلے تھا اب پھر اس کو حاصل کرنے کے لیے کمر ہمت باندھیں"۔ ؎

مسدس کی صنف اردو شاعری میں مرثیہ کے لیے مخصوص تھی۔ انیس، دبیر، مونس، خلیق، ضمیر، دیگر سب ہی نے اسی صنف میں مرثیہ گوئی کی لیکن حالی نے اسے اسلام کے مد و جزر کی کہانی بیان کرنے کے لیے استعمال کیا۔

حالی کے جذبے کا خلوص "مسدس" کی بے انتہا مقبولیت کا سبب بنا اور تھوڑے ہی عرصے میں یہ نظم ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی۔ ۱۲۹۶ھ میں "مسدس" کا پہلا اڈیشن نکلا تھا، سات سال کے اندر اس کے آٹھ اڈیشن چھپ کر ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں نیا اڈیشن نکلا تو حالی نے خود اس پر دوسرا دیباچہ تحریر کیا جس میں وہ اس نظم کی غیر معمولی مقبولیت کے بارے میں لکھتے ہیں :—

"بعض قومی مدرسوں میں اس کا انتخاب بچوں کو پڑھایا جاتا ہے۔ مولود شریف کی مجلسوں میں جا بجا اس کے بند پڑھے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ اس کو پڑھ کر بے اختیار روتے اور آنسو بہاتے ہیں۔ اس کے بہت سے بند ہمارے واعظوں کی زبان پر جاری ہیں، کہیں کہیں قومی ناٹک میں اس کے مضامین ایکٹ کیے جاتے ہیں۔ بہت سے مسدس اسی کی روش پر اسی بحر میں ترتیب دیے گئے ہیں۔ شمالی مغربی اضلاع کے سرکاری مدارس میں عام قبولیت کی وجہ سے اس کو تعلیم میں داخل کرایا گیا ہے۔ یہ اور اسی قسم

کی اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ
قوم نے اس کی طرف کافی توجہ کی ہے۔" [8]

یہ حیرت انگیز مقبولیت ہے جو اُردو زبان کی شاید ہی کسی کتاب کو حاصل ہوئی ہو۔ حقیقت یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے عروج و زوال کی کہانی بذاتِ خود بھی بڑی دل گداز اور رقت انگیز۔ یا تو وہ زمانہ تھا کہ جب مسلمانوں کی مملکت دنیا کی اہم ترین مملکت سمجھی جاتی تھی اور ساری متمدن دنیا کی امیدیں اسی سے وابستہ رہتی تھیں۔ وہ بھی دن تھے کہ جب علوم و فنون میں دنیا کی کوئی قوم مسلمانوں کے ہم پلہ نہیں تھی۔ تاریخ، جغرافیہ علم الافلاک، فلسفہ، منطق، الہیات، کلام، تفسیر، حدیث، فقہ، علم رجال لغت نویسی، معجم نویسی، تنقید نگاری، داستان سرائی، فزکس، کیمسٹری، ریاضی، بیالوجی، زوالوجی، حساب، جیومیٹری، الجبر والمقابلہ دوا سازی، طب اور اس کی بہ کثرت اقسام غرض کہ کون سا علم ایسا تھا جس کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ نہ رہا ہو۔ ان میں سے کتنے ہی علوم ایسے بھی تھے جن کی ایجاد اور اختراع کا سہرا بھی مسلمانوں ہی کے سر تھا۔ یا تو وہ زمانہ تھا ان کے تمدن کا آفتاب نصف النہار پر پہنچا ہوا تھا یا وہ زمانہ آگیا کہ علم و فن سے بیگانۂ محض ہو کر رہ گئے۔ تمدن خاک میں مل گیا۔ غیرتِ قومی خاک میں مل گئی۔ آزادی اور خود مختاری غلامی میں تبدیل ہو گئی۔ حاکم سے محکوم ہو گئے۔ عزت و سربلندی کے بجائے ذلت و رسوائی اپنی انتہا کو پہنچ گئی، اور حالی نے اسی دکھ بھری کہانی کو پوری صداقت کے ساتھ انتہائی پرخلوص انداز میں پیش کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی کتاب کو ایسی غیر معمولی مقبولیت بے سبب نہیں ملتی۔ چنانچہ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:۔۔۔۔

"زمانۂ حال کی کوئی اُردو کتاب مقبولیت میں اس کا
مقابلہ نہیں کرسکتی۔ ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا مسلمان
اس سے آشنا ہے اور کچھ عرصہ ہوا کہ بہت سے لوگوں
کو تو یہ حفظ تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ
تمام قومی اچھائیوں اور برائیوں کا ایک ساتھ جائزہ لیتی
ہے یعنی اچھائیاں زمانہ گذشتہ کی اور برائیاں
زمانہ موجودہ کی۔" [9]

"مسدس حالی" اسلام کے عروج و زوال کی نہ صرف مؤثر تاریخ ہے بلکہ اس کتاب میں فاضل شاعر نے تاریخی حقیقتوں کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ زمانۂ حال سے اس کا مقابلہ بھی کیا ہے، اور یہ حصہ ایسا دلکش مؤثر اور رقت انگیز ہے کہ اسے پڑھ کر سنگ دل سے سنگ دل انسان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ 'مسدس' کے آخر میں حالی نے بعد میں ایک ضمیمہ کا بھی اضافہ کیا تھا جو اپنی جامعیت کے لحاظ سے ایک اہم نظم ہے۔ اس ضمیمہ میں حالی نے امید، غیرتِ قومی، امکان ترقی، آغاز ترقی، اقبال مندی کیا چیز ہے؟ محنت پسندی، کاہل، مذمتِ کاہلی، شرافت محنت، غم خواری بنی نوع انسان، رغبت علوم و فنون، فضیلتِ علم، علوم جدیدہ کے نتائج، ہمتِ مرداں، زمانہ گذشتہ میں تعلیمی کوششیں، دارالعلوم اسلامیہ، اپنی تعلیم آپ، تعلیم سے بے توجہی کا نتیجہ، ترغیب علوم و فنون، ذی علموں کی قدر افزائی اور متفقہ کوشش کے مضامین نظم کیے ہیں اور آخر میں دعا پر نظم کو ختم کیا ہے۔ دعا کے بعد جناب سرورِ کائنات ؐ کی خدمت میں ایک طویل "عرضِ حال" شامل ہے۔ یہ عرض حال بھی بے حد مؤثر اور درد انگیز ہے۔

*

حواشی:۔

[1] اُردوئے معلیٰ دہلی۔ غالب نمبر حصہ سوم فروری ۱۹۶۹ء ۔ غالب کی شخصیت اور شاعری۔ از پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ صفحہ ۴۳
[2] آشفتہ بیانی میری۔ مصنف رشید احمد صدیقی صفحہ ۱۹۸۔ [3] اُردوئے معلیٰ۔ دہلی۔ غالب نمبر حصہ سوم، فروری ۱۹۶۹ء ۔۔ غالب کی شخصیت اور شاعری۔ از رشید احمد صدیقی صفحہ ۴۴

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

دستِ سوال

شباب للت
ریلوے بورڈ ہاؤسنگ
شملہ-۱۷۱۰۰۳

اٹھا ہے دستِ سوال میرا
ترے وفورِ کرم کا مقروض [illegible] میرا
دراز پھر کیوں ہے آج دستِ سوال میرا

بکھر پڑے ہیں ترے خزانے
تو اپنے اوصاف کے خزانوں سے مجھ کو
شاداب پیڑ جیسا
چلن عطا کر
کہ لوگ اُسے مارتے ہیں پتھر
مگر وہ بدلے میں ان کے دامن
رسیلے میٹھے لذیذ و دلکش پھلوں سے بھر کر
مدام خوش کامیوں سے ان کو نوازتا ہے
پھلوں سے خالی ہوں جیب و داماں
تو پتھروں کے صلے میں وہ پھول اور پتے ہی بخشتا ہے۔

اساڑھ کا شعلہ بار سورج
جو تیر دھرتی پہ چھوڑتا ہے کماں سے اپنی
وہ جھیل کر اپنے سر پہ
اپنے بدن پہ دھوپ اوڑھ کر
گھنی گھنی چھاؤں ہر چرند و پرند و انساں کو بانٹتا ہے
کلہاڑی جو کاٹتی ہے اُس کو
اسے بھی وہ مالا مال کرتا ہے
اپنے لمسِ بدن سے دے کر لطیف خوشبو
وہ سوکھ کر پُرزہ پُرزہ کٹ جائے
تو بھی بنتا ہے
جزوِ تعمیر جھونپڑوں اور حویلیوں کا
جلے اگر تو لہو کو حدت، حرارتیں جسم و جاں کو
نور و فروغ چہروں کو بخشتا ہے

وہ کہہ رہا ہے پکار کر
اِس جہاں کی ہر ذی حیات شے کو
طیور و حیواں کو
نوعِ انساں کو
اپنے ایثار سے عمل سے بتا رہا ہے یہی کہ
میرے بدن کا اک ایک عضو
اک ایک جزو
اک ایک شاخ پتہ
مری رگِ جاں، نفس نفس، ریشہ ریشہ
ہر موئے تن
تمہارے لیے ہے پیارو
یہ جسم و جاں نذر ہیں تمہاری
مجھے بھی پروردگارِ عالم
درخت جیسا چلن عطا کر
نہ جذبۂ انتقام سے میرا سینہ آلودہ ہو خدایا
نہ بدلہ لینے کی زہرناک آرزو سے کردار ہو گزیدہ
نہ بدزبانوں کی نکتہ چینی سے، حرف گیری سے دل کبھی
ہو مرا کبیدہ۔
بھلا کروں ہر بدی کے بدلے
وہی فقیرانہ بے نیازی، کشادہ ظرفی
وہی وقارِ قلندرانہ
وہی تحمل، وہی متانت، وہی حلیمی
سپردگی و سرور و مستی
درخت کا سا خموش ایثار
پاک کردار
بخش دے تو مجھے خدایا!

نظام صدیقی
۵۲۰۔ دائرہ شاہ محب اللہ
بہادر گنج
الہ آباد

نئی غزل کا چہرہ

غزل بنیادی طور پر اردو کی ایک شرمیلی اور دلربا صنف ہے۔ اس نے ہر دور کی رد و کد کے اظہار کے لیے ایسے حجابانہ وسیلے استعمال کیے جس میں اس کا مخصوص حجاب برقرار رہ سکے۔ اپنے صدیوں کی تربیت یافتہ اس مخصوص مزاج کے ساتھ ہی نئی غزل بھی اپنے دور کی روح میں گردش کرتا ہوا آئینہ ہے۔ اس نے اپنے زمانہ کی تمام تبدیلیوں کے گہرے اثرات قبول کیے اور فکر، خیال اور احساس کو برسوں کی فرسودہ حالت، بے دماغ کرانہ مقررہ سانچوں، بے جان راستوں اور گھسے پٹے مواد کی گہری کھائیوں سے نکال کر اس کو اس صنعتی اور سائنسی عہد کی مشینی زندگی کی گوناگوں پیچیدگیوں، منفصل کیفیتوں، خوش رنگ امیدوں، شدید محرومیوں، خدشوں اور نئے تقاضوں سے بیک وقت عہدہ برآ ہونے کا حوصلہ بخشا اور ہوا میں معلق ہونے کے احساس کو یکسر ختم کیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے موجودہ حوصلہ شکن حالات، سماجی رشتوں کی ابتری اور قدروں کی شکست و ریخت کی مسموم فضا میں فرد کی شدید روحانی آرزومندی کو فنی طور پر منکشف کرنے کے ساتھ ساتھ "فرد" کو ایک "اکائی" کے طور پر ابھارنے کی بھرپور کوشش کی، نیز فرد کو اس کے ماضی اور مستقبل سے جوڑ کر اس کو تہذیبی اکائی (GESTALT) کی علامت بنا کر بھی بخوبی نمایاں کیا۔ یہ نیا اسلوب، شیوہ اور رجحان روایتی ادب اور ترقی پسند غزلیہ ادب میں معدوم تھا۔ لیکن یہ ایک بالکل دوسری بات ہے کہ محض جدید حسیت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ جب تک اس میں آفاقیت کا عنصر بھی کارفرما نہ ہو۔ اچھی اور سچی غزلیہ شاعری کی شناخت اور قدر سنجی کے لیے محض یہی کافی نہیں ہے کہ اس کے سننے اور پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہو کہ یہ کس دور کی زائیدہ اور پروردہ ہے بلکہ یہ بھی پتہ چلے کہ وہ ماورائے عصر بھی ہے۔ تاہم کوئی ادیب اس حقیقت سے منکر نہیں ہو سکتا کہ نئی غزل اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے باوجود اردو کی غزلیہ ادب کی تاریخ کا ایک نیا درخشاں باب ہے اور روایتی اور ترقی پسند شاعری کا اگلا قدم ہے۔ وہ اپنی دھرتی سے بھرپور لگاؤ کے باوجود آسمان سے بھی ہم آہنگ ہے۔ اس کا جسم روح کے پرتو سے بھی منور ہے۔ وہ آج کی بدصورتی کی جمالیات (Cult of Ugliness) کے باوجود نئی روشنی کے پیکر سے بھی ہم آغوش ہے۔ اس نے ہر ہوا کی موج، ہر درد کے چہرہ، ہر امید کی کرن، ہر خوشبو کے جھونکے کے لیے اپنی نگاہ، ذہن، دل اور روح کے دریچے کھلے رکھے ہیں۔ نئی غزل صحیح معنوں میں نئی نسل کی باطن کی آواز ہے جو خودنگر بھی ہے اور خودگر بھی ــــــ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ ہماری غزل اپنی چار سو سال کی تاریخ میں اپنی زمین کی ٹھیٹ ہندستانی بوباس سے کبھی اتنی قریب نہیں ہوئی جتنی وہ اب ہے۔ اس کی کہن سال ایرانی لذت و لطافت بڑی حد تک ختم ہو گئی ہے جس کی وجہ سے وہ فارسی غزل کا مثنیٰ سمجھی جاتی تھی۔ نئی غزل میں برصغیر کے بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی، اخلاقی، روحانی اور تہذیبی موسموں کے تیور کو اس کے مخصوص رنگ و آہنگ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ غزل کا یہ نیا روپ ایک حد تک نئی اردو نظم کے لہجہ سے بھی متاثر ہے، اس کو نئے عہد کا داخلی سند نامہ تصور کیا جا سکتا ہے۔

اپنے مختلف تہذیبی، سماجی، فکری اور انفرادی پس منظر کے باوجود نئی غزل کے معتبر نمائندوں نے نئے دور کے نئے موضوعات، مسائل، افکار، اشیا اور مناظر سے اپنی گہری حسی جذباتی اور فکری وابستگی کو شعری پیکر عطا کیا۔ یہ گہری وسیع تر وابستگی اکثر و بیشتر مختلف ہنگامی اور سیاسی نوعیت کے مقررہ نظریوں، خانوں، منصوبوں، فارمولوں اور نعروں سے معنی آگیں "ناوابستگی" کی شکل میں بھی عیاں ہوتی ہے جو زندگی کی وحدت کو اس کی تمام تر وسعتوں کے ساتھ دیکھنے، برتنے اور سمجھنے کی خواستگار ہے۔ یہ دراصل ایک ہی سکّے کے دو رخ ہیں ایک دوسرے کا راویہ تکملہ ہیں اور اپنے دور کے آرکسٹرائی ہم آہنگی (Orchestral Harmony) کے زندہ اور بیدار سچے ہیں۔ ان کو نظر انداز کرنا ادبی بددیانتی ہے۔ بشرطیکہ یہ شاعرانہ تجربے بھی بن گئے ہوں۔

نئی غزل کے ان نئے معماروں نے اپنے منفرد ادراک کے علاوہ شعوری طور پر نئی غزلیہ لفظیات کے ترکیبی نظام اور تشکیلی وضع میں بھی غیر معمولی اجتہاد کا ثبوت فراہم کیا اور شعری شعریت کی تخلیق کی۔ سودا، میر، غالب، نظیر، اقبال، جوش، یگانہ، فراق، فیض اور آج کے سربرآوردہ ترقی پسند شاعر سردار جعفری کے لفظیات کے سنجیدہ جائزہ کے بعد اگر لسانی نقطۂ نظر سے نئی غزلیہ لفظیات کے تناسب کا تجزیہ کریں تو آپ کو زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ ناصر کاظمی، شہزاد احمد، شکیب جلالی، خلیل الرحمن اعظمی، ظفر اقبال، منیر نیازی، احمد مشتاق، باقی، بشیر بدر، باقی فاروقی، محمد علوی، سلیم احمد، باقر مہدی، مخمور سعیدی، عادل منصوری، مظہر امام، کشور ناہید اور فضا ابن فیضی سے لے کر ندا فاضلی، پرکاش فکری، مظفر سبزواری، زیب غوری، کمار پاشی، احمد فراز، پروین شاکر، سلطان اختر اور صادق تک سب نے حسب ضرورت تخلیقی توڑ پھوڑ، نیک نیت پیوند کاری، لفظوں کی تراش خراش، نئی علامتوں کی تخلیق اور پرانی گم شدہ اور عاق کی ہوئی علامتوں کو نئے مفاہیم عطا کر کے گویا غزلیہ زبان کو بہت حد تک از سر نو خلق کیا۔ ان کے استعارے کا نظام نیا ہے۔ پیکر تراشی کے عوامل نئے ہیں تشبیہات کی دنیا نئی ہے۔ الفاظ کے تلازمے نئے ہیں۔ یہ الفاظ و علائم ہمیں ہر جگہ زندہ اور محسوس شکل میں نظر آتے ہیں جو ایک طرف نئی غزل کے معنوی افق کو روشن کرتے ہیں اور دوسری طرف بیان میں جمالیاتی سحرکاری کی شان پیدا کرتے ہیں۔ نئی غزلیہ شاعری سکّہ بند ردعمل کی شاعری نہیں ہے جو ذہنی ین (YIN) جمود کی فضا کی غمکار ہوتی ہے وہ ذہنی یانگ (YANG) 'حرکت' کی فضا کی علمبردار ہے اور زندہ بیدار، متحرک اور نئے شعور و وجدان کی حکایت، بلاغت، اشارت اور ادا کا نیا جمالیاتی مکاشفہ ہے۔ اس میں پرانا احساس غیر تخلیقی طور پر نہیں گونجتا ہے۔ پرانا شعور لو نہیں دے اٹھتا ہے۔ پرانی آواز نہیں لرزتی ہے، اس میں نئی حسیت کی نت نئی خوشبوئیں پھوٹتی ہیں اور نئی غزل اپنے عہد کے ساتھ پیوست ہو کر غیر معمولی تخلیقی اظہار کی ذمہ داری سنبھالتی ہے۔ اس غزلیہ آزادی اور ذمہ داری کی پر تضاد پیچیدگی کے عرفان کے لیے استعاری شعور (Paradoxical) کی ضرورت ہے۔ کسی حد تک یہی ان کے حسین و بلیغ ابہام کا راز ہے جس سے اکثر نیم روشنی اور خواب کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ان خارجی اور داخلی اوصاف کے باعث نئی غزل میں بیشتر ایک عجیب سی تازگی، توانائی، نادرہ کاری اور برنائی کا شدت سے احساس ہوتا ہے اور واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ یہ نیا تازہ اور تیز نوکیلا زلزلہ بھرا لہجہ غزلیہ شاعری میں پہلے موجود نہیں تھا جس نے اس میں طغیانی سی بیداری اور تاثر کی گہرائی، معنی کی گمبھیرتا اور موسیقی کا نیا لہرا جگانے میں کامیاب ہے۔

اس دور میں دیکارت کے اس نظریہ کا زمانہ بہت حد تک لد گیا کہ "میں سوچتا ہوں۔ اس لیے ہوں" (Cogito ergo Sum)

اس کے برخلاف آج بیشتر نئے غزل گو اپنے باطنی وجود کی توثیق کے ضمن میں اس بات پر مصر ہیں "میں ہوں۔ اس لیے سوچتا ہوں" (Sum ergo Cogito)۔ وہ ایک طرف جہاں ان کلاسیکیٹ پسند روایتی شاعروں کے زعم سے کنارہ کش ہیں جو ہر وقت فخریہ حقیقت و صداقت کی بابت "من دانم" کا نعرہ بلند کرتے ہیں اور دوسری طرف بہت حد تک ترقی پسندی کی اجتماعیت، خارجیت، عمومیت، تصور پرستی اور نصب العینیت سے بھی دامن کش ہیں۔ وہ ان دونو

کے خلاف زندگی، زمانہ، انسان، تہذیب اور کائنات کی ہر لمحہ بدلتی ہوئی متحرک اور تغیر پذیر حقیقت کو (جیسی وہ اس دور میں ہے) اپنی ذات کے توسط سے محسوس کرنے اور سمجھنے کے متمنی ہیں، اس لیے وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں اترنا چاہتے ہیں۔ ان کی اس حسی اور ذہنی مہم جوئی کی اہمیت ان کی پرخلوص داخلیت میں مضمر ہے۔ ان کے منفرد طرز ادراک پر ہمیں غیر بالیدہ اور مقصد بردار "اجتماعی ادراک" کا شبہ نہیں ہوتا جو اوپر سے گوبر کے مانند تخلیق کے چہرہ پر عموماً تھوپا ہوتا ہے یہ اندر سے اگتا ہے اور زمانہ کے مجموعی آہنگ سے نہایت فطری طور پر ہم آہنگ ہوتا ہے۔ ان کا ذہنی سفر ذات سے کائنات کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ یہ بیحد دشوار اور جاں گداز عمل ہے۔ ان کے سارے پرانے ذہنی سہارے چھن چکے ہیں۔ اس لیے زندگی کی ہر نوعیت کا کرب ان کو اکیلے جھیلنا پڑتا ہے۔ اگر نئے غزل گو اپنی فطری ہوشمندی اور تخلیقی روح کی نشوونما اپنی صلیب اپنے کاندھے پر اٹھا کر منفرد انداز میں کرنے کے خواستگار ہیں تو اس سے کون سی قیامت ٹوٹی پڑ رہی ہے۔ دنیا میں صرف ایک نظریہ، ایک عقیدہ، ایک مسلک سو فیصد صحیح نہیں ہوتا۔ وہ تو آفاق کی کلیت کا صرف ایک جز ہی ہو سکتا ہے۔ غزلیہ فن کار کے لیے جہاں روایت کی زندہ نامیاتی اور متحرک قدروں کا عارف ہونا ضروری ہے۔ وہاں اس کو اپنے اندرونی فیضان کے مطابق مجتہد ہونے کا بھی پورا حق حاصل ہے۔ نئی غزل کے اہم شاعر ناصر کاظمی، خلیل الرحمن اعظمی، شکیب جلالی، بانی، بشیر بدر، ظفر اقبال، وزیر آغا، سلیم احمد، باقر مہدی، شہریار، محمد علوی، زبیر رضوی، عادل منصوری، ندا فاضلی، کمار پاشی، حسن نعیم، نشتر خانقاہی، وحید اختر، مظہر امام، مخمور سعیدی، فضا ابن فیضی، حرمت الاکرام، ظہیر صدیقی، راج نرائن راز، فضیل جعفری، بمل کرشن اشک، بشر نواز، شہاب جعفری، ساقی فاروقی، احمد فراز، عبداللہ علیم، سلطان اختر، پرکاش فکری، مصور سبزواری، شمس الرحمن فاروقی، عبداللہ کمال، لطف الرحمان، نصر قریشی اور ظہیر غازی پوری غزل کی بنیادی روایت، اس کے مخصوص رمزیاتی اور علامتی انداز اور اس کی تہ داری سے نئے غزلیہ منظر نامہ کی تشکیل میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں جو اس کے دائرہ اثر کو وسیع کرتی ہے اور اس کو کسی مخصوص مسلک یا نصب العین سے وابستہ کرنے کے بجائے عالمگیر انسانی جذبات و محسوسات سے منسلک رکھتی ہے جو ایک شدید بحران سے دوچار ہے۔ اور ہر نوعیت کی ادارہ بندی کے جبر کی منکر ہے "نہیں" پر یہ اصرار ایک مقدس فریضہ ہے اور فی زمانہ ایک جگمگاتا اور جاگتا ہوا سچا شعری رویہ! لیکن انکار کی لے مقلدانہ طور پر کنسٹری ہو جائے تو اثبات پر زور ناگزیر ہے وہ بھی نئی غزل کا روشن حاشیہ ہے ؎

انقلابوں کی گھڑی ہے ہر "نہیں" "ہاں" سے بڑی ہے

(جاں نثار اختر)

دھوپ نے ناخن ڈبوئے ہیں گلوں کے خون میں
زخم خوردہ خوشبوئیں پھرتی ہیں سر پکڑے ہوئے (عمیق حنفی)

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا
سارا لہو بدن کا رواں مشت پر میں تھا (وزیر آغا)

کھلی آنکھیں تو پھر لگتی گئی چپ
ہوئے ہم بے زباں منظر بہ منظر (مخمور سعیدی)

تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے
مرے لہو کے سمندر ذرا پکار مجھے (خلیل الرحمان اعظمی)

پی چکی کتنی ہی موجوں کا لہو ساحل کی ریت
لاشیں ہی لاشیں نظر آئیں سر ساحل تمام (شہاب جعفری)

دوستوں سے ملاقات کی شام ہے
یہ سزا کاٹ کر اپنے گھر جاؤں گا (مظہر امام)

میرے لہو کی چیخ کو کب کوئی آسرا ملا
دشت بھی بے زبان تھا، شہر بھی بے صدا ملا (شہریار)

بلندیوں پہ تھا محو سفر ہوا کی طرح
لباس خاک جو پہنا تو خاکسار ہوا (کمار پاشی)

برہنہ شاخ پر اک برگ تنہا، کہیں میلے میں کھویا ایک بچہ، شکستہ قبر کا اک ٹوٹا کتبہ
طلسم وقت سے سہما پرندہ، تماشائی کبھی اور خود بھی تماشا، لب گل پر خزاں کا مرثیہ ہوں

(نصر قریشی)

کیوں کہہ دیا کہ خاک کی منزل ہے آسماں
کیا جرم تھا کہ دی یہ سزا؟ پوچھتے چلیں (حرمت الاکرام)

سمندر کو مجھ سے کس ریت کی پیاس ہو گیا ہوں
(فضا ابن فیضی)

دیکھ لوں صورتِ الفاظ تو معنی دیکھوں
دل میں ارمان ہے کہ ہر درد کا چہرہ دیکھوں (حسن نعیم)

وہ مری زندہ دلی کا جانے کیا مانگے حساب
جا موسم ہے، کوئی پتہ ہرا لیتا چلوں! (بانی)

کردار قتل کرنے لگے لوگ یوں کہ ہم
اپنے ہی گھر میں بیٹھ کر آوارہ ہو گئے (شمس الرحمان فاروقی)

لرز گئی جو آنکھوں کے آئینوں میں کبھی
کٹے پھٹے ہوئے اندر کی انتہا ہی تو ہے (ظفر اقبال)

آندھی کو اپنی شاخ میں روکے کھڑے رہے
یوں احتجاج کچھ نئے اشجار کر گئے (باقر مہدی)

میں دن ہوں میری جبیں پہ دکھوں کا سورج ہے
دیے تورات کی پلکوں پہ جھلملاتے ہیں (بشیر بدر)

نئی غزل محض لامعنویت، داخلیت پسند المیہ اور انکار کے محبس میں ہی اسیر نہیں ہے بلکہ اب اس کے مثبت کردار کا منظر نامہ بھی آہستہ آہستہ گہری دھند سے سامنے آ رہا ہے جس میں زندگی کی مکمل اکائی کی آگہی کا سورج ہولے ہولے طلوع ہو رہا ہے ؎

پہاڑوں پر کہیں بارش ہوئی ہے
زمیں محوِ دعا ہے اور میں ہوں (مظہر امام)

دل میں ہو آس تو ہر کام سنبھل سکتا ہے
ہر اندھیرے میں دیا خواب کا جل سکتا ہے (حسن نعیم)

اس شام کے افق پہ سیاہی کے باوجود
کچھ روشنی ہے کچھ تو ابھرتا ہوا سا ہے (وقار ناصری)

نئی غزل کے ان معدودے چند اشعار سے بھی یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ نئی غزل انسانی زندگی اور اس کے ماحول کے رشتوں اور رابطوں کو بندھے ٹکے زاویوں سے الگ کر کے بالکل نئے انداز میں دیکھتی ہے۔ اچھے اور سچے نئے غزل گو کے پاس وہ شاعرانہ عرفان (۷/۱۵/۱۶/۳) موجود ہے جو آج کی سچائیوں کو اپنے باطن یا سائیکی کی سطح پر "نئی صورتوں" میں محسوس کرتا ہے اور یہ "نئی صورتیں" اس کا حقیقی تجربہ بھی ہیں اور تخلیقی پیکر بھی۔ اس کے ہوش مندانہ انحراف پسند رویہ اور اجتہادی جذبہ کے پس پشت وجودی بحران اور جدید آشوب گزیدہ ذہن کا محولا بالا نفسیاتی پس منظر ہے جو کامیو کی زبان میں ایک "اندوہناک حشر" کو ہضم کرنے کی فکر ہے اور بیک وقت وجودیت پسندوں کا فلسفۂ آزادیٔ عمل نیز فلسفۂ تعمیرِ ذات بھی کارفرما ہے۔ لیکن یہ نیا غزلیہ رنگ و آہنگ بھی اب فکر و فن سے عاری مقلدین کی ذہنی تناسخی گردشوں کا بُری طرح شکار ہو گیا ہے جس کے باعث غیر پختہ جدیدیت زدہ شاعروں کی کارٹونی غزلیں بیشتر محض اقدار کی شکست و ریخت کا نوحہ اور لسانی بے حرمتی کا چیختا چلاتا بھونپو بن کر رہ گئی ہیں۔ وزن، قافیہ و ردیف کے ساتھ معمولی سے معمولی بات کا بھدے سے بھدا بیان غزل کا شیوہ نہیں۔ یہ ہزل کا وطیرہ ہو سکتا ہے۔ شعر اور نئے شعری محاورہ کے تصور کی آڑ میں شمس الرحمان فاروقی کی غیر شعری تصور کی تبلیغ نے بہت سے سنجیدہ شاعروں کو بھی نئی غزل کے منی سرکس کا مسخرا بنا کر رکھ دیا ہے ؎

مجھے کیا غزل خولیا ہو گیا
کئی دن سے میں بھی کھڑے پاؤں ہوں (محمد علوی)

سر منڈاتے ہیں ہم سے آ کے خیال
اپنا پیشہ ہوا ہے حجامی (سلیم احمد)

سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہو گئی (ندا فاضلی)

چمک چمکارنے شب شیرنے کی
مزے محکم، الف انجیرنے کی (ظفر اقبال)

تو کس کے کمرے میں تھی
میں تیرے کمرے میں تھا (عادل منصوری)

ہم اپنے سائے سے تو بھڑک کر الف ہوئے
دیکھا نہیں مگر پسِ دیوار کون ہے (شمس الرحمان فاروقی)

خاص طور سے فاروقی کے ہیرو ظفر اقبال کی نئی غزلیہ لسانی تشکیل کو توڑھنا اور سمجھنا ناگ پھنی چبانے کے مترادف ہے۔

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

ڈاکٹر مظفر حنفی

اس قدر حیران کیوں ہو، بات کیا ہے دوستو
سر کہ شانے پر تھا ہاتھوں پہ دھرا ہے دوستو

ریت کی دیوار سے سیلاب تھمنے کا نہیں
جال مت پھینکو، ہوا آخر ہوا ہے دوستو

ناؤ سے پتوار غائب اور دریا طیش میں
حوصلہ کتنا ہے کس میں، دیکھنا ہے دوستو

چل سکو تو چل رہا ہے آگے آگے گردباد
روکنے کو نقشِ پا بھی روکتا ہے دوستو

اس بیاباں میں کوئی گھر کی خبر لاتا نہیں
کیا در و دیوار پر سبزہ اگا ہے دوستو

ڈھل گیا تپتا ہوا سورج تو جنگل آئے گا
کٹ گیا دن، مسئلہ اب رات کا ہے دوستو

آؤ رکھ لیں اپنی اپنی روشنی کو سان پر
دھوپ کا پرچم ابھی لہرا رہا ہے دوستو

ہم سے پس ماندوں کا بھی منزل کو پہنچانا سلام
مطمئن رہنا، ہمارا بھی خدا ہے دوستو

سانس چلتی ہے ابھی تک، شاہ رگ تو کٹ چکی
تم سے شرمندہ مظفر کی خطا ہے دوستو

بشیر فاروقی

کوئی رکھتا نہیں اب شہر میں اپنا چہرہ
ہے اگر جسم کسی کا تو کسی کا چہرہ

جس کو دیکھیں تو کوئی تازہ غزل ہو جائے
مدتیں گزریں کہ دیکھا نہیں ایسا چہرہ

زندگی میں نے تری ایک جھلک دیکھی تھی
آج تک ڈھونڈھ رہا ہوں تجھے چہرہ چہرہ

کتنی بے درد ہے اے گردشِ دنیا تو بھی
کیسا مرجھا گیا وہ پھول سا ہنستا چہرہ

کبھی مجھ پر بھی ٹھہر جائے زمانے کی نظر
بخش دو تم مجھے کچھ دیر کو اپنا چہرہ

آؤ اس مقتلِ تنہائی سے نکلیں کہ جہاں
قتل ہو جائے گا خوابوں کا سنہرا چہرہ

درد کے رشتے عجب رشتے ہوا کرتے ہیں
دل دکھے ان کا اتر جاتا ہے میرا چہرہ

کہنے جاتا تو ہوں حالِ غمِ دل ان سے بشیر
جانتا ہوں کہ بدل جائے گا ان کا چہرہ

غزلیں

صلاح الدین نیّر

پرایا غم تھا اسے، با ضمیر ایسی تھی
وہ لڑکی شہرِ غزل میں امیر ایسی تھی

بجز مرے، کوئی انجم شناس پڑھ نہ سکا
ہتھیلیوں پہ تمہاری، لکیر ایسی تھی

بہت سے تجربے ہوتے رہے، رہا نہ ہوئی
نگاہ، زلفِ غزل میں اسیر ایسی تھی

تمہارے بعد کسی اور پر خدا کی قسم
اٹھی نہ پھر سے، نگاہِ فقیر ایسی تھی

زبان کٹ گئی، سمجھوتہ وقت سے نہ کیا
ہمارے پرکھوں کی ہم میں خمیر ایسی تھی

ہزار چاہا مگر اک قدم بھی اٹھ نہ سکا
تمہاری خوشبو مری راہ گیر ایسی تھی

خموشی ان کی علامت بنی رہی نیّر
ادائے کم سخنی بے نظیر ایسی تھی

مومن غازیپوری

جو بے عمل تھے ارادوں کی منزلوں میں رہے
تصورات کے کردار ناولوں میں رہے

اداس رات کی تنہائیوں میں بھی لے دوست
ترے خیال کی رنگین محفلوں میں رہے

کسی کی پیاس وہ دریا کبھی بجھا نہ سکے
جو دور دور پہاڑوں کے سلسلوں میں رہے

پیامِ امن و محبت تھے، بعدِ مرگ بھی ہم
حیات بن کے دھڑکتے ہوئے دلوں میں رہے

جو دن میں امن و حفاظت کی بات کرتے تھے
تمام رات وہی لوگ قاتلوں میں رہے

مرا مزاج ہے طوفاں کی زد میں چلنے کا
جو مصلحت کا سفینہ ہے ساحلوں میں رہے

ہمیشہ ہم پہ یہ فیضانِ رب رہا مومن
کہ پر وقار حریفوں کی محفلوں میں رہے

رفیق الزماں

اس درجہ زندگی میں اکیلا نہیں کوئی
میری طرح سے آج بھی تنہا نہیں کوئی

کچھ دور جا کے راستے سب ایک ہوگئے
منزل نہیں ہے سامنے رستا نہیں کوئی

کس کی رفاقتوں کے نشاں ڈھونڈتے ہیں ہم
اس راستے سے اب تو گذرتا نہیں کوئی

اخبار کی خبر کا بھروسہ نہ کیجیے
جو سچ ہے اس کو آج بھی لکھتا نہیں کوئی

لہجے ہیں پر تپاک مگر اس کے باوجود
یاروں سے کھل کے آج بھی ملتا نہیں کوئی

اس دل کو مدتیں ہوئیں اجڑے ہوئے رفیق
برسوں سے اس مکان میں رہتا نہیں کوئی

حکیم عبدالقوی دریابادی
«صدق جدید» کچہری روڈ
لکھنؤ

رسالہ "زمانہ" کی ایک ششماہی کا جائزہ

۱۹۲۱ء میں جب احقر کی عمر آٹھ سال کے قریب تھی تو پہلی بار کان پور کے رسالہ "زمانہ" کی زیارت ہوئی۔ اس وقت تک اردو کتابیں مولانا "شبلی" وغیرہ کی بے تکلف پڑھ لیتا تھا اور کسی حد تک سمجھ بھی لیتا تھا۔ زمانہ کا پہلا پرچہ دیکھتے ہی اس کے مطالعہ کی چاٹ لگ گئی۔ اس کے مطالعہ کا سلسلہ برابر اسی ذوق و شوق کے ساتھ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ انقلاب زمانہ کے ہاتھوں اس رسالہ کی اشاعت بند نہ ہوگئی۔ اس کے ایڈیٹر منشی دیانرائن نگم سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا، البتہ ان کے خطوط جو عم محترم مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے نام کبھی کبھار آیا کرتے تھے، دیکھنے اور رسالہ زمانہ میں ان کی سنجیدہ ادبی و سیاسی تحریریں پڑھنے کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ان کا طرز نگارش سادہ ہونے کے باوجود موثر اور پڑھنے والے کے دل پر لکھنے والے کی ادبی صلاحیت کا سکہ جمانے والا تھا۔

اسی بچپن کے زمانہ میں اس رسالہ میں شائع ہونے والا ایک دلچسپ افسانہ "میر کرامت کا گھوڑا" تو اتنا پسند آیا کہ اسے نہ معلوم کتنی بار پڑھ ڈالا اور عرصہ تک یہ سارا قصہ خزانۂ حافظہ میں محفوظ رہا۔ اب تو صرف عنوان ہی یاد رہ گیا ہے۔

یہ رسالہ اولاً بریلی سے شائع ہونا شروع ہوا تھا اور پھر آخر تک کان پور سے نکلتا رہا۔ اردو کے معاصر ادبی رسائل میں یہ ہمیشہ درجۂ اوّل کا مانا گیا۔ اس کے مضمون نگاروں میں اردو کے نامور ہندو مسلم اور مسیحی اہل قلم — نثار اور شاعر — دونوں شامل رہے۔ اس کے مضمون نگاروں میں پریم چند نے اپنے افسانوں کے ذریعہ غالباً سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ اور اس رسالہ میں جن مشاہیر کی نگارشات شائع ہوتی رہیں ان میں — خاص طور سے علامہ شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا ذکاء اللہ دہلوی، مسٹر جے۔ آر۔ رائے جرنلسٹ (جو مذہباً مسیحی تھے) علامہ اقبال، لسان العصر حضرت اکبر الٰہ آبادی، لالہ لاجپت رائے، سر شیخ عبدالقادر، منشی نوبت رائے نظر، سرور جہان آبادی، مولانا سید سلیمان ندوی، خواجہ حسن نظامی، پنڈت برج نرائن چکبست وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

یہ رسالہ تقریباً ۳۹ — ۴۰ سال بڑی پابندی سے نکلتا رہا۔ رسالہ کے فخر و امتیاز کے لیے شاید یہ امر ہی کافی ہے کہ علامہ اقبال کا ترانۂ ہندی "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" سب سے پہلے اس رسالہ (ستمبر ۱۹۰۴ء) میں چھپ کر روشناس زمانہ ہوا۔ اور بعد میں تو اس شاعر اعظم نے اس رسالہ کو اپنا ایک فارسی شعر مرحمت کر کے اس کی انتہائی قدر افزائی فرمائی ؎

نہ کنم دگر نگاہے بہ رہے کہ طے نمودم
بہ سراغ صبح فردا روشِ زمانہ دارم

رسالہ زمانہ بلا شبہ "یادگار زمانہ" ادب و سیاست کے انمول خزانہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ ضروری ہے کہ اس کی فائلوں کا جائزہ لے کر اس کے قیمتی مضامین نظم و نثر کے انتخابات مختلف موضوعات سے متعلق کتابی شکل میں شائع کیے جائیں خصوصاً وہ مضامین جن کا تعلق ہندو مسلم اتحاد اور ملک کے لسانی جھگڑے (ہندی اردو کے تنازعہ) سے ہے۔ یہ مضامین آج مشعل راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

رسالہ کم و بیش چالیس سال اردو کے اس نامور صحافی و ادیب کی ادارت میں پابندی وقت کے ساتھ اور اسی بلند معیار کے مطابق نکلتا

رراجو مدیر محترم نے قائم کیا تھا۔ رسالہ زمانہ کی ساری جلدوں پر نظر ڈال کر ان کے چیدہ مضامین کا انتخاب کرنا یا محض جائزہ لینا کوئی آسان کام نہیں، یہ کام اگر کسی اہل قلم نے اپنے ذمہ لیا تو وہ پورا ایک دفتر صدہا صفحوں کا تیار کر سکے گا۔

احقر، صرف جولائی ۱۹۱۲ء تا دسمبر ۱۹۱۲ء (احقر کی پیدائش یکم جنوری ۱۹۱۳ء کو ہوئی تھی اس سے قبل والی ششماہی) کی فائل پر جو کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے مطالعہ کے لیے مل گئی تھی نظر ڈال کر اس کے جواہر پاروں کے مختصر ذکر پر اکتفا کر رہا ہے۔

پہلے یعنی جولائی کے پرچہ میں "چینی افیون اور ہندستانی افیون" کے عنوان سے اقبال بہادر سکسینہ ایم۔ اے کا سیاسی معلومات سے لبریز مضمون بہت خوب ہے۔ اس وقت ان دونوں ملکوں کی سیاست اور معاشیات میں افیون کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل تھی اس پر پوری روشنی ڈالی گئی ہے۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی کے مضمون "دربار رام پور" کی دوسری قسط میں نواب کلب علی خاں کے دربار کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سعید احمد صاحب مارہروی کے مضمون "تذکرہ خوش نویسان" کی ایک قسط درج ہے۔ اس کے بعد "پانی" کے عنوان سے ایک سائنسی مضمون اور پریم چند کا ایک مشہور افسانہ درج ہے۔ آخر میں ایڈیٹر صاحب کے قلم سے ملک و بیرون ملک کے معاشی و سیاسی حالات پر اظہار خیال رفتار زمانہ کے مستقل عنوان کے تحت کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ نگم صاحب محب وطن ہونے کے ساتھ سیاسیات میں ہمیشہ اعتدال پسندی کے مسلک پر گامزن بلکہ قلم زن رہے تھے۔ جوش و خروش ان کی سیاسی تحریروں میں مفقود ہے۔ کتابوں پر تبصرے "بعض نئی کتابیں" کے عنوان سے اس نمبر کے کئی صفحوں میں ہیں۔ جن کتابوں پر تبصرہ ہے ان میں مولانا اسلم جیراج پوری کی تالیف "حیات جامی" اردو کے شعرائے قدیم کے کلام کا انتخاب "نشتر سخن" گورکھ پور کے ایک نامور اہل قلم مولوی محمد احسان اللہ عباسی کے قلم سے اور پنڈت منوہر لال زتشی کی کتاب "گلدستۂ ادب" (جو عرصۂ دراز تک انٹر میجیٹ کے اردو نصاب میں داخل رہی تھی) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

حصۂ نظم میں لکھنؤ کے پرانے امام باڑہ پر نادر کاکوروی کی نادر نظم، مرزا ہادی عزیز کی دو صفحہ کی طویل نظم "یادگار سلف" مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد حیدر آبادی کی فارسی نعت۔ لکھنؤ کے دو نامور ہندو شعرا لچھمن نرائن در آبر اور نوبت رائے نظر کی اردو غزلیں درج ہیں نظر کی غزل کا یہ شعر اہل نظر کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے ؎

برنگ شمع ہیں ہم بھی مسافر بزم ہستی میں
جو ہوگی شام دنیا میں تو عقبیٰ میں سحر ہوگی

ماہ اگست کے پرچہ میں اردو کے مشہور فلسفی اہل قلم مرزا سلطان احمد کا مضمون "ملازمت" اور "جارج ایلیٹ" کے عنوان سے امیر احمد انصاری کا مضمون درج ہے اس میں انگلستان کی اس خاتون ناول نگار جس نے مردانہ نام اختیار کر کے درجہ اوّل کے متعدد انگریزی ناول لکھے تھے، کی سوانح اور اس کے ناولوں کا تعارف درج ہے۔ پھر "ہوا" کے عنوان سے ایک سائنٹفک مضمون جگدیش پرشاد پانڈے کے قلم سے ہے اور اس کے معاً بعد سعید احمد صاحب مارہروی کے مضمون تذکرہ خوش نویسان کی ایک قسط ہے۔ ان بظاہر خشک مضامین کے بعد منشی تیرتھ رام فیروز آبادی کے قلم سے ایک افسانہ "رنج و راحت" خاصا طویل درج ہے۔ ان بظاہر خشک مضامین کے بعد منشی تیرتھ رام فیروز آبادی کے قلم سے ایک افسانہ "رنج و راحت" خاصا طویل درج ہے۔ حصۂ نظم میں حیدر آباد کی موسیٰ ندی کی انتہائی ہلاکت آفرین طغیانی (۱۹۰۸ء) سے متعلق بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو کے انگریزی نوحۂ درد کو سفیر کاکوروی نے اردو کے قالب میں "اشک آصف" کے عنوان سے منتقل کیا ہے۔ دو نظمیں تصویر ضبط اور فصل بہار کے عنوان سے محشر لکھنوی اور نظر لکھنوی کی بھی اس نمبر میں ہیں۔

ایڈیٹر کے قلم سے رفتار زمانہ کے زیر عنوان انگریزی اخبار "انڈین اسپکٹیٹر" کے ایڈیٹر مسٹر مالاباری (افسوس آج کی موجودہ نسل ان کو اور ان کے اخبار کو تقریباً بھلا چکی ہے) انڈین نیشنل کانگریس کے اکابر بانی مسٹر ہیوم اور شہنشاہ جاپان کی موت کا ذکر بڑا ہی بساز معلومات ہے۔

ستمبر کے پرچہ میں نوبت رائے صاحب نظر کا ایک طویل اور نہایت

پر تعلقات تاریخی مضمون "آثار اودھ" کے عنوان سے سب سے پہلے درج ہے، اس کے بعد بیرونی ممالک سے متعلق دو سیاسی مضامین "چین کی کایا پلٹ" از تیرتھ رام فیروزپوری اور "شہنشاہ جاپان" از سید محمد فاروق درج ہیں۔

بعد ازاں ہی خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی کے مسلسل مضمون "دربار رام پور" کی تیسری قسط درج ہے۔ حصۂ نظم میں حضرت اکبر الہ آبادی کے اشعار آبدار پورے دو صفحوں میں ہیں۔ اور اسی حصۂ نظم میں برق دہلوی کی نظم "شمع کشتہ"، جگت موہن لال رواں کی نظم "غنچۂ ناشگفتہ" ادبی معیار سے بہت بلند پایہ اس رسالہ کی زینت ہیں۔

ماہ اکتوبر کے پرچہ کا آغاز "مذہب کی ماہیت اور اس کا مفہوم حقیقی" کے عنوان سے ایک مسیحی مضمون نگار جے۔ آر۔ رائے کے قلم سے ہے۔ دوسرا مضمون عالم اسلام کی سیاست پر "ایران کی تباہی کی ایک جھلک" کے عنوان سے "فدائی" مقیم آکسفورڈ کے قلم سے ہے۔ جگدیش پرشاد پانڈے کے قلم سے ایک سائنٹفک مضمون علم الاصوات پر، اور "نمک حرام وزیر" کے عنوان سے ایک تاریخی مضمون میر جعفر سے متعلق منشی محی الدین فوق ایڈیٹر کشمیری میگزین لاہور کے قلم سے درج ہیں۔ سعید احمد مارہروی کے مسلسل مضمون تذکرہ خوش نویساں کی ایک قسط اس کے بعد درج ہوئی ہے۔ نادر کاکوروی کے حادثۂ وفات پر ان کے ہم وطن سفیر کاکوروی کی غزل کے ساتھ ان کے ایک شاگرد عزیز جگت موہن لال رواں کی ایک چار صفحہ کی نظم "پیام رو کمی"۔ ارشد تھانوی کی نظم سہرہ اور نظر لکھنوی کے قلم سے ان کے نواسہ کا مرثیہ درج ہیں۔ اور آخر میں ایڈیٹر کے قلم سے رفتار زمانہ کے تحت قومی یونیورسٹیوں یعنی ہندو یونیورسٹی بنارس اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سلسلے میں اس وقت کی چھڑی ہوئی بحثوں اور یو۔ پی کے نئے گورنر سر جیمس مسٹن کے خیر مقدم کے ساتھ دو مسلم ملکوں ایران و ترکی کے سیاسی حالات پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔

نومبر کے شمارے میں پہلا مضمون ایک ہندو مؤرخ منشی بساون لال شاداں پر منشی رام پرشاد کے قلم سے اس موضوع پر بالکل اچھوتا ہے۔ دوسرا طویل سیاسی مضمون محمد حسین حیدر آبادی کے قلم سے "سرگزشت ایران" کے عنوان سے ہے۔ اس کے بعد یورپ کے ایک مشہور فلسفی سینیکا کے فلسفۂ اخلاق پر عبدالقوی فانی (جو بعد میں عرصہ تک لکھنؤ یونیورسٹی میں لیکچرر عربی و فارسی رہے تھے) کا ایک مضمون درج ہے۔ اس کے بعد "نقاد لکھنوی" کے قلمی نام سے خطوط منشی امیر احمد امیر مینائی، مرتبہ مولوی محمد احسن اللہ خاں ثاقب پر بصیرانہ تنقید کی گئی ہے۔ اس کے بعد تذکرہ خوش نویساں کی ایک قسط ہے۔ حصہ نظم میں نظر لکھنوی کی کچھ غزلیں باسط بسوانی کی نظم "نامۂ یار" اور "ہوائی جہاز" کے عنوان سے ایک طویل نظم، جس میں مولوی موسیٰ حسین اختر جلال آبادی نے بڑی بلند پروازی طبع دکھائی ہے، پڑھنے اور سر دھننے کے قابل ہیں۔ ایڈیٹر کے قلم سے "رفتار زمانہ" کے عنوان سے جنگ بلقان کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔

اس ششماہی کے آخری پرچے یعنی دسمبر کے شمارے میں پہلا مضمون "ہندوؤں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں" مشہور سیاسی لیڈر لالہ لاجپت رائے کے قلم سے ہے جو آج بھی پڑھے جانے کے قابل ہے۔ اس کے بعد ایک قابل مطالعہ تاریخی مضمون "وجیانگر۔ ایک معدوم سلطنت" کے عنوان سے قطب الدین خاں زاق کے قلم سے ہے۔ پریم چند کا ایک مشہور افسانہ "راج ہٹ" بھی اسی پرچہ میں پہلی بار شائع ہوا ہے۔ جو آج بھی بالکل تازہ نظر آتا ہے۔ حصۂ نظم میں تلوک چند محروم کی نظم "مہاتما بدھ" خان بہادر رضا علی خاں وحشت (کلکتہ) کی غزل جگت موہن لال رواں کی غزل، فخر الدین احمد سفیر کاکوروی کی نظم جنگ بلقان، قابل ذکر نظر آتی ہیں۔ سب سے آخر میں "رفتار زمانہ" کے مستقل عنوان کے تحت ایڈیٹر نے دفتر زمانہ سے اپنی ہی ادارت میں اس زمانہ میں جاری ہونے والے ہفتہ وار "آزاد" کی پالیسی کی وضاحت کئی صفحوں میں کی ہے۔ اس کے بعد اس تجویز کی کہ ہندوستان کی زبانوں کو رومن رسم الخط میں لکھا جائے، مخالفت مدلل طور پر کی ہے اور وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ پر چاندنی چوک دہلی میں جو بم پھینکا گیا تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے دہشت انگیزی کی اس کارروائی کی سخت مذمت کی ہے۔ ✱✱

یادگار شفیق گوپال مغموم

بیادِ حضرت سکندر علی وجد حیدرآبادی

بزمِ غزل میں وجد غزلخواں نہیں رہا
وہ شاعروں میں شاعرِ ذیشاں نہیں رہا

آنسو بہا رہی ہے زلیخائے شاعری
جب سے نظر میں یوسفِ کنعاں نہیں رہا

جو تھا دکن کی علمی روایات کا امیں
وہ افتخارِ مجلسِ خاصاں نہیں رہا

شہرت نصیب تھا جو سراج و ولی کے بعد
وہ کج کلاہِ سحر طرازاں نہیں رہا

معنی طراز و نکتہ نوازِ ادب گیا
فکر و نظر کا ایک دبستاں نہیں رہا

ہر صنفِ شاعری پہ تھا یکساں جسے عبور
وہ نازشِ سخن، وہ سخنداں نہیں رہا

ہر شعر جس کا منتخب و لاجواب تھا
وہ شاہدِ سخن کا ادا داں نہیں رہا

جو اپنی طرز کا تھا سخن سنجِ باکمال
گلزارِ شعر کا وہ نواخواں نہیں رہا

خود حسن کو بھی ناز رہا جس کی ذات پر
وہ عاشقِ جمالِ حسیناں نہیں رہا

جس نے پڑھا صحیفۂ فطرت کو غور سے
وہ دیدہ ور، وہ صاحبِ عرفاں نہیں رہا

نظروں سے چھپ گیا وہ نواگر حیات کا
انوار کا وہ سازِ زرافشاں نہیں رہا

قلب و جگر کو کون کرے گا گداختہ؟
سوزِ نوا شعلۂ رقصاں نہیں رہا

بزمِ جہاں سے اٹھ گیا وہ دستوں کا دوست
ہر دلعزیز بزمِ رقیباں نہیں رہا

چھینا ہے جب سے موت نے وہ ارمغانِ شعر
ہستی کے زخمِ زخم کا درماں نہیں رہا

دن رات نوحہ خوانی سے فرصت نہیں رہی
مجھ کو بھی اب تو جینے کا درماں نہیں رہا

مغموم! جس کو ترسے گی میری نظر نظر
ایمان کی تو یہ ہے، وہ انساں نہیں رہا

اسرار حسین اسیر
مہند گڑھی۔ شاہجہاں پور

غم و خوشی کا حسیں امتزاج تھا وہ بھی
بدل گیا ہے کہ موسم مزاج تھا وہ بھی

حنائی ہاتھ جو اب تک وصول کرتے رہے
لہو تھا دل کا کہ تیرا خراج تھا وہ بھی

یہ ماہ و سال کی گردش بھی اک ضرورت تھی
مری حیات کی اک احتیاج تھا وہ بھی

اکیلا کیسے روایت کو توڑ سکتا تھا
بدل تو جاتا رہینِ سماج تھا وہ بھی

فقط یہ سوچ کے اپنے غموں کو بھول گیا
اداس اداس سا کیوں اتنا آج تھا وہ بھی

شرابِ ناب کا ہاتھوں سے پیالہ چھوٹ گیا
تری نگاہ کا اک احتجاج تھا وہ بھی

غزلیں

طارق ایرانی

دل کی روداد حدیثِ غمِ جانانہ گئی
بات اس شوخ تک افسانہ در افسانہ گئی

اک جھلک روئے صنم کی نظر آئی تھی کبھی
میرے دل سے نہ مگر یادِ صنم خانہ گئی

بے نیازانہ اٹھی تھی مری جانب لیکن
نگہِ یار بنا کر مجھے دیوانہ گئی

دو قدم بھی نہ چلے تھے کہ سفر ختم ہوا
مرحبا جوشِ جنوں وسعتِ ویرانہ گئی

اب کہاں جلوہ گرِ وادیٔ ایمن کی بہار
تیری نظروں میں جو تھی خوئے کلیمانہ گئی

دشمنی تھی خس و خاشاک کی تعمیر سے بھی
یوں گری برق جلاتی ہوئی کاشانہ گئی

جام بے نور سے ہیں ساغرِ صہبا بے کیف
اٹھ کے ساقی جو گیا رونقِ میخانہ گئی

عشقِ برباد نے تاثیر دکھا دی طارق
شمع کی گود میں خاکسترِ پروانہ گئی

وزیر اعلا شری سری پت مشرا، ۱۰ اگست ۱۹۸۳ء کو مرزاپور کے اَن پارہ حرارتی بجلی پراجکٹ کے اوّلین ٹربائن کی تعمیر کا افتتاح کرتے ہوئے

وزیر اعلا شری سری پت مشرا ۱۰ ستمبر ۸۳ء کو سہکار تا بھون لکھنؤ میں آنجہانی پنڈت گووند ولبھ پنت کے ۹۶ ویں یوم پیدائش کے موقع پر ایک خصوصی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے۔

وزیر اعلا شری سری پت مشرا ۷ ستمبر ۸۳ء کو سوچنا بھون لکھنؤ میں ڈاکٹر سمپورنانند میموریل جرنلسٹ بیڈمنٹن ٹورنامنٹ سے متعلق انعامات تقسیم کرتے ہوئے

...ا شری سری پت مشرا ۲۳ ستمبر ۸۳ء کو
...ں اسمبلی میں، سیلاب اور خشک سالی سے
...نے والے مسائل کے سلسلے میں ایک علا...
...جلسے کو خطاب کرتے ہوئے۔

اترپردیش کے وزیر قومی یکجہتی ڈاکٹر عمار رضوی قومی یکجہتی کو مستحکم کرنے کے مقصد سے پروفیسر نورالحسن کی صدارت میں منعقدہ جلسے میں صلاح ومشورہ کرتے ہوئے۔ یہ جلسہ ۲۱ اور ۲۲ اگست ۸۳ء کو نینی تال میں ہوا تھا۔
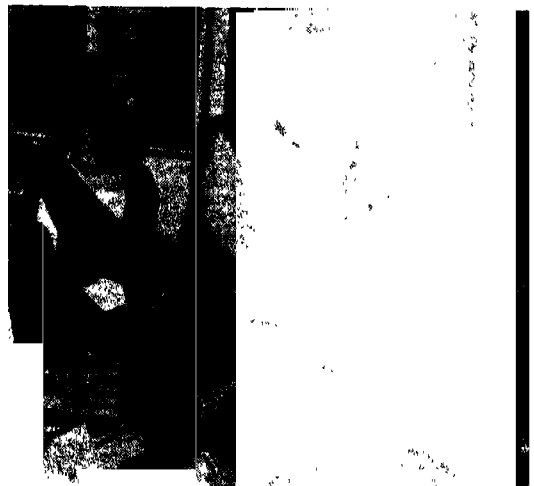
بزمِ ثقافت لکھنؤ کے زیر اہتمام ۲۰ راگست ۰۳ء کو پریس کلب لکھنؤ میں منعقدہ شامِ غزل کے موقع پر بزم کے جنرل سکریٹری شری ظاہر قزلباش بزم کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے۔ تصویر میں شری انجم ملیح آبادی اتر پردیش کے لوک آیکت شری مرتضیٰ حسین، سکریٹری اطلاعات شری یوگیندر امن شری نازش پرتاپگڑھی، ڈاکٹر حضور نواب اور ڈاکٹر سلمان عباسی وغیرہ بھی نظر آرہے ہیں۔
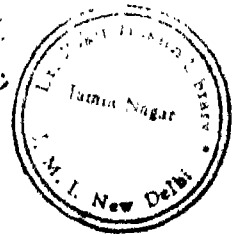
شامِ غزل کے حاضرین کا ایک منظر

دیا شنکر
سی-۱۰۶۲-سیکٹر بی-۵
مہانگر، لکھنؤ-۶

دیوان پنڈت رادھے ناتھ کول گلشن

کچھ یادیں کچھ باتیں

اب سے ۳۰-۳۵ سال پہلے تک الہ آباد میں بالعموم طرحی مشاعرے ہی منعقد ہوا کرتے تھے اور ان میں زیادہ سے زیادہ گیارہ اشعار پڑھنے کی اجازت تھی۔ اس طرح ایک نشست میں اچھی خاصی تعداد میں شعرا کو غزل پڑھنے کا موقع ملتا تھا اور سامعین بھی شائستگی کے ساتھ مختلف شعرا کی غزلیں سن کر محظوظ ہوتے تھے۔ ارباب نقد و نظر شعرا کا کلام بغور سنتے تھے اور بعد میں باہم تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ اصحاب ذوق مشاعرے میں بلا تفریق مذہب و ملت شریک ہوتے تھے۔ نتیجتاً قومی یکجہتی کی جڑیں مضبوط ہوتی تھیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اردو زبان کی ترقی اور ترویج بھی ہوتی تھی۔ الہ آباد کی ادبی انجمنوں اور مختلف تعلیم گاہوں کے سالانہ مشاعرے کی صدارت زیادہ تر دیوان پنڈت رادھے ناتھ کول گلشن کرتے تھے اور یہ سلسلہ موصوف کی معذوری صحت تک قائم رہا۔

موصوف کشمیری پنڈت دیوان شوناتھ منتظر کے فرزند ارجمند تھے اور ۴ر جنوری ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے کرسچین کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ ۱۹۲۱ء میں الہ آباد میں پنجاب سے آکر سکونت پذیر ہوئے اور یہاں کے گنگا جمنی معاشرہ میں گھل مل گئے۔ اور پھر الہ آباد ہی کے ہوکر رہ گئے۔ جن لوگوں نے گلشن صاحب کو دیکھا ہے ان کو یاد ہے کہ موصوف کے بشرہ پر علمیت اور طہارت کی تابانی رہتی تھی۔ ان کی پیشانی کشادہ تھی وہ سر پر سفید بڑا صافہ باندھتے تھے اور شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنتے تھے۔ ان کا قد اوسط درجہ کا تھا اور رنگ گورا چٹا تھا۔ ان کی گفتار میں حلاوت اور چہرے پر متانت تھی۔

جب سر شاہ سلیمان، الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدہ جلیلہ پر ۱۶ر مارچ ۱۹۳۲ء کو فائز ہوئے، ان کے اعزاز میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ اس میں ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک تھے اور وہ سر شاہ سلیمان کے ساتھ رونق بزم تھے۔ مشاعرہ طرحی تھا۔ گلشن صاحب نے اس موقع پر جو غزل پڑھی تھی اس کے چند اشعار قارئین کی دلچسپی کے لیے درج ہیں۔

آیئے کچھ دیر کو بزم سخنداں دیکھیے
جمع ہیں تفریح دل کے ساز و ساماں دیکھیے

نیستی ہستی کا ٹھہرا بس نفس پر انحصار
اس ہوائی بات پر نازاں ہے انساں دیکھیے

آج رائٹ آنریبل ٹی۔ بی سپرو ذی وقار
خوبیٔ تقدیر سے ہیں میرے مہماں دیکھیے

ہو نظر تو جلوۂ وحدت ہے کثرت میں عیاں
اور پھر کثرت میں وحدت کو نمایاں دیکھیے

بزم گلشن کو نہ ہو کیوں ناز اپنے بخت پر
جلوہ گر ہیں چیف جسٹس سر سلیماں دیکھیے

گلشن صاحب اپنی استطاعت سے اپنے بنگلے 'سرسوتی نواس' پر مشاعرے منعقد کرتے تھے جس میں اچھی خاصی تعداد میں مقامی و بیرونی

مشہور و ممتاز شعراء کو شرکت کے لیے دعوت نامے بھیجتے تھے۔ ایسا ہی ایک مشاعرہ دسمبر ۱۹۳۴ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس وقت علاوہ دیگر مشہور شعراء کے تاباں بدایونی کا بڑا نام تھا۔ ان کا حلقۂ تلامذہ روہیل کھنڈ کے اضلاع میں وسیع تھا۔ وہ اپنے وطن بدایوں سے باہر جانے کے لیے بڑی مشکل سے راضی ہوتے تھے۔ گلشن صاحب نے خصوصی طور پر انتظام کر کے ان کو بلوایا تھا۔ ان کی عمر اس وقت تقریباً ساٹھ سال تھی۔ ان کا قد متوسط تھا، ان کا جسم نحیف تھا لیکن آنکھوں میں چمک تھی، سر پر وہ نارنجی رنگ کی پگڑی باندھے ہوئے تھے اور ان کی شیروانی اور کرتے کا رنگ بھی نارنجی تھا۔ وہ اپنا سامان ایک نارنجی رنگ کے بقچے میں لیے تھے اور کسی کو چھونے نہیں دیتے تھے۔ سامان خاص نہیں تھا، ایک ایک عدد کپڑے اور سبھی نارنجی رنگ کے تھے چنانچہ مذکورہ مشاعرے میں جب زیادہ تر شعراء اپنا اپنا کلام سنا چکے اور صرف چند شعراء باقی رہ گئے تو رات کے پچھلے پہر ساڑھے تین بجے انھیں ڈائس پر لایا گیا۔ ان کے پاجامہ کا ازاربند اتنا لمبا تھا کہ جو صاحب ان کو بٹھانے کے لیے آگے بڑھے ان کے پاؤں ازاربند میں پھنس گئے اور وہ گرنے سے بال بال بچے۔ ان کی پوشاک اور چال ڈھال ایسی تھی کہ ان کو دیکھنے کے لیے ہجوم اُمڈ گیا۔ جب انھوں نے غزل کا مطلع پڑھا تو حاضرین جلسہ فرطِ مسرت سے جھوم اُٹھے۔ انھیں غزل ازبر تھی۔ سامعین حضرات جب تحسین و آفریں کہتے تو وہ اپنے زانوؤں پر ہاتھ اس طرح مارتے کہ جیسے معرکہ آرائی پر آمادہ ہوں۔

تاباں بدایونی کا پورا نام مولوی لیاقت علی تھا۔ پُرگوئی، قادر الکلامی اور عروض دانی کے لیے اپنے وقت میں مشہور تھے۔ ان کے علاوہ مذکورہ مشاعرے میں حضرت نوح ناروی، پنڈت برجموہن ناتھ عرف صاحب شوق۔ خواجہ عبدالحمید شیدا بیرسٹر، کرشن سہائے وحشی کانپوری، پروفیسر ضامن علی ضامن، ہادی مچھلی شہری ایڈوکیٹ سیّد ماجد علی ماجد، قدمی جائسی، سید طالب علی طالب، و نیز دیگر شعرائے کرام نے شرکت کی تھی۔ آداب نشست و برخاست اور شائستگی ان محفلوں سے ساتھ گویا ختم ہو گئی ؎

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا   یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

پنڈت تیج نرائن ملا جج الٰہ آباد ہائی کورٹ کے بنگلہ پر ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرہ میں بڑی تعداد میں مشہور شعرائے کرام نے شرکت کی تھی۔ دیگر ممتاز شعراء کے علاوہ لکھنؤ سے پنڈت آنند نرائن ملا نے بھی اپنے بڑے بھائی کے یہاں مشاعرہ میں شرکت کی تھی۔ مصرع طرح مشکل تھا۔ مصرع طرح میں پنڈت آنند نرائن ملا کا درج ذیل شعر سن کر سامعین پھڑک اٹھے ؎

مریضِ غم کو تسلیوں سے کہیں سوا دے رہا تھا تسکیں
وہ ایک چمکتا ہوا سا آنسو جو دیدۂ چارہ ساز میں ہے

مشاعرہ کی صدارت گلشن صاحب نے فرمائی تھی۔ ان کی طرحی غزل کے چند اشعار قارئین کی دلچسپی کے لیے درج ہیں ؎

اگر نہ ہو لذتِ عبادت دھرا ہوا کیا نماز میں ہے
اسی میں ہے شانِ بندگی کی یہی حقیقت مجاز میں ہے

ہے دردِ دل جس میں ہے وہ انساں نہیں تو خاصیت میں حیواں
کہ آدمیت کا سارا جوہر دلِ بشر کے گداز میں ہے

اٹھاؤ تکلیف دل پہ اپنے کہ دوسروں کو ہو اس سے راحت
نہ ہو جو اپنی غرض سے مطلب تو لطف راز و نیاز میں ہے

جو چاہے ہونا نہ ہو سکے وہ، نہ چاہے جس کو وہ پیش آئے
بشر کی قدرت میں کیا ہے گلشن جو ہے اسی بے نیاز میں ہے

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو ۱۹۴۰ء میں سخت بیمار پڑ گئے۔ ان کی صحت یابی کے سلسلے میں ایک جلسہ ۱۱ دسمبر ۱۹۴۰ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس جلسہ میں گلشن صاحب نے جو تہنیت نامہ پڑھا وہ قابلِ توجہ ہے ؎

سر ٹی۔ بی سپرو بی سی کا   ہے جشن مبارکبادی کا
ارمان ہوا پورا جن کا   مقصود یہی تھا ہستی کا
ہر چہرہ پر شادابی ہے   کچھ سُرخی کچھ عُنّابی ہے
تاثیرِ صحت یابی ہے   مفقود وہ بیتابی ہے
ہر داغ سے خالی ہے دامن   دلشاد ہیں سارے اہلِ وطن
مشہورِ جہاں تقریر اُن کی   حامی ساری تحریر ان کی
اُردو کے ماہر نامی ہیں   اربابِ سخن کے حامی ہیں
دلدادۂ سعدی و جامی ہیں   تصویرِ خوش انجامی ہیں

گلشن کی ہوائیں کھائیں ہم دیں دل سے ان کو دعائیں ہم
دُنیا میں کرم ایجاد رہیں
ارباب وطن کو یاد رہیں

پرتاب گڑھ میں سید عشرت حسین ڈپٹی کمشنر کے عہدہ پر فائز تھے ان کا تعلق الہ آباد کے ایک مشہور علمی اور ادبی خاندان سے تھا۔ وہ اُردو کے مایہ ناز شاعر سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی کے فرزند ارجمند تھے عشرت حسین صاحب کو شعر و سخن سے فطری لگاؤ تھا۔ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ فوجیوں کی امداد و بہبود کے سلسلے میں ایک شاندار شاعرہ ۲۲ مارچ ۱۹۴۱ء کو منعقد ہوا تھا۔ گلشن صاحب نے عشرت صاحب کی دیرینہ ملاقات کی بنا پر مشاعرہ میں شرکت کی اور اس مشاعرہ کی صدارت کا کام بھی انجام دیا۔ میرے دوست معیز الدین صاحب (سابق آئی اے ایس اور سکریٹری کونسل آف ایگری کلچر ریسرچ) اس وقت وہاں حاکم پرگنہ کنڈہ تھے۔ انھوں نے مجھے بھی مدعو کیا تھا اور میں نے مشاعرے میں شرکت کی تھی۔ گلشن صاحب نے مشاعرہ میں جو غزل پڑھی تھی اس کو سُن کر حاضرین جلسہ بہت محظوظ ہوئے۔ اس غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں، جن سے موصوف کی شائستگی اور خیالات کی بلندی اور پاکیزگی نمایاں ہے ان کے اشعار عام فہم ہوتے ہیں اور بات سیدھی دل پر نقش ہو جاتی ہے۔

محفلِ شعر میں عشرت کی ہے دعوت میری
جس میں وہ خوش ہیں اسی میں ہے مسرت میری

ہے مصیبت میں خدا ہی کا سہارا مجھ کو
ٹال سکتا ہے وہ ایک ایک مصیبت میری

آپ کی جلوۂ رنگیں کی جھلک ہے اس میں
آئینہ بن گئی ہے دیکھیے حیرت میری

جو مرے پاس ہے سب دین خدا کی سمجھو
نہ تو طاقت ہے نہ حکمت ہے نہ دولت میری

سحر کا کام کیا کرتے ہیں اچھے اشعار
کیا عجب دہر میں گلشن ہے جو شہرت میری

دیوان راجہ ترلوک ناتھ (ریٹائرڈ کمشنر لاہور) نے لکھا ہے کہ گلشن صاحب اُردو کے بلند پایہ شاعر ہیں اور فرقہ وارانہ میلان و رجحان سے مبرّا تھے، ان کے تعلقات مسلمان حضرات سے نازیبت خوش گوار رہے۔ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے لکھا ہے کہ دیوان پنڈت رادھے ناتھ کول گلشن کے صرف ایک شعر سے ان کی زندگی کے معمول کا سچا نقشہ سامنے آجاتا ہے ان کی زبان سے کبھی کسی کی بُرائی نہیں سُنی۔ ان کے دل میں دشمن کے خلاف بُرائی کا خیال نہیں آتا۔

دوست کے ساتھ بُرائی کا بھلا ذکر ہے کیا
ہم سے اغیار کی بھی خاک اُڑائی نہ گئی

ان کو زبان پر عبور تھا۔ سہل الفاظ استعمال کر کے وہ مشکل مسائل کو عام فہم بنا دیتے تھے۔

جیسے گزر رہی ہے اُسے جانتا ہوں میں
کیا پوچھتے ہو حالتِ دل بار بار آج

کارخانے جو خدا کے ہیں سمجھتا ہے وہی
کس کو یہ معلوم ہے کیا ہو گا کیا ہونے کے بعد

محبت میں ہر شے سے بے نیازی اور استغنا کی جو کیفیت ہوتی ہے اس کو بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

عشق کے دن بھی عجب بے خبری میں گزرے
یعنی ہر قید علائق سے ہم آزاد رہے

انکساری اور عاجزی نعمت ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:۔

ثمر کی مل سکی نعمت نہ سروِ سرکشیدہ کو
زمیں کی سمت جھکتی ہے لدی جو پھل سے ڈالی ہے

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا شعر۔

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت
رفت و منزل بہ دیگرے پرداخت

ایسا ہی انسانی زندگی پر شعر قابل توجہ ہے۔

جو جاتا ہے وہ منزل دوسرے کو سونپ جاتا ہے
جو آیا اس نے آکر ایک نئی بنیاد ڈالی ہے

ان کا کلام صداقت، محبت اور خلوص سے بھرا ہوا ہے۔

محبت دل میں جب ہوگی تو پیدا ربط [illegible]
نہ رہ جائے گا باقی فرق ہندو اور مسلماں کا!

انجمن روحِ ادب کا ایک سالانہ مشاعرہ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کے دولت کدہ واقع ۱۹، البرٹ روڈ پر منعقد ہوا تھا۔ عدالت عالیہ میں کرسمس (بڑے دن) کی تعطیل تھی۔ اس دوران میں ڈاکٹر سچدانند سنہا پٹنہ سے الہ آباد تشریف لائے تھے اور الہ آباد میں ایلگن روڈ پر اپنے بنگلے میں قیام پذیر تھے۔ انھیں اردو اور فارسی سے گہرا لگاؤ تھا اور وہ بڑے سخن شناس تھے۔ وہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے مشاعرے میں تشریف رکھتے تھے۔ مشاعرہ دن میں دس بجے شروع ہوا تھا۔ چائے اور دوپہر کے کھانے کا انتظام سر تیج بہادر سپرو کی طرف سے تھا۔ اس میں چند دیگر شعرا کی طرحی غزلوں کے بعد گلشن صاحب نے اپنی درج ذیل طرحی غزل پڑھی۔ اس کا ہر شعر مقبولیت سے پُر ہے:

نہ کارواں ہے نہ وہ گردِ کارواں میری
جہاں میں کہنے کو باقی ہے داستاں میری
مسافرانہ ٹکا ہوں سرائے ہستی میں
خبر نہیں مجھے منزل کی ہے کہاں میری
کسی کا ٹھیک نہیں آسماں بد زمیں
یہ سب ہی بدلیں گے بدلی نظر جہاں میری
دکھائی کچھ نہ دیا اور رہ گیا مل کر
کھلی جو آنکھ پسِ خوابِ ناگہاں میری
دن ایک ایسا بھی ہوگا نہ ہوں گا میں گلشن
سبق سکھائے گی دنیا کو داستاں میری

جناب جگر مرادآبادی بھی اسی دن دوپہر کی ٹرین سے آگئے تھے چند ناگزیر حالات کی وجہ سے ان کی طرحی غزل نہ ہو سکی تھی۔ حاضرین جلسہ کی فرمائش پر بعد مشاعرہ کی اجازت سے جگر صاحب نے اپنی غزل پیش کی، تب تک ساڑھے چار بج چکے تھے۔ جاڑے کے دن تھے آفتاب کی شعاعوں کی تیزی کم ہونے لگی تھی۔ جگر صاحب پر والہانہ کیفیت طاری تھی۔ چنانچہ انھوں نے جب درج ذیل شعر پڑھا تو سارا پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا:

جگر یہ مے ارغوانی نہیں ہے
ارے آگ ہے آگ پانی نہیں ہے

بہت دنوں تک اس مشاعرے کا چرچا الہ آباد میں رہا۔

کشمیری پنڈت شعرا کا تذکرہ 'بہار گلشن کشمیر' انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد سے طبع کرا کر گلشن صاحب نے اردو زبان اور ادب کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں ایک بڑی اہم خدمت انجام دی۔ یہ تذکرہ کی اشاعت کے کثیر مصارف انھوں نے جس حوصلہ مندی اور فراخدلی سے برداشت کیے اور جس لگن سے انھوں نے اپنی برادری کے افراد سے رقم اکٹھا کی وہ قابل ستائش ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور اس کے مؤلف و مرتب پنڈت جگ موہن ناتھ رینہ شوق (ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر یوپی) اور پنڈت برج کشن کول بیخبر ہیں۔ گلشن صاحب نے مسودے کی کتابت سے لے کر طباعت تک کے مراحل کے تمام کام اپنی نگرانی میں بحسن و خوبی پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ جلد اول مندرجہ بالا پریس سے ۱۹۲۱ء میں اور جلد دوم ۱۹۲۲ء میں طبع ہوئی۔ پہلی جلد میں ۱۸۵ شعرا کے حالات زندگی مع انتخاب کلام درج ہیں۔ ہر صفحہ پر سرخ جدول ہے۔ صفحات کی تعداد ۷۲۰ ہے۔ دوسری جلد میں ضمیمہ کو چھوڑ کر ۱۶۱ شعرا کے سوانح حیات مع انتخاب کلام درج ہیں۔ اسی کے ساتھ ضمیمہ جلد اول اور ضمیمہ جلد دوم بھی شائع ہوا ہے۔ صفحات کی تعداد ۹۷۶ ہے۔ ہر صفحہ پر سبز جدول ہے۔ جن شعرا کی تصاویر دستیاب ہو سکیں وہ بھی ان جلدوں میں شامل ہیں۔ کتاب کی اشاعت پر اردو کے ممتاز رسالہ "زمانہ" کانپور کے مدیر منشی دیا نرائن نگم نے ماہ اگست ۱۹۲۱ء کے شمارہ میں اظہار رائے کیا تھا کہ "خمخانۂ جاوید" کے علاوہ تذکروں میں کوئی اور بڑا کارنامہ انجام پایا ہے تو [illegible] اور یہ کشمیری پنڈتوں کا ایک مبسوط تذکرہ ہے۔

اردو کے مشہور شاعر پنڈت برج نرائن چکبست (لکھنوی) کے المناک سانحۂ ارتحال پر گلشن صاحب نے جو قطعۂ تاریخ لکھا ہے وہ نہایت پُراثر ہے۔ چکبست صاحب وکالت کرتے تھے اور ایک مقدمہ

کی پیروی کے سلسلے میں لکھنؤ سے باہر گئے ہوئے تھے جب وہ واپس آرہے تھے تو اسٹیشن پر ہی ان پر فالج گرا اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔
یہ سانحۂ دردناک ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو پیش آیا تھا ؎

بریلی کے تھے اسٹیشن پہ چکبست اس سے کچھ پہلے
تھی واپس لکھنؤ جانے کی پوری ان کی تیاری
کہ قزاقِ اجل نے آکے لوٹا اس مسافر کو
ہوئی فالج کے سر دم قبض کرنے کی گنہگاری

۱۹۲۶ء

تھی بارہ فروری انیس سو چھبیسواں سن تھا
کہ ٹوٹا کوہِ غم یک لخت ملک و قوم پر بھاری
وکالت پیشہ تھا اور ماہرِ فنِ سخن بھی تھے
رہا کرتی تھی ان کو بادۂ معنی سے سرشاری
گئے دنیا سے اے چکبست تم کیا ہم تو کہتے ہیں
گئی صحبت سخن کی آہ! رونق بزم کی ساری

سمبت بکرمی ۱۹۸۲

موصوف نے مسلسل نصف صدی سے زائد مدت تک اُردو زبان کے چمن کی آبیاری کی۔ اربابِ علم و ادب کا خیال تھا کہ موصوف اپنا دیوان شائع کریں گے لیکن باوجود انتظار کے جب ایک طویل عرصہ تک ان کی طرف سے کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی تو احباب نے تقاضے شروع کیے۔ وہ بڑی مشکل سے راضی ہوئے۔ ان میں عاجزی اور انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ کہتے تھے: "بڑے بڑے سخنور ہیں، میں تو اپنے سکونِ خاطر کے لیے کچھ لکھ لیتا ہوں، میری بساط کیا؟" بہرحال بہت کہنے سننے اور احباب کے اصرار پر ایک سو تینتالیس (۱۴۳) غزلیات کے مجموعے کا مسودہ ایک ہزار دو سو اکتیس (۱۲۳۱) اشعار پر مشتمل تیار ہوا۔ احباب کا جی نہیں بھرا اور انھیں قطعات، ترکیب بند اور تہنیت نامے بیاض سے دینے پڑے۔ کتب "باغِ نشاط" انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد سے جون ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔ حصۂ اوّل میں غزلیں اور حصۂ دوم میں قطعات، نظمیں، خمسے اور قصیدے اور ان کے خاص رنگ میں ان کے اشعار پاکیزگیٔ خیال اور زبان میں فصاحت و سادگی کی بنا پر مقبول ہوئے۔

موصوف کے درج ذیل اشعار جو انھوں نے چار دہائی قبل لکھے تھے، زمانۂ حال کے مطابق ہیں خصوصاً جب کہ ہر طرف تفرقہ پردازی اور علاقہ پسندی کے خراب اثرات سے ماحول مکدر ہے۔ اور اس کے انسداد کے لیے اقدام کیے جا رہے ہیں ؎

خواہ ہندو ہے کہ مسلم ہے کہ عیسائی ہے
یک دلی سے جو رہے مل کے تو زیبائی ہے
دوست دارِ دل سے محبت ہو تو دشمن سے سلوک
اس پہ ہو جائے عمل تیرا تو دانائی ہے
کام لے کوئی نہ تو اپنی غلط فہمی سے
آنکھ بخشی ہے خدا نے تجھے بینائی ہے

حکومت کی طرف سے نشہ بندی کے لیے اقدام کیے جا رہے ہیں۔ چالیس برس قبل اس بری عادت کی طرف گلشن صاحب کی توجہ مبذول ہوئی اور انھوں نے شراب خانہ خراب کی مذمت کرتے ہوئے لکھا ؎

نہ کبھی خدا کا عتاب ہو کبھی عاقبت نہ خراب ہو
جگر اور دل نہ کباب ہو جو کوئی نہ مستِ شراب ہو
یہ شراب آبِ ممات ہے نہ سمجھ کہ آبِ حیات ہے
یہ وہ بد بلا ہے کہ جو پیے لبے اس کا خانہ خراب ہو
یہ ہے قولِ گلشنِ باصفا کہ کبھی نہ منھ سے اسے لگا
وہ ہے بدنصیب جہاں میں، جو شراب پی کے خراب ہو

دیوان پنڈت رادھے ناتھ کول گلشن اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کو ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو رحلت کر گئے۔ انھوں نے اپنے کلام میں پاکیزہ جذبات کا خوبی سے اظہار کیا ہے۔ ان کا کلام انسانی معاشرہ کو سنوارنے کی دعوتِ عمل دیتا ہے۔ ان کے اخلاق پرور کلام کے مرتبے کا اندازہ اس قطعۂ تاریخ سے ہوتا ہے جو ان کے مجموعہ کلام کی اشاعت پر الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے سابق صدر پروفیسر سید ضامن علی ضامن نے لکھا تھا اور جس کے چند اشعار قارئینِ کرام کے مطالعے کے لیے درج ہیں ؎

قابلِ تقلید حسنِ فکر و اندازِ بیاں
ہر غزل ہر نظم ہے بزمِ ادب میں سرفراز

ڈاکٹر صابرہ حبیب
لکچرر رشین لینگویج
لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

اُردو ادب میں حقیقت نگاری

مشرقی ادب اور خاص طور پر اُردو ادب میں حقیقت نگاری کا آغاز اور اس کا بتدریج ارتقا قابلِ ذکر اہمیت کا حامل ہے۔ دراصل اس کا آغاز جمہوریت کے آغاز سے ہوتا ہے۔ اور یہی وہ منزل ہے جہاں سے ادب کا زندگی سے گہرا رشتہ اور سماجی تنقید نیز بنی نوع انسان سے محبت جیسے موضوعات کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔

ادبی تاریخ کا جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اردو ادب میں حقیقت نگاری کا رجحان روسی ادب اور تنقید کا مرہونِ منت ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اگر ہم کرشن چندر، بیدی اور منٹو کا موازنہ روسی ادیب اے۔ آئی۔ کوپرن Kuprin (۱۸۷۰-۱۹۳۸ء) سے کریں تو ہمیں ان میں بہت سی قدریں مشترک ملیں گی۔ کوپرن نے زیادہ تر غریب اور پسماندہ طبقوں نیز دبے کچلے لوگوں کو موضوع بنایا ہے۔ حالانکہ روسی ادب کے لیے یہ موضوع نیا نہیں تھا۔ کوپرن سے پہلے پشکن کی کہانی اسٹیشن ماسٹر، گاگل کی کہانی پیٹرس برگ، اور دوستوسکی کی بہت سی کہانیوں اور ناولوں میں یہ موضوع مل جاتا ہے۔ کوپرن کے بعد بھی اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے اس سلسلے میں چیخوف کا نام سرفہرست ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ چیخوف کی حقیقت پسندی غیر جانب دار ہے تو کوپرن کے یہاں اس کے پسندیدہ ہیرو کے لیے ہمدردی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔

ایک فطری سوال یہ ذہن میں آتا ہے کہ پسماندہ اور دبے کچلے لوگوں کی زندگی ہی کیوں مختلف ملکوں کے ادیبوں کا موضوع بنی۔ اس کا جواب ادب کے ناقدین نے یہ دیا ہے کہ جب کسی ملک کے عوام اس ملک کا تاریخ ساز حصہ بن جاتے ہیں تو یہ موضوع خود بخود ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ ہندستانی ادب میں یہ موضوع انیسویں صدی کے آخر میں آیا اور پہلے بنگالی میں پھر اردو میں اور اس کے بعد ہندی اور ہندستان کی دوسری زبانوں میں۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندستانی ادب میں تنقیدی حقیقت نگاری اپنے دور اور قومی تاریخ کی پیداوار ہے اور اس کا براہ راست تعلق ہندستان کی جنگ آزادی سے ہے۔ یہی وہ مواقع ہوتے ہیں جب ادب عوام کی زندگی کے نزدیک آتا ہے اور ان کے سیاسی اور معاشی حقوق کی عکاسی کرتا ہے۔

بیسویں صدی کے شروع میں جب عوام روشنی میں آنے لگے تو ادیبوں نے ان پر ایک دوسری نظر ڈالی، انھیں سماج کی اکثریت نے ایک نئے انداز سے دیکھنے اور ان کی اہمیت کو سمجھنے پر مجبور کیا۔ اس کی ابتدا پریم چند سے ہوتی ہے۔ لیکن آزادی کی جدوجہد کے دوران وہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ حقیقت پسند ہوگئے تھے۔ پریم چند کی اسی روایت پر ادیبوں کا ایک قافلہ چل پڑا اور انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل کی جس کی پہلی کانفرنس پریم چند کی صدارت میں اپریل ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ہوئی تھی۔

ادب میں یہ حقیقت پسندی بتدریج آگے بڑھتی رہی اور بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے ادیبوں کے لیے عوام محض ایک خیالی پیکر نہیں تھے بلکہ کسانوں اور مزدوروں کی شکل میں ایک جیتی جاگتی حقیقت تھے اس کی مثال خاص طور پر ملک راج آنند، منٹو، یشپال، احمد ندیم قاسمی کرشن چندر، بیدی، ٹیگور اور پریم چند کے یہاں ملتی ہے۔ موضوع کے لحاظ سے پریم چند، کرشن چندر، بیدی اور منٹو روسی ادیب کوپرن سے

بہت قریب ہیں۔ ان کی کہانیوں میں آزاد اور خوش حال زندگی پر عوام
کے حق کی وکالت کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور خصوصیت ان سب
کے یہاں مشترک ہے۔ وہ یہ کہ یہ سبھی ادیب پسماندہ اور دبے کچلے
طبقوں کی ٹریجڈی کا اصل سبب سماجی ڈھانچہ اور استحصال کو مانتے ہیں
اس کی نمائندہ مثال کرشن چندر کی کہانیوں "سپنا" "بھوی دان" "ان کی
انگلیاں"۔ پریم چند کی کہانی "کفن"۔ بیدی کی کہانیوں "دانہ و دام"۔
"گرہن"۔ "کوکھ جلی" اور منٹو کی کہانیوں "کالی شلوار" اور "ایک مرد"
وغیرہ میں ملتی ہے۔

روسی ادیبوں میں کوپرن قابل ذکر ہے۔ ان کے یہاں پسماندہ
طبقے اور دبے کچلے لوگ بے حس نظر نہیں آتے بلکہ اپنی پریشانیوں کا حل
ڈھونڈتے ہوئے اور جدوجہد کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ کوپرن کے یہاں
اس حقیقت کی ترجمانی بھی ملتی ہے کہ ہر انسان کو آزاد اور خوش حال
زندگی بسر کرنے کا حق ہے۔ جیسا کہ وہ اپنی کہانی "کوسٹے والیاں" میں
کہتے ہیں:

> "انسان کو خوش حال زندگی کے لیے پیدا کیا گیا ہے
> اور اس کو سب چیزوں سے آزادانہ طور پر محبت کرنے
> کا فطری حق ہے"۔

یہ خیال کوپرن کی تمام تخلیقات میں ملتا ہے۔ کوپرن کے زمانے سے ہی
اردو ادب پر روسی ادب کا اثر نمایاں ہونے لگا تھا۔

"ہمایوں" کے روسی ادب نمبر میں ناخدا لکھتے ہیں:—

> "ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگوں کی روسی ادب
> کی طرف بڑھتی ہوئی دلچسپی اس بات کا ثبوت
> ہے کہ دونوں کے زندگی سے متعلق رجحان میں مماثلت
> ہے"۔

بیدی کی کہانیاں "کوکھ جلی"۔ "دانہ و دام"۔ "گرم کوٹ"۔
"گرہن"۔ "دوسرا کنارہ"۔ اور "زین العابدین" کی "رحمان کے
جوتے"۔ کوپرن کی کہانیوں "آخری شو"۔ "بچوں کا باغ" اور "پہلا ملاقاتی"
کی یاد تازہ کر دیتی ہیں۔

اردو ادب پر روسی ادب کے اثرات کے کئی اسباب ہیں۔ ان
میں یہ حقیقت بھی اہم ہے کہ اردو کے ادیبوں نے سب سے پہلے
روسی ادب کا مطالعہ کیا اور ان کا اردو میں ترجمہ پیش کیا۔
دوسری اہم وجہ یہ بھی ہے کہ انگریزی ادب کے برخلاف
روسی ادب میں ایک طرح کی مشرقیت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ
اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو ادب میں حقیقت نگاری روسی
ادب ہی کی دین ہے۔

★

بقیہ: پنڈت رادھے ناتھ کول گلشن (صفحہ ۲۹ سے آگے)

دامنِ تخیل پر ایک دوڑتی تصویر سے
جنگِ حسن و عشق و ہم آغوشیٔ ناز و نیاز
ہے دعا ضامن کی رہتی دنیا تک رہے
طبعِ گلشن کا ریاضِ دل فروز و دل نواز
۱۹۴۴ء

نے بھی اپنی ایہ ناز تصنیف "ملکِ ادب کے شاہزادے" میں گلشن
صاحب کی اردو زبان کی بیش بہا خدمات کو سراہتے ہوئے ان
کے شعری کلام پر اپنی تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ گو گلشن صاحب
نے اردو زبان و ادب کی جو بے لوث خدمت انجام دی ہے وہ اردو
ادب میں ان کی حیاتِ جاودانی کی ضامن ہے۔

ڈاکٹر سید اعجاز حسین، سابق صدر شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی

★

کیشومنک

ادب، ساہتیہ اکاڈمی اور ـــــ قومی یک جہتی

کتنے لوگ ایسے ہیں جنھیں اس کا صحیح علم ہے کہ کالی داس کہاں پیدا ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں نہ تو پہلے کسی کو فکر تھی اور نہ آج ہے۔ اس کے باوجود ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں آج بھی ایسا کوئی خطہ نہیں ہے جہاں لوگ اس لافانی شاعر کو جانتے نہ ہوں اور جہاں اس کے گیت نہ گائے جاتے ہوں۔ یہ ادب کی یک جہتی اور اتحاد پیدا کرنے کی وہ عظیم قوت ہے جو انسانوں کے ذریعہ اپنے درمیان قائم کی گئی مصنوعی حد بندیوں کو پہاڑوں اور دریاؤں کی طرح توڑ کر اپنا راستہ بنا لیتی ہے۔

انگریزوں کی جیلوں میں اکتاہٹ سے نجات حاصل کرنے کے لیے جواہر لال نہرو نے تصنیف و تالیف کا سہارا لیا۔ لیکن جب وہ سرگرم سیاست میں داخل ہو گئے تو ہم ایک ایسے عظیم ادیب سے محروم ہو گئے جو ہندوستانی ادیب کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت حاصل کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود آنے والی نسلیں جس طرح جدوجہد آزادی میں ان کی قیادت کو یاد رکھیں گی اسی طرح ان کی تصنیفات کو بھی احترام و عقیدت کی نظر سے دیکھیں گی۔

ساہتیہ اکاڈمی کا قیام ۱۲ مارچ ۱۹۵۴ء کو عمل میں آیا تھا۔ اس کے قیام کا مقصد ہندوستانی علم و ادب کی ترقی کے لیے کام کرنا اور سبھی ہندوستانی زبانوں کی ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینا اور ان میں تال میل پیدا کرنے کے لیے معیار طے کرنا اور ان کے ذریعہ ملک کے ثقافتی اتحاد کو مستحکم کرنا تھا۔

اکاڈمی ایک خود اختیار ادارہ ہے جو ۸۲ ممبران پر مشتمل ایک جنرل کونسل کی نگرانی میں کام کرتا ہے۔ جنرل کونسل کی مدت کار پانچ برس ہوتی ہے۔ اس کونسل میں ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے ۲۵ نمائندے، ہندوستانی زبانوں کے ۲۲ نمائندے یونیورسٹیوں کے ۲۰ نمائندے جنرل کونسل کے ذریعہ منتخب کیے گئے آٹھ نمائندے اور سنگیت ناٹک اکاڈمی، للت کلا اکاڈمی اور ثقافتی تعلقات کی ہندوستانی کونسل کا ایک ایک نمائندہ شامل ہوتا ہے۔

ایک ایگزیکٹو بورڈ اکاڈمی کی سرگرمیوں میں اس کی مدد کرتا ہے جنرل کونسل صدر، نائب صدر اور ایگزیکٹو بورڈ کے ممبران کا انتخاب کرتی ہے۔ مختلف زبانوں سے متعلق مشاورتی بورڈوں کی تشکیل ایگزیکٹو بورڈ کے ذریعہ عمل میں آتی ہے۔

ساہتیہ اکاڈمی کے پہلے صدر جواہر لال نہرو تھے۔ ۱۹۶۳ء میں انھیں پھر صدر منتخب کیا گیا۔ اس کے بعد مئی ۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن اس کے صدر ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ۱۹۶۹ء میں سنیتی کمار چٹرجی، ۱۹۷۷ء میں پروفیسر سری نواسن اور ۱۹۷۸ء میں شری اوما شنکر اکاڈمی کے صدر ہوئے فی الوقت ڈاکٹر وی۔ کے گوکاک اس کے صدر ہیں۔ ساہتیہ اکاڈمی دلی میں رابندر بھون نامی عمارت میں قائم ہے جو ۱۹۶۱ء میں تعمیر کی گئی تھی۔ اسی اکاڈمی میں سنگیت ناٹک اکاڈمی اور للت کلا اکاڈمی کے دفاتر بھی قائم ہیں۔

ساہتیہ اکاڈمی کے (دلی میں واقع) کتب خانہ میں ۲۲ ہندوستانی زبانوں اور کچھ غیر ملکی زبانوں کی کتابیں ہیں۔ ہندوستانی

زبانوں کی کتابوں میں ادبی، عام دل چسپی کی اہم کتابیں، لغات اور حوالہ جاتی کتابیں شامل ہیں۔

اگرچہ ہندستانی ادب ایک ہے۔ تاہم ایک زبان کے مصنف اور قاری اپنے ہی ملک کی دوسری زبانوں کے بارے میں بہت کم علم رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ایسے طریقے اپنائے جائیں جن سے مختلف ہندستانی زبانوں کے ادیب ایک دوسرے کے ادبی سرمایہ سے فائدہ اٹھا سکیں اور قارئین اپنے ملک کے ادبی ورثہ کی گوناگوں خصوصیات سے واقف ہو سکیں۔

اس کام کی انجام دہی کے لیے اکاڈمی ایک پروگرام پر عمل کر رہی ہے جس کے تحت سبھی زبانوں کی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں معلوماتی مواد پر مبنی کتابوں کی فہرستیں، ہندستانی کتابوں کے مصنفین کے بارے میں معلوماتی اور تحقیقاتی مقالے وغیرہ شائع کیے جاتے ہیں۔ اکاڈمی "انڈین لٹریچر ان انگلش" (انگریزی) اور "سمکالین بھارتیہ ساہتیہ" (ہندی) نامی دو رسالے شائع کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اس پروگرام کے تحت ایک زبان کی کتابوں کے دوسری ہندستانی زبانوں میں ترجمے بھی شائع کیے جاتے ہیں۔

اکاڈمی — غیر ملکی زبانوں کی کتابوں کے سبھی اہم ہندستانی زبانوں میں ترجمے بھی شائع کرتی ہے۔ اکاڈمی یونیسکو کے "ایسٹ۔ ویسٹ پروگرام" اور مختلف بیرونی ممالک کی ادبی اور ثقافتی تنظیموں کے ساتھ ادبی مواد اور معلومات کے تبادلہ میں بھی تعاون دیتی ہے۔

ساہتیہ اکاڈمی ہر سال مختلف زبانوں میں گزشتہ تین برسوں کے دوران شائع شدہ بہترین کتابوں پر فی کس دس ہزار روپے (پہلے یہ رقم پانچ ہزار روپے تھی) کا انعام بھی دیتی ہے۔ اب تک ..بہ ادیبوں کو انعامات دیے جا چکے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر دیریندر کمار بھٹاچاریہ (آسامی)، تاراشنکر بندھو پادھیائے (بنگالی)، آر۔ کے۔ نارائن (انگریزی)، پروفیسر اوماشنکر جوشی (گجراتی)، ہزاری پرشاد دویدی (ہندی)، ڈاکٹر کے ایس کارانتھ (کنڑ)، ایس۔ کے۔ پوٹے کاٹ (ملیالم)، ٹی۔ جانکی رمن (تامل) اور کیفی اعظمی (اُردو) شامل ہیں۔

ہندستانی زبانوں کی توسیع و ترقی دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح نہیں ہو پا رہی ہے۔ اور شاید ایسا ممکن بھی نہیں ہے۔ پھر بھی متعدد زبانوں میں ڈرامہ اور ادبی تنقید میں پیدا شدہ انحطاط باعثِ تشویش ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ان شعبوں میں ہمارا ورثہ انتہائی شاندار رہا ہے۔ اکاڈمی اس عدم توازن کو ختم کرنے کے لیے بہر حال پوری کوشش کر رہی ہے۔ ایک دوسرا پریشان کن مسئلہ مختلف ہندستانی زبانوں کے درمیان براہ راست باہمی ربط و ضبط کی کمی کا ہے۔ اس کمی کو ہر زبان کے متعدد ادبی شاہکاروں کے دوسری سبھی زبانوں میں ترجمے شائع کر کے کسی حد تک دور کیا گیا ہے۔

کسی قوم کے لیے اس کا ادب اس کی ثقافت کی معراج ہوتا ہے۔ ادب لوگوں کو اعلا اقدار کی بلندیوں تک پہنچاتا ہے۔ عوام میں جوش ولولہ اور کیف و سرور پیدا کرتا ہے۔ یہ لوگوں میں حسن و جمال کے تئیں مربوط تصور قائم کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ہمیں ایسے ادب کو فروغ دینا ہے جس میں قدیم اور جدید کے درمیان ایک حسین امتزاج پایا جاتا ہو، وہ عوام کے ذہنوں میں رچ، بس سکے، جس کی عظمت اور تابناکی ہمیشہ برقرار رہے اور جو ہمیں اپنی مادر وطن کی خدمت کے لیے ہمیشہ دعوت عمل دیتا رہے۔

ہر دہی کو بھی ساہتیہ اکاڈمی سے اسی طرح کی خدمات کی توقعات تھیں اور یہ بات اطمینان کی ہے کہ مذکورہ اکاڈمی اس سلسلے میں سرگرمی کے ساتھ یہی خدمات انجام دے رہی ہے۔

(بہ شکریہ پریس انفارمیشن بیورو، حکومت ہند)

★

ڈاکٹر بشیشر پردیپ
۱۸۔ گلستان کالونی
لکھنؤ

پوسٹ مارٹم کے بعد لاش گھر آ چکی ہے اور ایک بار پھر گھر میں کہرام مچ گیا ہے۔ پچیس برس کی عمر کے اکلوتے جوان بیٹے کی لاش! سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی جس پر پیلے، پیلے، بڑے بڑے داغ نمایاں ہیں، جو پوسٹ مارٹم میں جسم کو چیرنے پھاڑنے سے بلڈ سیرم (BLOOD SERUM) اور چربی کی وجہ سے لگ گئے ہیں۔ پوسٹ مارٹم کی وجہ سے پورے چوبیس گھنٹے کے بعد لاش گھر آئی ہے۔ اور ابھی تک سریواستوا جی کی آنکھیں اسی طرح سوکھی ہیں۔ معمولی سی بات پر آنسو بہانے والے سریواستوا جی نہ اپنے بیٹے کی موت کے وقت روئے اور نہ اب اس کی لاش کے گھر آ جانے پر ــــ لاش ان کے قدموں کے پاس رکھ دی گئی ہے۔ لیکن وہ اسی طرح خاموش بیٹھے ہیں۔ ایک ٹک اپنے بیٹے کے ادھ کھلے چہرے کو دیکھتے ہوئے ــــ انھیں اس طرح خاموش بے سدھ بیٹھے دیکھ کر دوسروں کی آنکھوں میں پانی بھر آتا ہے۔ جوان بیٹے کی موت کے صدمے نے شاید ان کی آنکھوں کے سوتے سکھا دیے ہیں!

ابھی ابھی ان کی بڑی بہن آگئی ہے اسی کا انتظار تھا۔ وہ آئے تو لاش کا انتم سنسکار کر دیا جائے! ــــ وہ زار و قطار روتی ہوئی ان کے پاس آئی تو وہ بولے۔

"دیکھو نا بہن! کتنا سندر لگ رہا ہے کفن میں ــــ بُت تراش دیا گیا ہو جیسے۔"

انھیں روتے نہ پاکر اور اس طرح کی باتیں کرتے دیکھ کر ان کی بہن اور بھی زور سے رونے لگی ہے۔ اندر رونے میں اس کا ساتھ سریواستوا صاحب کی بیوی دے رہی ہیں۔

"آخر کیا ہو گیا ہے انھیں ــــ یہ روتے کیوں نہیں؟" بہن کے رونے کے انداز میں یہ سوال نمایاں ہے۔

سریواستوا صاحب اسی گہری سوچ میں ڈوب جاتے ہیں ــــ اور اس وقت ان کے ہونٹوں پر اچانک ہنسی کی ایک ہلکی سی لکیر نمودار ہوتی ہے جس کا عنوان ڈھونڈنے کی لوگ کوشش کرتے ہیں لیکن ڈھونڈ نہیں پاتے۔

تھوڑی دیر کے بعد رشتہ کے چند لوگ لاش کو نہلانے کے لیے اندر آئے۔ اور ان سب کو کمرے سے باہر جانے کے لیے کہہ دیا۔ شام ہو رہی ہے۔ رات بھر لاش کو گھر میں نہیں رکھا جا سکتا۔ جلد سے جلد نکال لے جائیں گے تو سنسکار کر کے وقت پر لوٹ سکیں گے۔

سریواستوا صاحب اچانک بولے:

"اسے ابھی لے جائیں گے کیا ــــ؟ کل صبح لے جاتے تو اچھا تھا۔ آج کی رات میں اس کمرے میں اپنے بیٹے کے پاس رہ لیتا ــــ ایک رات اس کے ساتھ سو لیتا۔ بچپن میں یہ اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال کر سوتا تھا۔"

ان کی اس بات سے لوگوں کا دل بھر آیا ہے۔

"نہیں چاچا جی! اب اس میں کیا رکھا ہے ــ؟ پہلے ہی چوبیس گھنٹے ہو گئے ہیں۔ اب اور دیر ٹھیک نہیں۔"

سر لیو ستوا جی مایوس نگاہوں سے بیٹے کی لاش کی طرف دیکھتے ہیں اور باہر آجاتے ہیں۔

آج سے پانچ برس پہلے جب رام اوتار پہلی بار پی کر گھر آیا تھا تو ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔ انھوں نے آج تک شراب کی بوتل کو چھوا تک نہیں تھا، اور ان کا اکلوتا بیٹا شراب پینے لگا تھا۔؟!
انھوں نے بیٹے کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہ سمجھا۔ وعدہ کرتا اب نہیں پیئے گا لیکن پھر پی آتا۔۔۔ اور پھر ان کو پتہ چلا کہ رام اوتار کے کچھ دوست ہیں جو اسے بری راہ پر ڈال رہے ہیں۔ وہ لوگ اسمگلنگ کا دھندا کرتے ہیں۔ اور رام اوتار ان کا ساتھی ہے۔۔۔ اسمگلنگ کے بارے میں جان کر وہ بری طرح ڈر گئے۔ ایک نہ ایک دن سب پکڑے جائیں گے۔ کب تک چھپے گی ان کی یہ کارستانی۔؟ پکڑے جائیں گے اور پھر جیل!

رام اوتار۔ یہ بوجھ کچھ تو دور کرتا۔ انھوں نے ڈر کے مارے اپنی بیوی سے بھی بات نہ کی۔ بیوی پوچھتی۔۔۔ آخر رام اوتار کرتا کیا ہے۔؟
آئے دن نئے نئے کپڑے سلوا رہا ہے۔ مہنگی مہنگی چیزیں خرید رہا ہے۔ اسکوٹر بھی خرید لیا ہے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں کھاتا پیتا ہے۔؟"
اور وہ بیوی سے جھوٹ بول دیتے۔
"ارے تم کیا جانو۔ وہ آرڈر سپلائی کا کام کرتا ہے۔ اچھی خاصی آمدنی ہے اس کی۔ تم اس کے لیے اب کوئی رشتہ دیکھو۔"
اور انھوں نے خود بھی دو چار جگہ اس کے لیے رشتہ کی بات کی۔ لیکن کوئی بھی رشتہ نہیں آ رہا تھا۔
اور یہ دیکھ کر وہ بے چین ہو اٹھتے۔۔۔ جب تک لوگوں کو لڑکے کی ٹھوس آمدنی کا ثبوت نہ ملے وہ رشتہ کرنے کو تیار نہیں ہوتے یا پھر۔۔۔؟ یا پھر۔۔۔؟؟ نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں۔۔۔ ان کو بھی تو جب پتہ چلا تھا جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اپنے گھر میں اس طرح کی باتیں کر رہا تھا۔۔۔ گرما گرم بحث کے دوران وہ لوگ بہت کچھ بک گئے تھے۔
جب انھیں اس کے دھندے کے بارے میں پتہ چلا تو وہ اس کمرے کے گرد منڈلانے لگے۔ جس میں رام اوتار اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوتا۔
اور یہ سلسلہ دو برس تک چلتا رہا۔۔۔ اور اس دو سال کے عرصہ میں انھوں نے کئی بار باتوں باتوں میں اسے سمجھایا کہ اس کی سوسائٹی اچھی نہیں ہے۔ لیکن رام اوتار نے ان کی نصیحت پر کچھ دھیان نہ دیا۔
اور پھر ایک دن انھوں نے محسوس کیا کہ رام اوتار کچھ بے چین سا ہے۔ انھوں نے پتہ لگانے کی بہت کوشش کی لیکن اس نے کچھ نہ بتایا۔ وہ اس کی بے چینی کے بارے میں اندازے ہی لگاتے رہے۔ لیکن اس روز انھیں گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی جب رام اوتار کے دو دوست اس سے ملنے کے لیے آئے اور اس نے ماں کے ذریعہ کہلا دیا کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔
اور کل یہ حادثہ ہو گیا۔ وہ کسی ٹرک کے نیچے آ گیا تھا۔۔۔ سڑک کے کنارے اس کی لاش پڑی ملی تھی۔ وہ صبح سویرے گھر سے گیا تھا۔ شام کو نہیں آیا۔۔۔ رات بھر نہیں آیا۔ پہلے بھی وہ کئی بار بغیر بتائے رات بھر گھر سے غائب رہتا تھا، اور ان کی تشویش کا باعث بنتا تھا۔ لیکن اب کافی دنوں کے بعد وہ رات کو غیر حاضر تھا۔۔۔ ان کی تشویش کچھ زیادہ ہوئی۔۔۔ رات بھر نہیں سوئے اور صبح سویرے ان کو پتہ چلا کہ ان کے لڑکے کا حادثہ ہو گیا ہے۔ اور لاش اسپتال میں ہے۔
یہ سن کر وہ کچھ لمحوں کے لیے ساکت سے ہو گئے۔ یہ انجام تو وہ جانتے تھے؛ بری سنگت برے دھندے کا انجام۔۔۔ یہ حادثہ نہیں ہے۔ ہرگز نہیں ہے۔ ان کے سوا کسی کو پتہ نہیں کہ وہ کس بری سنگت میں پھنس گیا تھا۔ ان کا لڑکا ایک بری سوسائٹی کا شکار ہو گیا۔ وہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتے۔ خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ خاموش۔ اپنے دل پر جبر کیے ہوئے۔ کسی کو پتہ نہ چلے کہ رام اوتار کی عادتیں خراب تھیں اس کا چال چلن اچھا نہ تھا۔۔۔ اف! کتنی گھٹن ہے۔؟! نہ جانے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کیا ہے۔؟!
جب چتا جل رہی تھی تو وہ پاس ہی ساکت سے کھڑے تھے۔ لوگ وہاں سے ہٹ کر ذرا پرے بیٹھ گئے تھے۔ ان کا بھتیجا ان کے پاس آیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔
"چاچا جی۔۔۔ ادھر آ جایئے۔۔۔ وہاں چل کر بیٹھیے۔

بہت لوگوں کے پاس تھے

"بھیّا! ذرا چلو — دیکھو نا شعلے کتنی بلندی تک جا رہے ہیں — اور کتنے سُندر ہیں۔ پیلے پیلے۔ لال لال۔ رام اوتار کی چتا بھی کتنی سُندر ہے — ہے نا۔؟"

اس کے ساتھ چلتے ہوئے وہ پیچھے مڑ کر دیکھتے جاتے تھے۔

ایک بجے کے قریب جب لوگ گھر واپس آئے تو رام اوتار کی ماں، ان کی بہن، ان کی رشتہ کی دوسری عورتیں پھر سسک سسک کر رونے لگیں۔ لیکن سریواستوا جی کی آنکھوں میں اب بھی آنسو نہ تھے۔

ماتم پُرسی کے لیے آئے ہوئے رشتہ دار تھک کر سو گئے تھے۔ کچھ لوگوں کو صبح سویرے واپس جانا تھا۔ ان کی بیوی دبے پاؤں ان کو دیکھنے آئی کہ وہ سو گئے ہیں یا نہیں — انھیں جاگتا دیکھ کر وہ دوپٹّے کے پلّو کو منہ میں ٹھونسے، اپنے رونے کی آواز کو اندر ہی اندر دبائے اُلٹے پیروں واپس چلی گئی۔

صبح سویرے ابھی لوگ وداع نہیں ہوئے تھے کہ پولیس انسپکٹر آگیا۔ ایک سپاہی کے ساتھ۔ رشتہ دار سب چوکنّے ہو گئے۔

ڈرائنگ روم میں انسپکٹر اور سریواستوا جی کے علاوہ کچھ سگے سمبندھی بھی بیٹھے تھے — انسپکٹر صاف لفظوں میں باتیں کر رہا تھا۔

"سریواستوا صاحب! پولیس کو پتہ چلا ہے کہ آپ کا بیٹا رام اوتار کچھ جرائم پیشہ لوگوں کا ساتھی تھا — آپ اس کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں۔؟"

"جی — جی — میں تو کچھ نہیں جانتا — میں۔ میں کیا بتا سکتا ہوں۔؟"

"آپ کو اپنے بیٹے کے چال چلن کے بارے میں تو پتہ ہوگا۔ اس کی عادتیں، اس کے دوست یار، اس کا وقت بے وقت گھر آنا یا اس کا کام دھندا۔؟"

سریواستوا صاحب نے محسوس کیا کہ انسپکٹر کی گھورتی ہوئی تیز نظروں کے علاوہ اور بھی بہت سی آنکھیں انھی پر لگی ہوئی ہیں۔ ان کے رشتہ دار سگے سمبندھی جو ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے تھے۔ یا جو پردے کے پیچھے کھڑے ڈرائنگ روم میں ہونے والی باتوں کی طرف کان لگائے تھے — مرد۔ عورتیں۔ سب۔ سریواستوا صاحب کا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔

وہ خاموش انسپکٹر کی طرف دیکھنے لگے۔ انسپکٹر نے ان کی طرف سے نگاہیں ہٹا لیں — اور سگریٹ سلگانے میں لگ گیا۔ شاید وہ انھیں سنبھلنے کے لیے موقع دینا چاہتا تھا۔

ڈرائنگ روم میں اتنے لوگوں کی موجودگی کے باوجود ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں کوئی بیٹھا ہی نہ تھا — خاموشی! بے چارگی!! تجسّس!!!

ایک منٹ — دو منٹ۔ پورے پانچ منٹ!

اور پھر اچانک سریواستوا صاحب بولے:

"میں — میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ ٹھیک تھا — وہ بہت اچھا لڑکا تھا — اگر گمراہ ہو گیا تھا تو اسے گمراہ کرنے والے دوسرے تھے — اور — اور میں کیا بتا سکتا ہوں انسپکٹر صاحب!

ان کی آواز روہانسی ہو گئی —

انسپکٹر نے ان سے مزید پوچھ گچھ مناسب نہیں سمجھی۔ اٹھتے ہوئے بولا۔

"اچھا! اب چلتا ہوں۔ پھر کسی وقت حاضر ہوں گا۔"

وہ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے انسپکٹر صاحب سے ہاتھ ملایا اور پھر دھم سے کرسی میں دھنس گئے۔ اور بڑبڑانے لگے

"جانتے ہیں۔ سب جانتے ہیں۔ اور میں — میں تیرے بارے میں جانتے ہوئے بھی نہیں جاننا چاہتا تھا — رام اوتار! میرے بیٹے۔!"

اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

*

نفلیت بانو
ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

انسانی درندے

دردسے کراہتی ہوئی
ایک نڈھال جان۔
نحیف و ناتواں
آنکھیں ویراں
زلف پریشاں
زندگی گریاں
موت خنداں
مسیحا حیراں

سن رسیدہ
کمر خمیدہ
ہڈیاں بوسیدہ
زرد چہرے پہ
جھریوں کی باریک چادر
شکن آلود

میلی میلی
یا —
کسی دریا کا سوکھا ہوا سینہ
جابجا دراریں
یا —
کسی بچے کا غبارہ۔
مسلا ہوا سکڑا ہوا

کانپتے تھرتھراتے لبوں پر
زہر آلود تبسم رقصاں
جابجا ہونٹوں کی کھال ادھڑی ہوئی۔
جیسے کسی دلدل کی تہہ دھوپ سے اکھڑی ہوئی
پھر بھی نیلے ہونٹ پر مسکراہٹ بکھری ہوئی
اُف!
تقدیر کی سیاہی لبوں پر اتری ہوئی

یہ کون ہیں اس کے اردگرد؟
منڈلاتے ہوئے لاش پہ جیسے گدھ
یہ وہ ہیں! یہ وہ ہیں!
جن کو اس نے جنم دیا
جن کو اس نے خون پلایا
جن کو اس نے پروان چڑھایا

ماں کی دولت کے بھوکے
یہ انسانی درندے
ماں دم توڑ رہی ہے
دولت بیٹوں میں بٹ رہی ہے۔

توقیر جمال نجیب آبادی

غزل

کتابِ ہستی کے ہر ورق پر لکھی ہے روداد سوزِ غم کی
مگر ہے ایسی نگاہ کس کی پڑھے جو تحریر چشمِ نم کی

خدا کرے مجھ پہ راستے میں نہ بارِ احساں ہے کسی کا
سفر میں میرے جو کام آئے وہ روشنی ہو خود اپنے دم کی

سوادِ منزل کا ذکر سن کر سبک روی جب سے میں نے چھوڑی
وہ حادثے پیش آ رہے ہیں کہ خیر مانگوں قدم قدم کی

خزاں رسیدہ چمن میں جا کر کھلے ہیں مجھ پر رموزِ فطرت
میں زرد پتوں پہ پڑھ رہا ہوں نوشت احساس کے قلم کی

یہ رکھ رکھاؤ نہیں تو کیا ہے کہ دوستوں کی ہو یا کسی کی
جمال نے اپنے دل میں رکھ لی چھپا کے ہر داستان غم کی

انور انصاری
چشمن اثر (اثاثہ)
اولڈ ایچ بی روڈ ۔ مقابل چوناجتہ
رانچی (بہار)

تلوک چند محروم کی رُباعیاں

رُباعی ایک مشکل فن ہے ۔ یہ اُردو ادب کی ایسی صنف ہے جو تخیل کی بلندی اور بیان کی پختگی چاہتی ہے ۔ رُباعی میں شاعر اپنی زندگی کے مشاہدات و تجربات کو دل نشین اور پر اثر انداز میں ادا کرتا ہے ۔ رُباعی میں یوں تو چار مصرعے ہوتے ہیں مگر چوتھا مصرعہ ایسا ہوتا ہے جو رباعی کی جان کہا جاتا ہے ۔

جب ہم تلوک چند محروم کی رُباعیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ محروم کی رباعیاں دلکش انداز بیان سے مزین ہیں ۔ حسن ترکیب میں جدت ہے ۔ ندرت خیال میں سادگی ہے ۔ فکر کی گہرائی سے بھرپور ہے ۔ محروم کی رُباعیوں میں حقیقت نگاری بدرجہ اتم موجود ہے ان میں خیال کی پاکیزگی اور خلوص ہے ۔ ان رباعیوں کو پڑھ کر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے ۔

تلوک چند محروم عصر حاضر کے "انسان" سے بہت نالاں ہیں ۔ انسان کو ننگ انسانیت اور اخلاق سے گری ہوئی حرکتیں کرتے ہوئے دیکھ کر ان کا دل بے چین ہو جاتا ہے ۔ اس کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں ۔

بے رحم و کرم سے آج بیزار انساں
انساں سے ہے خود برسر پیکار انساں

دُنیا کو بنا دیا ہے دوزخ اس نے
کس منہ سے ہے جنت کا طلب گار انساں

محروم کی رُباعیوں میں انسانی دل کی تڑپ موجود ہے ۔ شاعر کا دل دُنیا کی نت نئی مصیبتوں پر کڑھتا ہے اور بے اختیار ان کی زبان سے نکل جاتا ہے

حاصل کتنا کمال انساں نے کیا
افلاک کو پامال انساں نے کیا
یہ عقل مگر ابھی نہیں آئی کہ کیوں
انساں کو تباہ حال انساں نے کیا

محروم چاہتے تھے کہ دنیا مکر و ریا اور فریب و تصنع سے پاک ہو ۔ وہ دنیا کو صدق و صفا کی دنیا دیکھنا چاہتے تھے مگر انسان کے جور و ستم کے آگے وہ بے بس ہیں ۔ وہ دُکھ بھرے انداز میں کہتے ہیں

دُنیا تھی یہی صدق و صفا کی دُنیا
رحم و کرم مہر و وفا کی دُنیا
انساں نے بنا دیا بالآخر اس کو
جور و ستم و کذب و ریا کی دُنیا

محروم کے نیک اور پاک خیالات کو دیکھنے کے بعد ہی جوش ملیح آبادی نے اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا تھا :۔

"محروم کی رُباعیاں ان حضرات کو لطف اندوز ہونے اور فائدہ اُٹھانے کا بھرپور موقع دیں گی جو بجا طور پر اس کا یقین رکھتے ہیں کہ شاعری حیات انسانی کو آرائش، آسودگی اور استواری کی دولت بخش سکتی ہے ۔"

یہ حقیقت ہے کہ تلوک چند محروم نے شاعری میں کسی سے اصلاح نہیں لی مگر آپ نے شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور شاعری کے مرغزار میں حسین اور دلکش گل بوٹے کھلائے ہیں آپ ایک فطری شاعر تھے اس لیے آپ کے کلام میں زبان و بیان کی سادگی اور حسن و لطافت دونوں نمایاں ہیں ۔

مذہب کے بارے میں فرماتے ہیں ۔

مذہب کی زباں پہ ہے نکوئی کا پیام
حسنِ عمل اور راست گوئی کا پیام
مذہب کے نام پر لڑائی کیسی
مذہب دیتا ہے صلح جوئی کا پیام

محروم کی نظروں میں مذہب کی بنیاد پر نسلِ انسانی کی تفریق ایک بڑا جُرم ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

دنیا کے حق آگہوں کا مذہب ہے ایک
تعلیم خدا رسی کا مکتب ہے ایک
تفریق کے ہیں بہت بہانے ورنہ
اللہ کہو کہ رام مطلب ہے ایک

محروم نے اپنی رباعیوں میں سادہ، سلیس اور عام فہم زبان استعمال کی ہے۔ ان کی زبان ایسی عام فہم ہے جسے بچے بوڑھے عورت مرد سبھی سمجھتے ہیں۔ رُباعی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ رُباعی کا ہر مصرعہ چست ہونا چاہیے اور دوسرا مصرعہ پہلے سے بلند ہونا ضروری ہے اور چوتھا مصرعہ تو جیسے رُباعی کی جان ہی ہوتا ہے۔

علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی

محروم بھی انسان کو انسان اسی وقت تک سمجھتے ہیں جب تک اس میں نیک و بد کی تمیز باقی رہتی ہے ورنہ جس انسان میں نیک و بد کی تمیز نہیں وہ انسان کہاں۔ محروم ایک سیدھے سادے انسان تھے ان کی زندگی لہو و لعب سے پاک تھی۔ وہ ہر انسان کو برابر سمجھتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کی تلقین اس طرح کرتے ہیں ؎

قائل ہم ذاتِ پاکِ یزداں کے ہیں
قائل فرمودہ ہائے شیطاں کے ہیں
کہنے کو تو ہندو بھی مسلماں بھی ہیں ہم
پابند نہ دھرم کے نہ ایماں کے ہیں

محروم کی رُباعیاں عامیانہ اور سوقیانہ رنگ سے بالکل پاک ہیں ان کی رُباعیوں میں ادبی حسن، قلبی واردات، گہرائی و گیرائی، سنجیدگی و متانت اور زبان کی لطافت و حلاوت سب ہی کچھ موجود ہے۔ ان کے کلام میں ندرت اور بلندی ہے۔ محروم کی شاعری کے متعلق سر شیخ عبدالقادر کی بیش قیمت رائے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں،

"..... بڑے بڑے سخنوروں نے ان کی شاعری کو سراہا ہے اور ان کے حُسنِ بیان کی تعریف کی ہے۔ الفاظ کی برجستگی، بندش کی چُستی، خیالات کی پاکیزگی حضرت محروم کے اشعار کی خصوصیت ہیں۔ مگر ان کی شاعری کا خاص وصف جو مجھے خاص طور پر پسند ہے وہ یہ ہے کہ اس میں صلح و محبت کی تلقین ہے۔"

صلح و محبت کی تلقین دینے والے عدم تشدد کے پیغامبر مہاتما گاندھی جی کا بیان تلوک چند محروم کی زبان میں سنیے ؎

گاندھی جی لڑائی کو بُرا کہتے ہیں
ظاہر ہے بُرائی کو بُرا کہتے ہیں
حیرت ہے تو اُن کی عقل پر جو لوگ
دُنیا کی بھلائی کو بُرا کہتے ہیں

غرض کہ محروم کی رُباعیوں کے مطالعہ سے پتہ چلے گا کہ ان کی رُباعیوں میں زبان و بیان کی پختگی ہے۔ خیالات پاک ہیں، اور جذبات انسانی محبت سے مملو ہیں۔ محروم اپنی رباعیوں میں ایسے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں جو آسان اور پُر تاثیر ہوتے ہیں۔ اس لیے محروم کی رباعیاں انسانی قلب و جگر کی وسعتوں پر چھا جاتی ہیں۔ اگرچہ رُباعی ایک ایسی نازک صنعتِ سخن ہے جس میں بڑی چابک دستی اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر محروم نے اس مشکل فن کو ماہرانہ انداز سے برتا ہے۔ ان کی رُباعیوں میں اصلاحی رنگ زیادہ غالب ہے اور انسانی اخوت کا عنصر بدرجۂ اتم موجود ہے۔

★

اسعد بدایونی
شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ
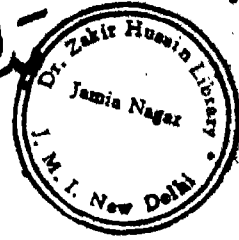
بدایوں کی ایک گمنام شخصیت

علی احمد خاں اسیر

ہندستان کے علمی، ادبی اور روحانی مراکز میں بدایوں کو روزِ اول سے جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا، شیخ شہاب الدین مہمرہ۔ خواجہ ضیاء الدین نخشبی (مصنف طوطی نامہ) ملا عبدالقادر مورخ البدایونی ظہور اللہ نوا اور بے شمار باکمال شخصیتوں کی تربیت اسی خاکدان سے ہوئی آج نیرنگی وقت کے سبب ان نابغۂ روزگار شخصیات سے نئی نسل بہت کم واقف ہے۔ خیر یہ تو ماضی بعید سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے مگر ان لوگوں سے بھی ہمیں خاطر خواہ استفادے کا موقع نہیں مل سکا جن کا تعلق ماضی قریب سے ہے البتہ فانی ایسی شخصیت تھے کہ سرد و گرم زمانہ کا مقابلہ بڑی خوبی سے کر گئے اور ان کی شخصیت کے خد و خال وقت کے بے رحم ہاتھوں سے پامال نہ ہو سکے، لیکن ان کے بیشتر ہم عصر اور پیش رو نیرنگیٔ دوراں کے شکار ہو گئے، ایسا نہیں کہ ان میں وہ خوبیاں نہ تھیں جو کسی شخصیت کی تعمیر اور استحکام کے لیے ناگزیر ہوتی ہیں، بلکہ معاملہ یہ تھا کہ ان کے کارناموں سے دنیائے ادب پورے طور پر واقف نہ ہو سکی کیونکہ ان حضرات کی تخلیقات و تصنیفات کی ترسیل و اشاعت کا مناسب انتظام نہ ہو سکا۔ ان بہت سے ناموں میں سے چند اہم ترین نام یہ ہیں۔ عبدالحی بیخود۔ مولانا حسین مولانا اکرام احمد لطف۔ دیبی پرشاد سحر امیر احمد اثر ٹونک والا بدایونی عبدالجامع جامی مولانا ضیا القادری۔ میر محفوظ علی اور سلطان حیدر جوشش۔

مولانا علی احمد خاں اسیر بھی بدایوں کی ان نابغۂ روزگار ہستیوں میں تھے جن کے فیض عام سے مستفید ہونے والوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ شکیل بدایونی کے استاد مولانا ضیا القادری مرحوم کی تعلیم و تربیت حضرت اسیر ہی کی نگرانی میں ہوئی اور انہوں نے مولانا ضیا القادری کو مثل اولاد کے سمجھا۔

مولانا اسیر کی پیدائش ۱۸۵۲ء مطابق ۱۲۶۸ھ میں بریلی میں ہوئی ان کے والد گرامی جنگ باز خاں بسلسلۂ معاش بدایوں منتقل ہو گئے تھے، چونکہ اسیر کی ابتدائی تعلیم و تربیت بدایوں ہی میں ہوئی اس لیے خود کو بدایونی لکھتے تھے۔ حامد حسن قادری نے حضرت اسیر کے متعلق ان الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے:

"مولانا اسیر ایک مدت تک سینٹ جانس کالج آگرہ میں پروفیسر رہے۔ بڑے صاحب دل اور درویش کامل تھے۔ ان بزرگوں میں تھے جن کے دیدار و صحبت سے خدا یاد آتا ہے اور جن کی نگاہ سے دل کو تسکین ہوتی ہے۔" (زمانہ کانپور دسمبر ۱۹۳۹ء)

اسیر نے مولانا عبدالحق خیر آبادی جیسے جید عالم سے مدرسۂ عالیہ رام پور میں فلسفہ و منطق کی تعلیم حاصل کی تعلیم سے فراغت پانے کے بعد بدایوں میں "مطبع نسیم سحر" کے نام سے ایک پریس ۱۸۷۸ء میں مولوی امتیاز احمد تاثیر کی شرکت میں قائم کیا جس سے ایک ہفت روزہ اخبار "نسیم سحر" بھی شائع ہوتا تھا ۱۸۸۱ء میں مولانا اسیر کو بدایوں کے تحصیلی مدرسے میں ملازمت مل گئی اور پریس کی طرف سے ان کی توجہ رفتہ رفتہ ختم ہو گئی اس پریس

کی معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ۱۹۲۳ء تک قائم رہا۔ مولانا اسیر کے مطبع سے جو کتابیں شائع ہوئیں ان میں سے چند یہ ہیں:۔

(۱) غوامض الحساب (دیبی پرشاد سحر) (۲) مراۃ الصفا (دیبی پرشاد سحر) (۳) رسالہ قیاذ (دیبی پرشاد سحر) (۴) محیط المساحت (دیبی پرشاد سحر) (۵) دلائل المشائین (دیبی پرشاد سحر) (۶) صبر و شکیب کی لوٹ (عبدالحئی بیخود) (۷) ہوش و خرد کی دکان (عبدالحئی بیخود) (۸) منقبت خلفائے راشدین (دلدار علی شاہ مذاق) (۹) فضائل غوثیہ (دلدار علی شاہ مذاق) (۱۰) طہارت کبریٰ (مولوی منور حسین) (۱۱) دیوان گلزار نظم (مولوی حامد بخش) (۱۲) باغ و بہار جیلانی (مولوی ستار بخش) (۱۳) شرح گل گشتی (مولوی امتیاز احمد تاثیر)

۱۹۱۲ء میں بدایوں کے اسکول کی مدرسی سے پنشن پائی۔ اسی سال آپ کا تقرر سینٹ جانس کالج آگرہ میں بحیثیت پروفیسر عربی ہو گیا ۱۹۲۷ تک اسی کالج سے وابستہ رہے۔ آگرہ میں آپ کا قیام محلہ چار سو دروازہ میں تھا جہاں طلبا کو مفت درس دیتے اور اہل علم کے جلسے منعقد کرتے تھے ان جلسوں میں مفتی انتظام اللہ شہابی جیسے علما نیاز مندانہ شریک ہوتے تھے۔

مولانا اسیر نے اپنی زندگی بہت سادہ اور درویشانہ انداز سے بسر کی صوفیانہ مسلک کے پیرو تھے اور عشقِ رسول کو اپنا سرمایۂ حیات جانتے تھے آخری عمر میں مولانا نے بہاریہ اور عاشقانہ شاعری بالکل ترک کر دی تھی۔ عشق رسول کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ ہر وقت "دیار دوست" میں خاتمہ بالخیر ہونے کی خواہش کا اظہار کرتے تھے جو پوری ہوئی اور سفر حجاز سفر آخرت بھی ثابت ہوا جون ۱۹۲۷ء میں حج کے لیے روانہ ہوئے بمبئی پہنچ کر چند روز جمیل احمد قادری (والد شکیل بدایونی) کے یہاں قیام کیا جو بمبئی کی کسی مسجد میں پیش امام تھے ۲۰ جولائی ۱۹۲۷ء میں مدینہ منورہ میں وصال ہوا۔ حامد حسن قادری لکھتے ہیں:۔

"... مکہ معظمہ پہنچ کر ایسے بیمار ہوئے کہ مدینہ طیبہ کی حاضری دشوار ہو گئی۔ وہ الطاف

میں وطن مولوی اسمٰعیل ذبیح بدایونی کے ہمراہ ہوئے۔ ... مولانا نے اپنے میزبان سے اصرار کیا کہ جس طرح ہو مجھے مدینہ پہنچا دو نہ پہنچ سکوں گا تو راستے ہی میں ختم ہو جانا چاہتا ہوں۔ چنانچہ مولانا اسمٰعیل ذبیح نے خاص طور پر موٹر کا انتظام کیا اور مولانا اسیر دیار محبوب کو روانہ ہوئے۔ راستے بھر اپنا ایک شعر پڑھتے جاتے تھے اس کا مضمون سچ ہو گیا اور راستے ہی میں وصلِ دوام حاصل ہو گیا وہ شعر یہ تھا۔

الجھ کر رہ گیا میں وادیٔ طیبہ کے کانٹوں میں
مجھے پہنچا دیا ہے ضعفِ تن نے منزلِ جاں تک

زمانہ کانپور دسمبر ۱۹۲۹ء

ان کے شاگرد رشید اور قریبی عزیز مولانا ضیا القادری نے تاریخ وفات کہی!

کہیے ضیا سالِ وصالِ جناب
خاتمہ بالخیر ہوا بے حجاب

۱۹۲۷ء

مولانا اسیر کے تلمذ کے سلسلے میں بہت مختلف قسم کے بیانات ملتے ہیں۔ مالک رام نے انھیں "تلامذۂ غالب" میں ذکریا خاں ذکی (تلمیذ غالب) کا شاگرد لکھا ہے۔ ضیا القادری نے "منقبت خواجہ ولی ہند" کے مقدمے میں مولانا کو غالب اور مومن دونوں کا شاگرد قرار دیا ہے۔ خمخانۂ جاوید (لالہ سری رام) اور ذوقِ مذاق (حافظ فضلِ اکرم) میں انھیں بدایوں کے مشہور صوفی بزرگ اور شاعر حضرت دلدار علی شاہ مذاق اور امجد بدایونی (تلمیذ مذاق) کا شاگرد بتایا گیا ہے جس کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ مولانا اسیر کے ایک شاگرد سید منظور علی بدایونی نے اپنی کتاب "آثار اولیائے شہر بدایوں" تاریخی نام صدیقہ تاریخ ۱۹۱۹ میں مولانا کو مذاق کا شاگرد لکھا ہے حضرت مذاق کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

"... میرے استاد حضرت اسیر ظلہم بھی شاعر تھے

[illegible] ہے تلمذ کی نسبت رکھتے ہیں اگرچہ [illegible] میں مرزا غالب کے پیرو ہیں" حدیقۂ تاریخ [illegible]
مطبوعہ ابوالعلائی پریس آگرہ

یہ کتاب علی احمد خاں اسیر کی ہی زیرِ نگرانی شائع ہوئی تھی اگر مندرجہ بالا بیان حقیقت پر مبنی نہ ہوتا تو مولانا اسیر یقیناً اس کی تردید فرماتے دوسرے حضرات کو التباس غالباً اس وجہ سے ہوا کہ مولانا اسیرؔ پیروی غالب" کے حامی تھے، جس کی طرف منظور علی بدایونی نے بھی اشارہ کیا ہے۔

مولانا اسیر نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ علمی و ادبی کاموں میں صرف کیا اور کثیر تعداد میں کتابیں تصنیف کیں، مگر ان کی کتابیں عرصے سے نایاب ہیں۔ موصوف کی کئی تصانیف اشاعت سے تادمِ تحریر محروم ہیں۔ جن میں دو کتابیں بہت اہم ہیں پہلی کتاب "حیاتِ عبدالقادر بدایونی" ہے جو عہدِ اکبری کے مشہور مورخ کی زندگی کا احاطہ کرتی ہے یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ مولانا اسیر ہی نے ملّا عبدالقادر بدایونی کی قبر کا صحیح پتہ لگایا تھا جس کے آثار تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ آج وہاں پختہ قبر موجود ہے۔ مولانا کی یہ تحقیق آج بھی قابلِ تحسین ہے کہ ان کی کوششوں سے اس مشہور مورخ کی یادگار باقی رہ گئی۔ اس کام میں ان کے شریک نظامی بدایونی (بانی نظامی پریس بدایوں) تھے۔ دوسری اہم کتاب "حیاتِ شیخ" ہے جو شیخ اکبر محی الدین ابن العربی کے حالات پر مشتمل ہے۔ مشہور نقاد حسن عسکری نے اپنا آخری زمانہ ابن العربی کے فلسفے کو سمجھنے اور اپنے شاگردوں کو اس سے روشناس کرانے میں بسر کیا وہ ابن العربی سے مشہور فرانسیسی دانشور رینے گینوں (اسلامی نام شیخ عبدالواحد یحییٰ) کی وساطت سے واقف ہوئے تھے لہٰذا یہ کتاب ابن العربی کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے یقیناً مفید ہوگی۔

مولانا کی تمام غیر مطبوعہ کتابوں کے مسودے ان کے شاگرد رشید مولانا ضیاء القادری مرحوم کے پاس تھے اب غالباً ضیاء القادری صاحب کے فرزندِ ارجمند جناب یوسف حسن قادری کی ملکیت میں ہوں گے جو ایک عرصے سے کراچی میں مقیم ہیں۔ مولانا اسیر کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں کی فہرست حسبِ ذیل ہے۔

مطبوعہ کتب

(۱) آئینۂ صدود اقلیدس (۲) قواعدِ اردو (۳) شجرۂ خاندانِ نقشبندیہ (۴) نظم معراج (۵) نظم جمال افروز (۶) سیرت نعمان (۷) مثنوی شیریں خسرو (۸) قصیدۂ نور (۹) منقبت خواجہ علی سند (۱۰) سیرت سیدنا ابوالعلا اکبرآبادی (۱۱) خلوت گاہِ ناز (۱۲) مشرقستانِ قدس

غیر مطبوعہ کتب

(۱) حیاتِ ملّا عبدالقادر بدایونی (۲) حیاتِ شیخ ابن العربی (۳) اولیائے بدایوں (۴) غیر مطبوعہ کلام۔

علی احمد خاں اسیر کے بہاریہ اور عاشقانہ اشعار کمیاب ہیں "میخانۂ جاوید" میں ان کے صرف تین شعر اس رنگ کی نمائندگی کرتے ہیں انہوں نے اپنے عاشقانہ کلام کی اشاعت کو پسند نہیں کیا مگر ان کی نعتیہ اور حمدیہ شاعری بھی بہت متنوع ہے اس میں جذبے کی شدت اور نیت کا خلوص پوری طرح موجود ہے۔ مولانا نے اردو کے ساتھ فارسی میں بھی شعر کہے ہیں ان کے کچھ منتخب اشعار درج کیے جاتے ہیں:

ادائیں نرگسِ چشم کی ہوں پسند اٹھاتے ہیں نازِ سب بیمار کے
نظر اس جنبشِ مژگاں کی ہے گردونِ گرداں تک
اشارے پر پھرا ہے الٹے پاؤں دہر تاباں تک
الجھ کے رہ گیا میں وادیٔ طیبہ کے خاروں میں
مجھے پہنچا دیا اس ضعفِ تن نے منزلِ جاں تک
کسی کی زلف کے صدقے میں قیدی چھوٹے جاتے ہیں
کھنچے یہ سلسلہ یارب اسیرِ پا بجولاں تک

تو آئینہ دارِ چشم و رو ہے ہر آئینہ رو میں تو بہ رو ہے
تو مہرِ خوبی میں کو بکو ہے دیارِ گیسو میں سو بسو ہے
تعیناتِ شئونِ اعیاں ہیں حسنِ ذاتی کہ سب کے سب ہیں
فنائے مطلق جو ماسوا ہے فنائے عالم مقام ہو ہے
کھنچا ہے عالم میں تیرا نقشہ یہ باغ و صحرا میں تو سراپا
تو غنچہ و گل میں رنگ و بو کر تو چشمِ آہو میں ہو بہو ہے
حیا کہاں کی حجاب کیا کر کہاں تک کوئی [illegible]

انتہائے پردہ دکھا کہ کلوہ نظیر میں ہو داور تو ہے
اسیر اس مہ جبیں کے صدقے کہ شش جہت یکی اسی کا جلوہ

وہ حسن انتہائے ہے کہ ہرہ چشم جا دویں دو بدو ہے

آسی کے قلم کی جولانیاں نظم و نثر دونوں میدانوں میں کھائی ہیں۔ ان کی نثر بھی دلچسپی اور لطف سے خالی نہیں ان کی تحریر اس زمانے کے مذاق کے عین مطابق ہے بیخود بدایونی کی تضمین (بر غزل مضطر خیر آبادی) "صبر و شکیب کی لوٹ" پر انہوں نے جو تقریظ لکھی اور جو انہیں کے مطبع نسیم سحر سے شائع ہوئی اس کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے تاکہ قارئین کو مولانا آسی کے اسلوب نثر سے بھی آگاہی ہو سکے۔

"ادھر تو اس مست پر درد نما و زدیدہ نگاہ نے وہ آفت ڈھائی نہ زہد و پارسائی کا خیال نہ رندی و آزادی کا ملال، جسے پایا لوٹ لیا، جو ہتے چڑھا جامہ تلاشی لی اور چھوڑ دیا۔ مضطر کی دردمندانہ تحریر اسی کی چھپی ہوئی کارروائیوں کا ایک پورا روزنامچہ ہے اور بیخود کی مستغیثانہ تقریر اسی کی پوشیدہ دست درازیوں کا ایک سچا کارنامہ اور ادھر انہیں خوخ طبع، سادہ کار، نازک خیالی کے خم آشام بادہ خوار بیخود اور مضطر نے اسی دزدیدہ نظر کی فریاد اور الغیاث کے پردہ میں بادۂ سخن کی بھری ہوئی دکان کہ ؎

نہ پیمانہ باقی نہ اب جام باقی
فقط اک اللہ کا نام باقی

جرعہ جرعہ کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ ڈالا قطرہ قطرہ ٹٹول لیا دکہیں دست ساقی میں ساغر و مینا ہیں نہ مینا و ساغر میں شراب کا چڑھاؤ اتار، دشراب میں نشہ ہے نہ نشہ میں دوران سری و اعضا شکنی کے لطف کا خمار ابی، اسیر دیوانے پھر تو کس امید پر تکیہ لگائے در میکدہ پر ہاتھ پاؤں پھیلائے پڑا ہے۔"

مولانائے موصوف کے مخصوص احباب اور نیاز مندوں کی فہرست میں مفتی انتظام اللہ شہابی، دیبی پرشاد سحر، ذکریا خاں ذکی (تلمیذ غالب)، عبدالمعبود سبحانی (پروفیسر فارسی سینٹ جانس کالج آگرہ)، مولوی سعید الدین خالق، قاضی غلام امیر نقاد ضیا القادری اور مولوی انعام اللہ خاں (رئیس آگرہ) جیسے باکمالوں کے نام شامل ہیں۔

*

بقیہ نئی غزل کا بحث صہ ۱۸ سے آگے

نئی غزلیہ اقلیم میں یہ ذہنی اور عملی غلط روی اور بےجروی تشویشناک ہے۔ یہ غیر غزلیہ رویہ اور غیر جمالیاتی برتاؤ اس کے حسین اور دلربا چہرہ پر کوڑھ کے بدنما داغ کے مترادف ہے۔ وقت کی ایک ہی گردش ان برصغیر اور برتانی تک بندیوں کو ساتویں پاتال میں پہنچا دے گی۔ نئی غزل کو آج کے بدلتے ہوئے سیاق میں جدید حسیت کی تہذیب کے ساتھ زندگی کے در پر ہاتھ میں شمع لیے کھڑے ہونا چاہیے۔ اسی وقت اس میں بیک وقت دم عیسیٰ اور روئے مریم کی زندگی بار کیفیت اور جمالیاتی برکت پیدا ہوگی۔ اور وہ ارتقائی معنوں میں ایک زندہ تابندہ اور پائندہ کردار کی حامل ہوگی

**

بقیہ حواشی ــــ حالی اور مسدس حالی ــــ صفحہ ۱۲ سے آگے

[illegible] آشفتہ بیانی میری ــ رشید احمد صدیقی، صفحہ ۲۰۰ ــ ۲۰۱، [illegible] ماخوذ از تاریخ ادب اُردو۔ مصنف رام بابو سکسینہ مترجم مرزا عسکری حصہ نظم صفحہ ۳۴۲۔ [illegible] موج کوثر۔ از محمد اکرام صفحہ ۶۶، [illegible] تاریخ ادب اردو۔ مصنف رام بابو سکسینہ۔ مترجم مرزا عسکری حصہ نظم صفحہ ۳۴۱ ــ ۳۴۰۔ [illegible] دیباچہ دوم مسدس حالی، صفحہ ۸۰ ــ ۸۱ مطبوعہ تیج کمار پریس لکھنؤ۔ [illegible] تاریخ ادب اردو۔ مصنف رام بابو سکسینہ، مترجم مرزا عسکری، حصہ نظم صفحہ ۳۱۱۔

ترجمہ: قطب اللہ

صرف تمہارے لیے

کوملا وردھن

"تالیوں کی آواز سے کان کے پردے پھٹے جا رہے ہیں۔ میں

"ملانہ" رقص ختم کرنے کے بعد پردے کے پیچھے کھڑی ہو کر پسینہ

پونچھتی ہوں اور تالیوں کی آواز پر پھولی نہیں سماتی۔

اماں دوڑی ہوئی آتی ہیں مجھے سینے سے لگا لیتی ہیں۔ ان کا چہرہ

فخر سے تمتما رہا ہے۔ سبھا کے سکریٹری گرتے پڑتے جلدی جلدی

سیڑھیاں چڑھ کر اسٹیج پر آتے ہیں اور ہانپتے ہوئے مجھ سے

کہتے ہیں۔۔

"کمال کر دیا۔ منّی تم نے! بہت خوب!"

پھر دوسری طرف مڑ کر بولتے ہیں۔ "ارے بھئی جلدی کرو۔

ان دونوں صوفوں کو گھسیٹ کر اسٹیج پر کیوں نہیں لگا دیتے۔؟ بس

منتری جی آنے ہی والے ہیں۔ ہار پھول سب تیار ہے نا؟ بھئی

جلدی کرو!"

"اس طرف آ کر ذرا پنکھے میں بیٹھ جاؤ۔ قبائلی رقص کے

لیے کپڑے نہیں بدلتے ہیں کیا۔؟" میرے پتاجی قریب آتے ہوئے

سوال کرتے ہیں۔

"منتری جی کی تقریر کے بعد فوراً انعام تقسیم کیا جائے گا۔

انعام لینے کے بعد تم اندر جا کر بنجارہ رقص کے لیے کپڑے

بدل لینا۔"

اماں بڑی ہوشیاری سے میرے چہرے پر پسینے کو تولیے سے

سکھا رہی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں میرے لیے محبت ٹھاٹھیں مار رہی

ہے۔ اس محبت کے پس منظر میں ان کے سارے خواب بھی نمایاں

ہیں۔!

بچپن میں مجھے کھلی چھت پر بٹھا کر اور بہلا کر بھات کھلاتے ہوئے

وہ روزانہ یہی سب کچھ تو سناتی تھیں۔ "بیٹی تو اچھی طرح کھائے

پیئے گی تو جلدی سے بڑی ہو جائے گی۔ تا... تھئی... تا... تھئی کر کے

ناچ سیکھے گی۔ میری لڑکی جب رقص کرے گی تو لوگ دانتوں تلے

انگلیاں دبا لیں گے۔ سب خوش ہو کر تالیاں بجائیں گے اور

بٹیا کو میڈل دیں گے۔"

ماں نے مجھے اپنا دودھ چاہے ایک بار کچھ کم ہی کیوں نہ

پلایا ہو لیکن رقص سیکھنے اور ریاض کرنے پر وہ بغیر کسی

ہچکچاہٹ کے برابر زور دیتی رہیں۔

لو۔ باہر منتری جی آ گئے۔ لوگ گلے میں مالا ڈال کر تالیاں

بجا رہے ہیں۔ منتری جی تقریر کر رہے ہیں۔ میرے رقص کی وہ بھی

تعریف کر رہے ہیں۔

نٹراج کی ایک خوبصورت سی مورتی پا کر میں پھر پردے کے

پیچھے چلی جاتی ہوں۔ اماں دوڑ کر میرے پاس آتی ہیں اور میری بلائیں

لینے لگتی ہیں۔ وہ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی ہیں۔

مجھے اس بات کا بڑا افسوس ہے کہ میری ماں کو رقص سیکھنے

کا بڑا شوق تھا لیکن انھیں سیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ خود بتاتی

ہیں کہ ان کا زمانہ وہ تھا جب کلاسیکی رقص کو دوبارہ زندگی ملی

تھی۔ اس عظیم فن کو نہ سیکھ پانے کا انھیں بھی بڑا افسوس تھا۔ اس کمی کو

پورا کرنے کے لیے اکثر وہ اپنی سہیلیوں کو اکٹھا کر کے جیسا بن پڑتا

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

نام کتاب: **فروغِ شعلۂ دل** (شعری مجموعہ)
شاعر: ڈاکٹر محمد ولی الحق انصاری
ملنے کا پتہ: انوار پبلی کیشنز، ۲۷ - فرنگی محل لکھنؤ - ۳
قیمت: چالیس روپیہ

ڈاکٹر محمد ولی الحق انصاری ولی لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کے صدر ہیں انھوں نے جملہ اصناف شاعری مثلاً غزل قصیدہ نعت، منقبت، رباعی، نظم، تاریخ گوئی وغیرہ پر طبع آزمائی کی ہے۔

ان کے فکر و خیال کی جڑیں فارسی ادب میں پیوست ہیں۔ بقول جناب علی جواد زیدی "وہ فارسی اور اردو کے معتبر اور آزمودہ آہنگ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے مگر ان کے یہاں جدید ترحیت کا التباس بھی ہے۔ ان کے یہاں ایک غم انگیز مستی، ایک لذت آمیز قلندری، ایک نیم صوفیانہ ترکِ دنیا تک پہنچ جانے والی نگاہ اور پھر کشمیر و ایران کی حسین فضاؤں میں جذب ہونے والی سرشاری، جانی پہچانی روایتوں میں بھی عصریت پیدا کر دیتی ہے۔"

ڈاکٹر ولی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے فارسی تراکیب بندش الفاظ کو کلاسیکل طرز تخیل کا سہارا لیتے ہوئے جدید سانچوں میں اس طرح ڈھالا ہے جس میں ہندستانی فضا کی خوشگوار و رومان پرور زندگی کی جھلک ملتی ہے۔

ڈاکٹر ولی کی شاعری فارسی اور اردو ادب کا حسین امتزاج تو ہے مگر وہ فارسی ادب سے مرعوب نہیں۔ انھیں اپنے وطن کی شاعری پر ناز ہے۔ وہ اپنی نظم "نذرِ حافظ" کا آغاز ہی اس شعر سے کرتے ہیں:

کہہ دے یہ جا کے حافظِ شیراز سے کوئی
ایران ہے شعرزا نہیں، ہندوستاں بھی ہے

اسی نظم میں رسمی شاعرانہ تعلّی کے طور پر فرماتے ہیں:

اور آج بھی ولی غزل خواں ہے، جس کے پاس
صنعت گری کے ساتھ ہی طبع رواں بھی ہے

شاعر اپنے ماحول سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ ڈاکٹر ولی بھی موجودہ انتشار سے متاثر ہیں اور ان کے کلام میں قنوطیت ملتی ہے۔ چونکہ ڈاکٹر ولی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اس لیے ان کی نظمیں بھی غزل کی شراب میں ڈوبی ہوئی ہیں اسی وجہ سے ان کی قنوطیت میں بھی رجائیت کار فرما ہے اور امید کی جلوہ گری محسوس ہوتی ہے۔

ڈاکٹر ولی کے اشعار زندگی سے قریب ہیں ان میں احساس کی آئینہ داری، جذبات کی عکاسی، بیان کی شگفتگی و خلوص اور معنی آفرینی نمایاں ہے۔ موضوع اور موقع کے اعتبار سے موزوں الفاظ کے نگینوں سے اپنے کلام کو مرصّع کرنا ان کی خصوصیت ہے۔

ڈاکٹر ولی کے کلام میں دل آویزی بھی ہے اور دل کشائی بھی مثلاً نظم "جنّتِ ارضی" دیکھیں:

تا حدِ نظر سبزہ، تا حدِ نظر پانی
ہر سمت فضا رنگیں ہر سمت زمیں دھانی
یہ جھیل یہ دریا یہ چشمے یہ ندی نالے
سب روپ میں یکتا ہیں سب حسن میں لاثانی

ڈاکٹر ولی کو اپنے وطن سے محبّت ہے انھیں دوسرے ملکوں کے مقابلے اپنے وطن کی ہر شے برتر اور عزیز محسوس ہوتی ہے ان کی نظم "بازگشت" کے یہ اشعار دیکھیں:

ایراں کو مانتا ہوں کہ بے حد حسین ہے
لیکن کہاں وہ بات جو ہندوستاں میں ہے
وہ حُسن کوہسار دماوند میں کہاں
کشمیر کے جو خطۂ جنّت نشاں میں ہے

——— راجیندر بہادر موج

نام کتاب۔ بول البول۔ شاعر۔ دیپک قمر
قیمت۔ بیس روپے۔ ملنے کا پتہ۔ ۱۸۰ آبولین۔ میرٹھ

دیپک قمر کی شاعری پر تبصرہ کرتے وقت سب سے پہلے ان کی لسانی ہدایات کو ماننا چاہیئے اودھی اور برج بولیوں سے اردو ہندی تضاد بھاشا جس میں کھردراپن بھی ہے، ان کی شاعری کا میڈیم ہے۔ اس سلسلے میں صدر انجمن ترقی اردو بہار ڈاکٹر رضا صاحب نے لکھا ہے کہ یقیناً مستقبل کی گنگا جمنی زبان یہی ہو گی اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مثال کے طور پر مستقبل میں غزل کی گنگ جمنی زبان یہ نہیں ہو سکتی۔

نرواڈی کا پربت نہ کوئل نہ بلبل نہ تازہ ہوا بھی
یہ کیسا سلم ہے جہاں آکے بن بیٹھا کاگا گویا
بیری کا دنیا ظلمی ماہیا سوئیاں چوبھیں
چھاچھ پڑتی مٹیارن کو کاگ پکارے

پھر دیپک قمر کی بحر کا سوال آتا ہے۔ زیر نظر مجموعہ کا سب سے پہلا شعر ملاحظہ فرمائیں۔

سارے گاما پادھانی سا
گنگ جمنا کے پانی سا

اگر کوئی یہ پوچھے کہ اس شعر کے کیا مطلب ہیں تو میں یہ کہوں گا کہ اس کا کوئی مطلب نہیں ہے لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اس میں ایک نرم سا احساس چھپا ہے۔ جو آہستگی کے ساتھ دلوں کو گدگداتا ہے۔

میں آوارہ تیز ہوا کا جھونکا
وہ ٹخنوں تک کا پاڈ ھکنے والی
داغ کہاں رہ جاتے پائی ہم نے
لاجی دھوبن تن من دھونے والی

کتابت طباعت اور گٹ اپ کے لحاظ سے کتاب بہت اچھی ہے جس کے لیے دیپک قمر اور مرتب ڈاکٹر احتشام الحق صدیقی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ایم۔ جے۔ رضا

صرف تمہارے لئے
صفحہ ۴ کا بقیہ

میں زور سے چٹکی لیتی ہوں .... میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔

سامنے ڈاکٹر۔ ان کے پیچھے نرس اور سب سے پیچھے اماں کھڑی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ جن آنکھوں میں انھوں نے ست رنگے سپنے سجائے تھے۔ میں ان کی طرف دیکھتے ہوئے ڈر رہی ہوں۔

میں جس خیالی دنیا میں ابھی گم تھی۔ کیا وہ اماں کی ہی دنیا تو نہیں تھی۔ یہ سچ ہے کہ چار برس کی عمر سے ہی میں نے رقص سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ کتنا ہی ضروری کام کیوں نہ ہو، اماں میری تعلیم کے وقت میرے پاس ہی رہتیں، وہاں سے کہیں نہیں ہٹتی تھیں۔ بڑی گہری نظر سے وہ میرے ریاض کا جائزہ لیتیں ــــ "کہیں نظر نہ لگ جائے بیٹا کو، کیونکہ مجھے ان سب باتوں کا اندازہ ہے۔"

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ پانچ چھ برس کی عمر میں ہی مجھے جو خطرناک بیماری لگی اسے کوئی بھی ڈاکٹر اور حکیم ختم نہیں کر پایا۔

اچانک ڈاکٹر کا انجکشن میرے بازو میں چبھتا ہے۔ میں تکلیف سے سر جھکا لیتی ہوں۔

میرے پیر زہریلے بخار اور پولیو کے حملے سے بےکار ہو چکے ہیں۔ سکڑ کر کسی کام کے نہیں رہے۔ میرے دونوں پیر اب میری ہی آنکھوں میں کھٹکنے لگے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ میری اماں اور ان کے کبھی نہ پورے ہونے والے سپنوں کا مذاق اُڑا رہے ہوں ــ!

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ہیں ــــ میں رو رہی ہوں ــــ اپنے لیے نہیں! تمہارے لیے! ماں ــــ صرف تمہارے لیے ـ!

★

Vol. 38, No. 6
SEPTEMBER, 1983
50 Paisa

Urdu Monthly

NAYA DAUR
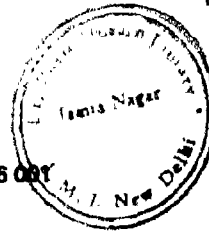
REGD. No. LW/NP-1
Annual Subs.
Rs. 5/-

POST BOX No. 146 LUCKNOW-226 001

نیا دور
جلد ۳۸ نمبر ۷
اکتوبر ۱۹۸۴ء
ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی
جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

عنوانات

★

پبلشر: گنگا دھر پرشاد شکلا
ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ ـ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلیکیشن برانچ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ ـ لکھنؤ
رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

اپنی بات

ہمارے ملک میں یوم آزادی اور یوم جمہوریہ کی طرح ۲ اکتوبر کو بھی قومی اہمیت حاصل ہے۔ اسی مبارک دن ہندستان کی وہ جلیل القدر ہستی پیدا ہوئی ہے جو ہندستانیوں کی نجات دہندہ تھی اور جو ایسے صفات کی حامل تھی جن کے باعث وہ دنیا کے دیگر عظیم سیاسی رہنماؤں اور سماجی مصلحوں میں منفرد نظر آتی ہے۔ گاندھی جی کی ذات گرامی ہندستان کے لیے تو مایۂ صد افتخار ہے ہی کیونکہ انھوں نے اپنے ملک کو صدیوں کی غلامی سے نجات دلائی ۔ ان کی شخصیت دُنیائے انسانیت کے لیے بھی باعث فخر ہے کیونکہ انھوں نے مساوات ، عالمی اخوت، امن و آشتی اور آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا پیغام دیا۔ اگرچہ وہ ہماری جنگِ آزادی کے سپہ سالارِ اعظم تھے، لیکن اُن کی حقیقی عظمت کا راز یہ ہے کہ یہ جنگ ان کی رہنمائی میں اس انداز سے لڑی گئی ہے جس کی مثال دُنیا کی بڑی سے بڑی جنگوں میں بھی نہیں ملتی۔

گاندھی جی ایک سیاسی رہنما کے علاوہ ایک زبردست سماجی مصلح بھی تھے۔ اگر ہم ان کی زندگی کا غور سے مطالعہ کریں تو ہمیں بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ وہ سیاسی رہنما ہونے کے باوجود سماجی اصلاح کے کاموں سے کبھی بھی غافل نہیں ہوئے۔ انھوں نے ملکی اقتصادیات، تعلیم، قومی اتحاد، دیہات، کسان، مزدور، خواتین، سبھی کی جانب خصوصی توجہ دی اور ان تمام امور پر اہل ملک کو مفید اور قابلِ قدر مشورے دیے۔ ملک کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے لیے انھوں نے گھریلو صنعتوں کے قیام پر بہت زور دیا۔ گاندھی جی نے قومی اتحاد پر بھی ہمیشہ زور دیا اور اس کے لیے انھوں نے اپنی جان بھی قربان کر دی۔

وہ ایک مذہبی آدمی تھے۔ ان کو اپنے ہندو ہونے پر فخر بھی تھا لیکن ان کا خود کہنا تھا کہ "میری ہندوئیت فرقہ وارانہ چیز نہیں ہے۔ اس میں وہ سب شامل ہے جسے میں اسلام، عیسائیت، بودھ مت اور زرتشتیت میں بہترین سمجھتا ہوں"۔ اسلام کے متعلق ان کا خیال تھا کہ "میں اسلام کو اسی طرح امن کا مذہب سمجھتا ہوں جس طرح عیسائیت، بودھ مت اور ہندو مت کو"۔ وہ ہندستان کے رہنے والوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مساوات، رواداری اور بھائی چارہ برتنے کی تلقین آخری وقت تک کرتے رہے۔

ہمارے ملک کی ترقی اسی وقت ہو سکتی ہے جب یہاں کے رہنے والے ایک دوسرے کے مذاہب کا یکساں احترام کریں اور متحد ہو کر زندگی بسر کریں۔ ان کے اس پیغام کو گھر گھر پہنچانا اور اس پر کاربند رہنا ہم سب کا فرض ہے۔
آیئے اس موقع پر باپو کی تعلیمات کی روشنی میں اپنے کردار و عمل کا جائزہ لیں اور ان کی تعلیمات کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائیں۔

ایڈیٹر

● نیا دور کے خریدار حضرات سے نیا دور نہ ملنے کی شکایتیں متواتر موصول ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی شکایتوں کا لہجہ کبھی کبھی انتہائی درشت بھی ہوتا ہے۔ خریداروں کو پرچے انڈر سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ بھیجے جاتے ہیں۔ نیا دور کا زرِ سالانہ صرف پانچ روپیہ ہے۔ اس قیمت میں پرچہ بذریعہ رجسٹری بھیجنا ممکن ہی نہیں ہے۔ پھر بھی کاپیاں اگر موجود ہوتی ہیں تو دوبارہ بھیج دی جاتی ہیں۔ ہم نے فراق نمبر حصہ اوّل اپنے تمام خریدار حضرات کو بذریعہ رجسٹری بھیجا ہے تاکہ نیا دور کا یہ خصوصی نمبر سب کے پاس یقینی طور سے پہنچ جائے۔ ایک کاپی کی رجسٹری پر تقریباً چھ روپے صرف ہوتے ہیں اس سے زیادہ کی ہم سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ اگر کسی خریدار کو پرچہ نہیں ملتا ہے تو اپنے متعلقہ ڈاک خانے کو نیا دور کی گم شدگی یا عدم وصولی کی جانب توجہ دلائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

جمیل مہدی
ایڈیٹر عزائم لکھنؤ

وہ اخلاق کے قالب میں ڈھلی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ کتنے ہی دور ایسے گذرے کہ مسلمانوں نے ان کی نیت پر شک کیا، انھیں فرقہ پرست کہا، ان کے قریبی دوست اور پرانے ساتھی، مولانا محمد علی، شوکت علی تک ان سے بدگمان ہو کر ان پر الزامات لگا کر ان سے الگ ہو گئے، ان کی مخالف صفوں میں شامل ہو گئے لیکن گاندھی جی اپنے راستے پر چلتے رہے۔ انھوں نے اپنے ان ساتھیوں کی جدائی پر صدمہ کا اظہار ضرور کیا لیکن وہ اس بات کو چھوڑنے پر ذرا بھی تیار نہ ہوئے جسے وہ صحیح اور درست سمجھتے تھے۔

گاندھی جی کی یاد

یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر گاندھی جی اس زمانے میں زندہ ہوتے تو کیا کرتے، کیونکہ یہ بھی ممکن تھا کہ گاندھی جی زندہ رہتے تو سیاست کی صورت حال وہ سرے ہی سے نہ ہونے پاتی، جو آج نظر آتی ہے۔ گذشتہ ۵۰ برسوں کی سیاست پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد ہی صورت حال کا وہ فرق ظاہر ہونے لگتا ہے، جو گاندھی جی کے زمانے سے آج تک سیاست دانوں اور خود عوام کے کردار اور فکر و ذہن میں آ چکا ہے۔

گاندھی جی کی نظر بہت دوررس تھی، فکر و ذہن کی ادنیٰ سی تبدیلی بھی ان کی تیز نظر سے بچ نہیں سکتی تھی، جب بھی ہندستان ایسے موڑ پر کھڑا جہاں سے گمراہی کی سرحد شروع ہوتی تھی، انہوں نے شہرت، عظمت، وقار، عوام کی خوشی یا ناخوشی، شخصی مقبولیت، غیر مقبولیت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پوری طاقت کے ساتھ اسے روکنے کی کوشش کی، ان کے اس رویہ کی بہتر مثال چوری چورا کے واقعہ کے بعد سول نافرمانی کی پوری تحریک کو ہی واپس لینے اور ختم کر دینے کے فیصلہ کی صورت میں موجود ہے، جس نے سارے ہندستانی سیاست دانوں کے ساتھ برطانوی حکمرانوں کو بھی حیران کر دیا تھا۔

گاندھی جی کے زمانے تک سیاست میں اخلاق کا نام ضرور لیا جاتا تھا لیکن انھوں نے قومی سیاست کو اس حد تک اخلاق کے تابع کر دیا کہ

ایسا بھی دور آیا کہ ہندوؤں نے ان کی نیت اور طرز عمل پر شک کیا۔ انھیں ہندو دشمن ثابت کرنے کے لیے ایک ہمہ گیر اور زہریلی مہم چلائی ان کے خلاف نفرت اور دشمنی کا ایسا ماحول تیار کر دیا کہ ان کا شمار غیر مقبول رہنماؤں میں ہونے لگا لیکن انھوں نے اپنی ڈگر کو چھوڑ دینے پر غور تک کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، اور اصول سے ایک انچ بھی ہٹے بغیر اصول اور سچائی کے راستے پر اپنے سفر کو جاری رکھا۔

زندگی ان کے نزدیک اعلیٰ مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ تھی، جب اعلیٰ مقاصد خطرے میں پڑے، انھوں نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کر ان مقاصد کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی، اور ہر بار ایسی شاندار کامیابی حاصل کی کہ لوگ ان کی روحانی قوت اور اخلاقی طاقت کے اثرات کو دیکھ کر حیران ہو گئے۔

انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے جدوجہد کی۔ انھوں نے ہریجنوں کو ہندو سماج کا حصہ بنانے کے لیے جدوجہد کی۔ اور آخر میں انھوں نے مسلمانوں کو قومی سماج کا ایک باعزت حصہ تسلیم کرانے کے لیے جدوجہد کی۔ اور ہر بار انھوں نے اجتماعی ذہن اور قومی سطح پر پھیلے ہوئے انتشار کے خلاف ایسی شاندار اور فیصلہ کن کامیابی حاصل کی

کہ جیسے دھارے کو مکمل طور پر بدل دینا چاہتے ہیں، وہ حالت ان کی روحانی اور اخلاقی قوت کے مظاہرے اور رہنمائی کی اہلیت کے اظہار کی بدولت ہندوستان کی قومی سیاست اور سماج میں دکھائی دینے لگی۔

وہ پہلے سیاسی رہنما تھے، جنھوں نے مذہب کو سیاست میں داخل کیا، اور ان لوگوں سے بالکل مختلف تھے جو سیاست کو مذہب میں داخل کرکے، مذہب کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں، اور مذہب کو منافرت کا ذریعہ بناتے ہیں، مذہب اور سیاست کے باہمی تعلق کے سلسلے میں ان کے واضح خیالات ان الفاظ میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہیں۔

> خوف اور ڈر کی وجہ سے میں سچائی سے منہ نہیں موڑ سکتا کیونکہ جہاں خوف کا ماحول ہوگا، وہاں مذہب کی بے حرمتی ہوگی۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ دوسری دنیا میں نہ ہندو ہیں نہ مسلمان، نہ عیسائی، وہاں مختلف قبیلوں یا پیشے کے لحاظ سے نام نہیں رکھے جاتے بلکہ صرف عمل کردار کی پہچان ہوتی ہے۔ البتہ اس دنیا میں مجھے اپنے آبا و اجداد کا لیبل لگانا ہی ہوگا۔ میرا ہندو دھرم فرقہ وارانہ نہیں ہے۔ میرے ہندو دھرم کے تصور میں اسلام، عیسائیت اور بدھ مت کی تمام اچھائیاں شامل ہیں، سچائی میرا مذہب ہے اور اہنسا اس کا مزاج ہے۔

اس مذہب کے ساتھ سیاست کو ملا کر انھوں نے جس سیاسی موقف کو بنایا تھا، اس میں مذہب، سیاست کو اعلیٰ اخلاقی اقدار سے روشناس کرنے کے ایک موثر آلے کی حیثیت سے شامل تھا۔ وہ مذہب اور قومیت کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے، آج کے سیاست دانوں کی طرح مذہب اور سیاست کو الگ الگ رکھنے کے علم بردار نہ تھے۔ انھوں نے اس سلسلے میں اپنے نقطۂ نظر کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔

> میرے لیے مذہبی اصولوں پر بغیر پورے عقیدے کے بغیر سیاست میں حصہ لینا بے مقصد ہے۔ کیونکہ سیاست کا تعلق عوام سے ہے۔ اور جو شخص خدا اور سچائی سے بیگانہ کر سیاست کا راہ میں پڑ جائے وہ سچائی کا پرستار نہیں۔
>
> جہاں تک قومیت کا تعلق ہے، ہم سب ہندوستانی ہیں چاہے کسی بھی مذہب پر ہمارا عقیدہ ہو، میرا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی سماج کے الگ الگ خانے نہیں بنائے جا سکتے ہیں نہ ہی اس کو سماجی مذہبی اور سیاسی مذہب کے خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ سیاست کو مذہب سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ سیاست کے بغیر سماجی بہبودی کا کام ناممکن ہے۔

جمہوری نظام کے بارے میں انھوں نے ہندوستانی سماج کے مزاج اور سیاسی ماحول کے پیش نظر جو کچھ کہا تھا اسے آج کے سیاسی مزاج اور سماجی انتشار کے دور میں حرز جان بنانے کی جتنی ضرورت ہے، اتنی شاید گاندھی جی کی زندگی میں بھی نہیں تھی۔ انھوں نے مختلف قومیتوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذاہب کے تانے بانے سے بنے ہوئے ہندوستانی سماج اور رنگا رنگ میں یک رنگی کے مزاج کو سنبھال کر چلانے والی سیاست کے لیے جمہوریت کو ایک ناگزیر اور قدرتی نظام کی شکل میں قبول کیا تھا، اور پیغمبرانہ انداز میں تمام کمزوریوں کی پیشگی نشاندہی کر دی تھی، جو ہندوستانی جمہوری نظام کو مستقبل میں لاحق ہونے والی تھیں، انھوں نے کہا تھا

> اگر تعصب، جہالت اور قدامت پرستی کو جمہوریت پر حاوی ہونے دیا گیا، تو نراج کی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور جمہوری نظام تباہ ہو جائے گا۔ جمہوری نظام کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ افراد جماعتی فیصلوں کا احترام کریں، اگر ہر فرد قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر انفرادی فیصلے کرنے لگے تو قانون کی عمل داری ختم ہو جائے گی، موقع پرستی اور اصولوں سے سمجھوتے بازی جمہوریت کو ختم کر دے گی۔

اقلیتوں اور اکثریت کے باہمی تعلق کو جمہوری نظام کے نقشے میں گاندھی جی نے مخصوص جگہ دی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ

> جمہوریت میں اکثریت اور اقلیت کا تصور واضح ہونا چاہیے، اکثریت کے فیصلوں کو اقلیت کو تسلیم

محبوبؔ شیدائی
ڈھاکہ (بنگلہ دیش)

ظفرؔ گورکھپوری
ایف ۳ میونسپل کالونی دیونار
بمبئی ۴۳

غزلیں

دیپ سے دیپ جلانے کی ہے عادت میری
روشنی بخش ہے یہ رسمِ قدامت میری

آگ کو آگ سمجھتا ہوں مگر بنیا ہوں
کیا کروں میں بڑی ضدی ہے طبیعت میری

جنبشیں کرنے لگے اب تو اپاہج الفاظ
اب زبانوں کو مبارک ہو اقامت میری

ٹوٹ جائے نہ کہیں ہمتِ مردانِ وفا
کاندھے کاندھے پہ زمانے کے ہے میّت میری

اب کے تو پرزے گریباں کے اڑے شہر تلک
وسعتِ دشت سے بڑھنے لگی وحشت میری

کوئی کلمہ کوئی جملہ کوئی مصرعہ کوئی شعر
جب بھی سوچو گے تو نکلے گا کہاوت میری

دیپ مانگے کا جلانے سے ہے بہتر محبوبؔ
گھر کی تاریکی سے روشن ہو قناعت میری

تم زمانے کے لیے جب بے نشاں ہو جاؤ گے
پھر یہ ہوگا، میرے چہرے سے عیاں ہو جاؤ گے

اشک کیوں بنتے ہو، میرا درد بن جاؤ میاں
اس ادا سے حاصلِ عمرِ رواں ہو جاؤ گے

تم بدن کی آگ میں ہو، میں رگوں کی آنچ میں
کل شرر بن جاؤں گا میں، تم دھواں ہو جاؤ گے

خود غرض چہروں کی دیمک چاٹ جائے گی تمھیں
میرے دل میں آؤ ورنہ رائیگاں ہو جاؤ گے

آج جن کے بوجھ ہلکے کر رہے ہو، دیکھنا
کل انھیں کے واسطے بارِ گراں ہو جاؤ گے

ٹوٹ کر بکھرا ہوا ہوں میں تمہارے آس پاس
مجھ کو اپنے ساتھ لے لو، کارواں ہو جاؤ گے

اس کے احسانات سچ کہنے نہیں دیں گے ظفرؔ
سامنا جب ہوگا اس کا، بے زباں ہو جاؤ گے

رباب رشیدی
۶۵-تارین
شاہجہاں پور

گاندھی جی

نقیبِ صبح و میرِ کارواں و صاحبِ منزل

ہمالہ کا طلسمی وقار، گنگ و جمن کا تقدس، سرسوتی کا علمی فیضان شاہین کی نگاہ آسمان رفعت، سبزہ زاروں کا حسن، نشاط انگیز و جانفزا خوشبوؤں کا مجموعہ اور اقبال کے مردِ قلندر کا تصور۔ جب کسی انسانی پیکر کا روپ دھار لیتا ہے تو وہ تاریخ کے صفحات پر موہن داس کرم چند گاندھی بن کر جگمگاتا ہے۔

ان کی پوری زندگی جدوجہد سے عبارت، ان کا ہر عمل حب الوطنی کا آئینہ دار، ان کا ہر قول صداقت کا شاہکار، خلوت و جلوت میں ایک ہی بات ایک ہی فکر، آنسو چھلکے تو ملک و قوم کے غم میں، تبسم بر لب ہوئے تو ہندستان کی ہندستانیت پر۔ سوئے تو دیش کی آزادی کا خواب لیے ہوئے، جاگے تو حصولِ تعبیر کا خیال سمیٹے۔ غرض کہ رگ و پے میں جذبۂ حریت کا بہاؤ، خون کی گردش بن گیا تھا۔ گاندھی جی کا فلسفۂ حیات ہندستان کے رنگ و مزاج سے اتنا ہم آہنگ ہے کہ انھیں ایک دوسرے سے کسی طرح علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ فلسفۂ حیات صدیوں سے کسی نہ کسی زاویے سے دانشوروں کے ذہن میں رہا ہے مگر اس کو برتنے کا شرف باپو کے حصے میں آیا۔ مسئلہ صرف زنجیرِ غلامی کاٹنے کا نہیں تھا، اصل مسئلہ تھا یہاں کے مخصوص جغرافیائی حالات کے تحت ایک مربوط نظامِ زندگی کا، پسماندگی، غربت و جہالت کے خلاف ایک مضبوط محاذ کا، صدیوں سے استحصال کا شکار طبقوں کے باوقار ڈھنگ سے جینے کا اور جمہوری خطوط پر ملک کو چلانے کا۔ یہ دودھ کی نہر نکالنے سے کہیں زیادہ مشکل کام تھا۔

گاندھی جی ذوقِ عمل کے اسرار سے آگاہ تھے۔ کڑی دھوپ میں بھی وہ شبنم کی طرح خنک رہتے تھے۔ یہی ان کی خصوصیت تھی اور یہی ان کا جوہر جس نے انھیں بالآخر منزل نشین کر دیا۔

میرِ قافلۂ جنگِ آزادی کی حیثیت سے جو مثبت رول باپو نے ادا کیا وہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں تھی۔ ذرا اس دور کی طرف پلٹ کر دیکھیے کیسے کیسے عاقل، بالغ نظر، کیسے کیسے عالم و مجاہد، کیسے کیسے پرجوش و باہوش افراد کا مجمع تھا۔ اس مجمع کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دینا کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی نگاہِ بصیرت افروز کے اثر سے بڑے بڑے سرکش اپنا سر تسلیم خم کر دیتے تھے۔ ان کی روحانی قوت کے آگے اچھے اچھے سپر ڈال دیتے تھے۔ باپو نے انھیں اخلاقی و روحانی قوتوں اور اپنے عزمِ راسخ کی بدولت ہندستان کو وہ مقام عطا کر دیا جس کے سبب یہاں کے سبھی رہنے والے ایک عجیب شانِ افتخار محسوس کرتے ہیں۔

آج جب بڑی طاقتیں قیامِ امن کی بات کرتی ہیں، نیز تخفیفِ اسلحہ پر مذاکرات ہوتے ہیں، پھر ویت نام اور بیروت کی طرف نظر جاتی ہے تو ہمیں باپو کی یاد آتی ہے۔

جب کہیں سے فساد کی خبریں آتی ہیں اور فضا خون سے رنگین ہونے لگتی ہے، انسانیت کی چیخوں سے ماحول متغیر ہو جاتا ہے تو باپو بہت یاد آتے ہیں۔

ہمارا اپنا عالم یہ ہے کہ ہم شخصیتوں سے پیار کرتے ہیں اور

زبان ودل سے اس کا اقرار بھی کرتے ہیں مگر ان شخصیتوں کی پسند و ناپسند کا خیال نہیں رکھتے ہیں اس صورت میں دو ہی باتیں سمجھ میں آتی ہیں یا تو ہمیں وہ باتیں پسند نہیں یا ہم ان کی اب ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ دوسری بات یہ کہ بس فیشن کے طور پر ہم بھی اپنے قائدین کا کبھی کبھی ذکر کر لیتے ہیں۔ یا ان کی یاد منا لیتے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ کیا واقعی اب ہم وہ باتیں پسند نہیں کرتے یا ان کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ باپو نے اہنسا کا جو پیغام دیا کیا وہ اپنی قدر کھو چکا ہے؟ اگر اہنسا کا عمل کل دوسروں سے اپنی بات منوانے کے لیے کارگر ہوا تھا تو آج اپنوں کے سلسلے میں بھی اس سے بہتر طریقہ کار اور کیا ہو سکتا ہے؟ یاد رکھیے اگر ہم نے وہ راستہ چُنا جو باپو کے بتائے ہوئے راستے سے جُدا ہے اور مخالف سمت جاتا ہے تو اس ملک کے لیے کوئی اچھے مستقبل کا تصور نہیں کر سکتا۔ اس ملک کا روشن مستقبل تبھی محفوظ رہ سکتا ہے جب ہم گاندھی جی کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں۔ کیا کبھی ہم یہ سوچتے ہیں کہ انھوں نے اس دیش کی خاطر کتنی سختیاں جھیلیں، کتنے مصائب برداشت کیے، کتنے برت رکھے، کس لیے؟ صرف اپنے عوام کی محبت میں، دکھی انسانوں کے لیے، غلام ہندستان کے واسطے۔ آخر ان کو کس شے کی کمی تھی؟ متمول گھرانے میں پیدا ہوئے، اعلا تعلیم حاصل کی، بیرسٹر بنے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پھولوں کی سیج پر لیٹتے مگر انھوں نے کانٹوں کے بستر کا انتخاب کیا۔ قدرت سے وہ گداز قلب و متاع چشم تر لے کر آئے تھے۔ ملک کو آزادی دلانا اور عوام کو بھائی چارگی، مساوات و اخوت کے سانچے میں ڈھالنا ان کی زندگی کے دو اہم مقصد تھے۔ باپو کا خواب اسی وقت شرمندۂ تعبیر ہوگا جب یہاں کے سارے رہنے والے وطنیت کے جذبہ سے سرشار ہو کر ہم رنگ ہو جائیں۔ مذاہب جُداگانہ سہی، معاشرہ میں فرق سہی، لباس الگ سہی، زبانیں مختلف سہی لیکن ایک لہر ملک کے ہر گوشے میں یکساں ہونا چاہیے۔ ہم سب ایک ہیں، ہم سب انسان ہیں۔ ہم سب ہندستانی ہیں، ہم نے اونچ نیچ اور بھید بھاؤ کے سارے جھمیلے ختم کر دیے ہیں۔ ہم ایک سیسہ پلائی دیوار کی طرح ہیں۔

صداقت کے رموز و اسرار ان پر کس طرح منکشف تھے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقوال سے ہو جائے گا۔ فرماتے ہیں:

"صداقت ایک عظیم درخت ہے، جیسے جیسے اس کی خدمت کی جاتی ہے ویسے ویسے اس میں ان گنت پھل آتے دکھائی دیتے ہیں جو جاوید ہوتے ہیں۔
صداقت کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے طاقت اس کی سرشت میں ہے۔
میں نے سچ کو جس شکل میں اور جس راہ سے دیکھا ہے اسے اسی شکل اور اسی راہ سے بتانے کی کوشش کی ہے۔ میں سچ کو خدا مانتا ہوں۔"

اہنسا کے بارے میں ان کے افکار منارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں:

"میرے لیے سچ سے بڑا کوئی مذہب نہیں اور اہنسا سے بڑا کوئی مقدس فریضہ نہیں۔ اہنسا کے بغیر سچ کی تلاش و جستجو اور کامیابی ناممکن ہے۔ اہنسا ذریعہ ہے اور سچ مقصد ہے۔ اسی لیے اہنسا پر کاربند ہونا ہمارا فرضِ اولیں ہے۔ اہنسا ایک انفرادی عمل نہیں بلکہ وہ سماجی عمل بھی ہے۔ میری تاکید اتنی ہے کہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر اسے بروئے کار لایا جائے۔
اہنسا۔ سچ کی رُوح ہے اس کے بغیر انسان جانور ہے۔"

مذہب کی ضرورت پر باپو نے ہمیشہ زور دیا۔ وہ جانتے تھے کہ ہر مذہب بنیادی طور پر آفاقی قدروں کا حامل ہوتا ہے اس کے ضابطے انسان کو پیار، محبت، برابری، نیکی اور سچائی کا پیکر بناتے ہیں۔ اسی لیے وہ مذہب کی اہمیت پر لکھتے رہتے تھے۔ (باقی ص ۱۳ پر)

ساغر وارثی
امین زئی شاہجہانپور

جبر

عشرتوں کا سحاب چھایا ہے　　راحتوں کا پیام لایا ہے
عہدِ نو پر شباب آیا ہے　　زندگی نے سکون پایا ہے
دلِ رنجور مسکرایا ہے
ملک میں انقلاب آیا ہے

بیس جب سے ہوئے ہیں بیس نکات　　جگمگانے لگا ہے روئے حیات
فرقہ بندوں کو ہو گئی ہے مات　　ظلم سے اب ملے گی سب کو نجات
ایسا مثبت قدم اٹھایا ہے
ملک میں انقلاب آیا ہے

ہوئی تعمیرِ نو کی تیاری　　ہر طرف کی گئی شجر کاری
گھٹتی جائے گی خود ہی بیکاری　　قوم میں آچلی ہے بیداری
راہبر نے گجر بجایا ہے
ملک میں انقلاب آیا ہے

جنس کی قیمتیں گھٹائی گئیں　　کام کی اجرتیں بڑھائی گئیں
نئی دفعات بھی بنائی گئیں　　صوبتیں ردِ عمل میں لائی گئیں
ظلم کا سلسلہ گھٹایا ہے
ملک میں انقلاب آیا ہے

کل جو رائج تھا آج بدلا ہے　　جبر کا ہر رواج بدلا ہے
زندگی کا مزاج بدلا ہے　　ذہن بدلے سماج بدلا ہے
نغمۂ امن سب نے گایا ہے
ملک میں انقلاب آیا ہے

ایسی اسکیمیں کچھ چلائی ہیں　　ہم کو راہیں نئی دکھائی ہیں
بستیاں نور میں نہائی ہیں　　جتنی فصلیں ہیں لہلہائی ہیں
صنعتوں نے فروغ پایا ہے
ملک میں انقلاب آیا ہے

نیاز سلطان پوری
جونیر ہائی اسکول پیشی پور،
ضلع سلطانپور۔

(بیس نکاتی پروگرام کی روشنی میں)

آؤ کہ ایسا شہر بسائیں تہِ فلک
وہ شہر جس سے عیش بداماں ہو زندگی
وہ شہر جس سے روح کو حاصل ہو تازگی
وہ شہر جس میں جنگ کا نام و نشاں نہ ہو
فرقہ پرست ذہن کی حاجت جہاں نہ ہو
جو اٹھ کے ظلم و جبر کا پنجہ مروڑ دے
دامانِ زندگی سے جو امرت نچوڑ دے
جس کی لغت میں صرف محبت کا نام ہو
جس کے ادب میں مکر و سیاست حرام ہو
ردی کے واسطے نہ جوانی بکے کوئی
بالائے بامِ حسن نہ مریم لٹے کوئی
اولاد کے سبب نہ کوئی خودکشی کرے
فٹ پاتھ پر بسر نہ کوئی زندگی کرے
دولت کے آستاں پہ نہ انسان جھک سکے
زرپاش ڈالروں پہ نہ ایمان بک سکے
ہونٹوں پہ زندگی کے تبسم ہو موجزن
آنکھوں میں صبحِ نو کی مچلتی ہوئی کرن
وہ شہر زخمِ دل کا مداوا کہیں جسے
وہ شہر عصرِ نو کا تقاضا کہیں جسے

ڈاکٹر ثمینہ شوکت
بیت ثمین ۲-۲-۱۱۰۸/۲ تلک نگر
حیدرآباد - ۵۰۰۰۴۴

اُردُو ہے جس کا نام......

اُردو کی بہ حیثیت زبان یا لسان کے کیا نوعیت ہے ؟ کیا یہ ایک ایسی زبان ہے جس میں محض گردان او تصریف INFLEXIONS الفاظ کے وظائف FUNCTIONS کا تعین کرتے ہیں ؟ اس زبان میں لفظی تتمے WORD ENDINGS ہیں بھی اور معنی کی صورت گری میں کوئی حصہ بھی لیتے ہیں یا نہیں ؟ یہ جملہ میں الفاظ کی نشست اور ترتیب WORD ORDER کوئی اہم کردار بھی ادا کرتی ہے یا نہیں ؟

یہ ہیں وہ سوال جن کا تشفی بخش جواب ابھی تک دریافت طلب ہی ہے ۔ یوں اُردو کے ماہرین لسانیات نے علاحدہ علاحدہ طور پر ہر موضوع پر تحقیق ضرور کی ہے لیکن اس تحقیق کو مربوط کر کے زبان کی نوعیت بیان کرنے کا کام ہنوز تشنۂ تکمیل ہے ۔ اردو کی اصل ORIGIN نشوونما ، اصوات ، صوتیات ، قواعد صرف و نحو ، عروض صنائع بدائع کے بارے میں مواد کی کمی نہیں ۔ محمد حسین آزاد ، پروفیسر محمود شیرانی ، شوکت سبزواری ، ڈاکٹر عبدالحق ، ڈاکٹر زور ، پروفیسر عبدالقادر سروری ، پروفیسر احتشام حسین ، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر گیان چند میں سے کسی نے بھی اُردو کو بہ حیثیت زبان بیان کرنے کی کوشش نہیں کی ۔ حالانکہ دیگر زبانوں خصوصاً انگریزی کے تعلق سے ایسی کوشش کا آغاز ہوئے مدت ہوئی ۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزی نحو کے بارے میں نحو یا SYNTAX کا کوئی شافی جواب ابھی تک معرض وجود میں نہیں آیا ہے لیکن انگریزی اس کے جواب سے یکسر محروم بھی نہیں ۔

اُردو میں موضوعاتی تحقیقی مواد کے باوجود بار بار یہ کمی محسوس ہوتی ہے کہ اُردو کی لسانیاتی ساخت LINGUISTIC STRUCTURE کا کوئی جامع بیان موجود نہیں LINGUISTIC DESCRIPTION یعنی لسانیاتی بیان کا یہ فقدان جہاں عجلت پسند سیاست دانوں کو اپنے بیان دینے پر اکساتا ہے کہ اُردو ایک بڑدلی زبان ہے تو وہیں زبان کے سیکھنے اور سکھانے میں تیقن اور تعقل کا وہ رویّہ بھی پیدا نہیں ہو پاتا جو آج کا اہم ترین تقاضا ہے ۔

لکھنؤ اور دہلی کے لسانی مناقشات ذہنوں پر ایک ناخوشگوار اثر مرتب کرتے ہیں اور ہمیں یہ سمجھنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ دہلی یا لکھنؤ کی کورانہ تقلید ہی سب کچھ ہے نہ اردو کا کوئی مزاج ہے اور نہ کوئی مستحکم ساخت ۔

زبان کے بارے میں سائنٹیفک SCIENTIFIC رویّہ اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب تجزیہ ANALYSIS اور ترکیب SYNTHESIS کے ذریعہ زبان کی ساخت STRUCTURE کے بارے میں ایک واضح تصور رکھیں اور یہ خاکہ ہم میں ایک قسم کا اعتماد پیدا کر دے جس کا دارومدار تقلید کی روش پر نہیں بلکہ تنقید کی سرشت پر ہے ۔ جب ہم کوئی کلاسیکی زبان مثلاً عربی ، سنسکرت یا فارسی سیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں پہلے ہی بتا دیا جاتا ہے کہ لفظ کی گردان ضروری ہے ۔ کیونکہ ہر لفظ اپنی اس گردانی شکل میں ایک خاص صرفی اور نحوی وظیفہ انجام دیتا ہے ۔ گویا ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ زبانیں INFLECTIONAL یا تصریفی ہیں

اسی طرح انگریزی کا پہلا سبق ہی شاگردوں پر یہ واضح کر دیتا ہے کہ اس زبان میں گردان کی کوئی اہمیت نہیں اصل اہمیت WORD ORDER یا ترتیب الفاظ کی ہے، گویا انگریزی NON-INFLECTIONAL) یا غیر تصریفی زبان ہے۔

لیکن اردو سیکھتے وقت ہم اس قسم کی کسی بھی نشاندہی سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ یہ نشاندہی کی ہی نہیں جاتی، یا کی ہی نہیں جا سکتی۔ نتیجۃً اردو سے یہ اچانک مڈبھیڑ ہمیں اپنے طرز عمل کے تعین کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں دیتی۔

اردو صرف و نحو کے موجودہ قواعد ہمیں یکایک الفاظ، فقرول اور پھر جملوں سے آگاہ کرا دیتے ہیں لیکن صرفی اور نحوی قواعد زبان نہیں ہوتے۔ یہ تو محض سانچے ہوتے ہیں جس میں لسانیاتی ضرورت کی ہر چیز ڈھال لی جاتی ہے۔ شے اور سانچے کا فرق اتنا بین ہے کہ ہمیں اس کی تشریح کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کر گھے پر پیٹے تانے بانے کو جس طرح کوئی شخص کپڑے کا نام نہیں دے سکتا اسی طرح صرف اور نحو کے قواعد کو زبان نہیں کہا جا سکتا۔ کپڑے کو ہم اطلس، ریشم، سوت کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے برتتے ہیں۔ اردو کو بھی جب تک ہم کوئی نوعیتی اظہار نہ دے لیں ایک قسم کی بے چینی کی سی کیفیت باقی رہے گی۔

نوعیتی اظہار کے تعین کے لیے ظاہر ہے کہ ہمیں نوعیت کا بھرپور مطالعہ کرنا پڑے گا۔

جب ہم اردو کے جملوں پر جنھیں ترسیلی لسانیات COMMUNICATION کی اکائی (UNIT) کہنا چاہیے غور کرنا شروع کرتے ہیں تو سب سے پہلے جو چیز ہماری توجہ کا مرکز بنتی ہے وہ یہ ہے کہ ماضی (PAST) کے صیغہ میں تو جملے دو الفاظ (فاعل + فعل) سے مل کر بن جاتے ہیں۔ مثلاً "وہ آیا" لیکن حال (PRESENT) اور مستقبل FUTURE کی صورت میں مکمل جملے کے لیے کم از کم تین الفاظ کا استعمال ضروری ہے مثلاً وہ آتا ہے اور وہ آئے گا۔

"وہ آیا" کی نحوی تشریح (فاعل + فعل) ہے اسی طرح وہ آتا ہے اور وہ آئے گا کی نحوی تشریح (فاعل + فعل) کی جا سکتی ہے لیکن اس صورت میں فعل مفرد نہیں بلکہ مرکب (لازم + امدادی) ہوگا۔ یہ ایک اہم لسانیاتی عنصر ہے جس کو مناسب طور پر بیان کرنا ضروری ہے۔

پھر جب تذکرہ 'عمل' یا کام کا نہیں بلکہ محض وجود کا ہو تو دو لفظی جملے، قواعد کی تکمیل کر دینے کے باوجود تشریحی پس منظر کے بغیر مکمل معنی نہیں دے سکتے۔ مثلاً 'میں ہوں'، 'تو ہے'، 'وہ ہے' اور 'یہ ہے' یہ سب کے سب قواعد کے لحاظ سے جملہ کہلائے جانے کے مستحق تو ہیں لیکن جب تک کوئی سوال مثلاً "وہاں کون ہے؟" پس منظر میں نہ ہو۔ "میں ہوں" محض دو لفظ ہیں جن کی ترسیلی اہمیت صفر سے زیادہ نہیں۔ یہی حال دوسرے متذکرہ جملوں کا ہے 'تو ہے'۔ 'مجھے جو کچھ نظر آتا ہے نہیں ہے' کے ساتھ مل کر ہی ترسیل کے دائرے کو مکمل کرتا ہے 'وہ ہے'، جلسہ کا صدر کون ہے'، کے جواب ہی میں معنی خیز ہوتا ہے۔ 'یہ ہے' کی اہمیت اچھی کتاب کون سی ہے؟ کے بعد ہی سمجھ میں آ سکتی ہے۔

اس طرح ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ ان حالات میں دو لفظی جملے ترسیل کا ادھورا دائرہ بنا کر رہ جاتے ہیں لیکن یہ ترسیلی چاند نہیں جو عید کی نوید بن سکے بلکہ محض ایک نعل ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم ان جملوں کو قواعد کے لحاظ سے جملے کہنے پر مجبور ہیں خواہ معنویت اور وضاحت کے نقطہ نظر سے یہ تشنہ ہی کیوں نہ ہوں۔

اب عربی قواعد سے مستعار لی ہوئی اصطلاح مبتدا (فاعل) اور خبر (فعل + متعلقات فعل) اس مشکل کو حل کرنے کی سعی مشکور ہی سہی حجاب شعور بھی ہے۔ کیونکہ ہمیں STRUCTURE یا ساخت سیکھنے سکھانے کے لیے مزید تشریح کی ضرورت ہوتی ہے۔

صرف کے بیان میں افعال کی تشریح تو کر دی جاتی ہے فعل تام۔ فعل لازم۔ فعل امدادی۔ فعل متعدی۔ متعدی المتعدی لیکن ایسے جملوں کے بارے میں جن میں یہ افعال استعمال ہوتے ہیں بیان پھر بھی تشنہ ہی رہ جاتا ہے۔ نہ ان کی تمیز کے لیے کوئی علامت ہے

اب کوئی نام ــــ فعل معروف ACTIVE اور فعل مجہول PASSIVE جملے سے زیادہ فعل کی تشریح کرتے ہیں۔ اگر جملے کے لیے بھی کوئی امتیازی نام اختیار کرلیا جائے تو بہتر ہی ہوگا۔ یہ اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ انگریزی کے برخلاف اردو میں (SENT-ENCES IN ACTIVE VOICE) معروف افعال والے جملے اور مجہول افعال والے جملے (SENTENCESIN PASSIVE VIOCE) نہایت آسانی سے پہچانے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ اُردو جملوں میں فاعل کی علامت 'نے' ایک علاحدہ لفظ کی صورت میں موجود ہے۔ اور اسی طرح مفعول کے لیے لفظ 'کو' دستیاب ہے۔

انگریزی میں (THE HUNTER KILLED THE TIGER) میں فاعل (HUNTER) اور مفعول (TIGER) اسم ہیں اور کسی ایسی علامت کا وجود نہیں جو ایک اسم کو فاعل قرار دے اور دوسرے کو مفعول۔ لہٰذا دونوں اسم باہم متبادل (INTER-CHANGEABLE) ہیں اسی وجہ سے غلطی کا امکان بہت زیادہ ہے۔

لیکن اس کے برخلاف اردو میں "شکاری نے شیر کو مارا" چاہے کسی ترتیب میں لکھا اور پڑھا جائے مطلب میں نقص واقع نہیں ہوسکتا بشرطیکہ 'نے' کی علامت ہمیشہ شکاری کے اور 'کو' کی علامت ہمیشہ شیر سے متعلق رہے بلکہ اگر 'کو' کو حذف بھی کردیا جائے اور علامت فاعل 'نے' کو برقرار رکھا جائے تو بھی مطلب واضح ہوجاتا ہے چاہے "شکاری نے شیر کو مارا" کہیے یا "شکاری نے شیر مارا" یا "شیر کو شکاری نے مارا" الفاظ کی نشست اور ترتیب کی تبدیلی معنی پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ عربی کی طرح اُردو میں بھی اشعار سے صحت زبان کی سند کا کام لیا جاتا ہے۔

لیکن ایک سرسری مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچ جانا کہ اردو میں نشست اور ترتیب الفاظ یا WORD ORDER کی اہمیت ہی نہیں، ایک نہایت گمراہ کن غلطی ہوگی۔ جو اُردو کی نوعیت پر غلط فہمیوں کا پردہ ڈال سکتی ہے۔

ذرا ان جملوں کو پڑھ کر دیکھیے "اچھے آم پک گئے"۔ "آم اچھے پک گئے" دو الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں اور مفہوم کی یہ گوناگونی محض ترتیب یا نشست الفاظ ہی کی بدولت ہے۔ یہی حال ذیل کے جملوں کا ہے:۔

اچھا ذرا نام تو بتاؤ	ذرا اچھا نام تو بتاؤ
شام ابھی گزر گئی	ابھی شام گزر گئی
یہ اچھی زبردستی ہے	یہ زبردستی اچھی ہے
اچھا تماشا ہوا	تماشا اچھا ہوا
بیمار اچھا ہوگیا	اچھا بیمار ہوگیا

ان میں آخری جملے کے سوا تمام جملے نہ صرف یہ کہ فطری معلوم ہوتے ہیں۔ تصحیح کے محتاج بھی نہیں، اور معنی بھی مختلف دیتے ہیں۔ صرف آخری جملہ "اچھا بیمار ہوگیا" پڑھتے وقت ہمیں کچھ تکلف کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن یہ اجنبیت اس وقت دور ہوجاتی ہے اگر ہم اچھا کو ایک اسم خاص تصور کرلیں۔

یہ کیفیت صرف لفظ 'اچھا' ہی کی نہیں۔ اُردو میں اور بھی لفظ ہیں جو اسی طرح استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً ان جملوں کو دیکھیے:۔ "بھلا پہچانو تو کون ہے"۔ "پہچانو تو بھلا کون ہے (اور بُرا کون؟)"

"وہ بھی بھلا آدمی ہے"۔ "بھلا وہ بھی آدمی ہے" یا "کوئی ایسا بھی کرسکتا ہے"۔ "ایسا کوئی بھی کرسکتا ہے" وغیرہ۔

ان تمام جملوں میں الفاظ کی نشست اور ترتیب ہی معنی کی تبدیلی کی ذمہ دار ہے۔ جب ہمیں اس طرح کے جملے دستیاب ہوجاتے ہیں تو اُردو کے لسانیاتی بیان میں اس کا تذکرہ ضروری ہوجاتا ہے۔ اسی خصوصیت کی بنا پر مجاز یہ جملہ چست کرسکے تھے۔ جب انھوں نے کہیں پڑھا کہ مذہب کے نام پر لڑنا حماقت ہے تو کہا "یعنی حماقت کے نام پر لڑنا مذہب ہے"

لیکن ترتیب یا نشست الفاظ کے بارے میں کچھ کہتے وقت ہمیں ایسے جملوں کو بھی نہیں بھولنا چاہیے جو بغیر کسی ترتیبی تبدیلی کے مختلف معنوں میں استعمال ہوسکتے ہیں مثلاً:

"میں نے اسے حال ہی میں دیکھا ہے" حال (معنی وقت)

ہیں جیسے حال ہی میں دیکھا ہے (حال بمعنی وجد کیفیت) اس قسم کے جملے ایک دوسرا مسئلہ پیدا کر دیتے ہیں جس میں ایک ہی جملہ دو مختلف معنی دینے کے باعث دو مختلف انواع کا علمبردار ہو جاتا ہے اسی طرح اگر ہم مکان کے طرز تعمیر کا بیان کرتے وقت "کرسی ذرا اونچی ہونی ہے" استعمال کریں تو اس کا مفہوم مکان کا پایہ یا بنیادی چبوترہ ہوگا، اور فرنیچر کے بیان کے ضمن میں اگر اسی جملے کو استعمال کریں تو اس کا مفہوم بالکل ہی جداگانہ ہوگا۔ زبان کی اسی خصوصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے ماہر لسانیات N. CHOMSKY نے اپنے ۱۹۵۵ء کے ایک مقالہ میں انگریزی کے تعلق سے بحث کرتے ہوئے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جملے تمام الفاظ کے یکساں اور ایک ہی مقام پر ہونے کے باوجود — مفہوم کے لحاظ سے مختلف ہو جاتے ہیں اور اس اختلاف کا دارومدار گفتگو کے موضوع پر ہوتا ہے جو لسانیات کے دائرہ عمل میں نہیں — لسانیاتی طریقہ عمل کے لحاظ سے اختلاف کا انحصار محض معنی پر نہیں ہونا چاہیے لیکن مشکل یہ ہے کہ SPEAKER LISTENER اس اختلاف کا اعتراف کرتے ہیں اس صورت میں ہمیں کوئی NON SEMANTIC PAIR نہیں ملتا اور NON SEMANTIC جانچ کے لیے کوئی صورت نظر ہی نہیں آتی جو صرف STRUCTURE یا ساخت سے تعلق رکھتی ہو اور امریکی ماہر لسانیات بلوم فیلڈ BLOOM FIELD کے اتباع میں قواعد زبان اور معنی کو تقسیم نہ کرنے اور باہم مربوط رکھنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

اس خصوص میں ہم ماہر لسانیات ZELLING HARRIS کے پیش کردہ :— (METHODS IN STRUCTURAL- (-LINGUISTICS) سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن محدود طور پر۔ یا پھر ایک اور ماہر لسانیات 'CHARLES FRANCIS HOCKETT' کے MODELS سے کام لیا جا سکتا ہے۔

MODELS یا نمونے یوں تو دراصل سائنس اور ریاضی سے تعلق رکھتے ہیں، اور ان ہی مضامین کے ضمن میں استعمال ہوتے آئے ہیں۔ ریاضی میں مختلف مساوات EQUATIONS کو بطور نمونہ استعمال کر کے دیئے ہوئے حقائق سے نتیجہ نکالا جاتا ہے تو سائنس میں مختلف آلات کو چھوٹے پیمانے پر استعمال کر کے ان کی کارکردگی کے بارے میں تحقیق کی جاتی ہے۔

لسانیات میں ان کے استعمال سے خصوصاً نحوی ترکیب کو ایک معیاری صورت دی جا سکتی ہے پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ہم (S.M. LAMB) ایک اور ماہر لسانیات کے دریافت کردہ STRATA سطحات یا Layers پرت کے نظریہ کا استعمال کریں اور اردو کا لسانیاتی خاکہ پیش کرتے وقت ان سے مدد لیں۔ اس صورت میں اوپر دی گئی مثال کے الفاظ 'حال' اور 'کرسی' کا تذکرہ ان کے (STRATA) کے لحاظ سے کیا جا سکتا ہے کیونکہ 'سطحات' کے اس نظریہ میں (MORPHEME) یا لفظ کو جو صوتیہ (PHONEME) کے مجموعہ سے بنتا ہے۔ بنیادی اکائی مان کر جملے (SENTENCE) کو ان ہی اکائیوں سے بنا ہوا ایک زمرہ قرار دے کر جانچا جا سکتا ہے۔

لیکن یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ جملے SENTENCES ہمیشہ فاعل، مفعول، فعل کی سادہ اکائیوں سے مل کر نہیں بنتے۔ اس قسم کے جملے گرامر یا قواعد کی کتاب میں تو مل جاتے ہیں لیکن عام تحریر یا تقریر میں ان کی یہ سادہ معیاری صورت نہیں رہتی، بلکہ وہ توسیع یا شاخسانگی (BRANCHING) کے پیچ در پیچ عمل سے گزر کر کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ انگریزی میں فاعل + فعل + مفعول کی ترتیب اور دیگر خصوصیات کے باعث RIGHT HAND BRANCHING LEFT HAND BRANCHING یا دائیں اور بائیں شاخسانگی کی واضح شکلیں مل جاتی ہیں جبکہ اردو میں فعل درمیان میں نہیں بلکہ آخر میں آتا اور فاعل + مفعول + فعل کی بنیادی ترتیب رکھتا ہے۔ اس ساخت کے باعث ہمیں توسیع کی وضاحت کے لیے قابل قبول بیان وضع کرنے پڑیں گے۔

اردو کا یہ 'فاعل + فعل' والا مختصر جملہ — دوسرا ہے "جہاں" جوش کے کلام میں ایک خیال انگیز مصرعہ "تھک کر مرے زانو پہ وہ

سویا ہے ابھی" بن سکتا ہے وہاں توسیع یا شاخسانگی کے اسی عمل کے باعث ۱۲۴ الفاظ رکھنے والا واحد جملہ بھی بن سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

" وہ اپنے تاریخی لحاظ سے سب سے قدیم اور سیاسی اعتبار سے سب سے بڑی جمہوریت سمجھے جانے والے ملک کی سب سے بڑی اور زرخیز ترین ریاست کے سب سے پررونق اور آباد ترین صوبے کے سب سے پرانے اور حسین روایات رکھنے والے دیہات کا ہردلعزیز اور مشہور باشندہ، بلاوجہ بے انتہا تھکن سے چور ہوکر آج کئی دنوں کے پریشان کن لمبے وقفے کے بعد پہلی بار اپنے بنائے ہوئے خوشنما گھر کی سلیقے سے رنگ کرائی ہوئی خوابگاہ میں قرینے سے رکھے ہوئے اپنے قیمتی آبنوسی مضبوط پلنگ پر ڈھنگ سے رکھے ہوئے خوبصورت سے غلاف والے نرم و نازک تکیہ پر لیمپ کی بے انتہا تیز روشنی میں بھی اس قدر گہری اور راحت افزا نیند سو سکا ہے۔"

مبالغہ سے قطع نظر یہ جملہ توسیع BRANCHING کے امکانات کی لائق غور مثال پیش کرتا ہے اور ماہرین لسانیات کو اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ وہ ایسی توسیع کے لیے واضح سانچے پیش کریں۔

یہ بات بہرحال تقریباً طے شدہ ہے کہ محض Phonetics یا اصوات پر تحقیق ہی لسانیات کی کل پونجی نہیں Phonetics کے موضوع یعنی اصوات اور ان کے مخارج کے بارے میں آج سے چودہ سو سال پہلے تجوید کے قاعدوں میں کافی مواد پیش کیا جا چکا ہے۔ عربی سے اردو میں پیش آنے والے سب ہی اصوات اور حروف کے بارے میں مکمل معلومات مہیا کی جا چکی ہیں جن کو بنیاد مان کر دوسری آوازوں کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا اور کیا جا چکا ہے۔ اب تو ہمیں اصوات سے آگے بڑھ کر بیان Expression کے بارے میں تحقیق کرنی چاہیے۔ کیونکہ زبان محض ترسیل Communication ہی کا کام انجام نہیں دیتی بلکہ تفہیم کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے اسی سے ہم اپنے آپ کو اور کائنات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اردو کے Linguistic Description یا لسانیاتی بیان کا یہ کام اتنا وسیع ہے کہ اس کے لیے جامعات میں موجود لسانی شعبے اور ترقی اردو بورڈ جیسے ادارے ہی اپنے سرمایہ اور وسائل کے باعث اس کام کا PROJECT یا منصوبے کے طور پر آغاز کر سکتے ہیں۔ اس مضمون میں صرف اسمات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

*

گاندھی جی ... (نقیبِ صبح و میرِ کاروانِ و صاحبِ منزل) ... صفحہ ۷ کا بقیہ

وہ یہ بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ لامذہبیت، بے راہ روی اور بے ضابطگی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

" فرد و سماج مذہب سے زندہ رہتے ہیں، لامذہبیت سے فنا ہو جاتے ہیں۔ سچ پوچھا جائے تو مذہب زندگی کی ہر سانس کے ساتھ عمل میں لانے کی چیز ہے۔

اگرچہ درخت کے پتوں کی طرح سارے مذاہب الگ الگ نظر آتے ہیں مگر جڑ کو دیکھا جائے تو سب ایک ہی دکھائی دیتے ہیں۔

دُنیا کے مختلف مذاہب ایک ہی منزل پر پہنچنے کے الگ الگ راستے ہیں۔ اہنسا ہم کو درس دیتی ہے کہ ہم دوسرے مذہبوں کا بھی ویسا ہی احترام کریں جیسا کہ اپنے مذہب کا کرتے ہیں۔"

*

غزلیں

فاروق شفق
۱۲ ۔ دھان کھیتی
... کلکتہ ۷۰۰۰۲۴

یوں تو ہر قیمتی سامان یہاں ملتا ہے
نیند کا قحط ہے اور خواب گراں ملتا ہے

پھول بن جاتا ہے ہر زخم دیا جلتے ہی
دن کا سویا ہوا احساس جواں ملتا ہے

چند قدموں کی رفاقت بھی غنیمت جانو
بھیڑ میں کھو گیا جو شخص کہاں ملتا ہے

ایک دن ہم کو بھی اس بھیڑ میں کھو جانا ہے
اس مسافت میں کہاں کس کا نشاں ملتا ہے

ایک مدت سے مرے شہر نے بدلا نہ لباس
سب کی آنکھوں میں اک اکتایا سماں ملتا ہے

جسم کو دھول کریں بالوں میں چاندی بھر لیں
راہوں میں روز یہ طوفان کہاں ملتا ہے

میرے ہی نام کی تختی ہے ہر اک در پہ شفق
ایک جیسا مجھے ہر ایک مکاں ملتا ہے

انجم عرفانی
ایم۔ ایل۔ کے پی جی کالج
بلرام پور ۲۷۱۲۰۱

شہرت نہیں ملی، نہ ملے، غم نہیں مجھے
یہ افتخارِ خدمتِ فن، کم نہیں مجھے

ابلاغ کا ہر ایک دریچہ ہے مجھ پہ وا
ترسیل کے المیے کا ماتم نہیں مجھے

تشبیہ و استعارہ سے دیرینہ رسم و راہ
ابہام کے دھندلکے بھی مبہم نہیں، مجھے

ایجاز کے مزاج کا ہر رنگ منکشف
ایمائیت کی راہ میں کچھ خم نہیں مجھے

اسلوبِ نو بہ نو کہ تراکیبِ تازہ کار
ناخوشگوارِ جدتِ موسم نہیں مجھے

بزمِ غزل ہو یا کہ ہو وہ رزم گاہِ نظم
ناسازگار کوئی بھی عالم نہیں مجھے

رہتے ہیں ہشت پہلوئے الفاظ روبرو
تہہ داریاں معانی کی مدغم نہیں مجھے

عنبر بہرائچی
ایس۔ ڈی۔ ایم
کلکٹریٹ۔ رائے بریلی

کیا مقدر ہے کہ غیروں سے دعا لیتا ہے
ویرانیوں سے وہ زخموں کی ردا لیتا ہے

کتنا خوددار ہے رہتا ہے ندی میں پھر بھی
تشنگی اپنے ہی اشکوں سے بجھا لیتا ہے

اس کے قدموں سے ستارے بھی لپٹنا چاہیں
اور وہ شخص کہ پیروں کو ہٹا لیتا ہے

خود اندھیروں میں گزارے ہے یہ ہنس ہنس کے مگر
دوسروں کے لیے سورج بھی اگا لیتا ہے

گھر سے باہر تو وہ رہتا ہے چراغوں کی طرح
گھر میں آتا ہے تو وہ خود کو بجھا لیتا ہے

جذبِ دل کیا ہے اسے کرشن سے پوچھو عنبر
وقت آئے تو پہاڑوں کو اٹھا لیتا ہے

ایس اے بیگ چمن اٹاوی
۲۰ چمن منزل، چوہٹہ، اٹاوہ

اہنسا کا دیوتا گاندھی

تری حیات صداقت کی راہ روشن تھی
تری حیات شگفتہ گلوں کا گلشن تھی

تری حیات نے بخشی ہے زندگی اکثر
دکھائی ہے غمِ دوراں میں روشنی اکثر

تری حیات حقیقت کا ایک پیکر تھی
تری حیات محبت کا ایک جوہر تھی

تری حیات بنی آفتابِ نو کی کرن
تری حیات سے وابستہ تھی بہارِ چمن

تری حیات نے ساقی کو جام بخشے ہیں
دیارِ ہند کو اعلیٰ مقام بخشے ہیں

تری حیات ہی اہلِ خرد کی راہ بنی
تری حیات غریبوں کی اک پناہ بنی

تری حیات نے مردوں کو زندگی بخشی
تری حیات نے ذروں کو روشنی بخشی

تری حیات گل افشاں حیات بن کے رہی
بگڑ رہی تھی وطن کی جو بات بن کے رہی

پلٹ دی بغض و عداوت کی ملک سے آندھی
تو واقعی تھا اہنسا کا دیوتا گاندھی

عبدالمنان سیتاپوری
۳۵۔ بنگلہ، سیتاپور یوپی

گاندھی جینتی

آج پھر بھارت میں گاندھی جینتی کا جشن ہے
گونج اٹھی ہے ہر طرف پھر سازِ آزادی کی لے
شخصیت گاندھی کی تھی کتنی عظیم المرتبت
جن کے نعروں سے لرز اٹھی فرنگی سلطنت
دُبلے پتلے تھے مگر کیا شیر دل انسان تھے
کارنامے آپ کے سارے عظیم الشان تھے
حُرّیت کے رہبروں میں آپ تھے سب سے عظیم
آپ کا ہر نقشِ پا ہے مشعلِ راہِ مستقیم
آپ کی جہدِ مسلسل میں تھی کچھ ایسی صفت
جس سے ہر اہلِ وطن کو مل گئی جمہوریت
مسکرائے آپ جب آئے کبھی رنج و محن
سختیاں جھیلیں مگر آئی نہ چہرے پر شکن
آپ کی فکرِ رسا ہر بات سے آگاہ تھی
ہر قدم پر کامرانی آپ کے ہمراہ تھی
آپ ہی سے گلستانِ ہند میں آئی بہار
پتّا پتّا جھوم اٹھا ہر پھول پر آیا نکھار
آپ کا احساں نہ بھولیں گے کبھی اہلِ وطن
زندگی بھر یاد رکھیں گے اسے سب مرد و زن
بچہ بچہ ہند کا ہے آپ کا منت پذیر
آپ کی ذاتِ گرامی تھی بلا شک بے نظیر

طلبہ منتہی

خیرہ ملک البستی

اقبال: میخانۂ مغرب سے صہبائے رومی تک

اقبال کے میخانۂ سخن میں مشرق و مغرب کے صہبا گساروں کا ذکر ملتا ہے۔ صہبا سے مراد یہاں صہبائے فکر ہے نہ کہ صہبائے ناب۔ ان صہبا گساروں میں اگر ایک طرف چوٹی کے حکما، شعرا اور صلحا ہیں تو دوسری طرف عظیم قائد، عساکر اور سربراہِ ملک و ملت بھی ہیں۔ اقبال کہیں ان کے مداح ہیں اور کہیں ان کے ناقد۔ مغرب کی عقلیت کو وہ اسی لیے پسند کرتے ہیں کہ علم الاشیار کے احیا سے دینِ فطرت کو بھی منکشف کیا جا سکتا ہے۔ دینِ فطرت یعنی اسلام ان کے نزدیک ایک ابدی مذہب ہے۔ مغرب نے اشیا کو علم کی کسوٹی پر رکھ کر انکشافات اور تسخیرِ فطرت کے نئے دروازے کھول دیے ہیں عقلیت ہی مغرب کے نزدیک علم کی اساس ہے۔ اقبال کا تصورِ علم دین سے جدا نہیں۔ ان کے نزدیک انسانی عقل کے ساتھ الہامِ ربانی شامل نہ ہو تو علم کی صحیح تربیت نہیں ہو سکتی۔ ("علم اور دین"۔ ضربِ کلیم) اس لیے وہ قرآنِ حکیم اور حدیثِ نبوی ہی کو علم کی صحیح بنیاد ٹھہراتے ہیں۔ وہ مغربی مفکرین مثلاً برگساں، نیٹشے، ہیگل، کانٹ، گوئٹے، براؤننگ اور بائرن وغیرہ کا ذکر اس لیے کرتے ہیں کہ کہیں کہیں دشتِ فکر میں ان کو اپنا ہمصفیر پاتے ہیں اور کہیں گلشنِ سخن میں اپنی نوا کو ان سے ہم آہنگ بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ قارئینِ اقبال کو اس امر کا بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ مغربی تہذیب و بساطِ فکر کے عمیق مطالعہ و مشاہدہ کے بعد بجائے مطمئن و آسودہ ہونے کے ایک طرح سے تشنہ کام و ناآسودہ لوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ انھیں شفا خانۂ مغرب میں علاجِ انسانیت اور زخمِ دل کا مرہم ملنے کے بجائے ایک طرف کا کرب و اضطراب محسوس ہوتا ہے جس کے نقوش ان کے اشعار میں جا بجا دیکھے جا سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

بیا اقبال جامے از خمستانِ خودی درکش

تو از میخانۂ مغرب ز خود بیگانہ می آئی

فرنگ میں کوئی دن اور بھی ٹھہر جاؤں

مرے جنوں کو سنبھالے اگر یہ ویرانہ

جلوۂ او بے کلیم و شعلۂ او بے خلیل

عقلِ نا پروا متاعِ عشق را غارتگر است

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ

سرمہ ہے مری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک

نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

دوسری طرف وہ مشرقی حکما و صوفیا کے معترف و مداح ہی نہیں بلکہ اتباع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر اکبر حسین قریشی "اتباع اس لحاظ سے کہ انھیں ان کے یہاں بعض اسلامی اقدار کی توضیح و تشریح مل جاتی ہے جس میں کچھ اور اضافے کے ساتھ عہدِ جدید کے تقاضوں کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح موجودہ زمانہ کے اس ذہن کو مطمئن کیا جا سکتا ہے جو ہر وقت تشکک کا شکار رہتا ہے۔" ان حکما و صوفیا میں وہ خصوصاً مولانا روم کے اندازِ فکر

سے بے حد قائل ہیں۔ اس کی وجہ قرینِ قیاس یہ معلوم ہوتی ہے کہ انھیں رومی کے علاوہ دوسرے اسلامی صوفیا و متفکرین کے یہاں اپنے مطلب کی چیز کم نظر آتی ہے۔ انھیں تو ایسے اثباتی فلسفۂ فکر کی تلاش تھی جو خدا، کائنات اور انسان کے باہمی مسائل کو حل کرسکے۔ حدیقۂ سنائیؔ اور عطار کی منطق الطیر میں تو انھیں اثبات خودی کی تائید مل جاتی ہے مگر بوعلی سینا کو وہ ایک یونان زدہ فلسفی کے سوا اور کچھ نہیں سمجھتے۔

بوعلی داندۂ آب و گل است
بے خبر از خستگیہائے دل است

نیش و نوشِ بوعلی سینا بہل
چارہ سازیہائے دل از اہلِ دل

امام رازی سے بھی اقبال متفق نظر نہیں آتے۔ غالباً وہ اس لیے کہ بہت سے مسائل مثلاً جبر و اختیار، جبر و قدر، توکل کوشش اور ارتقاء و تسخیر میں رومی اور رازی میں خاصا اختلاف ہے۔ امام رازی جبر کے حامی ہیں اور اس کے اثبات کے لیے عقلی و نقلی دلائل پیش کرتے ہیں۔ جبکہ مولانا روم کا رجحان جبر کے بالکل خلاف ہے۔ وہ اختیار کے قائل ہیں اور جبر کی تردید کرتے ہیں۔ اسی طرح جبر و قدر اور توکل و کوشش کے معاملہ میں بھی مولانا روم کا نکتہ نظر اپنے زمانہ کے دوسرے علماء اور صوفیاء سے بالکل مختلف ہے۔ ان سب مسائل میں رومی کی توجیہات اقبال کے فلسفۂ حیات اور "آدمے نو سازم از خاکِ کہن" میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رومی کے یہاں عشقِ صادق کی ایسی والہانہ مستی ملتی ہے جو حدودِ گردوں کو چیرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ عشق کا ایسا مقام اور کسی کے یہاں دکھائی نہیں دیتا۔ اسی لیے اقبال مولانا روم کو اپنا پیش رو ہی نہیں بلکہ پیر و مرشد تسلیم کرتے ہیں اور اس غائبانہ شاگردی پر وہ فخر کرتے ہیں۔ "مثنوی پس چہ باید کرد" میں وہ مولانا کی مدح سرائی اسی استغراق و گرویدگی کے ساتھ کرتے ہیں جس طرح مولانا نے اپنے پیر شمس تبریز کی مدح اپنی مثنوی میں کی ہے:

پیرِ رومی مرشدِ روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی را امیر

منزلش برتر ز ماہ و آفتاب
خیمہ را از کہکشاں سازد طناب

نورِ قرآں درمیان سینہ اش
جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش

از نئے آں نے نواز پاک زاد
باز شورے در نہادِ من فتاد

اس کے علاوہ اقبال نے متعدد اشعار میں رومی کی عظمت کا اعتراف کیا ہے اور ان کی تعلیمات سے استفادہ کی تلقین کی ہے۔

شعرِ رومی خواند و خندید و گریست
یارب ایں دیوانۂ فرزانہ کیست

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی

نے مہرہ باقی نہ مہرہ سازی
جیتا ہے رومی ہارا ہے رازی

علاجِ آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تیری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سربجیب ایک کلیم سربکف

وقت است کہ بکشائم میخانۂ رومی باز
پیرانِ حرم دیدم در صحنِ کلیسا مست

ایں کار حکیم نیست دامانِ کلیمے گیر
صد بندۂ ساحل مست یک بندۂ دریا مست

میخانۂ رومی تو آج تقریباً پونے آٹھ سو سال سے کھلا ہوا ہے مگر مستی ایک الگ چیز ہے۔ لوگ اس سے اپنی اپنی طرح مست ہوتے رہے ہیں۔ اقبال نے اس مینائے تاک کی نقاب کشائی کچھ ایسے انداز میں کی ہے کہ اس کی خوشبو و مستی دور دور تک پھیل گئی ہے اور آج یہ خوشبو مشرق سے نکل کر مغرب کی فضاؤں کو معطر کررہی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ شمس تبریز کی ملاقات سے پہلے مولانا روم صرف مولوئ روم تھے۔ درس و تدریس، کتب بینی اور فتویٰ نویسی ان کے پسندیدہ مشاغل تھے مگر پہلو میں ایک پاک و صاف دل رکھتے تھے۔ شمس تبریز کی نگاہِ پرسوز نے ایسی حرارت بخشی کہ وہ مسندِ درس سے عرشِ فضیلت پر پہونچ گئے۔ انتہائے جذب میں کبھی گوشہ نشین ہوئے تو کبھی صحرا نورد۔ سچ تو یہ ہے کہ اس شاہدِ حقیقی کے جلوے جس نے دیکھ لیے اسے قرار کہاں۔ مثنوی جو اسرار و معارف کا خزانہ ہے اور جسے "ہست قرآں در زبانِ پہلوی" کہا جاتا ہے، ایامِ جذب و مستی کی یادگار ہے۔ یہ چھ حصوں پر مشتمل ہے اور اس میں ۲۶۶۶۲ اشعار ہیں۔ اس کے علاوہ "دیوان" اور "فیہ ما فیہ" خطوط کا مجموعہ بھی مولانا کی تصانیف ہیں۔

ہم یہاں صرف مولانا کے عشق سے بحث کریں گے جو ان کے

کلام میں کار فرما ہے۔ اور جس کے آئینے میں وہ مشاہدۂ ذات کرتے ہیں اور جس کی بدولت وہ حقیقتِ ہستی اور تقاضائے ہستی کی گتھیوں کو سلجھاتے ہیں :

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما
اے تو افلاطون و جالینوس ما

بشنو از نے چوں حکایت می کند　　از جدائی ہا شکایت می کند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق　　تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق
کوزۂ چشمِ حریصاں پر نہ شد　　تا صدف قانع نہ شد پر در نہ شد
ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد　　او ز حرص و عیب کلی پاک شد
عاشقی پیداست از زاریٔ دل　　نیست بیماری چو بیماریٔ دل
علتِ عاشق ز علتہا جدا است　　عشق اصطرلاب اسرارِ خدا ست

عشق کی ہمہ گیری اور آفاقیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ عاشقانِ خدا کا مذہب صرف ایک ہوتا ہے اور وہ ہے صرف معبودِ حقیقی کا عشق اس کی حدود بے پایاں ہیں اور اس کی تمنیں لامحدود۔ عشق کی نہ کوئی زبان ہے اور نہ اس کے گریہ و فغاں کی کوئی لے۔ یہ ایک وحدت ہے جو مذہب و ملت اور اظہار وادا کے اسلوب سے بے نیاز و ماورا ہے۔ عشق چاہے ایک نبی کا ہو یا کسی چرواہے کا اپنی ذات و وحدت کے لحاظ سے ایک ہی ہے۔ دونوں میں ایک ہی نے مشترک مے محبت چھلکتی ہے یعنی "لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں" کے مصداق دہم معنی ہے :-

وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا　　بندۂ ما را چرا کردی جدا
تو برائے وصل کردن آمدی　　نے برائے فصل کردن آمدی
ہر کسے را سیرتے بنہادہ ایم　　ہر کسے را اصطلاح دادہ ایم
در حقِ او مدح و در حقِ تو ذم　　در حقِ او شہد و در حقِ تو سم
ما بروں را ننگریم و قال را　　ما دروں را بنگریم و حال را
ہیچ کس مضطر ثواب اولیٰ تر است　　خونِ شہیداں را ز آب اولیٰ تر است

ملتِ عشق از ہمہ دیں ہا جدا است　　عاشقاں را مذہب و ملت خدا است

اطاعت و عبادت عاشقوں کے لیے تعمیرِ عشق کا ایک ذریعہ ہے۔ مولانا نے مندرجہ ذیل غزل میں اپنی اطاعت یعنی نماز کا ذکر کیا ہے کہ وہ اسے کس طرح ادا کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک وہ عبادت جس میں سوز و گداز، طلب و جستجو اور انجذاب کامل نہ ہو، بے جان و بے مقصد ہو جاتی ہے۔ ایسی عبادت نہ تو مقبولِ بارگاہِ محبوب ہوتی ہے اور نہ اس سے کوئی فائدہ ہی پہنچ سکتا ہے۔ انجذاب کامل ہی کو شریعت میں خشوع و خضوع کہا گیا ہے۔ ہمارے اسلاف کا بھی یہی طریقہ تھا کہ جب وہ نماز میں کھڑے ہو جاتے تھے تو استغراق و محویت اور یکسوئی قلب کا یہ ہوتا تھا کہ ان کے جسم میں پیوست تیر کب نکال لیا گیا یا ان کے بدن پر کوئی زخم عمل جراحی سے کب گذر گیا اس کی انھیں مطلق خبر نہ ہوتی تھی۔ بارگاہ محبوب میں تسلیم و رضا کا یہی شیوہ حاصلِ قربِ محبوب ہوتا ہے :

چو نمازِ شام ہر کس بنہد چراغ و خوانے
منم و خیالِ یارے غم و نوحہ و فغانے
چو وضو ز اشک سازم بود آتشیں نمازم
در مسجدم بسوزم، چو در بدر اذانے
عجبا نمازِ مستاں، تو بگو درست ہست آں
کہ نداند او زمانے نہ شناسد او مکانے
عجبا دو رکعت است ایں عجبا چہارم است ایں
عجبا چہ سورہ خواندم چو نداشتم زبانے
در حق چگونہ کوبم کہ نہ دست ماند و نے دل
دل و دست چوں تو بردی بدہ اے خدا امانے
بخدا خبر ندارم، چو نماز می گذارم
کہ تمام شد رکوعے کہ امام شد فلانے

مولانا کے یہاں عبادات میں یہ استغراق و خود فراموشی حقائقِ زندگی سے بے نیازی اور روگردانی نہیں سکھاتی بلکہ وہ اس دیوانگی کو انتہائے فرزانگی کا ضامن تصور کرتے ہیں۔ وہ انسان کو سعی و عمل اور حرکت و جہد کا پیکر سمجھتے ہیں۔ وہ توکل

[illegible] کے غلط تصور کے قائل نہیں ہیں۔ زندگی کو کوشش و [illegible] کے ذریعہ سنوارنے کی تلقین کرتے ہیں۔

[illegible] کا یہ سوز عشق جو اپنے زمانے کے گوشہ گیر تصوف کی چہار دیواریوں کو توڑ کر میدان عمل کی جستجو کرتا ہے اور زندگی کی فضا ہر اوپ کو سعی و کوشش کی شعلوں سے منور کرتا ہے، اقبال کے یہاں پہونچ کر کائناتی ہو جاتا ہے اور ان کے سارے فلسفۂ حیات اور مقتضائے حیات کی روح بن جاتا ہے۔ اقبال کا یہ عشق رسمی نہیں حقیقی و وجدانی ہے۔ یہ ایک ایسا جوہر لطیف ہے جو مشت خاک میں روز ازل ہی سے مضمر ہے۔

ستا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی

یہ انسان کو اس کے خالق کی طرف سے ایسا بیش بہا عطیہ ہے جس کی امانت داری کے لیے سے سو سو جتن کرنے پڑ رہے ہیں پھر بھی وہ اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو پا رہا ہے۔ اقبال کے یہاں لفظ عشق بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہ مجاز و حقیقت دونوں کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ اس کی بدولت انسان حقائق زندگی اور اسرار حیات سے واقف ہوتا ہے۔ یہ خودی کو مستحکم کرنے کا ذریعہ ہے یہ ایک وجدانی کیفیت ہے جس کا وصف مستی و انہماک ہے۔ اس کی بدولت انسان آرزوئے پیہم سے ہمکنار رہتا ہے۔ سوز دروں اور ذوق نمو کا جذبہ جو انسان میں پایا جاتا ہے وہ عشق ہی کی بدولت ہے۔ یہ زندگی میں ایک زبردست قوت محرکہ اور سرچشمۂ عمل ہے۔ یہ انسان کو بے پناہ قوت ارادی سے نوازتا ہے۔ جس کی بدولت وہ تسخیر فطرت کرتا ہے اور اس کی ہمت و نگاہ اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ مہر و ماہ اور زہرہ و مشتری اس کے گرد راہ ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اپنے وجدان کی کمند سے جبرئیل اور ذات یزداں کو اسیر کرنے کے منصوبے بناتا ہے۔

در دشت جنون من جبرئیل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

اقبال جاوید نامہ میں مرشد رومی کے ساتھ افلاک کی سیر کرتے ہیں۔ آغاز سفر سے پہلے روح رومی ان کو معراج کی حقیقت اور اس کے اسرار سے آگاہ کرتی ہے اور اس حقیقت کو منکشف کرتی ہے کہ معراج مرد مومن در اصل مشاہدۂ حق ہے جو بغیر عشق اعلیٰ صفات اور تکمیل خودی کے ممکن نہیں۔

برمقام خود رسیدن زندگی است   ذات را بے پردہ دیدن زندگی
مرد مومن در نسازد با صفات   مصطفیٰ راضی نہ شد الا بذات
چیست معراج آرزوئے شاہدے   امتحانے روبروئے شاہدے

جب مرد مومن عشق اعلیٰ صفات کا حامل بن کر تکمیل خودی کر لیتا ہے تو دنیا کا ہر کام اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ امداد الٰہی ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ نان جویں کھا کر قلعۂ خیبر کو پاش پاش کر دیتا ہے اور فرعون و نمرود جیسے جابر و سرکش حکمرانوں کے لشکروں کو آلات حرب و ضرب کے بغیر شکست دے سکتا ہے۔ روح رومی کہتی ہے کہ اگر تو خودی کے ذریعہ خدا چاہنے والا بن جائے تو تمام عالم تیرا محکوم بن جائے۔

عشق با نان جویں خیبر کشاد   عشق در اندام مہ چاکے نہاد
کلۂ نمرود بے ضربے شکست   لشکر فرعون بے حربے شکست
چون خودی را از خدا طالب شود   جملہ عالم مرکب او راکب شود

اقبال کے نزدیک عشق زندگی کی اعلیٰ ترین تخلیقی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ ایجاد و معنی کا محرک ہے۔ اس کی بدولت انسان کی تخلیقی قوتیں بیدار ہوتی ہیں اور وہ آئے دن تحقیق و تسخیر ایجاد و اختراع کرتا رہتا ہے۔ یہ عقل کے لیے رہبری کا کام کرتا ہے اور اسے تشکک اور تامل سے نکال کر اولو العزمی سکھاتا ہے۔ [illegible] کی طرح اقبال کے یہاں بھی عقل و عشق اور علم و عشق میں ایک کشمکش ملتی ہے۔ اس حریفانہ کشاکش سے بہت سے لطیف واضح اور بہت سی نئی جہتیں متعین ہو جاتی ہیں۔ اس مضمون [illegible] خامہ فرسائی اقبال نے کچھ اس انداز سے کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ موضوع صرف انھیں کا ہو کر رہ گیا ہے۔ برگساں کے یہاں بھی عقل محض کے خلاف ایک طرح کی بغاوت ملتی ہے وہ عقل اور وجدان کو دو متضاد قطبین (POLARITIES

حیثیت پیش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک کائنات میں دو قوتوں کے درمیان کشمکش اور تضاد پایا جاتا ہے ایک زندگی ہے جو ہمہ وقت ارتقائی منزلیں ڈھونڈتی ہے اور اوپر کی طرف پرواز کرنا چاہتی ہے دوسری طرف مادہ ہے جو پستی کی طرف کھینچتا ہے۔ برگساں کے بموجب عقل کے ذریعہ صرف ان اشیاء کا ادراک ہو سکتا ہے جو غیر مسلسل اور غیر متحرک یا ساکن ہوں اور مکان (SPACE) کے حدود سے آزاد نہ ہوں یعنی بالفاظ دیگر ان کی حیثیت مکانی ہو۔ مگر حقیقت ابدی جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو، اس پر صرف وجدان کے ذریعہ ہی قابو پایا جا سکتا ہے۔ یہی وہ نکتے ہیں جہاں برگساں اور اقبال میں باہمی مماثلت پائی جاتی ہے۔ دراصل اقبال کے یہاں عقل کے مقابلے میں عشق کو فضیلت حاصل ہے جس کا اظہار ان کے کلام میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ مگر وہ عقل کو بیکار محض بھی نہیں سمجھتے۔ دراصل دونوں زندگی کے لئے اہم و ضروری ہیں فرق یہ ہے کہ ایک منزل کے رہنما سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور دوسرے کو منزل کی طلب کا محرک کہا جا سکتا ہے۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں — اس کی تقدیر میں حضور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن — یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں
دل بینا بھی کر خدا سے طلب — آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

آخر میں شرح و حدیث عشق یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ کائنات اور زندگی میں یہ ساری رونق عشق ہی کی بدولت ہے۔ مرد مومن کے سارے اعمال و افعال کی تکمیل جذبۂ عشق کے ذریعہ ہی ہوتی ہے عشق ہی اصل حیات ہے اس کو کبھی موت نہیں آتی اور یہ اپنی ذات و صفات کے اعتبار سے اتنا پاکیزہ ہے کہ دم جبرئیل اور دم مصطفےٰ ہے۔

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو — عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا — اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دم جبرئیل عشق دم مصطفےٰ — عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک — عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہ حرم عشق امیر جنود — عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات — عشق سے نور حیات عشق سے نار حیات

اقبال کا رومی سے یہ استفادہ صرف اقبال ہی کے لیے با برکت مستحسن ثابت نہیں ہوتا بلکہ خود فرمودۂ رومی کے حق میں بھی اکسیر ثابت ہوتا ہے۔ اقبال سے پہلے مطالعۂ رومی کی نوعیت محض جزوی و انفرادی تھی، یہ مطالعہ صرف مدرسوں، خانقاہوں اور کچھ مخصوص حلقوں تک محدود تھا۔ مگر اقبال کی تشریح و توضیح کی بدولت اس کی یہ نوعیت بدل چکی ہے۔ اب مثنوی محض تصوف کے مطالعہ کی کتاب نہ رہ کر تلقین فکر و عمل کا سرچشمۂ لازوال بن گئی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم اس سے کہاں تک مستفید ہو سکتے ہیں اور صہبائے رومی ہمیں کس حد تک سیراب و سرشار کر سکتی ہے۔ ★

بقیہ: میر انیس

چہرے پہ آب و تاب رسول زمنؑ کی ہے
زلفوں میں بو بھری ہوئی مشک ختن کی ہے
عارض کے بوسے لیتا ہے نور آفتاب کا
چہرہ نہیں ہے پھول کھلا ہے گلاب کا

(سردار جعفری)

ہم رات کو دیں حکم تو سورج نکل آئے
ہم ماریں جو ٹھوکر ابھی دریا ابل آئے
ہم تیغ اٹھا لیں تو تمہاری اجل آئے
ہم جب بھی کہیں نظم جہاں میں خلل آئے
مختار ارادے کے ہیں مجبور نہیں ہم
تم کیا ہو خدائی سے بھی مقدور نہیں ہم

(وحید اختر)

میر انیس کا کلام آج بھی جادو جگا رہا ہے اور یہ جادو اس وقت تک سر چڑھ کر بولتا رہے گا جب تک ذوق شعر دلوں میں دیئے جلاتا رہے گا اور دماغوں کو سرشار کرتا رہے گا۔

نازش مانکپوری
۳۳ میاں پور
جونپور ۲۲۲۰۰۲

یک جہتی

یک جہتیٔ ذرّات سے ہے عظمت توحید
محدود ہے اطراف سے اقلیم من و تو

یہ کثرتِ جلوہ کی نمائش، یہ مناظر
یہ عالمِ صد رنگ ہے تنظیم من و تو

آئینۂ توحید کو جب میں نے کیا چاک
فطرت سے ان ناسمجھوں نے تعلیم من و تو

میں نے ہی سمجھی کی غلطی وہ تقسیم کہ جس سے
یہ زیست ہے خمیازۂ تقسیم من و تو

خمیازہ یہی وہ ہے جو ہے حاصل ایماں
زندانِ من و تو میں مقید ہے ہر انساں

ہر دل کے دھڑکنے کی صدا ہے مری آواز
کیوں تو یہ سمجھتا ہے کہ میں اور ہوں تو اور

ظاہر ہے وہ قالب میں، وہی روح میں پنہاں
کیوں تو یہ سمجھتا ہے کہ گل اور ہے بو اور

ساحل سے نہیں ہوتا ہے اندازۂ طوفاں
ہر دل میں وہ کچھ اور ہے قطرہ لبِ جو اور

جس مے کا تو عادی ہے، وہ مے اور ہی کچھ ہے
پی بادۂ توحید اٹھا جام و سبو اور

کیا عظمتِ توقیر انا ہے یہ سمجھ لے
ہر ذرّے میں معکوس خدا ہے یہ سمجھ لے

رشید رام پوری
بے تاب روڈ
رام پور ۲۴۴۹۰۱

یہ میرا وطن ہے

یہ میرا وطن، میرا وطن، میرا وطن ہے
یہ میرا چمن، میرا چمن، میرا چمن ہے

ہر شام دل آویز ہے ہر صبح ضیا بار — ہر سمت یہ فطرت کے برستے ہوئے انوار
فردوس نظر منظر ہر دشت و دمن ہے — یہ میرا وطن میرا وطن میرا وطن ہے
یہ میرا چمن، میرا چمن، میرا چمن ہے

اللہ رے یہ صد رنگ بہاروں کا گلستاں — اس خاک کا ہر ذرہ ہے فردوس بداماں
یہ ارضِ حسیں سنگمِ گنگ و جمن ہے — یہ میرا وطن میرا وطن میرا وطن ہے
یہ میرا چمن، میرا چمن، میرا چمن ہے

یہ تاج و اجنتا کے دل آویز نظارے — گنگ و جمن و کوثر و تسنیم کے دھارے
یک جہتی و اخلاص و محبت کا چمن ہے — یہ میرا وطن میرا وطن میرا وطن ہے
یہ میرا چمن، میرا چمن، میرا چمن ہے

گونجے ہیں یہاں نانک و چشتی کے ترانے — زنار کہیں ہے کہیں تسبیح کے دانے
یہ درس گہہ تزکیۂ روح و بدن ہے — یہ میرا وطن میرا وطن میرا وطن ہے
یہ میرا چمن، میرا چمن، میرا چمن ہے

جس محفلِ رنگیں میں ہوئے میر غزلخواں — غالب کے ہوئے جس میں کمالات نمایاں
ہاں ہاں یہ وہی محفلِ اربابِ سخن ہے — یہ میرا وطن میرا وطن، میرا وطن ہے
یہ میرا چمن، میرا چمن، میرا چمن ہے

خود دار جوانوں کا، دلیروں کا یہ مسکن — عظمت کے نگہبانوں کا شیروں کا یہ مسکن
ہنس ہنس کے یہاں جان گنوانے کا چلن ہے — یہ میرا وطن، میرا وطن، میرا وطن ہے
یہ میرا چمن، میرا چمن، میرا چمن ہے

اس خلد کو گاندھی نے جواہر نے نکھارا — اس باغ کو آزاد نے جوہر نے سنوارا
شاداب یہاں صبحِ تمنا کی کرن ہے — یہ میرا وطن، میرا وطن میرا وطن ہے
یہ میرا چمن، میرا چمن، میرا چمن ہے

علقمہ شبلی
۹۵ رپن اسٹریٹ
کلکتہ - ۷۰۰۰۱۶

میر انیس — کل اور آج

میر ببر علی انیس اُردو شاعری میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اُردو میں نہ صرف رزمیہ شاعری کی بنیاد رکھی، زبان و ادب کو نئے اسالیب سے آشنا کیا، اور ہمارے ذوقِ شعر کی تربیت کی بلکہ ہمیں آدابِ مجلس بھی سکھائے۔ دور در از کے انسانوں سے ہمدردی کا درس بھی دیا اور ہر عمر کے انسانی کرداروں کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کیں۔ بیانیہ شاعری کے میدان میں انھوں نے جس فن کاری کا ثبوت دیا اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ تلوار کی تعریف، گھوڑوں کی توصیف، بہادروں کی بزم آرائی، دشمنوں کی ستیزہ کاری، جوانوں کے جوش و خروش، بوڑھوں کے ہوش و گوش، مختلف کرداروں کے مکالمے اور منظر نگاری کے پیش کرنے میں وہ کمال دکھایا جس نے اردو شاعری کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔ میر انیس کا یہ دعویٰ محض تعلّی نہیں ہے

مری قدر کر اے زمینِ سخن
تجھے بات میں آسماں کر دیا

میر انیس نے اپنے مرثیوں کے لیے مسدس کی ہیئت کو اپنایا اور اپنے فن کارانہ سلیقۂ اظہار سے اس میں بے حد توانائی پیدا کر دی، ورنہ یہ حقیقت ہے کہ کوئی خاص ہیئت کسی نظم یا آہنگ کو گوارا اور پُر اثر بنانے کے لیے ضروری نہیں، اس میں شاعر کے سلیقے اور فن کاری کو زیادہ دخل ہے۔ ایک اچھا اور باذوق شاعر کسی بھی فارم میں اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کر سکتا ہے اور اسے دل کش اور موثر طور پر پیش کر سکتا ہے اور محض ایک ناظم کسی بھی ہیئت میں کسی بھی موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتا، اور ہیئت و مواد دونوں ہی بے جان نظر آتے ہیں۔ میر انیس الفاظ کے بادشاہ ہیں۔ ان کے سامنے الفاظ غلاموں کی طرح ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے ہیں۔ انھوں نے الفاظ کی بڑی سے بڑی تعداد کو زیادہ سے زیادہ سلیقے سے برتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان میں بڑی شگفتگی اور بیان میں دل نشینی ہے۔ رعایتِ لفظی، معنوی بلند آہنگی پیکر تراشی اور متناسب الفاظ ایسی خوبیاں ہیں جن سے شاعروں کی بھیڑ میں ان کی شناخت بہ آسانی ہو سکتی ہے اور ان کا قد نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔

میر انیس کے مرثیوں کا موضوع شہدائے کربلا کی عظیم قربانی ہے۔ انھوں نے کربلا کی تپتی ہوئی ریت میں حسینی اور یزیدی فوجوں کی صف آرائی کو نہایت ہی پُر اثر انداز میں پیش کیا ہے اس لیے کچھ لوگوں نے اسے خاص فرقے اور مخصوص عقائد رکھنے والوں تک محدود سمجھ لیا۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ دنیا کی اہم زبانوں میں جن ادب پاروں کو ادبِ عالیہ کا رتبہ ملا ہے ان میں سے متعدد مذہبی ہیں اور کسی خاص فرقے سے ان کا گہرا تعلق ہے۔ مہابھارت، رامائن، پیراڈائز لاسٹ ایسے ہی شہ پارے ہیں لیکن ساری دنیا میں ان کا مطالعہ ادبی حیثیت سے کیا جاتا ہے اور ان کی پرکھ سائنسی نقطۂ نگاہ سے ہوتی ہے۔ ان کی ادبی قدر و قیمت کے تعین میں مذہب کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ بالکل یہی معاملہ مرثیے کا بھی ہے۔ میر انیس نے کربلا کے پس منظر میں ایسے آفاقی کرداروں کی

تخلیق کی ہے جن کو کسی ایک مذہب یا فرقے میں محدود نہیں کیا جا سکتا
ہے۔ میر انیس کی شاعری میں جہاں عقیدے کی روشنی چاندنی
کی طرح پھیلی ہوئی ہے وہیں ہندستانیت بھی ہوا کی طرح موجود ہے
جس سے اس میں ارضیت کا رنگ آگیا ہے۔ وہ خلا میں سانس نہیں
لیتی بلکہ اس کے قدم زمین پر ہیں اور یہ کم اہم بات نہیں۔

میر انیس کے تمام واقعات و کردار کا تعلق تاریخ عرب سے ہے
لیکن یہ کم حیرت انگیز نہیں ہے کہ مرثیے نے جو ترقی ہندستان میں کی
وہ عرب اور ایران کے حصے میں نہیں آئی۔ ہندستان میں اس کی مقبولیت
اور ترقی دراصل اس مشترکہ تہذیب کی دین ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں
کے میل جول سے وجود میں آئی تھی اور جسے صوفیوں اور سنتوں
کے اقوال سے تقویت ملتی تھی اور یہیں سے عرب کرداروں کے ساتھ
ہندستانی معاشرت کے ذکر کا جواز ملتا ہے اور اسی کی بدولت انیس
کی شاعری میں ہمیں اپنا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ انیس چاہتے
بھی تو اس کے خلاف نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ ۱۸ ویں صدی کے
لکھنؤ کی پیداوار تھے اور ان کا ذہن اس دور کے لکھنؤ کی تہذیب
اور معاشرت کا ذہن تھا۔ ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ تیرہ سو برس
پہلے کی اس تہذیب و معاشرت کا جو انھوں نے دیکھی ہی نہیں تھی
دل پذیر اور اثر انگیز نقشہ پیش کریں۔ ہر دور کے عظیم شاعر کی طرح
انیس نے اپنے کرداروں کو مقامی لب و لہجہ عطا کر کے انھیں ہمارے
دلوں سے زیادہ قریب کر دیا ہے

ہندستانی عورتوں کے جذبات و احساسات کی جھلک دیکھنا
ہو تو میر انیس کے مرثیے کا یہ بند ملاحظہ کیجیے ؎

خیمے میں جا کے شہ نے یہ دیکھا حرم کا حال
چہرے تو فق ہیں اور کھلے ہیں سروں کے بال
زینب کی یہ دعا ہے کہ اے ربِّ ذوالجلال
بچ جائے اس فساد سے خیر النسا کا لال
بانوئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

"صندل سے مانگ بھرنا" "کھیتی ہری ہونا" اور "بچوں سے گودی
بھری رہنا" ہندستانی سماج کی وہ جھلکیاں ہیں جن میں ہمارا دل دھڑکتا
ہے۔ ہندستانی تہذیب کے پس منظر میں کسی معزز خاتون کے جانور
پر سوار ہونے اور اترنے کا نقشہ ان اشعار میں دیکھیے ؎

محمل سے اتر آئیں جو نیوڑھائے ہوئے سر
نعلین رکھیں زوجۂ عباس نے بڑھ کر
اک ہاتھ کو تھامے ہوئے تھی بانوئے سرور
سجاد اٹھائے تھے لٹکتی ہوئی چادر
اک دختر شبیر ادھر اور ادھر تھی
سر بلوے میں کھل جائے گا اس کی نہ خبر تھی

"سر نیوڑھانا"، "چادر اٹھانا" اور "سر کھلنا" وہ ادائیں ہیں جن میں
ہندستانی سماج زندہ و پائندہ نظر آتا ہے۔

میر انیس کے مرثیوں میں ان ہندستانی رسومات کا ذکر بار بار
آتا ہے جو اس وقت کی معاشرت کا لازمی جز تھیں۔ شادی کی رسومات
مثلاً سہرا، بدھی، اوڑھنی، کنگنا، تلک، مہندی، آرسی مصحف،
دہلیز روکنا، نیگ مانگنا، دولھا بنے ہوئے بھائی پر دوپٹے کا آنچل
ڈالنا اور موت کی رسمیں مثلاً برہنہ سر ہونا، سینہ پیٹنا، رخسار نوچنا،
رونا پیٹنا ایسے مضامین ہیں جو لکھنوی سماج کی جیتی جاگتی تصویریں
ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔

جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے کہ میر انیس فن شاعری کے امور سے
اچھی طرح واقف تھے، اشعار کی نوک پلک کو سنوارنے کا فن انھیں
آتا تھا، الفاظ پر ان کی گرفت بڑی سخت تھی اور ہر ایسی ترکیب یا لفظ
ان کے لیے ناقابل برداشت تھا جسے ذوق سلیم گوارا نہ کرتا ہو، اس
کے باوجود انھیں ایسے عامیانہ الفاظ کے استعمال سے عار نہ تھا جو
اس وقت کی ہندستانی زبان کا جز و لاینفک بن چکے تھے کیونکہ انھیں
اس کا احساس تھا کہ عوام سے قریب آنے اور اشعار میں فطری رنگ
پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے۔ اس طرح انھوں نے ٹھیٹھ اور
"ناصاف" الفاظ کو استعمال کر کے زبان کو عوامی رنگ دینے کی
کوشش کی۔

مشہور انگریزی شاعر اور نقاد ایلیٹ نے لکھا ہے:

"جب ہم کسی شاعر کے ساتھ غیر جانبداری سے معاملہ کریں گے تو اکثر یہ دیکھیں گے کہ اس کے کلام کے نہ صرف بہترین بلکہ سب سے زیادہ انفرادیت آمیز حصے شاید وہی ہوں گے جن میں شعرائے گزشتہ جو اس کے اجداد ہیں اپنی لافانیت کا اظہار سب سے زیادہ جوش اور قوت سے کرتے ہیں۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ شاعر گزشتہ شاعروں کا اثر قبول کرتا ہے۔ یہ ایک صحت مند روایت کا حصہ ہے۔ یہ معاملہ شعوری بھی ہوتا ہے اور غیر شعوری بھی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اثر قبول کرنے والا اس سے بے خبر رہتا ہے کہ اس نے کسی شاعر کا اثر قبول کیا ہے اور کبھی اسے اس کا احساس رہتا ہے کہ وہ کسی شاعر کی تقلید کر رہا ہے یہی وجہ ہے کہ آج شاعروں کا مطالعہ اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جاتا جب تک ان کے کلام میں گزشتہ شاعروں کے اثرات کی نشان دہی نہ کی جائے۔ اسی طرح متقدمین شعراء کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت بعد کے شعراء پر ان کے اثرات کا جائزہ بھی ضروری ہے کیونکہ تنقید دراصل ان گم شدہ شاہراہوں کی بازیافت کا عمل ہے جو مختلف شاعروں کے کلام کو ایک دوسرے سے ملاتی ہیں۔

اس نقطۂ نگاہ سے جب ہم انیس کے مرثیوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کے لہجے کی گونج میر عشق سے لے کر عہد حاضر کے شاعروں تک سنائی دیتی ہے۔ حالی، اقبال، چکبست، جوش ملیح آبادی، تلوک چند محروم، پرویز شاہدی، جمیل مظہری، سردار جعفری اور وحید اختر وغیرہ ایسے شعراء ہیں جنھوں نے مرثیوں ہی میں نہیں بلکہ دوسری نظموں کے لیے بھی مسدس ہی کی ہیئت کو اپنایا۔ ان کے کلام میں جو زور بیان اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے وہ براہ راست انیس کا اثر ہو یا نہ ہو لیکن روایت انیس کی توسیع ضرور ہے۔ ان شعراء کے کلام میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں۔ یہاں صرف چند ایسی مثالیں پیش ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان شاعروں نے مرثیے کی بہترین صفات کا تسلسل کس طرح قائم رکھا ہے

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے
(علامہ اقبال)

شہد میری گفتگو ہے سانس میری ہے گلاب
نطق سے میرے نمایاں ہے تخیل کا شباب
پیکر خاکی ہوں لیکن وہ طلسم آب و تاب
جس کے ہر ذرے میں گردش کر رہا ہے آفتاب
ڈالتا ہوں پرتو گلشن خس و خاشاک پر
عرش کی مہریں لگاتا ہوں جبین خاک پر
(جوش ملیح آبادی)

مجلس وہم و گماں میں ہے نظر بند یقیں
شرم سے ہے عرق آلود تفکر کی جبیں
ایسے بھی لوگ ہیں منجملۂ ابنائے زمیں
دور تک جن کے تصور میں کوئی باغ نہیں
اپنے دامن کو جھٹک، موسم گل ان کو دکھا
اے قلم پھول کھلا! پھول کھلا! پھول کھلا!
(پرویز شاہدی)

ہائے وہ بندۂ مقبول خداوند جلیل
وہ یتیموں کا مربی وہ غریبوں کا کفیل
جس کا انداز کرم رحمت خالق کی دلیل
جس سے جاری ہوئی الفاظ و معنی کی سبیل
دانش و زہد نے ڈالا یہیں بستر اپنا
تشنگی ذوق کی بھرتی رہی ساغر اپنا
(جمیل مظہری)

قاسم میں آن بان امام حسن کی ہے
قوت کلائی میں شہ خیبر شکن کی ہے

(باقی صـ۲ پر)
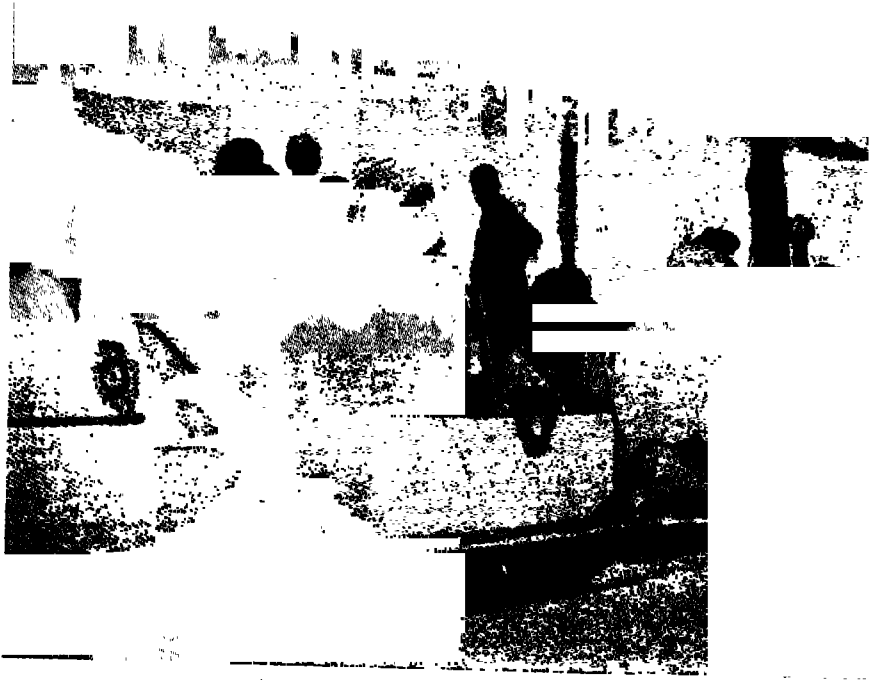
وزیر اعلا شری سری پت مشرا ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۳ کو بیگم حضرت محل پارک لکھنؤ میں ہریجن، قبائل مندرجہ فہرست و خواتین کنونشن کو خطاب کرتے ہوئے۔ تصویر میں مرکزی وزیر صنعت شری نرائن دت تیواری اور ممبر پارلیمنٹ شری راجیو گاندھی بھی نظر آ رہے ہیں۔

وزیر اعلا شری سری پت مشرا ۲۰ اکتوبر ۱۹۸۳ کو جواہر بھون لکھنؤ میں : دوسرے آبادی پراجکٹ کے ریاستی سمینار کی صدارت کرتے ہوئے جو ریاست کے مختلف محکموں کے درمیان خاندانی بہبود پروگرام کے سلسلے میں تال میل قائم کرنے کی غرض سے منعقد کیا گیا۔ تصویر میں وزیر صحت شری لوک پتی ترپاٹھی بھی نظر آ رہے ہیں۔

وزیر ریاست برائے محنت شری سنیل شاستری ۲۷ راکتوبر ۸۳ء کو گورکھپور میں کارپوریشن بینک کی شہری شاخ کے افتتاح کے موقع پر منعقدہ جلسے کو خطاب کرتے

چیلا پاور ہاؤس ۔ بجلی کی پیداوار میں جدید ٹیکنالوجی کا مظہر
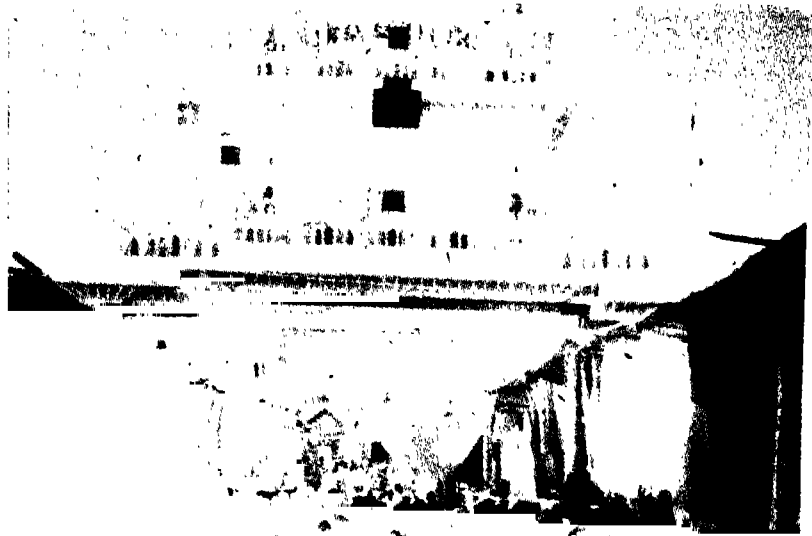
دیوہ (ضلع بارہ بنکی) میں میلے کے موقع پر حضرت حاجی وارث علی شاہ کے آستانے پر عقیدت مندوں کا ہجوم

ینگ مین ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ۵ راکتوبر ۱۹۸۳ء کو نیا گاؤں لکھنؤ میں منعقدہ قومی یک جہتی سے متعلق مشاعرے میں اتر پردیش اردو اکاڈمی کی صدر بیگم حامدہ حبیب اللہ اظہار خیال کرتے ہوئے۔ تصویر میں شری ظاہر قزلباش، محترمہ فاطمہ وصیہ جائسی شری عرفان عباسی، شری نازش پرتاپگڈھی، شری صائم سیدن پوری، شری تسنیم فاروقی اور شری شایاں رام پوری بھی نظر آرہے ہیں

نیچے ـــ سامعین کا ایک منظر

احسان نانپاروی

حیاتِ جاوداں

یہ دنیا یہ دنیائے رازِ حیات   اُسی کا ہے پرتو ہر اک سمت پر
فروغِ تمنا گہہ شش جہات   فضائے تمنا ہے نکھری ہوئی
تھی سادہ حدیثِ جہانِ وجود   کہ ہے چاندنی جیسے بکھری ہوئی
تھا بے رنگ یہ آسمانِ کبود   یہ مینا، و منبر یہ محراب و در
ہوا ریزہ ریزہ وہ سنگِ جمود   کہ ہے اذنِ مومن سے نورِ سحر
کہ رکتا نہیں آبشارِ وجود   یہ تنویر اپنی فضاؤں میں ہے
یہ آدم متاعِ روانِ حیات   یہی سوز اپنی نواؤں میں ہے
ہوا زیبِ گہوارۂ کائنات   یہ مانا کہ فانی ہے ذوقِ حیات
اُسی کی یہ گرمی شراروں میں ہے   اسے عشقِ جاوید سے ہے ثبات
اُسی کا لہو لالہ زاروں میں ہے   مہکتے خیالوں کے رنگیں گلاب
اُسی کے گل و لالہ اس کے یہ داغ   رخِ دوست جس سے ہوا لالہ تاب
یہ صحرا، یہ کہسار، یہ باغ و زاغ   ہر اک غنچہ جلوہ بارِ نشاط
یہ انجم یہ شمس و قمر یہ حیات   ہر اک [illegible] نشاط
اُسی کے ہیں آثار صد کائنات   وہ معمورہ جس سے ہیں [illegible]
یہ سب اس کی خاطر ہے تسخیر ہیں   وہ پیکر کہ جس سے ہیں رعنائیاں
اُسی کی تمنا کی تصویر ہیں   وہ حسن کی جہاں باریاں جان ہیں
لہو اب بھی تازہ ہے دل میں ہی   وہ حور و ملک جس پہ قربان ہیں
دھڑکتا ہے دل آبِ گل میں ہی   اسی سے ہے لبریز جام و سبو
ہے اب بھی وہی بادۂ لالہ رنگ   خنابستہ دستِ گلِ آرزو
کہ ہے وجد میں عالمِ خشت و سنگ   حیاتِ مسلسل ہے قائم یونہی
مرا کیف تو صہبائے باقی میں ہے   کہ تخلیقِ آدم ہے دائم یونہی
یہ ذوقِ نظر حسنِ ساقی میں ہے   نے لمحۂ منتِ شیخ و شاب
نہ جادہ ہے باقی نہ کوہ و قمر   زہے نغمۂ آرزوئے شباب

رمیش چندر شوق مرزاپوری
۱۳/۳۵ جواہر لال نہرو روڈ
الہ آباد

غزل

کچھ ملا بھی تو بہت کچھ دیر میں کھونے کے بعد
اک چمن کھلتا ہے لاکھوں اشکِ خوں بونے کے بعد

جانے کیا ڈھائے غضب بیداریِ دیوانگی
یاد اس کی جاگ اٹھی ہے مدتوں سونے کے بعد

سہل مت سمجھو مری زندہ دلی کو دوستو
مجھ کو آیا ہے یہ ہنسنا بھی بہت رونے کے بعد

شاعری کی منزلیں مٹ مٹ کے طے کرتے رہے
نقشِ دائم تم نے چھوڑے ہے نشاں مٹنے کے بعد

بعد بارش کے درختوں کا سماں ہے دیدنی
جیسے چپ ہو جائے کوئی دیر تک رونے کے بعد

چاند نکلے جیسے پردوں سے اندھیری رات کے
مہرباں ہونا ترا نامہرباں ہونے کے بعد

میرا نغمہ شوق آوازِ شکستِ ساز ہے
شاعری حاصل ہوئی ہے ہر خوشی کھونے کے بعد

محمد اسحاق صدیقی
۵۰۱ اے، گومتی تالاب
لکھنؤ ۲۲۶۰۱۰

علمِ نجوم

فارسی اعداد کے آئینہ میں

نہ جانے کب سے انسان مناظرِ فطرت میں دلچسپی لیتا رہا ہے؟ شاید اس وقت سے جب سے وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا۔ سورج اور ستاروں کا باقاعدہ نکلنا اور ڈوبنا، چاند کا گھٹنا اور بڑھنا۔ جاڑے کی برف باری، گرمی کی لو، خزاں کا پت جھڑ اور بہار میں سبزۂ گل کی رنگینیاں، وہ مناظر تھے جنھیں غور و فکر کرنے والے انسان کے لیے نظر انداز کر دینا ممکن نہ تھا۔ آسمان کے ہزار ہا سال کے مشاہدے نے علمِ نجوم کو جنم دیا۔

جب انسان نے کھیتی کرنا سیکھا تو فصلیں بونے اور کاٹنے کے لیے صحیح موسم کا تعین کرنے کے لیے اسے علمِ نجوم کی ضرورت پڑی لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ کس طرح انسان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کی قسمت سیاروں کی گردش کے تابع ہے۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ دوازدہ بروج کی دریافت کیسے ہوئی، ستاروں کے مجموعوں کے نام کس نے رکھے۔ انسانی زندگی پر ان کے موافق اور ناموافق اثرات کا تعین کس نے کیا اور مضر اثرات سے بچنے کی تدابیر خصوصاً جواہرات کی تاثیر کا پتہ کیسے چلا؟ چین، ہندستان، عراق، مصر، یونان اور روم علمِ نجوم کے گہوارہ تھے۔ لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ علمِ نجوم کی دریافتوں میں کس ملک کا کیا حصہ تھا۔

علمِ ہیئت یا فلکیات علمِ نجوم کی نئی شکل ہے جس کا موضوع تحقیق یہ ہے کہ خود چاند، سورج، سیارے اور ستارے کیا ہیں، وہ زمین سے کتنے فاصلے پر اور کس طرح گردش کرتے ہیں، وہ کب اور کیسے وجود میں آئے؟ فلکیات کے ماہر یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ سیاروں کی گردش انسان کی زندگی کو متاثر کرتی ہے۔ علمِ نجوم کو وہ محض توہم پرستی سمجھتے ہیں۔ اگرچہ سائنس دانوں کی ایجادوں اور دریافتوں نے علمِ نجوم کے بہت سے مفروضوں کی تردید کر دی ہے۔ تاہم عوام کی اکثریت نجوم کی صداقت پر یقین رکھتی ہے اور نجوم سے متعلق قدیم عقائد آج بھی شعر و ادب کا موضوع ہیں۔ اردو شاعری میں یہ روایت فارسی سے آئی۔ یہاں میں نے ان فارسی ترکیبوں کو یکجا کیا ہے۔ جن کے شروع میں فارسی اعداد آتے ہیں اور جو علمِ نجوم سے متعلق ہیں۔ یہ ترکیبیں مختصر تشریح کے ساتھ نیچے پیش کی جاتی ہیں۔

دو آسیا۔ دو چکیاں، زمین و آسمان سے مراد ہے۔ دو صحن بھی کہتے ہیں۔

دو پایۂ نحس: دو منحوس سیارے، زحل اور مریخ یعنی سنیچر اور منگل۔

دو پیکر۔ تیسرے آسمانی بُرج کا نام، جو دو ننگے پیٹھ سے جڑے ہوئے لڑکوں کی شکل کا ہے۔ عربی جوزا ہندی متھن راسی۔

دو خواهر۔ دو بہنیں، مجموعۂ نجوم شعرائے شامی اور شعرائے یمانی۔ دو دختر بھی کہتے ہیں۔

دو شاهین۔ مجموعۂ نجوم: نسرِ طائر۔ نسرِ واقع

دو علوی۔ دو اعلا سیارے: مشتری اور زحل۔

دو گاؤ۔ بُرج ثور اور گاؤ زمین۔ قدیم عقیدے کے مطابق

زمین ایک بیل کی پیٹھ پر ٹکی ہے۔ اور وہ بیل ایک مچھلی کی پیٹھ پر کھڑا ہے۔

دو میخ۔ دونوں قطب یعنی قطب شمالی اور قطب جنوبی۔

پنج بے چارہ۔ آوارہ پھرنے والے پانچ سیارے: عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل جن کے فارسی نام بالترتیب یہ ہیں: تیر، ناہید، بہرام، برجیس اور کیوان۔

شش بانو: چھ سیارے جنھیں سورج کی بیویاں مانا جاتا ہے: قمر، عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل۔ انھیں شش بانوئے پیر / شش خاتون / شش عروس / شش عروسِ رعنا بھی کہتے ہیں۔

ہفت اختر: سات سیارے، جن کے فارسی، عربی اور ہندی نام یہ ہیں:

ماہ۔ قمر (چاند)	جس کا مقام پہلا آسمان ہے۔
تیر۔ عطارد (بدھ)	جس کا مقام دوسرا آسمان ہے۔
ناہید۔ زہرہ (شکر)	جس کا مقام تیسرا آسمان ہے۔
آفتاب۔ شمس (سورج)	جس کا مقام چوتھا آسمان ہے۔
بہرام۔ مریخ (منگل)	جس کا مقام پانچواں آسمان ہے
برجیس۔ مشتری (برہسپت)	جس کا مقام چھٹا آسمان ہے۔
کیوان۔ زحل (سنیچر)	جس کا مقام ساتواں آسمان ہے۔

ہفت اختر کے لیے شاعروں نے یہ ترکیبیں بھی استعمال کی ہیں: ہفت اجرام / ہفت اختاں / ہفت آئینہ / ہفت بانو / ہفت پاسباں / ہفت پیکر / ہفت چراغ / ہفت چشمِ چرخ / ہفت خاتون / ہفت دخترِ سرا / ہفت دُر / ہفت رخشاں / ہفت شمع / ہفت شمعِ بے دخاں / ہفت شمعِ درخشاں / ہفت مہرۂ زریں / ہفت نرادِ فلک

ہفت اورنگ سات تخت۔ سات تاروں کا مجموعہ، جسے ہندی میں سپت رشی، عربی میں دبِّ اکبر یا بنات النعش کہتے ہیں۔ قطب تارہ سات تاروں کے جس مجموعے میں ہے اُسے دبِ اصغر کہتے ہیں۔ اسے ہندی میں بھالو یا ریچھ۔

ہفت آسمان۔ اگر رات گئے تک آسمان کا مشاہدہ کیا جائے احساس ہوتا ہے کہ تارے اپنی اپنی جگہ بدل رہے ہیں۔ ستاروں کی ظاہری گردش دراصل زمین کی محوری گردش کا عکس ہے جیسے ریل پر سفر کرتے ہوئے ریل ٹھہری ہوئی اور باہر کی چیزیں بھاگتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ زمانہ قدیم کا انسان زمین کو ساکت اور آسمان کو متحرک سمجھتا تھا کیونکہ زمین ٹھہری ہوئی اور آسمان گھومتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ تارے آسمان میں جڑے ہوئے ہیں جب آسمان گھومتا ہے تو تارے بھی گھومتے ہیں۔ رات کو تاروں کی ظاہری حرکت سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا۔ فارسی میں آسمان کو چرخ اور گردوں کہنے کا یہی سبب ہے۔ انسان اپنی پریشانیوں کا سبب تاروں کی گردش یا آسمان کی گردش کو بتاتا رہا ہے۔ بقول غالب ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

یہ بتانا مشکل ہے کہ سات آسمانوں کا تصور کیسے پیدا ہوا۔ بہرحال فارسی شاعری میں سات آسمانوں کے لیے جو ترکیبیں پائی جاتی ہیں ان سے شاعروں کی پروازِ تخیل کا پتہ چلتا ہے۔ خاص ترکیبیں یہ ہیں:

ہفت اوراق (سات ورق)	ہفت دائرہ (سات دائرے)
ہفت آبا (سات باپ)	ہفت رواق (سات چھجے)
ہفت ایوان (سات محل)	ہفت سقف (سات چھتیں)
ہفت بام (سات کوٹھے)	ہفت صحیفہ (سات کتابیں)
ہفت بنا (سات عمارتیں)	ہفت طارم (سات بلند مکان)
ہفت پردہ (سات پردے)	ہفت طبق (سات طبقے)
ہفت پرکار (سات دائرے)	ہفت کاسہ (سات پیالے)
ہفت پوست (سات کھالیں)	ہفت کحلی (سات سرمئی)
ہفت خراس (سات چکیاں)	ہفت کرہ (سات کرے)
ہفت خم (سات گھڑے)	ہفت گنبد (سات گنبد)

آسمان کو ہفت آبائے علوی بھی کہتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پرانے زمانے میں آسمان کو باپ اور زمین کو ماں مانا جاتا تھا (ہفت آبائے علوی کے مقابل ہفت امہاتِ سفلی کی ترکیب ہے)۔

آسمان کو ہفت پوست (سات کھالیں) کہنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے انسان یہ سمجھتا تھا کہ آسمان چمڑے کا بنا سائبان ہے۔ غالباً یہ قدیم ترین تصور ہے۔ فنِ تعمیر کے وجود میں آنے کے بعد انسان

آسمان کو معمار کی بنائی ہوئی عمارت سے تشبیہ دی گئی ہے جیسے ہفت ایوان، ہفت بام، ہفت رواق، ہفت سقف، ہفت طارم، ہفت گنبد وغیرہ۔ آسمان کو سقف (چھت) کہنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے ہموار مانا جاتا تھا۔ لیکن بلندی سے دیکھنے پر آسمان اوندھے پیالے کی طرح نظر آتا ہے۔ ہفت کاسہ اور ہفت گنبد کہنے کا یہی سبب ہے۔

بعض ترکیبیں آسمان کے رنگوں یعنی سبز (خضرا، اخضر) اور نیلگوں (ازرق) کی طرف اشارہ کرتی ہیں مثلاً ہفت آب گوں چتر، ہفت ایوانِ خضرا، ہفت پردۂ ازرق، ہفت پردۂ کحلی، ہفت دریائے اخضر۔ آسمان کی گردش کو ظاہر کرنے والی یہ ترکیبیں ہیں: ہفت خراس، ہفت دائرہ، ہفت قلعۂ دوار وغیرہ۔

ہفت جوش، سات دھاتیں ملی ہوئی جن کو اٹھ دھات کہتے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

سونا، چاندی، تانبہ، جست، لوہا، سیسہ، رانگا۔

ان دھاتوں کی انگوٹھی تیار کی جاتی ہے۔ جسے پہننے سے سیاروں کی نحوست کم ہو جاتی ہے۔

ہفت حروف: علمِ جفر کے مطابق ابجد کے ۲۸ حروف چار عناصر کی خاصیت کے لحاظ سے سات سات کے مجموعوں میں تقسیم کیے گئے ہیں۔

آتشی	بادی	آبی	خاکی
ا	ب	ج	د
ہ	و	ز	ح
ط	ی	ک	ل
م	ن	س	ع
ف	ص	ق	ر
ش	ت	ث	خ
ذ	ض	ظ	غ

یہ حروف بالترتیب آگ، ہوا، پانی اور مٹی کی تاثیر رکھتے ہیں (دیکھیے فرہنگِ آصفیہ جلد اول آبی حرف، آتشی حرف وغیرہ)

ہفت رنگ - علمِ نجوم کے مطابق سیاروں کے سات رنگ ہیں:

قمر کا سفید، مریخ کا سرخ، عطارد کا ارغوانی، مشتری کا گندمی، زہرہ کا سبز، زحل کا سیاہ، شمس کا زرد،

نہ بام - نو آسمان۔ پہلے یہ خیال تھا کہ آسمان سات ہیں، جن میں سے ہر ایک سے ایک سیارہ مخصوص ہے (دیکھیے ہفت اختر) بعد میں دو کا اضافہ کیا گیا (۱) فلکِ ثوابت جس میں ستارے جڑے ہیں، آٹھواں آسمان ہے (۲) فلک الافلاک جو سب پر محیط ہے، نواں آسمان ہے۔

نواں آسمان کے لیے فارسی شاعری میں یہ ترکیبیں پائی جاتی ہیں۔

نہ بام ایوان / نہ پایہ / نہ پردہ / نہ حجرہ / نہ حصارِ مینا / نہ خرگاہ / نہ رواق / نہ شہر / نہ شہرِ بالا / نہ صحیفہ / نہ صحیفۂ گردوں / نہ طارم / نہ طاق / نہ طبق / نہ قصر / نہ کاخ / نہ گنبد / نہ گنبدِ دوار وغیرہ۔

دوازدہ بروج - اہلِ تنجیم نے آسمان کے بارہ برجوں کو ان کے خواص کے موافق اربعہ عناصر پر اس طرح تقسیم کیا ہے کہ ہر عنصر سے تین تین برج متعلق ہیں۔

بُرجِ آبی	حوت۔ عقرب۔ سرطان
بُرجِ آتشی	اسد قوس۔ حمل
بُرجِ بادی	دلو جوزا میزان
بُرجِ خاکی	جدی سنبلہ ثور

لغاتِ ہیرا صفحہ ۲۳۰، فرہنگِ آصفیہ جلد اول صفحات ۹۴۰، ۱۰۶

دوازدہ مقام - ایرانی موسیقی کے بارہ مقام جن کی تفصیل یہ ہے:

نام	ماخذ / آواز	برج سے تعلق	کن امراض کے لیے مفید ہے
(۱) راست	ہاتھی کی	حمل	فالج
(۲) اصفہان	بھیڑ کی	ثور	امراضِ سرد و خشک
(۳) عراق	گائے کی	جوزا	مزاجِ گرم و خفقان
(۴) کوچک	بچے کی	سرطان	درد سر دل کی تپش
(۵) بزرگ	چکور کی	اسد	[illegible]
(۶) حجاز	؟	سنبلہ	درد پہلو اور درد کان
(۷) بوسلیک	شیر کی	میزان	کمر اور سرین کا درد
(۸) عشاق	مرغی کی	عقرب	[illegible]

(باقی صفحہ ۳۸ پر)

حبیب انصاری
[illegible]

شاعرِ مزدور: ایک تنقیدی مطالعہ

احسان دانش عام طور پر شاعرِ مزدور کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں اور یہ سچ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کا بیشتر حصہ مزدوروں، کسانوں، غریبوں اور سماج کے نچلے طبقے کے لوگوں کی زندگی کی عکاسی اور اسے بہتر بنانے کے لیے وقف کر دیا تھا اور بجا طور پر انھیں اس کا حق بھی تھا کیونکہ وہ خود بھی سماج کے اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے خود بھی دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لیے کبھی خشت برداری کی تو کبھی چوکیداری۔ کبھی مالی گیری کی تو کبھی مزدوری۔ لہٰذا محنت کشوں اور مزدوروں کی زندگی، ان کے مسائل، ان کی مجبوریاں، محرومیاں، ناکامیاں، مایوسیاں اور حرماں نصیبیاں سمجھنے اور برتنے کے انھیں خوب خوب مواقع ملے، اور انھوں نے ان کی ایسی ایسی دل سوز اور درد انگیز تصویریں کھینچی ہیں کہ بعض اوقات آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں ؎

میرے اشعار جو ہوتے ہیں مشہور
خدا شاہد ہے ذاتی تجربے ہیں

یہاں پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے "ذاتی تجربوں" پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔ احسان دانش کا آبائی وطن باغپت (ضلع میرٹھ) ہے۔ لیکن ان کی پیدائش ۱۹۱۴ء میں قصبہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر (یو۔پی) کے ایک غریب گھرانے میں ہوئی۔ ان کی پرورش و پرداخت کی ذمہ داری ان کے نانا بو علی شاہ نے سنبھالی جو ایک غریب سپاہی تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے والد ترکِ وطن کر کے کاندھلہ آگئے۔ یہاں وہ نہر کی کھدائی کر کے روزی کماتے تھے۔ ایسی غربت و افلاس کے باعث احسان کی باقاعدہ تعلیم نہ ہو سکی۔ چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کرنے میں گھر کے برتن تک فروخت کرنے کی نوبت آگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اپنی تعلیمی استعداد کی بنیاد پر وہ لکھنے پڑھنے والی ملازمتیں تلاش کرتے تھے۔ لیکن ناکام رہے۔ آخر میں اپنے آبائی پیشے یعنی نہر کی کھدائی کے کام کو ذریعۂ معاش بنانا چاہا لیکن اس میں بھی ناکام رہے۔ تب مجبوراً میونسپلٹی میں چپراسی گیری کرنا پڑی۔ کچھ دنوں کے بعد دلی چلے گئے، اور ایک چھاپہ خانہ میں آٹھ روپے ماہوار پر سپاہی کا تعین ہو گئے۔ وطن اور ماں باپ کی یاد نے ستایا اور کاندھلہ لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ یہاں آ کر پھر وہی بے کاری اور بے روزگاری۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں سے سیدھے لاہور کا رُخ کیا ؎

کر رہا ہوں دوستوں کے زعم پر ترکِ وطن
شاید اب آغازِ دورِ گردشِ ایام ہے

یہاں واقعی گردشِ ایام کا دور شروع ہوا۔ پہلے انھوں نے اپنے ہم وطنوں کے یہاں باورچی کی حیثیت سے کام کر کے دو وقت کی روٹی حاصل کی۔ تلاش بسیار کے بعد معماروں کے ساتھ خشت برداری کا کام مل گیا، جہاں انھیں سخت جسمانی مشقت کرنا پڑتی تھی۔ اپنی خود نوشت سوانح "جہانِ دانش" میں لکھتے ہیں:

"جب میں شام کو مزدوری سے گھر آتا تو جسم چور چور ہو جاتا [illegible] جسم میں صرف [illegible] زندگی باقی رہ جاتی [illegible] والدین کا

خیال اور ان کا منی آرڈر کا انتظار میرا شانہ ہلا کر پھر
مزدوری پر لے جاتا۔۔۔۔۔۔۔ غرض یونہی ہر رات
غم اور ہر دن مشقت کا پیغام لے کر آتی اور گزر
جاتی۔۔۔۔۔"

مزدوری کرتے کرتے انھوں نے معماری سیکھ لی اور معمار کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ ایک دن ڈیوٹی پر دیر سے آنے کے باعث ٹھیکیدار نے کچھ بُرا بھلا کہہ دیا۔ احسان چونکہ بلا کے حساس اور خوددار تھے، دوسرے دن کام پر نہ گئے اور نصیر موٹر (شملہ ولی) میں چوکیداری حاصل کرلی۔ علمی مصروفیت اور ذہنی بلندی کی وجہ سے سیر گاہ، کھانی وغیرہ ان سے غافل کھاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ملازمت بھی جاتی رہی۔ پھر گورنمنٹ ہاؤس کے باغبان جناب الدین نے گورنمنٹ ہاؤس ہی میں نائب باغبان کی حیثیت سے تقرر کرا دیا۔ یہ ملازمت بھی دیرپا ثابت ہوئی۔ اسی زمانے میں انھوں نے قالین بافی بھی سیکھ لی تھی۔ ان ہی دنوں چپراسی کی حیثیت سے ان کا تقرر ریلوے میں ہوگیا۔ اس تقرر کے چند روز بعد ہی انھیں ایک مطبع میں بیس روپے ماہوار کی ملازمت مل گئی۔ اسی اثنا میں انھوں نے اپنی پہلی کتاب "حدیثِ ادب" چھپوائی اور اس کی فروخت سے جو آمدنی ہوئی اس سے اپنا کتب خانہ قائم کیا۔

پامال کر دیا ستمِ روزگار نے
احسان آہ اب وہ مرا دل نہیں رہا

یہ تھے وہ حالات، جو چکی کی مشقت سے بھی زیادہ سخت، مشکل اور صبر آزما۔ لیکن ان حالات میں بھی انھوں نے مشقِ سخن جاری رکھی۔ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ نہ صرف اردو بلکہ دیگر زبانوں کا بھی شاید ہی کوئی قلم کار ایسے ہوشربا مشکل حالات سے دوچار ہوا ہو۔ بلاشبہ یہ احسان کی امتیازی شان ہے کہ انھوں نے دامِ ہر موج میں پنہاں [illegible] سے بہو آزمائی کی اور قطرے کے گہر ہونے کی منزل [illegible] کے ساتھ طے کی۔
[illegible] تجربے [illegible] اور وسیع مطالعے کے ساتھ [illegible] شاعری [illegible] ہو سکے۔ اپنے چاروں طرف

انھیں سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ، جبر، ظلم اور مزدوروں کی بدحالی، افلاس اور جہالت نظر آئی۔ انھوں نے ان ستم رسیدہ لوگوں کے حالات کی ترجمانی کو اپنا نصب العین بنا لیا۔ یوں تو انھوں نے رومانی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ سیاسی بھی، قومی بھی اور وطنی بھی، اخلاقی بھی اور اصلاحی بھی۔ لیکن ان کے اصل جوہر محنت کش طبقے کی ترجمانی ہی میں کھلتے ہیں۔ انھوں نے اپنی اس قسم کی نظموں کے ہر ہر شعر میں سرمایہ داروں کے جور و ستم کے خونیں افسانے، مزدوروں، کسانوں، بیواؤں اور مظلوموں کی غربت اور افلاس کے وہ جیتے جاگتے نقشے کھینچے ہیں کہ سنگ دل سے سنگ دل انسان کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ اسی کو احسان اپنی شاعری کی معراج سمجھتے تھے۔ وہ بعض اوقات اپنے شاگردوں اور دوستوں سے کہا کرتے تھے کہ مشاعروں کی پُرشور لفظی داد سے میں خوش نہیں ہوتا۔ بلکہ سامعین کی آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر مہرِ خاموشی دیکھتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ میری نظم کامیاب رہی۔ لیکن ادب میں صرف رونے رُلانے اور ماحول کی عکاسی محض کر دینے سے کام نہیں چلتا۔ حالات و ماحول کی صحیح عکاسی کی اہمیت تسلیم، کیونکہ اس سے ادب میں تاثیر پیدا ہوتی ہے اور عوام میں شر کو خیر میں بدل دینے کا جوش اور جذبہ۔ لیکن شر کو کیسے دور کیا جائے یہ بتانے کی ذمہ داری بھی فن کار پر عائد ہوتی ہے۔ جور و ستم اور عصری مصائب اور مسائل سے نجات اور ان کے حل کے ذرائع بھی بیان کیے جائیں۔ کسی سمت کا تعین بھی کیا جائے، کسی راہ کی نشاندہی بھی کی جائے۔ خود احسان دانش کہتے ہیں:-

"ادب تو وہ ہوتا ہے جو مسائل کی نشاندہی کر کے
مسائل کا حل بیان کرے۔ نیلی دھوپ اور لال چاندنی
جیسی تراکیب وضع کر لینے سے آدمی جدید نہیں ہو جاتا۔
جدیدیت کوئی ایسا نیا عذاب نہیں جو ہم پہ پہلے نازل
نہ ہوا ہو۔ بیس پچیس برس بعد کچھ تبدیلیاں دیکھنے
میں آتی ہیں۔ مگر اس میں وہ تبدیلیاں ادب میں
اپنا نقش چھوڑتی ہیں جو مسائل کے حل کی طرف
اشارہ کرتی ہیں۔ نیلی دھوپ، لال چاندنی اور شب تاب

باتیں کوئی تک ہے یار!
یاد رکھو وہی ادب زیادہ کارآمد ہوگا جو مسائل کی
بہتر نشان دہی کرے گا اور ان کے صحیح تر حل کی طرف
اشارہ کرے گا۔"

لیکن ہمیں سخت حیرت اور مایوسی ہوتی ہے جب ہم احسان دانش کے
کلام کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے عہد کے مسائل
کا حل بھی پیش کیا ہوگا۔ وہ اپنے ہی اصول پر عمل پیرا نظر نہیں
آتے۔ یہ سچ ہے کہ انھوں نے انھوں نے اپنے زمانہ کے مسائل کی
نشان دہی کی ہے اور بہت خوب کی ہے۔ لیکن جہاں تک مسائل کے
حل کا تعلق ہے وہ اس طرف نہ کوئی اشارہ کرتے ہیں اور نہ کوئی رہنمائی
بلکہ سرمایہ دارانہ مظالم کی دھوپ سے بچنے کے لیے وہ کبھی رومانیت
کی چھاؤں میں پناہ لیتے نظر آتے ہیں۔ کبھی علم کی، کبھی آسمان
کی طرف بے بسی سے دیکھتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی انقلاب
کی بات کرتے ہیں۔ میری بات کی تائید ڈاکٹر سید اعجاز حسین کے
اس اقتباس سے بھی ہوتی ہے :۔

"احسان نے جو کچھ محسوس کیا اسی شدت سے
آپ تک پہنچانے کی کوشش کی، اب ان تکالیف کا
کیا علاج ہو، یہ آپ خود سوچیے۔ اس علاج کے لیے
وہ چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہیں۔ کبھی خدا سے دریافت
کرتے ہیں، کبھی اقبال کی بات مانتے ہیں۔ کبھی جوشؔ
کی طرف جھکتے ہیں۔ کبھی خود اپنی انفرادی ترقی کو نمونہ
سمجھ کر غریبی کا علاج علم میں تلاش کرتے ہیں، کبھی اصلاح
پسندوں سے کہتے ہیں کہ بے روزگاری کا علاج کرو،
ورنہ یہ ستائے ہوئے لوگ انقلاب کر بیٹھیں گے۔"

ڈاکٹر محمد حسن کو سنیے :۔

"غربت، دکھ اور ناداری احسان کے نزدیک ایک
آدرش کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ان کے دور کرنے
کے کسی حکیمانہ علاج پر غور کرنے کے بجائے ان کی برتری
ثابت کرنے پر زیادہ توجہ دیتے ہیں، اور کبھی کبھی اس
نابرابری کے خلاف بلند آواز میں فریاد کرتے ہیں۔"

انقلاب کا تصور بھی ان کے یہاں ناقص ہے۔ وہ انقلاب
کی دہشت پسندی، انتہاپسندی اور اس کے تخریبی پہلوؤں پر ہی نظر
رکھتے ہیں اور اس کی ہولناک تصویر کھینچتے ہیں۔ یہ انقلاب کی وہی
تصویر ہے جسے عوام کو انقلاب اور انقلابیوں کے خلاف صف آرا
کرنے کے لیے سرمایہ دار اور ان کے پٹھو فنکار پیش کیا کرتے تھے۔ احسان
کی نظر انقلاب کے تعمیری پہلوؤں تک پہنچ ہی نہیں پاتی۔ اس سے
انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایک حساس اور غیرت مند دل رکھتے تھے۔
جس میں پرخلوص بے چینی، جستجو اور ناآسودگی کا سمندر لہریں لے
رہا تھا۔ لیکن ایسے انقلاب سے کیا فائدہ جس میں سوائے تخریب کے
اور کچھ نظر ہی نہ آئے؎

نصب تعمیر پہ تخریب کا پرچم کر دے
سازِ تشویش کی آواز کو مدھم کر دے

تیرے قابو سے ہے باہر یہ زمانے کا نظام
دیکھتا کیا ہے اسے درہم و برہم کر دے

ان کا انقلاب بسا اوقات جوشؔ کی طرح جذباتی اور رومانی
ہوتا ہے۔ وہ انقلاب کا سبب کسی طبقاتی کش مکش کو نہیں سمجھتے اور
نہ ہی ان کے یہاں طبقاتی کش مکش کی کوئی اہمیت ہے۔ ان کا یہ جملہ کہ
"میری بوریے پر آنکھیں کھلی ہیں اور قالین پر دم نکلے گا"۔ ظاہر
کرتا ہے کہ ان کے نزدیک انقلاب کے معنی یہ ہیں کہ جن کے پاس
سب کچھ موجود ہے انھیں اس سے محروم کر دیا جائے اور جو ہر چیز
سے محروم ہیں انھیں سب کچھ دے دیا جائے۔ یہ مسئلے کا حل نہیں
ہے۔ بات گھوم پھر کر وہیں رہتی ہے۔

اپنی بات کی وضاحت کے لیے میں ان کی نظم "ناقوسِ بیداری"
کے چند اشعار پیش کرتا ہوں؎

ناخدا تیرے نہنگانِ اجل ہیں سرِ بسر
اپنی غرقابی سے پہلے ان کے بیڑے غرق کر
جس قدر ہیں پیشوایانِ تمدن فتنہ گر
تیرے درماں کے لیے اکسیر ہے ان کا لہو

چاہتے ہیں جو کہ بجھ جائے اُخوت کا چراغ
پیس دے گھوڑوں کی ٹاپوں کے تلے ان کے دماغ

دل کا کینہ رات بھر بے تاب رکھتا ہے انھیں
دیدۂ دولت طلب بے خواب رکھتا ہے انھیں
شوقِ سلطانی بنا دیتا ہے ان کو بد شعار
ان کے مذہب کا نہ ان کی دوستی کا اعتبار
بے کسی مزدور کی جرأت دلاتی ہے انھیں
آنسوؤں کی شبنمی میں نیند آتی ہے انھیں
یہ وہ محسن ہیں جو کر دیتے ہیں قوموں کو ہلاک
ان کے دم سے عافیت کا ہے گریباں چاک چاک
مورچے کبر و نخوت کے اڑا کر پھینک دے
دمدمے ان کی سیاست کے اڑا کر پھینک دے

اسی سیاق و سباق میں ان کی ایک اور نظم کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔ یہ نظم ہے "باغی کا خواب"۔ نظم کافی طویل ہے۔ اس میں ان کے افکار و خیالات، نظریات و احساسات زیادہ شرح و بسط کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہ نظم جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے ایک باغی کے خواب کا بیان ہے۔ بھوک کی حالت میں ایک نوجوان باغی سو گیا ہے۔ خواب میں اس نے دیکھا کہ "ایک بہت بڑے میدان میں بہت سے لوگ جمع ہیں۔ ان میں سے ہر شخص کہہ رہا ہے کہ آج انتقام کا وقت آگیا ہے۔ ہم لوگوں پر اس قدر ظلم و ستم ڈھائے گئے ہیں کہ بیان سے باہر ہیں۔ اس میدان سے کچھ دور ایک ایسا مقام بھی ہے جو میدان کی سطح سے کچھ بلند ہے۔ یہاں ایک تیز و طرار نوجوان مجمع عام سے مخاطب ہے اور وہ سرمایہ داروں، جاگیر داروں اور نام نہاد لیڈروں کے مظالم تفصیل کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ وہ اپنی تقریر کے درمیان بار بار نعرے بلند کرتا ہے یہ بار اس نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا کہ اے یارانِ تنگ! اب تمھارے تیغ و تفنگ بیدار ہونے چاہئیں اور دورِ شرارت ختم ہونا چاہیے۔ اب ہمارے ساتھ نہ صرف زمین و آسمان کی قوتیں ہیں بلکہ اب ہم مجبور بندوں کے ساتھ خدا کی قوتیں بھی شامل ہوگئی ہیں۔ اگر تم نے بزدلی کے جرم کا ارتکاب کیا تو فطرت تمھیں کبھی معاف نہ کرے گی۔ اتنا سنتے ہی مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔ چاروں طرف شور دار و گیر بلند ہوگیا۔ سرمایہ داروں کے محلوں پر حملے شروع ہوگئے۔ ایوانوں میں دراڑیں پڑنے لگیں، دیواریں گولیوں سے چھلنی ہونے لگیں۔ فضاؤں میں بارود کا دھواں نظر آنے لگا۔ ہر طرف ایسا واویلا، چیخیں اور شور بلند ہو رہا ہے کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی ہے۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے۔ کنواری لڑکیاں ہیرے چاٹ چاٹ کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہی ہیں۔ ہر طرف مارنے مرنے کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں اور حدِ نگاہ تک خون ہی خون نظر آتا ہے۔ کارخانے بند ہیں۔ دکانیں اور محل سنسان پڑے ہیں۔ جگہ جگہ آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ بجلی کے کھمبے سڑکوں پر ڈھیر ہوگئے ہیں۔ باغی نوجوان خونی رجز گاتے ہوئے ادھر ادھر گھوم رہے ہیں۔ انھیں اس کی بھی پروا نہیں کہ ان کے پیر زخمیوں پر پڑ رہے ہیں اور ان کی ٹھوکریں مُردوں پر۔ فاقہ مست لوگ انسان کا خون پینے کے لیے بیتاب نظر آرہے ہیں۔ عنصر بینکوں کو جلانے کے لیے بار بار حملے کر رہے ہیں۔ سرمایہ داروں کی عورتیں حفاظت کی غرض سے صندوقوں میں بند کر دی گئی ہیں۔ ان کے بچے خوف کی وجہ سے تھر تھرا رہے ہیں اور رہ رہ کر چیخیں بلند کر رہے ہیں۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازوں سے راستے [illegible] گونج رہے ہیں جیسے تاشے بج رہے ہوں۔ آگ سے جلتے ہوئے بچوں کے جا بجا ڈھیر لگے ہوئے ہیں، اور دلیر نوجوان برچھیاں لیے ہوئے ادھر ادھر پھر رہے ہیں۔ وہ لوگ [illegible] گاڑیوں میں لا رہے ہیں۔ گلی کوچوں میں [illegible] ہیں۔ چیلیں چھوٹے بچوں کے سر لیے آسمان [illegible] اہلِ ثروت کے [illegible] اروں [illegible] کیے جا رہے ہیں [illegible] برہمن کا قتل [illegible] ہے۔

طنز و مزاح

احمد جمال پاشا
ٹھاکرواڑا سیوان (بہار)

کتاب کی جلد

ہمارے بچپن میں کتاب کی جلد بہت مضبوط واقع ہوا کرتی تھی۔ ایک بھائی کے ہاتھ میں علی بابا چالیس چور ہوتی تو دوسرے کے ٹھگوں کا بادشاہ یا کلنگ گھنڈوں یا تک یانگ کھیلا کرتے۔ تھک گئے تو کتاب کھول کر قصہ پڑھنے لگے، تازہ دم ہوئے تو پھر کتاب بلا بن گئی۔ بھائی بہنوں میں جنگ مغلوبہ ہوتی تو الف لیلیٰ اور ہزار داستان" جیسی ضخیم کتابوں سے جوابی حملے کیے جاتے کہ کیا مجال جو کبھی کوئی کتاب شہید بھی ہوئی ہو۔

گھر میں سبھی کو پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ اس لیے کتابوں کو چاٹنے کے بعد ان سے دسترخوان کا بھی کام لیا جاتا تھا ہمدرد کا مریڈ اور ہمدم کی فائلوں پر ہمیں بیسوں بار کھانے اور اخبار سے دسترخوان کا کام لینے کا شرف حاصل ہے۔ اکثر ڈھکن غائب ہو جانے کی صورت میں گھڑے پر اسٹوڈنٹس پاکٹ ڈکشنری ڈھک دی جاتی۔ بارہا بیمار کا نسخہ کتاب کی جلد میں اور دوا کتاب پکڑا دی جاتی۔ کسی نے پوچھا "نسخہ کہاں ہے"؟ جواب دیا — گلستاں میں۔! نولکشور پریس کی باتصویر گلستاں کی جلد اتنی مضبوط تھی کہ بھائی لوگوں نے گھریلو سینما کے لیے اس کی تمام اہم تصویریں کاٹ لی تھیں۔ پھر بھی جلد کی شکل میں شیخ سعدی باقی رہ گئے۔ اور عرصہ تک بچہ پھوڑنے میں مدد دیتے رہے۔

اللہ بخشے ماموں جان مرحوم علامہ یاد بریلوی تخلص کرتے۔ ہمیں اپنے کمرے میں کسی کو پھٹکنے تک نہ دیتے جب علامہ رسالہ اور کے شمارے میں ایکسپورٹ ہوتے تو ہم لوگ پیچھے سے ان کے کمرے میں گھس کر ریل ریل کھیلتے۔ "قاموس، منجد، سکندرنامہ اخلاق جلالی۔ اخلاق ناصری اور کیمیائے سعادت" وغیرہ کو بطور ریل کے ڈبوں کے استعمال کرتے۔ انجن کے طور پر سب سے آگے "شاہنامہ" فٹ کیا جاتا اور "قرابادین" گارڈ کے ڈبے کے کام آتا۔ دن بھر کتابوں کی اٹھا پٹک اور کتابوں پر بیٹھ کر انھیں کھسکانے کا سلسلہ جاری رہتا۔ مگر کیا مجال کہ کبھی کوئی جلد کہیں سے مسکی بھی ہو۔ دراصل اس زمانے میں بچوں کا دل رکھنے کے لیے "چائلڈ پروف" یا "ہائی بوائے" قسم کی چرمی جلدیں باندھی جاتی تھیں۔

ہم پر جوانی آئی تو جلدوں پر بڑھاپا آگیا وجہ ہماری جوانی نہ تھی بلکہ کتابوں کا انجھاڑ ھیلا تھا۔ دراصل فن کارانہ جلد کی جگہ کاروباری اور پھر کام چلاؤ جلدوں نے لے لی تھی اس کے بعد دو نمبری کا فیشن چلا تو چلتاؤ جلدیں بھی دو نمبری بننے لگیں۔

نئی قسم کی جلدوں میں جلدساز سے زیادہ خریدنے والوں کا قصور ہے۔ پرانی جلدیں تو پڑھنے والے خریدا کرتے مگر نئی جلدیں لائبریریوں کے لیے باندھی جاتیں۔ جہاں اچھی بھلی کتاب کا سرورق نمائش کے لیے اور کتاب جلد باندھنے کے لیے بھیج دی جاتی ہے۔ اس خوف سے کہ قاری غلطی سے کتاب خرید کر مصنف کے بارے میں رائے نہ خراب کرے، قیمتیں آسمان سے بھی بلند کر دی گئیں کہ نہ پہنچ پاؤ نہ خرید سکو۔

لائبریری جلد کمیشن کی شکایت کرتی ہے۔ اس لیے ماہرین نے کتاب پر سے قاری کا خطرہ ختم کرنے کے لیے یہ اصول بنادیا کہ "خبردار! قاری کتاب نہ خریدنے پائے۔" جس کا خوش گوار اثر یہ ہوا کہ پڑھنے والی مخلوق یا تو ناپید ہو گئی یا لائبریریوں میں پناہ گزیں۔

رہ گئے شاعر، ادیب تو انھیں اپنی قیمتی تحریروں کے مطالعے سے کہاں فرصت کہ دوسروں کو پڑھ کر اپنی اور تخلیقی پر بٹہ لگائیں۔ کافی ہاؤس میں بیٹھنے کے بعد پڑھنے کی یوں بھی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

جب دو نمبر کا زمانہ آیا۔ جلدوں میں مضبوطی کی جگہ حسن و نزاکت اور نفاست نے لے لی تو جلد بندی کی رہی سہی کسر جدید آرٹ نے پوری کر دی۔ جس سے فوری فائدہ یہ ہوا کہ کتاب پر نظر پڑنے کے بجائے ترچھی نظر پڑنے لگی اور وہ بھی آرٹ پر نہیں، کتاب کی ہوش ربا قیمت پر۔

کتاب کی بہت سی منزلیں ہوتی ہیں۔ مگر جلد کا صرف ایک کہ اس کا انتہائی محنت سے مطالعہ کرنے والا ہو۔ مطالعہ بلکہ ایسا ذہنی عمل ہے جس میں قاری اور کتاب میں باقاعدہ کشتی ہوا کرتی ہے اور دونوں کی ڈاڑھی ایک دوسرے پر کھل جاتی ہے۔ پڑھتے پڑھتے زور پڑا تو کتاب دو نا ہو گئی۔ کوئی کام نکل آیا تو کتاب بغل میں۔ ڈاکٹر کے یہاں نمبر آنے یا دوا لینے میں دیر ہے تو کتاب جیب میں سے نکالی اور پڑھنے لگے۔ بہت سے لوگوں کو خوش فہمی ہے کہ صرف جاسوسی ناول بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور داستان پڑھنے والے کو کھانے پینے تک کا ہوش نہیں رہتا۔ ہم نے نہایت خشک اور ٹھوس تحقیقی کتابیں نیاز فتحپوری اور قاضی عبدالودود کو اس طرح پڑھتے دیکھا ہے کہ کتابیں ان کا اوڑھنا بچھونا۔ سرہانے جلد رکھی ہے تو پائنتیانے کتاب کا پڑھا ہوا حصہ، زیر مطالعہ حصے کو بٹیر کی طرح ہاتھ میں دبوچے ہوئے ہیں۔ اگر آپ نے کاظم علی خاں کو پڑھتے نہیں دیکھا تو پھر کچھ نہ دیکھا۔ ان کے مطالعہ کا طریقہ رشید حسن خاں سے بھی پراسرار ہے۔ پہلے وہ ڈاکٹر گیان چند کی طرح کتابوں کے چھوٹے بڑے چبوتروں کا حلقہ اپنے گرد بنا لیتے ہیں۔ ہر چبوترے کو مواد کی تاریخی ترتیب کے اعتبار سے سجاتے ہیں۔ ہر بار اٹھ کر الماریوں کے تالے کھولتے، کتابیں نکالتے اور تالے بند کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہوتی ہے کہ ان کے پڑھنے کے کمرے کی کنڈی اندر سے بند رہتی ہے اس کے باوجود تالے پر تالا اور پھر تالا۔ غرض اوپر تالے اور اندر کتابیں گویا کتاب نہیں، بینک کے اسٹرانگ روم سے کرنسی نکالی جا رہی ہے۔

پھر بڑے اہتمام سے ان کتابوں کے بیچ میں حقہ رکھا جاتا ہے۔ تاؤ تیز کرنے کے لیے مخطوطات سے پنکھے، دھونکنی اور پھونکنی کا کام لیا جاتا ہے۔ ہمارے پٹھان دوست عابد پشاوری کی طرح اس شان سے علمی اور تحقیقی تخت پر جلوہ افروز ہوا کرتے ہیں کہ اگر موسم معتدل ہے تو بنیائن اور تہبند، حق پر تہبند کی تہمت ہے۔ خدا نہ کرے موسم گرم ہے تو پھر لباس گرمی تحقیق کی تاب بھلا کہاں لا سکتا ہے۔

موصوف نے ایک جلد اٹھائی اور اسے کھا جانے والی نظروں سے پڑھا۔ سناٹے میں آ گئے، اچھل پڑے، بڑبڑائے، یا مصنف کا شجرہ نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ حقے سے بیان کیا۔ غصہ میں بھنویں تن گئیں "بکواس" کے فلک شگاف نعرے کے ساتھ کتاب اتنے زور سے پھینکی کہ اس کونے میں کتاب اور اس کونے میں جلد گری یا ہاتھ ہی میں رہ گئی۔ پھر کسی مخطوطے میں غرق ہو گئے۔ تاؤ کم ہوا تو جلدی سے کچھ چلم اور کچھ جسم کو ہوا دی۔ کھانے کا وقت گزرنے لگا تو بیگم صاحبہ نے ڈرتے ڈرتے یاد دلایا۔ اتنے زور سے گرجے کہ "مجھے غالب کے شاگرد میر مہدی مجروح کے پرنواسے کی تاریخ پیدائش نہیں مل رہی ہے اور تمھیں کھانے کی پڑی ہے۔ ؟" بیچاری بیگم سہم کر رہ گئیں۔ رئیس التحقیق پھر غلام رسول مہر اور مالک رام کی جلدوں میں ڈوب گئے۔

سب سے پہلے کتابوں کے ٹھنگے کور دریافت کیے گئے، اندر ایک جانب کی دفتی، جس پر جلد کی تہمت، اوپر مرتل سا پتنگی کاغذ جلد کے اندر آدھا انچ مڑا ہوا۔ کتاب کھولنے پر جلد سے کور اس طرح نکل جاتا جیسے کسی نے جلد کا ازار بند کھول کر جلد کو عریاں کر دیا۔ مگر یہ سب باتیں اس زمانے کی ہیں جب لوگ کتاب خرید کر پڑھتے تھے۔ اگر کتاب اس کی عقل سے بھی موٹی ہوتی تو اس کو سے "بک مارک" کا کام لیتا یا بچے ناؤ بنا کر پانی میں اپنے ہاتھ سے تیراتے صاحب کتاب کو چنداں کوفت نہ ہوتی۔ کور گم ہو گیا تو کیا ہوا۔ ! بچوں کا گھروندا پھر ملنا تو سہل گیا۔ اگر کتاب دیا برد بھی کر دیتے تو ماتھے پہ شکن نہ آتی۔ مہذک اقاری جب تک نفیس جلد نہ بندھوا لیتے کتاب کی طرف دیکھتے تک نہیں۔ ابتدائی چند صفحات فیصلہ کر دیتے کہ کتاب

لائبریری میں رکھی جائے یا ردی کی ٹوکری ہے جلد نکال کر بنیے کی دکان تک پہنچادی جائے

شیڈی جلدوں کو تاؤ کی طرح موڑ کر بآسانی جیب میں رکھا جا سکتا ہے۔

پتہ نہیں چل پاتا کہ کہاں سے جلد شروع ہوئی ہے اور کہاں پر کتاب کی سرحد واقع ہے۔ سنگم کہاں ہے۔ کتاب میں جلد سے بھی یا محض ہارڈ کور ہے۔ یا ساری الجھن اس وجہ سے ہے کہ کور سافٹ۔

[illegible] کی [illegible] پہچان یہ ہے کہ وہ جعلی ہو مگر آپ اسے پڑھنے [illegible] جعلی ایڈیشن کی شان نزول یہ ہے کہ [illegible] سکا۔ اس سے سستا کاتب میسر آ سکا جلد [illegible] ہی گئی انشاء اللہ خیر صلّا۔! اسے پڑھنے کے لیے غیر معمولی بینائی اور ماہرانہ دانائی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ مشکل ہی سے کام نکالا جا سکے۔ تقریباً بیشتر کتب فروش انتہائی اہم بیرونی کتب کے انتہائی غیر اہم جعلی ایڈیشن اندھے نفع کے اہتمام سے چھاپتے بلکہ کاغذ کالا کرکے ہوش رُبا قیمتیں اینٹھتے رہتے ہیں۔ کچھ متنازعہ کچھ نصابی اور کچھ اہم کتابوں کا حشر میدان حشر سے پہلے ہی برپا کر دیتے ہیں۔ جوش صاحب کی یادوں کی بارات" کا اصلی ایڈیشن دیکھ لیجیے تو آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ [illegible] وصاب ایڈیشن پڑھنے سے فاضل مصنف کی اردو تک مشکوک ہو جاتی ہے۔ کوئی جلد لنگڑا رہا ہے تو کوئی ہکلا رہا ہے۔

ابن انشا کی "اردو کی آخری کتاب" کا اصل ایڈیشن حسن و جمال میں دلہنوں کو شرما دیتا ہے مگر جعلی ایڈیشن سے اندازہ ہوتا ہے کہ خرابی میں بھی کس قدر خرابہ ہو سکتا ہے۔

یوسفی اگر "چراغ تلے" کا فٹ پاتھ ایڈیشن دیکھ پائیں تو اتنا ضرور سمجھ جائیں کہ "آنکھوں میں خون اترنا" کے آخر کیا معنی ہوتے ہیں۔؟

کتابیں اب صرف پیٹ کی خاطر چھاپی جا رہی ہیں یا توند بڑھانے

کے لیے۔ ایک دفعہ بھی پڑھنے پر کتاب تار تار اور جلد کے انجر پنجر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اگر کتاب قاعدہ کی طرح اہتمام سے سامنے رکھ کر پڑھی گئی تو غنیمت، اگر بے خیالی میں موڑ دی تو دفتیاں جھولنے لگیں گی اور ختم ہونے تک کور سُرمہ، دفتی ملیدہ اور کتاب بھوسہ ہو جائے گی۔ جب ہم نے ایک ممتاز ناشر سے جلدوں کی زبوں حالی کی دبے لفظوں میں شکایت کی تو وہ یوں گویا ہوئے:

"صاحب! آپ بھی عجیب آدمی ہیں؟ اس مہنگائی میں کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں۔ اس طرح تو ہو چکا آپ کا پڑھے لکھوں میں شمار اور ہو چکا گزارا۔ اللہ شوق دے تو پہلے جلد بندھوا لے۔ ایک پڑھائی تک تو ساتھ دے ہی دے گی"۔

ہم نے پوچھا: "آخر آپ پڑھا لکھا کسے کہتے ہیں۔؟"

وہ چمک کر بولے:- "جس شاعر، ادیب، نقاد وغیرہ کو کوئی بہت بڑا عہدہ مل جائے بس ہو گیا وہ سب سے بڑا۔ اور اگر اپنے ساتھیوں کو زندہ در گور کرکے صدر شعبۂ اردو ہو گیا تو بس ہو گیا سب سے بڑا پڑھا لکھا محمد فاضل"۔

ہم نے پوچھا۔ "مالی حالت سے آخر آپ ادبی حالت کو ملانے پر کیوں مُصر ہیں۔؟"

بولے۔ "ان علاقوں پر غور کیجیے جو نامور یعنی لکھ پتی شاعر ادیب پیدا کرتے ہیں۔ شاعروں کی بین الاقوامی ٹیم تیار کرتے ہیں۔ جن کا آپ نام نہیں کلمہ پڑھنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ برخوردار! اس مہنگائی میں اگر آپ کی آمدنی پانچ ہزار سے کم ہے تو کوئی دوسرے درجہ کا نقاد بھی آپ کا نام تو لینے سے رہا۔ نقاد غریب ادب تو کھاتا نہیں، کھاتا تو شاعروں ادیبوں کو ہی ہے۔ پھر اگر ادب کے نام پر ہم ان کے جعلی ایڈیشن چھاپ کر کھا لیتے ہیں تو کیا ستم کرتے ہیں۔؟"

اس ستم ظریفی پر ہمیں یاد آیا کہ لیسنگ (LESSING) کی "عقلمند ناتھن" (NATHAN THE WISE) ہمیں اتنی پسند آئی کہ ہم نے بہ زبان اردو اس کا ترجمہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۷۸۱ء میں انگریزی زبان میں اتنا ابہام تھا یا وہ یورپ کی جملہ زبانوں کی کھچڑی تھی، اس کا اگر شبہ بھی ہو جاتا کہ انگریزی کے

طالوی' ہسپانوی، البانوی، فرانسیسی وغیرہ بھی ہوا کرتے ہیں تو
سے واپس لے لیتے۔ دُشواری یہ تھی کہ اولیں سو صفحات جہازی
و نقد' تاریخ و معلومات کا بیش بہا خزانہ تھے۔ کنگ ریڈر پرائمر
سادہ' آسان اور رواں تھے۔ جن کا ہم نے فرفر ترجمہ بھی
اب ہماری حالت اس جہاز کی تھی جو ساحل کے نزدیک
ا ہو مگر کنارہ دور ہو۔ مجبوراً ہم نے بابا سے اُردو کی' انگریزی
ت" یعنی بابا کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ گاہے گاہے یونانی،
فرانسیسی، جرمن، لاطینی وغیرہ لغات پر بھی تکیہ کر لیتے۔ بیٹھ
ٹ کر، ٹہل کر، سر کو ہاتھوں سے پکڑ کر، ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر
اتھ لہرا کر، فکر میں غرق ہو کر کتاب کے ان نازک مقامات
ت تمام گزرتے بلکہ کھسکتے رہے۔ اُلجھن اور ذہنی کش مکش
ی قسمیں ہو سکتی ہیں وہ سب ہم پر آئینہ ہو گئیں۔ آئینہ بھی
نے لگا۔ لوگوں نے ہمارے حلیے اور صحت کے بارے میں
ں شروع کر دیں۔ ڈاکٹر کو دکھانے پر زور دیا۔ ان سب باتوں
را ہم جونک کی طرح "بابا" سے چمٹے ہوئے کتاب کی پریکرما
ہے۔

ابھی ہم نے کتاب کے ابتدائی دس صفحات کا ترجمہ کیا تھا کہ "بابا"
نے چھوڑنا شروع کر دیا۔ جلد کی دونوں دفتیاں اس طرح جھولنے
ے مرنے کے کچھ پہلے گدھ اپنے دونوں ڈینے ڈال دیتا ہے
یک مہمان جو کھانا کھا کر برآمد ہوئے تھے "بابا" کی پشتی جو
چکی تھی اور جزبندی کی سلائی کے جھٹڑے نکل آئے تھے
بڑی بے تکلفی سے ایک تاگا توڑ کر دانتوں کے آر پار خلال
دع کر دیا۔ ہمارا خون ہی تو کھول گیا۔ بس پی گئے۔ آگے
د ایسی بے ڈھب تھی کہ ہماری ترجمے کی گاڑی اس طرح
ی گویا مختلف انجانی زبانوں نے مل کر اس کی زنجیر کھینچ

ب میں کچھ عبارت ایسی آگئی تھی کہ معلوم ہوا کہ ڈکشنری
وکیل ہی ان اصطلاحات کو بتا سکتا ہے۔ وکیل صاحب
سے کی فیس طلب کر لی۔ مگر ایسا سمجھایا اور بتایا کہ

ہم فیس ادا کرنے کے باوجود پھڑک اُٹھے۔

فاضل مصنف کو شاید علم تھا کہ دو سو سال بعد ہم اُس
فخرِ روزگار کو اُردو میں پیش کریں گے اور اس سلسلے میں ہمیں مسلسل
زحمت نہ ہو' اس لیے وہ اچانک خالص، سادہ اور آسان انگریزی
پر اتر آیا تھا۔ انداز بیانیہ تھا اور وہ فرفر بیان کرتا کینڈین انجن کی طرح
تیز گام اُڑا چلا جا رہا تھا۔ سو صفحات ہم نے بآسانی ترجمہ کر ڈالے —
یہاں تک کہ مصنف پر پھر قابلیت کا دورہ پڑ گیا اور گاڑی جام ہو گئی۔
"بابا" کی حالت ورق ورق تھی۔ اگر پنکھا تیز ہو جاتا یا ہوا کا جھونکا
آتا تو ان کے پرزے اُڑنے لگتے۔ سہولت کے خیال سے ہم نے
حروفِ تہجی کے لحاظ سے ڈکشنری کی گڈیاں بنا کر پیپر ویٹ بلکہ ہر
وزنی شے کے نیچے دبا دیں۔ اب مصیبت یہ تھی کہ اگر "آر" کی گڈی
اٹھانا پڑی تو ورق ورق بھلا اس کی ورق گردانی کیسے کی جائے۔
معلوم ہوتا کہ ہم ڈکشنری نہیں دیکھ رہے ہیں کرنسی نوٹ گن
رہے ہیں۔

تعجب اس بات پر ہے کہ عملاً بابا سے زیادہ ہم نے دوسری
زبانوں کی ڈکشنریوں سے استفادہ کیا جن کے اصلی ایڈیشن نُسخ
نہ ہوئے مگر اس دو نمبر کی حالت یہاں تک غیر ہو چکی تھی کہ اچانک
ہم پر انکشاف ہوا کہ کچھ حروفِ تہجی اس میں سرے سے پائے ہی
نہیں جاتے۔ خاصی چھان بین کے بعد یہ پتہ چلا کہ کسی دن ہوا سے
کچھ گڈیاں اُڑ کر فرش پر بکھر گئی تھیں جن کو مہتر کوڑا سمجھ کر جھاڑو
سے صاف کر کے کوڑے پر ڈال چکا تھا۔ کوڑے کو کریدنے پر
کچھ صفحات بیشک مل گئے مگر بارش نے ان کا حلیہ بگاڑ دیا تھا
کچھ صفحات نہایت مشکوک حالات میں باورچی خانے سے برآمد ہوئے
مگر ہمارے تیور دیکھ کر باورچی صاف مکر گیا۔ یوں بھی خراب کھانے کے
علاوہ وہ کوئی دوسری ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔ مجبوراً ہم بابائے اردو
کا سالم جعلی ایڈیشن مکرر خرید لائے تاکہ ترجمہ کی جو غلطی شروع کی
تھی اسے نباہ کر آئندہ کے لیے اس قوم کے ترجمے سے معافی مانگ
لیں جس پر اب سورج غروب ہونے لگا ہے۔

خدا خدا کر کے تین سو صفحات پورے ہوئے جس میں سے دو تہائی

نا ڈکشنری کہاں مرحوم کے ڈبے اٹھا جا سکتا تھا۔ مگر نئے بابا کے فلیٹ بھی نہ لگایا جا سکتا تھا کیونکہ ان کے اطراف بیس پچیس صفحات پڑا پنے ڈبے بھیگ گئے تھے کر دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ حادثے کے بعد ہوائی جہاز کے ملبے سے نکلنے والا مسافر جس کا سر کہیں، دھڑ غائب، چھوٹے بڑے کٹے پھٹے آدھے ادھورے اعضاء۔ آسانی کے لیے ہم نے سب سے جوتے کے ڈبے نمبر پر سجا دیے۔ ہر ڈبے پر کسی نہ کسی حرف کا نام جلی طور پر لکھ دیا۔ جب کوئی لفظ ڈھونڈنا ہوتا تو متعلقہ ڈبے میں معنی خیز طور پر لگا دیتے۔

جوتے کے ڈبوں میں غوطہ خوری کا سلسلہ جاری تھا۔ اب محض آخری باب کے دس صفحات کا ترجمہ باقی تھا۔ اسی خوشی میں سینما دیکھنے چلے گئے۔ انٹرول ختم ہونے کے تھوڑی دیر بعد مزید ایک جبری انٹرول ہوا یعنی بجلی غائب ہو گئی۔ بڑی دیر کے بعد بجلی واپس آئی۔ معلوم ہوا کہ طوفان آگیا تھا۔ آندھی کا پہلا نزلہ بجلی پر گرا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا تو آندھی ختم ہو چکی تھی۔ آندھی کا نام سنتے ہی اندھیرے میں پکچر چھوڑ کر ٹوکرم گھر بھاگا۔

طوفان آندھی کے بعد بارش میں تبدیل ہو چکا تھا۔ بھیگتا ہوا گھر پہنچا۔ لائبریری کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں، جوتے کے سارے ڈبے غائب تھے۔ نئے اور پرانے دونوں باباؤں کو آندھی اڑا لے گئی تھی۔ چنانچہ بقیہ دس صفحات کا میں نے آزاد بلکہ شاعرانہ ترجمہ کر دیا۔ جس کا لیسنگ سے زیادہ حالات سے تعلق تھا۔ کیونکہ ڈکشنری کی دفتیوں سے ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔

★

بقیہ: شاعرِ مزدور - ایک تنقیدی مطالعہ (صفحہ ۳۳ سے آگے)

ہر طرف خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ فاقہ مستوں کے گندا ہے امیروں کے سر تن سے جدا کر رہے ہیں۔ اخبار کے مالک اور ایڈیٹر کا قتل کر دیا گیا ہے۔ چوراہوں پر لاشیں جمع کر دی گئی ہیں۔ باغی لوگوں کو سوراجیوں کے خطابات مل رہے ہیں۔ ـــــ ـــــ یہ تھا اس باغی نوجوان کا خواب جو بھوک کی تاب نہ لا کر سو گیا تھا۔

یہ انقلاب کا سراسر منفی اور ہولناک تصور ہے۔ یہاں انقلاب کی دہشت انگیز نراجیت اور اس کے تخریبی پہلوؤں کو لطف لے کر بیان کیا گیا ہے۔ ایسا انقلاب برپا نہیں کیا جا سکتا اور نہ عوام ایسا انقلاب چاہتے ہیں۔ انقلاب کا یہ تصور، سرمایہ داروں کی چال ہے تاکہ عوام انقلاب سے بدظن ہو جائیں۔ احسان کے یہاں یہ نقائص اور خامیاں ان کے ناپختہ شعور اور فکری کجروی کے باعث نظر آتی ہیں جن کی گرہیں ان کی کشمکشِ حیات میں کھلتی ہیں۔ ان کی تعلیم باقاعدہ طور پر نہ ہو سکی تھی۔ محنت مزدوری کے بعد جو کچھ وقت مل سکا اس میں وہ اپنے ذوقِ سلیم کی رہنمائی میں مطالعہ کرتے رہے اور پھر ان کا دور ایسا تھا جس میں خالص ادب کے مطالعہ سے بات بن ہی نہیں سکتی تھی۔ سیاسیات، سماجیات، اقتصادیات، عمرانیات اور تاریخ کے مطالعے کے بغیر نہ سماجی ادراک حاصل ہو سکتا ہے نہ حکیمانہ فکر اور نقطہ نظر بھی اس مطالعہ کے بغیر وسیع نہیں ہو سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے خیالات سلجھ نہ سکے۔ پھر بھی ان کا یہ کارنامہ کسی طرح کم نہیں ہے کہ انھوں نے غریبوں، ناداروں، مزدوروں اور محنت کشوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور ان کے احوال و کوائف ہمارے سامنے ایک سچے اور مخلص فن کار کی طرح پیش کیے۔ ان کا یہ کارنامہ ہمیشہ بہ نظرِ استحسان دیکھا جائے گا ؎

بکھر کے رہ گئی کاغذ پہ روحِ عصرِ رواں   اٹھا لیا جو حیات آشنا قلم تو نے

★

اشتیاق علوی
کاکوری ہاؤس
خیالی گنج۔ لکھنؤ

شکاری بھی فن کار ہے

شکاریوں کی ایک برادری ہوتی ہے جو واقعی مثالی سماج کا نمونہ کہلانے کی مستحق ہے۔ اس برادری میں سب سے زیادہ جاذبیت کا پہلو یہ ہے کہ شکاری ہر طرح کی سماجی تفریق و امتیاز سے بالاتر ہوتا ہے باہمی میل جول، اتفاق و اتحاد کا ایسا نمونہ یہ برادری پیش کرتی ہے کہ ہمارا مہذب سماج بھی شرما جاتا ہے۔ کسی مسئلہ پر اختلاف رائے کے باوجود ایک دوسرے پر قربان ہو جانے میں کوئی شکاری دریغ نہیں کرتا۔ جان جوکھم میں ڈال کر وہ شکاری ساتھیوں پر اپنے آپ کو قربان کر دیتا ہے۔ چنانچہ کوئی مثال ایسی نہیں ملے گی کہ خطرناک لمحات میں کسی شکاری نے اپنے ساتھی سے دغا کی ہو۔

ہمارے بالغ نظر اور تجربہ کار شکاریوں نے ایک معیار بنا رکھا ہے بقول ان کے یہ معیار بہت سی مخصوص صلاحیتوں پر مبنی ہے اور ہر شکاری کو اس کا اہل ہونا چاہیئے جب وہ اس ماحول میں ہو تو اس میں جملہ مطلوبہ صلاحیتیں اتنی بیدار ہوں کہ اس سے جو اعمال سرزد ہوں وہ معیاری ہوں یعنی اس کی ہر نظر، ہر حرکت، ہر انداز اور ہر طریقہ ایسا پختہ اور منجھا ہوا ہو کہ سب کچھ عادتاً اور غیر ارادی طور پر عمل میں آتا چلا جائے۔

جس موقع پر اور جس صورت حال کے لیے جو طریقے شکاری کے نقطۂ نظر سے مناسب ترین اور موزوں ترین ہوں وہ سب کے سب بروقت بروئے کار آتے جائیں۔ خطرے کے لمحات میں، اچانک پیش آنے والے موقعوں پر، حادثات اور تنہائی و مایوسی کے لمحوں میں اس کو اپنے اوپر قابو ہو اور اس کا ہر قدم مستحکم، درست اور بروقت ہو۔ محض نشانے میں پختہ ہونا، باہمت اور جیالا ہونا، اچھی بندوق اور ساز و سامان رکھنا، ہمہ وقت شکار کی باتیں کرنا، شکاری لباس پہننا، یا شکار کے قصّے بالغات میں بیان کرتے رہنا، اس کے کامیاب شکاری ہونے کا ثبوت نہیں ہوتا۔ خطرناک لمحات کا آخری گھڑی تک مشاہدہ کرنا شکاری ہی جانتا ہے شکاری کے لیے اپنے اوسان خطا نہ ہونے دینا اور اپنا ذہنی توازن برقرار رکھنا از حد ضروری ہوتا ہے۔ شکار کی صلاحیتیں پیدائشی یا موروثی نہیں ہوتیں۔ اس سلسلے میں فرد کا رجحان طبع اس کی لگن اور سازگار ماحول ان صلاحیتوں کو ابھارتا اور بیدار کرتا ہے۔ اچانک پیش آنے والی صورت حال اس کا امتحان ہوتی ہے اور یہی امتحان شکاری کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔

شکار کا ماحول اور شغل اتنا دلچسپ ہے کہ ہر فرد کو اس سے بہت کچھ حاصل ہوتا ہے۔ شکار میں ۹۵ فیصد واقعات ایسے ہوتے ہیں جو اچانک پیش آتے ہیں۔ شکار پر پہلی نظر پڑتے ہی فیصلہ کن قدم اٹھانا اصل فن ہے۔ پہلی ہی نظر میں بھرپور جائزہ لینا پھر فیصلہ اور عمل ضروری ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل تو بہت طویل ہے تاہم بہت سی باتوں کا پہلی ہی نظر میں جائزہ لینا پڑتا ہے۔ غیر شکاریوں کو آسانی سے ان پر یقین نہیں آئے گا۔ مثلاً اچانک اور جھلکی دکھا کر برآمد ہونے والا جانور کون سا ہے۔ اس کی عمر، قد، وزن شکار کے لائق ہے یا نہیں۔ بندوق اس کی سیدھ میں اٹھے یا نہیں، اس جانور کے اس پار،

سیدھ میں میدان صاف ہے یا کوئی خطرہ ہے، جانور کا رُخ کس طرف ہے، کہاں پر گولی مارنا چاہیے، گولی مناسب ہے یا نہیں نشانہ لگانے کے لیے فاصلہ کتنا ہوگا۔ جانور کی رفتار کتنی ہوگی جس کی مناسبت سے کتنا آگے نشانہ لے کر فائر کرنا ہوگا۔ یہ چند باتیں تو ہر شکاری کو اپنے جائزہ میں ملحوظ رکھنا پڑتی ہیں۔ مگر ایک اور سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر شکاری نیا ہے اور جذبات پر قابو پانے کی اس کی عادت اتنی پختہ نہیں ہو سکی ہے تو وہ گھبرا جاتا ہے اور جلد بازی میں یا تو فائر جھونک دیتا ہے یا فائر کر ہی نہیں پاتا ہے۔

شکار میں ہر طرح کے نازک لمحات آتے ہیں اور شکاری کی اہلیت یہ ہونا چاہیے کہ جن لمحات میں اور جس طرح مقابلہ کرنا مناسب ہو وہ اسی طرح کرے۔ اس اہلیت کا حامل شخص ہی کامیاب شکاری کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔ نشانے بازی کے طریقے پڑھ کر اور دوسروں سے بھی سیکھے جا سکتے ہیں۔ مگر شکار کی تربیت شکار کے حقیقی ماحول اور عملی تجربات سے ہی مکمل ہوتی ہے۔ اچھے شکاریوں کے ساتھ شکار کھیلنے سے ایک طرح کا حوصلہ افزا اعتماد پیدا ہوتا ہے جو انتہائی مفید ثابت ہوتا ہے۔ دوسرے کے شکاری تجربے ایک نو آموز کی تربیت میں مدد دیتے ہیں۔ بظاہر یکساں نوعیت کے شکاری واقعات سب ہی کے ساتھ پیش آتے ہیں لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا بلکہ ہر واقعہ جزئیات کے اعتبار سے جداگانہ ہوا کرتا ہے۔ ہر شکار کا نقشہ شکاری خود بناتا ہے جس کے تانے بانے کو ذرا سی بات الجھاتی رہتی ہے اور شکاری کا کام یہ ہوتا ہے کہ اس کو سلجھائے اور حالات کو اپنے موافق بنا لے۔ شکار کے سلسلے میں یہ صلاحیت بڑے بڑے تجربات کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ جانوروں کی نفسیات سے واقف ہونا اس شکاری کی اہلیت پر منحصر ہے کہ وہ کتنا محتاط اور دور اندیش ہے اور جانوروں کی نفسیات کو کس حد تک سمجھتا ہے کیونکہ بعض وقت معمولی سا جانور قدم قدم پر چرکہ دے جاتا ہے۔ ایک ہی قبیل کے جانور مختلف ماحول میں مختلف طور طریقے اختیار کر لیتے ہیں۔ شکاری کے لیے مختلف جانوروں کی نفسیات اور ان کی عادتوں کو پرکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ان کی بے فکری کے موڈ خوف کے وقت ان کی حرکات وسکنات اور ان کی چالاکی کے انداز و اطوار وغیرہ کے مشاہدے بڑے دلکش ہوتے ہیں۔ شکاری اکثر انھیں میں کھو جاتا ہے۔ یہ تمام صلاحیتیں جانوروں کو قدرت کی طرف سے حاصل ہیں جبکہ شکاری میں شکار سے متعلق صلاحیتیں تربیت اور تجربوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ دوسرا اہم اور دلچسپ پہلو یہ ہے کہ شکاری کو اپنے اسلحہ جات سے پوری واقفیت ضروری ہے کیونکہ ہر بندوق یا ہر گولی ہر جانور کے لیے موزوں نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں خاصی سوجھ بوجھ اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح ہر جانور کے بدن کی بناوٹ سے واقفیت بھی اچھے شکاری کے لیے لازمی امر ہے۔

شکار کے کئی میدان ہوتے ہیں مثلاً درندوں کا شکار، چرندوں کا شکار، مرغابیوں کا شکار اور میدانی چڑیوں کا شکار۔ اس قسم کے ہر شکار کے لیے جداگانہ اہلیت اور صلاحیت درکار ہوتی ہے۔

شکاری خواہ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو، اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے اسے اپنے مسند شاہی سے اتر کر ایک گھسیارے کی چلم کے سہارے زمین پر بیٹھ کر باتیں کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے اور ناکامی سے وہ کبھی ہمت نہیں ہارتا۔ شکاری کردار کی تعمیر و تربیت کے لیے کسی موزوں استاد کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ تجربے کی منزلیں کامیابی سے طے ہو سکیں اور ناکامی کی صورت میں بھی شکاری کی ہمت پست نہ ہو۔

شکار مسلسل جد و جہد پر مبنی ایک تحقیقی عمل کی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح شکارگاہ شکاری کی صلاحیتوں اور اہلیتوں کو پرکھنے کی کسوٹی ہے جو شکاری کی تفریح طبع کا سامان بھی فراہم کرتی ہے اور جہاں کی روح پرور فضا، سکون بخش ماحول اور فطری سکوت شکار کے لیے پر کشش اور سازگار فضا پیدا کرتا ہے۔ شکاری اس ماحول میں چاق و چوبند رہتا ہے اور وہ کسی قسم کی گرانی یا تھکاوٹ نہیں محسوس کرتا۔

شکار کا مسئلہ ان لوگوں کے لیے دردِ سر بنا رہتا ہے جو

شکار کی بابت صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ یہ صرف جانوروں کا خون کرنا ہے اور بس۔ مگر شکار کے شیدائیوں کے لیے یہ ایک با مقصد مشغلہ ہے جو ان کے لیے ایک مقناطیسی کشش رکھتا ہے۔ شکار اسپورٹس بھی ہے، تربیت بھی، جذبات و احساسات کی ورزش بھی اور میدانِ کارزار بھی۔ یہ ایک ایسی ذہنی تربیت ہے جس کے معلم نیچر کے مشاہدے، پیش آنے والے حادثات اور بے زبان حیوانات نیز خطرناک درندے ہوتے ہیں۔ ان ویرانوں کی گود میں بے شمار آبادیاں ہیں جہاں ہر شے بولتی ہے اور نظارے رقصاں نظر آتے ہیں۔ اس سنسان ماحول میں بلا کی کشش اور سرچشمۂ تحریک پنہاں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں کے قدرتی نظاروں اور پرسکون فطری ماحول سے لطف اندوز ہونے کے لیے شہری اندازِ فکر سے پرے ہٹ کر ہر شکاری کو چند مخصوص صلاحیتیں پیدا کرنا پڑتی ہیں اور ان صلاحیتوں کو کامیابی سے بروئے کار لانے والا شکاری ہی فن کار کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔

★

گاندھی جی کی یاد

(صفحہ ۴ کا بقیہ)

کرنا چاہیے، لیکن اقلیت کے نقطۂ نظر اور اس کی دلیلوں کا احترام بھی لازمی ہے۔ کیونکہ جمہوریت میں لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکنا جمہوریت کی توہین ہے۔ میری زندگی ہندو اور مسلمانوں کے مابین نہ ٹوٹنے والے رشتے قائم کرنے کے لیے وقف ہے۔ میرے دل میں ہندو اور مسلمان کے لیے برابر کا پیار ہے۔ اگر سینہ چاک کر کے میں اپنے اندر کی تصویر دکھا سکتا تو صاف دکھائی دے سکتا کہ میرے دل کے اندر ہندو اور مسلمان کے لیے علاحدہ علاحدہ خانے نہیں ہیں۔

گاندھی جی بہر حال ہیں، ایک انسان رہنا چاہتے تھے' ان کی نظر سے یہ حقیقت کسی لمحہ اوجھل نہ ہوتی تھی کہ انسان کو دیوتا اور مہاتما کے اونچے مقام پر بٹھا کر لوگ اس کی تقلید اور پیروی کو مشکل سمجھنے لگتے ہیں اور اسے ایک غیر معمولی اور بالاتر قوتوں کا مالک سمجھ کر، اس کی پیروی کو اپنے بس سے باہر قرار دے دیتے ہیں، اس لیے انھوں نے کئی بار کہا کہ مہاتما کا لفظ بہت مقدس ہے' اور میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی اور میری شخصیت کے ساتھ مہاتما کا لفظ وابستہ نہ کیا جائے کیونکہ میں صرف سچائی کا متلاشی ایک فرد ہوں اور تجربے کر رہا ہوں، مجھے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف ہے۔ اسلئے مجھے مہاتما یا سنت قرار دینا حق بجانب نہیں ہے میں مہاتما کا لبادہ اوڑھ کر ریاست کے میدان میں نہیں آیا ہوں۔ میری اپنی کوئی پالیسی بھی نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ میں اہنسا اور سچائی کا پرستار ہوں، مذہب اور ملک کے لیے میں سچائی اور اہنسا کو قربان نہیں کر سکتا۔

ہمیں نہیں معلوم کہ گاندھی جی کے ان صاف اور واضح خیالات اور رہنمایانہ ہدایتوں کی طرف لوٹنے کے لیے کس طرح کے اقدامات ضروری ہوں گے۔ لیکن اتنی بات ہم جانتے ہیں کہ ان ہدایتوں کی طرف لوٹے بغیر ہندستان کی سیاست اور قومی کردار کو متوازن اور جمہوری نظام کو مضبوط اور مستحکم بنانے کی کوئی کوشش کام یاب نہیں ہو سکتی۔

★

ترجمہ : ڈاکٹر صابرہ حبیب

بچو! کیا تم جانتے ہو کہ سال میں کتنے مہینے ہوتے ہیں۔

"بارہ"

کیا نام ہیں ان کے؟

"جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، اور دسمبر۔"

جیسے ہی ایک مہینہ ختم ہوتا ہے فوراً ہی دوسرا مہینہ شروع ہو جاتا ہے، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ جنوری ختم ہونے سے پہلے ہی فروری آجائے یا مئی کا مہینہ اپریل سے پہلے آجائے۔ مگر لوگ بتاتے ہیں کہ ایک لڑکی تھی جس نے ان بارہ مہینوں کو ایک ساتھ دیکھا تھا۔

یہ کیسے ہوا۔ لو سنو

بہت پہلے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک عورت اپنی بیٹی زویا کے ساتھ رہتی تھی، اس کی ایک سوتیلی بیٹی، ماشا بھی تھی، ان کے باپ مر چکے تھے زویا تو سارا دن لیٹی رہتی تھی اور مٹھائی کھاتی رہتی تھی جبکہ ماشا کو سارا کام کرنا پڑتا تھا، پانی بھر بھر کر لاتی، کھانا پکاتی اور برتن دھوتی۔ اس کے پاس نہ تو اچھے کپڑے تھے اور نہ گرم جاڑوں میں وہ ٹھنڈ سے اکڑتی تھی، گرمی میں تپتی تھی، بسنت میں ہوا لگتی تھی اور برسات میں پانی میں بھیگتی تھی۔ ہو سکتا ہے اسی وجہ سے اسے بارہ مہینوں کو ایک ساتھ دیکھنے کا موقع ملا ہو۔

جاڑے کا زمانہ تھا، جنوری کا مہینہ، سڑکوں اور جنگل میں چاروں طرف برف ہی برف تھی۔ کڑاکے کی ٹھنڈ پڑ رہی تھی ایسے موسم میں سوتیلی ماں نے ماشا سے کہا۔ "سنو کل تمہاری بہن زویا کی سالگرہ ہے، جنگل میں جاؤ اور پھول لے کر آؤ۔"

اس بچی نے سوتیلی ماں کی طرف دیکھا اور سوچنے لگی ماں شاید مذاق کر رہی ہے۔ "آج کل کیسے پھول، روس میں تو جاڑے میں پھول ہوتے ہی نہیں، اور مارچ سے پہلے ان کے ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا، میں تو جنگل میں جاڑے سے مر جاؤں گی۔"

پھر سوتیلی بہن بھی بولی، "جاؤ جا کر پھول لاؤ اگر تم جاڑے سے مر بھی گئیں تو کون بیٹھا ہے تمہارے لیے رونے والا، بنا پھول لیے گھر واپس مت آنا یہ لو تھامو ٹوکری۔"

ماشا رو پڑی مگر کوئی چارہ نہ تھا اس نے اپنا پھٹا کوٹ پہنا اور گھر سے نکل پڑی، تیز ہوائیں چل رہی تھیں اور برف گر رہی تھی، چاروں طرف اندھیرا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

ماشا جنگل تک پہنچ گئی مگر وہاں تو اندھیرا گھپ تھا راستہ تک نظر نہیں آرہا تھا تب وہ ایک پیڑ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اچانک بہت دور سے آگ جلتی ہوئی دکھائی دی، وہ اٹھی اور اس طرف چل دی جدھر وہ آگ نظر آرہی تھی وہ پیڑوں کو پکڑے پکڑے چلنے لگی۔ بار بار گرتی مگر پھر اٹھ کر چلنے لگتی، آگ پاس آتی جا رہی تھی۔

پھر وہ ایک کھلے میدان میں جا پہنچی میدان کے بیچوں بیچ آگ جل رہی تھی اور اس کے چاروں طرف لوگ بیٹھے تھے۔ اس نے جب گنا تو وہ بارہ تھے کچھ جوان تھے اور کچھ بوڑھے۔ جوان آگ کے بہت پاس بیٹھے تھے اور بوڑھے اس سے دور تھے، وہ سب آہستہ

آہستہ بات کر رہے تھے۔

اچانک ایک بوڑھے نے جو قد میں سب سے اونچا تھا اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اس کی نظریں ایک طرف جم گئیں جہاں پیڑ سے ٹیک لگائے ماشا بیٹھی تھی۔ اُسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے وہ ڈر گئی اور وہاں سے بھاگنا چاہا مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ بوڑھے نے پوچھا۔ "کون ہو تم اور یہاں جنگل میں کیا کر رہی ہو۔؟

لڑکی نے اپنی خالی ٹوکری دکھائی اور بولی۔ جنگل میں میں پھول لینے آئی ہوں۔

بوڑھا ہنس پڑا اور بولا۔ پھول اور وہ بھی جنوری میں؟

ماشا نے کہا۔ میری سوتیلی ماں نے مجھے پھول لینے جنگل بھیجا ہے اور حکم دیا ہے کہ بغیر پھول لیے میں گھر واپس نہ آؤں۔

"مگر پھول تمھیں ملیں گے کہاں سے؟ ابھی تو جنگل میں ایک پھول بھی نہیں ہے اور مارچ سے پہلے ہوں گے بھی نہیں، کیا کرو گی تم تب تک؟"

تب تک میں جنگل میں ہی رہوں گی، مارچ کا انتظار کروں گی، پھولوں کے بغیر میں گھر واپس نہیں جا سکتی۔ ماشا بولی اور رو پڑی۔

تب ان میں سے ایک شخص جو سب سے کم عمر اور زندہ دل تھا اٹھا، بوڑھے کے پاس آ کر بولا " بھائی جنوری تم مجھے صرف ایک گھنٹہ کے لیے اپنی جگہ دے دو۔

میں دے تو سکتا ہوں بڈھے نے کہا مگر فروری مارچ سے پہلے آتا ہے۔ دے دو بوڑھا فروری بھی بولا میں بُرا نہیں مانوں گا۔ ہم سب ماشا کو اچھی طرح جانتے ہیں اور اکثر اس سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ کبھی کھیت میں کبھی ندی پر۔

ٹھیک ہے جنوری بولا اور اس نے فروری کو وہ چھڑی دے دی جو وہ اپنے ہاتھ میں تھامے تھا۔ فروری کے ہاتھ میں چھڑی آتے ہی جنگل میں ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں اور برف اڑنے لگی پھر فروری نے وہ چھڑی چھوٹے بھائی کو دیدی اور بولا اب تمہاری باری ہے بھائی مارچ اس نے جیسے ہی چھڑی کو ہاتھ میں لیا فوراً ہی جنگل سے برف غائب ہو گئی اور پیڑوں پر ہری ہری پتیاں نکل آئیں اور میدان میں بسنت کے پھول کھل اٹھے۔ ماشا نے پوری ٹوکری ان پھولوں سے بھر لی سب کا شکریہ ادا کیا اور گھر کی طرف چل دی۔

اسے دیکھ کر سوتیلی ماں اور بہن نے پوچھا، "تم گھر کیسے واپس آئیں پھول کہاں ہیں؟ ماشا کچھ نہیں بولی اس نے چپ چاپ ٹوکری میز پر رکھ دی جو رنگ برنگے پھولوں سے بھری ہوئی تھی، اس کی سوتیلی ماں اور بہن دونوں کو بڑا تعجب ہوا۔ کیونکہ وہ تو سوچے بیٹھی تھیں کہ ماشا ٹھنڈ سے سکڑ کر مر جائے گی اور اس کا زندہ واپس آنا اور وہ بھی پھولوں کے ساتھ انھیں اچھا نہیں لگا۔

اتنے کڑاکے کی ٹھنڈ میں تمہیں پھول کہاں سے ملے اُن دونوں نے پوچھا۔ ماشا نے مہینوں سے اپنی ملاقات کا حال بتایا تب اُسکی بہن زویا بولی میں بھی جنگل جاؤں گی اور اُن سے تحفے لے کر آؤں گی اس نے خوب گرم کوٹ پہنا اور جنگل کی طرف چل پڑی۔ جلد ہی وہ اس میدان میں پہونچ گئی۔ ماشا نے جیسا بتایا تھا ویسے ہی بیچ میدان میں آگ جل رہی تھی اور اس کے چاروں طرف وہ بارہ بھائی یعنی بارہ مہینے بیٹھے ہوئے تھے۔ اکڑ کر جلتی ہوئی آگ کے پاس وہ آئی کسی کو سلام نہیں کیا اور گرم جگہ ڈھونڈھ کر وہاں بیٹھ گئی۔

جنوری نے اس سے پوچھا " کون ہو تم کہاں سے آئی ہو؟ کہاں سے کیا اپنے گھر سے آئی ہوں' اس نے جواب دیا۔ آج تم نے میری بہن کو پھولوں سے بھری ٹوکری دی تھی میں بھی تحفے لینے آئی ہوں میں چاہتی ہوں کہ جون مجھے خوبصورت پھل دے، جولائی مجھے تازہ ترکاریاں دے اور ستمبر. . . . .

" ٹھہرو" جنوری بولا۔ گرمی بسنت کے بعد آتی ہے اور بسنت جاڑے کے بعد ابھی جنگل کا مالک میں ہوں۔

"کتنا غصہ ور ہے یہ بڈھا" زویا نے بدتمیزی سے جواب دیا میں تمہارے پاس نہیں آئی ہوں میں تو گرمی کے مہینوں کے پاس آئی ہوں یہ سن کر جنوری کو غصہ آگیا اور اس نے اپنی چھڑی اوپر اٹھائی، ایسا کرتے ہی تیز ہوا چلنے لگی برف گرنے لگی اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ زویا نے بھاگنے کے لیے قدم اٹھائے ہی تھے کہ برف میں گر پڑی

(باقی ص ۴۸ پر)

فراق نمبر : تاثرات کے آئینے میں

اوامرؔ
مارہرہ ضلع ایٹاوہ ۔ یو۔پی

فراق نمبر تشریف لایا۔ شاید یہ اپنی قسم کا نمبر جوٹی کی چیز ہے۔ دو تین بار ورق گردانی کر چکا ہوں۔ مجھے ایک بار حضرت فراق سے حصولِ نیاز کا اتفاق ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ تعارف کے بعد مجھ سے ان کا پہلا سوال تھا کہ آپ شعر کہتے ہیں۔ جواب نفی کے سوا اور کیا ہوتا۔ یہ ملاقات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ میں اب زندگی کے اس موڑ پر پہنچ چکا ہوں جو درگاہ برکاتیہ کے کسی گوشے پر تمت بالخیر ہوگا۔ پلنگ کا قیدی ہوں نہیں جانتا کہ غریب خانہ کے باہر کیا ہے۔ دونوں ٹانگیں اب میری نہیں رہیں۔ ترانواں برس ختم ہو رہا ہے۔ لکھنؤ کو لاکھ بھلانا چاہتا ہوں مگر قادر نہیں۔ عمر کا بڑا حصہ اسی عروس البلاد میں بسر کیا ہے۔ کیسے کیسے دیکھا، کس کس سے فیضیاب ہوا اب بھلا رہا ہوں۔ اب لکھنا میرے لیے عذاب ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ چند بے ربط سطریں لیٹے لیٹے لکھ پایا ہوں۔ آپ حسنِ اتفاق سے اگر مجھے دیکھیں تو مشکل سے پہچانیں گے۔ دعا کیجیے کہ ایک بار پھر آپ سے نیاز حاصل ہو۔ بس حضور اب لیٹے لیٹے بھی نہیں لکھا جاتا۔ دعا کیجیے کہ زندگی کے باقی دن عافیت سے رہوں۔

پروفیسر سید حسن
سنگھی ہاؤس، ترپولیا۔ پٹنہ ۸۰۰۰۰۷

دو روز ہوئے نیا دور کا فراق نمبر کا ایک پوسٹ پارسل موصول ہوا۔ بڑے اشتیاق سے وصول کر کے اسے سرسری نظر سے دیکھا ظاہری آرائش اور باطنی نگارشات کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ آپ نے اچھے مقالات کو بڑی خوش اسلوبی سے ترتیب دیا ہے۔ ابھی بھی اس کے مندرجات کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ چند مضامین ایسے ہیں جو فراق کے ذاتی حالات اور ادبی کمالات پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں۔ اب انشاء اللہ اس نمبر کا دوسرا حصہ بھی ایسا ہی مفید اور جاذب نظر ہوگا۔

ڈاکٹر گیان چند
شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد۔۵۰۰۰۰۱

'فراق نمبر' کی ایک جلد کافی تھی۔ آپ نے دو حصوں کا فیصلہ کیوں کیا آپ پر کتنا بار پڑے گا میں اندازہ کر سکتا ہوں۔ رسالوں کے خاص نمبروں کو ترتیب دینے والے ایڈیٹر کسی طرح کتابی مجموعوں کے مؤلف سے کم نہیں ہوتے بلکہ انھیں زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے کیونکہ یہ تقاضا کر کے مضمون لکھاتے ہیں۔

پرسوں رجسٹری سے نیا دور کا فراق نمبر ملا۔ واہ وا! جی خوش ہو گیا سرورق ہی اتنا خوبصورت ہے۔ اس میں فراق گورکھپوری کا طغریٰ خوب ہے۔ یہ نمبر ایسا رنگا رنگ چمن ہے جس کی سیر کرنے کو کئی دن بلکہ کئی ہفتے چاہئیں۔ بس ابھی سرسری گزر گیا ہوں۔ فرصت میں گھسے گا ہے دیکھتا رہوں گا۔

آپ لکھتے ہیں کہ آپ کی یہ کوشش کہ فراق کی ادبی زندگی کے ساتھ نجی زندگی کا کوئی گوشہ تشنہ نہ رہے، یہ کیا غضب کرتے ہیں۔ نجی زندگی کے تمام گوشے پیش کرنے کی جسارت نہ آپ میں ہے اور نہ مجھ میں۔ میں ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک الہ آباد یونیورسٹی کا طالب علم رہا ہوں اور ۱۹۷۶ء سے ۱۹۷۹ء تک معلم۔ میں نے جو کچھ دیکھا سنا

ہے اسے کیونکر ننگِ قرطاس کردوں۔

بہرحال نمبر خوب ہے۔ اس میں مضامین خوب جمع کیے ہیں۔ مشکور ہوں کہ آپ نے اپنے سینے پر پتھر رکھ کر میرا مضمون بھی شامل کردیا۔ فراق کی عردمنی کمزوریاں دکھانے کے معنی یہ نہیں کہ میں ان کے شاعرانہ مرتبے کا منکر ہوں۔

کاش یہ پیپربیک میں نہ ہوکر مجلد ہوتا تو زیادہ پائدار ہوتا اور سردوگرمِ روزگار سے زیادہ محفوظ رہتا۔

ڈاکٹر سیّد محمّد عقیل رضوی

صدر شعبۂ اُردو، الٰہ آباد یونیورسٹی۔ الٰہ آباد

نیا دور کا فراق صاحب پر اتنا اچھا نمبر نکالنے کے لیے مبارکباد قبول فرمائیے۔ میرے خیال میں ابھی تک نیا دور نے جتنے نمبر نکالے ہیں سب سے اچھا یہ نمبر ہے۔ ڈاکٹر نریش اور رمیش دویدی کے مضامین مجھے بہت پسند آئے۔ الٰہ آباد میں اس نمبر کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ایک دکان سے تقریباً سو جلدیں فروخت ہوگئی ہیں۔

ڈاکٹر نریش چندر

۱۰۔ کرشنا نگر، فیض آباد روڈ۔ لکھنؤ

آپ کے محکمہ کی موجودہ اہم کامیابیوں میں سے ایک اہم کامیابی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میری مراد نیا دور کا فراق نمبر شائع کرنے سے ہے۔ جس وقت مجھے یہ نمبر ملا تو سب سے پہلے میں نے اس کا شاندار گٹ اپ اور خوشنما طباعت دیکھ کر بہت متاثر ہوا، اس کے گرانقدر اور بے حد معلوماتی مضامین کو پڑھ رہا ہوں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ یہ نمبر اُردو ادب میں ایک یادگار ثابت ہوگا لوگ اس نمبر سے فراق کے فن اور شخصیت کو بہتر طور سے سمجھنے کے ساتھ ساتھ ہماری مشترکہ تہذیب کی بنیادوں کو بھی بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔ آپ نے قومی اتحاد کے سلسلے میں یہ عظیم خدمت انجام دی ہے۔

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

ڈالی گنج۔ لکھنؤ

نیا دور کے فراق گورکھپوری پر خاص نمبر نکالنے پر میری جانب سے دلی مبارکباد قبول کیجیے۔ اس کا عمدہ گٹ اپ اور بہترین مضامین دونوں ہی قابلِ تعریف ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ نمبر آپ کے محکمہ کی بہترین تخلیق کی حیثیت سے عرصۂ دراز تک یاد رہے گا۔ برائے کرم میری مبارکباد اپنے معاونین کو بھی پہنچا دیجیے جنھوں نے اس قدر خوبصورت اور گراں قدر نمبر نکال کر حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا ہے۔

فاروق شفق

جی۔۱۲، دھان کھیتی، گارڈن ریچ، کلکتہ ۔ ۲۴ ۔۔۔۔۷

آپ لوگوں نے فراق صاحب سے متعلق اتنا خوبصورت، ضخیم اور مبسوط نمبر پیش کیا ہے کہ اُردو دُنیا مدتوں اس کو یاد کرتی رہے گی۔

فراق پر جب بھی کوئی تحقیقی کام ہوگا تو اس کا مطالعہ اور اس سے استفادہ ازبس ضروری ہوگا۔ فراق کی شاعرانہ خدمات بلا شبہ ایسی تھیں کہ ان پر ان کے شایانِ شان ایک یادگار اور دستاویزی نمبر شائع کیا جاتا۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ آپ لوگوں نے فراق سے متعلق یہ گرانقدر نمبر شائع کر کے اردو ادب کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ابھی فراق پر ادھر ادھر کئی نمبر شائع ہوں گے لیکن میرا خیال ہے کہ نیا دور کے مذکورہ نمبر سے بہتر اور وقیع شاید ہی کوئی دوسرا نمبر شائع ہو۔

اخلاق سہسوانی

سہسوان (بدایوں) یو۔پی

نیا دور کا فراق نمبر موصول ہوا شکریہ۔ آپ نے فراق نمبر نکال کر اُردو ادب میں ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ کم از کم اتنا ضخیم، اتنا کامیاب نمبر میری نظر سے نہیں گزرا۔

★

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب : **مشاعرۂ زنداں**

ملنے کا پتہ : اتر پردیش اُردو اکاڈمی لکھنؤ۔ قیمت : چار روپے پچاس پیسے

اُردو شاعری کے فروغ اور غزل کی مقبولیت کا سہرا بڑی حد تک مشاعروں کے سر ہے۔ ہر دور میں مبتدی شعراء مشاعروں کے ذریعہ ہی عوام سے روشناس ہوئے۔ جہاں ان کی ہمت افزائی ہوئی اور رفتہ رفتہ ان میں سے بیشتر شعراء کی صف اول میں داخل ہو گئے۔ اتنا ضرور ہے کہ آپس کی صف آرائیوں اور ادبی نوک جھونک کے باوجود پہلے مشاعرے نہایت صاف ستھرے ماحول میں ہوتے تھے اور سامعین کا بڑا حصہ باذوق اور ادب شناس ہوا کرتا تھا۔ اور مبتدی شعراء کے قابل قدر اشعار کی دل کھول کر داد دی جاتی تھی۔ مشاعروں کا یہ جادو اور غزل کی مقبولیت کیسے کیسے آزمائشی حالات میں برقرار رہی اس کا اندازہ اتر پردیش اُردو اکیڈمی لکھنؤ کی جانب سے شائع ہونے والی کتاب "مشاعرۂ زنداں" سے ہوتا ہے۔

ہندوستان کی جنگ آزادی کے دوران آزادی کے متوالوں نے قید خانے کے تلخ اور بے کیف ماحول کو شعر و سخن کے چرچوں سے خوش گوار بنا لیا تھا۔ مشاعرۂ زنداں ان چند مشاعروں کی داستان ہے جو قید خانوں میں آزادی کے متوالوں نے منعقد کیے تھے۔ اس کی ترتیب روزنامہ 'زمیندار' کی ۱۹۲۲ء کی فائلوں سے کی گئی ہے۔ محمود الٰہی صاحب سابق چیرمین یوپی اُردو اکیڈمی کے پیش لفظ اور ہر مشاعرے کی مختصر روداد اور اس پر مجمل تبصرے نے اس کی افادیت میں ایسا اضافہ کر دیا ہے کہ یہ کتاب ایک تاریخی دستاویز بن گئی ہے۔ قومی یکجہتی کا مظاہرہ اس دور میں جہاں زندگی کی دوسری سرگرمیوں میں ہوتا رہا۔ وہاں قید خانوں کے مشاعروں میں ہندو مسلمان شعراء کی یکساں طور پر شرکت سے بھی اس کا اظہار ہوتا تھا۔

'زمیندار' کی پرانی فائلوں تک رسائی ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اُردو اکیڈمی نے یہ بڑا کام انجام دیا کہ زنداں میں منعقدہ ان تاریخی مشاعروں سے ہم کو دوبارہ روشناس کرا دیا۔ کتاب کی ادبی اور تاریخی اہمیت کے پیش نظر اس کی قیمت کچھ بھی نہیں۔

شبیر حسن خاں

نام کتاب : **دھنک رنگ** (شعری مجموعہ)

شاعر : نوبہار صابر۔ قیمت : بائیس روپے

ملنے کے پتے : مڑھیہ آشرم، راگھو مزرعہ۔ پٹیالہ۔ جناب رشی پٹیالوی ۲۴۴۲، سیکٹر ۳۔ اے، چنڈی گڑھ

وزیر آغا ہوں یا گوپی چند نارنگ، کنھیا لال کپور ہوں یا جگن ناتھ آزاد، مظہر امام ہوں یا بشیر بدر، نوبہار صابر کی شاعرانہ عظمت کے سب ہی معترف اور مدّاح ہیں لیکن عرش ملسیانی نے دوٹوک بات کہی ہے۔ "نوبہار صابر کو قدرت نے ایسا خوبصورت فن دیا ہے جو کم از کم پنجاب میں کسی اور کو نہیں ملا"۔

صابر صاحب ہریانہ کے بزرگ اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ قابل رشک بات یہ ہے کہ تقریباً ساٹھ سال کی مشق سخن کے بعد بھی ان کے تخلیقی سوتے خشک نہیں ہوئے بلکہ اپنے نام کی رعایت سے وہ فکر و فن کی بات نئی بہاروں سے ہمیں آشنا کر رہے ہیں۔

صابر صاحب کا اپنا لہجہ ہے ــــ اچھوتا اور منفرد ــــ اور اس میں ایسی شگفتگی اور مٹھاس ہے جو دلوں کو مسحور کر دیتی ہے۔ صابر جدید تر غزل کے شاعر ہیں اور ان کے کلام میں عصری آگہی کی ایسی چھوٹ ہے جو فکر اور جذبے کی اکائی کی ترجمان ہے۔ صفحہ ۱۳ سے ۴۹ تک وہ غزلیں ہیں جو اس شعری مجموعے کی آبرو ہیں ؎

ٹھٹھر کر جان دے دی جس نے تنگ بستہ ہواؤں میں
سنا ہے بیش قیمت شال پشمینے کے بنتا تھا

زندگانی دھوپ میں تپتی ہوئی پتھر کی بنچ
آدمی اس بنچ پر ننگے بدن لیٹا ہوا

روشنی، دھوپ، ہوا، پھول، ستارے، بادل
مجھ سے ملتا ہے کوئی روپ بدل کر کتنے
پڑے پڑے کوئی اپنے بستر پہ نیم خوابی میں لے جو کروٹ
ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے کہ میں اسے انقلاب لکھوں
حسین خوابوں کی چاشنی سے مٹی ہے کب تلخیٔ حقیقت
جواز کیا ہے کہ ظلمت شب کو سرخیٔ آفتاب لکھوں

مختصر بحروں میں بھی صابر نے بہت خوبصورت شعر کہے ہیں ؎

لا کوئی ایسا آئینہ سائیں — مجھ کو مجھ سے جو دے ملا سائیں
شانتی کا سروت ہے بن باس — نیند کی گولیاں نہ کھا سائیں

زیرِ دیوار قہقہہ بھی ہمیں — کھل کے ہنسنے کی مہلتیں نہ ملیں
رات بھی کٹ گئی سحر بھی ہوئی — زندگی کو صباحتیں نہ ملیں

صحیفہ کوئی اس سے بڑھ کر نہیں — میاں! زندگی کی عبارت پڑھو
تقاضا ہے صابر نئے دور کا — سیاست لکھو اور سیاست پڑھو

صفحہ ۵۵ سے ۶۸ تک مختصر نظمیں ہیں جن میں سب سے زیادہ خوبصورت نظم "شام" ہے۔ صفحہ ۷۱ سے ۸۷ تک "منظر نامہ" ہے جو نسبتاً کمزور ہے۔ صفحہ ۸۱ سے ۹۰ تک "اپنی دھرتی اپنا دیش" کے عنوان سے قومی نظمیں ہیں جو شاعر کی حب الوطنی اور انسان دوستی کا ثبوت ہیں۔ صفحہ ۱۰۱ سے ۱۳۰ تک "یہ باتیں ہیں تب کی" کے عنوان سے دوسرا انتخاب ہے۔ ان نظموں کا مطالعہ صابر کے فنی اور شعری ارتقا کو سمجھنے میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ صفحہ ۱۳۳ سے ۱۴۲ تک "نذر غالب" کے عنوان سے غزلیں اور قطعات ہیں۔

غالب کی زمینوں میں شعر کہنے کی کوشش سعیٔ رائیگاں ثابت ہوئی ہے لیکن صابر کا جذبۂ پرستش لائق صد احترام ہے۔ صفحہ ۱۴۵ سے ۱۶۸ تک "متفرق" کلام ہے جس میں ۲ نعتیں اور ۵ سلام بھی شامل ہیں۔

الغرض نوبہار صابر کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کے لیے "دھنک رنگ" کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ یقین ہے اہلِ نظر اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

غلام رضوی گردش

نام کتاب: "تازیانہ" شاعر: بیباک جوگی قیمت: ۱۰ روپے
ملنے کا پتہ: اسلم برادرس اردو بازار گورکھپور

عام طور پر مزاحیہ شاعری سنجیدہ شاعری کی ناکامی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ حالانکہ مزاح گوئی بذات خود ایک بڑا فن ہے جس کی گیرائی و گہرائی تک پہنچنا عام لوگوں کے بس کا روگ نہیں بظاہر یہ فن ایک سہل سا عمل معلوم ہوتا ہے۔ اسی لیے سنجیدہ شاعری میں مات کھا جانے والے لوگ مزاح گوئی پر اتر آتے ہیں۔

زیر نظر مجموعہ "تازیانہ" کے خالق بیباک جوگی کی شاعری کی ابتدا ان کے قول کے مطابق سنجیدہ شاعری سے ہوئی تھی۔ وہ اس طرف کیوں متوجہ ہو گئے؟ ان کو اکبر الہ آبادی کی شاعری نے متاثر کیا! (میر، غالب یا اقبال ان کو متاثر کرنے میں ناکام رہے)

دراصل شاعر اپنی قدر و قیمت کا اندازہ خود نہیں کر سکتا۔ میں نے ان کی سنجیدہ شاعری کے کچھ نمونے بھی دیکھے ہیں۔ دو نشستوں یا کبھی کبھار اب سے بہت پہلے اکا دکا پرچوں میں خاصا "استادانہ" کلام تھا چنانچہ اپنے مقامی ہم عصروں میں نمایاں ہی نظر آتے تھے اچانک پتہ چلا ایک اور تخلص رکھ کر مزاحیہ شاعروں کی فہرست میں ایک نام کا اضافہ کر دیا ہے۔ اور گاہے گاہے لکھنؤ کے ایک روزنامہ کے تو یہ بھی کالموں کی زینت بننے لگے ہیں۔

بہرحال "تازیانہ" میں جوگی صاحب نے بہت کچھ دے دیا ہے
۱۔ انتساب اکبر الہ آبادی کے نام
۲۔ تعارف بقلم خود
۳۔ نذر قارئین کے عنوان سے تین اشعار پر مشتمل پیش لفظ (نصف صدی بیشتر چھپنے والے بعض سستے عامیانہ دواوین کے مثل میں)

مجموعہ قطعات سے شروع ہوکر "غزلیات" پر ختم ہوتا ہے۔ تعجب ہے انھوں نے "ہزل" کو غزل کیسے سمجھ لیا۔ اور اگر یہی سمجھنے پر مصر تھے تو یہ تخلیقات ان کی "سنجیدہ" شاعری کے مجموعہ میں آنا چاہیئے تھیں (جس کے آنے کی اطلاع وہ "تازیانہ" میں دے چکے ہیں)

رنگ پختہ، روایت کا قدم قدم پر پاس، لہجہ میں کہیں کہیں ندرت، جگہ جگہ دقیانوسیت (کہ جسے کے بجائے رد نے کو جی چاہے) اشعار سادے کے سارے "مقصدی" شاعری کے دلچسپ "نمونے"۔ منظوم پند و نصائح کا یہ مجموعہ دیکھنے میں خوبصورت، پڑھنے میں بدصورت نظر آتا ہے۔ طباعت، کتابت، کاغذ گوارا، سرورق سعی تیز، صفحات ۱۱۲۔ سائز ڈیمائی۔

ساتھ ہی یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ جگہ جگہ اکبر الہ آبادی کی روش اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر یہ اور بات ہے کہ وہ اس کوشش میں ناکام نظر آتے ہیں۔ اور خود اکبر مرحوم کے اس شعر پر پورے اترتے ہیں۔

ہزار شیخ نے داڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

لیکن جہاں انھوں نے خود اپنا طور طریقہ رکھا ہے وہاں تیکھے نظر آتے ہیں۔ "نذر قارئین" کے عنوان سے انھوں نے جو کچھ پیش کیا ہے اس میں ان کی انفرادیت نمایاں ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں

اس انتخاب میں جو آپ کے ہے پیش نظر
نہ زلف یار کا قصہ نہ ذکر شانہ ہے
حکایت گل و بلبل نہ داستان وصال
نہ اس میں طول شب ہجر کا فسانہ ہے
سمند فکر و عمل کے لیے بصد انداز
اس انتخاب کا ہر شعر تازیانہ ہے!

اگر آپ اپنے "معاشرے" کی "اصلاح" کرنا چاہتے ہیں تو "تازیانہ" کا مطالعہ ضرور کریں۔

——— ایم کوٹھیاوی راہی

بارہ مہینے (صــ۳۴ کا بقیہ)

اور اسی کے نیچے دب گئی۔ اس طرح اسی جنگل میں وہ دفن ہوگئی۔

ادھر ماں گھر پر اپنی بیٹی کا انتظار کر رہی تھی، کبھی کھڑکی سے جھانکتی تھی کبھی دروازے سے مگر زویا کا کہیں پتہ نہ تھا، پریشان ہوکر اس نے کپڑے پہنے اور جنگل کی طرف چل دی، چلتی رہی، چلتی رہی اور اپنی بیٹی کو ڈھونڈتی رہی مگر بیٹی تو کیا اس کے قدموں کے نشان بھی نہ ملے اور وہ بھی برف کے نیچے دب کر جنگل میں دفن ہوگئی۔

مگر ماشا بہت دنوں تک زندہ رہی، بڑی ہوئی، اس کی شادی ہوئی اور وہ کئی بچوں کی ماں بنی۔ اس کے گھر کے چاروں طرف ایک بڑا باغ تھا جس میں سب باغوں سے پہلے پھل لگا کرتے تھے، پھول کھلا کرتے تھے، گرمی میں ٹھنڈک اور جاڑوں میں خاموشی رہتی تھی۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ ماشا کے یہاں تو بارہ مہینے ایک ساتھ آتے ہیں کون جانے ہو سکتا ہے یہی بات ہو۔

★

علم نجوم۔۔ (صــ۲۸ کا بقیہ)

(۹) نوا	بلبل کی	قوس	عرق النساء
(۱۰) حسین	گھوڑے کی	جدی	حرارت و تپ شدید
(۱۱) زنگلہ	؟	دلو	خناق، ضعف، خون گردہ
(۱۲) رہاوی	کوّے کی	حوت	لقوہ، فالج

آخر میں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ اس سلسلہ کا پہلا مضمون "ایرانی تہذیب۔ فارسی اعداد کے آئینے میں" اپریل ۱۹۸۲ء میں نیا دور میں شایع ہوا تھا۔

له مزید تفصیل کے لیے دیکھیے "موسیقیِ ایران" از جناب رائے بہادر لالہ کنور سین۔ رسالہ زمانہ (کانپور) فروری ۱۹۳۹ء

★

Vol. 38, No. 7
OCTOBER, 1983
50 Paisa

Urdu Monthly

NAYA DAUR

REGD. No. LW/NP-17
Annual Subs.
Rs 5/-

POST BOX No. 146 LUCKNOW-226001

عنوانات

جلد ۳۸ نمبر ۸

نومبر ۱۹۸۳ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: گنگا دھر پرشاد شکلا

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو.پی

مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے

زرِ سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلیکیشن بیورو انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو.پی. لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو.پی. لکھنؤ

اپنی بات

اس سال نومبر کا مہینہ ہمارے ملک کے لیے خاص طور پر بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہوگیا ہے۔ ہمارے اوّلیں وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی پیدائش اسی مہینے کی ۱۴ تاریخ کو ہوئی تھی۔ ان کا یومِ پیدائش ہم یومِ اطفال کی شکل میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ مناتے ہیں۔ ہماری موجودہ وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا جنم بھی اسی ماہ کی ۱۹ تاریخ کو ہوا تھا۔ چنانچہ نومبر کا مہینہ پورے ملک کے لیے ایک خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سال اس مہینے کی اہمیت دہلی میں منعقد ہونے والی دولتِ مشترکہ کے ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس کے سبب اور بڑھ گئی ہے۔

اس کانفرنس کے موقع پر وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی یاد خاص طور سے آئے گی۔ جس طرح نہرو جی نے دنیا میں ناوابستگی کی تحریک شروع کی، اسی طرح انھوں نے دولتِ مشترکہ کی بھرپور حمایت کی اور اس کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا۔ دولتِ مشترکہ میں ہندستان کی شمولیت کے ان کے دانشمندانہ فیصلے کی افادیت اور اہمیت کو اب سبھی تسلیم کرنے لگے ہیں۔ نہرو جی کے ان دُور رس اقدامات نے عالمی امن کے قیام کے سلسلے میں ایک زبردست رول ادا کیا اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ نوعِ انسانی ابھی تک تیسری عالمی جنگ سے محفوظ ہے۔ نہرو جی نے عالمی امن ساز کی حیثیت سے دنیا میں بڑی طاقتوں کی گروہ بندی اور فوجی معاہدوں کے اثر کو کم کیا، اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ فوجی معاہدوں کا رجحان اب دُنیا میں بہت کم ہوگیا ہے۔ اور ناوابستگی کی تحریک دُنیا کی سب سے مؤثر اور پروقار تحریک بن گئی ہے۔

ہندستان میں پہلی مرتبہ منعقد ہونے والی اس دولتِ مشترکہ کانفرنس میں جن امور پر غور و خوض کیا جائے گا اور سیر حاصل بحث ہوگی، ان میں عالمی امن کے قیام کے مسئلہ کو سب سے زیادہ اہمیت بلکہ دیگر تمام امور پر فوقیت حاصل رہے گی، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ دُنیا پنڈت نہرو کے افکار و اقدامات کی معترف ہے کیونکہ یہی افکار و اقدامات دُنیا کو جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

✦ صدرِ جمہوریہ ہند شری گیانی ذیل سنگھ نے آل انڈیا اُردو سبھا کے زیرِ اہتمام ۱۰ر نومبر ۱۹۸۳ء کو لکھنؤ میں منعقدہ ایک کل ہند تاریخی مشاعرے کا افتتاح کرتے ہوئے اُردو کے سلسلے میں بڑی بصیرت افروز تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ: "جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو کو ہندی سے یا ہندی کو اُردو سے کوئی خطرہ ہے تو یہ محض خام خیالی ہے۔ اسی طرح یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ اُردو یا ہندی ایک دوسرے کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔" ظاہر ہے کسی ایک زبان کے سیکھنے یا پڑھنے سے کسی دوسری زبان کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ جس طرح بقول شخصے "اگر آپ جغرافیہ بھی پڑھتے ہیں تو اس سے ہسٹری یعنی تاریخ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

صدرِ جمہوریہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ "انقلاب زندہ باد" کے نعرے کا سب کی زبان پر آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ عوام کو کسی زبان سے الجھن نہیں ہوتی۔ انھوں نے زبان کے مسئلہ کو سیاست سے دُور رکھنے پر بھی زور دیا اور کہا کہ اُردو زبان ہستوں کو رلا دینے اور رونے والوں کو دلیر بنا دینے کی طاقت بھی رکھتی ہے۔ اس طرح یہ ایک کرشماتی زبان ہے۔ انھوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ اُردو ہندستان ہی کی زبان ہے اور اس کا جنم ہندستان ہی میں ہوا ہے، اسے مرنے نہیں دینا ہے۔ صدرِ جمہوریہ نے مزید کہا کہ میں غیر ملکی زبان سیکھنے کے خلاف نہیں ہوں۔ لیکن غلامی کے دور کی نشانیوں کو ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اُردو اور ہندی دونوں کو فروغ دیا جائے۔

یہ [illegible] سچ کر کسی بھی زبان سے نفرت نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اپنی مادری زبان اور اپنے ملک کی زبانوں پر کسی غیر ملکی زبان کو فوقیت بھی نہیں دی جانی چاہیے۔ تازہ ہوا اور نئی روشنی سے مستفید ہونے کے لیے کوئی بھی جدید مغربی زبان سیکھی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر ہم اسے سیکھ کر صرف اسی زبان کے ہو کر رہ جائیں اور اپنی مادری زبان نیز اپنے ملک کی زبانوں کو گھٹیا چیز سمجھنے لگیں اور ان کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں تو

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

حضرت حاجی وارث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ

نازش پرتاپگڈھی
بیگم وارڈ - پرتاپ گڑھ

وہی پیشانی پہ تہذیب محبت کی چمک
وہی انفاس میں گلریز اخوت کی مہک
وہی سینے میں بہی خواہیٔ انساں کی للک
سلسلۂ خواجۂ اجمیرؒ سے پہونچا تجھ تک
اب وہ بھگوان کے بندے ہوں کہ ہوں رب والے
معتقد ہیں ترے ہر فرقہ و مذہب والے

مدرسے میں ترے خودداریٔ انساں کا سبق
جس میں تہذیب مساواتِ بشر ایک ورق
تھا پئے تزکیۂ نفس ترا نعرۂ حق
واقعہ کیسے زخمِ سحر، خونِ شفق
کوئی صورت ہو مگر ایک ہی جلوہ دیکھا
تو نے کثرت میں بھی وحدت کا تماشا دیکھا

رام و رحمٰن کے جھگڑوں کے لیے غیر رہا
جہل کی ساری ہی شکلوں سے تجھے بیر رہا
ذہن آسودہ رہا اور نظر سیر رہا
وجہ برکت رہا، پیغامبرِ خیر رہا
پریم کا لفظ تھا اور پریت کی آواز تھا تو
جس میں سب راگوں کا سنگم ہو وہ اک ساز تھا تو

کون سمجھے ترے اقوال کہاں تک پہونچے
جادۂ دل سے چلے منزلِ جاں تک پہونچے
اب وہ اپنوں میں سے یادگراں تک پہونچے
"تیرا پیغام محبت تھا جہاں تک پہونچے"
تو رسومات و فروعات سے بیگانہ رہا
روحِ مذہب کا مگر طالب و دیوانہ رہا

سارے انسانوں کو الفت کی طرف لے کے چلا
تو ہمیں صدق و صداقت کی طرف لے کے چلا
قوم کو گوشۂ راحت کی طرف لے کے چلا
ملک کو منزلِ عظمت کی طرف لے کے چلا
شعلۂ عشق دیا ٹھٹھری ہوئی جانوں کو
واقفِ حسن کیا سوختہ سامانوں کو

نہ رکھیں بغض، نہ آمادۂ جنگ رہیں
ہم نہ افسردہ رہیں اور نہ دل تنگ رہیں
تیری کوشش تھی کہ جذبات ہم آہنگ رہیں
تو نے چاہا تھا سبھی آدمی اک رنگ رہیں
رائیگاں جا نہ سکا ایک بھی لمحہ تیرا
عمر بھر درس دیا لوگوں کو یک جہتی کا

سیکڑوں شاخیں تو ہوں پھر بھی شجر ایک رہے
ان گنت کرنوں سے مل جل کے سحر ایک رہے
زاویہ الگ ہو، انداز نظر ایک رہے
سارے جھگڑوں سے الگ ہو کے بشر ایک رہے
اسی پیغام سے ہم اپنا نفس مہکائیں
کام یہ پایۂ تکمیل تک پہونچائیں

جمیل مہدی
مدیر "عزائم"
امین آباد۔ لکھنؤ

جواہر لال نہرو

جدید ہندستان اور عالمی امن تحریک کے معمار

نہرو کو دیکھنے کے لیے دو پس منظر ہیں، ایک کا تعلق ہندستان سے ہے اور دوسرے کا بین الاقوامیت سے۔ ہندستان کا، اور قومی سیاست کا جو پس منظر ہے، اس میں نہرو، گاندھی جی سے چھوٹے نظر آتے ہیں۔ انھیں باپو کہتے ہیں لیکن ان سے اختلاف بھی کرتے ہیں، جھنجھلاتے بھی ہیں، لیکن ان کے احکام کی بے چون وچرا تعمیل بھی کرتے ہیں۔ اس پس منظر میں دیکھیے تو گاندھی جی اور نہرو کی شخصیتیں الگ الگ بھی نظر آتی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مربوط بھی۔ گاندھی جی نے اس بات سے پوری طرح واقف ہونے کے باوجود کہ نہرو، ان کے بہت سے خیالات سے اتفاق نہیں کرتے، آزادی سے بہت پہلے، انھیں اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا، اور اس جانشینی کے اعلان کے ساتھ یہ پیشین گوئی بھی کی تھی کہ گو جواہر لال نہرو کے خیالات بظاہر مجھ سے مختلف نظر آتے ہیں، لیکن انھیں یقین ہے کہ وہ میرے بعد، میری زبان بولیں گے۔

گاندھی جی کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔ آزادی کے بعد جواہر لال نہرو نے گاندھی جی کے خیالات کے پرچار، اور ان کی شخصیت کی عظمت قائم کرنے کے لیے جتنا کام کیا، اتنا کام ان کے آشرم کے جانشین اور وہ لوگ جو ان کی قربت کا اور خیالات میں ان کے ساتھ مکمل ہم آہنگی کا دعوا کرتے تھے، مل کر بھی نہیں کر سکے اور یہ کام جواہر لال نہرو نے، گاندھیائی فلسفے کے کٹر مقلدوں کی مخالفت اور اس تنقید کے باوجود انجام دیا، جو وہ ان پر اکثر کرتے رہتے تھے اور انھیں گاندھیائی طریقۂ کار سے منحرف قرار دینے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

ہم یقین کے ساتھ اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے کہ گاندھی جی کو اس راستے کا ادراک اور اس کا تصور پہلے سے تھا یا نہیں جس پر آزادی کے بعد، نہرو نے ہندستان کو چلایا، لیکن اس بات کے پیش نظر کہ

نہرو نے اپنے خیالات کو گاندھی جی سے کبھی چھپا کر نہیں رکھا اور سوشلزم اور اقتصادی نظریات کے سلسلے میں، پوری قوت کے ساتھ اپنے خیالات ان کے سامنے رکھے، اور ان پر اصرار بھی جاری رکھا۔ ہم آسانی کے ساتھ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ گاندھی جی کو اس نقشے کا اندازہ بخوبی ہو گیا ہوگا جو آزادی کے بعد کے ہندستان کے لیے نہرو کے ذہن میں تھا۔

کئی بڑے موقعوں پر، مثال کے طور پر چوری چورا کے واقعے کے بعد گاندھی جی کی طرف سے سول نافرمانی کی تحریک واپس لینے کے واقعے پر، اور سردار بھگت سنگھ کی پھانسی کے موقع پر، اور سب سے آخر میں ۱۹۴۲ء میں ہندستان چھوڑو تحریک کے موقع پر، نہرو نے گاندھی جی پر واضح کر دیا تھا کہ وہ گاندھی جی کے خیالات سے متفق نہیں ہیں، لیکن تینوں موقعوں پر انھیں اس بات کا تجربہ ہوا کہ گاندھی جی کی رائے ہی ٹھیک تھی، اور اس بات کا اعتراف انھوں نے کئی بار اپنی تحریروں میں کیا، گاندھی جی کی بابت انھوں نے کہا:۔

"ان کی بہت سی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں، اور بظاہر غیر عملی بھی معلوم ہوتی تھیں، لیکن حیرت انگیز بات یہ ہوتی تھی کہ وہ ہمیشہ درست نکلتی تھیں اور ان کے نتائج ہمیشہ حیرت انگیز حد تک درست نکلتے

جو گاندھی جی کے ذہن میں محفوظ تھے۔

[illegible] میں جب گاندھی جی نے "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ کانگریس کے بمبئی اجلاس میں دیا، نہرو بہت زیادہ ذہنی پریشانی کا شکار تھے۔ وہ دنیا میں ڈکٹیٹروں کے عروج سے پریشان تھے۔ اور ان کی تمام ہمدردیاں اتحادیوں کے ساتھ تھیں، جو اس وقت ہٹلر، مسولینی اور جنرل توجو وغیرہ کے ساتھ زندگی اور موت کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ اس لیے ان کا خیال تھا کہ ڈکٹیٹروں کی شکست تک اتحادیوں سے لڑائی کو ملتوی کر دیا جائے۔ اور یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ اس معاملہ میں مولانا آزاد کی رائے، جواہر لال کے مقابلہ میں گاندھی جی کے ساتھ تھی جو جواہر لال نہرو کے ساتھ مکمل ذہنی آہنگی کے لیے مشہور تھے، لیکن گاندھی جی نے جب ہندوستان چھوڑ دو تحریک چلائی تو جواہر لال نہرو حسب معمول پوری ذہنی رفاقت اور حکم کی تعمیل کے جذبہ کے ساتھ اس تحریک میں شریک ہوئے۔ ایک مثالی ڈیموکریٹ کی حیثیت سے ان کا مزاج ہمیشہ، اختلاف کو شدت کے ساتھ پیش کرنے اور پھر اکثریت کے فیصلے کی مکمل متابعت کا رہا تھا۔ اور اس خصوصیت نے، ہندوستان کے معماروں میں ان کی ایک ایسی شخصیت تعمیر کر دی تھی، جس کی مقبولیت، محبوبیت، اور عظمت کا مقابلہ کرنے والی، اب تک دوسری کوئی شخصیت ہندوستان کے سیاسی منظر پر ابھر کر سامنے نہیں آ سکی۔

جواہر لال نہرو کا دوسرا شخصی پہلو، بین الاقوامی پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے قومی پس منظر میں، ہندوستان کی تعمیر کا جو نقشہ بنایا اس کی بنیاد بھاری صنعتوں اور سوشلزم کے ستونوں پر تھی اور اقتصادی وسائل سب کے سب جدید اقتصادی نظریات پر قائم کیے گئے تھے۔ ہندوستان کی زراعت کو انھوں نے تنگ بوس باندھوں، اور بھاکرا جیسے ڈیموں کے ذریعہ ترقی دینے کا پروگرام بنایا اور فولاد کی پیداوار کو سب سے زیادہ اہمیت دی، اور بھلائی اور راوڑکیلا جیسے کارخانے قائم کیے، اور خالص سیاسی اور انتظامی سطح پر انھوں نے پس ماندہ طبقات اور اقلیتوں کو امتیازی درجہ پر رکھا، اور انھیں ایسی گرم ہواؤں سے محفوظ رکھا جو — اگر جواہر لال نہ ہوتے — تو نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ان کا قومی سیاست میں کیا درجہ ہوتا۔ اور درجہ ہوتا بھی تو ان کا نمبر کب آتا۔ ان سارے معاملوں پر خصوصیت کے ساتھ پس ماندہ طبقوں، ہریجنوں اور اقلیتوں کے مسائل پر وہ گاندھی جی کے آخری وقت کے خیالات سے پوری طرح متاثر نظر آتے ہیں۔ اور صاف طور پر دکھائی دیتا ہے کہ گاندھی جی جن مقاصد کے لیے زندہ رہے اور جن پر انھوں نے جان دی، جواہر لال نے ہمیشہ انھیں یاد رکھا اور انھیں کامیابی کے ساتھ آگے بڑھاتے رہے۔

بین الاقوامی سطح پر، انھوں نے جس نصب العین کو اہمیت دی وہ عالمی امن کے قیام کا نصب العین تھا، اس نصب العین کے لیے انھوں نے ہندوستان کی جو خارجہ پالیسی بنائی اس میں فوجی گٹھ بندھنوں اور فوجی معاہدوں سے الگ رہ کر اس دنیا کو تصادم سے بہر قیمت محفوظ رکھنے کی جد و جہد اولیت کا درجہ رکھتی تھی، اس مقصد کے لیے انھوں نے نہ صرف یہ کہ ہندوستان کے لیے ایک مخصوص قومی خارجہ پالیسی، غیر جانب دار پالیسی کے نام سے مرتب کی بلکہ اس نصب العین کو زیادہ موثر، اور زیادہ طاقت ور بنانے کے لیے دوسرے ملکوں، خاص طور پر ان ملکوں کی حمایت اور اشتراک حاصل کرنے کی کوشش کی، جو نوآبادیاتی نظام سے آزاد ہو کر بین الاقوامی ملکوں کی آزاد برادری میں نئے نئے شامل ہوئے تھے اور جن کے بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کے جال میں پھنس جانے کا خطرہ درپیش تھا۔ ان کی اس کوشش کا عملی اظہار ناوابستہ تحریک کی صورت میں ہوا، جو آج کل اپنے عروج پر پہنچ کر دنیا میں — اور بین الاقوامی سیاست میں، عددی لحاظ سے سب سے زیادہ ملکوں کی تنظیم بن گئی ہے اور سب سے بڑے گروپ کی حیثیت سے عالمی امن کی جد و جہد میں اپنا موثر رول ادا کر رہی ہے۔

اس زمانے کی دنیا میں، جو دوسری جنگ عظیم کے ما بعد اثرات سے نحیف و نزار اور جنگ کے بعد - سرد جنگ کے نئے بوجھ سے ڈگمگاتی ہوئی نسل انسانی کے لیے نازک دور تھا، جواہر لال نہرو

[illegible] حیثیت سے ابھرے

[illegible] جرأت اور ذہانت جنگ کے بجائے امن کو [illegible] کی حامی ہوئی اور اس سلسلے میں ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کی ان کی صلاحیت نے یقیناً ایک ایسی جماعت کو دنیا میں پیدا کر دیا، جس نے [illegible] کوریا، ویت نام اور کانگو کے معاملات میں [illegible] نازک موقعوں پر اس دنیا کو بڑی جنگ میں ملوث ہو جانے سے روکا، اور چین کے کمیونسٹ انقلاب تک کو اخلاقی امداد [illegible] اقوام متحدہ میں اس کی ممبری کی وکالت کی شکل میں فراہم کی۔

جواہر لال کا دوسرا جرأت مندانہ اقدام، کامن ویلتھ میں ہندستان کی شمولیت کے فیصلے کی صورت میں سامنے آیا، ایک ایسے ملک کو کامن ویلتھ تنظیم کے صدر اور چیرمین کی حیثیت سے قبول کرنے پر آمادگی، جس کے ساتھ تلخ تعلقات کی کم از کم سو سالہ تاریخ ہندستان نے بنائی تھی، آج چاہے غیر معمولی بات نظر نہ آتی ہو لیکن اس زمانہ میں، جبکہ نہرو نے اس آمادگی کو ظاہر کیا تھا، یقیناً ایک ایسا جرأت انگیز اور بہادرانہ اقدام تھا جس نے ہندستان کے اس ملک کا سیاسی عزت و احترام دنیا میں قائم کیا، جو دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنی نوآبادیوں سے محروم ہو کر تاریخ کے افق میں غروب ہو جانے پر تیار ہو رہا تھا۔

جواہر لال نہرو کا یہ اقدام اور کامن ویلتھ تنظیم میں ہندستان کی شمولیت کا فیصلہ گاندھی جی کے اس نظریہ اور اخلاقی تعلیم کی یاد دلانے کے لیے کافی ہے، جس میں برائی سے نفرت اور شخصیتوں کے احترام کے دونوں عناصر، پورے امتیاز اور نکھار کے ساتھ مربوط نظر آتے ہیں۔ گاندھی جی کی جنوبی افریقہ سے لے کر ...... ہندستان کی آزادی تک کی جدوجہد میں پہلے ہی تلخ تجربے ہو چکے تھے، وہ آہستہ آہستہ سرمایہ داروں سے نہیں سرمایہ داری سے، انگریزوں سے نہیں، انگریزی حکومت سے لڑنے کا سبق دیتے تھے ـــ اور جواہر لال نہرو نے کامن ویلتھ تنظیم میں ہندستان کو شامل کر کے عملی طور پر یہ ثابت کیا کہ وہ اس خیال کے قائل ہیں اور انگریزوں سے لڑ کر آزادی حاصل کرنے کے بعد، انگریزوں کے ساتھ دشمنی اور اختلاف کو باہمی تعلقات کی راہ میں رکاوٹ نہیں سمجھتے تھے۔

جیسا کہ شروع میں کہا گیا، نہرو کی اصل شخصیت ان کے کردار اور ان کے کاموں کو دیکھنے کے لیے قومی اور بین الاقوامی پس منظر ضروری ہیں۔ انھوں نے نئے ہندستان کے معمار کی حیثیت سے جو تاریخی کردار ادا کیا، اسے قائم رکھے بغیر، اس کا تحفظ کیے بغیر ہندستان کے مستقبل کی تعمیر آنے والے رہنماؤں اور معماروں کے لیے آسان نہ ہوگی۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ خطرہ، اس عام رواج، بلکہ انسانی فطرت کے اس پہلو سے ہے جس کی طرف خود جواہر لال نہرو نے ان الفاظ میں اشارہ کیا تھا۔

> "ہوتا یہ ہے کہ لوگ پہلے تو شخصیتوں کو
> فراموش کرنے کا رویہ اختیار کرتے ہیں، اس
> کے بعد وہ ان خیالات اور ان مقاصد کو بھی
> بھلا دیتے ہیں جن کے لیے ان شخصیتوں
> نے جدوجہد کی تھی۔"

ہندستان کو جواہر لال نہرو کے نام کو بھی یاد رکھنا چاہیے اور ان کے اس کام کو بھی، جس کے لیے انھوں نے جدوجہد کی، اور اس ملک کو اس راستے پر چلایا کہ آج اس کا شمار دنیا کے عظیم ملکوں میں ہو رہا ہے۔

★

سیرت صدیقی
ڈی ۱۲/۱ پیپر مل کالونی
لکھنؤ

اُردو شاعری دیگر زبانوں کی ہی طرح جذبات عشق و محبت کے تذکروں سے بھری پڑی ہے۔ فارسی شاعری کے ابتدائی غلبے سے نکل کر اُردو شعراء کا کلام عورت سے والہانہ عشق کی داستان ہے۔ محبوبہ، معشوقہ، دلبر، لیلیٰ، دلنواز، پیکر مہر و وفا، قاتل و بے وفا، ہرجائی، فریبی، ظالم، کبھی عیار، کبھی پُرفن یا مجسمۂ حیا۔ غرض کہ ہر رنگ، ہر جذبے کے تحت اس کا مخاطب عورت ہے اور یہ اُردو شاعری کی صحت مندی کی علامت ہے۔ خاص طور سے صنف غزل تو عورت سے عشق، رومانس، اس کے تئیں اظہار فریفتگی، داستان حسن و شباب اور ہجر و تمنائے وصال بیان کرنے کا نام ہے۔

ملاقاتیں، جدائی کا غم، دنور، ہیجان، خوشی، ولولے، لگن، احساس تنہائی غرض کہ زندگی، جوانی اور محبت کا ہر احساس اسی معشوقہ اسی عورت سے منسوب ہے۔

حالیؔ، شبلیؔ اور اقبالؔ نے اپنے دَور میں عورت سے متعلق تصور کو بدلنے کی سعی کی۔ اپنے ماحول سے متاثر اُردو کے دیگر شعراء نے عورت سے اظہار ہمدردی بھی کیا، اس پر رحم بھی کھایا، اسے ماں بھی کہا اور مظلوم بھی، کبھی اسے عفت کا جامہ پہنایا، کبھی قربانی اور ایثار کا مجسمہ بنا کر پیش کیا، کچھ نے اس کو زبوں حالی، پستی اور مجبوری کے بندھن توڑنے اور رسم و رواج سے روگردانی کرنے کی ترغیب دی اور پرچم بغاوت بلند کرنے کی تلقین بھی کی۔

اس سے قطع نظر کہ عورت کے لیے مرد کی سیاست نے کیا کیا اسلوب اختیار کیے یا یہ بھی اس کی تفریحِ طبع کا ایک رنگ تھا۔ عورت کے متعلق مرد سب کچھ کہتا رہا، شاعری کرتا رہا، لیکن اس نے عورت کی شاعری کو کبھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا اور عورت نے شاعری کی تو اسے نظر انداز کرتا رہا اور اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔

یہ بے نیازی اور ناانصافی صرف ہمارے اسلاف تک محدود نہیں، آج بھی جو تذکرے لکھے جا رہے ہیں اور قابل قدر کہے جا سکتے ہیں، ان میں بھی خواتین شعراء کا ذکر نہیں ملتا، اس بیدردی کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ مرد عورت کو اپنی ملکیت تو سمجھتا ہے، اسے اپنے ہم پلّہ دیکھنے پر تیار نہیں۔

عورت کو گمنامی اور پستی کے غاروں میں چھپائے رکھنے کا ظلم اس دور میں بھی کم نہ ہو سکا، جب عورت برسر اقتدار ہو سکتی ہے۔ عنانِ حکومت کسی کے بھی ہاتھ میں کیوں نہ ہو تہذیب و تمدن کا معیار، حیا، بے حیائی، حجاب، ننگ، برتری، پستی، افضلیت، یہاں تک کہ اثر اور بے اثری کے معیار بھی مرد ہی قائم کرتا ہے، قلم اسی کے ہاتھ میں ہے۔

اگرچہ چند خواتین ادیبوں نے دورِ حاضر میں عوام سے مقبولیت کی سند پائی بھی تو ادبی تذکروں میں انھیں نمایاں مقام دینے سے گریز کیا گیا۔ درسی کتابوں میں ان کا نام و نشان نہیں ملتا بلکہ شاعرات کو تو عوامی پسند کی سند پانے کے مواقع سے بھی محروم رکھا جا رہا ہے۔

شروع میں مصحفی، محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ نے "گلشنِ بے خار" میں چند شاعرات کا نہایت مختصر حال اور نمونۂ کلام درج کیا۔ مولوی عبدالغفور نساخ نے "سخن شعراء" میں بطور ضمیمہ مختصر تذکرۂ شاعرات

شامل کتاب کیا۔ اسی طرح "شمیم سخن" اور "تذکرۃ الخواتین" کے ذریعہ شاعرات کے تذکرے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس ضمن میں سب سے اہم کام جمیل احمد بریلوی نے ۱۹۴۳ء میں ایک ضخیم کتاب "تذکرۂ شاعرات اردو" مرتب کر کے انجام دیا۔ اس کتاب میں تقریباً چھ سو شاعرات کا کلام اور سوانحی حالات شامل ہیں۔ بقول عندلیب شادانی یہ کام "ہفت خوان رستم" طے کرنے سے کم نہیں تھا جسے جمیل صاحب نے اپنی جاں فشانی اور کاوش کے ذریعہ انجام دے کر ادب میں اضافہ کیا۔ لیکن ان سب کے باوجود شاعرات اُردو بھولی بسری یاد ہی بنی رہیں۔!

اس اشتیاق میں ورق گردانی کرتا رہا کہ اس سے خواتین کی شاعری کا معیار معلوم ہوگا، یہ پتہ چلے گا کہ عورت نے مرد کی چیرہ دستی، ناانصافی، غلط بیانی، تہمت طرازی، شکوۂ بے زنی، بے وفائی اور آرزوئے قرب و وصال کی کیا توجیہہ کی، دہشت پیمائی کرتا رہا لیکن گراں باری یہ ہوئی کہ عورت نے شاعری کی بھی تو بچ بچ کر اور کھل کر اپنے جذبات اور احساسات کو بیان نہیں کیا، احتیاط اور شرم و حیا قائم رکھنے کے لیے حقیقت بیانی سے گریز کیا۔ دل کی بات جو شاعری کی جان ہے اور جس پر اس کی بنیادیں قائم ہیں، کہنے سے رک کر رہ گئی، بلکہ بعض شاعرات نے تو اسی طرز، اسی رنگ، اسی اسلوب اور انہیں روایات کے تحت شاعری کی جن کی داغ بیل مرد نے ڈالی تھی۔ مثال کے طور پر یہ چند اشعار ملاحظہ کریں ؎

افشاں سے شوق شاید کچھ بڑھ گیا ہے ان کو
یوں ورنہ ٹوٹتے ہیں تارے کہیں زمیں پر (شمیم انور شمیم)

چھاگلیں یار کی کرتی ہیں قیامت برپا
سیکڑوں بار بجاتی ہیں گجر وصل کی رات (اشک)

کسی عاشق کا بے شک استخواں ہے میں نہ مانوں گا
کہ شانہ تیرے رُخ تک آنا ہے یا کا نہ آتا ہے (زاہدہ خلیق الزماں)

لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ خواتین کا سارا کلام ہی ایسا ہے۔ خواتین نے بہت سی نظمیں اور اشعار بہت سے شعرا سے بہتر اور پراثر بھی کہے ہیں جنھیں ادب میں یقینی طور سے ایک مقام ملنا چاہیے تھا۔

عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ شاعرات کا کلام ہمارے دیگر اساتذہ کے ہم پلہ نہیں۔ حقیقتاً یہ اعتراض غیر متوازن ہے اور صرف حقیقت سے ناآشنا ہی ایسا اعتراض کر سکتے ہیں۔

مرد تو کہتا ہے کہ عورت کو شاعری کرنا ہی نہیں چاہیے۔ اس کے لیے کھل کر شعر کہنا ممنوع ہی نہیں ہے بلکہ بے حیائی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے جذبات کا اظہار کرے، مرد کے متعلق اپنے احساسات بیان کرے تو اسے فحاشی میں شمار کیا جائے گا۔ پھر بھلا عورت شاعری کیا کر سکتی ہے۔ اس پہ مزید ظلم یہ کہ اس کی شاعری کو نظر انداز کیا جاتا رہا اور آج بھی کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اُردو شاعرات کا سارا کلام منظر عام پر آیا ہی نہیں پھر بغیر پڑھے فیصلہ کر لینا کیسے ممکن ہے۔؟

اس کے علاوہ ہر شاعر کا غالب، مومن، میر اور انیس کے ہم پلہ ہونا تو ممکن نہیں، اس کے باوجود تمام شعراء کا کلام محفوظ تو کیا جاتا رہا اس لیے کہ وہ سرمایۂ ادب و تاریخ اُردو کے لیے ضروری تھا مگر خواتین شاعرات کو تسلیم کرنے سے بھی گریز کیا گیا اگرچہ وہ بھی کوئی مقام تو رکھتی تھیں۔ بہمنی دور کے اُردو شاعروں نظامی، نصرتی، رستمی یا ولی دکنی کا کلام ڈھونڈھ ڈھونڈ کر سامنے لایا گیا اور اسے آثار قدیمہ کی طرح محفوظ رکھا گیا لیکن زیب النساء جیسی عالم فاضل خاتون کے کلام کو تلف ہو جانے دیا گیا، اور اسے تلاش کرنے کی کوئی سعی بھی نہیں کی گئی، صرف اس لیے کہ وہ عورت تھیں۔ یہاں تک کہ قدیم شعرا کا فارسی کلام تک اُردو کے ارتقاء کے زمرے میں گردانا گیا۔ لیکن زیب النساء کے فارسی کلام کو نظر انداز کیا گیا۔ خود علامہ شبلی نے یہ تسلیم کیا کہ وہ بڑی عالم اور علم دوست خاتون تھیں۔ علامہ شبلی نے ان کی علم دوستی کے کئی واقعات بھی بیان کیے ہیں لیکن اُردو ادب کی تاریخ میں ان کا ذکر کہیں بھولے بھٹکے آگیا ہو تو آگیا ہو ورنہ باقاعدہ طور پر کہیں نہیں ملتا۔ ایسی صورت میں جبکہ خواتین کا کلام ہی نہیں ملتا تو تقابل کیا ہو اور تقابل نہ بھی ہو تو کم از کم اسے تو تسلیم کیا جانا چاہیے تھا کہ خواتین نے شاعری کی ہے۔

ارسطو اپنی تصنیف "بوطیقا" میں کہتا ہے کہ (۱) فنون لطیفہ

اور شاعری کی ابتدا قدیم ترین ساحرانہ اور مذہبی رسوم سے ہوئی۔ (۲) شعر کہنے کا جذبہ ایک طرح کا جنون ہے (۳) جس کا محرک ایک قدسی جذبۂ تخلیق ہے (۴) شاعری کے ذریعہ دیوتا اپنا الہام لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ (۵) شاعری کی بنیاد حق اور صداقت پر ہونی چاہیے۔"

جہاں عورت ہزاروں پردوں میں چھپا کر رکھنے کی چیز سمجھی جاتی ہو، بے باکانہ اظہار تو درکنار اظہار ہی اس کے لیے جرم ہو، حجاب اور شرم و حیا اسی کے لیے بنائے گئے ہوں، اس کی آواز کوئی غیر سن لے تو سزائیں دی جائیں، وہاں عورت، جنون، قدسی جذبۂ تخلیق اور دیوتاؤں کے الہام کی ذاکر کیسے ہو سکتی ہے۔ اتنے جبر اور پابندیوں کے باوجود اس نے شاعری کی تو کمال کر دیا۔ یہ بات خود حیرت خیز ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اسے بھی شاعری کرنے اور شعر کہنے سے شغف ہے اور یہ پابندیاں نہ ہوں تو وہ شاعری کی بلندیوں کو چھو سکتی ہے اور ناانصافی نہ کی جائے تو آسمانِ شاعری کا درخشندہ ستارہ بھی بن سکتی ہے۔

مرد کے ہاتھ میں قلم ہے اور اس کی جانبداری کا رونا رونے سے بھی مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ پھر بھی مثالاً یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔

امیر مینائی اردو کے ایک مستند شاعر ہیں اور ان کا دیوان "صنم خانۂ عشق" بہت مقبول ہوا تھا۔ ایک ہی بحر میں ان کی دو غزلیں نظر سے گزریں جو کافی مشہور ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بوسہ بازی میں انھیں دھوکے دیے
لے گئے دش میش، دش گن کے لیے

پاک رکھا پاک دامن سے حساب
بوسے بھی گن کے دیے گن کے لیے

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنا ہیں ایک کم سن کے لیے

وصل میں جھنجھلا کے وہ بولے کہ ہائے
کن کا جوبن ہے اور کن کے لیے

حور یارب ہے جو مومن کے لیے
بھیج دے دنیا میں دو دن کے لیے

وصل میں بولے جھٹک کر ہاتھ وہ
پھول، پھل سب آج ہیں ان کے لیے

کیا شوخی اور بیباکی ہے، رنگین مزاجی کا نمونہ، عاشقی کا بانکپن، معاملہ بندی، خالص رنگ تغزل اور سب اسے چٹخارے لے لے کر پڑھتے ہیں میں بھی اسے تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن کیا عورت کو اس آزادی سے شاعری کرنے کی اجازت دی جائے گی۔ یہ تو خیر بہت بعید از قیاس ہے بعض خواتین کے حسب ذیل اشعار دیکھیے جنھیں آپ نے شاید ہی کہیں پڑھا ہو لیکن لکھنے والوں نے انھیں رکیک مبتذل، سوقیانہ اور فحش کہہ قرار دیا ہے، اشعار یہ ہیں:

قسمت میں ہماری نہ ہوا ہائے صد افسوس
ایک روز لپٹ کر شبِ مہتاب میں سونا ــــ دلبر

تم سے اللہ رکھے اپنی اماں میں تم تو ــ ذلیل
ہم سی پریوں کو بھی دیوانہ بنا لیتے ہو (کنیز سلطان شکوہ)

دختر رز سے رات صحبت تھی شیخ جی کا مگر وضو نہ گیا
ـــــــــــ یاسمین (کنیز سید انشا)

وصل کی شب ہوگا کیا حاصل ہمیں جو ناز سے
جب تلک تم بند کھولو گے سحر ہو جائے گی ــ فاطمہ بیگم کنیز

ان سے کہہ دو کہ ہمیں تم سے یہ امید نہ تھی
وعدہ ہم سے ہوا ہو غیر کے گھر وصل کی رات ــــ منی بائی حجاب

کچھ بے ادبی اور شبِ وصل نہیں کی
ہاں یار کے رخسار پہ رخسار کو رکھا ــ بیگم (دختر میر تقی میر)

لجا کر شرم کھا کر مسکرا کر دیا بوسہ مگر کچھ منہ بنا کر
ـــــــــــ گوہر

مندرجہ بالا اشعار سے ایک صداقت آمیز مطابقت پیدا ہوتی ہے اس لیے انھیں مخرب الاخلاق، رکیک اور مبتذل کہا جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ باتیں عورت کے منھ سے اچھی نہیں لگتیں۔ اگر مرد کی شاعری پر ایسا ہی اعتراض کیا جائے تو بزدلی کہلائے گی۔ صرف عورت پر معیار اور تعینات کی قید لگانا کسی خاص قسم کی تعلقاتی ذہنیت کی غمازی کرتا ہے۔ شاعری تو وجدان اور الہام ہے۔ قدسی

جذبۂ تخلیق ہے تو پھر وہ ایسی پابندیوں میں کیسے ہو سکتی ہے؟
آخر مرد عورت سے کس قسم کی شاعری کی توقع کرتا ہے، کیا وہ چاہتا ہے کہ عورت محض ایسی ہی بات کہے، ایسی ہی شاعری کرے جس سے اسے داد عیش لے، اس کی خواہشوں کی آسودگی ہو اور خود غرضی تسکین پائے۔

ناز برداری کرنے والا آخر اس کی روح کی گونج سننے سے کیوں کتراتا ہے، سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کا طلبگار اسے پس چلمن کیوں رکھنا چاہتا ہے، وارفتگی اور جنون میں اپنے دامن کی دھجیاں اڑانے والا تنہائی اس شعر کے مفہوم پر نظر کیوں نہیں ڈالتا۔

میں آپ دکھاتی تمھیں سو رنگ کے جلوے
تم حسرت دیدار کا اظہار نہ کرتے (ظریفہ)

تمام رکاوٹوں، پابندیوں، تنگ نظری، قدامت پرستی، بے مہری، حق تلفی اور ناقدری کے باوجود خواتین کی شاعری بلندی اور رفعت اثر اور دلدوزی سے خالی نہیں۔ اور یہ بڑی بات ہے۔
ہندی شاعری میں نرم مزاجی، دل بہلانے والی مٹھاس، جذبات کو چھونے والی سرخوشی، لگاوٹ کی چاشنی اسی لیے نمایاں ہے کہ اس میں جذبات، احساسات اور خیالات کا اظہار عام طور پر عورت کی طرف سے ہوتا ہے۔ عورت کے الفاظ میں تلخی اور کڑواہٹ تو ہو سکتی ہے۔ [illegible] اور طنز نہیں ہوتا جو محبت کی دنیا میں ممنوع ہے خاص طور سے شاعری اس کی حامل نہیں ہوتی۔
تحفہ نصرت (سید [illegible]) کا ایک شعر ہے ؎

مجھ کو تجھ سے [illegible] کا احساس ہے مگر
[illegible] تیرے پاس آ نہیں سکتی ہوں کیا کروں

اس شعر کی سادگی [illegible] کو تسلیم نہ کرنے والا [illegible] کہلائے گا۔ یہ اظہار [illegible] کی زبان میں کتنا [illegible] پر کیف بن گیا۔ سعید جہاں بیگم مخفی کا ایک [illegible] ملاحظہ کیجیے ؎

جنبش ستم سے نہیں یارائے خموشی مجھ کو
تم جو کچھ پوچھ لو مشکل مری آساں ہو جائے

اس ضمن میں شاعرات کے چند اشعار اور ملاحظہ کیجیے ؎

شب فرقت کی بیتابی سے میں واقف نہیں لیکن
کسی نے جیسے کانٹے رکھ دیے ہیں آج بستر میں (سعیدی)

خدا جانے کیا بات ہے اس میں مخفی
کہ اس ظلم پر دل کو بھاتا بہت ہے (مخفی)

کہا منصور نے سولی پہ چڑھ کر عشق والوں سے
یہ اس کے بام کا زینہ ہے آئے جس کا جی چاہے (جعفری)

جذبات کی رو میں مجھے معبود بنا کر
اے کاش تم اپنے کو گنہگار نہ کرتے (ظریفہ)

میرا مدعا یہ ہرگز نہیں ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان شعری تقابل ہو، یہ تو بہت بھونڈی بات ہوگی، میری تو خواہش یہ ہے کہ عورت کے دلی جذبات اسی کی زبانی سنوں، وہ منظر عام پر آئیں، اسی شدت سے بیان کیے جائیں اور عورت نڈر ہو کر اپنے دل کی بات کہنے کا حق پائے جو مرد کو حاصل ہے۔
حقیقت آشنا ہونے سے میری مراد یہ بھی نہیں کہ شعریت مفقود ہو جائے۔ چاند جب تک محض تصور تھا رومانی خیالات سے معمور تھا لیکن انسان اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا، اس کی سیر کی اور اسے ایک مردہ اور بے حس سیارہ پایا۔ لیکن اس سے محض زاویہ نظر تبدیل ہو گیا۔ نہ چاند نظروں سے گرا نہ شاعری کا اس سے رشتہ منقطع ہوا۔
اختر شیرانی نے نظموں کا ایک ڈرامائی سلسلہ شروع کیا تھا جس میں محبوبہ کو مخاطب کر کے عشق کا اظہار کیا گیا تھا اور پھر محبوبہ کی طرف سے جواب بھی انھوں نے خود ہی دیا، ایسی دو نظموں کے چند اشعار دیکھیے ؎

کبھی جو اٹھی ہو گیسو سنوارنے کے لیے
تو آئینے نے تمھیں ہم کنار دیکھا ہے
مگر مری نگہ شوق کو شکایت ہے
کہ اس نے تم کو فقط ایک بار دیکھا ہے
دکھا دو ایک نظر اور بس نگاہوں کو
دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو

اس کا جواب بھی ایک نظم کی صورت میں محبوبہ کی زبانی ہوا

دیا گیا ہے ۔

چلو وہ چاند نے دیکھا یہی سہی لیکن
کسی کا دیدۂ گستاخ وار کیوں دیکھے

ہمارا آئینہ کیوں ہمسر ہے ہم کنار نہ ہو
خدا نہ کردہ تمھیں ہم کنار کیوں دیکھے

یہ جرم کم ہے کہ اک بار ہم کو دیکھ لیا
کوئی شریر ہمیں بار بار کیوں دیکھے

لڑاؤں نہ کہیں بے سبب نگاہوں کو
قلم کو صبر سکھاؤ ادب نگاہوں کو

ان نظموں نے بڑی شہرت بھی پائی، لوگوں نے شوخی، شرارت اور چھیڑ چھاڑ، محبت کی نوک جھونک کو مزہ لے لے کے پڑھا لیکن یہ حقیقت سے دور تھیں، ان میں آمد نہیں تھی، لطافت، کسک، لگاؤ کا سچا رنگ حقیقی جذبات و احساسات مفقود تھے۔

عاشق، یا محبوبہ سے دلی وابستگی رکھنے والے شیدائی اگر یہ کہیں کہ ۔

غالب

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے:

گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

ہاں نہیں وہ وفا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

مومن

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے مجبور جی سے ہم

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

یہ عذر امتحان جذبِ دل کیسا نکل آیا
میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو
عذر کچھ چاہیے ستانے کو

ایسے اشعار عورت بھی تو کہہ سکتی ہے۔ عورت اپنی بات خود کہے گی تو ایسے نغمے ابھریں گے جن سے روح آسودہ ہوگی، سختیاں جھیلنے کی ہمت پیدا ہوگی۔ دل کی دھڑکنیں اپنی روش پائیں گی۔ رسمی اور مصنوعی عشق کے بجائے آدم، مجنوں اور فرہاد کے دل اپنی حوا، لیلیٰ اور شیریں کے لیے دھڑکیں گے، بوالہوسی کی موت ہوگی اور احمد ندیم قاسمی کی ایسی شاعری سامنے آئے گی ۔

انداز ہو بہو تری آوازِ پا کا تھا!
باہر نکل کے دیکھا تو جھونکا ہوا کا تھا

یا پھر شاعر لکھنوی کا شعر ابھرے گا ۔

نظر اٹھا کے جو دیکھا تو بھول تھی وہ نگاہ
نظر جھکا کے جو دیکھا تو زخم گہرا تھا

مرد کے لیے عورت کے احساسات راز سربستہ تو نہیں پھر بھی بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو عورت خود کہے تو وہ زیادہ سچی اور موثر بن جاتی ہیں۔ عورت جس کے الفاظ میں لطافت، سادگی، دل بستگی، دلبری اور طلسم، خود شاعر کو نظر آتا ہے، جب خود زبان کھولے اور اپنے جذبات بے باکانہ طور پر بیان کرے تو ایسی دل کشی اور سحر سامنے آئے گا جس سے ادب بھی پروان چڑھے گا، اور مالا مال ہوگا۔

وہ خون جسے شاعری کے جسم میں دوڑنے سے روکا گیا۔ اسے اگر بے روک ٹوک دوڑنے دیا جائے تو کچھ حاصل ہی ہوگا۔ نئے زاویے ہی ابھریں گے جن کی ہر ادب کو ضرورت ہوتی ہے اور اردو ادب کو بھی ان کی بہرحال ضرورت ہے۔

★

بیکل اتساہی
بلرام پور (یوپی)

گیت

چڑھی جوانی لوٹ لے گئی ہرے کھیت کھلیان
ہوے جب بن بگیا ویران ـــــ تو ندیا اتر گئی
نیل گگن سے لگن لگائے ساگر کی دیوانی
آنچل سے طوفان بکھیرے پربت کی بھورانی
جدھر جدھر تو اونچ نیچ سب کرتی ایک سمان
تباہی بن گئی اطمینان ـــــ تو ندیا اتر گئی
پہلے اپنے امرت رس سے فصلوں کو نہلائے
پھر کیوں جانے تال تلیاں زہریلی کر جائے
جانے کس کی چاہ ہے اس کو کیا چاہے نادان
موم سی ہو گئی ہر اک چٹان ـــــ تو ندیا اتر گئی
دروازوں کی تُرپّا جب ہلا گئی زنجیریں
گلیاروں میں مسکاتی گھٹا کی پھینک گئی تصویریں
چوپالوں میں ڈبو گئی سب دھرموں کا احسان
لگا جب جیون اک تاوان ـــــ تو ندیا اتر گئی
گاؤں کے چہرے زخمی ہو گئے شہر کی ٹوٹی باہیں
چوراہے مفلوج ہو گئے لنگڑی ہو گئیں راہیں
آبادی لاشوں جیسی ہے جل کھمبھی انسان
ہوئے چُپ گیتا اور قرآن ـــــ تو ندیا اتر گئی

کشور سلطانہ
۱۳۹۷۔ محلہ افغانان، کرتپور (بجنور)

پیار، یکجہتی

یوں آج تعصب کے اندھیروں کو مٹاؤ
مل جل کے رہو پیار کی قندیل جلاؤ

جو امن کے دشمن ہیں فسادات کے بانی
اُن کو بھی اہنسا کا چلن آج سکھاؤ

تعمیرِ چمن کے لیے ایثار ہے لازم
تخریب پسندوں کے فریبوں میں نہ آؤ

اللہ کے نزدیک ہر انساں ہے برابر
تفریق تو لعنت ہے یہ تفریق مٹاؤ

ہو شیخ کے کاندھوں پہ برہمن کا جنازہ
اربابِ وطن اپنی روش ایسی بناؤ

یہ دیش ہے جنّت اسے دوزخ نہ بنائیں
ہر مسلم و ہندو کو یہ پیغام سناؤ

نفرت جو کرو گے نفرت ہی ملے گی
آئین یہ کہتا ہے جیو اور جلاؤ

جو درس محبت کا ترنگے میں نہاں ہے
کشور اسے تم راہنما اپنا بناؤ

ڈاکٹر اختر بستوی
گورکھپور یونیورسٹی گورکھپور

میری راتوں کی بے خوابی

ہوا کرتے ہیں اہلِ شہر میں (اپنوں میں غیروں میں)
مری راتوں کی بے خوابی پہ اکثر تبصرے اکثر
جدا اس مسئلے پر اپنی اپنی رائے ہے سب کی
کہ آخر کس سبب سے جاگتا رہتا ہوں میں شب بھر
کوئی کہتا ہے اس کی تہہ میں ہے اک نیم پاگل پن
جو مجھ کو نیند کی راحت سے کر دیتا ہے بیگانہ
جو میرے ذہن میں چھپتا ہے بن کر نیشِ بے خوابی
جو زہرِ کرب سے بھرتا ہے میرے دل کا پیمانہ
کوئی برعکس اس کے، یہ کہا کرتا ہے لوگوں سے
کہ بے خوابی سے ہر شب خود کو میں سرشار رکھتا ہوں
یہ میرا جاگنا بھی ایک اندازِ تعیش ہے
میں اس سے عیش کے احساس کو بیدار رکھتا ہوں
کوئی اس رائے کا اظہار کرتا ہے کہ دل میرا
سکوں ناآشنا ہے مبتلا ہو کر محبت میں
سکوتِ شب میں جب محبوب کی یادیں ابھرتی ہیں
تو بے تابی بدل جاتی ہے بے خوابی کی صورت میں

مگر یہ ساری وجہیں میری بے خوابی کی ' ہیں فرضی
حقیقت کیا ہے، میں خود ہی زمانے کو بتاتا ہوں
مجھے جو بات اکثر صبح تک بے خواب رکھتی ہے
اسے اظہار کی نیت سے لب تک آج لاتا ہوں

یہ دشواری ہے میری، میں نہیں اُن عام لوگوں میں
کہ جن کے سامنے بس جسم اور اس کے مسائل ہیں
مری کلفت نہیں محدود جسمانی اذیت تک
دماغ و روح بھی مرہم طلب کرتے ہیں، گھائل ہیں
میں دن بھر جسم کی راحت کا بندوبست کرتا ہوں
پھر اس کے بعد ہو جاتی ہے فرصت شب کو جب حاصل
تو مجھ کو ذہن کی آسودگی کا دھیان آتا ہے
یہ دُھن ہوتی ہے پاؤں روح کی تسکین کی منزل
نکل کر دہر کے پُر شور ہنگاموں کے گھیرے سے
سمٹ جاتا ہوں علم و فن کی فرحت بخش بانہوں میں
بہارِ حسنِ اوراقِ کتب نظروں میں بستی ہے
خیالوں کی حسیں دنیا سماتی ہے نگاہوں میں
فضاؤں پر خموشی رات کی، ہوتی ہے جب طاری
کھلے دل سے کتابوں کے سمندر میں اترتا ہوں
نہ جانے کتنے موتی دانش و حکمت کے ملتے ہیں
جنھیں میں کر کے یکجا، ذہن کی جھولی کو بھرتا ہوں
کتابوں کے علاوہ شاعری سے عشق ہے مجھ کو
جو رات آنے پہ اپنے حسن کا جادو جگاتی ہے
جو شب کی ساعتوں میں سیکڑوں دلکش اداؤں سے
خیال و فکر کی رعنائیاں مجھ کو دکھاتی ہے
پھر اس کے بعد چڑھتا ہے جنوں یوں شعر گوئی کا
کہ حالت صبح تک میری، ہوا کرتی ہے سیمابی
یہ دونوں شوق ذہن و روح کو کرتے ہیں آسودہ
مگر دیتے ہیں اس کے ساتھ یہ راتوں کی بے خوابی

سید اظہر حسین ہاشمی
نعمت اللہ روڈ امین آباد۔ لکھنؤ

ذوقِ عمل

یہی کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

کسی حکیم دانا کا مقولہ ہے کہ تم خوشحال زندگی بسر کرنے کے خواہشمند ہو تو کام پر لگ جاؤ اور ناموری کی آرزو ہے تو "کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شدی" پر عمل کرو۔ کسی کام میں امتیاز پیدا کرنے سے ہردلعزیزی بھی حاصل ہوتی ہے اور شہرت بھی۔ کام کا آغاز اس کی تکمیل کی بنیاد اور کامیابی کی تمہید ہے۔ صرف محنت اور کام سے ہی آسودگی اور رفعت حاصل ہوتی ہے اور بس۔ انسان کی تخلیق کیوں ہوئی -؟ اس کی تخلیق میں قدرت کا یہی منشا رہے کہ وہ جد و جہد کو اپنا سرمایۂ حیات بنالے۔ انسانیت کے تمام رشتے ہمدردی، اخوت، نیکی اور خدمت محض اسی جد و جہد سے مربوط ہیں۔ جو لوگ محنت اور عمل سے دور دور رہتے ہیں ان کا عالمِ انسانیت سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ زندہ رہنا ہے تو جد و جہد کرو اور کام پر لگ جاؤ۔

ایک محنت کش کی زندگی جس آسودگی اور مسرت سے بسر ہوتی ہے وہ عیش پسند کو کہاں نصیب؟ جس کو تعیش کے سارے سامان فراہم نہیں وہ لطفِ زندگی کیا جانے؟ دراصل انھیں کی زندگی صحیح معنوں میں زندگی ہے جو موجِ حوادث سے ہنس کھیل کر گذرنا جانتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر ساری آسانیاں انھیں فراہم ہوں تو زندگی گزارنا دشوار ہو جائے۔ یہ کام اور عمل ہی کا فیض ہے جو انسان کو مہذب بناتا ہے اور اس کے مستقبل کو سنوارتا ہے۔ باعمل و باکار شخص خود اپنی زندگی کا بین ثبوت ہے اور بے عمل زندگی اس کے عدم کی علامت ہے۔ ایک کاہل الوجود نکمے اور مردہ میں کیا فرق ہے۔ کوئی فرق نہیں بجز اس کے کہ مردہ کی سانسوں کی آمد و رفت کا سلسلہ منقطع ہے اور اس نام نہاد زندہ کی سانسیں جاری ہیں۔ ورنہ حیثیت دونوں کی ایک جیسی ہے۔ مردہ کام کرنے کے قابل نہیں اور یہ زندہ کسی کام میں ہاتھ نہیں لگاتا۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ ہر اک اپنی ہی پسند کا کام سوچتا اور اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ اس میں اس کا طبعی رجحان شامل ہوتا ہے۔ یہی طبعی رجحان ذوقِ عمل میں بدل جاتا ہے۔ ذوقِ عمل سے استعداد اور صلاحیتیں از خود ابھر آتی ہیں۔ اسی ذوقِ عمل نے گمناموں کو نامور، مزدوروں کو تاجور اور غلاموں کو تاج و تخت کا وارث بنا دیا۔ یہ ماضی کے اس تاریک زمانہ کا ذکر ہے جب وسائل محدود، راستے مسدود اور سفر مخدوش تھے۔ دور دراز کے سفر جوئے شیر لانے سے کم نہ تھے۔ انھیں نامور اور تاریخ ساز شخصیتوں میں کولمبس ہے۔ واسکوڈی گاما ہے۔ جارج اسٹیفنسن ہے

جن نے بھاپ کے انجن سے ریل چلائی۔ انھیں شخصیتوں
میں آڈیسن، ابوریحان البیرونی اور نپولین ہیں جن کے
کارہائے نمایاں تاریخ میں مثل آفتاب کے درخشندہ رہیں گے۔

ہم انھیں ناموروں میں سلطان ظہیر الدین بابر کو بھی شمار
کرتے ہیں۔ یہ اس کے ذوق عمل ہی کا کرشمہ تھا کہ وہ کیسے
کیسے دشوار گزار راستوں کو روندتا، کیسے کیسے پرزور دریاؤں
کو عبور کرتا اور کیسے کیسے پرہول دروں سے گزرتا ہوا آیا؟
جب سرحدی پٹھانوں نے اس کے لشکر کو دیکھا تو تعجب میں
پڑ گئے۔ ان راستوں سے اس سے قبل کوئی نہ گزرا تھا۔

ذوق عمل کا اس کے ساتھ ساتھ دوسرا پہلو بھی ہے۔
وہ اس سے بھی زیادہ حیرت زدہ کرنے والا ہے۔ ایک حملہ آور
تو کامیاب ہو سکتا ہے لیکن ایک شکست خوردہ کو فتح یاب کرنا
اسی ذوق عمل کا فیض ہے۔ اس کی مثال بابر کا بیٹا ہمایوں ہے۔
وہ جنگ میں شیر شاہ سوری کے مقابلہ کی تاب نہ لایا اس نے پسپا
ہو کر راہ فرار اختیار کی۔ اور ایران پہنچا۔ اس نے وہاں ایک فوجی
بیڑا تیار کیا اور پھر چڑھائی کی۔ شیر شاہ فوت ہو چکا تھا اس کا بیٹا
تخت نشین تھا مگر اس کی فوج ہمایوں کی فوج کی بے جگری کا مقابلہ
نہ کر سکی اور بھاگ کھڑی ہوئی اس طرح ہمایوں کو اپنا کھویا ہوا
تخت واپس مل گیا۔ گویا ذوق عمل ایسی قوت ہے کہ کوہ گراں
تک زیر و زبر ہو جاتے ہیں۔

پس منزل پر پہنچنے کے لیے آغاز سفر شرط ہے ؎

یاران تیز گام نے منزل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

حسن و قبح سے واقفیت! کسی کام کے شروع کرنے سے
پہلے اس کے حسن و قبح جان لینا ضروری ہیں۔ اس کی خوبیاں
اور قباحتیں معلوم ہو جانے سے راہ کی دشواریوں اور پیچیدگیوں
سے نپٹنے کے لیے طبیعت میں زور پیدا ہو جاتا ہے ورنہ برخلاف
اس کے بغیر حسن و قبح سے واقفیت کے کوئی مشکل پیش آ جائے تو
جی چھوٹ جاتا ہے اور تذبذب پیدا ہو جاتا ہے۔ تذبذب سے
آسان سے آسان کام تک مشکل نظر آتا ہے۔ اگر ضرورت ہے
تو کسی دانشور سے مشورہ کر لے۔ لیکن سوچ بچار، غور و خوض اور
مشورہ میں اتنا وقت نہ صرف کر دے کہ تضیع اوقات کے مترادف
قرار پائے۔

جہاں تک دوسرے مشورہ کا تعلق ہے یہ ہر ایک کو سازگار
نہیں آتا۔ اس لیے کہ دوسرا شخص کسی کی خوبی یا خامی، جرأت یا
احساس کمتری، استعداد یا عدم صلاحیت کیونکر جان سکتا ہے۔
جب ان سب امور سے واقف نہیں تو وہ صحیح مشورہ دینے سے
قاصر رہتا ہے۔ لہٰذا اگر مشورہ کرنا ہے تو اپنے ضمیر ہی کو مشیر
بنائے۔ اس سے زیادہ اندرونی اور بیرونی خوبیوں اور خامیوں
سے کون واقف ہے۔ بس اپنے ہی ضمیر کی آواز پر لبیک کہے
یا گریز اختیار کرے۔ یہی طریقۂ عمل ازمنۂ ماضی سے اس وقت
تک نامور شخصیتوں کا رہا ہے۔

دیگر محاسن! عمل کرنے والوں کو دوسروں کے عیب
یا غیبت سے سروکار نہیں ہوتا۔ ان کے پاس وقت کہاں کہ ان
باتوں میں جان کھپاتے پھریں اور نہ ان کے پاس اتنی مہلت کہ
کسی صدمہ کی تکلیف یا کسی سانحہ کے غم کا احساس بہت دنوں
تک کرتے رہیں۔ باعمل اور باکار شخص ان سب باتوں سے محفوظ
رہتے ہیں۔

بے کار اور بے عمل زندگی گزارنے والوں کے بہانے دلچسپ
ہوتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ ہمارے کام کرنے کا وقت ابھی نہیں
آیا۔ کبھی حالات کی ناسازگاری کا کبھی شومیٔ قسمت کا رونا روتے
ہیں اور کبھی کہتے ہیں کہ یہ خدا کو منظور نہیں۔ اس سلسلہ میں ایک
بہانہ باز حیلہ جو کا لطیفہ نظر سے گزرا۔

ایک شخص دریا سے خوف کھاتا تھا۔ کشتی پر اس لیے
سفر نہ کرے مبادا منجدھار میں جا کر غرقاب ہو جائے۔ یا
دریا تک میں ڈرتا تھا کہ [illegible]

غزل کے ایک گمنام شاعر

خسرو کاکوروی

شمالی ہندستان کے قصبات عموماً اور صوبہ اودھ کے خصوصاً اپنی مردم خیزی، علم دوستی اور فن پروری میں ہمیشہ سے مشہور رہے ہیں۔ ان قصبات میں کاکوری کو جو امتیاز حاصل رہا ہے وہ قطعاً محتاج بیان نہیں۔ اس قصبہ کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو ایک سے بڑھ کر ایک دانشور، مستغنی اور صاحب قلم و صاحب سیف نظر آئیگا۔ اہل تصوف، علماء و فضلا اور صاحبان کمال کی ایک طویل فہرست ملے گی جن میں اکثر و بیشتر عظیم شخصیتیں گمنامی کے گوشے میں رہیں۔ دنیا کے دوسرے فضلا و ماہرین کی طرح شعرا میں بھی ہزاروں ایسی ہستیاں گذری ہیں جو اگر آغوش گمنامی سے باہر آسکی ہوتیں تو آج ہماری زبان و ادب کے خزانے میں بیش بہا جواہرات کا اضافہ ہو جاتا۔

منشی سراج الدین صاحب خسرو کاکوروی بھی ایسی ہی باکمال ہستیوں میں سے تھے کہ اگر ان کا کلام منظر عام پر آ گیا ہوتا تو وہ اپنے دور کے ایک عظیم صاحب طرز شاعر شمار کیے جا چکے ہوتے۔ زیر نظر مضمون میں ان کی حیات کا ایک مجمل خاکہ اور ان کی شاعری کا ایک مختصر تجزیہ پیش کرنا ہے۔

حضرت خسرو کا عہد کاکوری کا روشن و زریں دور تھا۔ ایک طرف ایک نامور شاعر، شاعر جدید نظم کی داغ بیل ڈالنے والے ... و نادر علی خاں نادر کل ہند شہرت حاصل کر چکے تھے، منشی فخر الدین کیفی، مقصود احمد ... صاحب حال و صاحب علم و دانش تشکیل کردار اور اصلاح نفس کے اہم کام میں مشغول تھے۔ خانقاہ کاظمیہ کی وجہ سے کاکوری کی عام ادبی، ذہنی اور روحانی سطح اتنی بلند تھی کہ جہاں کی ہمنشینی نے ذرہ ہائے خاک اور غبار راہ کو بھی ذوق جمال عطا کرکے انھیں خاک سے پاک کیا اور ہر خاک نشیں و خاک بسر یہ کہتا ہوا نظر آیا ؏

کیمیا ئیست عجب بندگیٔ پیر مغاں
خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند

حالات زندگی :-

حضرت خسرو آج سے ایک صدی قبل ۳ر جولائی ۱۸۸۳ء کو کاکوری میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد منشی تاج الدین صاحب عربی اردو و فارسی کے ایک زبردست صاحب حال و صاحب دیوان شاعر تھے۔ جنھوں نے عارفانہ و متصوفانہ تصورات کو اپنے کلام میں رچ بس دیا۔ حضرت خسرو نے ابتدائی تعلیم و تربیت اسی خانقاہ کاظمیہ میں حاصل کی جس نے بارہویں صدی ہجری سے اب تک مسلسل ایسے علمائے حق شناس و صوفیائے کاملین پیدا کئے ہیں جن کے نعلین کی خاک کو لوگوں نے کحل البصر بنایا۔ ان کا پورا خاندان اسی میخانۂ عرفان سے وابستہ تھا۔ حضرت قطب الاقطاب مولانا حافظ شاہ علی انور قلندر قدس سرہٗ کے روبرو زانوئے تلمذ تہ کیا۔ عربی و فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کی۔ انھیں کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ انگریزی تعلیم میٹرک تک حاصل کی۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد بغرض ملازمت حیدرآباد دکن گئے

وہاں تحصیلدار ہوگئے۔ غیر معمولی استعداد و صلاحیت کی بنا پر جلد ہی دوم تعلقدار اور بعد ازاں اول تعلقدار گلبرگہ ہوگئے۔ آگے چل کر اپنے حسن انتظام، لیاقت ذاتی اور عوام میں ہر دلعزیزی نیز ذہانت بیدار مغزی کی بنا پر نظام دکن کے معتمد و مشیر خاص ہوگئے۔ نظام نے نواب حسین نواز جنگ بہادر کے خطاب سے نوازا اور خلعت و کلغی جو شاہان آصفیہ کے یہاں کا سب سے بڑا اعزاز تھا عطا کیے دکن میں کافی عرصہ بڑی آن بان سے رہے سیکڑوں کو فائدے پہنچائے بکثرت حاجت مندوں کی حاجت روائی ایسی کی کہ انھیں کوتاہی دامن کا شکوہ کرنا پڑا۔

لیکن بعد میں کچھ ناگفتہ بہ حالات کی وجہ سے مزاج میں تکدر پیدا ہوا اور وطن واپس آگئے پھر یہیں قیام کیا۔ مئی ۱۹۳۵ء میں دفعتہً شاداں و فرحاں عالم ناسوت کو خیرباد کہہ گئے اور اس شعر کی شرح مفصل بن گئے ؎

نکہت روحی یاروں کو دکھلاؤں میں
کر بو ہو کے غنچے سے اڑ جاؤں میں

حضرت خسرو گلشن کاظمیہ میں مہکے، چہکے دہکے، دنیوی عروج جاہ و حشم سے ہمکنار ہوئے اور جب ہر قسم کی دولت و ثروت اور عزت کا مزا چکھ کر نیستی و پستی کی طرف ڈالے گئے تو ملامت، غربت اور تنگ دستی شریک قسمت بنی اور اس طرح تمام زندگی کے نشیب فراز سے دوچار ہوئے۔ نفس کی رہی سہی تمام کثافتیں دور ہوئیں۔ آئینہ دل کے زنگار پر صیقل ہوئی۔ اور احساس خودی کے شیشے چور چور ہوگئے۔

اس لیے کہ بقول اقبال ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

جب قلب شکستہ پیمانہ شکستہ بن گیا تو ساقی کو عزیز ہو گیا اور وہ بھی حسب کی زبان میں پکار اٹھے ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی   اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

تمام عمر ولی میار و دست نگار کا نمونہ رہے۔ اس دور ابتلا میں بھی نگاہ ایک ہی کج کلاہ سے لڑی رہی کہ تمام دنیا کو ترچھی نگاہ سے دیکھا کئے گویا اپنے اس شعر کی شرح مفصل بنے رہے ؎

جب سے لڑی ہے آنکھ مری کج کلاہ سے
عالم کو دیکھتا ہوں میں ترچھی نگاہ سے

شاعری

حضرت خسرو نے اپنے والد سے ورثہ میں ملکۂ شاعری پایا۔ حافظ کاظمی کی خادمیت اور حلقہ بگوشی کے بعد شاعری نکھری اور ایسی سنوری کہ مشاطۂ سخن کو مختصر سی آرائش خم کاکل کی ضرورت پڑی۔

رندی و سرمستی، بودگی و ہوشمندی، بیخودی و بیداری، سادگی و پرکاری وغیرہ تو صاحب غزل کی روح کی خصوصیات ہیں۔ جب یہی مزاج شاعری اشعار کے قالب میں سج سجا کر منصۂ شہود پر جلوہ آرا ہوتا ہے تو وہ سامع نواز بن کر تخیل کے لیے جنت نگاہ و فردوس گوش بن جاتا ہے یہ خیالات کی رنگینی اور الفاظ کا داخلی و خارجی آہنگ۔ جب ہیئت و خیال سے ہم آغوش ہوتا ہے تو شعر دل میں تیر کی طرح در آتا ہے۔

حضرت خسرو کے کلام میں یہ تمام محرکات بدرجۂ اتم موجود ہیں ان کی شاعری کے موضوعات محبت الہی و عشق رسول، حسن و عشق کی شیریں داستان، عاشق و معشوق کے رموز و کنایات اور حقائق و معارف کے دقیق ترین مسائل کو سلیس اور عام فہم آسان زبان میں پیش کرنا ہے وہ اس خانقاہ عالم پناہ سے وابستہ و منسلک تھے جس کی تعلیمات کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ ؎

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

اسی لیے ان کے کلام میں سرمستی و ربودگی کا ایک سحر زار نظر آتا ہے۔ حقائق و معارف کے باریک سے باریک نکتے اور تصوف کے دقیق مسائل اندر ہی اندر حل ہوتے جاتے ہیں۔

کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بات آزادی و فکر و نظر کی ہو یا فرحت و سرور اور انشراح و انبساط کی شعریت اور تغزل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔

کلام میں فقر و حسرت کے مضامین تصوف و غزل۔ جگر کی سرمستی جوش کی شکوہ لفظی میر و فانی کا سوز، جلیل کی شوخی، سبھی کچھ ملتے ہیں وہ در حقیقت ایک عارف باللہ تھے جن کا کلام اگر ایک طرف رموز معرفت و حقیقت سے معمور ہے تو دوسری طرف فن شاعری کی لطافتوں اور ندرتوں سے مزین ہے۔

ان کے کلام میں ان کی پوری شخصیت جلوہ گر ہے مرشد برحق نے نسبت حبی سے نوازا تھا اور اپنے صاحب زادہ عالی مقام حضرت مولانا شاہ حبیب حیدر قلندر قدس سرۂ (ف جون ۱۹۳۵ء) اور خسرو کی روح کو ایک کر دیا تھا۔ چنانچہ تمام عمر ایک جان دو قالب بنے رہے جو سراپا ناز تھا اس کے ناز منتھی رہے اور اس سے خوب خوب جا و بیجا ناز و نخرے بھی اٹھوائے ہمنشیں کے حسن و جمال ظاہری و باطنی نے حضرت خسرو کے کلام کو فرش سے عرش پر پہنچا دیا نسبت حبی نے کلام میں بے پناہ سوز و گداز پیدا کر دیا۔ نایافت کے احساس نے اشعار کو ایسا پرسوز بنا دیا کہ سننے والا اور پڑھنے والا تڑپ اٹھتا۔ اپنے عشق کی چنگاری سے خام دلوں میں بھی محبت کی آگ بھڑکا دی اور ان کو گدازی قلب کی دولت نایاب سے ہمکنار کیا ہے۔

دود آہ سینۂ سوزانِ من سوخت ایں افسردگان خام را

مندرجہ ذیل غزل میں حضرت خسرو کے واردات قلبی ملاحظہ ہوں۔

چاند ہے وہ رخ زیبا ہی نہیں کوئی بھی دیکھنے والا ہی نہیں
آنکھوں ہی آنکھوں میں پی لیتا ہوں جام سے ہاتھ سے چھوتا ہی نہیں
اڑ گئی ہاتھ سے رنگت قاتل اپنے خوں کا مجھے دعویٰ ہی نہیں
آئینہ حسن کا میں بن جاتا آپ نے بزم میں دیکھا ہی نہیں
جان میری ہو اداؤں پر نثار تم نے صدقہ تو اتارا ہی نہیں
بے وفا ہو کے سنورتے کیا ہو تم نے خسرو کو سنوارا ہی نہیں

ابتدا میں انھوں نے مولوی شریف الدین صاحب مسلوی شریف کاکوروی (متوفی ۱۹۱۶ء) سے اصلاح سخن لی۔ کچھ غزلیں والد گرامی نے ملاحظہ فرمائیں۔ حیدرآباد کے دوران قیام کچھ غزلوں میں حافظ جلیل حسن جلیل مانکپوری (م ۱۹۴۶ء) سے بھی اصلاح لی تھی۔ استاد سے شوخی معاملہ بندی، حسن و عشق کی نوک جھونک سیکھی۔ سچ پوچھیے تو جلیل کا اصلی رنگ ان کے شاگردوں میں نمایاں طور پر انھیں کے کلام میں جھلکتا ہے۔

غزل کی تمام رعنائیاں، اس کے جملہ موضوعات وہ رندی ہو کہ عاشقی، وہ واعظ و مولوی پر طنز خفی و جلی ہو یا تصوف کے دقیق مسائل سب حضرت خسرو کے کلام میں اپنے تمام فنی محاسن کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات اور ان کا منفرد طرز ادا ان کی انفرادیت کے مظہر ہیں۔ وہ بے نیاز رنگ دنیا رہے۔ اسباب ہستی کو لٹاتے رہے سیم و زر کی وقعت ان کی نگاہ میں کوڑیوں سے بھی کم تھی۔ جب دنیوی عروج کی معراج پر پہنچے تو بھی دل کو اسباب ہستی سے یکسر فارغ رکھا اور اپنے کو الفت محبوب میں غرق کر دیا۔ پھر جب سیلاب محبت اٹھا تو ہستی کی ہر شے کو بہالے گیا اس بے اگنی میں صرف ایک محبت ہی رفیق سفر رہ کر ہستی کو فروزاں و شعلہ فشاں کرتی رہی اسی حالت سرمستی و بیخودی کی ایک غزل ملاحظہ ہو۔ مقطع کا شعر شاعرانہ تخیل سے بالاتر اور حضرت خسرو کے اس اصلی حال کا مکمل آئینہ دار ہے جو وقت وفات تھا۔

جنوں خیز وحشت کا ساماں کریں گے
گریباں میں پیدا گریباں کریں گے
قفس میں نشیمن کا رونا ہی کیا ہے
چھٹیں گے تو رہنے کا ساماں کریں گے
الجھتے ہیں الجھا کریں خار صحرا
ہم اب لے کے کیا جیب داماں کریں گے
رہی ضد اگر بخیہ گر کو اسی کی
تو ہم اور پرزے گریباں کریں گے
دم تیغ عریاں سے زندہ رہیں گے
تجھے آج قاتل پشیماں کریں گے
وہ کہتے ہیں کوئی جو چھیڑے گا ہم کو
تو ہم اپنی زلفیں پریشاں کریں گے
گلے پر چھری جن سے پھرتی نہیں ہے

مری مشکلیں کیا وہ آساں کریں گے
اگر نیند آئے تو سو جاؤ خسرو
وہ جلوے دکھائیں گے حیراں کریں گے

اللہ جمیل و یحب الجمال (اللہ تعالیٰ خود حسین ہے اس لیے حسن و جمال کو محبوب رکھتا ہے) کے مصداق حسن ظاہری سے بھی ایسے نوازے گئے تھے کہ دیکھنے والے دیکھا کرتے۔
اللہ اللہ وہ جمال دلفریب   دیکھئے ایسا کہ دیکھا کیجئے
(خسرو)

حسن خداداد کی بنا پر مزاج میں نفاست و نزاکت بھی بلا کی تھی اپنی ایک غزل میں اپنی شخصیت کا تجزیہ یوں فرما رہے ہیں۔ جذبات عشقیہ کی تکمیل ہر ہر شعر میں اپنی جھلک صاف دکھا رہی ہے۔

مجھ سے پوچھے نہ کوئی شرح محبت میری
نکہت گل سے بھی نازک ہے طبیعت میری

حسن کے دل سے کوئی پوچھے عظمت میری
عشق ہوں عشق حقیقت ہے حقیقت میری

اے خدا بخشے تو سب غم کو نہیں مجھے
دیکھے حسن جفا کار بھی ہمت میری

جس نے دیکھا ہو تجھے تیرے سوا کیا دیکھے
کس قیامت کی ہے اللہ ری غیرت میری

جانتا ہوں ترے حسن چمن آرا کی بہار
کارفرما ہے محبت ہی محبت میری

جان جائیگی مری آپ بھی رسوا ہوں گے
محفل غیر میں زیبا نہیں شرکت میری

کیا کروں گا مے و معشوق سے خسرو توبہ
کبھی بھرتی نہیں کمبخت یہ نیت میری

عاشق و معشوق کے درمیان راز و نیاز اور مکالمت کی اکثر مثالیں شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہیں حضرت خسرو کی بھی ایک غزل نمونۃً پیش ہے جو بالکل اپنی نوعیت کی انوکھی ہے۔

اُس نے کہا ہستی تری میں نے کہا جلوہ ترا
اُس نے کہا پھر تیغ میں نے کہا پھر وار ترا
اُس نے کہا شام بلا میں نے کہا گیسو ترے
اُس نے کہا صبح صفا میں نے کہا چہرہ ترا
اُس نے کہا باران غم میں نے کہا رونا مرا
اُس نے کہا برق ستم میں نے کہا ہنسنا ترا
اُس نے کہا کس سے گلہ میں نے کہا تقدیر سے
اُس نے کہا تقدیر کیا میں نے کہا منشا ترا
اُس نے کہا دل لے گیا میں نے کہا ہاں لے گیا
اُس نے کہا وہ کون تھا میں نے کہا غمزہ ترا
اُس نے کہا خسرو کہاں میں نے کہا تیرے یہاں
اُس نے کہا وہ کون ہے میں نے کہا شیدا ترا

٭ ٭ ٭

مندرجہ ذیل غزل میں حضرت خسرو کے واردات قلب ملاحظہ ہوں۔

گل کے مرجھانے پہ بھی گل کی وہ نکہت نہ گئی
مٹ کے دل خاک ہوا دل سے محبت نہ گئی

اپنے جلوے میں ہوئے محو تماشا ایسے
آئینہ اٹھ بھی گیا آپ کی حیرت نہ گئی

تو یہ کیا کرتا جینے کا مزا جاتا تھا
دل سے میرے مے و معشوق کی چاہت نہ گئی

دل سے رخصت ہوئے ہوش و خرد و صبر و قرار
نہ گئی ہائے مگر اک تری چاہت نہ گئی

مرمٹے ہم مگر اس شوخ کا بدلا نہ مزاج
جور کی خو نہ گئی ظلم کی عادت نہ گئی

اپنی تقدیر کو دونوں میں کہاں تک خسرو
نہ مٹی دل کی تڑپ شومئی قسمت نہ گئی

٭

حضرت خسرو محبت اہل بیت سے سرشار ہیں جس کے آئینہ دار ان کے مرثیے اور بارگاہ حسینیؑ میں سلام عقیدت ہیں۔ ان کے مرثیوں کی امتیازی شان یہ ہے کہ جہاں ایک طرف دلسوزی و پرسوز بین پایا

[illegible] بارگاہ حسینی میں
ایک سلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کر جو قربان گُہر لعلِ دکھائیں شبیرؑ
چاہتے تھے خاک کو اکسیر بنائیں شبیرؑ

خواب راحت میں دکھا کر مجھے جلوہ اپنا
میری سوئی ہوئی تقدیر جگائیں شبیرؑ

کھل جاتی ہیں ان آنکھوں سے نگاہیں میری
آپ حسن کی نیچے کو بلائیں شبیرؑ

دیکھ لیں مست نظر سے جو سر بزم مجھے
کر دیں مدہوش مرے ہوش اڑائیں شبیرؑ

نازِ خسروؔ کو محبت پہ ہے قسمت پہ نہیں
روٹھا بیٹھا ہے اُسے آکے منائیں شبیرؑ

حضرت خسروؔ کے کلام میں واعظ و مولوی پر طنز خفی و جلی کا بیان بھی بڑے شوخ پیرایہ میں ملتا ہے۔

حضرت واعظ کو متنبہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

خود ہوئے ہو خلد ہو واعظ کہیں ملتی ہے جبّہ سائی سے
میخانہ میں آئے ہیں واعظ تو سمجھئے
ورنہ یہاں نہ آئیے شیخی بگھارنے

جناب شیخ کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو:

کیا لطف میکدہ میں جو آجائیں شیخ جی
وہ سر ہلائیں ہیں کہوں تھوڑی جناب دو

حضرت خسروؔ کے کلام میں تصوف کے مضامین بھی موجود ہیں

کثرت میں نظر آتی ہے وحدت تیری
ہر آنکھ سے پنہاں نہیں قدرت تیری
ذرہ ہو کہ مہتاب کا آئینہ ہو
ہر شے میں نظر آتی ہے صورت تیری

خود شناسی کے بعد ہی خدا شناسی حاصل ہوتی ہے۔ جب تک نفس کی معرفت نہ حاصل ہو سب بیکار ہے من عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ (جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا وہ خدا کو پہچان گیا) سے بھی یہی مراد ہے۔ حضرت خسروؔ کس دلنشیں انداز میں فرماتے ہیں:

مانا کہ تو ہر راز نہاں کو سمجھا
مانا کہ تو راز دو جہاں کو سمجھا
کیا فائدہ لیکن اس سمجھ سے تجھ کو
اب تک جو نہ اپنی جسم و جاں کو سمجھا

حضرت خسروؔ کا کوروی کے کلام کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں غزل کا مکمل بانکپن موجود ہے وہ زندگی کے ہر رنگ کو شیشۂ غزل میں اسیر کر لینا چاہتے تھے افسوس یہ ہے کہ اب تک ان کا کلام منظر عام پہ نہ آسکا۔ راقم الحروف کے پیش نظر موجود ان کا ضخیم دیوان جو اردو فارسی کلام پر مشتمل ہے اگر طبع ہو گیا ہوتا تو زبان و ادب اور شاعری کے سرمائے میں گرانقدر اضافہ ہو جاتا۔

سب شائق حسن شاعری بیٹھے ہیں
در ہائے سخن کے مشتری بیٹھے ہیں
کھولو گرہ کیسۂ مضمون خسروؔ
موتی نہ دکھاؤ جوہری بیٹھے ہیں

٭

اپنی بات ...... (صفحہ کا بقیہ)

کہ اس کا یقینی طور سے یہی مطلب ہوگا کہ ہم اپنی جڑوں، اپنی تہذیب اور اپنی معاشرت سے کٹ چکے ہیں۔ اور اپنی جڑوں، اپنی تہذیب نیز اپنی معاشرت سے کٹ جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صحیح طور پر ہمارے ذہن انتشار کی راہ پہ گامزن ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ غیر ملکی زبان پر دسترس اور اس سے وابستگی رکھنے کے ساتھ ساتھ ہم اپنی مادری زبان اور اپنے ملک کی زبانوں سے بھی اپنا رشتہ یقینی طور سے قائم رکھیں۔ اور غیر ملکی زبان سے ہمیں جو کچھ حاصل ہوا یا جو کچھ حاصل کر رہے ہیں اس سے ہم اپنی زبان کو بھی مالا مال کرتے چلیں تاکہ ہماری زبان بھی برابر فروغ پاتی رہے۔

ایڈیٹر

آل انڈیا اردو سبھا کے زیر اہتمام ۱۰ نومبر ۸۳ء کو لکھنؤ میں منعقدہ کل ہند مشاعرے میں صدر جمہوریہ ہند شری گیانی ذیل سنگھ کا نوجوان شاعر شمیم انصاری استقبال کرتے ہوئے۔ تصویر میں مرکزی وزیر تعلیم شریمتی شیلا کول، ممتاز ترقی پسند شاعر علی سردار جعفری، وزیر اعلیٰ شری سری پت مشرا اور وزیر قومی یکجہتی ڈاکٹر عمار رضوی بھی نظر آ رہے ہیں

گورنر اترپردیش شری سی۔ پی۔ این سنگھ سے میزورم کے لیفٹیننٹ گورنر شری ایچ۔ سی دوبے اور مرکزی وزیر مملکت برائے آبپاشی شری رام نواس مردھا ۱۵ نومبر کو راج بھون میں گفتگو کرتے ہوئے۔ تصویر میں وزیر قومی یکجہتی ڈاکٹر عمار رضوی اور شریمتی ایچ۔ سی دوبے بھی نظر آ رہی ہیں۔
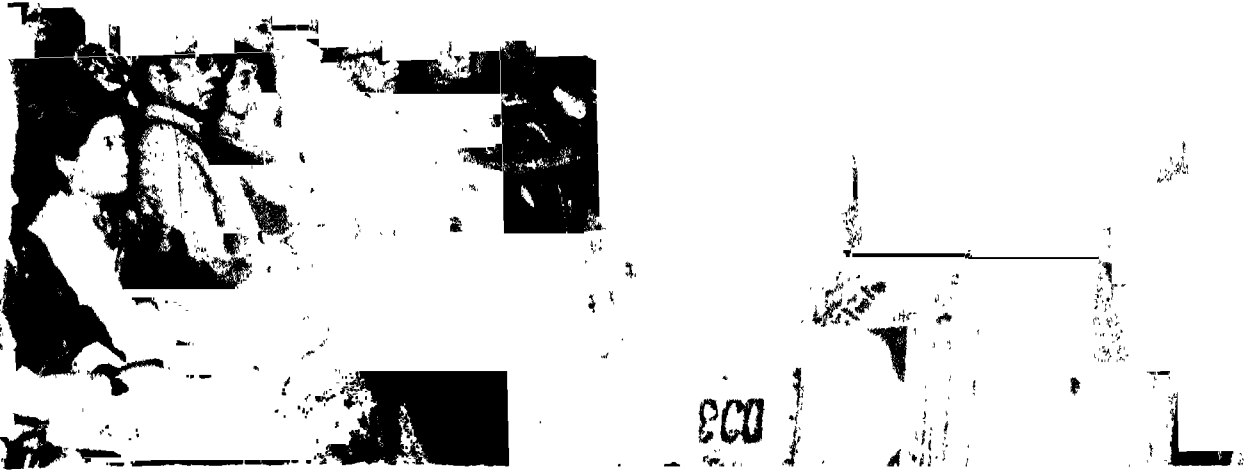
وزیراعلا شری سری پت مشرا ٹانڈہ (ضلع فیض آباد) میں فساد سے متاثرہ افراد سے گفتگو کرتے ہوئے۔

وزیراعلا شری سری پت مشرا علی گنج لکھنؤ میں ۱۹ نومبر کو انسٹی ٹیوٹ آف مینیجمنٹ ڈیولپمنٹ اینڈ ریسرچ کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے
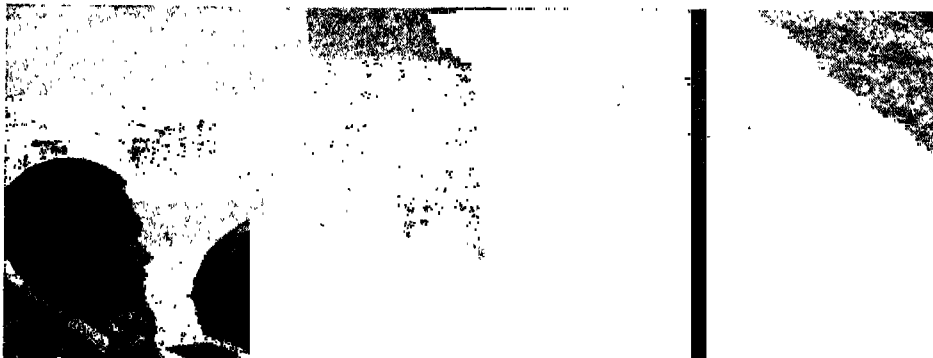
... اطلاعات کی سری ست منشا ۱۶ نومبر کو بی ہردوئی میں ریاستی ہومیوپیتھک اسپتال کا افتتاح کر رہے ہیں۔

... ریاست برائے محنت شری سنیل شاستری پابند مزدوروں کو بیل گاڑی تقسیم کرتے ہوئے۔

انیس انصاری
آئی اے ایس
اسپیشل سکریٹری
اربن ڈیولپمنٹ، حکومت اتر پردیش

خالد علوی
محلہ زکی
شاہجہاں پور

وہ دن گئے، جب خیال سے تھے نہ خواب سے تھے
وہ ہم پہ نازل وصال سے تھے عذاب سے تھے

میں ابتدا تھا تمھاری، تم میری انتہا ہو
یہ زاویے ہی وبال سے تھے عتاب سے تھے

تھے مرحلے سخت زندگی کے مگر تیرے غم
جہاد میں نیک فال سے تھے ثواب سے تھے

تمہاری صحبت مجھے مہذب بنا رہی تھی
تمہارے فقرے خیال سے تھے کتاب سے تھے

جدید شہروں کی جگمگاہٹ میں کھو نہ جائیں
جو دھندلے رشتے جمال سے تھے شراب سے تھے

تمہاری بستی کو کیا ہوا ہے کہ آج اس میں
تمام چہرے سوال سے تھے جواب سے تھے

تم سے بچھڑوں گا تو یادوں کے گہر دے جاؤں گا
میرے دامن میں جو ہے گردِ سفر دے جاؤں گا

دوست اور دشمن کو تم پہچان لوگے، اس لیے
جاتے جاتے میں تمھیں اپنی نظر دے جاؤں گا

ساتھ لے جاؤں گا اپنی [illegible] پائی عمر
تجربوں کی تم کو جنسِ معتبر دے جاؤں گا

جاتے جاتے [illegible] شہر سے لے زندگی
تجھ کو میں [illegible] چشم تر دے جاؤں گا

لوٹ جاؤں گا [illegible] شب کی ردا
اور تیرے گھر کو میں [illegible] دے جاؤں گا

کاٹ کوں گا [illegible] زخمی پرندے کی طرح
اور دنیا کو ستارے بال و پر دے جاؤں گا

غم کے چہرے پر سجا [illegible] تبسم کی کرن
اس طرح دنیا کو جینے کا ہنر دے جاؤں گا

چھوڑ جاؤں گا [illegible] ہی [illegible] آب پر
ڈوب کر جس میں سبھی اپنی خبر دے جاؤں گا

بے گناہی کا میں خالق اور کیا دوں گا ثبوت
خون میں تر اپنے گھر کے بام و در دے جاؤں گا

ڈاکٹر حامد افاق قریشی
کوچہ مرزا دبیر
کٹرہ اعظم بیگ لکھنؤ

نوابِ اودھ

وزیر علی کی شادی

نوابینِ اودھ کے خانگی معاملات میں وزیر علی کی شادی کافی مشہور ہے لیکن ابھی تک کسی بھی محقق نے اس کے تفصیلی واقعات نہیں لکھے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون کے ذریعہ میں اس کی تفصیلات ہمعصر اور دیگر ماخذات کی روشنی میں پہلی بار پیش کر رہا ہوں۔

۱۷۹۲ء کے اواخر میں وزیر علی کی عمر تقریباً ۱۲ سال ہو گئی تھی۔ اب ان کے والد اور اودھ کے چوتھے نواب آصف الدولہ کو ان کی شادی کی فکر لاحق ہوئی اور اشرف علی خاں سے اس معاملہ میں بات چیت کی گئی۔ اشرف علی سید بندہ علی خاں کے صاحبزادے تھے بندہ علی خاں، سعادت علی خاں، صفدر جنگ اور شجاع الدولہ کے عہد میں داغ و تصحیح کی خدمت انجام دیتے تھے اور آصف الدولہ کے عہد میں اشرف علی داروغہ داغ و تصحیح تھے۔ ان کی بیگم کا نام ثریا بیگم تھا۔

اشرف علی اپنی ماں کی طرف سے آصف الدولہ کے نائب حسن رضا خاں کے رشتہ کے بھائی تھے۔ ان دنوں راجہ ٹکیٹ رائے حسن رضا خاں کی پیش دستی میں کام کر رہے تھے۔ حالانکہ حسن رضا خاں برائے نام ہی نائب تھے اور تمام کام ٹکیٹ رائے ہی انجام دیتے تھے لیکن ان کو حسن رضا خاں کی برائے نام برتری بھی گوارا نہ تھی وہ برابر اس کوشش میں رہتے تھے کہ حسن رضا خاں کو نواب کی نظروں میں گرا دیا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسن رضا خاں اس سے خوفزدہ ہو گئے تھے، اور اودھ کے دربار میں اپنے مقام کے دوام کے لیے اور آصف الدولہ پر اور زیادہ اثر انداز ہونے کے لیے انھوں نے اپنے رشتہ کے بھائی اشرف علی کو اس بات کی ترغیب دی کہ وہ اپنی دختر کو وزیر علی کی شریکِ حیات بنا دیں۔ اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس شادی کے پیچھے حسن رضا خاں کی سیاست کام کر رہی تھی۔

گفت و شنید کے بعد اشرف علی کی دختر بنو بیگم اور وزیر علی کی شادی طے کر دی گئی اور اس بات کو اور زیادہ پکا کرنے کے لیے طرفین نے مصری اور شربت کے تبادلہ کی رسم ادا کر لی۔ اس بات کی خبر گورنر جنرل کارن ولیس کو بھی دی گئی اور انھوں نے آصف الدولہ کو اس موقع پر مبارکباد کا ایک خط لکھا۔

شادی کی اصل تقریبات شعبان ۱۲۰۸ھ میں انجام پائیں۔ یکم شعبان ۱۲۰۸ھ کو وزیر علی کی عمر ۱۳ سال، ۱۰ ماہ، ۱۴ دن تھی۔ اور بنو بیگم اس وقت دس سال کی تھیں۔

وزیر علی کی شادی انتہائی دھوم دھام سے کی گئی تھی۔ اس کے لیے بڑی تیاریاں کی گئی تھیں۔ اودھ کے امرا اور نواب آصف الدولہ کے خاندان کے افراد کے علاوہ قرب و جوار اور دور دراز علاقوں کے تمام ممتاز و نامور افراد اور باعزت لوگوں کو شرکت کے لیے دعوت نامے روانہ کیے گئے تھے۔ کلکتہ سے سر جان شور گورنر جنرل، ایبر کرامبی کمانڈر ان چیف اور کونسل کے دیگر ممبران کو مدعو کیا گیا تھا لیکن انھوں نے اپنی مشغولیت کے باعث معذرت کر لی۔ شاہ عالم ثانی کے ایک سابق نائب وزیر منیر الدولہ کے صاحبزادگان شجاع قلی خاں اور کریم قلی خاں گورنر جنرل کی اجازت سے اس شادی میں شریک ہوئے فرخ آباد کے نواب مظفر جنگ اور ریاست رام پور کے جانشین

محمد علی خاں ایک مہینہ قبل سے ہی شرکت کے لیے آگئے۔

جیسے ہی آصف الدولہ کو اس بات کی اطلاع ملی کہ فرخ آباد کے نواب مظفر جنگ وزیر علی کی شادی میں شرکت کے لیے فرخ آباد سے روانہ ہو چکے ہیں، انھوں نے ان کے راستے میں پڑنے والے تمام عاملوں کو لکھا کہ وہ ہر پڑاؤ پر ان کا دعوتوں اور دیگر ضیافتوں کے ذریعہ خیر مقدم کریں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب وہ لکھنؤ سے دس میل دور وزیر گنج پہنچے تو وزیر علی نے بہت سے ہاتھیوں، شہسواروں اور خدمت گاروں کے ساتھ ان کا وہاں جا کر خیر مقدم کیا اور نذر پیش کی جس کے بدلے میں مظفر جنگ نے ان کو پانچ بڑے تحفے دیئے۔

لکھنؤ ریزیڈنسی کے تمام انگریز مرد اور عورتیں اور لکھنؤ میں موجود تمام غیر ملکی اس موقع پر حاضر ہو گئے۔ لکھنؤ میں موجود اظفری اور دیگر مغل شاہزادے بھی اس تقریب میں شریک ہوئے۔ فیض آباد سے آصف الدولہ کی دادی نواب بیگم اور ماں بہو بیگم اس شادی میں شریک ہونے کے لیے آئیں۔

شادی کی تقریبات کے لیے لکھنؤ شہر سے باہر طرح طرح کے اور مختلف سائز کے خیمے لگائے گئے ان میں سے دو خیمے سب سے بڑے اور انتہائی پرکشش تھے یہ ۱۲۰ فٹ لمبے اور ۶۰ فٹ چوڑے تھے اور اس کو سہارا دینے والے ستونوں کی اونچائی ۶۰ فٹ تھی۔ ان کے چاروں طرف دس دس فٹ اونچی قناتیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ مضبوط قسم کے سوت کے بنے ہوئے تھے اور ان میں نفیس اور رنگ برنگی ولایتی کپڑے کی چوڑی گوٹیں اور کناریاں لگی ہوئی تھیں اور ان کو رنگ برنگی ریشمی اور سوتی دوڑیوں سے باندھا گیا تھا۔ ان کی قیمت تقریباً پانچ لاکھ روپیہ تھی۔ ان میں سے ایک خیمہ میں نفیس چلمنیں لگی ہوئی تھیں اور یہ نواب کی حرم سرا کی عورتوں اور دیگر شرفا کی مستورات کے لیے وقف تھا۔ دوسرے خیمہ کے سامنے ایک بہت بڑا، نفیس کپڑے کا شامیانہ لگا ہوا تھا جو چاندی کے ۶ ستونوں پر نصب تھا۔ اس کی لمبائی اور چوڑائی تقریباً ۱۰۰ فٹ تھی اور اودھ کے دربار کے امرا اور دیگر معزز مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔

شادی کی خاص تقریبات عیش باغ محلہ کے ایک باغ میں منعقد کی گئی تھیں۔ ان خیموں سے لے کر اس باغ تک کا تمام راستہ بہت خوبصورتی کے ساتھ سجایا گیا تھا۔ کافی اونچی اونچی اور بانس کی بنی ہوئی مصنوعی محرابیں، برج، گنبد اور مینار، جن میں روشن قندیلیں آویزاں تھیں، اس راستہ کی خوبصورتی میں چار چاند لگا رہے تھے۔ ان سب چیزوں نے پانچ میل کے حصار میں اس قطعہ کو ایک جگمگاتے ہوئے قلعہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ عیش باغ میں تمام پیڑوں پر رنگ برنگی کاغذی لالٹینیں روشن تھیں اور درختوں کی خوبصورتی کو دوبالا کرنے کے لیے انھیں تاس اور بادلہ سے سجایا گیا تھا نیز ان گنت فوارے اور نہریں کھودی گئی تھیں۔ اس باغ میں ایک عظیم الشان دالان بھی تھا جس میں بے شمار ولایتی شمعدان اور جھاڑ فانوس لگے ہوئے تھے، اور ان کے اندر مومی شمعیں روشن تھیں۔

روشنی کا انتظام اتنا آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا تھا کہ ایک ہم عصر مورخ مٹھو لال نے لکھا ہے کہ اس کی خوبصورتی کو بیان کرنے کے لیے الفاظ ملنا مشکل ہیں۔ اوپر جس شامیانے کا ذکر کیا گیا ہے اس میں تقریباً ۲۰۰ بیش قیمت جھاڑ فانوس، قندیلیں اور فلیتے روشن تھے۔ ان کی چمک دمک چوندھیا دینے والی تھی اور اس نے رات کو اس حد تک دن میں تبدیل کر دیا تھا کہ مٹھو لال نے لکھا ہے کہ اس کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ شاید سورج اپنی روزمرہ کی عادت کے برخلاف اس دن رات میں نکل آیا تھا۔ بیس ہزار آدمی محض اس روشنی کا انتظام کرنے کے لیے مقرر کیے گئے تھے اور اس میں جو تیل خرچ ہوا تھا اس کی قیمت تین لاکھ روپیہ تھی۔

اس موقع پر فریقین نے کتنے قیمتی تحائف، جہیز و دیگر رسومات میں دیے ہوں گے اس کا اندازہ مندرجہ بالا تفصیلات سے لگایا جا سکتا ہے۔ صرف سانچق میں ہی آصف الدولہ نے سینکڑوں چاندی کے ظروف اشرف علی کے گھر روانہ کیے تھے۔ سانچق ایک ترکی لفظ اور ترکی رسم ہے۔ اس میں دولھا کے یہاں سے دلہن کے لیے چڑھاوے کا جوڑا جاتا تھا جو بہت بھاری اور کارچوب کے کام کا ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ دلہن کے لیے سنہری نقش کا سہرا، چاندی کا چھلا

سونے کی انگوٹھی اور ایک اور چیز پہنی ہوتی تھیں اور وہ زیور ہوتا تھا جس کو پہنا کر وہ رخصت کی جاتی تھی اور پھولوں کا گہنا ہوتا تھا۔ جوڑے کے ساتھ شکر کے نقل، ترمس اور میوہ جاتا تھا۔ سانچق کے لیے خاص اہتمام کے ساتھ منقش اور رنگین گھڑے تیار کرائے جاتے تھے۔ بانس اور کاغذ کے زنگار رنگ تختوں میں چار گھڑے لگا کر ان سب گھڑوں کے آگے چاندی کی ایک دہی کی مٹکی ہوتی تھی اور اس کے منہ پر بھی سہرا ناڑے سے باندھ دیا جاتا تھا اور اس کے گلے میں مبارک فالی کے لیے دو ایک مچھلیاں بھی باندھ دی جاتی تھیں۔

وقائع خاندان بنگش میں لکھا ہے کہ آصف الدولہ کو مظفر جنگ سے اتنی انسیت تھی کہ انھوں نے ان سے گذارش کی کہ وہ وزیر علی کو اپنی نگرانی میں نہلا دھلا کر نوشہ بنوائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور وزیر علی کے سہرا بھی انھوں نے باندھا اور اس مالی کو جس نے اس سہرے کو بنایا تھا تین تھیلیاں اشرفیوں کی دیں۔

وزیر علی دولھا بن کر کچھ رات گئے باہر آئے۔ وہ زیورات سے اتنے لدے پھندے تھے کہ ان کے لیے چلنا بھی دوبھر تھا۔ وہ ایک نوابی پوشاک میں ملبوس تھے جس پر بیس لاکھ روپے کی قیمت کے جواہرات ٹکے ہوئے تھے۔ آصف الدولہ بذات خود رنگ برنگی پوشاک زیب تن کیے ہوئے تھے اور اس پر بھی جواہرات ٹکے ہوئے تھے۔ جن کی مالیت بھی تقریباً بیس لاکھ روپیہ تھی۔

تمام مہمانوں کا انتہائی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا اور ان کو مندرجہ بالا دونوں خیموں میں سے ایک خیمے تک جانے کی زحمت دی گئی تھی۔ مغل شاہزادہ اظفری نے لکھا ہے کہ ان کا اور دیگر مغل شاہزادوں کا استقبال بذات خود آصف الدولہ نے کیا تھا اور ان کو گوٹے اور پھولوں کے ہار پہنائے گئے تھے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دیگر معزز مہمانوں کا بھی آصف الدولہ ہی نے خیر مقدم کیا ہوگا اور ان لوگوں کو بھی اسی قسم کے ہار پہنائے گئے ہوں گے۔ مہمانوں کو عیش باغ تک لے جانے کے لیے زین پوش ہاتھیوں کو کام میں لایا گیا تھا۔

وزیر علی کے آنے کے بعد شادی کا جلوس عیش باغ کی طرف روانہ ہوگیا۔ جو وہاں سے صرف ایک میل دور تھا۔ یہ جلوس انتہائی شاندار تھا۔ اس میں تقریباً بارہ سو ہاتھی تھے جن کو خوبصورتی سے سجا کر باقاعدہ قطاروں میں کھڑا کیا گیا تھا۔ ان میں سے تقریباً سو ہاتھی بیچ میں رکھے گئے تھے اور ان پر چاندی کے ہودے کسے ہوئے تھے۔ ان ہاتھیوں کے سامنے اور جلوس کے دونوں طرف زرق برق کپڑوں میں ملبوس ناچنے والیاں تھیں جن کو تخت رواں پر لے جایا جا رہا تھا۔ ان تختوں پر سونے اور چاندی کے کام کی جھولیں پڑی ہوئی تھیں اور ان کو بادلہ و تمامی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ ہر تخت پر دو دو رقاصائیں اور دو دو سازندے تھے اور ہر دو طرف ان رواں تختوں کی تعداد تقریباً سو تھی۔ رقاصاؤں نے اپنے باکمال و مستانے رقص، ناز و انداز نیز فارسی اور اردو نغموں سے تماشائیوں کو مبہوت کر دیا تھا۔ عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ بارات کا تزک و احتشام تاریخ ارض کے تمام تکلفات سے بڑھ گیا تھا۔

آصف الدولہ اس جلوس کے بیچ میں ایک سب سے بڑے ہاتھی پر سوار تھے۔ اس پر سونے کے کپڑے کی جھول پڑی ہوئی تھی اور سونے ہی کا ہودا تھا، جس میں قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ ان کی داہنی طرف ریزیڈنٹ جارج جانسن تھے اور بائیں طرف وزیر علی تھے۔ وقائع خاندان بنگش میں لکھا ہے کہ وزیر علی مظفر جنگ کی گود میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن لیوس فرڈی نانڈ اسمتھ، جو اس جلوس کے چشم دید گواہ تھے، کے بیان سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی اور اس لیے یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ دیگر انگریز خواتین و مرد اور قابل تکریم مہمان نیز اودھ کے امرا دائیں اور بائیں جانب تھے۔ ابو طالب نے جو اس جلوس میں شریک تھے، لکھا ہے کہ کچھ دور تک آصف الدولہ وزیر علی کے تخت رواں کے سامنے پیدل چلے تھے۔ جب لوگوں نے ان سے ہاتھی پر سوار ہو کر چلنے کی گذارش کی تو انھوں نے کہا کہ میں نے قسم کھائی تھی کہ میں اس خوشی کے موقع پر اس ریاست کے عام نمکخواروں کی طرح وزیر علی کی سواری کے سامنے پیدل چلوں گا۔

عیش باغ تک سارے راستہ میں زمین دوز آتش بازی کا مظاہرہ کیا گیا تھا جو ہاتھیوں کے ہر قدم کے ساتھ دغتی تھی اور آسمان

مصنوعی ستارے گردش کرنے لگتے تھے جن کی روشنی کے سامنے اصل ستارے بھی ماند پڑ گئے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہزاروں ہوائیاں اور سینکڑوں لکڑی کے گولے بھی داغ رہے تھے جن سے ہزاروں سانپ بل کھاتے ہوئے نکل رہے تھے اور آسمان پر اس طرح سے چمکتے ہوئے گردش کر رہے تھے کہ ایک نظر میں چار چار میل کا قطعہ روشن ہو جاتا تھا۔ ان کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ جیسے آگ کا ایک دریا آسمان پر موجیں مار رہا ہو۔ ایک آتش باز نے ایک ایسا غبارہ بنایا تھا، جو آسمان میں چھوڑتے ہی اتنا اونچا ہو جاتا تھا کہ اس پر تارہ کا گمان ہونے لگتا تھا اور ایک گھنٹہ تک روشن رہتا تھا۔ روشن مناظر نے اس اندھیری رات کو ایک جگمگاتے ہوئے دن میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس کی روشنی کو دوبالا کرنے کے لیے بیس ہزار سے بھی زیادہ فلیتے روشن تھے جنھیں وہ افراد لے کر چل رہے تھے جن کی خدمات کرائے پر حاصل کی گئی تھیں۔

زمین دوز آتش بازی کے دغنے کے لیے وقفہ دینے کی غرض سے یہ جلوس کچھوے کی چال سے آگے بڑھ رہا تھا اور اگرچہ عیش باغ وہاں سے صرف ایک میل دور تھا، تاہم اس دوری کو طے کرنے میں دو گھنٹے لگ گئے۔

عیش باغ پہنچنے پر مہمانوں کی طرح طرح کے لذیذ اور پر تکلف دیسی اور ولایتی کھانوں، شرابوں، پھلوں اور مٹھائیوں سے ضیافت کی گئی تھی۔ کھانے کے دوران سینکڑوں گانے اور ناچنے والیاں اپنے دیسی گیتوں اور مسحور کن نغمات سے ان کا دل بہلاتی رہیں۔ صبح تک یہ ہنگامہ برپا رہا۔ کھانے اور روشنی کا یہ انتظام تین دن تک متواتر جاری رہا۔ لذیذ کھانے چوبیس گھنٹے تیار رہتے تھے اور یہ دعوت دعوتِ عام تھی۔

غرباء اور مساکین کو اس موقع پر بے تحاشا خیرات دی گئی۔ خادموں اور دوستوں و امراء کو خلعتیں بخشی گئیں۔ صرف مغل شاہزادہ اظفری کے گھر کھانے کے ۲۱ خوان بھیجے گئے تھے۔ اور ان کو کئی ہزار روپئے نذر کیے گئے تھے۔

اس شادی کے کل اخراجات کا تخمینہ ہمعصر ماخذات نے الگ الگ بیان کیا ہے اور اس میں مطابقت پیدا کرنا انتہائی دشوار کام ہے۔ ایک چشم دید گواہ شاہزادہ اظفری نے لکھا ہے کہ ۵۰ لاکھ روپئے خرچ ہوئے تھے۔ دوسرے چشم دید گواہ اسمتھ کے بیان کے مطابق ۳۰ لاکھ روپئے خرچ ہوئے تھے۔ بعد کے لکھنے والوں میں سے کمال الدین حیدر، عظمت علی اور طوطارام شایاں نے اسی کو صحیح تسلیم کیا ہے۔ تیسرے چشم دید گواہ ابو طالب کے مطابق ۲۰ لاکھ روپئے سے زائد خرچ ہوئے تھے۔ بعد کے ایک اور ہم عصر راوی بجے گوپال ثاقب نے ۵۳ لاکھ روپئے کا تخمینہ لگایا ہے۔

اس شادی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اسمتھ نے لکھا ہے کہ:۔ "جب ہم لوگ اپنے گھروں کو لوٹے تو بہت زیادہ خوش تھے اور اس موہ لینے والے نظارہ نے جو کہ تزک و احتشام کے اعتبار سے اس ملک میں اس قسم کی تمام تقریبات میں بے مثال تھا، ہمارے دل و دماغ کو مسحور کر دیا تھا۔" اسمتھ نے آصف الدولہ کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا تھا کہ اس قسم کا نظارہ نہ تو پہلے کبھی ہندوستان میں دیکھا گیا تھا اور نہ پھر کبھی دیکھا جائے گا۔ یہ محض ایک ڈینگ نہیں تھی۔ ایک ہمعصر مورخ مٹھولال نے لکھا ہے کہ ایسی شادی کسی بھی وزیر یا بادشاہ نے اس سے پہلے نہ کی ہوگی؛ بعد کے ایک اور ہم عصر مؤرخ کمال الدین حیدر نے لکھا ہے کہ خاندانی روایات میں بھی اس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔

آصف الدولہ نے وزیر علی کی شادی پر ایک مثنوی بھی لکھی تھی جو کہا جاتا ہے کہ ان کے دیوان میں موجود ہے۔ حیدرآباد میں میں نے آصف الدولہ کے دو دیوان دیکھے تھے، ان میں یہ مثنوی نہیں ہے۔ کلکتہ میں پائے جانے والے ایک اور مخطوطہ میں اس کے وجود کی نشاندہی کی گئی ہے لیکن ابھی تک مجھے اسے دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہے۔

حکمت شاد
وکیل نزد مسجد حرا
شاہجہانپور

رباعیات

احساس کی قندیل کی ضو تیز کرو
دردو غمِ انساں کو دل آویز کرو
دنیائے خوشی میں سانس لینے والو
پیشانی کو پھر تم بھی عرق ریز کرو

آسان نہیں اپنی ہی بھولوں کی پرکھ
ہوتی ہے مصیبت میں اصولوں کی پرکھ
جب دھوپ چمکتی ہے سرِ صحنِ چمن
اس وقت ہی کچھ ہوتی ہے پھولوں کی پرکھ

دل میں خلشِ درد جگا لینے دو
اپنا مجھے ہمدرد بنا لینے دو
تم دشتِ حوادث سے جو چلتے ہو ابھی
آنکھوں سے تو دامن کو لگا لینے دو

حالاتِ زمانہ پہ نظر رکھتا ہوں
تنہا ہی بسر شام و سحر کرتا ہوں
وہ ٹھوکریں زندگی میں کھائی ہیں شاد
بچ بچ کے اجالوں سے سفر کرتا ہوں

تخئیل کے شعلے ہیں کہ اظہار کی آگ
افسونِ صبا ہے کہ ہے گلزار کی آگ
ہر بزم میں کچھ پھول کھلا جاتی ہے
سینے میں دہکتی ہوئی یہ پیار کی آگ

کانٹوں کو بھی آنکھوں سے لگا کر گزرو
زخموں سے بدن اپنا سجا کر گزرو
مرجھا کے رہے گی کبھی حالات کی دھوپ
بس شرط یہی ہے مسکرا کر گزرو

ناصح انصاری
۹۷/۷۱ پریڈ۔ کانپور

یہ شام کیسی شام ہے!

یہ شام کیسی شام ہے!
اداس، اداس، بے بصر
نہ قہقہے، نہ چہچہے
نہ یار باشیاں کہیں
نہ دوستوں کے جمگھٹے
نہ ہاؤ ہو نہ شور و شر
نہ بے سبب مباحثے
یہ شام کیسی شام ہے!
کہ سرمئی اندھیرے میں
قطار در قطار ہیں
شجر تمام سرنگوں
اداسیوں کی چھاؤں میں
طیارِ فکر بھی زبوں
یہ شام کیسی شام ہے!
کہ جس کی آبنائے میں
مہ و نجوم گھل گئے
روپہلے پانیوں میں بھی
اچھل سکے نہ بلبلے
لبِ لہر خموشیاں
سہج سہج ہوا چلے
یہ شام کیسی شام ہے!

نہیں سمجھ سکا اسے
نہ یہ سمجھ سکی مجھے
شکستہ پائی کا سفر
کبھی نہ ہو سکے گا طے
عجب معاملہ ہے یہ
گدائے شہر کیا کرے
یہ شام کیسی شام ہے!
شفق ہے جس کی بے خبر
افق ہے جس کا بے نظر
سڑک پہ گرچہ ہر طرف
ہجومِ خاص و عام ہے
مگر نہ احتجاج ہے
نہ لب پہ کوئی نام ہے
یہ شام کیسی شام ہے
ہمارے آس پاس سے
گذر چکے ہیں قافلے
یہ گرد بھی نہ ہو اگر
تو مٹ ہی جائیں فاصلے
سپرد کیجئے کسے
جنوں کے سارے سلسلے
کہ وقت بے مقام ہے
یہ شام کیسی شام ہے

غزلیں

جاوید وششٹ

شعبۂ اردو ذاکر حسین کالج، دہلی ۶

جلوۂ حسنِ ازل، دیدۂ بینا مجھ سے
جانے کیا سوچ کے پھر کر لیا پردا مجھ سے

غم ہے احساس کا آئینہ جِلا پاتا ہے!
اور غم سیکھے ہے آکر یہ سلیقہ مجھ سے!

رات پھر جشنِ چراغاں کے لیے مانگا تھا!
موجِ احساس نے اک پیاس کا شعلہ مجھ سے

میں نے مظلوم کا بس نام لیا تھا لوگو!
جانے کیوں ہو گیا برہم وہ مسیحا مجھ سے

میری خواہش پہ ہے موقوف وجودِ عالم
اور ہے منسوب ازل سے یہ کرشمہ مجھ سے

دل ہوں میں پیار بھرا اور تو نازک دھڑکن
دل کا ہے تجھ سے گر درد کا رشتہ مجھ سے

بزمِ یادوں کی سجی گوشۂ دل میں جاوید
پھر وہی تازہ غزل کا ہے تقاضا مجھ سے

جعفر عسکری

گولہ گنج۔ لکھنؤ

داماں و دل انھیں کے فقط خوں میں تر ملے
ہستی کے معرکے میں جو سینہ سپر ملے

سب ہی اسیرِ گیسوئے لیلائے زر ملے
شہرِ ہوس میں کوئی تو آشفتہ سر ملے

پیدا کہاں سے گرمیٔ افکار ہو کہ جب
ذہنوں کے تیج کدوں میں کوئی شرر نہ ملے

یارو! کہاں کے رستمِ دوراں تھے پھر بھی ہم
شہ زور قاتلوں سے بھی خم ٹھونک کر ملے

جعفر سنوارتے رہو زلفِ فنِ سخن!
کیا غم اگر نہ قیمتِ عرضِ ہنر ملے

افسانہ

فاطمہ حسن
گلزار ہاؤس اٹاوہ

وقت کے سہارے

نوید کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی رگوں میں دوڑتا پھرتا گرم لہو اچانک سرد پڑ گیا ہے اور وہ منجمد ہو گئی ہے نوید کے دل میں بجلی کا ایک کوندا سا لپکا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے ہیں تہہ بہ تہہ آنسوؤں کے بہتے پھوٹتے گئے اور یادوں کی پرتیں کھلتی گئیں جب چاپ بھی کی نظروں میں وہ گھر لوٹ آیا جو کبھی درحقیقت محبت کا گہوارہ تھا اس میں سارے جہاں کا حسن تھا سب کچھ اپنا اپنا تھا زندگی میں پیار بھرا ہوا سا بلائیں لیتا ہوا سا اس کے ماضی کا گھروندا جس میں دادی ڈیڈی ممی فرحت و شاہد سبھی تھے۔

دادی کی برسوں کی دعائیں اور منت مرادوں کے بعد اس کی پیدائش ہوئی تھی گویا مدتوں کے انتظار کے بعد وہ نوید مسرت بن کر آئی تھی۔ اس لیے دادی نے اس کا نام نوید رکھا اور ممی ڈیڈی نے اسے اسی نام سے پکارا تھا۔ پھر دو سال بعد فرحت پیدا ہوئی اور پورے بارہ سال بعد ننھے شاہد کی پیدائش ہوئی۔ مگر نوید دادی کی لاڈلی اور ڈیڈی کی آنکھوں کا تارا بنی رہی۔

وقت ہمیشہ کی طرح بڑی سرعت اور آہستگی سے گذر گیا گھر میں نوید و فرحت کی شادی کا ذکر ہونے لگا۔ دادی کو اپنی ڈھلتی ہوئی عمر کا خیال تھا۔ ڈیڈی کو قریب آتے ہوئے اپنے ریٹائرمنٹ کے ساتھ لڑکیوں اور ننھے شاہد کے مستقبل کی فکریں تھیں اور ممی ان ساری باتوں کا خیال کرتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا چاہتی تھیں۔ اسی لیے آئے ہوئے پیغام کو وقتی طور پر ٹال دینے یا لڑکوں کے برسر روزگار ہونے کا انتظار کرنا کیوں کر ممکن تھا۔ اور پھر ایک تو زمانہ خراب دوسرے [illegible] دوست دشمن کس کے نہیں ہوتے۔ لڑکے ہونہار تھے اور پھر جلد ہی تعلیم مکمل کر کے نوکری کر لیں گے۔ قسمت پر بھروسہ کر کے اور اللہ کا نام لے کر شادی کر دینا ہی مناسب سمجھا گیا۔ اور اللہ کا نام لے کر شادی کر دی گئی۔ حالانکہ نوید و فرحت دونوں ہی ابھی پڑھ رہی تھیں مگر نوید کی ساس نے صاف کہہ دیا تھا "دلہن بیگم اب یہ بی۔اے۔ایم۔اے بعد میں کر لینا جب رشید آئی اے ایس ہو جائیں گے۔ ابھی کچھ دنوں ہمارے پاس رہو۔"

ادھوری تعلیم چھوڑ کر نوید میرٹھ سے اپنی سسرال بنارس چلی گئی فرحت میکے میں رکی رہی اور برابر آگے پڑھتی گئی۔ نوید شادی سے بہت خوش تھی سسرال میں سب اس کے قدر داں تھے۔ رشید تندرست خوبرو اور پر وقار شخصیت کے ساتھ بڑی اچھی طبیعت کا مالک تھا۔ ایم اے میں اس نے بڑی شاندار کامیابی حاصل کی تھی۔ اب وہ مقابلے کے امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھا۔

اسی درمیان دادی کا انتقال ہو گیا نوید ساس اور رشید کے ہمراہ میکے آئی ڈیڈی اسے خوش دیکھ کر خوش تھے اور ممی کو اطمینان تھا پھر بھی ان لوگوں نے نوید کو کچھ دنوں کے لیے روکنا چاہا تھا مگر ساس اور رشید دونوں ہی نوید کو واپس لے جانا چاہتے تھے۔ اس لیے تھوڑے بہت اصرار کے بعد ممی نے اسے واپس بنارس جانے دیا۔

آئی۔اے۔ایس کا رزلٹ نکلا رشید کا نام اس میں نہیں تھا گھر میں اداسی چھا گئی تھی ساس نے نوید کو دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس لے کے اٹھ گئیں۔ رشید افسردہ تھا وہ نوید سے نظریں بچاتا رہا۔ رشید کے والد

اس کو تسلیاں دیتے رہے ارے ابھی عمر ہی کیا ہے دوبارہ مقابلے کے امتحان میں بیٹھ سکتے ہو اور کوشش اور محنت کی ضرورت ہے سمجھے یوں دل نہ چھوٹا کرو۔ اور رشید نے اگلے سال کے لیے فارم بھرے اور تیاریوں میں لگ گیا۔

نوید نمازیں پڑھتی اور دل ہی دل میں دعائیں کرتی۔ انھیں دنوں رشید کی بہن فریدہ کی شادی طے ہوگئی۔ ساس نے نوید سے کہا دلہن بیگم تم تو جانتی ہو ہم لوگ نوکری پیشہ ہیں ذمہ داریاں اتنی زیادہ رہی ہیں کہ کچھ پس انداز نہیں ہوسکا رشید میاں سے امیدیں تھیں وہ بھی اللہ نے پوری نہ ہونے دیں۔ رہ گئے حمید و ساجد ان کے کسی لائق ہونے میں ابھی وقت ہے اب میں فریدہ کی شادی کروں تو کیسے کروں؟ تم تو اپنی ہو تم سے کہہ سکتی ہوں۔ کچھ میرا رکھا ہوا ہے اور کچھ تمھارا ملاکر فریدہ کے لیے جہیز مکمل ہوسکتا ہے اور گھر کی عزت قائم رہ سکتی ہے۔ آگے جیسی تمھاری مرضی۔

نوید نے ساس کی بات سر جھکا کر مان لی تھی۔ فریدہ کی شادی ہوگئی۔ نوید کے کپڑوں زیورات اور دوسرے ساز و سامان کے ساتھ وہ سسرال گئی اس طرح گھر کی عزت قائم رہی۔

آئی۔ اے۔ ایس کا رزلٹ آیا رشید ابتدائی مقابلے کے امتحان میں نہیں آسکا تھا۔ رشید کے والد کہہ رہے تھے "کچھ اور کرو دو موقعے تم کھو چکے ہو اب صرف تیسری کوشش باقی ہے اس کے بھروسے نہ رہو اخبار دیکھ کر درخواستیں بھیجتے رہو تم سے کہیں زیادہ تو حمید ہوشیار ہے جو دوسری تمام راہیں دیکھ رہا ہے۔"

رشید سے چھوٹا بھائی حمید تعلیم مکمل کر چکا تھا اس کی شادی کی باتیں ہو رہی تھیں نوید کی ساس اپنی ملنے والیوں سے کہہ رہی تھیں "ابھی نہیں وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے تب کروں گی ابھی کر دوں اور بہو نصیب ور نہ نکلیں تو؟ رشید میاں پہلے کبھی ناکامیاب نہیں ہوئے تھے مگر اب تو دلہن بیگم کے قدموں کی برکت ہے۔"

نوید کانپ کر رہ گئی اس نے رشید کی آنکھوں میں دیکھا رشید ہنس پڑا۔ مگر ایسی باتیں اب گھر میں شروع ہوچکی تھیں۔ تین سال شادی کو ہوچکے تھے ساس کے دل میں پوتے کا ارمان تھا۔ رشید کے خیال میں ابھی اس کے لیے وقت نہیں آیا تھا لیکن ساس اور ان کی ملنے والیوں کی نظروں میں قصوروار نوید تھی۔ نوید آنسو بہا کر رشید کو ملول نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اندر ہی اندر گھٹتی رہتی تھی اسے اپنی زندگی میں ایک خلا اور سونے پن کا احساس ہوتا مگر اب وہ پہلے والی بات نہیں تھی کہ نوید کے اترے ہوئے چہرہ کا سبب پوچھا جاتا۔ ساس اور نوید کے درمیان ناخوشگواریاں بڑھنے لگی تھیں، نوید کو احساس تھا اس کے ساتھ زیادتی ہورہی ہے اور گھر میں اب وہ مقام نہیں مل رہا ہے جو اسے اب تک حاصل رہا تھا۔

ممی کا خط آیا۔ فرحت اور طاہر سے ملنے کے لیے انھوں نے رشید و نوید کو بلایا تھا انکم ٹیکس آفیسر کی ٹریننگ مکمل کرکے طاہر فرحت کو اپنی پہلی پوسٹنگ پر لے جارہا تھا۔ میرٹھ پہنچ کر نوید بہت خوش تھی مہینوں بعد وہ دل سے ہنسی تھی لیکن رشید کی خجالت اور افسردگی بڑھ گئی تھی ایک رات رہ کر وہ واپس بنارس چلا آیا نوید رک گئی تھی رشید کے جلد ہی واپس چلے جانے کا سبب نوید بعد کو سمجھ سکی۔

فرحت کے چلے جانے سے گھر میں سناٹا ہوگیا تھا مگر اس گھر میں نوید کو بہت سکون تھا۔ محبت تھی اپناپن تھی۔ اسے بار بار رشید کا خیال آتا۔ رشید کے خطوط آتے رہے اس نے کہہ بھی دیا تھا جب تک دل چاہے رہ لینا مگر نوید نے ممی کو بتائے بغیر رشید کو لکھ دیا آکر لے جاؤ۔ رشید خود نہیں آئے چھوٹے بھائی ساجد کو لینے بھیج دیا۔

سسرال آکر اسے معلوم ہوا اس کا منجھلا دیور حمید لائف انشورنس کارپوریشن کے کسی اعلا عہدے کے لیے سلکٹ ہوگیا

اور اب وہ اس کی ٹریننگ لینے جا رہا تھا۔ ساس بہت خوش تھیں۔
رشید سے اس کے والد کہہ رہے تھے "کیا خاک امتحان دیتے ہو اور درخواستیں بھیجتے ہو نتیجہ وہی صفر رہتا ہے مجھے امید نہیں تھی کہ تم یوں نکمے ہوتے جاؤ گے"

نوید نے دیکھا رشید سمٹ کر رہ گیا تھا وہ جانتی تھی رشید برابر چھوٹی بڑی ہر نوکری کے لیے درخواستیں بھیجتا رہتا ہے مگر وہ اپنی قسمت کا کیا کرے جو رشید کو نوکری نہیں ملتی تھی۔ گھر کے اندر تناؤ سا محسوس ہوتا ساس اس سے بہت کم بات کرتیں۔ رشید زیادہ تر خاموش رہتا اور خود نوید — اس کا تو دل بجھ کر رہ گیا تھا۔

کچھ دنوں بعد نوید نے ممی کو لکھا اسے بلالیں ڈیڈی اسے لینے آگئے تھے ساس کہہ رہی تھیں دلہن بیگم تمہارا گھر ہے جب چاہنا واپس چلی آنا۔ اب یہ بلانے دلانے کا چکر تو تبھی ہوسکے گا جب انشاء اللہ رشید میاں کی کمائی ہوگی۔"

اصرار کے باوجود رشید نہیں گئے نوید اپنے ڈیڈی کے ساتھ اکیلی میرٹھ چلی گئی۔ اس بار گھر آکر اسے سسرال کے مکان سے زیادہ اپنا گھر روشن اور کھلا سا لگا بڑی گہری سانس لے کر اس نے محسوس کیا ہوا ٹھنڈی بھی ہے اور فرحت بخش بھی۔

اس کی آنکھوں کی اداسی ممی سے چھپی نہیں رہ سکی ممی نے اس سے بہت سے سوال پوچھے بہت سی باتیں کیں، اس نے کچھ کے جواب دیے کچھ خاموشی سے ٹال گئی تھی اس کے باوجود نوید کو ایک ہلکے پن کا احساس تھا مگر اس کی ممی کے دل کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ بہت سوچ سمجھ کر ڈیڈی نے اپنی رائے دی "نوید رک کر بی۔ ایڈ کرلے جوائن کرلے ادھوری تعلیم بھی مکمل ہو جائے گی اور تب تک رشید بھی اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں گے۔" نوید کو ڈیڈی کی رائے پسند تھی مگر ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ رشید کا خط آیا "حمید کی شادی طے ہوگئی ہے۔ اور فریدہ ولادت کی غرض سے آئی ہوئی ہے۔ اس لیے نوید اگر فوراً چلی آئے تو اچھا ہے۔"

ڈیڈی کہہ رہے تھے "کسی کو لینے آنا چاہیئے تھا اب خود ہم تمہیں کیوں پہنچائیں۔" مگر نوید سمجھتی تھی ساتھ لے جانے کے لیے اب کوئی نہیں آیا کرے گا اور اگر وہ نہیں گئی تو پھر اور باتیں اٹھ کھڑی ہوں گی۔ رشید آسکتے تو اسے نہ لکھتے۔ نوید کے سامنے ڈیڈی چپ ہو گئے اور اسے سسرال پہنچا آئے۔

حمید کی شادی ہوگئی اور فریدہ کے یہاں ولادت بھی دونوں ہی موقعے نوید کے لیے بڑے صبر آزما تھے۔ کبھی کبھی اپنوں کی خوشی بھی زہر لگتی ہے نوید کے دل میں نشتر سے چبھتے رہے اس کی توقیر اور وقعت تو گھر میں پہلے ہی کم ہو گئی تھی اب نئی منجھلی دلہن کے آنے پر وہ بالکل ہی سکنڈری ہو کر رہ گئی تھی۔ ساس کے ساتھ مہمان عورتیں بھی اپنی زبان بند نہ رکھتیں۔ ان کے ہمدردانہ جملے ٹھنڈی سانسیں نوید کے وجود کو گھلائے دیتی تھیں دن بھر اس کے مرجھائے ہونٹوں پر مسکراہٹ رہتی مگر رات گئے بڑی خاموشی سے اس کی آنکھوں سے شبنم گرتی اور تکیے میں جذب ہو جاتی۔ نوید کے اندر ایک عجیب ہیجان بڑھتا جا رہا تھا زندگی گھٹ کر رہ گئی تھی اسے سب کے کہنے سے یقین ہو چکا تھا کہ ضرور نحوست کا باعث وہ خود ہے تبھی تو رشید کی قسمت اس سے منہ پھیر چکی ہے۔

تیسری بار مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کے لیے رشید کو فیس کے روپے نہیں مل سکے۔ ان کے والد نے کہہ دیا تھا "میاں اب بہت ہو چکا میں پہلے ہی خرچ سے پریشان ہوں اب مجھ سے کچھ نہ کہو"

فیس کی ادائیگی کے لیے اپنے ڈیڈی کو خط لکھ کر نوید نے روپے منگا لیے۔ ساس کا غصہ بھڑک اٹھا اور اب وہ نوید کو کسی نہ کسی بہانے ہر وقت لتاڑتی رہتیں۔ عاجز آکر نوید نے ممی کو لکھا اسے بلالیں۔ ممی کا خط فوراً آیا "اس کے ڈیڈی سخت بیمار ہیں۔ نوید رشید کو لے کر آجائے۔" ڈیڈی کے بھیجے روپے نوید کے پاس تھے رشید نے فیس جمع نہ کرکے وہ روپے پہلے ہی نوید کو لوٹا دیے تھے۔

سفر خرچ دلہن بیگم کے پاس تھا ہی ساس نے ماتھا سکوڑ کر رشید کے ساتھ اسے میکے بھیج دیا۔

ڈیڈی سچ مچ بیمار تھے ان لوگوں کے پہنچ آنے کے کئی دنوں بعد ان کی طبیعت بہتر ہو گئی۔ اور وہ ٹھیک ہو گئے رشید واپس بنارس جانا چاہتے تھے۔ اجازت لینے کی غرض سے وہ ڈیڈی کے پاس گئے تو ڈیڈی نے ان سے بالکل صاف کہہ دیا۔

"بہت دنوں سے کہنا چاہ رہا تھا اس سے قبل کہ نوید تمہارے گھر والوں کے لیے بوجھ بن جائے بہتر یہی ہوگا کہ اسے ہمارے پاس چھوڑ دو اس وقت تک کے لیے جب تک تم برسرِ روزگار نہ ہو جاؤ پھر لے جانا" رشید پر گھڑوں پانی پڑ گیا خشک گلے سے اس نے جواب دیا

"والدین سے پوچھ کر لکھ دوں گا۔"

"پوچھنا کیا ہے اس غریب کی تعلیم بھی ادھوری رہ گئی۔ نوید کو چھوڑ جاؤ۔ تاکہ یہاں رہ کر وہ اپنی تعلیم کی طرف توجہ دے۔ یہی تم دونوں کے حق میں بہتر ہوگا۔"

نوید رک گئی رشید واپس بنارس چلا گیا اس کی باتیں سن کر رشید کی والدہ بولیں

"پڑھائی وڑھائی تو بہانا ہے دراصل تمہارے ابو کے ریٹائر ہو جانے سے دلہن بیگم کو وہ پہلے جیسا آرام اب یہاں مل نہیں رہا ہے اس لیے میکے رہنا چاہتی ہیں تو رہیں"

مگر ان کے والد کسی طور تیار نہیں تھے اس لیے رشید نے لکھ بھیجا "والدین کی رائے نہیں ہے نوید واپس آجاؤ۔"

ڈیڈی کو غصہ بہت آیا اور رنج بھی ہوا وہ ممی سے کہنے لگے آخر یہ لڑکا کچھ سمجھتا کیوں نہیں۔ نوید کس اذیت سے گذر رہی ہے اس کا اسے احساس تک نہیں۔ بالکل ہی ناکارہ ہے اور پھر یہ کہ آجاؤ کوئی لینے نہیں آسکتا بس چلی آؤ۔ مگر میں اب نہیں جاؤں گا اسے پہنچانے نوید رشید کو لکھ دو"

نوید جانتی تھی سمجھتی تھی وہاں کیا ہوا ہوگا رشید کو اتنی گنجائش ہی کب دی گئی ہوگی جو وہ کچھ کہتے۔ نوید کو روتے دیکھ کر ڈیڈی کا دل رو پڑا وہ نوید کو سمجھانے لگے۔ جاتے جاتے نوید سے کہتے رہے۔

رشید سے کہہ دینا میری رائے پر پھر سے غور کریں۔ والدین کا منہ کب تک دیکھیں گے۔ وہ لوگ صاف طور پر تم لوگوں کی ذمہ داری سے گھبرا اٹھے ہیں۔ روتے دل سے انھوں نے نوید کو سسرال بھیج دیا۔

نوید کو دیکھتے ہی ساس کہہ اٹھیں "ارے آگئیں دلہن بیگم میں تو سمجھی تھی کالج جایا کرو گی۔" نوید آنسو پی کر رہ گئی۔

اور اب صبح و شام سب یکساں ہو گئے گھر میں ہر وقت مایوسی ہی مایوسی نوید کو دکھائی دیتی نوید کی ہر بات میں کوئی بات ایسی نکل آتی جسے لے کر ساس شروع ہو جاتیں اور نوید کے نصیب سے اس کے سبز قدم ہونے کو ثابت کر دیتیں۔ نوید اپنے آپ کو قصوروار اور منحوس سمجھنے لگی تھی یوں تو ہر وقت خونخوار آگ اگلتی ہوئی زبان کے سامنے نوید خاموش رہتی مگر اب ضبط کرنا اس کے بس سے باہر ہوتا جا رہا تھا اس نے رشید کو بہت سمجھایا۔ رشید نے سوچا "الگ ہو جانے سے مزید بدمزگی نہیں ہوگی" اس لیے نوید کے سامنے ہی اس نے اپنے والد سے بات شروع کی۔

والد نے برہمی سے کہا "ایک تو تم خود ابھی تک کسی لائق نہ ہو سکے اوپر سے دلہن بیگم کو ان کے میکے میں رکھ کر آگے پڑھانے کی تجویز لائے ہو۔ عقل بالکل ہی ماری گئی ہے۔ شوق ہے تو یہیں پڑھیں دلہن بیگم۔"

مگر ساس فوراً بولیں "دلہن بیگم کہیں رہیں وہی لے گا جو نصیب میں لکھا کے آئی ہیں ہم کیا کریں اور غریب رشید کیا کرے تقدیر کوئی نہیں بدل سکتا۔ یہ رونا دھونا کیسا تمہاری انھیں باتوں سے تو رشید گھبرایا رہتا ہے بیچارہ پڑھنے پر پوری توجہ نہیں دے پاتا۔" غصہ میں ساس بولتی رہیں۔

نوید اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی نجانے کب تک وہ

بڑی رو تی رہی اور کب سو گئی۔

صبح گھر میں خاموشی تھی۔ ڈاک سے نوید کے ڈیڈی کا خط آیا۔ بڑے افسوس کے ساتھ مگر پرزور الفاظ میں انھوں نے رشید کے والد کو لکھا تھا کہ ان لوگوں کی طرف سے انھیں مایوسی ہے اور رشید کی طرف سے نا امیدی اس لیے نوید کو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے میرٹھ بھیج دیں۔

ساس کا غصہ بڑے زوردار طوفان کی صورت میں پھٹ پڑا وہ نوید کو فوراً میکے بھیجنے کا حکم صادر کر بیٹھیں رشید کے والد باہر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

گھر میں تناؤ تو پہلے ہی بہت تھا اب تو باقاعدہ ہنگامہ تھا۔ ایک طرف خاموشی سے نوید کے بہتے آنسو اور دوسری طرف ساس کی بڑھتی ہوئی برہمی اور غصہ۔ دو دن اور گزر گئے مگر گھر کا ہنگامہ ختم نہیں ہو سکا ساس بضد تھیں نوید جاتی کیوں نہیں۔ رشید اور اس کے والد خاموشی سے کچھ سوچ رہے تھے۔ آخر ایک دن رشید کے والد اس سے کہنے لگے۔

"گھر کی عجب حالت ہو گئی ہے پورے محلے اور خاندان بھر کے لیے ہمارا گھر تماشہ بن گیا ہے۔ تمھاری والدہ کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا ہے وہ کچھ سوچنے سمجھنے کو تیار ہی نہیں ہیں ادھر دلہن بیگم کے آنسو بند نہیں ہو رہے ہیں۔ عزت تو مٹ ہی رہی ہے ڈرتا ہوں کچھ اور نہ ہو جائے اس لیے میری تو یہی رائے ہے تم کچھ دنوں کے لیے نوید کو اس کے میکے چھوڑ آؤ ان کے ڈیڈی نے بلایا بھی ہے پڑھنا چاہتی ہیں جائیں پڑھیں یا جو چاہیں کریں۔ میں اب مجبور ہو گیا ہوں۔"

رشید نے حیرت سے والد کی طرف دیکھا وہ ہارے ہوئے سے سر جھکائے بیٹھے تھے گویا اپنی ساری حقیقت کھول کر رکھ چکے تھے اور رشید کو ایسا لگا کہ زندگی کی اس طویل مسافت میں اب رشید تو وہی راہبر بھی ہے اور راہی بھی۔ مگر کیا کرے اس کے سامنے راستہ ہی کیا تھا جو منزل تک پہنچنے کے لیے قدم بڑھاتا۔ والد کہہ چکے تھے نوید کے والدین کی رائے عملی طور پر مناسب تھی مگر اس کی غیرت گوارا نہیں کر رہی تھی۔ پھر کیا کرے وہ سوچ رہا تھا مگر کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک عجب سی بے حسی اسے چاروں طرف نظر آ رہی تھی۔

دوپہر بعد وہ روزگار کے دفتر سے مایوس لوٹ رہا تھا راستے میں اسے پرویز ملا جو کسی کام سے ان دنوں بنارس آیا ہوا تھا۔ برسوں بعد ملے تھے۔ طالب علمی کے زمانے سے لیکر موجودہ زندگی تک کی باتیں انھوں نے ایک دوسرے کو بتائیں۔ پرویز کو رشید کی حالت پر حیرت تھی اور پوری ہمدردی بھی۔ ہونہار طالب علم ہونے اور شاندار رزلٹ کے باوجود رشید ابھی تک کچھ نہیں کر پایا تھا۔ سب کچھ سن کر پرویز نے بتایا کہ اپنی فرم کی طرف سے چند مہینوں کے لیے وہ غیر ملکی دورے پر جا رہا ہے اس کی غیر حاضری میں پرویز کا فلیٹ آگرے میں خالی پڑا رہے گا اگر رشید نوید کیا تو کچھ دنوں اس کے فلیٹ میں قیام کرنا پسند کرلے تو ان کے مکان کی حفاظت بھی رہے گی اور وقتی طور سے رشید کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

مگر رشید کی بات نوید نہیں مان رہی تھی اس طرح بے سروسامانی میں بغیر روزگار کے گھربار چھوڑکر اور آگرہ جاکر گذارہ کرنا ممکن نہیں تھا۔

لیکن، ساس کے بگڑے تیور سسر کے کمزور لہجے اور پھر رشید کے اپنے ارادوں کے سامنے وہ کچھ بول نہیں سکی ساری امنگیں جن سے زندگی عبارت تھی پہلے ہی مردہ ہو چکی تھیں شعلہ بننے کی امید میں چمکے چمکے سلگنے والی چنگاریاں خود بخود بجھ گئی تھیں۔

ضروری کپڑوں اور بستر کے ساتھ رشید نوید کو لے کر آگرہ چلا گیا۔ نوید کے پاس دو تین زیور ہی بچے تھے اور اب وہ بھی ایک ایک کر کے بکتے جا رہے تھے۔

رشید مقابلے کے امتحان میں تیسری اور آخری بار بیٹھنے کے لیے فارم لے آئے تھے مگر فیس کا مسئلہ سامنے تھا نوید کے ہاتھوں کے کنگن ہی اب بچے تھے۔ نوید نے رائے دی میرٹھ چلیے ڈیڈی کا غصہ بھی کم ہو جائے گا اور فیس کے روپے بھی مل

جائیں گے لیکن رشید کو دیکھتے ہی ڈیڈی کا غصہ ابل پڑا، کہنے لگے "چلے جاؤ میرے سامنے سے رشید اگر میں جانتا تم اتنے دکھ دو گے نوید کو تو میں یہ شادی نہ کرتا نجانے کس قصور کی اتنی بڑی سزا اللہ نے مجھے دی ہے۔ کون سا غم نوید کو نہیں دیا چلے جاؤ میرے سامنے سے اب شکل نہ دکھانا۔"

بجھا بجھا سا جھنجھلایا سا اپنے آپ میں گم۔ رشید ایک طرف سر جھکائے بیٹھا تھا۔ نوید نے ڈیڈی کو سمجھانا چاہا مگر ڈیڈی اپنے آپ کو روک نہ سکے کہنے لگے نوید جو کچھ تمہیں رشید سے کہنا چاہیے تھا وہ مجھ سے کہہ رہی ہو۔ عقل ہوتی تو سسرال چھوڑ کر یہاں آتیں ہماری رائے پر چلیں یوں ڈا وارثوں کی طرح آگرہ جا کر نہ رہتیں۔ بڑے خود دار بنتے ہو تم لوگ تو بنو مگر مجھ سے کوئی امید نہ رکھو"

نوید کی بات اس کے منھ ہی میں رہ گئی ڈیڈی کی باتوں سے نوید کا دل ٹوٹ گیا۔ اس آنگن میں اس نے دھوپ کے ساتوں رنگ دیکھے تھے تپش نہیں۔ یہاں نرم ہوائیں تھیں آندھی کے تیز جھونکے نہیں وہ اپنی بدنصیبی پر پھوٹ پھوٹ کر روتی آئی تھی۔ مگر رشید نے پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہہ دیا تھا "چلو اچھا ہے اب تم وہاں جانے کے لیے نہیں کہو گی"

نوید نے خاموشی سے اپنے کنگن اتار دیے [illegible] کر آئی۔ اے ایس کے مقابلے کے امتحان کی فیس جمع کر دی گئی تھی ——— رشید امتحان بھی دے چکا اور انٹرویو بھی دے آیا تھا اور دوسری جگہوں پر بھی درخواستیں دے کر نوکری پا لینے کی کوشش میں لگا ہوا تھا مگر نوید کو لگتا تھا سامنے بڑے بھیانک ویرانے ہیں جن میں زندگی کی شاہراہ کہیں نظر نہیں آتی۔

خیالات کے تانے بانے میں الجھی نوید سوچتی خوش نصیبی کے لیے بزرگوں سے ملنے والی دعائیں کیا بددعائیں بن کر قبول ہوئیں ہیں ورنہ ایسا بھی کوئی مجبور ہوتا ہے کہ نہ کوئی پرسانِ حال اور نہ غمگسار نوید کو خود اپنے آپ پر ترس آتا وہ باتیں کرتے کرتے رونے لگتی تھی مگر رشید ہنس کر کہتا

"بڑی پست ہمت ہو اتنی اتنی سی بات پر رونے لگتی ہو"

وقتی طور پر نوید کو تسکین ہوتی تھوڑی ہمت بندھ جاتی مگر پھر وہ سوچ میں پڑ جاتی کوئی کسی کا نہیں ہوتا حتیٰ کہ والدین بھی۔ اس کی دانست میں دونوں کے والدین کی زیادتی تھی اور انھیں لوگوں نے انھیں اس حال کو پہونچایا تھا اب وہ ہی اولین کا مقدر اور اسی مقدر کی وجہ سے تو اس کے سارے خواب ادھورے رہ گئے تھے اور دل ہر آرزو سے خالی ہو چکا تھا مگر رشید اسے یقین دلاتا "ہمارے بھی دن پلٹیں گے"

بس یہی آس نوید کو زندہ رکھے تھی اس طرح ہفتے اور مہینے گذر گئے۔

شام ہی سے آسمان ابر آلود تھا خنک و تند ہوائیں چل رہی تھیں۔ آج آئی اے ایس کا رزلٹ آنے والا تھا رشید نتیجہ دیکھنے گیا ہوا تھا۔ اپنے نصیب سے دہشت زدہ نوید خیالات میں کھوئی منھ لپیٹے جانماز پر پڑی تھی

فیوز اڑ گیا تھا سارا گھر اندھیرے میں ڈوب گیا تھا اس نے اٹھ کر روشنی بھی نہیں کی۔ وہ سوچ رہی تھی روشنی نصیب میں ہوتی تو فیوز ہی کیوں اڑتا اس کے نصیب روشن ہی کب تھے۔ جو آج کے اندھیرے میں روشنی کی آس وہ کرتی۔

رشید لپکتا ہوا اچانک گھر میں داخل ہوا۔ اس کی سانس نہیں سما رہی تھی۔ شاید دوڑتا ہوا آیا تھا۔ ہانپتے ہوئے اس نے نوید کو پکارا اور بتایا کہ وہ آئی۔ اے۔ ایس میں سلکٹ ہو گیا ہے۔

رشید نے شمع جلا کر میز پر لگا دی اور نوید کے پاس بیٹھ گیا۔ نوید کو ایسا لگا جیسے شمع کی ننھی سی لو ہالۂ نور بن گئی ہے مگر وہ اچانک سہم گئی کہ شاید وہ سوتے میں خواب دیکھ رہی ہے اور کوئی دم میں جاگ اٹھے گی اور پھر وہی مایوسیاں وہی اندھیرے سامنے ہوں گے۔

نوید پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ پاس بیٹھا رشید اس سے کہہ رہا تھا "نوید بہت ہو چکا بہت، میں سوچتا ہوں اب ہم اپنے آپ کو اور سزا نہیں دے سکتے ہم اپنے گھر جائیں گے بتاؤ کہاں چلو گی، پہلے میرٹھ اور پھر بنارس ٹھیک ہے نا؟" نوید نے سر اٹھا کر رشید کو دیکھا پھر بولی "نہیں پہلے بنارس چلیے اور پھر جلد ہی میرٹھ ڈیڈی کے پاس"

★

اختر شاہجہانپوری

شمسی خاں کا مل ۔ زنجین چوپال
شاہجہاں پور

○

مرے جو اشک تمہاری نظر میں رہتے ہیں
وہی تو دامنِ جذب و اثر میں رہتے ہیں

مقامِ شوق سے گزرے تو یہ ہوا معلوم
ہمیں تو چشمِ حقیقت نگر میں رہتے ہیں

بلند حوصلہ ہوتے ہیں کھیلنے والے جب
ہمیشہ ایسے سفینے بھنور میں رہتے ہیں

ہماری بے ہنری موجبِ ندامت ہو
اسی لیے صفِ اہلِ ہنر میں رہتے ہیں

ہم ایسے درد کے مارے بھی اور کیا ہوں گے
جو شام ہی سے امیدِ سحر میں رہتے ہیں

جنھیں ملا ہے مذاقِ جمال و حسنِ نظر
وہ خوش نصیب عموماً سفر میں رہتے ہیں

ہمیں عزیز ہے اجداد کا وطن اختر
اسی لیے تو اس اجڑے نگر میں رہتے ہیں

سلطان احمد نادم

ملک گیتی پھاٹک
بانسی کی مسجد ۔ لکھنؤ

○

حریفِ قطرۂ شبنم نہ ہوں گے
کبھی آنکھوں میں آنسو کم نہ ہوں گے

نہ بدلے گا نظامِ دشت و صحرا
ترے گیسو اگر برہم نہ ہوں گے

جو سر قدموں پہ تیرے جھک گئے ہیں
کسی کے آستاں پر خم نہ ہوں گے

انھیں کو فکرِ وصلِ یار ہو گی
جو رازِ عشق کے محرم نہ ہوں گے

نہ کم ہو گی تری محفل کی رونق
ہماری بات ہو گی ہم نہ ہوں گے

رہیں گے زخمِ دل ممنونِ نشتر
مگر شرمندۂ مرہم نہ ہوں گے

عنایت گر ترے غم کی رہے گی
زمانے بھر کے ہم کو غم نہ ہوں گے

بدل جائے گا نادم نظمِ دوراں
اشاراتِ جنوں مبہم نہ ہوں گے

اسد انصاری

۵۹/۳۸۵-۸-۱۶ کالا ڈیرہ کالونی
ملک پیٹ، حیدر آباد ۳۶

○

دل جو میرا کبھی تنہا، نظر آتا ہے مجھے
کچھ نہ پوچھے کوئی کیا کیا نظر آتا ہے مجھے

ہر ضیا پاشِ کرن میں، مہِ کامل کی نہاں
عکسِ حسنِ رخِ زیبا، نظر آتا ہے مجھے

منقلب ہوتے ہوئے دہر کے ہر منظر میں!
عبرت آموز نظارا، نظر آتا ہے مجھے

جو رگِ جاں سے بھی، نزدیک رہا کرتا ہے
عرشِ اعظم سے بھی اونچا، نظر آتا ہے مجھے

ہو گیا رشکِ رقابت سے مفر، ناممکن
جو بھی ہے آپ کا جویا، نظر آتا ہے مجھے

پا گئی میری نظر، گوہرِ مقصودِ نظر
ہر طرف آپ کا جلوا، نظر آتا ہے مجھے

ہو کے بے پردہ بھی، باقی ہے وہی عظمتِ حسن
عشق آوارہ و رسوا، نظر آتا ہے مجھے

رحم کر رحم، کہ میرا دلِ مایوسِ کرم
مائلِ ترکِ تمنا، نظر آتا ہے مجھے

دہر بے وجہ نہیں، درپئے آزار مرے
پسِ پردہ، ترا منشا، نظر آتا ہے مجھے

آتی ہے جب بھی، شبِ وعدہ، ترے آنے کی
اوّلِ شب سے، اجالا، نظر آتا ہے مجھے

رندِ مستِ مے میخانۂ امروز اسد
بے نیازِ غمِ فردا، نظر آتا ہے مجھے

نصیر ناطقی

بچے کیا ہیں

بچے ہی والدین کے نورِ نگاہ ہیں
ہم جن کی ہر خوشی کے لیے فرشِ راہ ہیں

بچے وفورِ غم میں ہیں تصویرِ انبساط
بچے ہر ایک رخ سے ہیں جاگیرِ انبساط

بچوں پہ ناز کرتی ہے تقدیرِ کائنات
بچوں کے دم قدم سے ہے تنویرِ کائنات

بچے حیاتِ دہر کا حاصل ہیں اصل میں
بچے ہمارے رونقِ محفل ہیں اصل میں

بچے غموں کے دور میں بھی خوشگوار ہیں
اقلیمِ دل کے اصل میں یہ تاجدار ہیں

تسکین بچے دیتے ہیں یوں اضطراب میں
جیسے ملے سکون، شبِ ماہتاب میں

اپنے معاملے میں بڑے باشعور ہیں
بچے تکلفاتِ زمانہ سے دور ہیں

آئینۂ خلوص ہیں، حق کا جمال ہیں
بچے ہی اتحاد کی روشن مثال ہیں

بچوں کے دم قدم سے ہے احساسِ برتری
اس برتری سے کیوں نہ ملے دل کو تازگی

بچے ہی انقلاب ہیں بچے ہی تیغ ہیں
میدانِ کارزار میں بے دریغ ہیں

بچوں کے میل جول سے ہم کو ادب ملا
دل کو سکوں کے ساتھ ہی عیش و طرب ملا

ہر زاویے سے بچے ہی اہلِ مزاج ہیں
یہ سچ ہے ان کے زیرِ قدم تخت و تاج ہیں

بچے نظر کا نور ہیں، بچے بہار ہیں
گلشن کی آبرو ہیں، سراپا وقار ہیں

بچے متاعِ حسن ہیں، بچے فضائے دہر
چلتی ہے ان کے نام سے ہر دم ہوائے دہر

بچے عناد و بغض و عداوت سے دور ہیں
دل آئینے ہیں ان کے کدورت سے دور ہیں

بچے ہمارے گوہرِ مقصود بے بہا
کوئی امیرِ قوم ہے تو کوئی رہنما

بچے ہی آرزوئے محبت کا عکس ہیں
سچ پوچھیے تو حسنِ حقیقت کا عکس ہیں

گاندھی بنا کوئی تو جواہر بنا کوئی
کوئی ہریش چندر تو اکبر بنا کوئی

گلشن کی آبرو ہیں محبت کے پھول ہیں
اللہ کی نوازش و رحمت کے پھول ہیں

خادم کبھی ہیں اور کبھی مخدوم بھی ہیں یہ
حاکم کبھی ہیں اور کبھی محکوم بھی ہیں یہ

بچے ازل سے رحمتِ پروردگار ہیں
ٹھنڈک نظر کی اور دلوں کا قرار ہیں

ان کی خوشی پہ دیتے ہیں ماں باپ جان تک
اک جان کیا ہے بھولے ہیں خود اپنی شان تک

پھولیں پھلیں یہ دہر میں اور کامراں رہیں
اللہ ان پہ تیرے کرم جاوداں رہیں

بچے ہی ملک و قوم کے وارث ہیں اصل میں
گہوارۂ امید میں پروان یہ چڑھیں

بچے ملے بہار ملی زندگی ملی
ہمراہ زندگی کے لبوں کو ہنسی ملی

اک التجا یہ شاعرِ شیریں سخن کی ہے
بچو! تمھیں سے لاج بھی اپنے وطن کی ہے

ڈاکٹر اقبال محی الدین
ریڈر شعبۂ جغرافیہ
این سی ای آر ٹی
نئی دہلی - ۱۱۰۰۱۶

کھیتی میں جینٹکس کی اہمیت

پروفیسر وی ایل چوپڑا سے ایک انٹرویو کی روشنی میں

پروفیسر وی. ایل. چوپڑا مشہور و ممتاز سائنس داں ہیں جو انڈین ایگریکلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی میں جینٹکس ڈپارٹمنٹ کے صدر اور پروفیسر ہیں۔ ان سے ڈاکٹر اقبال محی الدین نے ایک انٹرویو لیا تھا، جس میں پروفیسر چوپڑا نے جین کے ہر پہلو پر بہت خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ ——— ایڈیٹر

اناج، پھلوں، پھولوں اور سبزیوں کی بہتر پیداوار اور ان کی عمدہ قسمیں کے پیدا کرنے میں جینٹکس ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک پھل کے پودے کو دوسرے قسم کے اسی نسل کے پودے سے کراس cross کیا جائے تو نتیجے کے طور پر ایک بہترین قسم پیدا ہو سکتی ہے۔ اسی طرح گلاب کے پودے کو دوسرے گلاب کے پودے سے کراس کرنے سے ایک نئی قسم کا اچھا گلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ سبزیوں اور اناج کے پودوں پر بھی اکثر تجربات ہوتے رہتے ہیں جن کے کراس کرنے سے نئی نسل پیدا ہو جاتی ہے ان سب نئی قسموں کی پیداوار میں جینٹکس کا بہت اہم رول ہوتا ہے۔ چونکہ آج کل جینٹکس کا تجربہ بڑی بڑی تجربہ گاہوں میں کیا جا رہا ہے تاکہ اناج، پھل، پھول اور سبزیاں زیادہ اور عمدہ قسم کی ملیں جو ہماری بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو آسانی سے پورا کر سکیں۔ دہلی کا انڈین ایگری کلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (زرعی تحقیقی ادارہ) اس کام کو بخوبی انجام دے رہا ہے۔ یہاں گیہوں، چاول پھلوں اور سبزیوں کی ایسی قسمیں پیدا کی جا رہی ہیں جو کم سے کم وقت میں تیار ہو جاتی ہیں اور ہماری بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات پوری کرتی رہتی ہیں۔ یہ سب کمال ہے ہماری سائنسی ترقیات کا اور ہمارے سائنسدانوں کا۔ جو دن رات اپنی انتھک کوششوں سے جینٹکس پر تجربات کر کے ہمارے لیے مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔ انڈین ایگری کلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے ایک مشہور سائنس داں پروفیسر وی. ایل. چوپڑا صاحب جو جینٹکس پر کام کر رہے ہیں اور شعبہ جینٹکس کے صدر بھی ہیں، گزشتہ دنوں میں نے ایک انٹرویو لیا، تاکہ کھیتی میں جینٹکس کی اہمیت پر زیادہ واضح روشنی ڈالی جا سکے آیئے ان سے جینٹکس کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ ———

س۔ پروفیسر چوپڑا صاحب۔ ہمیں سب سے پہلے کچھ اپنے انسٹی ٹیوٹ کے بارے میں بتائیے کہ یہ کب قائم ہوا تھا اور اس کے قائم کرنے کا مقصد کیا تھا۔؟

ج۔ ۱۹۰۵ء میں سب سے پہلے یہ انسٹی ٹیوٹ شمالی بہار کے پوسا نامی دیہات میں قائم کیا گیا تھا لیکن ۱۹۳۶ء میں اس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کو دہلی منتقل کر دیا گیا، کیونکہ ایسے انسٹی ٹیوٹ کی ضرورت بڑے شہر میں تھی۔ اس کا نام انڈین ایگری کلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ رکھا گیا۔ اس کو پُوسا انسٹی ٹیوٹ دہلی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

پوسا انسٹی ٹیوٹ کے قائم کرنے کا مقصد کھیتی باڑی کو فروغ دینا تھا اور نئے نئے سائنسی تجربات کرنا تھا تاکہ کھیتی زیادہ سے زیادہ پروان چڑھ سکے۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں بیس شعبے ہیں، جو کھیتی کے پہلوؤں پر الگ الگ تجربات کرتے رہتے ہیں۔

انڈین ایگری کلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۱۹۵۸ء سے اپنی ڈگری بھی دیتا ہے۔ پھلوں، پھولوں، سبزیوں اور اناج کو بہتر بنانے کے لیے یہاں مستقل تحقیقی کام ہوتا رہتا ہے جس میں اس انسٹی ٹیوٹ کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

س۔ ڈاکٹر چوپڑا صاحب۔ آپ ایک عرصے سے انڈین ایگری کلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، دہلی میں بحیثیت صدر اور پروفیسر شعبۂ جینٹکس کام کر رہے ہیں۔ کیا آپ ہمیں بتائیں گے کہ آپ کے انسٹی ٹیوٹ میں کس طرح کی ریسرچ ہوتی ہے۔؟

ج۔ ہمارے انسٹی ٹیوٹ میں کھیتی باڑی کو فروغ دینے کے لیے کھیتی کے ہر پہلو پر ریسرچ ہوتی ہے۔ ہمارے بیش شعبوں میں الگ الگ پہلوؤں پر تحقیقی کام ہوتا رہتا ہے۔ ان شعبہ جات کے نام ہیں:
(۱) سوائل سائنس اینڈ ایگری کلچرل کیمسٹری (۲) ایگری کلچرل کیمیکلس (۳) ائی کالوجی اینڈ پلانٹ بائی تھولوجی (۴) اینٹو مولوجی (۵) نیماٹولوجی (۶) جینٹکس (۷) سیڈ ٹیکنولوجی (۸) ہورٹی کلچر (۹) ویجی ٹیبل کروپس (۱۰) فلوری کلچر، (۱۱) ایگری کلچرل فزکس (۱۲) مائکرو بائی لوجی (۱۳) ایگری کلچرل اکنامکس (۱۴) ایگری کلچرل ایکسٹینشن (۱۵) بائیوکیمسٹری (۱۶) پلانٹ فزی اولوجی (۱۷) ایگرونومی (۱۸) ایگری کلچرل انجینئرنگ (۱۹) نیوکلیر ریسرچ لیباریٹری (۲۰) واٹر ٹیکنولوجی۔

انڈین ایگری کلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے یہ سارے شعبہ جات پیڑ پودوں، پھل پھول اور اناج کی عمدہ سے عمدہ قسمیں تیار کرنے کے تحقیقی کام میں منہمک رہتے ہیں تاکہ ہمیں اچھے سے اچھا اناج۔ پھل۔ پھول اور سبزیاں ملتی رہیں۔ ان کے علاوہ مٹی کی صحت کو برقرار رکھنے اور صاف نیز صحت مند پانی پر بھی تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ اچھے بیج کی پیداوار اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ اناج اور پھل پیدا کیے جانے پر بھی یہاں تجربات ہوتے رہتے ہیں۔

س۔ جینٹکس کیا ہوتی ہے اور اس کی پیڑ پودوں اور جانوروں کے سلسلے میں کیا اہمیت ہے۔؟

ج۔ جینٹکس ایک سائنس ہے جو یہ بتانے کی سعی کرتی ہے کہ کیوں نباتات و حیوانات ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں یا مختلف ہوتے ہیں۔ جینٹکس کی اہمیت بہت ہے کیونکہ اسی کی وجہ سے پیڑ پودوں اور جانداروں کی قسمیں الگ ہوتی ہیں اور جینٹکس کے استعمال سے مخصوص قسم کے پودوں اور حیوانات کی قسمیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ جینٹکس کا ادویات کے سلسلے میں بھی بہت اہم رول ہوتا ہے مثلاً مائکروبس کی ایسی قسمیں پیدا کر دی گئی ہیں جو بہت زیادہ مقدار میں پینی سی لین اور اسٹریپٹو مائی سین مہیا کرتی ہیں جو بیماریوں کو روکنے میں معاون ثابت ہوئی ہیں۔

س۔ انڈین ایگری کلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کھیتی میں کیسے اور کس حد تک مدد کرتا ہے اور کون کون سی فصلیں اور پھل آپ وہاں پیدا کرتے ہیں یا اس سلسلے میں تجربہ کرتے ہیں۔؟

ج۔ پُوسا انسٹی ٹیوٹ کھیتی باڑی میں ترقی کے لیے دن رات کام کرتا رہتا ہے اور تقریباً ہر فصل اور پھلوں کی اچھی قسمیں پیدا کرنے کے سلسلے میں تحقیقی کام یہاں ہوتا رہتا ہے۔ مٹی کی زرخیزی کو قائم رکھنے، پانی کے صحیح استعمال، پودوں اور پھلوں کی بیماریوں پر تحقیق کے علاوہ کھیتی کو نقصان پہنچانے والے کیڑے مکوڑوں پر بھی تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایگری کلچرل اکنامکس اور ایگری کلچرل اکسٹینشن کے شعبہ جات بھی کھیتی کو فروغ دینے کے لیے کام کرتے رہتے ہیں

س۔ ہائی برِیڈ کیا ہے۔؟ ہم ہائی برِیڈ کیوں بناتے ہیں۔؟ کیا ان میں طاقت زیادہ ہوتی ہے اور یہ کیسے پیدا کیے جاتے ہیں۔؟

ج۔ ہائی برِیڈ ایک ہی Species کے دو جین کے اعتبار سے مختلف افراد کے کراس کا حاصل ہے۔ یقیناً تجربات کی حاصل ہائی برِیڈ بہتر نسل یا قسم ہوتی ہے جس میں طاقت بھی زیادہ ہوتی ہے اور اپنے والدین کے مقابلے میں وہ ہر طرح سے اعلا بھی ہوتے ہیں۔ جب دو پودوں کا کراس برِیڈ کیا جاتا ہے تو نتیجہ کے طور پر اچھی قسم کا پودا ملتا ہے۔ جیسے ہائی برِیڈ مکا جو دو الگ الگ قسموں سے پیدا کیا جاتا ہے۔

س۔ ایک سائنس داں جس کا نام کارپی چینکو تھا اس نے سرسوں اور مولی پر کچھ تجربات کیے تھے، ان تجربات سے کیا حاصل ہوا۔؟ کیا مولی اور سرسوں کی قسموں میں کچھ نمایاں تبدیلی ہوئی۔؟

ج۔ کارپی چینکو نے دو Species کو کراس کر کے اور ہائی برِیڈ کے کروموسومس کو دوگنا کر کے ایک نئی قسم کی فصل تیار کرنے کی کوشش کی اور یہ ثابت کر دیا کہ تجربہ کے طور پر ایک نئی قسم جو قدرتی طور پر نہیں ملتی، پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس تجربہ کے لیے اس نے سرسوں اور مولی کو کراس کر کے ایک نئی قسم جس کو Raphonobrassica کہتے ہیں، تیار کی۔ حالانکہ اس نئی قسم کے ذریعہ کھیتی کے اعتبار سے کوئی نمایاں کامیابی نہیں ہوئی مگر سائنسی اعتبار سے یہ غیر معمولی تجربہ کامیاب رہا۔

س۔ رائی اور گیہوں کے کراس سے کوئی خاص یا عمدہ اناج پیدا ہوا؟ اگر ہاں۔ تو ایسے اناج سے ہندستان کو مستقبل میں کیا فائدہ پہنچے گا۔؟

ج۔ رائی اور گیہوں کا کراس بنایا گیا جس کو سیکل Secale کہتے ہیں۔ سیکل میں کچھ قسم کی بیماریوں سے نجات پانے کے لیے قوت مدافعت بھی موجود ہے۔ یہ بھی محسوس کیا جاتا ہے کہ ایسی جگہوں پر جہاں زمین ریتیلی ہو اور پانی کم دستیاب ہوتا ہو، سیکل کی کھیتی زیادہ فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔ سیکل کی کھیتی پہاڑی خطوں اور ٹھنڈے علاقوں میں خاص طور سے کی جا سکتی ہے۔ اس لیے معاشی اعتبار سے سیکل کی کھیتی بہت فائدہ مند ہے۔

س۔ فصلوں کو بیماریوں سے بچانے میں جینیٹکس کیا رول ادا کرتی ہے۔؟

ج۔ فصلوں کو بیماریوں سے بچانے میں جینیٹکس بہت اہم رول ادا کرتی ہے۔ بیماریوں کو روکنے کے لیے پودوں میں مخصوص جین ہوتے ہیں اور ان جین کو ایک قسم سے دوسری قسم میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کسی بھی اچھی قسم میں بیماری کو روکنے والے جین منتقل کر کے پودوں کو بیماریوں سے بچایا جا سکتا ہے۔

س۔ ایک عام خیال ہے کہ کراس کرنے سے پیدا ہونے والے بیج اچھی قسموں کے نہیں ہوتے اور نہ ان میں طاقت ہی ہوتی ہے۔ مثلاً کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ فارم کے انڈوں میں وہ طاقت نہیں ہوتی جو دیسی انڈوں میں ہوتی ہے۔ یا کراسنگ سے پیدا ہونے والے آم اتنے مزے کے نہیں ہوتے اور اناج بھی اس طرح پیدا کیے جانے پر ان میں طاقت کم ہو جاتی ہے کیا یہ بات صحیح ہے۔؟

ج۔ یہ بات غلط ہے۔ کراس بیج اچھے اور عمدہ قسم کے ہوتے ہیں فارم کے انڈوں میں اتنی ہی طاقت ہوتی ہے جتنی دیسی انڈوں میں۔ مزہ میں فرق ضرور ہو سکتا ہے مگر طاقت میں دونوں انڈے برابر ہی ہوتے ہیں۔ آم کے کراس برِیڈ بھی عمدہ قسم کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا عام طور پر جو یہ خیال ہے کہ کراس کرنے سے پیدا ہونے والے بیج یا پھل اچھی قسم کے نہیں ہوتے، غلط ہے۔ ان میں طاقت بھی زیادہ ہوتی ہے اور لذیذ بھی ہوتے ہیں۔

س۔ دو الگ الگ قسم کے جانوروں کا ہائی برِیڈ بنانے سے کیا اچھی نسل پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً گھوڑے اور گدھی کے کراس سے کیا اچھی نسل پیدا ہوتی ہے۔؟

ج۔ جی نہیں۔ دو الگ الگ قسموں کے جانوروں کو کراس کرنے سے ہمیشہ اچھی نسل پیدا نہیں ہوتی کیونکہ دونوں ایک گروپ سے تعلق نہیں رکھتے۔ گھوڑے اور گدھی کے کراس سے خچر پیدا ہوتا ہے جو نہ تو گھوڑا ہی ہوتا ہے اور نہ ہی گدھا۔ اس کا دوسرا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ خچر نامرد ہوتا ہے اس کو صرف بوجھ اٹھانے یا گاڑی کھینچنے کے لیے انسان پیدا کرا لیتا ہے۔

س۔ سائنسی تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جانوروں میں گروپ ہوتے ہیں۔ کیا ایسے ہی گروپ پیڑ پودوں میں بھی ہوتے ہیں؟ اگر ہاں۔ تو ان کے فائدے اور نقصان بتائیے۔

ج۔ جس طرح جانوروں میں گروپ ہوتے ہیں اسی طرح پیڑ پودوں میں بھی گروپ ہوتے ہیں۔ ان گروپوں کا فائدہ یہ ہے کہ فصلوں کو بغیر ضائع کیے قائم رکھا جا سکتا ہے۔ نقصان یہ ہے کہ کچھ اچھے جین جو ایک گروپ میں موجود ہیں بہ آسانی دوسرے گروپ میں منتقل نہیں کیے جا سکتے۔

س۔ سومیٹک سیلس کیا ہیں اور ان سے پودا کیسے تیار ہوتا ہے؟ آلو اور ٹماٹر کے سیلس کو فیوز کر کے کچھ تجربات کیے گئے۔ ان کا کیا نتیجہ نکلا۔؟

ج۔ ہمارا جسم سیلس سے بنا ہے۔ اس کی مثال آپ شہد کی مکھی کے چھتے سے لے سکتے ہیں۔ شہد کی مکھی کے چھتے کا ہر خانہ ایک سیل کی مانند ہے۔ اسی طرح ہمارا جسم بھی کروڑوں سیلس سے مل کر بنا ہے۔ ان سیلس کو سومیٹک سیلس کہتے ہیں۔

سومیٹک سیلس کو فیوز کر کے ہائی برڈ بنایا جا سکتا ہے۔ اور پھر ان سیلس کو Differentiate کر کے پودا بنایا جا سکتا ہے۔

عام طور پر آلو اور ٹماٹر کو ان کے پھولوں کے ذریعہ کراس نہیں کرایا جا سکتا لیکن سومیٹک سیلس کا استعمال کر کے یہ کراس ممکن ہو گیا ہے۔ آلو اور ٹماٹر کے کراس سے Pomato حاصل کیا گیا جو زمین کے نیچے آلو اور شہنیوں پر ٹماٹر کی طرح کا ایک پھل نکلا۔ یہ ابھی تجربات کی ہی حد میں ہے جو ابھی کھانے کے لائق نہیں ہے لیکن مستقبل قریب میں امید ہے کہ ایسے تجربات کامیاب ہوں گے۔

س۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ آم کی فصل ہر سال بہت اچھی نہیں ہوتی بلکہ اچھی فصل ایک سال چھوڑ کے ہوتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

ج۔ اس میں بھی جنیٹکس کا عمل کارفرما ہے۔ ایک سال چھوڑ کے اچھی فصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اچھی فصل والے سال میں اتنے پھل آ جاتے ہیں کہ پیڑ کی طاقت کم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے آنے والے سال میں پھل بہت کم آتے ہیں لیکن قسموں میں جنیٹکس کے اعتبار سے ایسی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں کہ ALTERNATE BEARING نہ ہو اور ہر سال فصل عمدہ ہو۔

س۔ پوسا انسٹی ٹیوٹ نے حال ہی میں تجربہ کے طور پر نیلم آم جو جنوبی ہندستان میں بہت پیدا ہوتا ہے اور ہر سال اس کی فصل اچھی ہوتی ہے اور دسہری آم جو شمالی ہندستان میں ایک سال چھوڑ کے اچھی فصل دیتا ہے، دونوں آموں کی قسموں کا ہائی برڈ بنایا۔ اس سے پیدا شدہ آم کا نام "ملکہ آم" رکھا گیا۔ کیا اس طرح کا کراس ہر سال آم دیتا رہے گا اور کیا یہ آم ذائقہ میں بھی اچھا ہوگا۔ ملکہ آم تجربہ گاہ سے عوام تک کب پہنچے گا۔؟

ج۔ یہ آم اچھی قسم کا ہے جس کو آپ ملکہ آم کہتے ہیں۔ اس کراس سے فائدہ یہ ہوا کہ ملکہ آم ہر سال پوری فصل دیتا رہے گا۔ بلکہ آم میں گودا اور خوشبو دسہری آم کی آئی اور فصل نیلم جیسی ہر سال والی آئی اور ملکہ آم ہر سال کثیر تعداد میں پیدا ہونے لگا۔ ہماری تجربہ گاہ سے یہ آم عوام تک پہنچ چکا ہے۔ اور کافی مقبول بھی ہوا ہے۔

س۔ انڈین ایگری کلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے گیہوں، چاول اور دوسرے اناج کی ہائی برڈ قسمیں پیدا کرنے میں کیا کارہائے نمایاں انجام دیے۔؟

ج ۔ گیہوں، چاول، مکا، باجرہ، جوار، کپاس اور چارہ کی قسمیں پوسا انسٹی ٹیوٹ نے تیار کرلی ہیں جو جلد ہی پک کر تیار ہوجاتی ہیں اور زیادہ پیداوار دیتی ہیں۔ ان قسموں کی تیاری سے کھیتی باڑی کو بہت فروغ حاصل ہوا ہے۔

س ۔ مستقبل میں انڈین ایگری کلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے کیا ریسرچ پلان ہیں۔ ؟ اناج، پھل اور پھولوں کے علاوہ کیا دودھ دینے والے جانوروں کی نسلوں کو سدھارنے کا بھی منصوبہ ہے۔ ؟ اگر ایسا ہے تو اس سے ملک کو کیا فائدہ پہنچے گا ؟

ج ۔ مستقبل میں انڈین ایگری کلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے بہت سے ریسرچ پلان ہیں جن میں کھیتی کے ہر پہلو پر سائنسی تحقیقات کی جائے گی تاکہ ہمیں معلوم ہوتا رہے کہ کھیتی کی مزید ترقی کیسے ہو ؟ فصلوں کو بیماریوں سے بچانے کی دوائیں اور ترکیبیں ایجاد ہوتی رہیں گی۔ مٹی کی زرخیزی قائم رکھنے اور اس کو صحت مند رکھنے کے لیے صحت مند کام ہوتا رہے گا۔ صاف پانی پر ریسرچ ہوتی رہے گی تاکہ وہ پانی جب پودوں کو دیا جائے تو ان میں بھی زندگی کے عنصر شامل ہوسکیں اور پودے شاداب رہیں۔

ہندستان کو اناج کے سلسلے میں خودکفیل بنانے کے لیے اناج کی عمدہ قسمیں جینیٹکس کے ذریعہ پیدا کر کے عوام تک پہنچانے کا کام بھی ہوتا رہے گا۔ پھلوں اور سبزیوں کے علاوہ پیداشدہ پھل اور سبزیاں زیادہ سے زیادہ عوام کو فائدہ پہنچاتی رہیں گی۔ ان سب پہلوؤں پر پوسا انسٹی ٹیوٹ تحقیقی کام کرتا رہے گا۔

جانوروں کی نسلوں کو سدھارنے اور جینیٹکس پر تحقیقی کام کرنال کا انسٹی ٹیوٹ کر رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ دودھ دینے والے جانوروں پر مزید تحقیقی کام بھی وہاں ہوتا رہے گا اور اچھی نسلوں کے جانوروں کا ہائی برِیڈ بھی وہاں تیار ہوتا رہے گا تاکہ ہمیں زیادہ سے زیادہ دودھ ملتا رہے۔ جس سے ہماری بڑھتی ہوئی آبادی کی ضرورت پوری ہوسکے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کھیتی میں جینیٹکس کی کتنی زیادہ اہمیت ہے۔ نہ صرف پیڑ پودوں کو ہی کراس کرنے سے عمدہ پیداوار اور عمدہ پھل اور اناج ملتے ہیں۔ بلکہ کھیتی کے جانوروں کی نسلوں کو سدھارنے میں بھی جینیٹکس بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ دہلی کا انڈین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور خاص طور سے اس کا جینیٹکس ڈپارٹمنٹ اپنے تجربات سے عوام کو مستقل فائدہ پہنچا رہا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج کل کی کھیتی "سائنسی کھیتی" ہوگئی ہے۔ جس میں جینیٹکس ایک اہم رول ادا کر رہی ہے۔

وہ دن دور نہیں جب ہمارے سائنس داں اپنی انتھک کوششوں سے کھیتی کی ترقی میں چار چاند لگادیں گے اور ملک پیداوار کے لحاظ سے خودکفیل ہوجائے گا۔

★

فراق نمبر: تاثرات کے آئینے میں

سید علی شبر حسینی کرھانی

۲۶۶۔ پرانا قلعہ لکھنؤ

آپ کا فراق نمبر ملا۔ واقعی آپ کی کاوش قابل تعریف ہے آپ نے محنت کی ہے اور نیا دور کا یہ خاص نمبر آپ اپنی مثال ہے۔

فاخر جلال پوری

جلال پور، فیض آباد

ماہنامہ نیا دور عرصے سے دیکھتا ہوں۔ اس کے بہت سے نمبر دیکھے جو بہت خوب بھی رہے مگر "فراق نمبر" کے "خوب تر" کا جواب نہیں بہرحال فراق نمبر صوری و معنوی دونوں اعتبار سے امکانات سے زیادہ خوبصورت اور اہم ہے۔

انیس قدر آزاد

قمر آزاد اردو لائبریری، دانا پیر بہوڑ۔ پٹنہ

نیا دور کا فراق نمبر نکالنے پر میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیے۔ اتنا عمدہ اور ضخیم نمبر فراق صاحب پر اتنے کم داموں پر آپ نے اردو ادب پر اور طلباء پر جو احسان کیا ہے اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر غلام مرتضیٰ

پرنسپل انٹرنیشنل کمرشیل انسٹی ٹیوٹ، بہار شریف

آپ کا ارسال کردہ نیا دور کا فراق نمبر بصد شکریہ وصول ہوا۔ آپ نے جس حسین و جمیل پیرائے میں اس گلدستۂ فکر و نظر کو آراستہ کیا ہے اس کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ظفر مرزاپوری

تحصیل داری لین، مرزاپور

فراق نمبر نظر نواز ہوا۔ پرچہ بہت خوبصورت ہے۔ مواد اور ضخامت کے اعتبار سے بام عروج پر نظر آتا ہے۔ بیک وقت اتنے اچھے اچھے قلم کاروں کو یکجا کرنا آسان کام نہیں ہے۔ میری جانب سے دلی مبارک باد اپنی کاوش و محنت پر ضرور قبول فرمایئے۔

سید نور الدین

99/3 کنگھی محال۔ کان پور

ارسال کردہ فراق نمبر مجھے مل گیا شکریہ! فی الحال یہ نمبر پڑھ تو نہیں سکا ہوں مگر اس کے حسن و ضخامت سے پہلی ہی نظر میں کوئی مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اتنا خوبصورت اور دیدہ زیب نمبر نکالنے پر دلی مبارک باد قبول فرمایئے۔

سید قمر رضا

ایڈیٹر پندرہ روزہ "بازگشت" امروہہ، یو۔پی

نیا دور کا فراق نمبر حصۂ اوّل موصول ہو کر نظر نواز ہوا۔ فراق نمبر واقعی فراق کی عظیم ہستی اور قدآور شخصیت کے شایانِ شان ہے۔ اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو کہ ہونا چاہیے تھا۔

میری نظر سے اب تک نیا دور کے جتنے نمبر گزرے ہیں ان میں فراق نمبر امتیازی شان رکھتا ہے۔

—— ——

محمد منظور کمال
اقبال اُردو لائبریری۔ بیگو سرائے (بہار)
فراق نمبر بذریعہ رجسٹری مل گیا جس کے لیے بہت بہت شکریہ ایک نظر دیکھنے کے بعد بے اختیار منہ سے تحسین کے الفاظ نکل گئے یہاں بہت سارے حضرات اسے خریدنے کے لیے بے قرار ہیں۔

ذہین پرویز
۱۹۰۲ ۔ خدمت گار محلہ (مدھیہ پردیش)
نیا دور کا مارچ، اپریل، مئی کا شمارہ مجھے ملا اس کی دیدہ زیبی اور ضخامت کا جواب نہیں۔ اس خاص نمبر کے لیے مبارکباد قبول فرمائیں۔

ماسٹر سید قمر رضا رضوی
شیش محل، لکھنؤ
آپ نے فراق نمبر حصہ اوّل شائع کر کے محض فراق فہمی میں پرستاران اُردو ادب کی ادبی خدمت ہی نہیں کی ہے بلکہ اُردو ادب کو سپہر شہرت پر پہنچانے کے لیے ایک سعی بلیغ کی ہے آپ کی یہ سعی بلیغ قابل ستائش ہے ع
اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

امیر محمد افضل انصاری
مئو ناتھ بھنجن، یو۔پی
فراق نمبر میں نیا دور کے نمبروں کی روایت آپ نے نہ صرف برقرار رکھی بلکہ اسے بلند سے بلند تر کرنے میں کوئی دقیقہ آپ نے فروگذاشت نہیں کیا۔ میری مبارکباد قبول فرمائیں۔ آپ کے لیے بھی اور معاونین کے لیے بھی۔

سید حسن اختر
جس پور۔ نینی تال
نیا دور کا فراق نمبر، فراق کی عظمت کی نشاندہی کرتا ہے۔

نثار جنگپوری
پروا جنگن پور، نوتنوا، گورکھپور
نیا دور کا فراق نمبر نہایت وقیع ضخیم اور دلکش ہے ایسا بصیرت افروز نمبر شائع کرنے کے لیے آپ حضرات صحیح معنوں میں مبارکباد کے مستحق ہیں۔

معیز اللہ فاروقی
سندورہ لال گوپال گنج، الٰہ آباد
نیا دور بذریعہ رجسٹرڈ لفافہ ملا، شکریہ! رگھوپت سہائے صاحب جیسی اُردو زبان و ادب کی قد آور شخصیت کے شایان شان اتنا خوبصورت اور اپنے آپ میں مکمل نمبر منظر عام پر لانے کے لیے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

تاج پیامی
دارالادب، مہاریوا محلہ آرہ (بہار)
آپ کا ترتیب دیا ہوا نیا دور کا فراق نمبر نظر نواز ہوا بے حد پسند آیا۔

سلیم اللہ
پھانی۔ ضلع ہردوئی
نیا دور کا فراق نمبر نظر نواز ہوا، آپ نے فراق نمبر نکال کر بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ بلکہ فراق جیسے عظیم المرتبت شاعر کو سمجھنے اور ان پر تحقیقی یا تنقیدی کام کرنے والوں پر ایک عظیم احسان کیا ہے

سید زین العابدین
رانچی۔ (بہار)
نیا دور کا فراق نمبر موصول ہوا۔ دیکھتے ہی دل خوش ہوگیا۔ نیا دور کے اب تک جتنے بھی نمبر نکلے سبھی اپنی جگہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زیر نظر نمبر انتخاب اور مضامین کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ کتابت و طباعت کے لحاظ سے بھی بہت خوبصورت ہے۔

بلقیس شبیہ
اکولہ۔ (مہاراشٹر)
نیا دور کا فراق نمبر ملا۔ بے حد پسند آیا۔ اتنا معلوماتی دلچسپ اور دلفریب نمبر نکالنے پر میری جانب سے مبارکباد قبول کیجیے اور تمام رفقائے کار تک بھی میری مبارکباد پہنچا دیجیے۔ ★

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب : "قصر جوش" (شعری مجموعہ)

شاعر : جوش ادیب   قیمت : دس روپئے

ملنے کا پتہ : جوش ادیب ، بارسی ٹکلی . ضلع اکولہ (مہاراشٹر)

"قصر جوش" جناب سید مشتاق حسین جوش ادیب کی ۵۰ عام فہم نظموں کا مجموعہ ہے . جو بچوں کے لیے سلیس زبان میں چھوٹی چھوٹی بحروں میں لکھی گئی ہیں . ان میں سے بیشتر میں کچھ نہ کچھ درس ملتا ہے . کچھ نظمیں قومی بزرگوں کی حیات و کارناموں سے متعلق ہیں . جن کا جاننا بچوں کے لیے ضروری ہے . شاعر نے موضوعات کے انتخاب میں بھی اس کا لحاظ رکھا ہے کہ وہ بچوں کے مذاق کے مطابق ہوں .

مجموعی طور پر یہ کتاب بچوں کے لیے دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی . ہمارے یہاں چونکہ بچوں کے ادب کی کمی ہے چنانچہ اس نقطۂ نگاہ سے بھی جناب جوش ادیب کی کاوش قابل ستائش ہے . شاعر کے طرز بیان میں روانی و شگفتگی ہے . مثلاً نظم "شام کی آمد" دیکھیں ؎

پیارے بچو آئی شام
بند ہوا دنیا کا کام
چڑیاں شور مچاتی ہیں
گیت خدا کے گاتی ہیں

—— راجیندر بہادر موج

نام کتاب : "زندگی اے زندگی" (شعری مجموعہ)

شاعر : خلیل الرحمان اعظمی ، قیمت : چھ روپئے

ملنے کا پتہ : اترپردیش اردو اکیڈمی ، قیصر باغ لکھنؤ

خلیل الرحمان اعظمی کی وفات (یکم جون ۱۹۷۸ء) کے تقریباً پانچ سال بعد ۱۹۸۲ء کے آغاز میں ان کے آخری مجموعہ کلام "زندگی اے زندگی" کی اشاعت اترپردیش اردو اکاڈمی کے زیر اہتمام عمل میں لائی گئی ہے . اس مجموعہ کلام کو بیگم راشدہ خلیل نے ترتیب دے کر ایک مقدمہ بھی سپرد قلم کیا ہے . جس کی بدولت "زندگی اے زندگی" کے مطالعہ میں بڑی مدد مل سکتی ہے .

خلیل صاحب کی شاعری میں ایک نیا رنگ و آہنگ اور سوز و گداز پایا جاتا ہے . ان کی شاعری عصری حسیت کے ساتھ مستحکم شعری روایتوں کی حامل ہے . خلیل صاحب کی شاعری پر میر تقی میر اور بہادر شاہ ظفر کے اثرات نمایاں ہیں . ایسا غالباً اس لیے ہے کہ ماحول اور زمانہ نے ان کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا جس کے شکار کم و بیش مذکورہ پیش رو شعراء ہوئے .

اس مجموعہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قدم قدم پر شاعر کو اداسیوں ، بے خوابیوں اور تنہائیوں نے گھیر رکھا ہے . ان کے یہاں اظہار و بیان کا جو اسلوب ہے وہ بڑا ہی تاثر انگیز اور مسحور کن ہے کہ پڑھنے والے پر بھی جذبات و احساسات طاری ہو جاتے ہیں جن سے شاعر دوچار ہوا . چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

عزیزو تم کو میری تشنہ تر سے کتنا شکوہ تھا
چلو اب خوش رہو اپنا یہ پیمانہ بھی خالی ہے

سو گئے ایک ایک کر کے خانۂ دل کے چراغ
ان چراغوں کو جگا دے زندگی اے زندگی

وہ بساط شعر و نغمہ ، رت جگے وہ چہچہے
پھر وہی محفل سجا دے زندگی اے زندگی

ایک مدت ہو گئی روٹھا ہوں اپنے آپ سے
پھر مجھے مجھ سے ملا دے زندگی اے زندگی

پاس اپنے کیا رہا بس اک عمر در مفلسی!
اس کی کیا قیمت لگائیں اس کا کیا سودا کریں
اپنا مقدر تھا یہی اسے منبع آسودگی
بس تشنگی بس تشنگی، گو پاس تھا دریا ترا
یاں تو سب لوگ ہیں دستارِ فضیلت باندھے
کوئی ہم سا جو ہو محفل میں تو ہم بھی بیٹھیں!

نثار اعظمی

نام کتاب: **"نکھار"** (رضا نقوی واہی نمبر)
قیمت: بیس روپیے۔ ملنے کا پتہ: نکھار پبلی کیشنز ڈومن پورہ
مئو ناتھ بھنجن۔ ۲۷۵۱۰۱ (یو۔پی)

ضلع اعظم گڑھ میں دار المصنفین کے اشاعتی پروگرام کے بعد "نکھار" پبلی کیشنز نے جو تاریخی ادبی رول ادا کیا ہے وہ اب اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ مجاہدینِ صحافت نسیم اعظمی اور بقا اعظمی نے اس وقت صحافت کے خارزار میں قدم رکھا تھا جب ان کی مسیں بھیگ رہی تھیں اور آٹھ سال کے مختصر عرصہ میں اپنے خلوص، محنت، جانفشانی اور لگن سے انھوں نے نہ صرف اس پر آشوب دور میں ماہنامہ "نکھار" کی اشاعت جاری رکھی، بلکہ یکے بعد دیگرے چودہ کتابیں شائع کر کے اہلِ علم و ادب سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔

"رضا نقوی واہی نمبر" بھی نکھار پبلی کیشنز کے منظم اشاعتی پروگرام کی ایک خوبصورت سنہری کڑی ہے۔ یہ ایک ایسا چمن ہے جس کی آبیاری نسیم اور بقا نے اپنے خونِ جگر سے کی ہے۔ صفحہ ۳۱ سے ۱۹۲ تک مشاہیرِ ادب کے ۲۲ مضامین شامل ہیں۔ ان شگفتہ تحریروں میں واہی کی دل چسپ شخصیت کے چند مبہم اور غیر واضح نقوش ضرور ابھرتے ہیں لیکن ان کے شعری مرتبہ کے تعین کی کوشش خاص طور سے نمایاں ہے۔ ڈاکٹر سید حامد حسین کا مضمون اپنے اختصار کے باوجود قاری کے ذہن پر ایک نقش چھوڑ جاتا ہے — "ایک ایسا سخن گسترانہ بلوہ کہ نہ کرفیو سے قابو میں آئے اور نہ مارشل لا سے زیر ہو.....

وہ (واہی) جس پر دھاوا بولتے ہیں چوکھی لڑتے ہیں اور اس کے تحت ذوق کو بھی سلامت نہیں رہنے دیتے۔ ان کے اندر کا شاعر، راون کا نیا سے نیا سر نکالتا جاتا ہے اور ان میں کا سیف زن، ایک ایک کو قطع کر کے اپنے لیے منارِ فتح چنتا جاتا ہے۔ لیکن اصلی کمان دار ان کے اندر کا شاعر ہی ہے؟

بمبئی کے قلم کاروں میں یوسف ناظم نے حسبِ روایت "گل افشانیٔ گفتار" کے جوہر دکھائے ہیں۔ لیکن پروفیسر یداللہ مہدی کا مضمون خاص طور سے توجہ طلب ہے۔ پروفیسر عبد المغنی، تاج پیامی، مناظر عاشق ہرگانوی اور حسن علی مرزا نے بڑی محنت اور کاوش سے اپنے افکار سپردِ قلم کیے ہیں۔ اویس احمد دوراں نے لفظوں کی بھول بھلیاں میں گرفتار ہوئے بغیر دو ٹوک بات کہی ہے۔ علقمہ شبلی کا مضمون "واہی اور کلکتہ" خاصا دلچسپ ہے۔ اور عبد المحمود کے لیے قاری کو مضامین کی یکسانیت اور بوجھل فضا سے نجات دلاتا ہے۔

لیکن "رضا نقوی واہی نمبر" میں ایک مضمون بھی ایسا نہیں ہے جسے ہم صحیح معنوں میں واہی کا شخصی خاکہ کہہ سکیں۔

صفحہ ۱۹۳ سے ۲۰۵ تک شعراء کرام نے واہی کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ صفحہ ۲۰۶ سے ۲۱۴ تک "کلام واہی" کا مختصر انتخاب مرتبین کی عجلت کا ثبوت ہے۔ اوّل تو یہ کہ اس انتخاب کے لیے مزید صفحات درکار تھے۔ دوم یہ کہ وہ نظمیں جن کے مفصل حوالے مختلف مضامین میں موجود تھے۔ مثلاً "انٹرویو"، "غالب صدی اور اردو"، "ایڈیٹر اور لیڈر" وغیرہ ان کو اس انتخاب سے خارج کر کے تکرارِ بے جا سے بچنا چاہیے تھا اور ان کے بجائے دوسری اہم نظمیں شامل کر کے محدود صفحات کا زیادہ موثر اور مناسب استعمال کرنا چاہیے تھا۔

بحیثیت مجموعی واہی نمبر کی جملہ خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے یقین ہے کہ اہلِ نظر اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور دنیائے علم و ادب میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

غلام رضوی گردش

*

Vol. 38 No. 8
NOVEMBER, 1983
50 paisa

Urdu Monthly
NAYA DAUR

REGD .No. LW/NP-17
Annual Subs.
Rs. 5/-

POST BOX No. 146 LUCKNOW 226001

جلد ۳۸ نمبر ۹

دسمبر ۱۹۸۳ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: گنگا دھر پرشاد شکلا

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلی کیشن برانچ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو

آئینہ تاب

ہماری سیاسی اور سماجی زندگی کے دو اہم سپاہی، سید علی ظہیر اور جنرل شاہنواز خاں گذشتہ دنوں ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔

سید علی ظہیر صاحب

سید علی ظہیر صاحب نے ہندستان کی جنگ آزادی میں نمایاں طور پر حصہ لیا اور اس کے لیے مصائب برداشت کیے۔ آزادی کے بعد اتر پردیش کی سیاست میں انھیں ایک نمایاں حیثیت حاصل رہی۔ ایک طویل عرصہ تک وہ کابینی وزیر کے عہدے پر فائز رہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کی سماجی و ثقافتی زندگی میں بھی وہ ہمیشہ فعال رہے۔ ادبی جلسوں اور مشاعروں میں بھی پوری دلچسپی کے ساتھ شریک ہوتے رہے۔ خرابیٔ صحت سے پہلے لکھنؤ کے بیشتر ادبی جلسوں اور مشاعروں کی صدارت یا افتتاح انھیں کے ہاتھوں انجام پاتا تھا۔ وہ لکھنؤ کی مخصوص تہذیب کی ایک متحرک تصویر تھے۔ رواداری، انکساری، ملنساری اور دھیمی آواز میں گفتگو کرنا، یہ تمام خصوصیات ان کی شخصیت کا اٹوٹ جز تھیں۔ وہ لکھنؤ کی معاشرتی اور مجلسی زندگی کا ایک مستحکم ستون تھے۔ نئی نسل اور نوجوانوں کی انھوں نے ہمیشہ حوصلہ افزائی کی، انھیں آگے بڑھایا اور بہت سے ذروں کو آفتاب بنا دیا۔ ان کا انتقال بلاشبہ ہماری سیاسی و معاشرتی زندگی کا ایک بڑا نقصان ہے جس کی تلافی شاید ہی ہو سکے۔

جنرل شاہنواز خاں

جنرل شاہنواز خاں ہندستان کی جنگ آزادی کے ایک ممتاز سپاہی تھے۔ وہ بنیادی طور پر ایک فوجی تھے۔ ملک کی جنگ آزادی میں انھوں نے اسی فوجی اسپرٹ اور حوصلے کے ساتھ حصہ لیا۔ نیتاجی سبھاش چندر بوس نے جب آزاد ہند فوج میں شامل ہونے کی ہندستانیوں کو دعوت دی تو بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق کے مصداق وہ آزاد ہند فوج میں شامل ہو گئے اور نیتاجی کے قریبی رفیق کی حیثیت سے انھوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ حصول آزادی کے بعد وہ ملک کی تعمیر و ترقی کے کاموں میں لگ گئے۔ اور یہاں بھی انھوں نے فوجی اسپرٹ اور فوجی ڈسپلن کا مظاہرہ کیا اور بے باکی نیز حق گوئی کی ایک قابل تقلید مثال پیش کی۔ وہ مرکز میں وزیر کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ اس کے علاوہ جمعیۃ العلماء سے بھی ان کا سرگرم تعلق رہا۔ اقلیتوں کے مسائل کے حل کے لیے بھی وہ نہ صرف یہ کہ فکرمند رہے بلکہ سرگرم عمل بھی رہے۔ فرقہ پرست عناصر اور فرقہ پرست سیاست سے وہ ہمیشہ دور رہے۔ مذہب کے نام پر سیاست کرنے والے عناصر انھیں اپنے حلقے میں شامل کرنے کی کوششوں میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکے۔ وہ ایک نیشنلسٹ مسلمان تھے اور آخری وقت تک ان کا انداز فکر یہی رہا۔ عمر کے آخری ایام انھوں نے ملک و قوم کی خاموش خدمت میں گذارے۔ ان کا انتقال ہماری ملکی و قومی زندگی کا ایک نقصان عظیم ہے، جس کی تلافی ممکن نظر نہیں آتی۔

خورشید احمد مرحوم سابق ایڈیٹر نیا دور

رفاقتوں کے سفر میں جب یکے بعد دیگرے پرانے ساتھی بچھڑنے لگتے ہیں تو تنہائی کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا جاتا ہے اور زندگی بڑی بے کیف نظر آتی ہے۔ اُن ہمسفروں کے نقوش قدم نیز اُن سے وابستہ خوشگوار یادیں ہی سرمایۂ حیات بن جاتی ہیں۔ خورشید بھائی کا سانحۂ ارتحال میرے لیے ایک ایسا ہی جانگداز واقعہ ہے۔ ۲۱ر نومبر کی شب میں تقریباً چار بجے ان پر دل کا اتنا شدید دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ چار پانچ سال قبل بھی دفتر ہی میں ان پر دل کا دورہ پڑا تھا مگر وہ اچھے ہو گئے تھے۔ دو ماہ قبل دفتر میں شرف نیاز حاصل ہونے پر میرے ذہن کے کسی گوشے میں گمان کا ایسا سایہ بھی نہیں گذرا تھا کہ وہ اتنی جلد داغِ مفارقت دے جائیں گے۔ وہ بظاہر پوری طرح چاق و چوبند نظر آتے تھے۔ وہ گھنٹوں اپنی شفقتوں کے پھول بکھیرتے رہے اور نیا دور کے فراق نمبر حصہ اول کے سلسلے میں کھل کر داد دیتے رہے اور اپنی مسرت کا اظہار فرماتے رہے۔ کسے معلوم تھا کہ مرحوم سے یہ آخری ملاقات ہے۔ راقم الحروف کا مرحوم سے تقریباً ۲۳ سال تک ساتھ رہا۔ وہ میرے مخلص دوست بھی تھے اور بزرگ رفیق کار بھی۔ اس طرح اُن کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کا وسیع تجربہ، کام کرنے کا منفرد انداز میرے لیے ہمیشہ مشعل راہ رہا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے اُن سے نہ صرف دفتر اور نیا دور کے معاملات میں بلکہ زندگی کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔ وہ بہت ہی با اصول، وضعدار اور ہماری مٹتی ہوئی مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ وہ سستی شہرت سے ہمیشہ دور رہے اور خاموشی کے ساتھ اردو کی خدمت کرتے رہے۔ انگریزی سے اردو میں ترجمے کے فن پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ان کی جہاندیدہ شخصیت میں رکھ رکھاؤ، بردباری، متانت اور سنجیدگی بدرجہ اتم تھی۔ ان کے کام کرنے کا طریق کار اور اُن کی زندگی کے ضابطے کچھ اتنے سخت تھے جس سے انھوں نے کبھی مفاہمت نہیں کی۔ آج وہ اس عالم فانی میں نہیں رہے مگر ان کا حسن خلوص و عمل نجم درخشاں کی طرح جگمگاتا رہے گا۔ نیا دور کے پرانے فائل اور اس کے خصوصی نمبر سدا ان کی انتھک کوششوں، بالغ نظری اور ادبی صلاحیتوں کی قسم کھاتے رہیں گے۔ خدائے لم یزل کے حضور میں دست بدعا ہوں کہ وہ مرحوم کو اپنی لازوال رحمتوں سے نوازے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ خورشید بھائی عرصے تک ادارہ قومی آواز سے بھی منسلک رہے۔

(باقی ص ۳۳ پر)

محشر صادقی
نظام آباد
اعظم گڑھ

مزدور کا نغمہ

میں نے تاریک فضاؤں کو اجالا بخشا
ہر چمن زار کو میں نے گلِ لالہ بخشا
کوہساروں کو بھی دی میں نے متاعِ زریں
میں ہوں مزدور مرے نام سے روشن ہے زمیں

میری تخئیل کا پیکر ہے حسیں تاج محل
جیسے تالاب کے دامن میں شگفتہ ہو کنول
یہ مرا حسنِ تصور یہ مرا نورِ یقیں!
میں ہوں مزدور مرے نام سے روشن ہے زمیں

میرے تیشے کو کہاں پائے گا مانی کا قلم
کہہ رہے ہیں مرے افسانے اجنتا کے صنم
خاتمِ حسن کے ایسے بھی تراشے ہیں نگیں
میں ہوں مزدور مرے نام سے روشن ہے زمیں

میرے اقدام سے لرزاں ہے حوادث کا بدن
میرے پیغام سے بیدار ہوئے اہلِ زمن
کانپ اٹھے مری للکار سے محلوں کے مکیں
میں ہوں مزدور مرے نام سے روشن ہے زمیں

وادیِ شب میں نئی صبح بلا سکتا ہوں
ہر بیاباں کو چمن زار بنا سکتا ہوں
میرا ایمان ہے محنت مرا مذہب ہے یقیں
میں ہوں مزدور مرے نام سے روشن ہے زمیں

جہد پیہم سے مرے، لالہ رخوں کی خوشبو
میری محنت کا پسینہ ہے چراغوں کا لہو
میرا سینہ ہے زمانہ کی امنگوں کا امیں
میں ہوں مزدور مرے نام سے روشن ہے زمیں

میرا ایمان چمکتا ہے ستاروں کی طرح
مسکراتی ہے مری فکر بہاروں کی طرح
میرے احساس کے دامن میں ہے فردوسِ بریں
میں ہوں مزدور مرے نام سے روشن ہے زمیں

راہ میں آئے نحوست بھی تو ہٹ جاتی ہے
ہر رگِ سنگ مری ضرب سے کٹ جاتی ہے
اپنے پیروں پہ جھکاتا ہوں پہاڑوں کی جبیں
میں ہوں مزدور مرے نام سے روشن ہے زمیں

کارخانوں کے دھوئیں ابرِ رواں میرے لیے
کھیت کی دھوپ ہے تابندہ سماں میرے لیے
زندگی رقص کناں اور یہ اندازِ حسیں
میں ہوں مزدور مرے نام سے روشن ہے زمیں

اپنی منزل کی طرف وقت کو موڑا میں نے
جبر کے شیشۂ پندار کو توڑا میں نے
ناتوانی کا تصور مرے مسلک میں نہیں
میں ہوں مزدور مرے نام سے روشن ہے زمیں

امن کا گیت بھی ہوں وقت کی للکار بھی ہوں
تیغ کی دھار بھی ہوں ساز کی جھنکار بھی ہوں
میں ہوں تاریخِ زمانہ کی کتابِ زریں
میں ہوں مزدور مرے نام سے روشن ہے زمیں

شاکر جروالی

رباعیات

چلمن کا جھولا کبھی جھلا دیتے ہیں
سن کی لوری کبھی سنا دیتے ہیں
تاویل سی کر اپنی ہی تسکینِ دل کو
ہم وہ ہیں کہ اپنے جی کو بہلا دیتے ہیں
خوابوں کے جزیرے میں بسا دیتے ہیں

سپنوں کی برات آئی آتے آتے
کس دھوم سے سات آئی آتے آتے
سمٹے سارے جوان گاؤں سے نکل
جب چاندنی رات آئی آتے آتے

جذبات کی تابش سے دمکتے ہی رہے
ہم گردِ رہگذر سے جھلکتے ہی رہے
بڑھتی گئی دھوپ اور اپنے پاؤں
سایوں کی تلاش میں بھٹکتے ہی رہے

دنیا کی نظر کے لیے نادیدہ ہے
لیکن وہ عبارت ہے جو فہمیدہ ہے
پیکر کہ ہوں جتنی بھی اسی روپ کو ہیں
جو میرے خیالوں کا تراشیدہ ہے

سکندر علی خاں
ایم۔ایل۔اے

کاکوری کیس

انقلاب ہمیشہ سے جہد و عمل اور ایثار و قربانی کا متقاضی رہا ہے۔ انقلاب چاہے بیرونی سطح پر ہو چاہے اندرونی سطح پر، اضطراب اس کی فطرت ہے۔ حرکت اس کی علامت۔ ہندستان کا انقلاب بھی یوں ہی نہیں آیا۔ ہندستان کو آزادی دلانے کا سہرا ایک طرف باپو کے نظریات کے سر ہے تو دوسری طرف نیتاجی کا انداز نظر بھی زنگیوں کو بہت سے اشارے دے گیا تھا اور وہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ اب زیادہ دنوں ہم یہاں نہ ٹک سکیں گے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۷۸۵ء میں اپنے نصب العین کی بنیاد رکھی تھی اور ۱۸۰۸ء میں ملک پوری طرح غیر ملکی اقتدار میں آگیا تھا۔ انھیں تاریک دنوں میں ملک کے جانثاروں اور نوجوانوں نے سیاسی بیداری کی جوت جگا کر انقلابیوں کی ایک مضبوط تنظیم تیار کی اور جگہ جگہ بغاوت کا بگل بجا کر انگریز حکومت کی بنیاد ہلا کر رکھ دی۔

اسی انقلابی تاریخ کا ایک باب ہے "کاکوری کیس"، جس نے ایک طرف سامراجی قوت کو للکارا تو دوسری طرف سارے ہندستان میں ایک ایسی لہر دوڑا دی جو آخرکار ساحلِ آزادی سے آ لگی۔ ملک کے پرانے انقلابیوں نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ ۱۹۲۱ء میں عدم تعاون کی تحریک کو ایک تجربے کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ اور بعض انقلابیوں نے اس میں حصہ بھی لیا تھا۔ جب تحریک واپس لے لی گئی تو وہ پھر انقلابی تنظیم میں شامل ہو گئے۔ اُس زمانے میں تنظیم کے افراد شہروں شہروں جاتے تھے ان کے پاس ہر شہر کے محب وطن افراد کے چند مخصوص نام ہوتے تھے۔ وہ اُن سے زادِ راہ کے طور پر کچھ لیتے تھے۔ اُن کی

شجاعت و جواں مردی کا روشن باب

اٹیچیاں پستولوں سے بھری ہوتی تھیں (میرے شہر کے ایک محترم بزرگ اور سابق ایم۔ایل۔اے مرحوم کریم الرضا خاں صاحب ایسے کئی واقعے بیان کرتے تھے) شمالی ہند میں سچیندر ناتھ سانیال کی قیادت میں انقلابی جماعت نے پھر ایک انگڑائی لی۔ سانیال جی کو سریش چندر بھٹاچاریہ، راجندر ناتھ لہری، رام پرساد بسمل، دشنوسرن اور یوگیندر چندر چٹرجی کا تعاون حاصل ہوا۔ اس طرح یہ ایک مرکزی تنظیم بن گئی۔ اتر پردیش کی شاخ کا نام ہندستان ریپبلکن ایسوسی ایشن رکھا گیا۔ رام پرساد بسمل اس تنظیم میں اشفاق اللہ خاں اور روشن سنگھ وغیرہ کے ساتھ شامل ہوئے تھے۔ انھیں اپنے کاموں میں مہارت کی وجہ سے تشدد پسند جماعت کا رہنما مان لیا گیا تھا۔ انقلابی تحریک چلانے کے لیے اس تنظیم نے حکومت کا خزانہ لوٹنے کی ایک اسکیم تیار کی۔ یہ لوگ ۹ راگست ۱۹۲۵ء کو شاہ جہاں پور سے سہارن پور۔ لکھنؤ پسنجر ٹرین پر شام کے وقت سوار ہوئے۔ راجیندر ناتھ لہری اس انقلابی جماعت کی قیادت کر رہے تھے۔ وہ اشفاق اللہ اور سچیندر ناتھ بخشی دوسرے درجہ میں اور باقی لوگ تیسرے درجہ میں بیٹھے جب کاکوری سے عالم نگر اسٹیشن کی جانب گاڑی بڑھی تو دوسرے درجہ کے ڈبہ سے زنجیر کھینچی گئی۔ مسافروں کو ہوشیار کر دیا گیا کہ وہ نیچے نہ اتریں۔ دو اشخاص وقفہ وقفہ سے پستول سے ہوائی فائر کرتے رہے اس دوران خزانہ لوٹ لیا گیا، اس میں مجموعی طور پر ۴۶۷۹ روپے ہاتھ

آئے۔ اس مہم میں راجیندر ناتھ لہری، اشفاق اللہ خاں، سچیندر ناتھ بخشی، چندر شیکھر آزاد، رام پرشاد بسمل، کیشو چیٹرجی، کندن لال، منمتھ ناتھ گپت، بنارسی لال اور روشن سنگھ شامل تھے۔ اس سلسلے میں شاہجہاں پور، کانپور، وارانسی اور الہ آباد میں چالیس سے زیادہ لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔ بدقسمتی سے بنارسی لال سرکاری مخبر بن گیا۔ یوگیش چندر چیٹرجی کو ۱۹۲۴ء میں گرفتار کیا جا چکا تھا۔ انھیں بھی کاکوری کیس سے وابستہ کر دیا گیا۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو اسپیشل مجسٹریٹ لکھنؤ کی عدالت میں کارروائی شروع ہوئی۔ پولیس کی طرف سے ڈھائی سو گواہ پیش کیے گئے۔ اسپیشل مجسٹریٹ سید عین الدین نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو یہ مقدمہ سیشن کے سپرد کر دیا اور ایک ملزم جیوتی شنکر دکشت کو رہا کر دیا۔ لکھنؤ کے سیشن جج مسٹر ہملٹن نے ۶ اپریل ۱۹۲۷ء کو انقلابیوں کو قتل اور ڈکیتی کے الزام میں ۱۲۱ (الف) آئی پی سی، ۱۲۰ (بی) آئی پی سی اور ۳۹۶ آئی۔ پی۔ سی کے تحت سزائیں دیں۔ رام پرشاد بسمل اور راجیندر لہری کو پہلی دو دفعات کے تحت تاعمر کالا پانی اور تیسری دفعہ کے تحت سزائے موت۔ ٹھاکر روشن سنگھ کو پہلی دو دفعات کے تحت ۵ سال قید با مشقت اور تیسری دفعہ کے تحت سزائے موت۔ اشفاق اللہ خاں پر ۵ دفعات لگائی گئی تھیں۔ جن میں دو دفعات کے تحت تاعمر کالا پانی کی سزا اور تین دفعات کے تحت سزائے موت دی گئی۔ سچیندر ناتھ بخشی اور سچیندر ناتھ سانیال کو تاعمر کالا پانی کی سزا دی گئی۔ منمتھ ناتھ گپت کو ۱۵ سال۔ یوگیش چند چیٹرجی، مکندی لال اور گووند چرن سرکار کو ۱۰ سال۔ اقبالی ملزمان بنواری لال اور بھوپیندر ناتھ سانیال کو دو دفعات کے تحت پانچ پانچ سال۔ رام کرشن کھتری اور راج کمار سنہا کو ۳-۳ سال کی قید سخت۔ سریش چند بھٹاچاریہ اور وشنو سرن، کو دو دو دفعات میں سات سات برس کی۔ پریم کشن کھنہ، پرنیش چیٹرجی، رام دلارے

اور رام ناتھ پانڈے کو پانچ پانچ برس قید سخت کی سزائیں دی گئیں۔ سیشن جج نے جب فیصلہ سنایا تو عدالت کھچا کھچ بھری تھی۔ انقلابیوں کے چہروں پر فتح مندی کی مسکراہٹ رقصاں تھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب تھے۔ آزادی کی داغ بیل اور مضبوط ہو گئی تھی۔ فضا انقلاب زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگی۔ اس مقدمہ میں پنڈت گووند ولبھ پنت، پنڈت ہرکرن ناتھ مشرا، بابو موہن لال سکسینہ اجیت پرشاد جین، چندر بھان گپتا، بہادر جی اور کلکتہ کے بیرسٹر جی کے چودھری نے انقلابیوں کی پیروی کی۔ سرکاری وکیل پنڈت جگت نرائن تھے۔ سزاؤں کے خلاف سبھی اپیل ناکام ہو گئی آخر ۱۷ دسمبر ۱۹۲۷ء کو الہ آباد میں روشن سنگھ، ۱۹ دسمبر کو فیض آباد میں اشفاق اللہ خاں، ۲۷ دسمبر کو گونڈہ جیل میں راجندر ناتھ لہری اور ۲۹ دسمبر کو گورکھپور جیل میں رام پرشاد بسمل کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ وطن کے جانبازوں کی یہ قربانی تاریخ آزادی کا ایک روشن اور تابناک باب ہے۔ ان شہیدوں نے اپنی جان جس انداز میں اپنے وطن کے لیے پیش کی وہ اپنی جگہ ایک بے مثال واقعہ ہے۔ اس عظیم الشان کارنامے کے بعد ہی ملک میں ایک ایسی لہر پیدا ہوئی جو ایک طوفان کا پیش خیمہ بن گئی جس کے نتیجے میں بالآخر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ایک ایسی صبح درخشاں نمودار ہوئی جس کی پیشانی پر اشفاق اور بسمل کے لہو کا قشقہ کھنچا ہوا تھا۔ آزادی کی یہ صبح درخشاں ایسے ہی ان گنت شہیدوں کی امانت ہے۔ ہمارا دھرم ہے کہ ہم ملک کی سالمیت، قومی یکجہتی، اور سماجی ذمہ داریوں سے متعلق اپنے فرائض انھیں کی اسپرٹ کے ساتھ نبھائیں کہ انھوں نے جو خواب دیکھا تھا (اور جس کی تعبیر ہم پا بھی گئے) وہ ہماری بے توجہی اور غفلت شعاری سے دھندلانے نہ پائے ......

★

مصور لکھنوی
[illegible] امین آباد لکھنؤ

بطحا کے نظارے (نعت)

مقصود حریم خدا دیکھ آئے — سنا تھا جو اُس سے سوا دیکھ آئے
نہ پوچھو کہ بطحٰی میں کیا دیکھ آئے — ہر اک سمت نورِ خدا دیکھ آئے
وہ ہر دم طواف اور سعیٔ تسلسل — عجب منظر خوشنما دیکھ آئے
وہ گل بار نکہت فضائے حرم کی — گلستانِ جنّت نما دیکھ آئے
کہیں ملتزم ہے کہیں چاہِ زمزم — مقاماتِ عفوِ خطا دیکھ آئے
مقامِ براہیم و میزابِ رحمت — نشاناتِ جود و عطا دیکھ آئے
بصد اضطرابِ تمنائے رحمت — درِ کعبۃُ اللہ وا دیکھ آئے
حسیں حلقہ ہائے صفوفِ حرم بھی — بصد شکرِ ربُّ العُلیٰ دیکھ آئے
نہ دے پائے جب سنگِ اسود کو بوسہ — بہ اندازِ مہر و وفا دیکھ آئے
بصد احترام و بصد شوقِ خاطر — عبادت گہِ انبیا دیکھ آئے
وہ خلوت گہِ آفتابِ رسالت — وہ فردوسِ غارِ حرا دیکھ آئے
وہ لحنِ اذاں کیسی مسحور کن تھی — حرم میں عجب ماجرا دیکھ آئے
بشر تو بشر ہے مگر گردِ کعبہ — پرندوں کا بھی گھومنا دیکھ آئے
ہر اک سمت لاکھوں قنادیل روشن — شبِ نورِ بارِ منا دیکھ آئے
جہاں سے کیا شقِّ مہ وہ جبل بھی — بدامانِ کوہِ صفا دیکھ آئے
غرض عرض یہ ہے کہ ہم کو بُلا کر — خدا نے جو دکھلا دیا دیکھ آئے

طوافِ وداعی کا عالم نہ پوچھو
حرم سے جدا جب ہوئے ہم نہ پوچھو

ڈاکٹر رشید [illegible]

نعتیہ رُباعیات

دنیائے سخنوری کا ان کو آداب
عاجز ہیں جہاں سارے خطاب و القاب
لاریب انھیں کی ذاتِ اقدس سے ہے
اک نسخۂ کیمیا کتابوں پہ کتاب

سیرت کی روشنی بصیرت والی
حکمت والی خدا کی رحمت والی
جب بھی سوچا چھلک پڑی ہیں آنکھیں
ان کی ہستی بڑی محبت والی

رحمت کی ردا دوش پہ ڈالے آئے
دستورِ خدا بخشنے والے آئے
پھوٹیں شبِ تاریک سے نوری کرنیں
لپٹے ہوئے قدموں سے اُجالے آئے

بجھتی ہوئی آنکھوں کا اجالا بن کر
مستقبل و حال کا تقاضا بن کر
چمکے وہ نقیبِ صبحِ روشن کی طرح
معراجِ عمل کا استعارا بن کر

محمد مصباح اللہ
نمبر ۵ ... چدمبرم نائکن اسٹریٹ
پلاوارم۔ مدراس ۶۳ (تمل ناڈو)

علامہ اقبال

"روزگارِ فقیر" کے آئینہ میں

فقیر سید وحید الدین کو اپنے والد بزرگوار فقیر سید نجم الدین مرحوم کی معیت میں علامہ اقبالؒ سے لڑکپن میں پہلی بار ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اس بارے میں موصوف کا بیان ہے۔ " شاعرِ مشرق سے میری نیازمندی کی کہانی ۱۹۱۶ء سے شروع ہوتی ہے میں جب میٹرک کالج میں پڑھتا تھا۔ تیرہ چودہ کا سن تھا۔" اس کے بعد علامہ ممدوح کی خدمت میں اپنے آپ حاضر ہونے اور ان کی صحبت سے فیض یاب ہونے کے موصوف کو کئی موقعے ملے۔ دوریں اثنا موصوف نے مفکرِ اسلام علامہ اقبالؒ کے اخلاق و عادات اطوار و انداز سیرت و کردار کو قریب سے دیکھا اور علامہ کے بلند لطیف اور پاکیزہ خیالات اور افکارِ عالیہ کو سنا۔ گو اس وقت عمر کے اعتبار سے ان گہرے اور عمیق نکات کو سمجھنا یقیناً موصوف کے فہم و ادراک سے بالاتر تھا تاہم یہ عینی مشاہدے اور فیضِ صحبت کے تاثرات موصوف کے دل و دماغ پر اپنے گہرے نقوش ثبت کر رہے تھے۔ اس بات کی تصدیق موصوف کے اس قول سے ہوتی ہے :

> " شعوری طور پر نہ مجھے اس گہرے کا احساس تھا نہ ان تجلیوں سے شناسائی۔ لیکن اسی زمانے میں میری کور بین نگاہیں اس صاحبِ کمال سے متعارف ہوئیں جس نے ان تجلیوں کو اپنے خرمنِ فکر میں محفوظ کر رکھا تھا۔"

عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ جب علمی استعداد میں اضافہ ہونے لگا اور شعور میں پختگی پیدا ہونے لگی تو فقیر سید وحید الدین نے ان نقوش کو الفاظ اور بیان کے سانچے میں ڈھالنا شروع کیا یہاں تک کہ ان کی اس خامہ فرسائی سے ادبِ لطیف کا ایک حسین اور دلکش گلدستہ آراستہ ہو گیا۔ جو گلستانِ اردو میں " روزگارِ فقیر" کی شکل میں لہلہانے لگا اور اس کی بھینی بھینی خوشبو اقبالیات کے چمن کو معطر کرنے لگی۔

یہ حسین و جمیل اور بصیرت افروز کتاب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی تو اقبالیات کی دنیا میں تہلکہ مچ گیا کیونکہ علامہ اقبالؒ کی زندگی، شخصیت اور شاعری کے بعض حیرت انگیز واقعات، انوکھے گوشے اور منفرد اور نادر پہلو جو پہلی بار صفحۂ قرطاس پر نمودار ہوئے تھے اربابِ اہلِ نظر کی توجہ کا مرکز اور ذوق کی تسکین کا سامان بن گئے۔ یہ وہ دلچسپ، دلکش اور حیران کن انکشافات تھے جن سے اقبالؒ کے شناسا اور واقفِ حال احباب بھی بے خبر اور ناآشنا تھے۔ عاشقینِ اقبالؒ کی ایک کثیر تعداد ایسی تھی جو مفکرِ اسلام کی نجی صحبتوں کو جاننے کے لیے بیتاب، مشتاق اور متمنی تھی۔ گویا اس کتاب کی اشاعت ان کے لیے نعمتِ عظمیٰ سے کم نہ تھی اور حامیانِ اقبالؒ کے حق میں یہ نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ یوں تو اقبالیات پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی تھیں۔ لیکن ان میں وہ انوکھی، دلچسپ اور دل آویز باتیں کہاں جو اس عظیم الشان مرقع میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ اس تصنیف کی سب سے اعلیٰ صفت یہ ہے کہ اس صاف و شفاف آئینہ میں "حکیمِ ملت" کا عکس "اقبال بحیثیتِ انسان اور اقبال بحیثیت عاشقِ رسول" واضح طور پر جھلک رہا ہے! اس حقیقت سے کس کو انکار

ہوتی ہے کہ دانائے راز کی زندگی کا پیمانہ حبِ رسولؐ سے لبریز اور اسی جذبۂ عقیدت سے سرشار تھا جس کی ترجمان ہیں مفکرِ اعظم کی تصانیف خطبات ملفوظات، افکارِ عالیہ اور انمول اقوال کا گنج ہائے گراں مایہ!

ضخامت کے اعتبار سے بظاہر یہ ایک مختصر کتاب ہے جو تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہے لیکن ٹھوس مواد، جامع متن، رنگین عبارت اور وسیع معلومات کے اعتبار سے یہ بحرِ بیکراں کی حیثیت رکھتی ہے، گویا سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے۔ یہ مرقع اقبالؒ کی زندگی کے متعدد گوشوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں دانائے راز کی نجی زندگی کی کلیاں چٹک رہی ہیں؛ غرض مفکریات سے متعلق ایسا کونسا پہلو ہے جس کی عکاسی "روزگارِ فقیر" میں نہیں کی گئی ہے؟

"روزگارِ فقیر" کا ہر صفحہ اور ہر ورق شاہد ہے کہ یہ عالیشان عمارت مستحکم بنیادوں پر کھڑی کی گئی ہے اور اس کی تعمیر میں جذبۂ خلوص و صداقت کارفرما ہے جس کی بدولت یہ شاندار شیش محل "روزگارِ فقیر" دلدادگانِ اقبالؒ کو دعوتِ نظارہ دے رہا ہے۔

ان نکات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر میں اس شہرۂ آفاق تصنیف کو اقبالؒ پر ایک مختصر انسائیکلو پیڈیا سے تعبیر کروں تو مجھے یقین ہے کہ اربابِ نظر میری ہمنوائی کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ وہ دن دور نہیں جب اقبال پر ایک مبسوط اور جامع انسائیکلو پیڈیا مرتب کیا جائے گا جس میں "روزگارِ فقیر" کو کتابیات کے باب میں سرِ فہرست جگہ دی جائے گی۔

میں یہاں "روزگارِ فقیر" سے چند اقتباسات نقل کر رہا ہوں ان کا مطالعہ قارئین کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ویسے تو اس کتاب میں اربابِ ذوق کے لیے از اول تا آخر سرمایۂ بے بہا موجود ہے۔

۱۔ احساسِ ندامت

"جب ڈاکٹر صاحب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے واپس آئے تو والدِ مرحوم ان سے ملنے گئے۔ بڑی مدت کے بعد ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس لیے بڑے تپاک سے ملے اور ڈاکٹر صاحب سے ان کے سفر کے تجربات کے متعلق گفتگو ہونے لگی والد مرحوم نے اثنائے گفتگو میں کہا: "اقبال! تم یورپ ہو آئے۔ مصر اور فلسطین کی سیر بھی کی۔ کیا اچھا ہوتا کہ واپسی پر روضۂ اطہر کی زیارت سے بھی آنکھیں نورانی کر لیتے" یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ یعنی چہرہ پر زردی چھا گئی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ چند لمحے تک یہی کیفیت رہی۔ پھر کہنے لگے: "فقیر! میں کس منھ سے روضۂ اطہر پر حاضر ہوتا؟"

۲۔ مسولینی اور ڈاکٹر صاحب!

مسولینی نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا کہ "میں دنیا کے مسلمانوں کی ہمدردیاں کس طرح حاصل کر سکتا ہوں"؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا: "مفت تعلیم اور رہائش کا انتظام کر کے زیادہ سے زیادہ مسلمان طلبا کو اٹلی بلائیے"۔

مسولینی نے ڈاکٹر صاحب سے کوئی اچھوتا مشورہ بھی طلب کیا انھوں نے کہا: "ہر شہر کی آبادی مقرر کر کے اسے حد سے نہ بڑھنے دو۔ اس سے زیادہ بسنے والوں کو نئی بستیاں مہیا کی جائیں!" مسولینی نے حیران ہو کر کہا: "اس میں کیا مصلحت ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ شہر کی آبادی جس قدر بڑھتی جاتی ہے اس کی تہذیبی اقتصادی توانائی کم ہوتی جاتی ہے اور ثقافتی توانائی (CULTURAL FORCES) کی جگہ محرکاتِ شر "EVIL FORCES" لے لیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا: یہ میرا ذاتی نظریہ نہیں ہے بلکہ میرے پیغمبرؐ نے آج سے تیرہ سو سال قبل یہ مصلحت آمیز ہدایت فرمائی تھی کہ جب مدینہ منورہ کی آبادی ایک حد سے تجاوز کر جائے تو مزید لوگوں کو آباد ہونے کی اجازت دینے کے بجائے دوسرا شہر آباد کیا جائے۔

یہ حدیث سنتے ہی مسولینی کرسی سے کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ میز پر زور سے مار کر کہا: 'WHAT AN EXCELLENT

۳۔ دعا کی تاثیر

"ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جو دعا دل کی گہرائیوں سے نکلے ضرور قبول ہوتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ دعا کا اثر فوراً ظاہر ہو۔ بعض دعائیں تو ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا اثر موت کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی بڑی مختصر ہے اور نظامِ کائنات بہت وسیع ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس قول کی تصدیق ان کی زندگی کے واقعات سے ہوتی ہے۔ جو لوگ ان کی زندگی کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہیں انھیں معلوم ہے کہ ڈاکٹر صاحب میری شادی کے بعد مدت تک اولاد سے محروم رہے۔ جب وہ قریب قریب اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تو حضرت مجدد الف ثانی کی درگاہ میں حاضر ہو کر دعا کی کہ اللہ انھیں ایک بیٹا عطا کرے جسے وہ اپنی زندگی میں اعلیٰ تعلیم دے سکیں۔ لیکن اس واقعہ کو بھی پانچ چھ برس گزر گئے اور ان کی دعا قبول نہ ہوئی۔ ایک دن شام کو وہ گھر گئے تو دیکھا کہ جاوید کی والدہ محلے کے بچے کو اپنے پاس بٹھا کے بڑی شفقت سے پھل کھلا رہی ہیں۔ یہ کیفیت دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے: "الٰہی! اس خاتون میں مادرانہ شفقت پیدا ہو چکی ہے اب اسے اولاد بھی عطا فرما۔" یہ دعا قبول ہوئی۔ چنانچہ اسی سال جاوید سلمہٗ تولد ہوئے۔"

۴۔ اُستاد کا احترام

ڈاکٹر صاحب اپنے استاد کا جس قدر احترام کرتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ انھیں مولوی صاحب کو اپنا کلام سنانے کی جرأت بھی نہیں ہوتی تھی۔ ایک دفعہ کہنے لگے: زندگی بھر میں ان کے سامنے صرف ایک مرتبہ میری زبان سے ایک مصرع نکل گیا۔ وہ بھی اتفاقی طور پر۔ مولوی صاحب کسی کام سے گھر سے نکلے۔ ایک بچہ جو ان کے ہمسایوں میں تھا اور جس کا نام احسان تھا، ساتھ تھا۔ مولوی صاحب کہنے لگے: "اقبال! اسے گود میں اٹھا لو۔" میں نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ کچھ دور جا کے میں تھک گیا۔ چنانچہ میں نے بچے کو تو ایک دکان کے تختوں پر کھڑا کر دیا اور خود سستانے لگا۔ مولوی صاحب اتنے میں بہت آگے نکل گئے تھے۔ ہمیں اپنے ساتھ نہ پایا تو الٹے پاؤں لوٹے اور میرے قریب آ کے فرمایا: "اقبال! اس کی برداشت بھی دشوار ہے!" میری زبان سے بے اختیار نکل گیا: "تیرا احسان بہت بھاری ہے!"

۵۔ تہذیب کا پیمانہ

"ایک دفعہ تہذیب و تمدن کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک شخص نے کہا: "تہذیب بتدریج بڑی نمایاں ترقی کر رہی ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا: "ذرا مجھے بھی تو بتائیے کہ آپ نے تہذیب کو کس پیمانے سے ناپ کے یہ معلوم کیا ہے کہ وہ برابر ترقی کرتی جا رہی ہے۔ اگر آپ کے پاس تہذیب کو ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ دورِ حاضر میں تہذیب رو بہ تنزل ہے۔"

۶۔ آنحضرت کا دیدار

"ڈاکٹر صاحب نے ایک بزرگ کا واقعہ سنایا کہ ان سے کسی شخص نے یہ سوال کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کس طرح ہو سکتا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ پہلے اسوۂ حسنہ پر عمل کر کے اپنا شعار بناؤ اور زندگی اس میں ڈھالو پھر اپنے آپ کو دیکھو! یہی ان کا دیدار ہے!"

۷۔ پتھر

ایک بار محفل میں اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کے ان کارناموں کا ذکر چل پڑا جن سے مسلمانوں کی غیر معمولی شجاعت اور بے جگری اور بے مثال سرفروشی کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس گفتگو میں حصہ لیا۔ وہ بولے: "مسلمان ایک ایسا پتھر ہے جو جس پر گرتا ہے اسے پاش پاش کر دیتا ہے اور جو اس پر گرتا ہے پاش پاش ہو جاتا ہے۔"

قرآن کریم نے مردِ مومن کی اس شان کو "اشداء علی الکفار" کے انداز میں پیش فرمایا ہے جس کی ترجمانی علامہ اقبالؒ نے ان لفظوں میں کی ہے ؏ دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان۔ مگر مردِ مومن کی دوسری شان "رحماء بینھم" کی ہے۔ ؏

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

۸۔ حسنِ انتخاب

ڈاکٹر صاحب اپنی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں قیام فرما تھے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کی قیام گاہ پر ایک نئے ملاقاتی آئے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اتنے میں انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے ایک سوال کر دیا۔ کہنے لگے: "آپ نے مذہب، اقتصادیات، سیاسیات، تاریخ اور فلسفہ وغیرہ علوم پر جو کتابیں اب تک پڑھی ہیں ان میں سب سے زیادہ بلند پایہ اور حکیمانہ کتاب آپ کی نظر سے کونسی گزری ہے؟" ڈاکٹر صاحب اس سوال کے جواب میں کرسی سے اٹھے اور نودارد ملاقاتی کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا کہ تم ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اندر چلے گئے۔ دو تین منٹ میں واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ اس کتاب کو انھوں نے اس شخص کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے فرمایا: 'قرآنِ کریم'!"

۹۔ عاشق

"ایک دن سیرتِ نبوی پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے خاص انداز میں ایک واقعہ سنایا۔ فرمانے لگے:"

"ایک معرکہ میں مسلمان سپہ سالار کا گھوڑا زخمی ہو گیا۔ زخموں کی یہ حالت تھی کہ گھوڑے کا میدانِ کارزار میں کھڑا رہنا دشوار تھا۔ وہ بیٹھنا چاہتا تھا اور دشمن کی طرف سے کافر یلغار کرتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ اسی عالم میں امیر العسکر نے گھوڑے کو مخاطب کر کے کہا: اگر تم نے اس نازک وقت میں میرا ساتھ چھوڑ دیا تو اس جہانِ فانی سے رخصت ہونے کے بعد رسول اللہ سے تمہاری شکایت کروں گا۔ یہ واقعہ بیان کر کے ڈاکٹر صاحب زار و قطار رونے لگے اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اس واقعے سے سپہ سالار کے عشقِ رسولؐ کا بھی اظہار ہوتا ہے۔"

۱۰۔ نصابِ تعلیم

ڈاکٹر صاحب جس طرح قوم کی زبوں حالی پر غور کرتے رہتے تھے کہ اس کے کیا اسباب ہیں اور یہ کس طرح دور ہو سکتی ہے اسی طرح انہیں نونہالانِ قوم کی صحیح ذہنی نشوونما اور معیاری تعلیم و تربیت کا بھی بڑا احساس تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ نئی نسل اخلاق کے صحیح تقاضوں کے مطابق پروان چڑھے تاکہ وہ حکمرانی کی اہل اور مستحق ہو سکے۔ چنانچہ انھوں نے بچوں کے لیے تعلیمی نصاب کی ترتیب و تشکیل کی جانب عملی قدم اٹھایا اور میرے محترم بزرگ حکیم احمد شجاع صاحب سے کہا کہ وہ ان کی نگرانی میں اس کام کا آغاز کریں۔ اردو کورس کے نام سے تیسری سے آٹھویں جماعتوں کے لیے جو کتابیں ڈاکٹر صاحب کے خیال اور رجحان کے مطابق مرتب ہوئیں۔ ان کتابوں میں نظم و نثر کے جو منتخب شہ پارے شامل کیے گئے ہیں وہ بچوں کی نفسیات، ذہنی ہم آہنگی اور احساسِ ذمہ داری کے آئینہ دار تھے۔ دراصل ان کے ذہن و فکر کی تربیت کا ایسا اہتمام کیا گیا تھا کہ ان میں نیک اور بہادر بننے کا جذبہ پیدا ہو۔"

۱۱۔ برگساں سے ملاقات

"۲۴ر دسمبر ۱۹۳۲ء کو جب لندن میں تیسری گول میز کانفرنس ختم ہوئی تو ڈاکٹر صاحب ہندوستان واپس آنے سے قبل پیرس تشریف لے گئے اور فرانس کے مشہور فلسفی پروفیسر برگساں سے ملاقات کی یہ ملاقات خاصی طویل رہی۔ اس میں برگساں کے نظریہ "واقعیت زمان" پر سیر حاصل بحث ہوئی۔ برگساں فلسفہ کا مجتہد تھا تو اقبال بھی ان علوم کے امام تھے۔ یوں سمجھئے کہ آئینہ آئینے کے مقابل تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے برگساں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنائی "زمانہ کو برا مت کہو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں خود زمانہ ہوں" تو برگساں حیران و ششدر رہ گیا اور بار بار ڈاکٹر صاحب سے دریافت کرتا رہا کہ کیا یہ صحیح قول ہے۔

۱۲۔ مخلوط تعلیم

"پردہ اور مخلوط تعلیم کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے خیالات بڑے واضح تھے اور وہ اپنے اس موقف سے بال برابر ہٹنا نہیں چاہتے تھے انھوں

نے خود اپنی زندگی میں اس کا عملی ثبوت دیا کہ اپنی بچی منیرہ کی تعلیم و تربیت کے لیے بڑی کوشش اور جد و جہد کے بعد علی گڑھ سے ایک معلمہ بلوائی جس نے گھر میں رہ کر ڈاکٹر صاحب کی بچی کو تعلیم دی۔

ڈاکٹر صاحب منطقی اور فلسفیانہ انداز میں مردوں اور عورتوں کو ایسے مختلف خوش رنگ اور مہکتے پھولوں سے تعبیر کیا کرتے تھے جن کو پروان چڑھانے کے لیے جداگانہ اقسام کی کھاد درکار ہوتی ہے۔ وہ زن و مرد کی ترقی نشو و نما اور تعلیم و تربیت کے لیے جداگانہ میدان عمل کے قائل تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جسمانی طور پر بھی ایک دوسرے سے مختلف بنایا ہے اور فرائض کے اعتبار سے بھی فولاد اور پھول کی ڈالی سے ایک جیسا کام نہیں لیا جا سکتا۔"

۱۴۔ دانہ و خرمن

ایک صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو لمبا چوڑا خط لکھا۔ انداز نگارش تبلیغی تھا یعنی بعض مسائل میں ڈاکٹر صاحب ان کے ہم خیال ہو جائیں۔ اس خط میں دلائل بھی تھے اور منطق و فلسفہ کی آمیزش بھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے جواب میں مفصل خط تحریر فرمایا اور ان کی باتوں کا ایک ایک کر کے جواب دیا خط کے آخر میں یہ قطعہ لکھا ؎

ایک دانہ پہ ہے نظر تیری — اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں
میں کسی کو برا کہوں توبہ! — ساری دنیا سے خود برا ہوں میں

۱۴۔ جواہر پارے

(i) "GOD IS: MAN IS BECOMING"

"وجود صرف خدا کا ہے۔ انسان موجود ہونے کی کوشش کر رہا ہے"۔ اگر خودی زندہ ہو جائے تو انسان بھی موجود ہو سکتا ہے۔ وجودِ مقید کو وجودِ مطلق سے جتنا قرب حاصل ہوگا وہ اسی قدر موجود ہوتا جائے گا۔

(ii) "PERSONALITY IS THE CRITERION OF VALUE"

"انسانی شخصیت اشیاء کے حسن و قبح کی کسوٹی ہے": جو فعل خودی کو مستحکم کرے وہ حسین ہے۔ جو خودی کو ضعیف بنائے وہ قبیح ہے۔ خودی کا اردو ترادف ہے جسے انگریزی میں EGO OR SELF کہا گیا ہے۔

(iii) DEATH IS ALSO AN ASPECT OF LIFE

"موت بھی حیاتِ انسانی ہی کا ایک پہلو ہے": زندگی اس سے آگے بھی ہے۔ بحث یہ تھی کہ موت زندگی کا اختتام نہیں ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

زندگی دراصل انسان میں قوتِ اعجاز پیدا کر دینے کا دوسرا نام ہے ؎

زندگی جز قوتِ اعجاز نیست — ہر کسے دانندۂ ایں راز نیست

۱۵۔ خاکِ پائے رسولؐ

" اقبال دین کے معاملے میں چون و چرا کے قائل نہ تھے۔ اللہ اور رسولؐ کے حکم کی کامل اطاعت ان کا عقیدہ اور ایمان تھا۔ علامہ اقبال اس عقل کے مخالف تھے جو ایک طرف تو منافق اور مصلحت شناس ہوتی ہے اور دوسری طرف دین کے احکام کی اطاعت کے لیے دلیلیں طلب کرتی ہے۔ اسی عقل کو اقبال نے جا بجا قابلِ ملامت ٹھہرایا ہے۔

وہ ایسے مسلمان تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاکِ پا کو سرمۂ چشمِ بصیرت اور "اکسیر و کیمیا" سمجھتے تھے۔ ان کا دل گداز اور ضمیر بیدار تھا۔

۱۶۔ درویش شہنشاہ!

ایک بار ایک دھوبی آیا۔ ڈاکٹر صاحب کا وفادار اور قدیم ملازم علی بخش دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ کہنے لگا: "میں ڈاکٹر اقبال کو دیکھنا چاہتا ہوں"۔ ڈاکٹر صاحب بنیان پہنے اور دھوتی باندھے صحن میں حقہ پی رہے تھے۔ علی بخش نے اشارے سے کہا: "یہ ہیں ڈاکٹر صاحب!" دھوبی کو علی بخش کے کہنے کا یقین نہیں آیا۔ وہ آگے بڑھا اور ڈاکٹر صاحب کو گھر کا کوئی معمولی آدمی سمجھ کر ان سے پوچھنے لگا: "ڈاکٹر اقبال کہاں ہیں؟ میں انھیں دیکھنا چاہتا ہوں"۔ ڈاکٹر صاحب اس پر مسکرائے اور کہا: "بھئی میں ہی ہوں۔ آؤ بیٹھو۔" دھوبی سکتہ میں آ گیا ـــ "اتنا سادہ اور بے نیاز! ـــ شہرت شہنشاہ جیسی" (باقی آئندہ)

شکیل احمد عاصم بریلوی
۱۳۹۷ - افغانان - کرت پور (بجنور)

وہ میرا وطن ہے

جس دیش کی میراث اہنسا کا چلن ہے ہر ذرّہ جہاں رشکِ قمر، لعلِ یمن ہے
اک نعمتِ عظمےٰ جہاں تہذیبِ کہن ہے جو پیار کا گہوارہ، محبت کا چمن ہے
یکساں ہیں ادھیکار جہاں ذہنِ سخن ہے
وہ میرا وطن، میرا وطن، میرا وطن ہے

جس دیش میں ہر سمت بہاروں کا سماں ہے رعنائی قدرت جہاں پھولوں سے عیاں ہے
جو رشکِ جناں ہی نہیں صد رشکِ جناں ہے فردوس نما وادیٔ کشمیر جہاں ہے
اور جلوہ مسوری کا جہاں توبہ شکن ہے

وہ میرا وطن، میرا وطن، میرا وطن ہے

جو رام کی بستی ہے جو نانک کی زمیں ہے گوتم کے جو انمول اصولوں کا امیں ہے
مدت سے جہاں زیرِ زمیں چشتی مکیں ہے اللہ پہ جس دیش کے لوگوں کو یقیں ہے
ہر سمت جہاں زُہد و تقدس کی کرن ہے
وہ میرا وطن، میرا وطن، میرا وطن ہے

بسمل نے جہاں دار کو لبیک کہا تھا ٹیپو نے جہاں جام شہادت کا پیا تھا
نہرو نے جہاں جیل میں ہر ظلم سہا تھا بے لوث جہاں خون شہیدوں نے دیا تھا
اک مشغلہ لوگوں کا جہاں دار و رسن ہے
وہ میرا وطن، میرا وطن، میرا وطن ہے

اقبال ماہر
۲۳۴ - نخاس کہنہ - الہ آباد ۳

غزل

زخموں کے پھول درد کے پتھر سمیٹ لے
جو کچھ ملے متاعِ مقدر سمیٹ لے

ناکامیوں کا زخم ترے ہاتھ آئے گا
رہنے دے چارہ ساز یہ نشتر سمیٹ لے

محفوظ کر لے ذہن میں ہر موجِ آگہی
کوزہ میں علم و فن کا سمندر سمیٹ لے

پرواز کا خیال بھی ہے عزمِ خود کشی
صیاد گھات میں ہے ابھی پر سمیٹ لے

موجوں سے کھیل سینۂ قلزم میں بھی اُتر
بکھرے ہوئے ہیں تہہ میں جو گوہر سمیٹ لے

کچھ تو خیالِ خاطرِ اغیار چاہیئے
ہنستے ہوئے یہ طنز کے پتھر سمیٹ لے

ماہر وہ ہو رہی ہے نئی صبح کی نمود
آنکھوں سے اپنی خواب کی چادر سمیٹ لے

مومن علی صدیقی مومن بسوانی
بسواں ضلع سیتاپور یوپی

(بہ سلسلۂ
۲۰ نکاتی پروگرام)

یہ وہی عورت ہے جو ہے صنعت پروردگار
ہے اسی کی ذات سے دنیا میں انساں کا وقار
اس سے پیدا سب جہاں کے آدمی اور تاجدار
سچ جو پوچھو ہے یہ قدرت کا انوکھا شاہکار
حسن کی دیوی یہی سرمایۂ راحت یہی
آدمی کے واسطے اک بے بہا نعمت یہی
ہے اسی کے دم سے قائم رونقِ بزمِ جہاں
ہے یہی بیچارگی میں چارۂ دردِ نہاں
ہے رواں اس کے ہی دم سے زندگی کا کارواں
جس مکاں میں ہو نہ عورت بے مکیں ہے وہ مکاں
اور اسی کے حسن نے انساں کو پرواز دی
لائے جوئے شیر یہ فرہاد کو آواز دی
اور ماں بن کر یہی بچے کو دیتی ہے جنم
پرورش کرتی ہے اس کی یہ بصد ناز و نعم
بچے جب بیمار ہوتے بھول کر دنیا کے غم
ہر گھڑی بے چین رہ کر سہتی ہے رنج و الم
پال کر ان لاڈلے بیٹوں کو کرتی ہے جواں
اور جب تک ہوں نہ بالغ ہے یہ انکی پاسباں
یہ وہی عورت ہے جس نے رسم جوہر کی ادا
جنگ میں مارا گیا شوہر ہوئی جل کر فدا
لکشمی بائی کبھی رضیہ کا رُوپ اس نے دھرا
مردِ میداں بن کے اکثر بن گئی فرماں روا
حیف اسی بیکس پہ ڈھائے جائیں یہ ظلم و ستم
اور محض اس واسطے یہ گھر سے دولت لائی کم
بن کے بیوی زینتِ آغوش بنتی ہے یہی
رات دن شوہر کی خدمت بھی تو کرتی ہے یہی
بن کے بیٹی باپ ماں پر جان دیتی ہے یہی
اور انہیں کے ہر اشارے پر بھی چلتی ہے یہی

یہ بہن بنتی تو ہر بھائی کا دل لیتی ہے جیت
اس سے بڑھ کر اس زمانے میں نہیں ہے کوئی میت
جب کسی نادار کی بیٹی سہاگن بن گئی
آئی جب سسرال بیچاری ابھاگن بن گئی
زندگی اس کی اجیرن اور الجھن بن گئی
اکثر اس کی ساس اس کی جاں کی دشمن بن گئی
رات دن سننے لگی وہ طعنہ ہائے دلخراش
جس سے اس کا دل ہوا زخمی جگر بھی پاش پاش
اس کی آنکھوں سے ہوئے بیساختہ آنسو رواں
آتی ہے طوفان بن کر جس طرح موجِ گراں
کون سنتا ہے اب اس بیکس کی فریاد و فغاں
ان کی فرمائش کرے پوری جو ہوں وہ شادماں
جرم اس کا صرف یہ ہے گھر سے کم لائی جہیز
اس کو ترکہ میں نہ اسکوٹر ملا کرسی نہ میز
یہ وہ لعنت ہے کہ انساں کے بدن میں جیسے کھاج
سن کے اس کو شرم سے گردن جھکا لیتی ہے لاج
گر یہی حالت رہی بگڑے گا یہ سارا سماج
سوچتے ہیں ہند میں یونہیں رہے گا کیا یہ راج
ان غریبوں مفلسوں کی بیٹیوں کا ہوگا کیا
کون پوچھے گا انھیں کنواری رہیں گی کیا سدا
اس لیے لازم ہے ہر اک آدمی کے واسطے
کوششیں کرتا رہے اس کی کمی کے واسطے
قتلِ بیجا جرم تو ہے ہر کسی کے واسطے
سخت تر قانون ہوں اس گندگی کے واسطے

اور اربابِ حکومت بھی تو یہ سوچیں ذرا
ایسے مجرم کو نہ ہو پھانسی سے کم کوئی سزا

ڈاکٹر انوار الحسن
صدر شعبہ علوم شرقیہ لکھنؤ یونیورسٹی
لکھنؤ۔

مطبعِ نولکشور
یا
ایک علمی، ادبی، تصنیفی و اشاعتی ادارہ

نومبر ۱۸۵۸ء میں یعنی ہندستان کی پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے بعد اودھ کی راجدھانی لکھنؤ میں منشی نولکشور (۱۸۳۶-۱۸۹۵ء) نے نولکشور پریس کی بنیاد رکھی۔ اس تاریخی حقیقت کو دہرانا یہ مقصود ہے کہ ابتدا میں یہ مشہور زمانہ پریس لکڑی کے چند ہینڈ پریسوں اور پتھروں پر مشتمل تھا یا منشی جی مرحوم نے ابتدا میں قاعدے پارے ہندوؤں کی مذہبی کتابیں یا کتاب پٹواریان چھاپی تھیں یا ابتدا میں ان کے پاس کوئی بڑا اسٹاف نہ تھا اور "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ" کے مصداق منشی جی اپنی کتابوں کے ناشر، طابع، مشین مین، پروف ریڈر، مصلح سنگ اور فروخت کنندہ تھے۔ سرمایہ کی کمی کو انھوں نے اپنی دانشمندی اور حکمت عملی سے پورا کیا یا انھیں کوئی زمین میں چھپا ہوا دفینہ مل گیا جس کی بدولت وہ لاکھوں میں کھیلنے لگے اور بالآخر اپنے انتقال کے وقت یعنی ۱۸۹۵ء میں انھوں نے تقریباً ایک کروڑ روپیہ کی جائیداد چھوڑی۔

زیر نظر مضمون میں نولکشور پریس کی خدمات اور اس کے اثرات کا جائزہ لینا مقصود ہے کہ اس ادارہ نے اپنی ۹۳ سالہ شاندار زندگی میں کتنے نمایاں کارنامے انجام دیے اور اپنے بعد آنیوالی نسلوں کے لیے کیا یادگاریں چھوڑیں۔ ویسے دیکھیے تو اس ادارہ کے قیام کو ۱۲۵ سال ہوگئے ہیں۔ اس میں ۱۹۴۷ء تک کا وہ زمانہ شامل ہے جب برطانوی حکومت ہندستان میں اپنی استعماریت کی جڑیں مضبوط کر رہی تھی۔ تہذیب و تمدن پر مغربی اثرات پڑ رہے تھے نئے اور پرانے کی جنگ خاموشی کے ساتھ جاری تھی، ملک کی قدیم شخصی بادشاہت دم توڑ چکی تھی اور اس کی جگہ غیرملکی حکمرانوں کا اقتدار مستحکم ہو رہا تھا۔ ایسے ہنگامی دور میں نولکشور پریس کا قیام عمل میں آیا۔ اور یہ ادارہ نہ صرف ہندستان بلکہ ایشیا کا سب سے بڑا تصنیفی اور اشاعتی ادارہ بن گیا۔

فرانس کے آلپائن پریس کے بعد نولکشور پریس دنیا کا وہ واحد ادارہ تھا جہاں اشاعت وطباعت کے ساتھ ساتھ تصنیف، تالیف، ترجمہ تدوین و تحشی کے لیے شعبہ جات مقرر تھے۔ ان شعبوں میں مختلف زمانوں میں مایہ ناز ادیب شاعر اور اہل قلم بھی شامل رہے۔ کسی نے ملازمت کی اور کوئی ان بندشوں سے آزاد رہ کر ایک "ریسرچ فیلو" کی حیثیت سے اپنا علمی تعاون پیش کرتا رہا۔ اردو کے ان مایۂ ناز ادیبوں میں مرزا غالب سرسید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی، ذکاء اللہ، اسمٰعیل میرٹھی، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، پریم چند، غلام محمد تپش، منشی امیر اللہ تسلیم، منشی رونق علی، اصغر علی نسیم، جالب دہلوی، نادر کاکوروی، امجد علی اشہری، سحر کاکوروی، قدر بلگرامی، ہادی علی اشک، حیرت دہلوی، شوکت میرٹھی، مفتی فخرالدین فخر، شاکر میرٹھی مرزا یاس یگانہ چنگیزی، احمد علی کامل، نوبت رائے نظر، طوطا رام شایاں، دوارکا پرشاد افق، امید امیٹھوی، امیر مینائی، مظفر علی اسیر اور شوکت تھانوی کے نام اس سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

مولانا امیر علی ملیح آبادی عرصہ تک اس ادارہ سے وابستہ رہے مولانا آسی مدراسی کا بھی تعلق عرصہ دراز تک اس ادارہ کے ساتھ

رہا۔ ان بزرگوں کے علاوہ منشی گو بند پرشاد فقتا، منشی بھگوان دیال عاقل، محمد حسین جاہ، مرزا عاشق علی عاشق اور منشی فدا علی عیش کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا جو انھوں نے اس نامی ادارہ کی ترقی کے سلسلے میں انجام دیں۔

اس ادارہ کے شعبۂ تصنیف و ترجمہ سے وابستہ رہنے والے دوسرے ارباب قلم میں مولوی غلام سرور لاہوری، مولانا احتشام الدین مرادآبادی، مولانا فخر الدین، مولانا فضل احمد، مولانا خرم علی، مولانا قطب الدین، مولوی تصدق حسین، منشی زوار حسین، خواجہ عبد المجید خاں، مولانا رحمن علی، سید مہدی حسن سیدن پوری، مردان علی خاں رعنا، حکیم احسن اللہ خاں، مولوی یوسف شاہ، لالہ سوامی دیال، منشی تلسی رام، شنکر دیال فرحت، جگن ناتھ خوشتر، احمد حسین قمر، پنڈت کالی چرن، مولوی ابو الحسن فریدآبادی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس ادارہ کی سب سے بڑی خدمت آج آزاد ہندستان میں لائق صد ستائش ہے کہ یہاں مختلف مذاہب کا لٹریچر شائع ہوتا تھا اور اس کے شایان شان انتظام ہوتا تھا۔ ہندو مذہب، جین مذہب، سکھ مذہب، عیسائی مذہب، بدھ مذہب، مسلمانوں میں سنی اور شیعہ مذاہب کی کتابیں بلا کسی تفریق کے شائع ہوتی تھیں۔ اسی طرح اس ادارہ کے مصنفین، مؤلفین، اور ارباب قلم میں ہر مذہب کے لوگ صلاحیت و اہلیت کے بموجب شامل کیے جاتے تھے۔ کیونکہ خود منشی نول کشور ایک برہمن خاندان کے فرد ہونے کے باوجود عربی فارسی اور اردو زبانوں سے نہ صرف واقف بلکہ ان کے ادبیات سے خاصا شغف رکھتے تھے۔ ان کی وسیع النظری اور بے تعصبی اُن کے اُن مخیرانہ کاموں سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف مذاہب کے اداروں کے لیے کرتے رہتے تھے۔ یہاں بھی کسی مذہب مسلک فرقہ یا ذات پات کی کوئی تفریق کبھی نہیں برتی گئی۔ آج بھی اس ادارہ کے ایک ہونہار اور لائق وارث ڈاکٹر رنجیت بھارگو کی اہلیہ ڈاکٹر بھنک لتا بھارگو ایم۔ بی بی ایس نہ صرف ہندی، سنسکرت اور انگریزی زبانوں اور ان کی ادبیات پر عبور رکھتی ہیں بلکہ اردو زبان کی اعلا تعلیم حاصل کر چکی ہیں اور قرآن پاک کو اصل عربی متن نیز اردو ترجمہ کے ساتھ پڑھ چکی ہیں۔ مجموعی طور پر اس خاندان کے افراد نے قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو ہمیشہ اپنا نصب العین بنائے رکھا۔

نول کشور پریس نے اپنے زمانۂ ارتقا میں وہ عظیم خدمات بھی انجام دیں جو ہندستان میں علوم و فنون کی نشاۃ ثانیہ کا سبب بنیں۔ سستے داموں پر کتابوں کی فراہمی اس ادارہ کا اہم کارنامہ ہے جس کی مثال جلد ملنا مشکل ہے۔ ہزاروں کتابوں کی اشاعت کا یہ طویل اور نہ ختم ہونے والا سلسلہ مختلف علوم و فنون پر حاوی تھا جس کی وجہ سے ہندستان میں علم کا فروغ ہوا اور جہالت کی تاریکیاں دور ہونے میں مدد ملی۔

۱۸۸۵ء میں بمبئی میں منعقدہ انڈین نیشنل کانگریس کی پہلی کانفرنس میں اس پریس کے مالک اور بانی منشی نول کشور کی شرکت مالی تعاون اور عملی امداد ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اور منشی جی موصوف نے یہ قدم اس وقت اٹھایا تھا جب انھیں دربار حکومت میں معزز کرسی بھی حاصل تھی، خطاب یافتہ بھی تھے اور ہندستان کی برطانوی حکومت کے معتمدین میں بھی شمار کیے جاتے تھے۔ ان کا مشہور زمانہ "اودھ اخبار" ہمیشہ اسی پالیسی پر گامزن رہا۔ اس اخبار نے آزاد صحافت کا بہترین معیار قائم کرنے کی بڑی ہی کامیاب کوشش کی۔

تاریخ صحافت اردو کے مصنف مولانا امداد صابری رقم طراز ہیں:

"یوں تو اودھ اخبار انگریزوں کا مداح تھا لیکن ان کی دکھتی ہوئی رگ کی ایسی گرفت کرتا تھا کہ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوتا تھا۔ ان کے عیوب کا سنجیدہ انداز میں مذاق اڑاتا تھا[1]"

اس اخبار میں تحریک آزادی کی حمایت میں بھی مضامین شائع ہوتے تھے۔ ۱۱ر اپریل ۱۸۷۵ء کے ایک شمارہ میں "ہماری آزادی" کے نام سے ایک طویل مضمون شائع ہوا جس میں اس پیدائشی حق کو سلب کرنے پر اظہار نفرت کیا گیا اور بیزاری کے ساتھ پرزور مطالبہ کیا گیا کہ ہمیں ہمارا پیدائشی حق دیا جائے۔

---

[1] تاریخ صحافت اردو ص ۶۳

اودھ اخبار ایک عہد آفریں اردو اخبار کی حیثیت سے ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی طرح نول کشور پریس کا ہندی رسالہ "دھودی" بھی بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہے جس کے نامور مدیران میں مشہور صاحب قلم اردو اور ہندی کے مایۂ ناز ادیب و افسانہ نویس منشی پریم چند جیسی شخصیتوں کے نام ملتے ہیں۔ آزاد ہندستان کے دوسرے وزیر اعظم اور مجاہد آزادی لال بہادر شاستری کے علاوہ دلارے لال بھارگو، کرشن بہاری مصرا، رام سیوک ترپاٹھی، ماتا دین شکلا، شیو پوجن سہائے، بانکے بہاری بھٹناگر اور پنڈت روپ نرائن پانڈے جیسے اہل قلم بھی اس رسالے کے حلقۂ ادارت میں شامل رہ چکے ہیں۔ اسی رسالے کے ذریعہ پہلے پہل ہندی کو سرکاری زبان بنائے جانے پر زور دیا گیا کیونکہ یہ بھی بدلتے ہوئے زمانے کی ایک اہم ضرورت تھی۔

"نولکشور پریس" کے علمی ادبی اور اشاعتی کاموں کے سبب ہندستان کو دنیا کے نقشہ میں ایک اہم جگہ حاصل ہوئی۔ شہنشاہ عبدالرحمٰن امیر افغانستان کا گورنر جنرل ہندستان کے دربار میں منشی نولکشور کی عزت و تکریم کرنا اور یہ کہنا کہ ان کا نام اور کام زندہ رہنے والا ہے پھر انھیں افغانستان میں پریس کی شاخ قائم کرنے کی ترغیب دینا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ ترکی، ایران، عرب، سمرقند، بخارا، تاشقند وغیرہ تو زمانۂ دراز تک اسی ادارہ کی مطبوعات کے محتاج رہے اور اسی ادارہ سے ان ممالک کی علمی ضروریات پوری ہوتی رہیں یہی نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں سے بھی علمی روابط استوار کرنے میں اس ادارہ کی خدمات اہمیت رکھتی ہیں۔ آج دنیا کے کسی بھی حصہ میں مشرقی علوم و فنون کا کوئی بھی کتب خانہ اس پریس کی شائع کردہ کتابوں کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جا سکتا۔

یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز ٹوکیو (جاپان) کے ایک تحقیقی مقالہ میں جو جاپانی زبان میں منشی 'نولکشور' کی خدمات پر لکھا گیا ہے۔ فاضل مقالہ نگار پروفیسر تاکیشی سوزوکی اور پروفیسر ٹوشیو تناکا رقم طراز ہیں:۔

"اس طرح انھوں[۲] نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں تہذیبی ترقی کے لیے بڑی خدمت انجام دی — ہم اپنے مقالہ میں منشی نول کشور کی حیات و خدمات کا تعارف پیش کر رہے ہیں۔ جو گذشتہ صدی کے نصف آخر میں اردو اور ہندی ادبیات اور صحافت کی تاریخ میں انتہائی اہم اور یاد رکھنے کے قابل ہیں[۳] منشی جی کی یاد میں ٹوکیو میں ایک لائبریری بھی قائم ہے۔"

جہاں تک ہندستان کی عوامی زبان اردو کی ترقی اور اس کے ادبیات کے فروغ کا سوال ہے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اودھ کی نوابی حکومت ۱۸۵۶ء میں آخری نواب واجد علی شاہ کی جلاوطنی پر ختم ہوئی تو ۱۸۵۸ء میں منشی نول کشور نے واجد علی شاہ کی نوابی حکومت کی جگہ سنبھال لی اور انھوں نے اس زبان اور اس کے ادبی سرمایہ کو دن دونی رات چوگنی ترقی دینے کے لیے ان تھک کوششیں کیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول تفسیر، اصول حدیث، اصول فقہ، منطق، فلسفہ، اخلاقیات، دواوین، کلیات، نوحے، مراثی، مثنویات، تاریخ، داستان، افسانہ، ناول، ڈراما، انشا، مکاتیب نگاری، فن تعلیم، تصوف، تذکرہ، تنقید، سوانح، مزاح، خوش نویسی، طب، نجوم، فلکیات، علم الحیوان، علم الکیمیا، موسیقی، رمل، جفر، ویدانت، حساب، جغرافیہ، لغات، قواعد، عروض، بلاغت، ہندو مسلم سکھ، عیسائی، بدھ، جین، سنی و شیعہ مذہبیات، میلاد نامے، درود، سلام، نعتیں، زراعت، باغبانی، انگریزی ہندی اور اردو سکھانے کی کتابیں — کس موضوع کی کتاب تھی جو اس مشہور زمانہ نولکشور پریس سے نہ شائع ہوئی ہو۔ اور یہی نہیں کہ ایک موضوع پر ایک کتاب ہو بلکہ پورا لٹریچر تیار کر دیا۔ اسی لیے تو مولانا عبدالحلیم شرر[۴] اس پریس کی عالمگیر خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"سچ یہ ہے کہ لکھنؤ میں اس زمانے کے ذوق

۲۔ منشی نول کشور

۳۔ مقالہ مذکور الصدر، بزبان جاپانی (دیباچہ)

۴۔ گذشتہ لکھنؤ، صفحہ ۱۰۹

نے ایسا سامان جمع کر رکھا تھا کہ اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے منشی نول کشور جیسے باہمت اور مردم شناس ناشر کی ضرورت تھی۔ آخر نولکشور پریس نے یہاں تک ترقی کی کہ مشرق کے ادب کو زندہ کر دیا۔ اور اعتماد اور خوبصورت طباعت کے لیے جو شہرت لکھنؤ کی ہوئی کسی اور شہر کو نصیب نہ ہو سکی۔ اور اسی کی برکت تھی کہ وسطی ایشیا میں کاشغر اور بخارا تک اور افغانستان اور ایران کی ساری مانگ لکھنؤ ہی پوری کر رہا تھا۔ چنانچہ آج تک نول کشور پریس علم و دانش کی اشاعت کی کنجی ہے۔ جس سے کام لیے بغیر کوئی شخص علم و دانش کے دائرہ میں قدم نہیں رکھ سکتا"

اسی کتاب میں شرر آگے چل کر لکھتے ہیں :-

"شروع میں یہاں چھپائی کا کام تجارتی ڈھنگ سے نہیں ہوتا تھا بلکہ شوق کی وجہ سے جاری ہوا۔ بڑھیا سے بڑھیا کاغذ لگایا جاتا جو پتھر کے چھاپے کے لیے بہت ہی مناسب تھا۔ بڑے بڑے خوش نویسوں کو مجبور کر کے اور بڑی بڑی تنخواہیں دے کر ان سے کتابت کا کام لیا جاتا تھا۔ نہ تو اس کے ساتھ کام کی کوئی شرط ہوتی، نہ یہ دیکھا جاتا کہ دن بھر میں کتنا لکھتے ہیں۔ یا لکھتے بھی ہیں یا نہیں۔ اسلئے ان کی بڑی خاطر کی جاتی۔ اسی طرح پریس مینوں سے بھی نہ پوچھا جاتا کہ دن بھر میں کتنے کاغذ چھاپے۔ سیاہی کے لیے کڑوے تیل کے ہزاروں چراغ جلا کر بڑھیا کاجل تیار کیا جاتا۔ کھٹائی کی جگہ کاغذی لیموں خرچ ہوتے اور کپڑے کی جگہ اصلی اسپنج کام میں لایا جاتا غرض ہر چیز بہترین قسم کی کام میں لائی جاتی ہے"[5]

منشی پریم چند نے دکھیتر چیترن (ہندی) مولفہ اچاریہ مہابیر پرشاد دویدی مطبوعہ ۱۹۲۸ء کے دیباچہ میں اس پریس کی اشاعتی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

" بھارت ورش میں نول کشور پریس ہی ایسی سنستھا ہے جس نے پہلے پہل ہندی میں پستک پرکاشن کا کاریہ شروع کیا اور اب تک پورے اُتساہ کے ساتھ کرتا جا رہا ہے پچھلے ۷۵ برسوں سے جس اُتساہ کے ساتھ اس پریس نے پرکاشن کا کاریہ کیا ہے وہ کسی بھی بھارت واسی سے چھپا نہیں ہے۔ یہاں پرکاشت پستکوں کا گاؤں گاؤں اور گھر گھر پرچار ہے۔ یہی اس کے اتکرش کا ثبوت پرمان ہے۔ اب تک جتنی بڑی بڑی ہندی اور سنسکرت کی پستکیں اس پریس سے پرکاشت ہوئی ہیں اتنی کسی بھی بھارت ورش کی پریس سے نہیں ہوئیں۔

اب نول کشور پریس کے ادار اور ودیا نوراگی سوامی شری وشنو نارائن جی بھارگوا نے ساہتیک چھیتر کو اور بھی وسترت کرنے کا وچار کیا ہے اور اسی ادیش سے انھوں نے مادھوری سی سرلیت ماسک پتریکا کو جنم دیا، جو اس سمے ہندی بھاشا ساہتیہ کی یتھا سادھ سیوا کر رہی ہے۔

اسی لیے خوشونت سنگھ سابق اڈیٹر السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا منشی نول کشور اور ان کے پریس کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-[6]

" منشی جی صحافت اور طباعت کے میدان میں اب ایک افسانوی شہرت کے انسان کہے جاتے ہیں۔ منشی نول کشور نے ہزاروں اردو و ہندی کتابیں شائع کیں اور اودھ اخبار جیسا کثیر الاشاعت اور موقر اخبار ایسے وقت میں نکالا جب کہ ابھی ہندستان میں طباعت کا فن اپنا ابتدائی منزلوں میں تھا۔"

مطبع نول کشور کے تاریخی کارناموں پر سید حسین ادشی ٹیوٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرف سے پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں ایک تحقیقی مقالہ تیار کیا گیا ہے جو ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) کی طرف

---

[5] گذشتہ لکھنؤ صفحہ ۱۱۰ [6] السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا بمبئی یکم مارچ ۱۹۷۰ء۔

سے شائع ہوتے جا رہا ہے۔

نول کشور پریس نے عربی، فارسی، اردو، ہندی اور سنسکرت میں ہزاروں کتابیں شائع کیں۔ ان کے علاوہ گجراتی، بنگالی، گورمکھی، پشتو اور انگریزی میں بھی متعدد کتابوں کی اشاعت اسی پریس سے ہوئی۔

افغانستان کی علمی اکاڈمی کے ایک ممبر "زلمی ہیواد مل" نے اس پریس کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"منشی نول کشور[1] اور ان کے مطابع کی طباعتی خدمات . . .

مشرق کے اہلِ زبان کے لیے عام طور پر اور خاص کر فارسی، پشتو، عربی، اردو اور برصغیر ہندستان کی دوسری زبانوں کی تاریخ و ادبیات کے محققین اور دانشوروں کے لیے بڑی ہی اہم اور قابلِ قدر ہیں۔

منشی نول کشور نے جو کتابیں اور رسالے اپنے مطابع سے شائع کیے ہیں ان میں سے منشی جی کی طبع کردہ کتابوں کے سوا بعض کے خطی نسخے بھی نہیں ملتے ہیں۔ میں پشتو ادبیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ خیال کرتا ہوں کہ خود پشتو کی سب سے زیادہ کتابیں مطبع نول کشور سے شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں سے اکثر اب نایاب ہیں اور اُن میں سے بیشتر کے خطی نسخے بھی نہیں ہیں۔ اور ہماری معلومات کا ذریعہ صرف مطبع نول کشور کے مطبوعہ نسخوں پر منحصر ہے۔

ہم ہندستان کے اس "فرزندِ فرہنگی" کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے ہیں اور انھیں عقیدت و احترام سے دیکھتے ہیں۔"

نول کشور پریس کی گوناگوں خدمات کا ذکر کرتے ہوئے اتر پردیش کے سابق گورنر، مجاہد آزادی اور آندھرا پردیش کے سابق وزیر اعلا ڈاکٹر بی۔ گوپالا ریڈی رقم طراز ہیں:

"ماضی کی طرف مڑ کر دیکھیے۔ انھوں نے (منشی نولکشور)

ہماری ہندستانی تہذیب کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ان کی شخصیت میں اتر پردیش کی ذہانت اور وسعت نظر اور پنجاب کی روایتی جراُت مندی اور بلند ہمتی کی صفات مجتمع ہو گئی تھیں، اور اس طرح ایک رنگا رنگ شخصیت اُبھر آئی تھی۔ قسمت جس کا ساتھ دے رہی تھی اور کامرانی قدم چوم رہی تھی۔

جن دنوں ہندستان کی سرزمین پر مغربیت کی تیز و تند ہوائیں تھپیڑے مار رہی تھیں، انھوں نے مشرقی تہذیب و دانش کی شمع کو روشن رکھا۔ وہ ہمارے کلاسیکی ادب کے چھپے ہوئے خزانوں کو منظرِ عام پر لائے اور انھیں ادب کے ادنیٰ طلبا کے لیے بھی فراہم کیا۔

اُن کی مطبوعات کی روشنی میں سیاسی اعتبار سے پست ہمت ہندستانیوں کو اپنے ماضی کی عظمت نظر آئی۔ اپنے آبا و اجداد کے علوم کی گہرائی نے ان کے دماغوں میں مستقبل کے لیے امید و اعتماد کی شعاعیں دوبارہ روشن کر دیں وہ اپنے زمانے کے بہت بڑے آدمی تھے اور اُن کی حیثیت ایک "بڑے تہذیبی مرکز" کی تھی۔"

نومبر ۱۹۸۳ء میں اس عظیم پریس کے قیام کو ۱۲۵ سال پورے ہو گئے۔ ۱۸۵۸ء سے ۱۹۵۰ء تک یعنی ہندستان کی آزادی کے تین سال بعد تک یہ پریس اپنی دیرینہ روایات کے ساتھ جاری رہا۔ ۱۹۵۰ء میں خاندانی نزاعات اور دیگر امور اس کی تقسیم کا سبب بنے اور آج مشرق کا یہ سورج غروب ہو چکا ہے۔ سورج ڈوبنے کے بعد ستارے ضرور نمودار ہوتے ہیں۔ اور نولکشور پریس کے درخشاں کے اپنے اوارے ابھی انھیں جھلملاتے ہوئے ستاروں کی مانند ہیں۔

★

[1] تحریر مورخہ اکتوبر ۱۹۸۳ء شہ انگریزی سے ترجمہ از نصار الحسن صدیقی۔ فروغ اردو مارچ ۱۹۷۰ء۔ صفحہ ۷

نور جہاں
۱۰ اسٹیشن روڈ لکھنؤ

نول کشور پریس

اکابرینِ ادب کی نظر میں

یادش بخیر ہندستان کے سب سے بڑے تہذیبی اور اشاعتی ادارہ نول کشور پریس کے قیام کو سوا سو برس نومبر سنہ ۱۹۸۳ء میں پورے ہو گئے۔ اس ادارہ کی خدمات لکھنے کے لیے بقول منشی پریم چند "شہد میں ڈوبے ہوئے قلم کی ضرورت ہے۔" مرزا غالب سے لے کر آج تک مختلف بانول کے ادیبوں، انشا پردازوں، صحافیوں اور دوسرے اہل قلم حضرات نے مطبع نول کشور کی طویل اور بے مثال خدمات کا اعتراف کیا ہے کسی نے بانیٔ مطبع کو علوم مشرقیہ کا محسن قرار دیا۔ کسی نے اردو والوں پر اُن کا احسانِ عظیم مانا۔ کسی نے اردو والوں کو اُن کا مقروض بنایا۔ بھارت سرکار کے محکمۂ ڈاک و تار نے سنہ ۱۹۷۰ء میں منشی جی کے پچھترویں سال وفات کے موقع پر اسپیشل ڈاک ٹکٹ جاری کر کے ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔ ادارہ فروغ اردو ہند (لکھنؤ) کے ترجمان ماہنامہ "فروغ اردو" نے مارچ سنہ ۱۹۷۰ء میں ان کی یاد میں نول کشور نمبر شائع کیا ایران کے رسالہ "مہر دمردم" نے سنہ ۱۹۷۰ء میں نولکشور پریس کی زریں خدمات پر مقالات شایع کیے۔ پھر ماہنامہ "تعمیر ہریانہ" نے اگست سنہ ۱۹۷۹ء میں نولکشور نمبر نکالا۔ دسمبر سنہ ۱۹۸۰ء میں محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش کے اردو ماہنامہ نیا دور نے ایک تاریخی نولکشور نمبر شائع کیا جو اپنی ضخامت، دیدہ زیبی اور مواد کے اعتبار سے اس موضوع پر ایک مکمل ادبی دستاویز کا درجہ رکھتا ہے۔ اسی محکمہ کے ہندی رسالہ اتر پردیش کا نولکشور نمبر جنوری سنہ ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا جو نسبتاً کم صفحات پر مشتمل ہے لیکن ہندی زبان میں منشی جی اور ان کے شہرۂ آفاق پریس کی خدمات پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔

سطور ذیل میں ان اکابرین ادب کے تاثرات پیش کیے جا رہے ہیں جنھوں نے وقتاً فوقتاً اس ادارہ کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ تو آئیے سب سے پہلے مرزا غالب کے خیالات سنیے۔ غالب کہتے ہیں:

"دیوانِ اردو چھپ چکا۔ ہائے لکھنؤ کے چھاپہ خانے نے جس کا دیوان چھاپا اس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ حسنِ خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔"

امیر عبدالرحمن خاں والیٔ افغانستان کہتے ہیں:۔

"آپ نے اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمت کی ہے۔ آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ بلکہ میرا سفر محض اس لیے کامیاب رہا کہ آپ سے ملاقات ہوئی۔ ہندستان آ کر جو مسرت آپ کو دیکھنے سے ہوئی ہے وہ کسی اور چیز سے نہیں ہوئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ افغانستان میں بھی آپ اپنے مطبع کی شاخ قائم کریں میں ہر قسم کی مدد کروں گا۔"

انگریزی دورِ حکومت میں اودھ کے چیف کمشنر مسٹر ونگفیلڈ نے سنہ ۱۸۶۱ء میں کہا تھا۔

"منشی نول کشور بڑے لائق شخص ہیں۔ اور اودھ میں ان کا مطبع سب سے اچھا ہے۔"

منشی رام جی داس اڈیٹر "اودھ ریویو" لکھنؤ رقم طراز ہیں:۔

"منشی صاحب (منشی نولکشور) بڑے علم دوست، ہنر شناس اور قدردان تھے۔ آپ نے اپنے مطبع میں ایسے ایسے لائق مصنف، مفسر، مولف، کاپی نویس،

پریس میں اور منتظم بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازم رکھے جو ہندستان میں اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ منشی صاحب نے الف لیلہ کے ترجموں کی خدمات بھی حاصل کیں اور ایسی ایسی قیمتی اور بڑی بڑی کتابوں کے ترجمے شائع کیے جن کا شائع کرنا کسی معمولی شخص کا کام نہیں تھا۔"

۱۸۸۳ء میں ایک امریکی سیاح نول کشور پریس آئے اور انھوں نے اپنے تاثرات قلم بند کیے جن میں سطور ذیل بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۸۳ء میں نول کشور پریس ترقی کے کن مدارج کو طے کرچکا تھا:۔

"چھاپہ خانہ نولکشور حضرت گنج میں واقع ہے۔ چھاپہ خانے کی عمارتیں بے شمار ہیں۔ یہ کل عمارتیں ایک بڑے رقبہ کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اور صدہا آدمی ہر طرف اپنے اپنے کاموں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اس مطبع میں نہ صرف ہندستان بلکہ ٹرکی، افغانستان، عرب اور یورپ کے فرمائشیں آتی ہیں۔ اس مطبع کا رقبہ اس قدر بڑا ہے کہ یورپ میں اس کی قیمت پانچ لاکھ ڈالر سے کم نہ ہوگی ———— ———— ایک کمرے کے پریسوں کو میں نے شمار کیا۔ اس میں اسّی تھے جو ہاتھوں سے چلائے جاتے تھے ———— ———— پتھروں کی تعداد بے شمار ہے ———— کارخانہ نولکشور میں تالیف اور تصنیف کا بہت سا کام اندر ہی ہوتا ہے اور اگر اس کی کوئی نظیر میں نے دیکھی ہے تو ایپٹن کے کارخانہ واقع پیرس میں دیکھی ہے ———— کارخانہ کشور کا گودام "عجائبات عالم" سے ہے ———— کشور کے مطبع کے ملازمین کی تعداد ایک ہزار دو سو سے کم نہ ہوگی۔"

علامہ نیاز فتحپوری لکھتے ہیں:۔

"منشی نول کشور نے اپنے مطبع کے ذریعہ نہ صرف اردو زبان بلکہ اسلامی علوم و فنون کی جتنی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف کرنے پر ہر شخص مجبور ہے۔"

جناب عزیز احمد آئی سی۔ ایس نے اس مشہور زمانہ پریس کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد اگر سرسید احمد خاں اور نولکشور ہندوستان کے تمدنی ورثہ اور ذہنی بیداری کی حفاظت نہ کرتے تو شاید ہندستان آج ترقی کی دوڑ میں اس طرح جدید اقوام کے ساتھ شانے جوڑ کر نہ بڑھ سکتا۔ اگر نولکشور ان بیش بہا خزانوں کا کھوج لگا کر طباعت کے ذریعہ انھیں زندۂ جاوید نہ بنا دیتے تو ۱۸۵۷ء کے بعد کی گڑبڑ میں ان کی تباہی یقینی تھی۔ یہ ہمارے تمدن کا اتنا زبردست نقصان ہوتا کہ جس کی تلافی ممکن نہ تھی۔"

"تاریخ ادب اردو" کے مصنف ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب میں اس ادارہ کی خدمات کو سراہتے ہوئے لکھا ہے:

"مطبع نولکشور نے زبان اردو کی بڑی خدمت کی۔ اور اس کی ترقی پر بہت اثر ڈالا۔ نادر کتابوں کی اشاعت، مشہور کتب فارسی و عربی کے تراجم، جدید کتابوں کی پبلک مذاق کے موافق تیاری، نیز اسکولی کتابوں کی تیاری سے ادب اردو پر بہت بڑا احسان کیا۔ منشی نولکشور کی قابلیت، دیانت داری اور پابندیٔ اصول سے یہ مطبع تھوڑے ہی دنوں میں ہندستان کیا، بلکہ ایشیا کے سب سے بڑے مطابع میں شمار کیا جانے لگا۔ اس مطبع سے ہزارہا عربی، فارسی، سنسکرت، اردو، ہندی کتابیں بڑے صرف اور بڑے تکلف سے چھپ کر شائع ہوئیں۔"

مولانا ناظر کاکوروی مصنف "اردو کے ہندو ادیب" اپنی کتاب میں منشی نولکشور اور ان کے پریس کی خدمات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"ہندوستانی مسلمان اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے اور نہ اس گراں بہا احسان سے کبھی بھی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کہ اسلامی درسیات، اردو ادبیات اور دیگر مذہبی علوم و فنون کی تبلیغ و اشاعت میں منشی نولکشور کی جو درخشاں خدمات مسلّم ہیں وہ بہ حیثیت مجموعی کوئی مسلمان انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے سرانجام نہ دے سکا۔"

مولانا احمد سعید دہلوی صدر جمعیۃ العلماء ہند دہلی لکھتے ہیں :۔

"اسلامی[۱۰] علوم و فنون کی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں منشی نولکشور اور ان کے ورثا کی خدمات زرّیں حروف میں لکھی جانے کے قابل ہیں۔"

پروفیسر نجیب اشرف ندوی اس ادارہ اور اس کے بانی کے لیے قم طراز ہیں:

"سورگ[۱۱] باشی منشی نول کشور نے سو سال پہلے علم و دانش کا چراغ جلایا تھا جس کی روشنی اور چمک سے ہندوستان کیا ساری دنیا جگمگا گئی تھی۔"

اردو کے مشہور محقق پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :

"مطبع[۱۲] نول کشور نے عربی، فارسی، اردو، ہندی، سنسکرت کی سیکڑوں نہیں ہزاروں کتابیں شائع کر کے علمی دنیا پر جو احسان کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔"

اسی طرح اردو کے بلند مرتبہ ادیب، صحافی، ناقد، محقق اور صاحب طرز انشا پرداز مولانا عبد الماجد دریا بادی رقم طراز ہیں :۔

"منشی[۱۳] صاحب اردو کے خاص محسنوں میں ہوئے ہیں۔ منشی صاحب نے مسلمانوں کا مذہبی لٹریچر چھاپ کر مسلمانوں پر احسان عظیم کیا ہے۔ منشی صاحب کا روزنامہ اودھ اخبار اردو صحافت کی تاریخ میں بڑا ممتاز درجہ رکھتا ہے۔"

رسالہ "معارف" اعظم گڑھ کے اڈیٹر اور مولانا سید سلیمان حسین صاحب مرحوم کے دست راست شاہ معین الدین ندوی مرحوم نے اس پریس کی گراں بہا خدمات کا ذکر اس طرح کیا ہے :

منشی نولکشور[۱۴] نے اسلامی علوم و فنون کی اتنی گراں قدر خدمت کی ہے جو اسلامی ملکوں کی خدمات سے کسی طرح کم نہیں ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا اور وہ اس کے مستحق ہیں کہ ان کی بڑی سے بڑی یادگار منائی جائے۔"

پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسے محتاط اہم قلم بھی اس ادارہ کے لیے لکھتے ہیں :

منشی[۱۵] نولکشور نے اخبار اور کتابوں کا کاروبار شروع کیا اور بڑے حوصلے اور امید سے اسے آگے بڑھایا۔ کاروبار میں نفع و نقصان کا تصور صائع ہو تو صائع، اور عظیم ہو تو عظیم تر کاموں کی ترغیب و رہبری ملتی ہے۔ انھوں نے ہندو مسلمان سکھ اور عیسائی میں کوئی فرق نہیں کیا۔ ہر ایک کی تہذیب اور مذہب کی کتابوں کی طباعت و اشاعت میں سعی بلیغ کی۔ ذاتی و انفرادی حیثیت سے میں منشی نولکشور مرحوم کو مسلمانوں کے غیر مسلم محسنوں میں بڑے پایہ کا محسن سمجھتا ہوں۔"

پروفیسر سید احتشام حسین جیسے نقاد کا خیال ہے :

منشی[۱۶] نولکشور نے اپنے اخبار اور پریس کے ذریعہ علم و ادب کو زندگی بخشی اور ملک کی ذہنی بیداری میں جو حصہ لیا اسے نظر انداز کر کے ہندستان کی مکمل تہذیبی تاریخ نہیں لکھی جا سکتی۔ نشر و اشاعت کے جدید ذرائع اختیار کر کے اپنی صلاحیت سوجھ بوجھ، محنت اور ذوق سے منشی نول کشور نے ان ادبی خزانوں کو برباد ہونے سے بچا لیا جو محض قلمی بیاضوں، سفینوں اور کتابوں میں لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ اور دسترس سے دور پڑے ہوئے تھے۔ اس احسان کو تسلیم کرنا مشرقی ادبیات سے دلچسپی لینے والے ہر دانشور کا فرض ہے۔ میں اسے احسان ہی نہیں قرض تصور کرتا ہوں جسے ہمیں ادا کرنا ہے۔"

ظ۔ انصاری ادیب صاحب کا خیال ہے کہ "نولکشور پریس، لکھنؤ کا فورٹ ولیم کالج کہے جانے کا مستحق ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ" نولکشور پریس کی خدمات کسی اعتبار سے بھی فورٹ ولیم کالج سے کم نہیں سمجھی جا سکتیں۔"

پروفیسر محمد حسن "ادبی تنقید" میں رقم طراز ہیں :۔

"۱۸۵۸ء[۱۷] میں جب منشی نول کشور نے اپنا مطبع کھولا تو علم و ادب کے نئے ذخیرے سامنے آ گئے۔ نولکشور پریس ہمارے ادب کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اگر نول کشور پریس نہ ہوتا تو اردو ادب کی روایات

نہ ہوتیں اور غالباً ہماری زبان ایک ایسی زبان ہوتی جو اپنا ماضی نہ رکھتی۔ نول کشور پریس نے اردو ادب کو اس کا ماضی دیا اور اس کی روایات کو زمانے کی دستبرد سے محفوظ کر کے اردو ادب کے نئے رجحانات کی نشوونما کے لیے راستہ استوار کر دیا۔"

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں :-

"منشی نولکشور[15] کی خدمات اردو فارسی اور عربی کی تاریخ میں سونے کے حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ ان کی یاد منانا علوم مشرقیہ کی خدمت ہے اور ان کو بھلا دینا تاریخی غلطی اور ناسپاسی ہے۔"

بزرگ ادیب، نقاد اور محقق ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کا خیال ہے :

"جب[16] تک اردو بولنے والے زندہ ہیں آنجہانی منشی نولکشور صاحب کی خدمات کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔"

امیر حسن صاحب نورانی اس پریس کی گوناگوں خدمات کا اس طرح اعتراف کرتے ہیں :

"مسلمانوں[17] کے مذہبی علوم و فنون کے احیاء میں منشی نولکشور کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے قرآن شریف کے علاوہ "تفاسیر" احادیث" فقہ، تصوف اور اخلاقیات کی ہزاروں کتابیں شائع کر کے ارزاں ترین قیمتوں پر اہل علم تک پہنچائیں —— ان کی خدمات علوم و فنون کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھی جانے کے قابل ہیں کیونکہ مغرب کی تیز و تند آندھیوں میں بھی انھوں نے مشرقی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کا چراغ روشن رکھا۔"

اور ممتاز ہندی ادیب امرت لال ناگر لکھتے ہیں :

"پریس[18] قائم کر کے تعلیم اور ادب کی اشاعت میں منشی جی نے اس زمانے میں بے مثال حصہ لیا۔ اس زمانے کے اتر پردیش میں دو ہی ایسے ہمیشہ اچھی تمنا رکھنے والے محنتی اور بڑے انسان تھے۔ ایک منشی نول کشور اور ان کے بعد بابو شیوا منی گھوش ہوئے۔ سرسوتی کے ان دونوں ہی جیالے مند خادموں پر لکشمی کی بے انتہا مہربانی رہی۔ علمی چراغاں کا جگ مگ اجالا کرنے والے ایسے جو شیلے بڑے انسان ہمارے دیش کی ادبی اور تہذیبی تاریخ میں لمبے عرصے تک یاد کیے جائیں گے۔"

★

---

[1] بنام میر مہدی مجروح مورخہ ۸ راگست ۱۸۶۱ء [2] جیون چرتر منشی نولکشور از لال جی کاکوروی [3] رجسٹر ریکارڈس مطبع نولکشور [4] اودھ ریویو فروری ۱۸۹۵ء [5] رجسٹر ریکارڈس مطبع نولکشور [6] دور جدید لکھنؤ فروری ۱۹۵۶ء [7] ماہنامہ آج کل نئی دہلی جون ۱۹۴۵ء [8] تاریخ ادب اردو حصہ نثر صفحہ ۹۰-۹۹ [9] اردو کے ہندو ادیب صفحہ ۱۸۴ [10] دور جدید لکھنؤ فروری ۱۹۵۶ء [11] ایضاً [12] مکتوب مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۷۰ء [13] مکتوب فروری ۱۹۷۰ء [14] ایضاً [15] ایضاً [16] دور جدید لکھنؤ مارچ ۱۹۷۰ء [17] ادبی تنقید صفحہ ۱۷۸-۱۷۹ [18] مکتوب فروری ۱۹۷۰ء [19] مکتوب فروری ۱۹۷۰ء [20] مکتوب ۱۵ فروری ۱۹۷۰ء [21] گیان دیپ پرکاشک نولکشور۔ اتر پردیش فروری ۱۹۸۶ء

ڈاکٹر شبیر فاطمہ
شعبۂ عربی و فارسی
الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد

فکرِ شاعر کی رسائی
کب ترے در تک نہیں؟

نول کشور پریس ہماری علمی و ادبی تاریخ کا ایک اہم اور زریں باب ہے۔ اس کے تذکرے کے بغیر ہماری علمی اور تہذیبی تاریخ نامکمل ہے۔ اس تاریخی ادارہ نے جو نمایاں کارنامے انجام دیئے اور جو عظیم خدمت کی اس کی مثال ہندستان تو کیا کسی اسلامی ملک میں بھی ملنا دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ تنہا اس ادارہ نے عربی و فارسی، اردو و ہندی سنسکرت و گجراتی، گورکھی و بنگالی اور پشتو زبانوں میں اب تک تقریبًا بارہ ہزار کتابیں شائع کی ہیں۔ اس تعداد میں مختلف کتابوں کے وہ متعدد اڈیشن شامل نہیں ہیں جو بار بار اور وقتًا فوقتًا نکلتے رہے بعض ایسی کتابیں بھی اس ادارہ نے شائع کیں جن کے اب تک ۵، ۷ اڈیشن نکل چکے ہیں۔

لیکن جہاں نولکشور پریس نے یہ عظیم خدمات انجام دیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علوم مشرقیہ کے قدر دانوں نے اس پریس کی خدمات کا صحیح اور مناسب طریقہ پر اعتراف نہیں کیا۔ ہمیں چاہیئے تھا کہ ہم ان کی شایان شان یادگاریں قائم کرتے۔ ان کے نام کی چیئر ہماری یونی ورسٹیوں میں قائم ہوتی۔ ان کے نام پر وظائف اور گولڈ میڈلس دیے جاتے۔

لیکن بڑی مسرت کی بات ہے کہ کچھ عرصہ سے اس طرف توجہ کی جا رہی ہے۔ ہمارے بہت سے ادیبوں، شاعروں اور انشا پردازوں نے ان کی خدمات پر قلم اٹھایا ہے۔

اس سلسلے میں ورق گردانی کی تو بعض کام کی باتیں سامنے آئیں۔ مرزا غالب اور منشی نول کشور کے تعلقات پر نیا دور لکھنؤ میں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ منشی نول کشور بڑے علم دوست، ادب نواز اور مردم شناس شخص تھے اور ان کے پریس سے ایسے ہی لوگ وابستہ رہے جنھیں تاریخ نظر انداز نہیں کر سکتی۔

منشی امیر اللہ تسلیم اور اصغر علی نسیم نے منشی موصوف کی مدح میں متعدد نظمیں لکھیں لیکن یہاں تسلیم کے ان اشعار کو پیش کرنا مقصود ہے جن سے منشی جی کے علاوہ پریس کی خدمات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

منشی امیر اللہ تسلیم سہوانی ایک قادر الکلام شاعر، مستند ادیب اور فنکار تھے۔ نولکشور پریس کے اشاعتی کاموں اور اودھ اخبار سے عرصہ تک ان کا تعلق رہا۔ انھوں نے اپنی ایک مثنوی میں منشی نول کشور کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بانیٔ مطبع اودھ اخبار اور مطبع نولکشور کی شہرت اپنے زمانے میں قریب و دور ہر جگہ پھیل چکی تھی۔ ان کے مطبع کی شاخیں جگہ جگہ قائم تھیں اور وہ بڑی اولوالعزمی، دانشمندی اور بلند ہمتی کے ساتھ مطابع کی اشاعتی اور تصنیفی سرگرمیوں میں مصروف تھے منشی جی موصوف حقیقت میں خود بھی بڑے صاحب قلم اور صاحب استعداد تھے۔ فارسی اور اردو کی بعض کتابوں پر ان کے دیباچے تواریخ نادر العصر کی تالیف اور بعض منظوم نمونے ان کی علمی لیاقت کا ثبوت ہیں اور سب سے بڑا ثبوت تو خود ان کے اشاعتی کارنامے ہیں انھیں علمی شہ پاروں کی سوجھ بوجھ تھی۔

منشی نولکشور کے بارے میں مذکورہ مثنوی میں تسلیم کہتے ہیں[۹]

اس کا ہر قول لائق تعریف اس کا ہر فعل قابل توصیف

آفتابِ سپہرِ دانائی — روشنی چراغِ مینائی
دُرِ یکتائے بحرِ لطف و کرم — گل نوخیز باغِ جود و ہمم
حکمرانِ ولایتِ اخلاق — شمع پرنورِ مجلسِ اشفاق
اس کا نکتہ حکمتِ لقمان — اس کے جوہر کا اک عرضِ سحبان
دیکھ کر اس کی گوہر افشانی — پانی پانی ہے ابرِ نیسانی
خوبصورت، جواں، پری دیدار — مالکِ مطبع "اودھ اخبار"
نام نامی نول کشور اس کا — ہفت اقلیم میں ہے شور اس کا
ہر جگہ اس کا کارخانہ ہے — اس اولوالعزمی کا ٹھکانہ ہے
اس سے تازہ ہے گلشنِ تقریر — اس سے روشن ہے مجلسِ تحریر

ناظموں کی اسی سے عزت ہے
ناشروں کی اسی سے شہرت ہے

حکیم عبدالعلی قلق نے دیوانِ گلشنِ گلزارِ وقار کی اشاعت کے موقع پر قطعات تاریخ لکھے تھے۔ ان میں بھی مطبع کی خدمات اور کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ سطور ذیل میں ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں:۔

بلبلیں بولیں، نہیں معلوم تجھ کو کیا سبب
چھپ رہا ہے مطبعِ عالی میں دیوانِ وقار
مطبع ایسا ہو، رہے دیواں ایسا ایسے مہتمم
زین موالید ثلاثہ ربع مسکوں را قرار[۲]

غلام محمد تپش سابق اڈیٹر اودھ اخبار نے مذکورہ دیوان کے خاتمۃ الطبع میں لکھا ہے۔

"منشی صاحب والا مناقب بلند اقتدار یعنی جناب منشی نولکشور صاحب مالک اودھ اخبار کی سخن فہمی بھی لائق تحسین و آفرین ہے کہ ممدوح الیہ نے اس مجموعۂ خوبی کو جیسا یہ عمدہ تھا ویسے ہی عمدہ اور خوشخط و خوشنما چھپوایا اور نقش و نگار طبع سے نگارِ معنی کو یک قلم دل ربا بنایا۔ الٰہی جب تک سخن و اہلِ سخن کا ساتھ رہے اس مطبع کی بات تیرے ہاتھ رہے۔"

منشی جگن ناتھ خوشتر کی "بھاگوت منظوم" میں ان کے صاحبزادے لالہ روشن لال کی تصنیف کردہ ایک طویل نظم بھی شامل ہے جو منشی نول کشور کی مدح میں ہے۔ اس نظم میں ۶۸ شعر ہیں۔ ان میں سے چند اشعار یہاں ہدیۂ ناظرین کیے جا رہے ہیں۔

بہارِ بوستانِ علم ہے وہ — نگارِ گلستانِ علم ہے وہ
بہارِ دانش و دولت ہے اس سے — شمیم گلشنِ حشمت ہے اس سے

منشی شنکر دیال فرحت خلف منشی پورن چند متوطن جلال آباد ضلع فرخ آباد مصنف "رامائن نظم اردو فرحت حرف بہ حرف مطابق تلسی کرت" نے منشی نول کشور اور ان کے شہرہ آفاق مطبع نولکشور کے بارے میں اپنے منظوم خیالات کتاب مذکور میں درج کیے ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۶۳ء میں پہلی مرتبہ مطبع نولکشور سے شائع ہوئی تھی۔ وہ کہتے ہیں ؎

سنبھل اے خامۂ فرخندہ کردار — مقامِ ہوشیاری ہے خبردار
ادائے شکر کو خم سر کے بل ہو — عروسِ مدعا سے ہم بغل ہو
تجھے اک قدرداں ایسا ملا ہے — کہ جس سے غنچۂ مطلب کھلا ہے
وہ نام اس بحر میں کس طرح آئے — بھلا کوزے میں کب دریا سمائے؟
نول سے ہو کشور لے دل اگر وصل — تو نامِ قدرداں ظاہر ہو در اصل
سخن فہم و سخن سنج و سخنداں — عقیل و سرگروہِ عقلمنداں
مہِ برجِ شرافت، نیرِ جاہ — سپہرِ ارجمندی دانش آگاہ
جہاں میں مطبع والا کی ہے دھوم — مجھے کیا جملہ خلقت کو ہے معلوم
کلوں کو کہیے نقلِ چرخِ گرداں — مگر ہو چرخ عقلِ چرخ گرداں
جو دیکھو پیچ کو دل پیچ کھائے — رہے بے کل بشر چکر میں آئے
منیجر، منشی و دیوان نامی — سب استادانِ فن ہیں اہتمامی
دبیر و شاعر و اہلِ فراست — ہر اک ہے اخترِ برجِ شرافت
قضا و موحد و تسلیم و شاداں — عیاں ہیں سب کے اوصاف نمایاں
عجب کچھ ہے بہارِ سنگ سازی — کہ پاسنگ اس کی ہے نیرنگ سازی
مصورِ غیرتِ مانی و بہزاد — عرض حاضر ہیں اس ہر فن کے استاد
ملے مالک جب ایسا نیک نیت — ملازم کیوں نہ ہوں عالی طبیعت

(بقیہ حاشیہ) [۱] منشی انوار حسین تسلیم از ڈاکٹر حنیف نقوی۔ ماہنامہ نیرنگ اگست ۱۹۷۹ء ص ۹۲ [۲] بہارستان اشعار ص ۸۹ مطبوعہ ۱۲۹۱ ہجری [۳] " "

काकोरी शहीद स्मारक
का शिलान्यास
श्रीमती इन्दिरा गांधी

منشی نول کشور کو کتابوں سے عشق تھا۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے مضمون نویسی کا شوق تھا۔ بڑے ہوئے تو صحافت کی طرف چلے گئے۔ اور پھر ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ میں ذاتی مطبع قائم کیا۔ اودھ اخبار جاری کیا۔ اور اپنے مطبع کے ذریعہ عمر کے آخری وقت تک گلستان علم و ادب کی آبیاری کرتے رہے۔ ان کے بعد ان کے لائق اور ہونہار جانشینوں نے بھی عرصہ تک ان کے شروع کیے ہوئے کاموں کو جاری رکھا۔

منشی جی کے بعد رائے بہادر پراگ نرائن نے ۱۹۱۶ء تک نولکشور پریس کا انتظام بحیثیت ایک لائق جانشین انجام دیا اور انھوں نے باپ کی جلائی ہوئی شمع کو نہ صرف روشن رکھا بلکہ اس کی لو تیز تر کر دی کیونکہ خود بھی دانشور اور اہل قلم تھے۔ اردو کی بیشتر طویل ترین داستانیں انھیں کے زمانۂ حیات میں شائع ہوئیں۔ صحیفۂ زریں انھوں ان کی تالیف ہے۔

منشی پراگ نرائن کے بعد منشی بشن نرائن ۱۹۳۱ء تک نولکشور پریس کے مالک رہے۔ ۱۹۲۲ء میں انھوں نے مشہور تاریخی پرچہ "مادھوری" جاری کیا۔ پنڈت روپ نرائن پانڈے ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"بشن نرائن بھارگو نے اپنے آبا و اجداد کی جلائی ہوئی شمع کو اور تیز کر دیا۔ ہندی سے آپ کی محبت کا سب سے بڑا ثبوت ہے ان کا رسالہ "مادھوری" جس کو آپ نے ہزاروں روپیہ ماہوار کے نقصان پر بھی جاری رکھا:"

منشی پریم چند نے رسالہ "زمانہ" کانپور میں جنوری ۱۹۳۱ء کے شمارے میں لکھا تھا۔

"منشی نولکشور کے خاندان کا یہ سورج عین اس وقت ڈوبا جب وہ اپنے پورے عروج پر تھا ...... لکھنؤ کا یہ علم دوست خاندان بہت کم عمر ثابت ہوا"۔

منشی بشن نرائن جی کے بعد راجہ رام کمار بھارگو نے اس عظیم پریس کی ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالا۔ ڈاکٹر رام کمار ورما نے راجہ صاحب کے بارے میں لکھا ہے۔

"راجہ صاحب کے کام کرنے کی لیاقت اور مستعدی کی وجہ سے یہ ادارہ ایشیا کے سب سے بڑے دارالاشاعت کی حیثیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ ..... انھوں نے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۵۰ء تک اردو کے مشہور روزنامہ "اودھ اخبار" اور ہندی کے ماہوار رسالہ مادھوری کی اشاعت میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ ..... ان کی یہ صحافت ہندوستان کی تحریک آزادی میں قوم پرستی کا جذبہ بیدار کرنے میں کامیاب ثابت ہوئی ہے"

✱

غزل

مناظر حسن شاہین

علاول پور ڈاکخانہ نگوں
براستہ تروان، ضلع گیا (بہار) ۸۰۵۱۲۸

نہ اور دل کو دکھاؤ بہت اداس ہے شام
غموں کو گیت بناؤ بہت اداس ہے شام

گزر سکے گی نہ فرقت کی رات اے ہمدم
نہ ایسے روٹھ کے جاؤ بہت اداس ہے شام

تمام شہر ہے پنہا غموں کی چادر میں
خوشی کے گیت نہ گاؤ بہت اداس ہے شام

تمہاری یاد کے زخموں سے ٹیس اٹھتی ہے
کوئی علاج بتاؤ بہت اداس ہے شام

دلوں پہ کرب کے سائے ابھی مسلط ہیں
یہ داستاں نہ سناؤ بہت اداس ہے شام

مرے چمن میں کبھی آئے، بہار سے کہنا
سنو خزاں کی ہواؤ! بہت اداس ہے شام

چراغ اشک فروزاں، خموش ساز غزل
غزل فراق کی گاؤ بہت اداس ہے شام

منشی نول کشور مرحوم نہ صرف ایک بڑے ناشر کتب بلکہ صاحب قلم اور صحافی بھی تھے۔ انھوں نے بعض اردو فارسی کتابوں پر دیباچے بھی لکھے جن سے ان کی علمی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے لیکن اردو میں ان کا مخصوص اندازِ تحریر ان کی کتاب "تواریخ نادر العصر" میں نمایاں ہے جو بقول خود ان کے "بہ عجالہ تالیفات قدیمہ سے انتخاب کرکے اور کچھ اپنی یادداشت سے بڑھا کر اس بضاعت مزجات کو پیشکش خدام عالی مقام کیا۔ [1]"

لکھنؤ آج بھی اترپردیش کا دارالسلطنت ہے اور اس لحاظ سے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ یہ شہر ہندستان کی سب سے بڑی ریاست کا دارالسلطنت ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کی تہذیب بھی ساری دنیا میں شہرت رکھتی ہے اور یہاں کی زبان اپنی نفاست، سلاست اور روانی کی بنا پر خصوصی اہمیت کی حامل۔ منشی نولکشور مرحوم نے اپنی کتاب "تواریخ نادر العصر" میں لکھنؤ کی تعمیرات کا حال لکھا ہے۔ منشی جی کی ولادت ۱۸۳۶ء میں اور وفات ۱۸۹۵ء میں ہوئی تھی۔ ۱۸۵۸ء کے نومبر میں انھوں نے اس شہر کو کاروبار کے لیے منتخب کیا اور وفات کے وقت تک یہیں قیام پذیر رہے۔ اس لحاظ سے ان کے بیانات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ سطور ذیل میں ان کی اس کتاب کے اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔

"اس شہر کے نواب آصف الدولہ بہادر سے ہر ایک کے عہدِ حکومت و سلطنت میں مکانات عمدہ عمدہ تعمیر ہوتے رہے۔ شہر کے اتر کی طرف گومتی کے کنارے کنارے کثرت سے مکانات شاہی موجود تھے۔ ہنگامے [2] دبلوے کے پہلے بعض بعض مکان سرکاری کام میں آگئے۔ پھر ایام غدر میں توپ کی زد میں جو مکانات رہ گئے۔ گولے اور گولیوں سے بالکل مسمار و شکستہ ہوگئے۔ چونکہ بعد انتظام ملوہ مرمت میں صرف کثیر ہوتا اس سبب سے اکثر مکانات مسمار کیے گئے۔ ان سب کے احوال عبرت مآل بخیال طوالت کتاب قلم انداز کیا گیا۔

اب جس قدر تعمیرات مشہور مشہور باقی ہیں حد شرقی سے سلسلہ اس کا شروع ہوکر حد غربی تک تمام کیا جاتا ہے۔

کوٹھی بیبیاپور جس کو نواب آصف الدولہ نے سیرگاہ و شکارگاہ کے طور پر تعمیر کروایا تھا اور وہاں جاکر سیر و شکار کیا کرتے تھے مگر جنکم صاحب ریذیڈنٹ بہادر سابق لکھنؤ سے تبدیل ہوکر روانہ ہوئے اور ڈسر صاحب بجائے ان کے کارفرما ہوئے تو دوسرے روز اس مقام پر نواب وزیر علی خان سے واسطے ملاقات صاحب ریذیڈنٹ بہادر کے تشریف لائے و بروقت رخصت صاحب بہادر کو اپنے ساتھ ہاتھی پر سوار کرواکر کوٹھی ریذیڈنسی میں لے گئے اور آں مرکا تصفیہ ہوا کہ وزیر علی کو مسند سے برخاست کرکے سعادت علی خاں پسر متبنیٰ آصف الدولہ کو بجائے ان کے مسند نشین کریں۔ اور یہ بات مشہور عام ہے کہ اسی مقام میں جناب لاٹ صاحب ٹلبن ہوتھ بہادر نے دربار اہالیان دربار شاہی کا فرمایا تھا اور اسی جلسے میں وزیر علی کو حکم معزولی مسند کا سنایا تھا اور اسی مقام سے ان کو روانہ شہر بنارس کیا تھا، جو جگہ

---

[1] دیباچہ تواریخ نادر العصر از منشی نولکشور [2] مراد ۱۸۵۸ء کا ہنگامہ جنگ آزادی [3] جمع توپ

ان کے قیام کے واسطے سرکار سے تجویز ہوئی تھی۔

کوٹھی دلکشا:۔ اس کوٹھی کو سعادت علی خاں نے اپنے سیر و شکار کے واسطے بنوایا تھا۔ اور جنگل گرد و پیش کو صاف کروا کر ایک چراگاہ مقرر اور اس میں جانوران شکاری مثل ہرن وغیرہ چھوڑ دا دیے تھے۔ اس کوٹھی میں اکثر بیگمات بھی سیر کے واسطے آیا کرتی تھیں۔

ولایتی باغ۔ اس باغ کو بادشاہ نصیر الدین حیدر نے تیار کیا تھا اور اس میں اکثر ولائتی درخت لگائے تھے۔ اسی وجہ سے اس کا نام ولایتی باغ مشہور رہا۔ واجد علی شاہ نے اس کی چار دیواری بنوا کر وہ بلندی بخشی جو اب موجود ہے۔ کیونکہ ان کے محلات اکثر وہاں جا کر سیر کیا کرتے تھے اور اس کے واسطے پردے کا مکان ضرور تھا۔

کوٹھی مارٹین۔ جس کو کنسٹنشیا بھی انگریزی زبان میں کہتے ہیں اس کو جنرل کلاڈ مارٹین صاحب نے تعمیر کیا تھا۔ صاحب نے اس کی تعمیر شروع کی اور نقشہ نواب آصف الدولہ بہادر کو دکھلایا۔ نواب صاحب نے نقشہ کو پسند فرما کر خواہش اس کے خرید فرمانے کی ظاہر کی اور دس لاکھ روپیہ اس کی قیمت قرار پائی مگر نواب صاحب کی مرگ نے اس معاملے کو انجام نہ ہونے دیا۔ اور بعد چند روز کے جنرل مارٹین صاحب بھی فوت کر گئے اور یہ تعمیر ناتمام تھی مگر صاحب موصوف نے بہ نظر اس کے کہ کوئی حکمران آئندہ اس کو ضبط نہ کر لے، یہ حکم دیا تھا کہ اس کی لاش اسی مکان میں دفن ہو، اور جو روپیہ اس نے واسطے ترتیب مدرسہ کے جمع کیا ہے اس کے سود کی آمدنی سے یہ تعمیر اختتام کو پہونچی بیچ ہنگام مفسدہ کے سپاہ مفسدین نے صاحب کی قبر کھود کر اس کے استخوان وغیرہ جو باقی تھے ان کو پاش پاش اور پریشان کر دیا تھا۔ مگر بعد فرو ہونے مفسدہ کے کچھ استخوان صاحب کے جو دستیاب ہوئے دوبارہ قبر میں رکھے گئے۔

نہر گنگ۔ اس نہر کی کھدوائی نصیر الدین حیدر کے وقت میں شروع ہوئی تھی اور زر کثیر اس میں صرف ہوا۔ اور علت غائی اس مطلب سے بہت مفید اور کارآمد تھی۔ راجہ بختاور سنگھ نے امرشاہ اودھ کے گوش گذار اور عرض کیا کہ اس نہر سے پانی گنگا کا لکھنؤ تک آوے گا اور اس کے سبب سے تجارت اور زراعت کو بہت فائدہ ہوگا بلکہ ان کو ترغیب و تحریص دے کر شروع کروا دیا تھا، مگر چونکہ یہ امر علم سے تعلق رکھتا ہے اور کسی صاحب انجینیر کی صلاح اور مشورہ اس میں نہ تھا اس لیے یہ امر اختتام کو نہیں پہونچا اور اکثر ٹھیکے داران کو جنھوں نے ٹھیکہ کندیگی کا لیا تھا، متمول کر دیا یعنی وہ لوگ روپیہ لے کر بھاگ گئے اور اس نہر کو ناتمام چھوڑا۔ ہنگام بلوہ مفسدین نے اسی نہر پر اپنا اوّل مورچہ قائم کیا تھا۔

تعمیرات عہد نواب سعادت علی خاں۔ تعمیرات مفصلۂ ذیل سعادت علی خاں نے تعمیر کروائی تھیں تاکہ شہر غربی جانب سے ویسا ہی آراستہ ہو جیسا کہ اس کے بھائی علاتی نے مشرقی جانب کو درست کیا تھا۔ کوٹھی حیات بخش جس میں جناب صاحب کمشنر بہادر رونق افروز ہیں کوٹھی دار الشفا جس میں صاحب سکرٹری بہادر تشریف رکھتے ہیں۔ کوٹھی بیگم جس میں توپ خانہ اب قائم ہے۔ منکر والی کوٹھی جس میں برگیڈیر صاحب قیام فرما ہیں۔ کوٹھی نور بخش جس میں صاحب ڈپٹی کمشنر فروکش ہیں بادشاہ منزل جس مقام پر اب قیصر باغ تیار ہوا ہے۔ چینی بازار اور تیڑھی کوٹھی ان مکانات میں اکثر صاحب زادے رہا کرتے تھے اور جو خالی تھے وہ نواب صاحب کے سیر و تماشا کے واسطے آراستہ رہا کرتے تھے۔ جس مکان میں ان کے دل میں آتا تھا اس میں سیر و تماشا کرتے تھے۔ اور تیڑھی کوٹھی واسطے سر انجام امور ملکی کے تیار ہوئی تھی۔ جو کام ملکی ہوتا تھا وہ وہاں درپیش ہوتا تھا۔ ان مکانات میں سے اکثر مکانوں کے نام بلوے میں مشہور ہو گئے۔ یعنی کوٹھی حیات بخش میں میجر موڈس صاحب جو نہایت دلیر و شجاع تھے جاں بحق تسلیم ہوئے۔ اور بیگم کی کوٹھی میں بہت سے سپاہیان شجاعت شعار نے ہاتھ مفسدین سے شربت ممات پیا۔ کوٹھی نور بخش کے بالا خانے سے ہاتھ سرینری ہولک صاحب بسرے مورچال مفسدین پر گولہ مارتے تھے اور راستہ قیصر باغ کا نکالا تھا۔ اور اس کوٹھی پر مفسدین کے گولے اس قدر لگے تھے کہ اب تک نشان گولوں کا اس کی دیوار پر موجود ہے اور اس کثرت سے ہے کہ گویا دیوار چھلنی ہو گئی ہے۔

سکندر باغ۔ تعمیر کردہ واجد علی شاہ جو شاہ ممدوح نے سکندر بیگم کو عطا کیا تھا اور اسی سبب سے بنام "سکندر باغ" مشہور رہا۔ اس میں کوئی شے قابل تعریف نہیں، مگر یہ کہ اس میں ہنگام بلوہ سپہ سالار بہادر افواج سرکاری نے قریب دو ہزار سپاہ مفسدین کو سزا دی تھی اور ان کی لاشیں بہتیری اسی میں دفن ہوئی تھیں اور بہت اس راستہ میں پڑی رہیں جو شمالی اور مشرقی جانب باغ کے جاتا ہے۔

قدم رسول:۔ ایک مذہبی مقام اہل اسلام کا جس کو غازی الدین حیدر نے ایک مقام بلند تیار کروا کر تعمیر کیا تھا۔ اس میں ایک سنگ پارہ ہے جو عرب سے ایک حاجی لایا تھا اور جس پر نقش قدم پیغمبرؐ کے ہیں ہنگام بلوہ سنگ پارۂ مذکور گم ہو گیا مگر کوئی اس کا لے جانے والا معلوم نہ ہوا۔

نجف اشرف۔ جو بنام شاہ نجف مشہور ہے۔ اس کو غازی الدین حیدر نے اپنا مقبرہ بنوایا تھا۔ اور اسی میں دفن بھی ہوئے ہیں۔ اس مقام کو یہ نام اس واسطے دیا گیا تھا کہ ایک مقام کوہ نجف ہے جس پر قبر حضرت علیؓ داماد محمد پیغمبرؐ کی تعمیر ہے۔ اور مشہور یہ ہے کہ یہ مقبرہ اسی کی نقل بنا ہے۔ اور غازی الدین حیدر نے کچھ روپیہ واسطے مصارف اس مقبرہ کے سرکار میں جمع کر دیا تھا جس کے سود سے خرچ اس تعمیر کی مرمت کا اور تنخواہ عملہ مقبرہ کی مثل سید وغیرہ ہوتا ہے۔ اس مقام پر بھی سپہ سالار افواج سرکاری کو بہ مقابلہ مفسدین بڑی تکلیف اٹھانی پڑی تھی اور مفسدین نے یہاں نہایت سخت مقابلہ کیا تھا۔ اس مقام پر ہنگام جنگ مفسدین سر ولیم پیل صاحب کی بھاری توپیں آئی تھیں دو دو گھنٹے تک ان کے گولے اس پر گرتے رہے۔ اور اسی مقام پر بریگیڈیر ہوپ صاحب نے کارنمایاں کیا تھا یعنی تنہا واسطے تلاش چور راستے کے گئے تھے اور ایک کھڑکی دریافت بھی کی تھی مگر اسی عرصہ میں اتواپ مذکورہ کے صدمے سے دیوار شق ہو گئی تھی اور سپاہ سرکار اس شق کے راستے سے اس مکان میں داخل ہو گئی

تعمیرات موتی محل۔ تعمیر کردہ سعادت علی خان شمال کی جانب احاطہ کے ہے اور موتی محل اس کا اس واسطے نام رکھا گیا تھا کہ اس میں ایک برج بنا تھا جو بہ شکل موتی کے تھا مگر اب وہ مسمار ہو گیا ہے دو دیگر مبارک منزل اور دیگر شاہ منزل۔ مبارک منزل غازی الدین حیدر نے کنارۂ دریا پر تعمیر کیا تھا اور شاہ منزل جہاں اب پل کشتیوں کا ہے . . .

واسطے لڑائی حیوانات کے تعمیر

. . . . ہوا تھا۔ چھوٹے چھوٹے جانوروں کی لڑائی اندر احاطہ شاہ منزل کے ہوا کرتی تھی اور شیر وغیرہ کی لڑائی بھی اسی احاطہ میں ہوتی تھی۔ اس واسطے مضبوط پنجرے اور مستحکم مامن تماشہ دیکھنے والوں کے لیے تعمیر ہوئے تھے، مگر لڑائی ہاتھی اور گینڈے کی دریا پار میدان میں حضوری باغ کے سامنے ہوا کرتی تھی کیونکہ ایسے حیوانات کی لڑائی کی سیر کے واسطے فاصلہ بہت ضرور ہے۔ اور شاہ اور دیگر ارکان سلطنت برآمدہ شاہ منزل پر دیکھا کرتے تھے۔

خورشید منزل۔ اس تعمیر کو سعادت علی خاں نے شروع کیا تھا اور غازی الدین حیدر نے ختم کیا مگر کسی خاص مطلب کے واسطے یہ عمارت نہیں بنی تھی اور بعد تسلط ملک اس میں سکونت ۳۲ رجمنٹ کی قرار پائی تھی۔

تارا والی کوٹھی:۔ اس تعمیر کو نصیر الدین حیدر نے بہ ہدایت اور بسر براہ کاری کرنیل ولکوکس صاحب کے جو منجم شاہی تھے تعمیر کروایا تھا اور آلۂ نجوم بھی اس میں نہایت اچھے رکھے گئے تھے ۱۸۴۷ء میں کرنیل صاحب ممدوح مر گئے اور واجد علی شاہ نے عملہ صاحب مرحوم کو برخاست کر دیا۔ اور آلۂ نجوم بہ حفاظت رکھے گئے مگر مفسدے میں گم ہو گئے کہیں ان کا پتہ نہ ملا۔

قیصر باغ۔ ایک نہایت عمدہ تعمیر عہد واجد علی شاہ کی ہے۔ یہ تعمیر ۱۸۴۸ء میں شروع ہوئی تھی اور ۱۸۵۰ء میں ختم ہوئی اور مع اسباب و سامان آرائش کے اس میں اسّی لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا۔ وجہ تسمیہ اس نام کی یہ ہے کہ بادشاہان اودھ اپنی مہر وغیرہ میں لقب "قیصر" کا لکھا کرتے تھے کیونکہ "قیصر" خطاب بادشاہ روم کا ہے اور شاہ روم بڑا بزرگ اور نامی بادشاہ اہل اسلام ہے۔

اس تعمیر کے بیان کرنے میں لازم ہے کہ ایک جانب سے بیان شروع ہو اور بہتر یہ ہے کہ دروازہ شمالی و مشرقی سے ہو۔ جو دروازہ روبرو اس میدان کے واقع ہے جو سامنے تارا والی کوٹھی کے تعمیر کیا گیا ہے۔ اسی دروازے میں سے اور بعد ازاں ایک کھڑکی میں سے تو اب بند ہے مجرمان گرفتار شدہ نیے قید خانے میں پہونچائے گئے تھے۔ اس دروازہ سے آگے جا کر ایک صحن وسیع روبرو دروازہ جلو خانے کے ہے۔ اس صحن میں سواری اور جلو شاہی تیار ہو کر آراستہ ہوا کرتی تھی یہاں سے آگے جا کر ایک دروازہ ہے اس پر پردہ پڑا تھا۔ اس سے گزر کر چینی باغ ہے۔

اس کا نام چینی باغ اس واسطے تھا کہ اس میں اسباب چینی کا باغ کی آرائش کے لیے تھا۔ وہاں سے آگے جا کر اور ایک دروازہ سے گزر کر حضرت باغ ہے۔ اس باغ کے جانب راست چاندی والی بارہ دری ہے۔ اس بارہ دری میں فرش چاندی یعنی نقرہ کا تھا۔ اور اسی جانب خاص مقام اور بادشاہ منزل ہے جس میں خاص کر بادشاہ رہا کرتے تھے۔

اس بادشاہ منزل کا بیان پیشتر ہو چکا ہے کہ اس کو سعادت علیخاں

نے تعمیر کیا تھا۔ اب واجد علی شاہ نے اسے نقشۂ قیصر باغ میں شامل کر لیا تھا۔ اس دروازے پر جس سے گزر کر حضرت باغ کو آتے ہیں، نواب علی نقی خاں وزیر اس مراد سے رہتا تھا کہ ہمیشہ قریب بادشاہ کے رہے اور ہر وقت بادشاہ کی حرکات سے خبر لیتا رہے۔

بہ جانب جنوب اس مکان کے تعمیرات جو تھی ہے یہ تعمیرات عظیم الشان حمام شاہی نے بنوائی تھیں اور بادشاہ کے ہاتھ چار لاکھ روپیہ کو بیچ ڈالی تھیں۔ ان تعمیرات میں خواص خاص محلات شاہی اور خاص محل صاحبہ رہتی تھیں۔ اور ایک اصطبل میں جو متصل ہے قیدیان انگلشیہ کے ہفتہ تک مقید تھی۔ یہاں سے آگے چل کر ایک درخت ہے جس کے نیچے واجد علی شاہ زرد کپڑے مثل فقیران پہن کر میلے کے دنوں میں بیٹھا کرتے تھے۔

یہاں سے آگے بڑھ کر لکھی دروازہ ہے، جس کی تعمیر میں لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا۔ اور اس کے آگے چوک خاص قیصر باغ کا ہے جس کے گرد جس قدر مکانات ہیں سب میں حرم شاہی رہا کرتی تھیں۔ بہ ماہ اگست یہاں ایک بڑا میلہ ہوا کرتا تھا اور اس میں سب شہر والے بغیر مزاحمت کے بار پاتے تھے۔

اس سے آگے چھتر والی بارہ دری ہے جس میں اب تماشا گاہ مقرر ہوا ہے اور لکھی دروازۂ مغربی سے غرب کی طرف قیصر پسند ہے، جس کے گرد نصف دائرہ ملمع طلا کا بنا ہوا ہے۔ اس کو روشن الدولہ وزیر نصیر الدین حیدر نے تعمیر کیا تھا۔ اور واجد علی شاہ نے ضبط کر کے معشوق السلطان اور محل خاص کو عطا کیا تھا۔ یہ دروازہ بھی اسی مقام کا ہے جیسا کہ غربی لکھی دروازہ ہے۔ اور اس تعمیر کے نیچے کے مکانات میں چند تن انگلشیہ جو دور سے آئے تھے مقید تھے۔ اور یہاں سے قتل گاہ پہونچائے گئے تھے۔

بہ جانب راست اس مکان کے ایک اور جلو خانہ اس قسم کا جیسا بجانب مشرق بیان کیا گیا ہے۔ اس میں سے محلات میں گزر کر اور اس کے نیچے کے جانب چل کر باہر حدود قیصر باغ کے جو دو برج شیر دروازہ کے ہے، آتے ہیں اس شیر دروازہ کو نیل دروازہ بھی کہتے ہیں بوجہ کہ اسی دروازہ میں جنرل نیل صاحب اتواب کے گولے سے جو قیصر باغ کے دروازہ کی توپوں سے آیا تھا، جاں بحق ہوئے تھے۔

مقبرہ سعادت علی خاں ۔ درمیان گوشۂ قیصر باغ اور چینی بازار کے دو قبریں ہیں۔ ایک تو سعادت علی خاں کی جن کو "بعد مرگ جنت آرام گاہ" کہتے ہیں۔ دوسری ان کی بیگم مرشد زادی کی۔ یہ دونوں قبریں ان دونوں کی وفات کے بعد غازی الدین حیدر نے تعمیر کرائی تھیں۔ اس سے محبت بشری ظاہر ہے۔ اس مکان پر اول ایک مکان تھا جس میں غازی الدین حیدر خود عین حیات رہتے تھے۔ اور ایک بات مشہور ہے کہ جب غازی الدین تخت پر بیٹھے تو ظاہر کیا کہ جب میں سعادت علی خاں کے تخت اور محل پر قابض ہوا تو مجھے لازم ہے کہ اپنا مکان ان کو دوں۔ اسی خیال سے فوراً حکم دیا کہ جس مکان میں وہ رہتے تھے اس کو مسمار کر کے یہ قبر سعادت علی خاں کی تعمیر ہوئی۔

مکان چھتر منزل ۔ جس کو نصیر الدین حیدر نے واسطے سکونت محلات حرم کے تعمیر کیا تھا اور جس کے متصل کوٹھی فرحت بخش اپنے رہنے کے واسطے بنوائی تھی اس مکان کا نام "چھتر منزل" اس واسطے قرار پایا تھا کہ اس کے اوپر چھتر طلائی نے تھے اور نہ اس لحاظ سے یہ نام اس کو دیا تھا کہ وہ چہار منزلہ ہے جیسے بعضے بعضے تصور کرتے ہیں۔ اس مکان کے ایک جانب کچہری صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی ہے۔ اس مکان کی وہ طرف جو جانب دریا ہے اور جس پر نشان گولہ باری کا توپ جنرل اوٹرم صاحب کے موجود ہیں واسطے دربار عام اور دیگر امور عامہ کے تیار ہوا ہے۔

کوٹھی فرحت بخش ۔ یہ کوٹھی سعادت علی خاں سے محل شاہی تھا اور واجد علی شاہ کے عہد تک مقام قیام شاہ رہا جب تک "قیصر باغ" تیار نہیں ہوا تھا۔ اس کوٹھی کی وہ جانب جو بہ طرف دریا ہے اس کو جنرل مارٹینیر صاحب نے تعمیر کر کے نواب وزیر کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ باقی تعمیرات جو اس سے ملحق تھیں اور "تخت گاہ" سب سعادت علی خاں نے بنوائی تھیں ان تعمیرات میں "تخت گاہ" جس کو "قصر السلطان" کہتے تھے اور اب یہ مکان یادگار انہ مرمت ہو کر خالی پڑا ہے، وہ صرف واسطے دربار شاہی کے آراستہ ہوا تھا۔ اور جب کبھی نیا بادشاہ جلوہ جلوس کرتا تھا تو اس کو صاحب ریذیڈنٹ اس محل میں تخت نشین کرتے تھے اور نذر دیتے تھے۔ اس نذر سے مراد یہ تھی کہ سرکار گورنمنٹ نے اس تخت نشینی کو منظور فرمایا۔ اسی کوٹھی میں بادشاہ بیگم نے منا جان کو تخت پر بٹھانے کا ارادہ کیا تھا اور جس کا حال مسٹر ڈبلو سلیمن صاحب نے اپنی تواریخ اودھ کی دوسری جلد میں تحریر کیا ہے۔ اسی کوٹھی میں اس وقت معتقدین ہمراہی بادشاہ بیگم نے کرنیل موسوم ریذیڈنٹ پر ارادہ جبریہ نذر دلوانے منا جان کا

کیا تھا بدیں لحاظ کہ اگر نذر گزر جا دے گی تو تخت نشینی مناجان کی صدر گورنمنٹ تک ثابت ہو جائے گی۔

کوٹھی دزیڈنسی۔ یہ کوٹھی بہت مشہور ہے اور اس کا بیان مفصل ضرور ہے۔ جب نواب آصف الدولہ بہادر دولت خانے میں رہتے تھے جس کا حال دفعہ ۲۶ میں درج ہے۔ صاحب رزیڈنٹ بہادر اسکے ایک مکان میں تشریف رکھا کرتے تھے لیکن جب نواب سعادت علی خاں نے کوٹھی فرحت بخش میں رہنے کو نہ چاہا تو اس کے نزدیک ایک کوٹھی صاحب رزیڈنٹ بہادر کے واسطے بنی تو تعمیر ہوئی اور اوائل میں اسی کوٹھی رزیڈنسی میں کوئی پہرہ جنگی نہیں رہتا تھا مگر جب کرنیل بیلی صاحب رزیڈنٹ مقرر ہوئے تو ان کے ہمراہ ایک گارد تعینات ہوا تھا اور ایک مکان یعنی دروازہ احاطہ ریذیڈنسی کے نزدیک اس کے واسطے سعادت علی خاں نے بنایا تھا۔ اور یہ دروازہ تمام دنیا میں بنام دروازہ بیلی گارد مشہور ہو گیا۔ اس تعمیر نقشہ اور بیان گنبس صاحب نے اپنی کتاب میں اور دیگر کتب میں بہ تفصیل بیان کیا ہے۔ اور اب بیان اس کا اس مختصر میں موجب طوالت ہے۔

پل آہنی۔ یہ پل حسب الحکم بادشاہ غازی الدین حیدر کے ولایت انگلستان سے طلب ہوا تھا مگر قبل آنے پل مذکور کے وہ آپ تنا در بحر لقا ہوئے۔ اور ان کے لڑکے نصیر الدین حیدر نے بعد تخت نشینی کے سنکلر صاحب کو جو ان کا ملازم تھا اس کی درستی کا ٹھیکہ کر دیا۔ صاحب موصوف نے کچھ کوٹھیاں واسطے اس کے برپا کرنے کے نزد بڑے کوٹھی ریذیڈنسی کے جہاں ایک چھوٹا سا گھاٹ اور شوالہ ہے ندی دریا واقع ہے بنوائیں اور یہ کوٹھیاں اب تک نمودار ہیں مگر اس سے اس کی درستی نہ ہو سکی اور اسی سبب سے پل مذکور برپا ہوا تا وقتیکہ امجد علی شاہ اور محمد علی شاہ کے تخت نشین ہونے اور اس بادشاہ نے ارادہ کیا اور اپنے عزم کو ختم بھی کیا یعنی پل آہنی قائم ہو گیا۔

قلعہ مچھی بھون۔ یہ قلعہ جس قدر سابق میں تھا جس کا نام اصلی "مچھی بھون" ہے اس سے زیادہ وسیع ہو گیا ہے۔ سابق مچھی بھون صرف اس قدر تھا جس قدر بر دو پختہ سڑک کے جنوب کی جانب موجود ہیں اور یہی قلعہ لکھنؤ تھا اور بہت مستحکم قلعہ دو سو برس پیشتر مشہور تھا۔ ایک مثل قدیم مشہور ہے کہ جس کے پاس قلعہ مذکور رہوگا وہی مالک شہر لکھنؤ ہوگا۔

اس رسالہ کے شروع میں جو مختصر حال لکھنؤ لکھا ہے اس میں احوال اور نام اس قلعہ کا درج ہے۔ اور دو ٹیلہ جو راستے کے بیچ میں درمیان گھونگھٹ قلعہ کے واقع ہے اور جس کے اوپر مسجد بنی ہوئی ہے وہ "لچھمن ٹیلہ" مشہور ہے۔ اور اس جگہ سابق "لچھمن پور" آباد تھا۔ عقب مچھی بھون خاص کے جانب جنوب و مغرب ایک میدان ہے جس میں توپ خانے کا گودام ہے۔

اس مقام پر "رنگ" اور "بیچ" محلے آباد تھے۔ اور یہ "بیچ" محلہ نہایت قدیم مکانات شہر لکھنؤ کے تھے جن کو خاندان شیخان نے جو سابق حاکم اس جگہ کے تھے تعمیر کیا تھا۔ جب سعادت خاں جو مورث اعلیٰ خاندان شاہی اس ملک کے تھے ۱۱۴۳ء میں صوبہ دار ہو کر یہاں آئے تھے تو یہ مکانات بہ کرایہ پانچ سو پینسٹھ روپیہ ماہانہ مالکان مکانات سے لیتے تھے۔ اور روپیہ کرایہ کا ان کے عہد تک ادا ہوتا گیا۔ مگر ان کے وارثوں نے یہ باعث تخلف آرائی بادشاہان لکھنؤ ان کو مال سرکار تصور کیا۔ اور صفدر جنگ اور شجاع الدولہ نے تو اس قدر اس عمل کو جاری رکھا کہ سر خط کرایہ کا مالکان مکانات مذکورہ کو دیا مگر زر کرایہ ادا نہیں کیا۔ لیکن آصف الدولہ نے یہ عمل بھی ترک کیا اور مکانات کو یک قلم ضبط سرکار کر لیا۔

یہ بات محتاج بیان کی نہیں بلکہ مشہور عام ہے کہ یکم جولائی ۱۸۵۷ء میں جو فوج سرکاری اس میں تھی اس نے کس طرح اس قلعہ کو خالی کیا تھا اور کیوں کر بیلی گارد کی جانب جا کر شامل ہوئی تھیں اور کس حکمت اور مطلب برآری سے اس قلعہ کو فوج سرکاری نے بوقت یہاں سے نکل جانے کے لیے اڑا دیا۔

بڑا امام باڑہ۔ یہ عمارت گویا تعمیرات لکھنؤ میں از ہمہ بہتر و اعظم ہے اور نواب آصف الدولہ کی سلطنت کے کارہائے عظام میں سے عظیم تر یہ مشہور ہے کہ نواب ممدوح نے بے شمار روپیہ اس کی تعمیر میں صرف کیا ہے۔ اور عوام میں مشہور ہے کہ اس میں دس لاکھ روپیہ خرچ ہوا ہے۔ شاید اس میں کچھ مبالغہ بھی ہو کیونکہ قول ہندیان ایسے مقام میں ہمیشہ ساتھ مبالغہ کے ہوا کرتا ہے۔

کاریگر اس کام کے واسطے بہت دور دور سے طلب ہوئے تھے اور سب کو حکم ہوا تھا کہ اپنی اپنی رائے سے نقشہ جات واسطے اس مکان کے پیش کریں۔ صرف تاکید یہ تھی کہ کسی عمارت کی نقل نہ ہو۔ اور یہ مکان

ایسا تیار ہو کہ کبھی ایسا پیشتر نہ بنا ہو اور جتنی تعمیرات مشہور ہیں سب سے زیادہ خوش قطع اور خوش اسلوب ہو۔

کفایت اللہ ایک شخص جس کی تدبیر سے یہ تیار ہوا ہے اور جیسا وہ اب موجود ہے اس سے ظاہر ہے کہ جو شرائط نواب کی تھیں ان میں کمی نہیں ہوئی ہے۔ یہ عمارت اس قدر مضبوط ہے جس قدر خوبصورت اور خوش قطع ہے۔ بنیاد اس کی بہت عمیق ہے اور ساری عمارت میں لکڑی کا کام بالکل نہیں ہے۔

اس کی وسعت ۱۶۷ فٹ سے ۵۲ فٹ تک ہے نواب آصف الدولہ بہادر بعد وفات کے اسی مقام میں دفن ہوئے ہیں۔

جامع مسجد۔ یہ عمارت متصل امام باڑہ کے ہے اور لائق تعریف نہیں۔ یہ مسجد نقل ہے اس جامع مسجد کی جو شہر دہلی میں ہے۔

رومی دروازہ۔ یہ دروازہ بھی نواب آصف الدولہ کے وقت میں تعمیر ہوا ہے اور مشہور ہے کہ نقل دروازہ روم کی ہے۔ مگر جو لوگ روم کو دیکھ آئے ہیں وہ بیان کرتے ہیں کہ ایسا دروازہ کوئی شہر روم میں نہیں ہے غالب ہے کہ نواب کو کسی شخص نے مغالطہ دیا ہو کیونکہ اگر وہ چاہتا کہ نقل دروازہ روم کی بنے تو اس میں شک نہیں کہ دو صد نقشہ دروازہ ہائی روم و دیگر روزاس کے سامنے پیش ہوتے۔ یہ دروازہ اور امام باڑہ کلاں دونوں اس زمانے میں بننا شروع ہوئے تھے کہ جب لکھنؤ میں قحط سالی تھی اور اسی لحاظ سے یہ عمارت عالی شروع ہوئی تھیں کہ جس سے غربا باشندۂ شہر پرورش پاویں۔

دولت خانہ۔ اس دروازے سے جو غرب کو چلو تو دولت خانہ یا محل قدیم لکھنؤ بہ جانب راست رہتا ہے۔ یہ تعمیر یعنی "دولت خانہ" مشتمل ہے اوپر متعدد مکانات کے جو متصل ایک دوسرے کے ہیں مگر ان میں کچھ ہنر معماروں کا صرف نہیں ہوا ہے۔ ان مکانات میں نواب آصف الدولہ اور ان کے عملے رہا کرتے تھے۔ جب نواب نے فیض آباد کو چھوڑ کر لکھنؤ کو اپنا دارالقرار ٹھہرایا تھا اور خاص محل نواب کا اس کے نام سے مشہور تھا یعنی جس مکان میں وہ آپ رہا کرتے تھے اس کو آصفی کوٹھی کہا کرتے تھے۔ مگر جب سعادت علی خاں بعد ان کے مسند نشین ہوئے اور قیام اپنا انھوں نے "فرحت بخش" میں مقرر کیا تھا تو یہ مکانات خالی رہے اور اسی سبب سے خستہ اور شکستہ ہو گئے۔

امام باڑہ حسین آباد۔ صرف یہ عمارت محمد علی شاہ سوم بادشاہ کے زمانے میں تیار ہوئی تھی اور ہر چند اس میں کچھ کاریگری صرف نہیں ہوئی ہے مگر خوش اسلوبی میں کسی اور عمارت لکھنؤ سے کم نہیں۔ اس کا باغ جو مربع ہے اس کی خوش وضعی کو ان عمارات نے جو اس میں بطور نمونہ تاج روضہ کے بنی ہیں اور چھوٹی چھوٹی عمارات جو ان میں ہیں انھوں نے خراب کر دیا ہے اس حسین آباد میں بڑی رونق معلوم ہوتی ہے جب اس میں شب کو روشنی ہوا کرتی ہے۔ اور جب لکھنؤ میں سلطنت تھی تو محرم میں بڑی دھوم ہوا کرتی تھی۔

محمد علی شاہ نے اپنی والدہ اور بیٹی کو اس میں دفن کیا ہے۔ اور یہ بھی حکم دیا تھا کہ ان کا جنازہ بھی اس میں دفن ہو۔ اور زر کثیر واسطے مزید رونق اس امام باڑے کے نام نہاد کیا تھا جو دار وغہ مہتمم اس امام باڑے کا قبل از بلوہ کے تھا اور یہ باعث اس کے عکس کی تصویر کھینچنے کے اکثر صاحب لوگوں سے اس کی ملاقات تھی مگر وہ اس بلوے میں بہ دل و جان متفق مفسدین کے ہوا تھا اور ایک گروہ کا جرنیل ہو گیا تھا۔ اور اس کی ملاقات ساتھ صاحب لوگوں کے کسی طرح مانع اس کے شامل ہونے کی نہ ہوئی۔

تالاب نہ کھنڈہ حسین آباد۔ متصل حسین آباد کے محمد علی شاہ نے ایک پرانا تالاب تیار کیا تھا جو اب سر راہ ہو گیا ہے۔ اور متصل امام باڑے کے تعمیر ایک مسجد کی شروع کی تھی جس کو انھوں نے چاہا تھا کہ جامع مسجد سے بہتر بنے مگر ان کی حیات نے وفا نہ کی اور قبل اس کے ختم ہونے کے وہ خود ختم ہو گئے۔

یہ مسجد ناتیار اب تک موجود ہے۔ مگر چونکہ اس وقت سے اب تک مرمت کبھی نہیں ہوئی اور اب عرصہ اٹھارہ برس کا ہوا اس واسطے اب وہ بہت خستہ و شکستہ ہو گئی ہے۔ امسال ۱۸۶۳ء میں نماز عید الفطر کی بھی اس جامع مسجد میں ادا ہوئی۔ پہلے شرف الدولہ غلام رضا خاں کی کاظمین میں ہوا کرتی تھی۔

اس بادشاہ نے ایک اور تعمیر شروع کی تھی جس کو "نہ کھنڈہ" کہتے ہیں اور ارادہ تھا کہ اس کو سات منزل کا بنوا کر اس کے اوپر سے سیر تمام عمارات شاہی کی جو اس نے میان شہر یا پل بنوائی تھی کیا کرے مگر یہ تعمیر بھی ناتیار رہ گئی اور صرف چار منزل اس کی پوری ہوئی۔

موسیٰ باغ۔ یہ باغ نواب آصف الدولہ نے تعمیر کروایا تھا اور جو تعمیرات اس میں ہیں ان کو سعادت علی خاں نے واسطے سیرگاہ خاص کے بنوایا ہے۔ ان کے وقت میں لڑائی حیوانات کی اس میں ہوا کرتی تھی۔

محسن خان
کنول ہار - ملیح آباد
لکھنؤ

افسانہ

شام اور پرندے

ہم دونوں ایک ہی سیٹ پر بیٹھے تھے مگر ہمارے درمیان فاصلہ تھا۔ بس تھوڑا سا فاصلہ۔۔ اتنا کہ اگر میں اپنے ہاتھوں کی کتاب نیچے درمیان رکھ لیتا تو ہم دونوں ایک دوسرے سے جڑ جاتے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کی سانسوں کی آمد و رفت اور دلوں کی دھڑکنوں کا بھرپور احساس ہو سکتا تھا مگر یہ کہاں ممکن تھا۔ فاصلہ بجائے گھٹنے کے مزید بڑھتا گیا۔ اس دیہاتی عورت کے کالے پسینے سے بھیگے جسم پر میل زدہ ساڑی اس طرح چپکتی جا رہی تھی جیسے تالاب کے گندے پانی میں کائی تیر رہی ہو۔ پیشانی اور گالوں پر پسینے کے ننھے ننھے شفاف قطرے ان سفید تاروں کی طرح تھے جو سرمئی رنگ کے دوپٹے میں ٹانک دیئے گئے ہوں۔ پتلی پتلی کلائیوں میں موٹے موٹے رنگین کڑے تھے جن کے نقش و نگار اس عورت کے رنگ میں رنگ گئے تھے۔

وہ دیہاتی عورت کسی تصور کے حصار میں تھی۔ اس کی رانوں پر اسی کے رنگ کا سیاہ معصوم بچہ تھا جو بالکل ننگا تھا۔ اس کے تمام جسم میں تیل لگا تھا جس سے اس کا جسم شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ اس کے برعکس چہرے پر بہت سی غلاظتیں تھیں جن میں دودھ کے دھبے زیادہ نمایاں تھے۔ . . . . . .

. . . . بچہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو خرگوش کی طرح منھ کے پاس لے جاتا۔ رال اور دودھ سے گیلے منھ میں انگلیاں ڈال کر چوستا کچھ دیر تک چوستا رہتا اور پھر شاید اس کے اندر کا کوئی خواب اس کی نازک اور چھوٹی چھوٹی انگلیاں پکڑ کر میری کتاب کی طرف بڑھا دیتا اور اس کا یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا جب تک کہ وہ تھک نہ جاتا یا اس کا خواب ٹوٹ نہ جاتا۔ مگر خواب ٹوٹ کر ختم نہیں ہوا کرتے۔ وہ ان پھول پتیوں کی طرح ہوتے ہیں جو سوکھتی ہیں ٹوٹتی ہیں پھر ایک نئی تازگی کے ساتھ نکل آتی ہیں۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک کہ درخت سوکھ نہیں جاتا۔

میرے ہاتھوں میں ایک کتاب تھی جسے میں بڑے انہماک سے پڑھ رہا تھا۔ یہ میرا پرانا شغل ہے کہ میں سفر میں ہمیشہ کوئی کتاب رکھتا ہوں۔ خاص طور سے افسانوں یا شاعری کی کتاب۔ جب بس سوکھے اور بے رونق منظروں سے گزرتی ہے (یہ مناظر عموماً اس وقت نظر کے سامنے آتے ہیں جب بس انسانی آبادی سے گزرتی ہے) تو میں کتاب کی وسعتوں میں کھو جاتا ہوں اور جب بس مناظر سے نکل کر ہرے بھرے درختوں کے پہلوؤں خوبصورت پھولوں کی خوشبوؤں لامتناہی کھیتوں کے دامنوں اور دریا کے اوپر سے گزرتی ہے تو میں کتاب بند کر دیتا ہوں اور ان دلفریب نظاروں میں کھو جاتا ہوں۔ اس دن بھی بس بے رونق منظروں سے گزر رہی تھی میں اپنے اطراف سے بے خبر ایک خوبصورت افسانے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک ایسا انسان تھا جس کا جوان بیٹا مر گیا ہے۔ اسے اپنے بیٹے کی موت کا شدید غم ہے۔ وہ کچھ خوش حال لوگوں کو اپنے دل کا حال سنا کر اپنا غم ہلکا کرنا چاہتا ہے کہ یہ ایک فطری عمل ہے۔ مگر کوئی بھی توجہ سے نہیں سنتا ہے اور کسی کا دل اس کے طوفان سے آشنا نہیں ہوتا اور پھر.

بچہ رال اور دودھ سے گیلے ہاتھ کتاب کی طرف بڑھا دیتا ہے۔ کتاب پر کیا تھا۔ ٹافی، بسکٹ یا کوئی کھلونا۔ کچھ بھی نہیں۔ کتاب کی جلد پر ایک رنگین کاغذ چڑھا ہوا تھا جس کے ایک کنارے پر سورج آہستہ آہستہ ڈوب رہا تھا۔ اور سرخ آسمان کے پاس خلا میں کچھ پرندے آہستہ آہستہ تیر رہے تھے یا اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ بس وہ بچہ ہاتھ بڑھا کر ان پرندوں کو پکڑ لینا چاہتا تھا۔

جب وہ انگوٹھا اور ... سے منا ہوا ہاتھ کتاب کی طرف بڑھاتا میں جلدی سے اپنی کتاب ہٹا لیتا۔ بچہ مزید کوشش کرتا اور پھر پرندوں کو دسترس میں نہ پاکر ہاتھ کھینچ لیتا اور جلدی جلدی انگلیاں منہ میں ڈال لیتا۔ میں پھر کتاب اپنی رانوں رکھ لیتا۔ بچہ پھر تھپتھپاتا۔ اسے اس عمل میں منہمک دیکھ کر عورت ...... اسے اپنی طرف کھینچ لیتی اور ہاتھ اٹھا کر شیشے کے باہر کا منظر دکھاتی۔ بچہ کچھ دیر تک دیکھتا رہتا پھر جلدی ہی اکتا جاتا ...... عورت جھنجھلا جاتی اور بچے کی آنکھوں میں جھانک کر کوئی اونٹ یا گھوڑا دکھاتی۔ پھر جٹ جٹ بجتی ہوئی چٹکی کی آواز پر پھر ماں کے چہرے کی طرف دیکھتا۔ مگر اس کا یہ تجسس زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ پاتا جلد ہی اس پر کوئی دوسرا احساس حاوی ہو جاتا۔ وہ ایک کلکاری مارتا اور جلدی جلدی ادھر ادھر دیکھنے لگتا کہ جیسے اس کے پاس سے کوئی پرندہ اچانک پھڑپھڑا کے اڑ گیا ہو۔ عورت بچے کو کلیجے سے لگا لیتی اور تھپکیاں دے کر سلانے کی کوشش کرتی مگر وہ مزید بلبلیاں کھانے لگتا۔ بالکل اس مچھلی کی طرح جو خشکی میں ڈال دی گئی ہو۔ وہ کسمسا کر عورت کی گود میں گر جاتا اور پھر اسی خاص عمل میں منہمک ہو جاتا۔

جب عورت بچے کو کسی گھاٹ پانی نہ پلا سکی تو اس نے اپنے پیٹ پر سے میل زدہ ساڑی ہٹائی کرتی سرکائی اور بچے کو چھاتی سے چپکا لیا۔ بچہ چند پل دودھ پیتا رہا۔ اور پھر اسی کیفیت میں آگیا اس بار اس نے عورت کی چھاتی پر اپنا گال رکھ دیا اور چھوٹی چھوٹی متجسس آنکھوں سے کتاب کی طرف دیکھنے لگا کچھ دیر تک قرار کے ساتھ دیکھتا رہا آخر مچل کر عورت کی رانوں پر گر گیا اور ہاتھ بڑھا کر جلدی جلدی پرندے پکڑنے کی کوشش کرنے لگا جیسے کوئی بلی اچانک اچھل کر اپنے شکار پر جھپٹ پڑے۔ اس بار بچہ بالکل باؤلا سا ہو گیا تھا۔ وہ جلدی سے جلد پرندوں کو پکڑ لینا چاہتا تھا جیسے سمجھ رہا تھا کہ اب سورج ڈوبنے ہی والا ہے اور پرندے اندھیروں میں کھونے والے ہیں بچے کا سیاہی مائل چہرہ ہلکا ہلکا سرخ ہو گیا تھا۔ بالکل ابھرتے ہوئے سورج کی طرح۔

افسانہ اب کلائمکس پر پہنچ رہا تھا۔ میں پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ افسانے میں کھویا ہوا تھا۔ اور اپنی توجہ کسی دوسری طرف نہیں بانٹنا چاہتا تھا دوسری طرف بچہ کوشش کی آخری منزل میں تھا اب اس کے ہاتھوں سے کتاب تک محض دو انگل کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ میں بچے کی بار بار کی مداخلت سے تنگ آ چکا تھا اور برداشت کی حد پر آ پہنچا تھا مجھے اس بچہ سے زیادہ کالی عورت پر غصہ آ رہا تھا جو بچے کی طرف سے بالکل بے نیاز ہو چکی تھی۔ جب بچہ برابر مداخلت کرتا رہا اور عورت اسے باز نہ رکھ سکی تو میرا پارہ چڑھ گیا میں نے تیز نظروں سے بچے کی طرف پھر عورت کی طرف دیکھا اور کچھ دیر تک دیکھتا رہا عورت میرے اس رویے سے ایک دم سہم سی گئی۔ شاید اسے اپنی بے توجہی کا احساس ہوا۔ اس نے جلدی سے بچے کو اپنی طرف کھینچ لیا اور اپنا سخت ہاتھ بچہ کے گال پر جڑ دیا۔ بچہ تیورا کر عورت کی گود میں گر گیا اور چیخ چیخ کر رونے لگا۔

افسانہ اب کلائمکس پر پہنچ چکا تھا۔ افسانہ کا ہیرو انسانوں کی بے حسی اور بے توجہی سے بد دل ہو کر اپنے دل کا حال گھوڑے کو سنا رہا تھا۔ میں آنکھیں بند کئے گہرے احساس کے ساتھ کچھ دیر تک اس تاثر انگیز افسانے کا تجزیہ کرتا رہا اور جب آنکھیں کھول کر دیکھا تو بچے کے رال اور دودھ سے آلودہ ہاتھ کھلے ہوئے تھے اور وہ عورت کی گود میں سو چکا تھا۔

میری کتاب کی جلد کے کاغذ پر آسمان سرخ تھا اور پرندے خلا میں آہستہ آہستہ تیر رہے تھے۔

*

درخشندہ پٹیالوی
۳۰۶۲ سیکٹر ۱۹ سی چنڈی گڑھ

فسردہ پھول۔ فضا مضمحل چمن ہے اداس
خزاں نصیبوں کو آئی نہیں بہار کبھی راس

بدلنا وقت کے دھارے کو کچھ نہیں آساں
لہو سے رکھنی ہے ہم کو حیاتِ نو کی اساس

بہار آئی تو سب ساکنانِ باغِ جہاں
نمودِ حسن کی خاطر بدل رہے ہیں لباس

مقامِ عیش نہیں جائے آزمائش ہے
یہ قید خانۂ ہستی یہ تنگنائے حواس

جنونِ شوق کی وارفتگی۔ معاذ اللہ
یہ ان کے پاؤں کی آہٹ ہے یا مرے انفاس

مقام کیسا یہ آیا ہے راہِ الفت میں
شبِ وصال میں بھی دل ہوا ہے غم سے اداس

غموں کے بوجھ سے دب کر جو خوش نہیں ہوتے
نکالتے ہیں تبسم سے اپنے دل کی بھڑاس

میرے نصیب میں لکھی ہوئی ہے محرومی
میں تنگِ زیست ہوں کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس

وفا کا خانۂ دل میں چراغ روشن ہے
یہی ہے ظلمتِ دنیا میں روشنی کی اساس

چندر پرکاش جوہر بجنوری
۲۰۔ رواں بلڈنگ۔ لیڈر روڈ
الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

ہر انقلابِ دہر کا تازہ اثر لیے
دنیا سے بے خبر ہوں، دلِ باخبر لیے

پیہم نوازشِ غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ
بارِ غمِ حیات بھی ہوں دوش پر لیے

شائستہ جنونِ محبت ہے کس قدر
پروانہ سوزِ زندگیِ مختصر لیے

یوں آج کوئی سامنے آ کر گزر گیا
ناکامِ دید رہ گئے تابِ نظر لیے

اک اک قدم پہ منزلِ مقصود بن گئی
گزرا ہوں جس مقام سے عزمِ سفر لیے

کچھ طائرانِ خاص رہائی کے بعد بھی
بیٹھے رہے قفس میں غمِ بال و پر لیے

پرسش نہیں وطن میں جب اہلِ کمال کی
جوہر کہاں میں جاؤں متاعِ ہنر لیے

کے بی تیواری کومل سیتاپوری
۱۳۰/۲۳۸ - ایم بلاک
قدوائی نگر - کانپور

آپ کے دل میں بھی طوفان اک اٹھا ہوتا
مجھ کو ساحل سے اگر آپ نے دیکھا ہوتا

کس طرح مجھ کو یقیں ہو کہ مٹی تیرہ شبی
میرے گھر میں کسی جانب تو اجالا ہوتا

اپنی بستی کے بھی لوگ تو شائستہ ہیں
ورنہ اس شہر میں اک حشر بپا ہوتا

مجھ کو مٹی کے گھروندوں پہ بھی ملتا انعام
کاش پانی یہ ذرا دیر سے برسا ہوتا

اپنے ہی شہر میں کچھ لوگ ہیں ایسے بھی کمل
کاٹ کر پیڑ یہ کہتے ہیں کہ سایا ہوتا

سیفؔ بجنوری
اسٹیشن روڈ۔ بجنور

درمیاں نگاہوں کے اک دبیز پردہ ہے
پھر بھی چھنکے پڑنے سے ایک شعلہ نکلا ہے

پی چکا ہوں میں کب کا زہرِ کربِ تنہائی
اب نہ میں ہی تنہا ہوں اب نہ دل اکیلا ہے

یہ جہانِ بے حس ہے امتیاز کیسے ہو
کس کو کس سے نسبت ہے، کون کس کا اپنا ہے

سر پہ لاکے سورج کو کتنا بے سہارا ہوں
دوپہر میں اب میرا عکس بھی تو عنقا ہے

اس سے کیوں وفا چاہیں شہرِ بے تعلق میں
ہم بھی دوسروں جیسے وہ بھی سیفؔ ہم سا ہے

سیلانی سیوتے
دوردرشن کیندر۔ لکھنؤ

کوہ و صحرا کبھی گلستاں
ان کے قدموں کے ڈھونڈے نشاں

تیرگی میں بھٹکتے رہے
جگمگاتی رہی کہکشاں

جستجوئے محبت میں ہم
آگئے ہیں کہاں سے کہاں

کیا ملا ڈھونڈنے پر ہمیں
منزلیں، منزلیں کارواں

دوریاں جب بڑھیں آپ ہم
بن گئے ایک دل ایک جاں

آبروئے جنوں بن گئیں
میرے دامن کی یہ دھجیاں

جشنِ گل ہم مناتے رہے
مسکراتی رہیں بجلیاں

راہ بھٹکا ہے سیلانی پھر
المدد مالکِ دوجہاں

منیر المحوی صدیقی
آستانہ محوی۔ گلی بسا ازری
گوجرپورہ۔ بھوپال ۔ ۴۶۲۰۰۱

ہمہ تن شعلہ اور دھواں ہوں میں
سوزِ الفت کا ترجماں ہوں میں
اک نگاہِ کرم کا ہوں محتاج
اور دم بھر کا مہماں ہوں میں
گر کے آنسو یہ کہہ گیا اُن سے
اک محبت کی داستاں ہوں میں
لوٹ کر لے گئے متاعِ حیات
اپنی قسمت پہ شادماں ہوں میں
اے قفس والو کیا بتاؤں تمہیں
کب سے محرومِ آشیاں ہوں میں
عمرِ رفتہ کی ہے تلاش مجھے
کیا کہوں کیوں رواں دواں ہوں میں
ہر طرف ہے ہجومِ جلوۂ ناز
یہ نہیں جانتا کہاں ہوں میں
دل کا سب حال ان پہ روشن ہے
اور محفل میں بے زباں ہوں میں
یہ بھی اے دوست کہہ نہیں سکتا
تیری نظروں کا رازداں ہوں میں
اپنی منزل سے خود نہیں آگاہ
نقشِ گم کردہ کارواں ہوں میں
راز اپنا نہ کھل سکے منیرؔ
کہیں نغمہ کہیں فغاں ہوں میں

عابدی شہناز ابنِ حسن
لکچرر شعبۂ اردو
جی۔ایس۔پی۔جی۔ڈگری کالج
سلطان پور

ولی کا مسلکِ عاشقی

غزل کے تاریخی ارتقار کے سلسلے میں شمالی ہند کے مقابلے میں دکن اردو نوازی میں پیش پیش رہا اور اس علاقہ میں کسی حد تک ہندی اور بھاشا کے اثرات شمالی ہند کی مروجہ فارسی روایات سے قوی تر رہے۔ دکنی دور کی ابتدائی غزلیں اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں۔

گولکنڈہ اور بیجاپور کی تباہی کے بعد اورنگ آباد میں جو دکن میں اورنگ زیب کا مرکز حکومت تھا بڑے بڑے باکمال ادیب و شاعر جمع ہو گئے تھے جیسے محمد علی عاجز۔ قاضی محمود بحری۔ شیخ محمد امین۔ محمد فیاض ولیؔ ویلوری۔ وجدی وغیرہ۔ اورنگ آباد کے ان نامور شاعروں میں ولیؔ اورنگ آبادی اور سراج خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ ان میں ولیؔ کے متعلق ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں۔

> "ولیؔ نے اردو غزل کو ایک نیا آہنگ دیا۔ ایک نئی لے عطا کی۔ ایک نیا لہجہ اور نئی آواز سے آشنا کیا اس نئے آہنگ نئی لے نئے لہجہ اور نئی آواز نے اردو غزل کو نئی زندگی بخشی۔ اور اس میں نیا خون دوڑایا"

ولیؔ نے شاعری کو زندگی سے روشناس کرایا۔ درد و الم کے بیان اور واردات قلبیہ کی مصوری میں کمال دکھایا۔ اور اس طرح غزل کے دائرہ کو بہت وسیع کر دیا۔

ولیؔ تک آتے آتے اردو شاعری کی روایت تین سو سال سے بھی زیادہ پرانی ہو چکی تھی اور اس روایت میں دو رجحانات کارفرما تھے۔ ایک تو مقامی یعنی ہندی رنگ اور دوسرے فارسی روایت کا اثر۔ ولیؔ تک سارے دکن میں فارسی اصناف سخن۔ فارسی بحریں۔ فارسی اسلوب اور علامات کا رجحان پورے طور پر جڑ پکڑ چکا تھا۔ دکنی ادب میں مثنویات غزلیات اور قصائد وغیرہ کا ایک عظیم الشان ذخیرہ موجود تھا۔ اور سیکڑوں چھوٹے بڑے شاعروں نے اپنے خون جگر سے اس روایت کے پودے کو سینچا تھا۔

ولیؔ کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے شمال کی زبان کو دکنی ادب کی طویل روایت سے ہم آہنگ کر دیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ فارسی ادب کی رنگ آمیزی سے اس میں اتنی رنگا رنگ آوازیں شامل کر دیں اور امکانات کے اتنے سرے بھی ابھار دیئے کہ آئندہ دو سو سال تک اردو شاعری انھیں امکانات کے ستاروں سے روشنی حاصل کرتی رہی۔

تقریباً ہر قدیم تذکرہ نگار نے انھیں "آدم ریختہ" کہا ہے۔ یعنی اردو شاعری کا باوا آدم۔ جس طرح تلسی داس ہندستان کا قابل فخر شاعر تھا اسی طرح ولیؔ بھی پورے ہندستان کا شاعر تھا۔ ولیؔ کا مرتبہ اردو میں وہی ہے جو انگریزی میں چاسر کو حاصل ہے۔

ولیؔ پہلے شاعر ہیں جن کے شاعرانہ مزاج کو "کلاسیکل" کہا جا سکتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے یہاں جو بحیثیت صاحب دیوان شاعر کے اولیت کے حامل ہیں کلام میں یکسانیت ہے۔ وہ اپنے فطری زور میں جنگل کی ایک چڑیا کی طرح یکساں راگ الاپتے چلے جاتے ہیں لیکن ولیؔ کے یہاں راگ کے تنوع کا احساس ہوتا ہے۔ نصرتی بھی بحیثیت شاعر ولیؔ سے بڑے ہیں۔ ان کی زبان میں بھی فارسی و عربی الفاظ کی آمیزش ہے۔ لیکن ان کے کلام میں ایک مخصوص بیجاپوری رنگ چھایا ہوا ہے۔ جس سے وہ بھی ولیؔ کی سطح پر

… دکنی اور شمال

… دلّی کی خوبی … کہ وہ علاقائی سطح سے … نہیں آنے پاتے۔ … ان اسباب کی بنا پر ولّی کو ہمیشہ اردو کی زبان کو اس طرح … کہا جائے گا۔

… ولّی … ۱۷۰۰ء میں سید ابوالمعالی کے ہمراہ دلّی آئے تو یہاں ان کی ملاقات شاہ سعداللہ گلشن سے ہوئی۔ شاہ گلشن نے جب ولّی کا کلام سنا تو مشورہ دیا کہ "ایں ہمہ مضامینِ فارسی کہ بیکار افتادہ اند۔ در ریختۂ خود بکار ببرد۔ از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت"۔ یہ بات ولّی کے دل کو ایسی لگی کہ انھوں نے اپنے رنگِ سخن کو فارسی روایت کے مطابق ڈھالنے کا عمل شروع کر دیا۔ جس سے اردو شاعری میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔

ولّی سے پہلے کی غزل میں کسی گہرے تجربے، احساس یا حیات و کائنات کے شعور کی جھلک نہیں ملتی۔ شاہی۔ نصرتی۔ اور ہاشمی کے یہاں بھی یہی تصور ہے۔ اور محمد قلی قطب شاہ، وجہی۔ عبداللہ اور غواصی کے یہاں بھی یہی بات نظر آتی ہے۔ حالانکہ ولّی نے بھی اسی روایت کو اپنایا لیکن انفرادیت کے ساتھ۔ انہوں نے زندگی کے رنگا رنگ تجربات تنوع اور داخلیت کو بھی سمیٹ کر پیش کیا۔

جس کلچر اور تہذیب نے اردو غزل کی تعمیر و تخلیق میں خصوصی کردار ادا کیا اس میں ایرانی اور فارسی مذاق خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے۔ اور تصوف اس زمانے میں شاعری کا بہت بڑا محرک تھا۔ سلوک اور معرفت کے لیے وحدت الوجود کا عقیدہ ہی بنیادی حیثیت کا حامل تھا تصوف ہی معیارِ عقل۔ معیارِ علمیت اور معیارِ تہذیب و اخلاق تھا۔ تصوف اگر ایک طرف کائنات کے بارے میں گہرے فلسفیانہ تصورات کو پیدا کرتا ہے تو دوسری طرف رسمی مذہبی ظاہر پرستی کا مخالف اور مذہب کے سخت گیر نظام سے ہمیشہ نبرد آزما بھی رہتا ہے۔ تصوف کو عام طور پر وہی شعرا بخوبی برت سکے ہیں جو خود بھی صوفی تھے اور تصوف کے اسرار و رموز سے پورے طور سے آگاہ تھے۔

ولّی کا عشق خیالی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ لیکن انھوں نے عشقِ مجازی کے ان تمام پہلوؤں کا تجربہ بھی حاصل کیا جو ہندایرانی روایت کے مطابق عشق کی پہلی منزل ہے کہتے ہیں ؎

دروادیٔ حقیقت جن نے قدم رکھا ہے ... اول قدم ہے اس کا عشقِ مجاز کرنا

اور اس کے بعد اس عشق کے سرے عشقِ حقیقی سے ملا دیتے ہیں۔

عارفاں پر ہمیشہ روشن ہے ؎
کہ فنِ عاشقی عجب فن ہے

ولّی کے عشق میں ایک شائستگی ہے سنجیدگی ہے، گہرائی ہے ضبط اور ٹھہراؤ ہے۔ اردو غزل میں عشق کے اعلا تصور کا اظہار سب سے پہلے ولّی نے کیا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد
طالبِ عشق ہوا صورتِ انساں میں آ

ہے ترا حسن ہمیشہ یکساں
جنت سوں بہار کیوں نکلے جا دسے

جلوہ گر جب سوں وہ جمال ہوا
نورِ خورشید پائمال ہوا

اے نورِ جان و دیدہ ترے انتظار میں
مدت ہوئی پلک سوں پلک آشنا نہیں

جان جاتا ہے ولے آتا نہیں
کیا سبب وہ دلبرِ جانی ہنوز

عشق میں عاشق پر جو کچھ گذرتی ہے اس کا بیان بھی بڑا اثر آفریں ہوتا ہے جس سے ولّی کے اشعار دل کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ مثلاً ؎

عشق کے ہاتھوں سے چھٹے دل ریش
جگ میں کیا بادشاہ کیا درویش

ان نے پایا منزلِ مقصود
عشق جس کا ہے ہادی و رہبر

اے یار گر منظور ہے تجھ کو فنائی عشق کی
ہر آن نئے عقل سوں بے گانہ ہوئے گا نہ ہو

ولی کے تصورِ عشق میں وفاداری بشرطِ استواری کا عقیدہ
[illegible]ت اہمیت رکھتا ہے ؎

ولی راہِ محبت میں وفاداری مقدم ہے
وفا نیں جس میں اس کوں اہلِ ایماں کر نہیں گنتے

یہاں عاشق نہ بو الہوس ہے کہ حسن پرستی ہی کو اپنا شعار بنالے
[illegible]رنہ ہی ہرجائی ہے کہ در در جھانکتا پھرے۔ اس وفاداری کے سبب
[illegible]ن کے یہاں سوز و ساز اور اندر ہی اندر عشق کی آگ میں سلگنے کی کیفیت
[illegible]تی ہے۔ ولی اپنے محبوب کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں ؎

لب پہ دلبر کے جلوہ گر ہے جو خال
حوض کوثر پہ جیوں کھڑا ہے بلال

ولی کی شاعری میں گہرا جمالیاتی احساس بھی ملتا ہے ؎

آغوش میں آنے کی کہاں تاب اس کوں
کرتی ہے نگاہ جس قدِ نازک پہ گرانی

عجب کچھ حسن رکھتا ہے شبِ خلوت میں دلبر سوں
سوال آہستہ آہستہ اور جواب آہستہ آہستہ

اسی رچے ہوئے جمالیاتی احساس نے ان کو اردو شاعری کا
[illegible]سب سے بڑا پیکر نگار بنا دیا۔ چشم و زلف، قد و گیسو اور عارض کا ذکر
[illegible]بار بار کیا ہے لیکن ہر بار ایک نئے انداز اور نئے لطف کے ساتھ
[illegible]ن میں خارجیت کے ساتھ ساتھ داخلیت بھی ہے ؎

خوش قداں دل کو بند کرتے ہیں
عام اپنا پسند کرتے ہیں

تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

تجھ نوجواں کی میں کیا کروں تعریف
مطلعِ شوخ و رمز و ایماں ہے

تجھ مکھ کوں دیکھ حیراں ہو رہا
جوں قلم لے ہاتھ میں مانی ہنوز

چاہتا ہے اس جہاں میں گر بہشت
جا تماشا دیکھ اس رخسار کا

وادیٔ عشقیت میں "یار" سے زیادہ "خیالِ یار" اہم ہو جاتا
ہے۔ زاہد کی مذمت واعظ کی پگڑی اچھالنے اور ناصح پر پھبتی کسنے
سے اخلاق کا وہ درس مقصود ہوتا ہے جو سخت دلی اور ریاکاری
کے پرزے اڑاتا ہے۔ اس قسم کی شاعری کا مقصد اخلاقیات کی طرف
مائل کرنا ہے۔ ولی نے بھی جگہ جگہ منافقت، تنگ دلی اور واعظوں
نیز ناصحوں کے قول و فعل کے تضاد کی مذمت کی ہے۔ مثلاً ؎

کیا بے خبر ہوا ہے معلم صنم کو دیکھ
مکتب میں اس کے بھول گیا ہے کتاب آج

شیخ مت گھر سے نکل آج کہ خوباں کے حضور
گول دستار تری باعثِ رسوائی ہے

لیکن جب وہ خود ناصح کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں تو ان
کی شاعری زندگی کے گہرے تجربے اور عقل و دانش کے نکات سے
مزین ہو جاتی ہے ؎

سختی کے بعد عیش کا امیدوار رہ
آخر ہے روزہ دار کو ایک روز عید یاں

ایسا بسا ہے آ کر تیرا خیال جی میں
مشکل ہے جی سے تجھ کو اب امتیاز کرنا

ولی اس گوہر کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی
مرے گھر اس طرح آتا ہے جیوں سینے میں راز آوے

ان اشعار میں ہمیں تنوع کا احساس ہوتا ہے۔ اس طرح ولی
نے غزل کا دامن اتنا وسیع کر دیا کہ اس میں ہر قسم کے خیالات
احساسات، جذبات و تجربات اور واردات کے اظہار کا سلیقہ پیدا ہو گیا
اور اردو غزل کو وہ رنگِ سخن مل گیا جو آج بھی زندہ ہے۔
پُر اثر سادگی اور سہلِ ممتنع بھی ولی کی ایک اہم خصوصیت ہے
یہ سادگی انہوں نے مشکل زمینوں میں بھی قائم رکھی ہے۔
ولی کے یہاں جو سادگی ہے وہ بھی پُرفن ہے۔ یہ سادگی

اکثر غزلوں میں سوال و جواب اور مکالمہ کا رنگ بھی اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً ؎

بولا مری نگاہ کی قیمت ہے دو جہاں
جس دیکھنے سوں دل میں ترے ہے طرب عجب
اس دولت عظیم کوں یوں مفت مانگنا
لگتی ہے بات مجکوں تری بے ادب عجب
کہتا میں اس سوال میں دو جا بھی اک سوال
گر بہرہ مند لب سوں کرے تیرے ہیں لب عجب

ولی نے مجاز و حقیقت کو معنی کی سطح پر ایک کرنے کی کوشش کی اور رمز و اشارے سے معنی کے حسن بیان کو ابھارا یہی وجہ ہے کہ ولیؔ کے یہاں صنعت ایہام ایک عجیب لطف دیتی ہے۔

ولی نے جہاں فارسی روایات و اصطلاحات کو اپنی شاعری میں برتا ہے وہیں ان کی شاعری میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ہندستانی عناصر کی کثرت دکھائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ چند اشعار کو چھوڑ کر تشبیہات و استعارات کے لیے انھوں نے خالص ہندستانی چیزوں کو ہی لیا ہے۔ محبوب کے لیے جا بجا وہ سری جن۔ موہن سجن پیتم۔ اور پیا جیسے ہندی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ تلمیحات کے لیے بھی وہ کاشی۔ جنمی۔ بیراگی۔ ارجن اور کرشن وغیرہ کا حوالہ دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی اثرات کے ساتھ ساتھ ان کے تخیل پر ہندستانی اثرات کی گرفت بھی کافی مضبوط تھی اس امتزاج کی وجہ سے جہاں ان کی شاعری میں نفاست اور دلکشی ہے وہیں 'اپناپن' بھی ہے۔ کہتے ہیں۔

دل کو گر مرتبہ ہو درپن کا مفت ہے دیکھنا سری جن کا
گنہگار واں کیا ہوں آپس کے نین ستی
آ اے صنم شتاب ہے روز نہان آج

ولیؔ کے کلام کا اگر ہم بغور تجزیہ کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ ان کے شاعرانہ مزاج پر نشاطیہ عنصر غالب ہے۔ دراصل ان کے اس نشاطیہ مزاج کی تشکیل میں اس زمانے کے خارجی حالات کا بھی کافی حصہ ہے۔ کیونکہ ولیؔ کے زمانے میں روزمرہ کی زندگی میں وہ انتشار اور بے سروسامانی کی کیفیت نہیں تھی جو بعد میں میرؔ کے زمانے میں پیدا ہوئی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ولیؔ کی اس خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

" ولی کا امتیاز خاص یہ ہے کہ وہ ان معدودے چند شاعروں میں ہے جس کی غزل بلکہ سارے کلام کو پڑھ کر غم کی کیفیت پیدا ہونے کے بجائے طبیعت پر شگفتگی طاری ہو جاتی ہے۔ ان کے عاشقانہ اشعار میں جذب و سرور کی ایک دلنواز کیفیت شروع سے آخر تک نمایاں ہے "

بقول میرؔ :

واقف نہیں ہم یوں ہی کچھ ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

تصوف نے جو اس کے دور کے تمدن کا آئینہ دار تھا شعر و ادب میں پاکبازی و پاک بینی قائم رکھی۔ اس کی جھلک ولیؔ کے دیوان میں جا بجا ملتی ہے۔ اسی سبب میر جیسا نکتہ چیں بھی ولی کی مدح سرائی کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے علاوہ قائم۔ حاتم اور آبرو وغیرہ بھی ان کے طرز کو سراہتے رہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بارہویں صدی ہجری تک ولی کا مسلک عاشقی مشعل راہ بنا رہا۔ لیکن جب دلی تباہ ہو گئی اور شاعری کا مرکز لکھنؤ منتقل ہو گیا تو یہیں سے عشق کی وہ پاکبازی ختم ہو گئی جو دلی کے دبستان شاعری کی خصوصیت تھی۔

★

غزلیں

منصور سبزواری

ڈاکخانہ : توہ

ضلع: گڑگاؤں، ہریانہ

سایۂ ماہ تھا آنکھوں میں رکا وہ بھی نہیں
ایک دھبہ تھا اس آنگن میں رہا وہ بھی نہیں

صبح تک بھوکی ہواؤں کے کشکول بکھرے
شب تھا جو برگِ عزادار بچا وہ بھی نہیں

خالی الفاظ ہیں چاہا مجھے جس نے تا عمر
میں جس احساس کا گھاؤ تھا مرا وہ بھی نہیں

جاتے جاتے تو بچھڑنے کی سزا دے جاتا
حرفِ آخر سا جو کہنا تھا کہا وہ بھی نہیں

لوریاں دے کے سلائے کسے اب شب کی رُتیں
وہ جو اک خوف تھا جنگل میں چھپا وہ بھی نہیں

عارف نجمی

۲۴-اے، کٹرہ ابوتراب خاں

لکھنؤ ۳

حالات و حادثات میں ڈھلتی رہی غزل
پہرے زباں پہ جب بھی لگے بول اٹھی غزل
دوشیزگی میں ماں کا تصور لیے ہوئے
در در بھٹک رہی ہے مرے عہد کی غزل
میرا کی زندگی ہے مری میر کا مزاج
ڈھلتا گیا میں گیت میں ہوتی گئی غزل
حسرت گریز کرب انا ضبطِ آگہی
دیکھی ہے میں نے پلکوں پہ ٹھہری ہوئی غزل

الفاظ کا طلسم بڑا کام کر گیا
ورنہ کہاں سے لاتا میں نجمی نئی غزل

قائم حسین کوثر

۸۸/۲۹۶، چمن گنج، کان پور - ۲۰۸۰۰۱

نہ کوئی چھپتا کسی سے نہ کچھ چھپا ہوتا
نواحِ ارض و فلک ایک آئینا ہوتا
رگوں کو چیر کے بڑھتا یہ آبشارِ صدا
سماعتوں کی زمیں پر نہ یوں گرا ہوتا
ہزار آنکھ سے تکتی ہوئی یہ ویرانی
میں اس سے بچ کے کبھی تو نکل سکا ہوتا
سسک رہا ہے اکیلا یہ کون چار طرف
ہوا نے نام تو اس کا بتا دیا ہوتا
لپٹ کے پاؤں میں یہ ریت ناچتی رہتی
بھنور کو ہاتھ پہ کوئی اٹھا لیا ہوتا

فہمیدہ نصرت ہاشمی
ظفر لاج، ترکمان پور
گورکھپور

افسانہ

ریزہ ریزہ احساس

دھوپ کی پری اپنے پر سمیٹ کر وادیٔ شام کی طرف چل پڑی۔ سورج اپنی کرنوں کو سمیٹتے ہوئے آسمان کی وسعتوں میں گم ہو گیا۔ خنکی فضاؤں میں آہستہ آہستہ رنگ لانے لگی۔ اور گھڑی کے پنڈولم کی سریلی آواز کے ساتھ سیما کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کسلمندی سے کروٹ بدلتے ہوئے در و دیوار پر نظر دوڑائی۔ چاروں طرف ایک خاموشی، ایک سکوت طاری تھا جیسے ہر چیز جامد و ساکت ہو۔ اور گھر میں تھا بھی کون کہ چہل پہل ہوتی۔؟

اس کی شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے لیکن اس کی گود ابھی تک سونی تھی۔ انل کے والدین شہر سے دور اپنے فارم پر ہی کوٹھی میں رہتے تھے اور یہاں اس بڑے سے بنگلہ میں وہ اور انل دو ہی افراد تھے۔ لیکن انل جو فارسٹ آفیسر تھے، آئے دن سرکاری دوروں پر رہتے اور ان کے جانے کے بعد وہ اکیلی اس بنگلہ کی نگرانی کرتی۔ ان دنوں اس کی اداسی کچھ اور گہری ہو جاتی مگر وہ حالات کے سامنے بے بس تھی۔ سچ ہے تقدیر کے معاملات بھی عجیب ہوتے ہیں۔ انل کو بھی اس کا احساس تھا۔ اس نے بنگلہ میں ہر قسم کی آسائش کا سامان مہیا کر رکھا تھا۔ سیما کو تنہائی میں دل بہلانے کے لیے، ریڈیو، ریکارڈ پلیئر اور ٹی۔ وی کا سہارا لینا ہی پڑتا تھا۔ حالانکہ اب ان بے جان چیزوں سے وہ اکتا گئی تھی۔ اسے ایک ذی ہوش، باشعور ساتھی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی جو اس کی ویران زندگی کے شب و روز میں ہر لمحہ اپنی قربتوں سے رنگ بھرے اور دونوں کے قہقہوں سے گھر کی فضا گونج اٹھے لیکن۔۔۔۔ انل ۔۔۔ انل ایک خاموش طبیعت اور مصروف ترین آفیسر تھے۔ وہ چند دن گھر پر گزار کر پھر دورے پر چلے جاتے اور آج بھی انل کہیں دور کسی جنگل کی پیمائش پر گئے ہوئے تھے۔

سیما نے غسل کیا تو کچھ فرحت محسوس ہوئی۔ نوکر سے چائے منگوائی۔ اسی وقت گھڑی نے ساڑھے چھ بجائے۔ سیما نے شام کی تنہائی دور کرنے کے لیے ٹی۔ وی۔ آن کر دیا۔ کوئی معلوماتی پروگرام آ رہا تھا۔ کچھ لمحے گزرے اور پھر اناؤنسر کا مسکراتا چہرہ پردہ پر آیا اور اس نے شام غزل پروگرام کا اعلان کیا۔ شہر کے موتی گارڈن میں آج شام غزل کا پروگرام تھا۔ وہی پروگرام ٹی۔ وی پر بھی دکھایا جا رہا تھا۔ سیما سوچنے لگی۔ انل ہوتے تو ان کے ہمراہ پروگرام سننے گارڈن جاتی۔ حسین پھولوں معطر ہوا اور خوبصورت غزلوں سے طبیعت شگفتہ ہو جاتی۔ لیکن اکیلے جائے تو بور ہوگی۔ لہٰذا گھر میں ٹی۔ وی پر ہی سن لے گی۔ اور یہی سوچ کر وہ پیر پھیلا کر آرام کرسی پر دراز ہو گئی۔ اسی وقت اناؤنسر کی آواز پھر گونجی۔ اناؤنسر نے پروگرام کے فن کاروں کے نام خوبصورت انداز میں تعارف کے ساتھ پیش کیے۔ ایک ایک کر کے ان کے فوٹو پردے پر آنے لگے۔ لیکن اچانک بالکل اچانک سیما کا ذہن ایک نام پر اور نگاہیں ایک تصویر پر جم کر رہ گئیں۔ شام غزل کے مہمان خصوصی راکیش کھنہ تھے۔ جو ایک بہترین گلوکار اور شاعر تھے۔

یہ ان کا خصوصی پروگرام تھا۔

اناؤنسر نے تعارف کرایا کہ راکیش ایک بہترین غزل گو ہیں اور اسی رائے پور کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہیں ان کے فن نے جنم لیا اور یہیں سے یہ فن کار آفتاب و مہتاب بن کر چمکا۔ یہ اپنی ٹیکنیکل تعلیم کے سلسلے میں بیرون ملک چلے گئے تھے اور اب جب دو ماہ بعد ہندستان واپس آئے تو انھوں نے مناسب سمجھا کہ جس سرزمین نے انھیں فنکار بنایا ہے۔ اسے سب سے پہلے خراج عقیدت پیش کریں۔ لہٰذا ہمارے شہر کا فرزند اور ملک کا مایۂ ناز شاعر آج ہمارے درمیان ہے۔ بیرون ملک سے واپسی کے بعد یہ ان کا پہلا پروگرام ہے۔ اناؤنسر کا تعارف سیما کے ذہن میں گونجتا رہا اور نظریں اس پیکر کا طواف کرتی رہیں۔ جو ابھی ابھی تالیوں کے شور میں اسٹیج پر آیا تھا اور پھولوں کے ہاروں سے لدا پھندا تھا۔ لیکن اتنے ہجوم میں اتنی بھیڑ میں بھی سیما نے اس شاعر کو پہچان لیا۔ کیونکہ وہ کوئی اجنبی یا غیر نہیں تھا اس کا پہلا پیار تھا۔ اس کی پہلی پسند۔

راکیش اپنی خوبصورت آواز میں غزلیں سناتا رہا۔ لوگوں کی واہ واہ سے فضا گونجنے لگی اور سیما کو ایسا لگا جیسے اس کا دل کھنچا جا رہا ہے۔ یہ راکیش جو آج اتنا بڑا فنکار ہے کبھی اس سے کتنا قریب تھا۔ کتنا نزدیک..... دونوں نے ساتھ جینے ساتھ مرنے کی قسمیں کھائی تھیں اور ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔ سیما اور وہ ایک ہی کالج کے طالب علم تھے۔ سیما جتنی حسین و نازک تھی۔ راکیش میں بھی اتنی ہی مردانہ وجاہت تھی۔ اسے شاعری کا ذوق کالج کے زمانے سے ہی تھا اور اچھی غزلیں کہا کرتا تھا جسے سیما کالج کے فنکشن میں اپنی آواز کے جادو سے سجاتی تھی۔ اور پھر ایک دن دونوں لازم و ملزوم ہو گئے۔ ہر جگہ ساتھ ساتھ ہر لمحہ ساتھ ساتھ لیکن اچانک بالکل اچانک ایک دن لاکھوں پیار کرنے والوں کی طرح وہ دونوں بھی بچھڑ گئے۔ راکیش کے ڈیڈی کا ٹرانسفر ہو گیا اور اتنی جلد وہ لوگ اس شہر سے چلے گئے کہ سیما کو اس کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔

کوئی خبر نہ مل پائی۔ حالانکہ اس کے گیت ہمیشہ اس کے کانوں میں رس گھولتے رہے۔ اس کے لبوں پر مچلتے رہے۔

وقت نے کروٹ بدلی، تعلیم کا زمانہ ختم ہوا اور اس کی شادی ہو گئی۔ سیما سے وہ مسز انل بن گئی..... مسز انل جسے انل نے زندگی کی ہر آسائش بہم پہنچائی۔ فرض ضرور ادا کیا لیکن محبت نہ دی۔ یا انہوں کا پیار نہ دیا۔ اس کی راتیں اب بھی اکثر و بیشتر تنہا گزرتی تھیں۔ لیکن آج اچانک..... راکیش کو دیکھ کر اس کے خوابیدہ جذبات بھڑک اٹھے۔ اسے پالینے کی آرزو پھر سے بیدار ہو گئی۔ اور وہ مسرور ہو اٹھی۔ آج کتنے برسوں بعد اس نے راکیش کو دیکھا ہے۔ اور اپنے ہی شہر میں ..... لہٰذا کیوں نہ وہ موتی گارڈن جا کر اس سے ملے..... اور اسے اتنا اعزاز پانے پر مبارکباد پیش کرے..... اور پھر اپنے گھر آنے کی دعوت دے؟ ــ وہ اسے دیکھ کر کتنا خوش ہوگا۔ رائے پور آ کر راکیش نے ضرور مجھے ڈھونڈا ہوگا۔! ہو سکتا ہے ممی اور پاپا سے ملنے گھر گیا ہو؟ اور جب اسے..... میری شادی کی اطلاع ملی ہوگی تو اسے کتنا دکھ ہوا ہوگا۔ اسی لیے تو مجھ سے ملنے نہیں آیا۔ سوچا ہوگا سیما اب کسی اور کی امانت ہے۔ اس کا مجھ سے کیا واسطہ..... اور پھر اس نے مجھے بے وفا سمجھ لیا ہوگا..... شاید اس نے ابھی تک شادی بھی نہیں کی۔ تبھی اس کے ہمراہ کوئی عورت نہیں۔ اس کے تعارف میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ کیا وہ ابھی تک مجھ سے پیار کرتا ہے؟ میں بھی کہہ دوں گی کہ راکیش..... شادی میری ضرور ہو گئی لیکن میں اب بھی تنہا ہوں۔ تم مجھے سہارا دو۔

غزل ختم ہو گئی تھی۔ تالیوں کے شور میں راکیش اسٹیج سے اتر رہا تھا۔ سیما نے ٹی۔ وی۔ بند کیا۔ نوکر کو آواز دی اور خود بجلی کی تیزی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی اور کار اسٹارٹ کرنے لگی۔ شوفر نے اپنی خدمات پیش کرنا چاہیں لیکن سیما کی بے قراری نے کسی کو ساتھ لینا گوارا نہ کیا۔

گاڑی کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی اور پھر موتی گارڈن

گے فوارے کی خوبصورت اور رنگ برنگی لائٹیں نظر آنے لگیں۔
ب کار ڈرائیور چند قدم پر ہی تھا کہ رتنا دیسا کے کنٹرول سے باہر ہو گئی اور گاڑی بجلی کے پول سے اس بری طرح ٹکرائی کہ الٹ گئی۔ اسٹیرنگ سیما کے سینے میں گھس گیا تھا۔ چیخ سن کر گارڈن سے سینکڑوں افراد بھاگتے ہوئے باہر آئے اور بڑی کوششوں سے لوگوں نے کار کو سیدھا کیا۔ لیکن سیما دم توڑ چکی تھی۔ پھر میں ڈاکٹر بھی نمودار ہوئے لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

پولیس اسٹیشن اطلاع دی گئی۔ لاش کی شناخت کے لیے لوگ اکٹھا ہونے لگے۔ پولیس بھی آگئی۔ پولیس آفیسر نے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ میں سے کوئی شخص شناخت کر سکتا ہے کہ یہ کس کی لاش ہے؟ کچھ لوگوں نے دیکھا اور بتایا کہ یہ فارسیٹ آفیسر انل کماری بیوی ہیں۔

اسی وقت راکیش بھی گیٹ سے نکل کر لاش کے قریب آیا۔ پولیس آفیسر نے افسوس کے ساتھ کہا: "راکیش جی لگتا ہے یہ دیوی جی آپ کو دیکھنے یا آپ کا پروگرام سننے کے لیے ہی اتنی تیزی سے آرہی تھیں کہ ایکسیڈنٹ ہو گیا"..... راکیش نے ایک نظر لاش پر ڈالی اور پھر بڑی لاپروائی سے کہا: "افسوس! میں انھیں نہیں پہچانتا۔ ہو سکتا ہے کہ میری کوئی فین ہوں....." اور یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

بھیڑ نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ پولیس والے لاش اٹھوانے اور وارثوں کو مطلع کرنے چلے گئے۔ لوگ راکیش کو پھر اسٹیج پر لے آئے۔ پروگرام دوبارہ شروع ہو گیا۔ چاروں طرف سے پھر فرمائشیں ہونے لگیں۔ راکیش ایک کے بعد ایک غزل چھیڑتے رہے۔ اور واہ واہ کے شور سے سارا ماحول گونجتا رہا۔ راکیش کو ایک لمحہ کی بھی فرصت نہ ملی کہ وہ سوچتا کہ یہ ایکسیڈنٹ کیوں اور کیسے ہوا؟۔ اور وہ کون تھی؟؟

★

علامہ اقبال

(صلا کا بقیہ)

زہائش درویش حبیبی!!

حواشی

۱ روزگار فقیر: تصنیف: فقیر سید وحید الدین۔ اشاعت نقش اول ۱۹۵۰ء نقش ثانی ۱۹۶۳ء
۲ ڈاکٹر صاحب: علامہ شیخ محمد اقبالؒ۔ اس مضمون میں جہاں جہاں ڈاکٹر صاحب مرحوم ہے۔ اس سے علامہ شیخ محمد اقبالؒ مراد ہے۔
۳ والد مرحوم: فقیر سید نجم الدین مرحوم۔ پدر مصنف کتاب "روزگار فقیر"
۴ مسولینی: نام (MUSSOLINI BENITO) ولادت ۱۸۸۳ء۔ وفات ۱۹۴۵ء۔ ڈکٹیٹر۔ اٹلی کا وزیر اعظم ۱۹۲۲ء تا ۱۹۴۳ء
علامہ اقبال سے مسولینی کی ملاقات روم (اٹلی) میں ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔
۵ خاتون: نام سردار بیگم۔ ڈاکٹر صاحب کی تیسری بیوی۔ والدہ جاوید اقبال وغیرہ۔ انتقال ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء
۵الف تولد: ولادت جاوید اقبال ۱۹۲۴ء بمقام لاہور
۶ استاد: علامہ اقبالؒ کے استاد شمس العلماء مولوی سید میر حسن مرحوم
۷ برگساں: نام ہنری لوئی برگساں۔ ولادت ۱۸۵۹ء۔ وفات ۱۹۴۱ء فرانس کا مشہور ریاضی داں اور فلسفی
۸ حدیث: لاتسبوا الدھر فان الدھر ھو اللہ (زمانہ کو برا مت کہو۔ بیشک زمانہ اللہ ہے)
اقبال کا شعر ؎ زندگی از دہر و دہر از زندگی است لاتسبوا الدھر فرمانِ نبی است

★

فراق نمبر: تاثرات کے آئینے میں

اظہر علی فاروقی

۸۴۸، دریا باد۔ الہ آباد

واقعی یہ نمبر فراقؔ گورکھپوری صاحب کے بارے میں بے پناہ معیاری اور مستند ریفرنس کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ نے جس کدوکاوش سے کام لیا ہے، وہ لائق صد ستائش اور مبارکباد ہے۔

نذیر بنارسی

پانڈے حویلی، وارانسی

کم سے کم ایسا شاندار نمبر اب تک میری نظر سے تو نہیں گزرا۔ کتابت، طباعت، تصاویر کی سٹنگ، پرمغز مضامین، جاندار نظمیں، حسین اور دلکش ٹائٹل پیج، سب میں آپ کی فطری صلاحیت اور بیدار ذہانت کارفرما ہے۔ اس آرائش و زیبائش کے شاہکار کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ آپ کے اس حسین کارنامہ پر میں آپ کو اپنی پرخلوص مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

صباح الدین عمر (آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے نشر)

بعض رسائل کے فراقؔ نمبر شائع ہوئے لیکن جس سج دھج اور آن بان سے نیا دور کا فراقؔ نمبر نکالا گیا ہے ویسا نمبر اب غالباً شائع نہیں ہو سکتا۔

نیا دور کے اس نمبر کی دو خصوصیات اور بھی ہیں پہلی خصوصیت یہ کہ اس میں فراقؔ کی تعریف ہی نہیں کی گئی ہے۔ بعض بعض مضامین میں فراقؔ کی شاعری اور شخصیت کے بعض دوسرے پہلوؤں کو بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ دوسری خصوصیت اس نمبر کی یہ ہے کہ فراقؔ کی جتنی تصویریں بھی حاصل ہو سکتی تھیں، فراہم کر کے فراقؔ نمبر میں شائع کر دی گئی ہیں۔

مسیح الحسن رضوی

وزیر گنج، لکھنؤ

نیا دور گذشتہ ۳۸ برس سے اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ اس عرصہ میں اس نے ایک سے ایک بڑھ کر تاریخی، ادبی و ثقافتی نمبر نکالے جو باذوق حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے گئے۔

فراقؔ نمبر بھی مدیران نیا دور نے اپنی روایتی شان سے نکالا ہے۔ اس کے مضامین کی خوبیوں کا ذکر کیا جائے تو کم ہے۔ کتابت کا ذکر کیا جائے تو کم ہے اور تزئین و آرائش کا ذکر کیا جائے تو اور بھی کم۔ غرضیکہ یہ ایک ایسا نمبر ہے جو ہر لحاظ سے مکمل اور ہر مکتبۂ خیال کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایسے خوبصورت اور دیدہ زیب نمبر نکالنا بڑی ہمت کا کام ہے۔

رند رحمانی سیتاپوری مرحوم

جگر اکاڈمی، چمن گنج، کانپور

بیشک فراقؔ نمبر کی اشاعت میں بہت تاخیر ہوئی لیکن بلند پایہ مصنفین کی تخلیقات حاصل کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ ایک مدیر کی پریشانیوں کو مدیر ہی سمجھ سکتا ہے۔ عام قاری کیا جانے۔

مناظر عاشق ہرگانوی

مارواڑی کالج، بھاگل پور (بہار)

آپ نے صحیح معنوں میں فراقؔ کا حق ادا کر دیا ہے۔ فراقؔ کی روح یقینی طور پر خوش ہو گئی ہوگی۔ یہ نمبر ہر باذوق آدمی کے پاس ہونا چاہیے۔ پڑھے لکھے لوگ تو اس سے استفادہ کریں گے ہی۔ اتنا بھرپور اور اتنا اہم نمبر نکالنے پر میری جانب سے دلی مبارکباد قبول کریں۔

شمس تبریز خاں

مکارم نگر، لکھنؤ

نیا دور کے 'فراقؔ نمبر' پر دلی اور مخلصانہ مبارکباد قبول فرمائیں۔ یہ نمبر نیا دور کے پچھلے تمام نمبروں سے بازی

ہو گیا، مغز و مواد، ضخامت، حسن طباعت اور ترتیب ہر لحاظ سے یہ ایک یادگار نمبر کہا جائے گا اور فراق پر کام کرنے والوں کے لیے بنیادی اور لازمی مواد فراہم کرے گا۔

فراق نمبر اتنا دلچسپ ہے کہ کئی دنوں کے مطالعے کے بعد آج ختم کر کے ہی اسے رکھا ہے۔ یہ نمبر ہمارے اس عظیم اردو شاعر کے شایانِ شان اور آپ کے ادارتی حسنِ ذوق کا مرقع آئینہ ہے۔

ضیا حسنی
لکھنؤ

'فراق نمبر' نظر نواز ہوا۔ شکریہ۔ یہ خصوصی شمارہ صوری و معنوی دونوں اعتبار سے مزین ہے۔ اس کے ذریعہ فراق کی شاعری اور شخصیت کے سبھی پہلو ابھر کر سامنے آگئے ہیں اور اس طرح فراق کی تفہیم کی راہ ہموار ہوئی ہے۔ ان کی نظموں، غزلوں، رباعیات اور تنقید نگاری سبھی کو موضوع بنایا گیا ہے اور شاید ہی کوئی گوشہ تشنہ رہ گیا ہو جس پر اظہار خیال نہ کیا گیا ہو۔ میں اس شمارے کو دلکش اور دیدہ زیب بنانے کے سلسلے میں آپ اور قریشی صاحب دونوں کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

نامی انصاری
۹۷/۱۲ پریڈ، کانپور

نیا دور کا "فراق نمبر" اتنا خوبصورت اور شاندار آپ نے شائع کیا ہے کہ نہ صرف اردو کے اہل ذوق حضرات کی بلکہ خود فراق کی روح بھی جھوم گئی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ نیا دور کی پوری تاریخ میں ایسا حسین اور شاندار نمبر کوئی دوسرا نہیں شائع ہوا۔ یہ آپ کا ایسا کارنامہ ہے جسے نہ صرف فراق پر ایک دستاویز کی حیثیت حاصل ہے بلکہ اپنے ظاہری حسن صورت کے اعتبار سے بھی اسے امتیازی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا۔

لئیق اختر فیض آبادی
امام باڑہ فیض آباد

'نیا دور' کا فراق نمبر آپ کی بے پناہ محنت، لگن، جدوجہد، ادب پروری اور فراق نوازی کا ایک شاہکار ہے۔ فراق نمبر اردو کا ایک ایسا معبد ہے جہاں بیساختہ عبادت کرنے کو دل چاہتا ہے۔ اللہ نے سلسلۂ معجزہ ختم کر دیا۔ لیکن اردو میں اعجازی تسلسل باقی ہے۔ فراق نمبر اس صدی کا ایک معجزہ ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تعریف کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں؟ کس لغت میں تلاش کروں؟

اس نمبر کے بعد یقین ہو گیا کہ اردو نہ اب مر سکتی ہے اور نہ قتل کی جا سکتی ہے۔ اگر جوش مرحوم کے الفاظ مستعار لے کر عرض کروں تو شاید میرے جذبات کی ترجمانی ہو سکے ۔" فراق (نمبر) نہ تلوار ہے، نہ خنجر، نہ چھری — یہ شخص (نمبر) دھار ہی دھار ہے —"

اصغر شریف
رحمانیہ ہائر سکنڈری اسکول، آسنسول

کافی انتظار کے بعد "فراق نمبر حصۂ اول" موصول ہوا۔ جو ہر اعتبار سے لاجواب ہے کیونکہ اس کے اوراق الٹتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا رہا کہ دیدہ و دل روشن ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنی بھی تخلیقات ہیں وہ سبھی معیاری، دلکش اور حسین ہیں اور اس کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

★

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: انتخاب ریختی

مرتب: سید سبط محمد نقوی ، قیمت: چار روپے پچاس پیسے
ناشر: اتر پردیش اردو اکاڈمی، لکھنؤ

اتر پردیش اردو اکاڈمی کا شعبۂ اشاعت کتب، کچھ عرصے سے کافی فعال نظر آ رہا ہے۔ اس شعبے کے ذریعہ اکاڈمی نے مختلف اشاعتی سلسلے شروع کر رکھے ہیں جن کے تحت اب تک تقریباً دو سو کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ان میں ایک سلسلہ مختلف اصنافِ ادب کے انتخابات کا بھی ہے زیرِ نظر کتاب "انتخاب ریختی" اسی سلسلۂ اشاعت کی ایک کڑی ہے۔

"ریختی" جہاں ایک غیر مہذب صنفِ سخن کی حیثیت سے متعارف کرائی گئی ہے، وہیں اردو زبان و ادب کے رموز آشنا حضرات اس سے اپنی خوش عقیدگی کا بھی اظہار کرتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کا مندرجۂ ذیل بیان ریختی کی اہمیت کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے:

"اردو کی جاذبیت اور دلکشی کا راز اسی حصۂ زبان میں ہے جسے عورتوں سے منسوب کیا جاتا ہے اور جس میں غضب کی گھلاوٹ اور مٹھاس ہے۔ اسے نکال دیجیے تو غریب اردو ننگی بوچی رہ جائے گی۔ اس کی خانہ پری کی ضرورت محسوس ہوگی اور آپ ادھر ادھر ٹاپتے اور جھکولے کھاتے پھریں گے، کہیں دال نہ گلے گی اور جھنجھی کوڑی ہاتھ نہ آئے گی، چیتھڑے لگائے سر بگریباں گھر کی سیدھ باندھے گا اور اس روٹھی رانی کو منانے پر مجبور ہو جائے گا۔"

(فرہنگ اثر۔ ص ۸۰، حصۂ دوم، مطبوعہ سرفراز پریس، لکھنؤ)

اس کے باوجود اگر ریختی اب تک اپنے سفر ارتقا کی اسی منزل پر ہے جہاں آج سے پورے سو سال پہلے میر یار علی نے اس کا ساتھ چھوڑا تھا، اور اس راہ کے مسافر ایک کامل صدی میں بھی جان صاحب کے مقام سے ایک قدم آگے نہ جا سکے تو قصور کس کا ہے۔؟

میرا خیال ہے کہ ذکر ریختی نویسوں کے مقابلے میں مؤنث ریختہ نگاروں پر اس کی ذمہ داری کا زیادہ عائد ہوتی ہے۔ ریختی پر تنقید یعنی تنقیص کرنے والوں سے زیادہ نقصان ریختی کو ان شاعرات نے پہنچایا ہے جنھوں نے عورت ہوتے ہوئے بھی بے تکلف، مردانہ صیغوں میں کلام کیا ہے اور اپنی شاعری میں انھیں جذبات و خیالات کو دہراتی رہی ہیں جن کا اظہار مرد شاعر کی طرف سے ہوتا رہا ہے۔

بہر حال، اردو دنیا کو اتر پردیش اردو اکاڈمی کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اکاڈمی، اردو کے تقریباً فراموش شدہ شعراء کی فکری کاوشوں کے از سرِ نو مطالعے اور معیار بندی کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

زیرِ نظر انتخاب میں اس صنفِ سخن کے تین اہم ترین اساطین یعنی سعادت یار خاں رنگین، انشاء اللہ خاں انشا اور یار علی جان صاحب کے علاوہ دبستانِ دکن، دبستانِ دلی اور دبستانِ لکھنؤ کے ۵۰ معلوم الاحوال ریختی نگاروں کے تعارف و کلام کے ساتھ ۴۸ مجہول الحال شاعروں کی ریختی کے نمونے بھی شامل ہیں اور اس لحاظ سے یہ انتخاب اختصار کے باوصف جامعیت کا حامل ہو گیا ہے۔ شروع میں مرتب کا مختصر سا مقدمہ بھی شاملِ کتاب ہے۔ نیز رنگین، انشا اور جان صاحب کا تعارف خصوصاً کاوش سے لکھا گیا ہے۔

تبصرہ نگار نے "انتخاب ریختی" کا ایک ایک لفظ پڑھا ہے اور افسوس کے ساتھ یہ عرض کرتا ہے کہ اس کی فرہنگ میں جن الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے ان میں نوے فی صد وہ ہیں جو اس کتاب میں کہیں بھی استعمال نہیں ہوئے۔ اور جو الفاظ کتاب میں استعمال ہوئے ہیں ان کی بھی اس فرہنگ میں کی گئی تشریح کا نمونہ یہ ہے، مثلاً پہلے رنگین کا ایک

مصرع ہے ؎

ہندی کو پڑے ہوکا رنگیں کی نہ چاہت کا

فرہنگ میں ص۳۳ پر اس 'ہوکا' کا مطلب یوں لکھا گیا ہے :-

"ہوکا ہے یعنی قناعت اور سیری نہیں"۔

جبکہ قاعدے کے مطابق "ہوکا پڑنا" یا "ہوکا پڑے" لکھ کر معنی کی وضاحت کرنا چاہیے تھی۔

اس کے باوجود میری رائے میں یہ کتاب عام قاری کے لیے خوش وقتی کا باعث اور ریختی کے مطالعے کا ذوق پیدا کرنے کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

—— رئیس نعمانی

"ضلع جگت"

نام کتاب :

نام مصنف : مہاراجہ سرکشن پرشاد / ناشر : اترپردیش اُردو اکادمی لکھنؤ

قیمت : چار روپے پچاس پیسے۔

اُردو کی بہت سی قدیم کتابیں ایسی تھیں جن کی اس دور میں کوئی خاص اہمیت نہیں رہی۔ لیکن اُردو کے ارتقا کو سمجھنے کے لیے وہ اہم کڑیوں کا کام دیتی ہیں، اس لیے ان کی تاریخی حیثیت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔ پچھلے دنوں بی بی سی نے اپنے اُردو پروگراموں کے ذریعہ ہم کو ایسی متعدد کتابوں سے روشناس کرایا جن میں چند ایسی تھیں جو اُردو کے ابتدائی دور جو سو برس پہلے مستعمل رہیں۔ زیر نظر کتاب مہاراجہ سرکشن پرشاد کی تصنیف ہے جو اب سے اسّی برس پہلے چھپی تھی اور اب اترپردیش اُردو اکادمی نے اس کو دوبارہ شائع کیا ہے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد دکن کی ممتاز شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں وہ نہ صرف اُردو کے شاعر تھے بلکہ بڑے انسان دوست اور شاعر نواز بھی تھے اور اپنے عہدہ اور امارت کا برمحل استعمال کرکے انھوں نے متعدد شعرا کو مالی مشکلات سے نجات دلائی، ان کی فیاضی اور علم دوستی کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ضلع جگت کا رواج اُردو کے دور ماضی میں رہا۔ یہ ایسا دور تھا جب نظم میں مختلف صنائع بدائع کے استعمال کو ہی زبان پر عبور مشاقی اور استادی سمجھا جاتا تھا، اور اگرچہ آج بھی بہت سے الفاظ ہماری نظم اور غزل میں ایسے استعمال ہوتے ہیں جن پر ضلع جگت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ لیکن آج کا شاعر ان الفاظ کو نہ اس اعتبار سے استعمال کرتا ہے نہ سامعین ان کی خاطر داد دیتے ہیں۔ "ضلع جگت" کا افادی پہلو صرف یہ ہے کہ مختلف ادوار میں جو کتابیں علم و فن کے بارے میں لکھی گئیں اور جو وقت گزرنے پر نایاب ہو گئیں ان کو تلاش کر کے دوبارہ چھاپا جائے تاکہ اُردو زبان کی تحقیق میں مدد مل سکے اور اس کے ارتقا کے مختلف مراحل نظروں سے اوجھل نہ ہوں۔ اسی لیے اُردو اکادمی کی یہ پیشکش اپنی ایک افادیت رکھتی ہے۔

نام کتاب : حاجی میاں محمد چھوٹانی

مرتب : فاروق احمد چھوٹانی — قیمت : دس روپے

ملنے کا پتہ : اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

جن لوگوں کو تحریک خلافت اب تک یاد ہے۔ ان کے لیے حاجی میاں محمد چھوٹانی کا نام نیا نہیں۔ لیکن آج کا نوجوان نہ تحریک خلافت سے واقف ہے اور نہ اس کے سرگرم کارکنوں سے۔ اس لیے فاروق احمد چھوٹانی نے اپنے والد بزرگوار حاجی میاں محمد چھوٹانی کی یاد تازہ کرنے کی خاطر زیر نظر کتاب ترتیب دی جس میں ایک سیر حاصل مضمون ڈاکٹر شیخ فرید صاحب کا ہے جنھوں نے تحریک خلافت میں سیٹھ چھوٹانی کے رول پر تفصیل سے بحث کی ہے اور یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ سیٹھ چھوٹانی تحریک خلافت کے اصل بانیوں میں سے تھے۔ اس کے علاوہ خلافت فنڈ کی جو کثیر رقم سیٹھ چھوٹانی کی تحویل میں رہی اور جس کا صحیح مصرف نہیں ہو پایا اس کے بارے میں بھی چھوٹانی صاحب کے دفاع میں دلائل دیے ہیں۔ اس کے ماسوا دوسرے مضامین کے ذریعہ سیٹھ چھوٹانی صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے

سیٹھ چھوٹانی کی خلافت تحریک سے وابستگی تو مسلم ہے البتہ خلافت فنڈ کے بارے میں جو بدگمانیاں سیٹھ صاحب کی ذات سے منسوب کی جاتی ہیں۔ ان کو رفع کرنے کے لیے زیادہ مدلل اور مستند حوالہ جات پر مبنی تحقیقی مضمون کی ضرورت ہے۔ بہر حال یہ بات قابل ستائش ہے کہ مبین برادری کے اس ممتاز فرد کی قومی اور ملی خدمات کو خراج تحسین پیش کر کے اس کی یاد کو تازہ کیا گیا۔

—— شبیر حسن خاں

DECEMBER, 1973
50 paisa

NAYA DAUR

POST BOX No. 146 LUCKNOW 226001

Annual Sub.
Rs. 5/-

نیا دور

جنوری ۱۹۸۴ء

پچاس پیسے

جلد ۳۸ نمبر ۱۰

جنوری سنہ ۱۹۸۴ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: گنگا دھر پرشاد شکلا

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلیکیشن انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

دفتر: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

یوم جمہوریہ نمبر

عنوانات

اپنی بات

یوم جمہوریہ یعنی چھبیس جنوری ہمارے ملک کی تاریخ میں ایک اہم حیثیت رکھتی ہے۔ ۳۴ سال قبل یعنی ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو آزاد جمہوریہ ہند کا دستور نافذ ہوا تھا جس کے تحت ملک میں ہر شخص کو بلا لحاظ مذہب و ملت آزادی کی نعمتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے اور ترقی کرنے کے لیے یکساں مواقع فراہم کیے گئے۔ ان ۳۴ برسوں میں وطن عزیز نے جو سماجی، ثقافتی، تعلیمی اور سائنسی ترقیاں کی ہیں ان کا ذکر چند سطور میں ممکن نہیں۔ ہماری جمہوریت روز بروز مضبوط اور مستحکم ہوتی جا رہی ہے اور ہمارے عوام میں جو عزم، اتحاد اور جد و جہد کی قوت آئی ہے وہ ناقابل تسخیر اور خوش آئند ہے۔

اگرچہ اس عرصے میں ملک کو متعدد بار آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا ہے لیکن ملک میں جمہوری اور پارلیمانی نظام کی جڑیں اتنی گہرائی تک پہنچ چکی ہیں کہ اس کے پائے استقامت میں جنبش تک نہ ہوئی۔ تاہم بعض جمہوریت دشمن اور فرقہ پرست عناصر چاہتے ہیں کہ ملک کی ترقی و خوشحالی کو درہم برہم کر کے اُسے اصل راستے سے بھٹکا دیں۔ چنانچہ ہماری یہ کوشش ہونا چاہیے کہ ان کے ناپاک ارادوں اور خوابوں کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیں۔ آئیے اس مبارک اور پُرمسرت موقع پر یہ عہد کریں کہ ہم کسی بھی سطح پر اور کسی بھی صورت میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کریں گے اور تخریبی رجحان رکھنے والی طاقتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے تاکہ وہ ہماری جمہوریت کے لیے خطرہ نہ بن سکیں۔

● گذشتہ دنوں اردو کے ممتاز و منفرد نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد بھی ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ کلیم الدین احمد کو اردو کا پہلا "باغی" کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ "باغی" ان معنوں میں کہ سب سے پہلے انھوں نے ہی ادب میں کٹھ ملّا پن، روایتوں اور رسمی تنقید کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اور ادب کو ادبی معیاروں پر جانچنے اور پرکھنے کی کوششوں کی ابتدا کی۔ انھوں نے ادب میں شخصیت پرستی اور شخصی عقیدت مندیوں کے خلاف بھی آواز اٹھائی اور ادبی پیمانوں سے ہی ادب کا تجزیہ کرنے پر زور دیا۔ اپنی عملی تنقیدوں کے ذریعہ انھوں نے اس سلسلے میں ایک قابل تقلید مثال پیش کی۔ جس نے پوری ایک نسل کو متاثر بھی کیا اور اس کی تربیت بھی کی۔ اس طرح انھیں اردو کا پہلا بت شکن نقاد بھی کہا جا سکتا ہے۔ اردو تنقید کا ایک پورا دور اُن سے عبارت ہے۔ اردو میں تنقید کو صحیح معنوں میں تنقید بنانے میں انھوں نے جو رول ادا کیا وہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور اردو تنقید کے لیے تاریخ ساز حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے ہمارے تنقیدی دھارے کا رخ ہی موڑ دیا۔ انھوں نے ہمارے ناقدین کی خامیوں اور تضادات کو بے نقاب کرنے میں بھی بڑی جرأت سے کام لیا۔

انگریزی ادب اور تنقید کا ان کا مطالعہ بڑا عمیق تھا۔ خاص طور سے انگریزی کے کلاسکی ادب اور قدیم مغربی تنقید پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ مشرقی اور ہندستانی ادبی روایات و افکار سے بھی بخوبی آشنا تھے۔ ان کے اس مطالعے، ان کی اس نظر اور ان کے اس علم نے اردو ادب و تنقید کو جس طرح مستفید کیا اُسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ اردو تنقید میں منطقی انداز کے بانی بھی وہی تھے۔ اپنی تنقیدوں میں انھوں نے منطق سے بڑا کام لیا جس سے ان کے تنقیدی افکار و خیالات کو رد کرنا تو درکنار ان سے اختلاف کرنا بھی آسان نہیں رہا۔ انکی منفرد اور قد آور شخصیت کا انتقال بلاشبہ ہمارے ادب کا ایک نقصانِ عظیم ہے، جس کی تلافی کی کوئی صورت دور دور تک نظر نہیں آتی۔

● بڑی خاموشی سے اردو شعر و ادب اور صحافت کی خدمت انجام دینے والے قلم کار رند رحمانی بیناپوری بھی گذشتہ دنوں داغ مفارقت دے گئے۔ وہ نیا دور کے دیرینہ معاونین میں تھے۔ گذشتہ سال نیا دور کے فراق نمبر میں بھی ان کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ وہ ان ادیبوں میں تھے جو اپنے مضامین یا تخلیقات کی اشاعت کے سلسلے میں تقدیم یا تاخیر کی پرواہ نہیں کرتے۔ انھوں نے کبھی اس کی فکر نہیں کی کہ ان کا مضمون اولیت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے یا نہیں؛ حقیقت یہی ہے کہ تخلیقات اپنی اہمیت خود منوا لیتی ہیں: مقام انھیں خواہ کہیں بھی ملے۔

رند رحمانی نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ اور ان کے فکر و فن دونوں میں بڑا توازن تھا۔

ادارہ نیا دور ان کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

—— ایڈیٹر

نذیر بنارسی
پانڈے حویلی۔ وارانسی

غزل

باہر نہیں ہے اشک مری چشمِ تر میں ہے
آجاؤ گھر کی بات ابھی گھر کی گھر میں ہے

جس کی چمک ستاروں میں شمس و قمر میں ہے
اسکو بھی کھینچ لانے کی قوت بشر میں ہے

اتنی حسیں چھلک جو مری چشمِ تر میں ہے
کیا وہ بھی جلوہ گر اسی پانی کے گھر میں ہے

ایسا بھی ریگزار تری رہگذر میں ہے
پانی کہیں نہیں ہے مری چشمِ تر میں ہے

وہ بھی مسافرت میں ہے جو اپنے گھر میں ہے
جب تک نہ ٹوٹے سانس ہر انساں سفر میں ہے

مجھ کو نہ دیکھ شیشۂ دل کا نصیب دیکھ
وہ آئینہ ہوں جو کفِ آئینہ گر میں ہے

اک یہ بھی فیض ہے مرے حسنِ نگاہ کا
پہلی نظر کا حسن تری ہر نظر میں ہے

جل جل کے آندھیوں سے وہی لے گا انتقام
ٹوٹا سا اک چراغ جو مفلس کے گھر میں ہے

منزل ہے جس کی کاکل و رخسار سے پرے
وہ بھی اسیر حلقۂ شام و سحر میں ہے

پھینکا گیا تھا خاک پہ جس آسمان سے
اب وہ بھی آدمی کی کمندِ نظر میں ہے

رخسار پر ہے قطرۂ اشکِ رواں نذیر
یا غم کا بے زبان مسافر سفر میں ہے

ابنِ احمد دریابادی

جمہور کی حکمرانی

یوپی کے ایک بڑے شہر میں ایک اخبار فروش (ہاکر) تھا۔ معمولی پڑھا لکھا لیکن بہت مقبول اور ہردلعزیز۔ ایک سیاسی جماعت کا رکن تھا۔ لوگوں کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہتا۔ میونسپل کارپوریشن کا الکشن قریب آیا تو پارٹی نے اسے امیدوار بنا کر میدان میں اتار دیا۔ عوام نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ غریب تھا لیکن عوام کی طاقت نے اس کی بھرپور مدد کی اور وہ بہ آسانی کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد ناپسندیدہ قسم کی سیاست کا چکر شروع ہوا۔ کارپوریٹروں کو ایلڈرمین کا انتخاب کرنا تھا۔ طریقہ ہاتھ اٹھا کر ووٹ دینے کا نہیں بلکہ واحد متناسب نمایندگی کا تھا۔ سب ہی جماعتوں نے اپنی عددی طاقت کی بنیاد پر فیصلہ کر لیا کہ ان کے ووٹ کس کس شخص کے حق میں پڑیں گے۔ نتیجہ کا اعلان ہوا تو پتہ چلا کہ کہیں کوئی کسر رہ گئی۔ مذکورہ پارٹی کو اندازہ ہو گیا کہ اس کے کسی کارپوریٹر نے ہدایت سے انحراف کیا ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس کا پتہ کیسے چلے؟ ووٹوں کے سلسلے میں رازداری برتی گئی تھی اور صحیح بات کا معلوم کرنا بہت مشکل تھا۔ پارٹی نے اپنی میٹنگ میں اس مسئلہ پر غور کیا اور یہ رائے قرار پائی کہ اخبار فروش چونکہ غریب ہے اس لیے ممکن ہے کسی مالی مجبوری کی بنا پر اس نے رقم لے کر اپنا ووٹ بیچ دیا ہو۔ پارٹی کے ایک لیڈر کو جو ہوشیار اور کامیاب وکیل تھے تحقیقات کے کام پر مامور کیا گیا۔ انھوں نے اس سے ادھر ادھر کی باتیں کیں اور یہ ظاہر کیا کہ بڑے بڑے لیڈر جو بظاہر پارسا نظر آتے ہیں۔ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح روپیہ وصول کرتے رہتے ہیں ورنہ ان کا کام کیسے چلے۔ سادہ لوح اخبار فروش نے جب یہ باتیں سنیں تو اس نے اقرار کر لیا کہ اسے ایک ضرورت کے سلسلے میں یہ رقم درکار تھی اور یہ کہ اس نے تین ہزار روپے کے عوض اپنا ووٹ فلاں امیدوار کے حق میں بیچ دیا تھا۔ وکیل صاحب نے پارٹی کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کر دی اور نتیجہ یہ نکلا کہ کارپوریٹر کو پارٹی سے نکال دیا گیا۔ یہی وہ موڑ تھا جہاں سے اس کی عوامی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ ایک سچا واقعہ ہے اور اس سے دو سبق جمہوریت کے سلسلے میں خصوصیت سے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ انسان مخلص ہو اور خدمت خلق کا جذبہ رکھتا ہو تو عوام خود مدد دے کر اسے جتا سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ دیانت داری اور ایمان داری سے انحراف برسوں کی خدمات اور محنت پر پانی پھیر دیتا ہے۔

گاندھی جی کا قول تھا کہ "جمہوریت پسند شخص کے لیے بے لوث ہونا لازم ہے۔ وہ اپنے غور و فکر میں اور خواب میں بھی اپنی ذاتی غرض کی یا پارٹی کی نہیں بلکہ جمہوریت کی بات سوچے" ایشیا اور افریقہ کے کتنے ہی ملکوں میں جمہوریت کا زوال ہوا اور ہو رہا ہے لیکن ہندستان جمہوریت کی ایک مضبوط چٹان اور ایک روشن مینارہ حصول آزادی کے بعد سے آج بھی ہے۔ جمہوریت کی جڑیں اتنی گہرائی میں پیوست ہو چکی ہیں کہ ان کو اکھاڑنا ملک میں کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ بعض بیرونی طاقتیں "عدم استحکام" کی کیفیت پیدا کر کے جمہوریت کو کمزور بنانے کے لیے کوشاں ہیں لیکن اب تک ان کی تمام کوششیں ناکام رہی ہیں۔

یہاں کیشو دیو مالوی کی ایک روایت کا ذکر کر دینا مناسب

ہوگا۔ آزادی کا ملنے کے فوراً بعد بڑا پرآشوب دور تھا چنانچہ بعض لیڈروں نے جن میں وہ خود شامل تھے یہ مشورہ دیا کہ جنرل الکشن بیس سال بعد کیے جائیں تاکہ اس اثنا میں آزادی کو استحکام حاصل ہو جائے لیکن جواہرلال نہرو کا ذہن صاف تھا۔ انھوں نے واضح طور پر یہ بات کہی کہ ہندستان کا مستقبل نہایت عزم کے ساتھ جمہوری راستہ پر گامزن ہونے میں مضمر ہے اور یہ کہ ایک نئی قوم کے عالم وجود میں آنے کی جو پریشانیاں اور الجھنیں ہیں ان کی پرواہ نہ کی جائے کتنی دوراندیشی اور بصیرت ان کے اس فیصلے میں تھی اسے آج ہر شخص دیکھ رہا ہے۔ ان کی ذات نے جمہوریت کی نہ صرف آبیاری کی بلکہ اسے ایک تناور درخت بنا دیا۔ الکشن جمہوریت کے لیے اسی طرح ہیں جس طرح کھیت کے لیے پانی اور کھاد — بیس سال کے لیے الکشن ملتوی ہو جاتے تو آج ہندستان بھی ان ملکوں کی صف میں کھڑا ہوتا جہاں جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے اور مختلف شکلوں میں آمریت کی حکمرانی ہے۔ پھر ہمارے ملک کی نہ وہ قدر و منزلت ہوتی۔ جو آج ہے اور نہ آواز میں وہ وزن ہوتا جو فی الوقت ہے۔

یہ بات اصولی طور پر صحیح ہے کہ جمہوریت ایسا طرز حکومت ہے جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے"، لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ تولنے کا کام خود اس ملک کے باشعور عوام کرتے ہیں کہ وہ اپنے حق رائے دہی کا استعمال کس امیدوار کے واسطے کریں۔ دیہات تک کے لوگ اب اس قدر بیدار ہیں کہ وہ مختلف جماعتوں اور ان کی کارگزاریوں ہی کے بارے میں نہیں بلکہ مختلف لیڈروں کا رکنوں اور امیدواروں کے بارے میں بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔ جمہور کی حکمرانی سے بہتر نظام عقل انسانی کم سے کم اب تک وضع کرنے سے قاصر رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مستقبل بعید میں جب مشینی انسان بہت سے محاذوں پر سرگرم ہوں اور کمپیوٹر کے ذریعہ پسند و ناپسند کا فیصلہ ہوا کرے تو کوئی اور نظام ابھر کر سامنے آئے جو سب کے لیے قابل قبول ہو لیکن یہاں بات حال کی ہو رہی ہے۔ مستقبل قریب میں بھی کوئی دوررس تبدیلی خارج از امکانات ہے۔ جہاں تک معلوم ہے کمپیوٹر کو نظام حکومت میں تبدیلی یا حکمراں کے انتخاب کے کام پر لگانے کا خیال امریکا جیسے انتہائی ترقی یافتہ ملک میں بھی ابھی کسی کو نہیں آیا ہے۔ اس کا بنیادی سبب بہ ظاہر یہی ہے کہ جمہوری نظام سے سب مطمئن ہیں۔

جن ملکوں میں جمہوریت رائج ہے وہاں کی الگ الگ شکلیں ہیں۔ ہندستان نے طویل بحث و مباحثہ کے بعد جو دستور اساسی تیار کیا وہ جمہوریہ (ریپبلک) کی ہیئت کا ہے۔ ہم نے پارلیمانی نظام کو اپنے لیے پسند کیا اور تقریباً تمام سیاسی جماعتیں اس بات پر متفق ہیں کہ یہ موزوں ترین ہے برطانیہ کی ایک زمانہ میں بڑی طاقت تھی اور اس کی سرپرستی میں برطانوی دولت مشترکہ کی بڑی اہمیت تھی اور اب بھی ہے لیکن ہندستان نے اپنے اثرات سے اس میں بڑی تبدیلی پیدا کر دی۔ ایک کام تو یہ ہوا کہ "برطانوی دولت مشترکہ" سے لفظ "برطانوی" نکل گیا۔ دوسری اہم بات یہ ہوئی کہ پہلی بار ایک "جمہوریہ" یعنی ہندستان کو قوموں کی اس برادری میں شامل کیا گیا۔ دولت مشترکہ کے اجلاس صرف برطانیہ میں نہیں ہوتے بلکہ مختلف ممبر ملکوں میں ہونے لگے ہیں ابھی حال میں اس کی کانفرنس ہندستان میں ہوئی تھی۔

جمہوریت ایک بہت عظیم وسیلہ بے شمار کام کرنے کا ہے۔ ملک کی ۷۰ کروڑ آبادی کا مطلب یہ ہے کہ اتنے ہی مسائل حل کرنا ہیں ترقیات کے وسیع کاموں کا جال ہر طرف پھیلا ہوا ہے لیکن اس کے باوجود بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ایک دشواری آبادی میں بے تحاشا اضافے سے پیدا ہوتی ہے۔ ترقی کے میدان میں جو پیش رفت ہوتی ہے اس کے اثرات محدود ہو کر رہ جاتے ہیں چنانچہ اب پھر اس طرف خصوصی توجہ کی جا رہی ہے منصوبہ بند ترقی میں اسے بہت زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت ہے۔

فلاحی مملکت ایک وسیع تر مفہوم رکھتی ہے۔ ہندستان نے واضح طور پر اپنی راہ متعین کر لی ہے کہ وہ سوشلزم کے ذریعہ مسائل کو حل کرے گا۔ جمہوریت میں چونکہ بے لگام آزادی نہیں ہوتی ہے اور کچھ معقول بندشیں ہوتی ہیں اس لیے ترقی کی رفتار کسی قدر سست ہوتی ہے لیکن جتنی بھی ترقی ہوتی ہے وہ پختہ اور پائدار ہوتی ہے۔ وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کا بیس نکاتی پروگرام ایک ایسی اہم دستاویز ہے جس پر عملدرآمد کر کے پسماندہ سے پسماندہ طبقے کے لوگوں کو بھی اوپر اٹھایا جا رہا ہے۔

(باقی ص ۲۵ پر)

نصیر قریشی
بہادر گنج الہ آباد (یوپی)

نیا سال

مرے ملک کے ہم دجاں پاسبانو ، نیا سال تم کو مبارک !
نئے سال کا لمحہ لمحہ تمہارے لیے کامرانی، خوشی لے کے آئے
تمہارے لیے ہر قدم پر نیا سال ہنستی ہوئی زندگی لے کے آئے
بہاروں کی شہزادی ہر صبح، ہر شام خوشبو میں ڈوبی ہوئی لے کے آئے
مرے ملک کے بے بہا نوجوانو ، نیا سال تم کو مبارک !
تمہارے ہی دم اور قدم سے ہے رونق، درخشاں ہے پیاری محفل ہماری
تمہارے ہی عزم جواں کی بدولت ملی ہے ہمیں آج منزل ہماری
تمہارے ارادوں کی مشعل سے ہر سو فروزاں ہوئی آتش دل ہماری
مرے ملک کے مہربانو ، کسانو ، نیا سال تم کو مبارک !
نئے سال کے سارے موسم تمہیں اور فصلوں کو دیتے رہیں شادمانی
ضرورت کے اوقات میں چھائیں بادل برسنے لگے چاہیے کھیتوں میں پانی
تمہاری ہی محنت کے پھل کھا کے قائم تر و تازہ ہے آج اپنی جوانی
مرے ملک کے مختلف خاندانو ، نیا سال تم کو مبارک !
نیا سال یکجہتی، یکرنگی کے خوشنما پھولوں سے من کا آنگن سجائے
محبت، اخوت، مروت، شرافت کی شمعوں سے دل کا نگر جگمگائے
یہ دھرتی وطن کی جو تم چاہو تو قومی یکجہتی کے یوں ہی پرچم اڑائے
مرے ملک کے عالمو ، رازدانو ، نیا سال تم کو مبارک !
تمہارے ہی افکار، اقوال، اعمال کے نور سے ہر طرف روشنی ہے
دلوں کے ورق پر محبت کی نورانی تحریر کی روشنی پھیلتی ہے
نئے سال کی ہر گھڑی آج بھی طالب روشنی، طالب زندگی ہے
مرے ملک کے شاعرو، ترجمانو ، نیا سال تم کو مبارک !
تمہارا قلم، صلح کل، امن اور آشتی کے لیے یوں ہی ہر دم رواں ہو
تمہارا قلم، زندگی، آگہی، روشنی کا علم بن کے پھر ضوفشاں ہو
نئے سال میں بھی تمہارا قلم عظمتوں کا نشاں، فخر ہندوستاں ہو
نیا سال سب کو مبارک !!

انجم بہرائچی
لیکچرر، آزاد انٹر کالج
بہرائچ

جشنِ جمہور

ہو مبارک سب کو یہ جشنِ مسرت دوستو
کیا ہی اچھا ہو جو آئینہ ہمارا دل بھی ہو
آج کے دن ہم جلائیں پیار والفت کے چراغ
مہربانی کے دیا کے اور محبت کے چراغ
سادھوؤں، رشیوں، فقیروں اور بزرگوں کی زمیں
ہم سے کہتی ہے کرو بیدار احساس یقیں
بھائی چارے کا یہ امن و آشتی کا دیس ہے
علم و فن کا اور عقل و آگہی کا دیس ہے
یہ ہمارا فرض ہے گھٹنے نہ دیں اس کا وقار
سب کی آنکھوں میں مروت ہو سبھی کے دل میں پیار
مل کے رہتے آئے ہیں مل کر رہیں گے ہم سدا
جان سے بڑھ کر ہمیں پیاری ہے قومی ایکتا
مختلف ہیں پھول لیکن ایک ہے یہ گلستاں
ہم سبھی ہیں ایک اپنا ایک ہے ہندوستاں
کون ہے ہم میں پرایا ہم سبھی ہیں ہم وطن
ایک جیسے دل ہمارے ایک جیسے جان و تن

ہم گلے لگ جائیں انجم دوستی کا دن ہے آج
دل سے دل اپنے ملالیں ہم خوشی کا دن ہے آج

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

خواجہ غلام السیدین اور ڈاکٹر اقبال

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے خواجہ غلام السیدین کے والد ماجد جناب خواجہ غلام الثقلین کی شخصیت کا تعارف مختصر ترین الفاظ میں کیا جائے تاکہ اس سے سیدین صاحب کی تعلیم و تربیت پر کچھ روشنی پڑ سکے۔

خواجہ غلام الثقلین کے والد بزرگوار خواجہ غلام عباس (۱۹۰۶-۱۸۴۱) تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب مشہور صحابی حضرت ایوب انصاری سے ملتا ہے۔ حضرت ایوب کے خاندان میں اکثر اہل کمال و صوفیائے کرام گزرے ہیں۔ ازاں جملہ حضرت خواجہ عبداللہ انصاری المعروف بہ پیر ہرات جن کا نام افغانستان، خراسان اور ایران میں بچہ بچہ کی زبان پر تھا بہت مشہور ہوئے۔ ان کی اولاد میں ایک بزرگ خواجہ ملک علی علم و فضل اور زہد و اتقا کے اعتبار سے اپنے زمانے میں ممتاز تھے ۱۲۶۸ء عیسوی میں اپنے وطن مالوف یعنی شیراز کو چھوڑ کر ہندوستان چلے آئے تھے۔ اس وقت غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر متمکن تھے۔ ان کا دربار علماء و فضلا کی قدردانی کی وجہ سے مشہور تھا۔ اس لیے اکثر اہل کمال دور دراز ممالک سے آ کر دہلی میں جمع ہو گئے تھے۔ خواجہ ملک علی ان میں مشہور تھے۔ اس زمانے میں حضرت امیر خسرو دہلوی جو غیاث الدین بلبن کے بیٹے شاہزادہ محمد کے اتالیق تھے دربار شاہی کے رکن تھے۔ بلبن نے اپنی قدردانی اور فیاضی کا ثبوت اس طرح دیا کہ قصبہ پانی پت کے کل رقبہ کی ایک چوتھائی بطور معافی دوامی کے خواجہ ملک علی کو عطا کی اور فرمان شاہی میں اس امر کی صراحت کر دی گئی کہ یہ معافی خواجہ ملک علی کی اولاد کے لیے نسلاً بعد نسل قائم رہے اور جب تک خواجہ موصوف کی نسل سے کوئی متنفس زندہ رہے اس وقت تک علیٰ حالہٖ بحال رہے اگرچہ سلطنت دہلی میں بڑے بڑے انقلاب پیش آئے مگر یہ معافی بدستور قائم رہی اور عہد سرکار انگلشیہ تک قائم تھی۔[۱]

خواجہ غلام عباس کا عقد پانی پت کی مشہور و ممتاز شخصیت سید محمد حسین کی صاحبزادی سے ہوا۔ خواجہ غلام الثقلین کی نانی خواجہ الطاف حسین حالی کی حقیقی بہن تھیں۔ سیدین صاحب کی والدہ مولانا حالی کے بیٹے خواجہ سجاد حسین کی صاحبزادی تھیں۔ خواجہ عباس کے تین بیٹے تھے۔ خواجہ غلام الحسنین، خواجہ غلام الثقلین، اور خواجہ غلام السبطین۔

خواجہ غلام الثقلین ۱۸۷۳ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ گیارہ سال کی عمر میں مولانا حالی کی نگرانی میں دہلی بھیجے گئے اور وہاں انگلو عربک اسکول میں داخل ہو گئے۔ انٹرنس کے بعد علی گڈھ میں داخلہ لیا۔ اکتوبر ۱۸۸۹ء سے اپریل ۱۸۹۴ء تک وہاں رہے۔ طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے ہی پروفیسر آرنلڈ (متوفی ۱۹۳۱ء) کو آمادہ کر کے ۱۸۹۰ء کی ابتدا میں علی گڈھ میں "انجمن اخوان الصفا" قائم کی تھی۔ ہر دو ہفتے کے بعد اس میں ایک مضمون انگریزی میں پڑھا کرتے تھے۔ مارچ ۱۸۹۳ء میں ۲۰ سال کی عمر میں بی۔ اے۔ پاس کیا۔ ۱۸۹۵ء میں ایل ایل بی کیا۔ علی گڈھ میں شبلی، سرسید اور سید محمود کی صحبت سے استفادہ کیا۔ بی۔ اے کرنے کے بعد ہی نواب محسن الملک بہادر کے مترجم اور سکریٹری ہو گئے تھے۔[۲]

خواجہ صاحب طالب علمی کے زمانے میں اپنے مطالعے اور وسیع معلومات کی وجہ سے ممتاز تھے اور تمام طالب علم اور پروفیسر انہیں وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یونین کلب میں ان کی تقریروں کی آتش فشانی اور اخوان الصفا میں ان کے مضامین کی فصاحت بیانی مشہور تھی۔ ان کی لیاقت اور سچائی کے سب قائل تھے۔ خود سرسید مرحوم انہیں محض ان کی قابلیت کی وجہ سے عزیز رکھتے تھے۔ علی گڈھ کالج میں ان سے پہلے اور ان کے بعد غالباً کوئی ایسا طالب علم نہیں ہوا جس کا مطالعہ ایسا گہرا، معلومات ایسے وسیع اور جو کام کرتے میں ایسے

ان تمام تعلقات و عہدوں پر فائز تھے۔ بلکہ قوم کی خدمت ان کا نصب العین تھا۔

خواجہ غلام الثقلین ۱۳ جنوری ۱۸۹۶ء کو حیدرآباد گئے اور نواب سرو قار الملک کے اسٹاف میں مقرر ہو گئے۔ یہاں پانچ سال یعنی اپریل ۱۹۰۱ء تک سول اور انسپکٹر ماڈرن سکے عہدوں پر ممتاز رہے۔ آخر کار ملازمت چھوڑ کر ۱۹۰۱ء سے میرٹھ میں وکالت شروع کی جنوری ۱۹۰۳ء سے اردو رسالہ "عصر جدید" کے نام سے شائع کیا۔ اکتوبر ۱۹۰۲ء سے نومبر ۱۹۰۵ء تک مالیر کوٹلہ میں چیف جج کے فرائض انجام دیتے رہے ۱۹۱۲ء میں کونسل کے ممبر ہوئے ۴۳ سال کی عمر میں ۳ دسمبر ۱۹۱۵ء کی رات میں انتقال کیا۔

خواجہ غلام الثقلین اپنے وقت کے بہترین مقرر اعلیٰ پایہ کے دانش ور مشہور و معروف صحافی اور قابل فخر سماجی کارکن تھے۔ سچے مسلمان تھے اور ملت اسلامیہ کے مختلف فرقوں میں اتحاد و اتفاق کے زبردست حامی تھے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے "اصلاح تمدن" کی تحریک بھی چلائی تھی جس کے وہ سکریٹری بھی تھے۔ اس کا پرچار "عصر جدید" کے صفحات میں بڑے زور و شور سے ہوتا تھا۔ مختلف اخبار و رسائل میں ان کے مضامین چھپتے تھے۔ راقم الحروف کی نظر سے ان کے کئی مضامین ۱۹۰۸ء کے "اخبار چودھویں صدی" راولپنڈی میں گزرے ہیں۔ خواجہ صاحب کوئی پندرہ کتابوں کے مصنف تھے۔

"عصر جدید" کے پرچوں سے بہت سے لوگ واقف نہیں ہیں۔ یہ پرچے اب نادر و نایاب ہیں لیکن میری نظر سے بہت سے پرچے گزرے ہیں۔ کچھ پرچے دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ "عصر جدید" کی پہلی جلد کے بارہ اور دوسری جلد کے دس نمبر میرٹھ سے جنوری ۱۹۰۳ء میں نکلنے کے بعد اس کا پہلا نمبر (نومبر ۱۹۰۴ء) مالیر کوٹلہ میں شائع ہوا۔ خواجہ صاحب کی وفات تک یہ پرچہ کبھی بند ہوتا تھا اور کبھی چھپتا تھا۔ "عصر جدید" کے لکھنے والوں میں سید احمد علی اشہری، مولوی یعقوب علی، مولانا حالی، نیاز احمد، سید سجاد حیدر، مولوی محمد حسین شوق، مولوی سعدالدین حیدر، خواجہ غلام الحسنین، سید علمدار واسطی، ہادی مچھلی شہری، خواجہ غلام الثقلین، خواجہ غلام السبطین، میرزا سلطان احمد، منشی ذکاء اللہ، زہرا خانم وغیرہ جیسی ہستیاں تھیں۔

خواجہ غلام السیدین اسی عظیم المرتبت، روشن خیال اور مصلح قوم (خواجہ غلام الثقلین) کے فرزند بلند اقبال اور خانوادہ مولانا حالی کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی ولادت ۱۹۰۴ء میں ہوئی تھی۔ گیارہ برس کی عمر تک اپنے والد اور نو دس برس کی عمر تک حالی کی تربیت میں رہے۔ کم سنی ہی میں انگریزی اور فارسی کے علاوہ عربی میں بھی اچھی خاصی استعداد رکھتے تھے جس زمانے میں خواجہ غلام الحسنین حیدرآباد میں ملازمت کرتے تھے تو سیدین صاحب نے انھیں عربی میں ایک طویل خط مورخہ ۸ مارچ ۱۹۱۵ء کو لکھا تھا۔ اس زمانے میں ان کا سن گیارہ برس سے کم تھا۔ جب ان کی عربی دانی کا حال علامہ شیخ عبدالعلی ہروی (متوفی ۱۹۲۳ء) سے اس وقت بیان کیا گیا جبکہ وہ دسمبر ۱۹۱۵ء میں خواجہ غلام الثقلین کی تعزیت کے لیے پانی پت گئے تھے تو موصوف اپنی تقریر میں بار بار سیدین صاحب سے مخاطب ہوتے تھے۔ انہوں نے فارسی میں فرمایا: اس بچے کو ابتدائی قواعد پڑھا دیے گئے ہیں اور عربی سمجھتا ہے اب اس کو صرف میں شیخ بہائی کی کتاب "تعدیل" اور نحو میں "صمدیہ" اور شرح صمدیہ اور بعد ازاں "انموذج" پڑھوانی چاہیئے۔ منطق میں رسالہ کبریٰ اور "تعدیل المیزان" کے نیے عمدہ رسائل بھی پڑھوائے جائیں۔ ان کتابوں کی خصوصیت یہ ہے کہ باوجود مختصر ہونے کے کامل ہیں۔

سیدین صاحب طالب علمی کے زمانے میں بڑے ذہین تھے۔ میٹرک حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت سے اعزاز و امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ میٹرک کے بعد علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ ایف۔ اے اور بی۔ اے کے امتحانات فرسٹ ڈویژن میں کئے۔ اور یونیورسٹی بھر میں اول آگئے۔ اپنے والد کی طرح یونیورسٹی کے تمام طلباء میں بہترین مقرر سمجھے جاتے تھے۔ جو کیمرج میڈل طالب علمی کے زمانے میں خواجہ غلام الثقلین نے حاصل کیا تھا وہی میڈل آپ نے بھی حاصل کیا تھا۔ وہ علی گڑھ میگزین کے بھی ایڈیٹر رہ چکے تھے۔

علی گڑھ میں سیدین صاحب کی طالب علمی بڑی درخشاں رہی۔ ایف اے اور بی۔ اے کے زمانے میں یونیورسٹی کے بہترین طالب علم کو جونیر اسکالرشپ اور سینیر اسکالرشپ کا اعزاز ملتا تھا۔ یہ دونوں اعزاز ایک دوسرے کے بعد انہیں ملے۔ یونیورسٹی کے ماہوار رسالہ کا نام بھی انھوں نے ہی پہلی مرتبہ "علی گڑھ میگزین" رکھا تھا جو آج تک اسی نام سے جاری ہے۔ اس کے وہ ایڈیٹر بھی تھے وہ انگریزی اور اردو کے بہترین مقرر تھے اور علی گڑھ ڈبیٹنگ سوسائٹی کے سکریٹری اس وقت مقرر کئے گئے تھے جبکہ وہ سکنڈ ایر میں پڑھتے تھے اس زمانے کا خاص انعام جو جونیر اسپیکنگ پرائز JUNIOR SPEAKING PRIZE

جھلاتا تھا ان کو دیا گیا تھا۔ اس کے بعد جب فورتھ ایر میں آئے تو علی گڑھ کا سب سے قابل قدر تقریری انعام جس کا نام "ہیرلڈ کیکس اور کیمبرج اسپیکنگ پرائز" ہے اور جو مدتوں پہلے خواجہ غلام الثقلین اور خواجہ سجاد حسین (نانا) کو مل چکا تھا وہی پرائز سیدین صاحب کو بھی ملا۔ ان کے لیے یہ بات قابل فخر تھی کہ ایک ہی اعزازی بورڈ پر ان کا نام درج تھا [8]

سیدین صاحب نے ۱۹۲۳ء میں حکومت ہند سے وظیفہ حاصل کرکے لیڈز یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ وہاں ڈپلوما اِن ایجوکیشن کا امتحان امتیاز سے پاس کیا۔ یونیورسٹی کے دوران قیام وہ کئی مرتبہ یونیورسٹی کے نمائندہ بنا کر دوسری یونیورسٹیوں میں بھیجے گئے۔ یونیورسٹی یونین پارلیمنٹ کے وزیر اعظم اور انٹرنیشنل سوسائٹی کے صدر کے فرائض موصوف نے انجام دیئے۔ متعدد اہم مباحثوں اور علمی انجمنوں میں حصہ لیا۔ ان کی تقریریں اور بحثیں دو سال تک انگلستان بلکہ دنیا کے سب سے مشہور اخبار "ٹائمز" میں شائع ہوتی رہیں [9]

۱۹۲۵ء میں سیدین صاحب ایم۔ ایڈ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ واپس آگئے۔ ان کی آمد پر بشیر احمد صدیقی جو علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر تھے لکھتے ہیں۔

"ہمارے مفتخر قوم خواجہ غلام الثقلین صاحب کے مایہ ناز فرزند خواجہ غلام السیدین صاحب ہماری یونیورسٹی سے گریجویٹ ہوکر انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ تکمیل تعلیم کے بعد اپنے وطنِ معنوی علی گڑھ تشریف لائے ہیں۔ سیدین صاحب کی طالبعلمانہ زندگی ہر حیثیت سے قابلِ ستائش رہی ہے۔ وہ ہر امتحان میں اول رہے اور یہ "بدعت حسنہ" انھوں نے انگلستان میں بھی ملحوظ رکھی۔ یہاں وہ ہماری یونیورسٹی کے امتحان بی۔ اے میں تو اوّل رہے تھے۔ انگلستان میں بھی انہوں نے اس وقار کو قائم رکھا۔ سیدین صاحب ایک جادو بیان مقرر ہیں۔ ہمارے خوشی محمد ناظر کو کالج کا "لانگ فیلو" کہا جاتا تھا۔ اس سنت کی پابندی میں بعض لوگ سیدین صاحب کو "کالج کی سروجنی" کہتے ہیں بہرحال اس مسئلہ میں ہم فریق بننا نہیں چاہتے لیکن ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

سیدین صاحب ہمارے میگزین کے ایڈیٹر اور یونین کے وائس پریسیڈنٹ رہ چکے ہیں اور اب وہ تعلیمات کے ماہر خصوصی ہو کر آئے ہیں۔ ہماری دعا اور خواہش ہے کہ وہ ہم سے اب جدا بھی نہ رہیں۔ کیا یونیورسٹی کے اربابِ حل وعقد ہمارے تمناؤں کا پاس کریں گے" [10]

سیدین صاحب کے ایم۔ ایڈ کا نتیجہ ابھی نکلا ہی تھا کہ انھیں علی گڑھ کے وائس چانسلر آفتاب احمد خاں کا تار ملا کہ یونیورسٹی علی گڑھ ٹریننگ کالج کی پرنسپلی پیش کرتی ہے منظوری سے مطلع کریں۔ وہ سیدین صاحب کے والد خواجہ غلام الثقلین صاحب اور دوسرے بزرگوں سے بخوبی واقف تھے۔ لندن میں جب وہ سکریٹری آف اسٹیٹ کی کونسل کے ممبر تھے تو ان سے چند مرتبہ ملاقات ہوئی تھی اور ان کی خواہش تھی کہ یونیورسٹی کے لیے مناسب لوگوں کا انتخاب کیا جائے۔ یہ پیش کش سیدین صاحب کے لیے عزت افزائی کا باعث تھی کیونکہ انھوں نے اس لئے درخواست نہیں دی تھی۔ بہرحال یہ ذمہ داری انھوں نے قبول کی [11]

سیدین صاحب نے اپنے عہدے کا چارج ابھی نہیں سنبھالا تھا کہ انہیں اطلاع ملی تھی کہ علی گڑھ کالج کی پچاس سالہ جوبلی دسمبر ۱۹۲۵ء میں منائی جائے گی۔ جوبلی کی تقریبات میں ایک اہم مد یونین کی ڈبیٹ تھی۔ انھوں نے بحیثیت یونین کے سابق نائب صدر کے ایسی معرکہ آرا تقریر کی بحث کا آغاز کیا کہ بڑے بڑے لوگوں سے جن میں محمد علی جناح، سر آغا خاں اور سر علی امام موجود تھے اپنا لوہا منوالیا۔ ڈبیٹ کے جلسے میں سیدین صاحب کے چچازاد بھائی خواجہ احمد عباس بھی موجود تھے جنھوں نے چالیس سال بعد ایک مضمون میں اس کا ذکر کیا تھا جو انہوں نے سیدین کی ساٹھویں سالگرہ کی تہنیت کے طور پر جو کتاب شائع ہوئی تھی اس کے لیے لکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"میرے بچپن کا ایک یادگار واقعہ جس نے میرے مستقبل پر گہرا اثر ڈالا وہ بحث ہے جو ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر ہوئی تھی۔ یہ کالج اب یونیورسٹی بن چکا ہے۔ اس موقع پر مسلمانوں کے تقریباً تمام نامور لیڈر وہاں موجود تھے۔ سیدین اس وقت اعلیٰ تعلیمی کامیابی حاصل کرکے انگلستان سے لوٹے تھے۔ ان کو اس موقع پر یہ اعزاز دیا گیا کہ وہ یونین میں اس بحث کا افتتاح کریں۔ اس لیے انہوں نے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کیا تھا جو اب چالیس سال بعد بھی مسلمانوں کے لئے ایسی اہمیت رکھتا ہے جس قدر اس

وقت انہوں نے شروع میں ایک مختصر مگر مدلل تقریر کی۔ اس کے بعد تقریروں کا ایک سیلاب شروع ہوا جس میں مسلمانوں کے اس وقت کے بڑے بڑے لیڈر شریک تھے۔ محمد علی جناح، آغا خاں، سر علی امام وغیرہ جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ گویا ایک پہلوان تھا۔ انھوں نے زوردار تقریریں کیں۔ اور نوجوان مقرر کی دلیلوں کو سرپرستانہ انداز میں یہ کہکر مسترد کر دیا کہ یہ نوجوانی کی عیب پسندی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ سیدین اس وقت ایک کونے میں بیٹھے ہوئے تیزی کے ساتھ نوٹ لے رہے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے بزرگوں کی وزنی اور باوقار آوازوں سے کافی مرعوب ہیں۔ پھر وہ وقت آیا جب وہ بحث کا جواب دینے کے لیے کھڑے ہوئے۔ میں اس وقت اتنا کم عمر تھا کہ ان کی دلیلوں کا پورا مطلب تو نہیں سمجھ سکا لیکن ایک گیارہ سالہ طالب علم بھی یہ محسوس کر سکتا تھا کہ ان کی فصاحت اور زور بیان میں کس قدر خلوص اور جذبہ بھرا ہوا ہے۔ اس تقریر کی چوٹ غالباً میرے تحت الشعور پر بہت کاری لگی کیونکہ اس کے بعد کبھی فرقہ پرستوں کے جذباتی دلائل نے مجھے متاثر نہیں کیا۔ اگر زندگی کا سیکولر اور انسانیت دوستی کا نظریہ میرے عقیدے کا ایک اٹل جزو رہا ہے تو اس کی ذمہ داری سب سے پہلے اس تقریر پر ہے اور اس کے بعد چند سالوں پر جو میں نے بعد میں اپنی اسکول اور کالج کی تعلیم کے دوران میں سیدین کی نگرانی میں بسر کئے۔ شاید انہیں کے اثر سے میرا علمی تجسس بیدار ہوا۔ اور میں نے ادب، ڈراما اور آرٹ میں دلچسپی لینی شروع کی۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہاں تو بحث کا انجام یہ ہوا کہ اپنے دلائل کی مضبوطی اور زور بیان کی ترغیب سے ان کے تمام مخالفین کو شکست ہوئی اور مجمع نے بہت بڑی اکثریت سے سیدین کی رائے سے اتفاق کیا۔"

جوبلی ڈبیٹ کی اس پر مغز تقریر سے سیدین صاحب کی بڑی شہرت ہوئی۔ الغرض انھوں نے علی گڑھ ٹریننگ کالج میں ریڈر کی حیثیت سے فروری سنہ ۱۹۲۶ء میں کام کرنا شروع کیا۔ اور اصول تعلیم و طریق تعلیم کا درس دینے لگے سنہ ۱۹۳۰ء میں ٹریننگ کالج کے پرنسپل ہوئے۔ اسی سال انھوں نے اردو کے مشہور و معروف شاعر اور محقق محمد یحیٰی تنہا (مصنف سیر المصنفین) کی تقرری کے لیے ایک سفارشی خط جناب سید مسعود حسن رضوی صاحب کو لکھا تھا۔ چونکہ یہ خط سیدین صاحب کا بہت ہی پرانا اور غیر مطبوعہ ہے اور ان کے اخلاق و کردار پر روشنی ڈالتا ہے اس لئے ذیل میں من و عن درج کیا جاتا ہے۔

ٹریننگ کالج (بحروف انگریزی)	کے۔ جی۔ سیدین۔ (بحروف انگریزی)
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	بی۔ اے۔ (علیگ) ایم۔ ایڈ (لیڈز)
تاریخ ۸ ار ستمبر سنہ ۱۹۴[illegible]ء	پرنسپل

حبیب محترم۔ تسلیم

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ کچھ عرصہ ہوا معلوم ہوا تھا کہ آپ لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر ہو گئے ہیں۔ بہت خوشی ہوئی تھی لیکن خط لکھنے کی توفیق نہ ہوئی۔ یہ کہنے کی بمشکل ہی ضرورت ہے کہ یونیورسٹی نے آپ کی قدر شناسی کر کے اپنے حسن مذاق اور انصاف کا ثبوت دیا ہے کیونکہ اس سے بہتر انتخاب ممکن نہ تھا معلوم نہیں ہماری یونیورسٹی کا شعبۂ اردو کب اپنی کس مپرسی سے نکل سکے گا۔

میں اسوقت یہ خط اس غرض سے لکھ رہا ہوں کہ آپ کی اجازت سے آپ کو محمد یحیٰی تنہا کی طرف متوجہ کر دوں۔ میں بالعموم سفارش کرنے سے پرہیز کرتا ہوں لیکن اگر میرا خیال ہو کہ اس سے کسی عمدہ انتخاب میں مدد ملے گی تو اس سے دریغ نہیں کرتا تنہا صاحب کے نام اور کام سے آپ واقف ہوں گے۔ میں ان کو سالہا سال سے جانتا ہوں۔ اس زمانے سے جب میری عمر بہت چھوٹی تھی۔ اور وہ والد مرحوم کے ہمراہ رہا کرتے تھے انہوں نے باوجود ناموافق حالات کے محض اپنے شوق اور شغف ادبی کی وجہ سے جو کام اردو ادب کی خدمت کے لیے کیا ہے۔ وہ ہمت افزائی کا مستحق ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ غیر معمولی طور پر BRILLIANT آدمی تھا۔ لیکن ایسا آدمی جو اس صنعت کے ساتھ ساتھ تیشار کر کام کرنے کی صلاحیت دکھاتا ہو۔ آپ کو اپنے ہاں کی کچھ ذیب کے لیے شاید نہیں مل سکتا

اس لیے میں بہت زور کے ساتھ آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ان کے CLAIMS پر ہمدردی کے ساتھ غور کریں اور اگر ممکن ہو تو کمیٹی میں ان کی سفارش کریں۔ وہ نہایت نیک نفس، بے شر اور شریف آدمی ہیں اور بحیثیت ایک شریک کار کے آپ ان کو بہت مفید اور دلچسپ پائیں گے اور وہ ہمیشہ آپ کے مشورہ کے مطابق کام کریں گے۔

امید ہے کہ میری یہ "سفارش" آپ کو گراں نہ گزرے گی" [۱۳]

زیادہ نیاز

خاکسار، غلام السیدین

سیدین صاحب، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ٹریننگ کالج میں ۱۲ سال تک رہے ۱۹۳۸ء میں ریاست جموں کشمیر میں وزیر اعظم سر گوپالا سوامی آئنگر کا دور دورہ تھا۔ وہ ایک مضبوط اور بیدار مغز منتظم تھے۔ انہیں یہ خیال ہوا کہ ریاست میں بھی یہ تعلیمی تجربہ کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو بلایا اور انہیں یہ دعوت دی کہ وہ ریاست کی تعلیمی ڈائریکٹری قبول کریں انہوں نے جواب دیا کہ میں تو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کام کو نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن اگر آپ واقعی اپنی ریاست میں بنیادی تعلیم کا کام کرنا چاہتے ہیں تو غلام السیدین کو بلائیں۔ کچھ عرصے کے بعد وزیر اعظم موصوف نے سیدین صاحب کو تار کے ذریعہ بلایا کشمیر آنے سے پہلے وہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے ملے۔ انھوں نے صورت حال سے آگاہ کیا اور کہا کہ میں نے ذاکر حسین صاحب سے مشورہ کرکے آپ کا نام تجویز کیا [۱۴]۔ قصہ مختصر یہ کہ سیدین صاحب اسی سال یعنی ۱۹۳۸ء میں جموں کشمیر کے ناظم تعلیمات مقرر ہوئے۔ انھوں نے آتے ہی یہاں کے معیار تعلیم کو بلند کرنے کی کوشش کی۔ وردھا اسکیم، بیسک اور تعلیم بالغان کی اسکیمیں مرتب کرکے جاری کیں۔ ان دنوں یہاں مسلمان کثرت کے باوجود تعلیمی میدان میں بہت پیچھے تھے۔ سیدین صاحب نے انہیں تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ مدرسوں کا جال بچھایا۔ غریب اور لاچار طلباء کے لیے وظیفے مقرر کیے۔ مدرسوں اور کالجوں میں آبادی کے تناسب اور قابلیت کی بنیاد پر مسلمان اساتذہ کی حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ یہ اقدامات کشمیری پنڈتوں کو پسند نہیں آئے۔ اور وہ پریس میں ان کی نکتہ چینی کے درپے ہوئے۔ ان کے خلاف ریاست اور بیرون ریاست کے

اخبارات میں مراسلات چھپنے لگے۔ کشمیری پنڈتوں کا ترجمان اخبار "مارتنڈ" تھا مہاراجہ کشمیر سری ہری سنگھ اور شری آئنگر سیدین صاحب کی کارکردگی سے بخوبی مطمئن تھے۔ اسلئے وہ مارتنڈ میں ان کے خلاف چھپی ہوئی خبروں کو پسندیدگی کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے۔ انہوں نے اخبار کے پہلے صفحے کی کالم پر جو اس کی پیشانی پر سیدین کے خلاف روز چھپتا تھا سنسر کی پابندی عائد کی تھی سنسر کے بعد اخبار کے اس کالم پر × کا نشان پڑا رہتا تھا۔ اس کے ساتھ یہ لکھا ہوتا تھا۔

"ڈائرکٹر ایجوکیشن اور ہم

خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری"

اس سلسلے میں سیدین صاحب لکھتے ہیں کہ:

"جب میں کشمیر گیا تو اس وقت کی ملازمت میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور ان کا مطالبہ تھا کہ اس کو بڑھایا جائے یہ مطالبہ جائز تھا لیکن اس کو جلدی میں پورا کرنا بہت مشکل تھا۔ علاوہ اور دقتوں کے ایک دقت یہ تھی کہ اس وقت مسلمانوں میں اعلیٰ قابلیت کے امیدواروں کی تعداد کم تھی۔ اور ان کے مقابلے میں کشمیری پنڈت امیدواروں کی کثرت تھی۔ میں نہ مسلمانوں کے مطالبات کو مسترد کرنا چاہتا تھا نہ میری یہ خواہش تھی کہ تعلیمی مفاد کو ملازمتوں کی محض فرقہ وارانہ تقسیم کے اصولوں پر قربان کر دوں۔ میرا کہنا تھا کہ ایک نا قابل استاد طلبہ کی نسلوں کی نسلوں کو خراب کر سکتا ہے اور یہ بہتر ہے کہ ایک مسلمان طالب علم اچھے ہندو استاد سے یا ہندو طالب علم اچھے مسلمان استاد سے پڑھے بجائے اس کے دونوں نالائق استادوں سے تعلیم پائیں لیکن جن لوگوں کو محض فرقہ وارانہ نیابت درکار تھی وہ اس حقیقت کی طرف توجہ نہ کرتے تھے۔ وہ محض ترازو میں تول کر اپنا حصہ مانگتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک وقت ایسا آیا جب بعض مسلمان محکمہ تعلیم کی پالیسی سے اس وجہ سے خفا ہوگئے کہ ڈائرکٹر ان کو کافی اسامیاں نہیں دیتا۔ اور بعض ہندو اس وجہ سے کہ اب تک ان کی محکمہ میں جو اجارہ داری تھی وہ ٹوٹ گئی چنانچہ دونوں جماعت کے انتہا پسند اخباروں میں میرے خلاف مضامین نکلنے لگے اور جیسا کہ فرقہ وارانہ ذہنیت کا دستور ہوتا ہے ایک

طرف یہ الزام تھا کہ ڈائرکٹر نے ہندو حکومت کو خوش کرنے
کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا ہے اور دوسری طرف یہ کہ چونکہ
ڈائرکٹر مسلمان ہے اسلئے مسلمانوں کے ساتھ بے جا رعایت کرتا
ہے ؎

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
(کیونکہ) میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند[۱۵]

سیدین صاحب نے اپنے قیام کشمیر کے دوران میں وزیر اعظم آئینگر کے علاوہ سر کیلاش ناتھ ہکسر، مہاراج سنگھ اور پھر ان کے بعد سر بی. این راؤ کی وزارت عظمیٰ کا زمانہ دیکھا۔ اخبار "مارتنڈ" کی مخالفت کے باوجود ۱۹۴۵ء میں جب سیدین صاحب کی مدت کا ساتواں سال ختم ہونے کو آیا تو سر بی. این راؤ نے ان کے انکار کے باوجود انہیں مزید تین سال کی توسیع کے احکامات جاری کئے۔ اگر ۱۹۴۵ء کے بعد راؤ صاحب کشمیر میں رہتے تو سیدین صاحب بھی ضرور رہتے راؤ کے بعد پنڈت رام چند کاک وزیر اعظم ہوئے تھے۔ سیدین صاحب کو یقین تھا کہ وہ کاک صاحب کے وقت میں بغیر پارٹی بازی میں گرفتار ہوئے کوئی مفید تعلیمی کام کر سکیں اس لیے واپس چلے گئے۔

حکومت کشمیر کے علاوہ جن لوگوں نے سیدین صاحب کی تعلیمی پالیسی کو سراہا تھا ان میں پنڈت نہرو، مولانا آزاد، سر تیج بہادر سپرو، سر عبدالقادر، سر بی. این راؤ، مسٹر شو اراؤ، سر عزیز الحق، میاں بشیر احمد، سر جان سارجنٹ ڈاکٹر ذاکر حسین اور بعض مسلم لیگ کے ممتاز قائدین شامل تھے۔ ان سب لوگوں نے سیدین صاحب کی کارکردگی جموں و کشمیر میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔

سیدین صاحب ہر اس آدمی سے خوش رہتے تھے۔ جو اپنے فرائض ایمانداری اور نیک نیتی سے انجام دیتا تھا۔ اس میں چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہیں تھی اس کی ادنیٰ مثال ایک چپراسی کی ہے جو ان کے ساتھ رہتا تھا اس کا نام سنت رام تھا۔ جموں کے تھے اور بڑے قد آور تھے۔ وہ ہمیشہ ڈائرکٹروں کے ساتھ ہی مخصوص کئے جاتے تھے۔ میں نے انہیں برسوں دیکھا تھا۔ ڈسپلن کے بڑے پابند تھے۔ سیدین صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ ان سے بڑے پیار اور محبت سے پیش آتی تھیں۔ جب ۱۹۴۵ء میں سیدین صاحب کشمیر سے جانے لگے اس وقت سرکاری دفاتر جموں میں منتقل ہو چکے تھے۔ یہاں ایک عالیشان الوداعی تقریب ان کے اعزاز میں ہوئی تھی۔ موصوف نے اپنی جوابی تقریر سنت رام کی فرض شناسی پر ختم کی۔ فرماتے ہیں۔

"میں آپ کو بتاؤں کہ ریاست میں کس شخص نے مجھے اپنی فرض شناسی اور دیانتداری سے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے (اور یہ کہکر میں ذرا ٹھہرا اور میرا خیال ہے کہ میں نے حاضرین میں سے بعض اعلیٰ افسروں کے چہرے پر اس توقع کے اعتراف کے آثار دیکھے) تو وہ جمعدار سنت رام ہے۔ جو آپ سب کے پیچھے آخری قطار میں کھڑا ہے۔ اس پر ایک سناٹا سا ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس شخص نے سات سال تک میری منصبی اور ذاتی حیثیت میں ایسی خدمت کی تھی کہ میں اس کا پورا شکریہ نہیں ادا کر سکتا۔ میری بیوی اس کی ایسی قدر کرتی تھیں کہ کشمیر سے واپسی کے بعد بھی کئی سال تک اپنے ہاتھ سے اونی پل اوور بن کر اسکو بھیجتی رہیں[۱۶]"

سیدین صاحب چاپلوسی، خوشامد اور جی حضوری کے خلاف تھے۔ انہوں نے کشمیری اساتذہ کو عزت نفس کا احساس دلایا تھا۔ مگر جو قوم صدیوں سے غلامانہ طرز عمل اور پست ذہنیت کا شکار ہو چکی تھی وہ دو چار سال میں کیسے بدل سکتی تھی۔ پھر بھی انھوں نے اساتذہ کا وقار بڑھایا۔

سیدین صاحب کشمیر میں سات سال تک رہے تھے۔ اس دوران انھوں نے ریاست میں ایک صاف ستھرا تعلیمی نظام قائم کیا تھا۔ اپنے زمانۂ قیام میں موصوف نے یہاں کی ادبی، سماجی اور ثقافتی زندگی میں ایک نئی روح ڈالی تھی ان کی صدارت میں مذہبی جلسے ہوتے تھے۔ ان میں اسلامیہ ہائی اسکول سری نگر میں سیرت کے جلسے۔ اور زڈی بل علی پارک میں مولود کعبہ حضرت علی کے یوم ولادت کی تقریبات قابل ذکر ہیں۔ ان میں سر شیخ عبدالقادر، چودھری خوشی محمد ناظر اور ڈاکٹر تاثیر وغیرہ بھی تقریریں کرتے تھے۔ مذہبی تقریبات کے علاوہ سیدین صاحب مشاعروں میں بھی صدارت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اردو کے مشہور شاعر اور صحافی محمد الدین فوق (متوفی ۱۹۴۵ء) لکھتے ہیں کہ۔

"ستمبر ۱۹۴۳ء کی شب کو نمائش گاہ سری نگر میں ایک مشاعرہ سیدین صاحب کی صدارت میں ہوا۔ انہی ایام میں نیشنل کانفرنس کے کچھ رہنما بھی گرفتار کئے گئے تھے۔ مشاعرے کی طرح یہ تھی۔

ع. وہ چھپلے جھنگ کے دامن مرے دستِ ناتواں سے

سیدین صاحب کی تعلیم بالغان کے فروغ کے لیے فوق کا یہ شعر کافی ہے ؎

گر یوں ہی ہمدردِ تعلیم رہا ہے غلام السیدین
فوق بھی فوق بھی تو فائق بھی فوقستاں بھی تو

فوق نے یہ نظم اخبار "رہبر" جموں کے تعلیم بالغان کے لئے لاہور میں ۱۵ شعر میں لکھی تھی۔ اسی زمانے میں اسلامیہ ہائی اسکول سری نگر کے وسیع احاطے میں لیسرڈیک (صفائی کا ہفتہ) کے سلسلے میں ایک یادگار تقریب سیدین صاحب کی صدارت میں ہوئی تھی۔ اس میں اچھے اچھے شاعروں نے اپنا کلام سنایا تھا۔ ان میں اسلامیہ ہائی اسکول زڈی بل سری نگر کے ہیڈ ماسٹر نواب سجاد علی خاں اور مولوی محمد حسین پرنسپل ٹریننگ اسکول سری نگر نے بھی اپنا کلام سنایا تھا۔ ان کے شعر اس زمانے میں بچوں کی نوکِ زبان پر تھے مجھے بھی ڈیڑھ شعر اب تک یاد رہے ہے ؎

بغیر اپنی کمائی کے گذارا ہو نہیں سکتا
اگر فرزند ناکارہ نکما ہے اپاہج ہے وہ بیٹا ہے مگر آنکھوں کا تارہ ہو نہیں سکتا

کشمیر میں سیدین صاحب کے مخلص دوستوں میں آغا سید علی ہمدانی تحصیلدار تھے۔ ان کی تحریک پر سیدین صاحب کو بڈگام کے پس ماندہ علاقے سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ بڈگام میں لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے ہائی اسکول کھولنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں آغا صاحب بڈگام کو اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کیا وہ کئی مرتبہ بڈگام تشریف لے گئے لیکن آغا صاحب نے جو مروجہ تعلیم کے خلاف تھے سیدین صاحب کے ساتھ تعاون نہیں کیا جس کے باعث وہ ہمیشہ ملول رہے۔ جب وہ دسمبر ۱۹۷۱ء میں بسترِ علالت پر تھے اور کشمیر سرکار کی طرف سے آغا سید علی ہمدانی کے فرزندِ ارجمند اور ہمارے مخلص دوست جناب آغا سید السلطان حسین ہمدانی ان کی عیادت کو گئے تو اس وقت بھی سیدین صاحب نے ان سے بڈگام کی تعلیمی پس ماندگی کے بارے میں دریافت کیا۔ یہ وقت تھا جبکہ ڈاکٹروں نے سیدین صاحب کو بات چیت کرنے کی ممانعت کی تھی اور لوگوں سے ملنے پر پابندی لگائی تھی۔ کشمیر سے جانے کے بعد سیدین صاحب دو برس رامپور میں مشیرِ تعلیم رہے۔ یہاں سے بمبئی گئے اور تین سال تک وہاں مشیرِ تعلیم کی خدمات انجام دیتے رہے ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک حکومتِ ہند میں متعدد تعلیمات میں جوائنٹ سکریٹری اور سکریٹری کے عہدوں پر فائز رہے۔ یہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد حکومتِ کشمیر نے دوبارہ ۱۹۶۱ء میں ان کی خدمات مشیرِ تعلیم کی حیثیت سے حاصل کیں۔ اس مرتبہ یہاں وہ صرف ایک سال رہے۔ پہلے جب آئے تھے تو وزیرِ اعظم سر آئینگر تھے اور وزیرِ تعلیم سید عبدالصمد اور ان کے بعد نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی تھے۔ اب کی بخشی غلام محمد وزیرِ اعظم اور میر غلام محمد راجپوری وزیرِ تعلیم تھے۔ یہ حضرات سیدین صاحب کی قدر و قیمت کیا جانتے۔ اس لیے انھوں نے زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور ۱۹۶۲ء میں واپس چلے گئے۔ اس مختصر سے قیام کے دوران مجھے ان سے اکثر ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ انھوں نے یہیں سے پہلے ۲ ستمبر ۱۹۶۱ء کو میری کتاب "میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر" پر تبصرہ لکھا تھا۔ کتاب کی ترتیب انہیں بہت پسند آئی تھی چنانچہ لکھتے ہیں۔

"میں نے یہ تحقیقی مقالہ جستہ جستہ بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ واقعی یہ اردو تنقیدی ادب میں ایک سود مند اور گراں قدر اضافہ ہے جس محنت اور سلیقے سے آپ نے اسے ترتیب دیا وہ یقیناً لائق صد آفرین ہے۔ آج تک انیس پر ایسا سیر حاصل مقالہ دیکھنے میں نہیں آیا ہے۔"[۹]

کشمیر میں میری آخری ملاقات سیدین صاحب سے جولائی ۱۹۷۱ء میں ہوئی تھی۔ ان کی صحت اچھی نہیں تھی اس لیے تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے یہاں آئے تھے۔ کشمیر کی سبکدوشی کے بعد وہ امریکہ کی کئی یونیورسٹیوں میں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے درس و تدریس دیتے رہے۔ اس کے بعد دہلی میں یونسکو کے مشترک ادارے کے ڈائرکٹر رہے علاوہ ازیں کئی ملکوں میں جانے اور رہنے کا موقع ملا۔ ان میں سفرِ عراق، سوڈان اور کولمبیا قابلِ ذکر ہیں۔ آخر کار اس شریف النفس اور انسان دوست شخصیت کا انتقال ۱۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہوا۔ جہلم کی مجلس بر صغیر کے سب سے بڑے عالمِ دین اور مجتہد مولانا سید علی نقی نے پڑھی تھی۔

سیدین صاحب اوائل زندگی سے ہی کئی اداروں سے وابستہ تھے اور ان کی مدد بھی کرتے تھے ۱۹۱۲ء میں جنگِ طرابلس کے مجروحین کے لیے چندے کی مہم جاری کی گئی تھی۔ اخبار "وکیل" امرتسر کی ۱۵ ارجون ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں چندہ دہندگان کی فہرست شائع ہوئی تھی اس میں خواجہ غلام الثقلین خواجہ غلام السیدین اور مشتاق فاطمہ (والدہ سیدین) کے نام بھی درج ہیں۔ اس زمانے میں سیدین کی عمر ۸ سال کی تھی۔ انجمن وظیفۂ سادات، اسلامیہ ہائی اسکول سری نگر، اسلامیہ

ان اسکول ... شیعہ یتیم خانہ لکھنؤ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور دوسرے اداروں کے ممبر بھی تھے اور ان کی مدد بھی فرماتے تھے۔ انہوں نے ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو ایک خط جناب مسعود حسن رضوی پروفیسر شعبۂ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے نام لکھا تھا۔ دونوں شیعہ کالج لکھنؤ کے ممبر تھے۔ سیدین صاحب نے خط میں لکھا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین اور سید اسداللہ کاظمی انسپکٹر مدارس الٰہ آباد کو بھی میٹنگ میں شریک کرنا چاہیئے۔ یہ میٹنگ شیعہ کالج لکھنؤ کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ سیدین صاحب کو راجہ صاحب محمود آباد نے بھی میٹنگ کے لیے تار دیا تھا۔ سیدین صاحب کا یہ خط راقم الحروف کی تحویل میں ہے۔ سیدین صاحب کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ انہوں نے زیادہ تر تعلیم پر کتابیں لکھی ہیں اور وہ بھی زیادہ تر انگریزی میں۔ ان کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔ اردو میں کسی مستقل ادبی موضوع پر ان کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ اردو میں یہ کتابیں ہیں۔

(۱) روح تہذیب ۱۹۴۳ء، (۲) شہیدان وفا کا خون بہا کیا ۱۹۴۳ء (۳) علی گڑھ تحریک ۱۹۴۵ء، (۴) قومی سیرت کی تشکیل ۱۹۳۸ء، (۵) اصول تعلیم ۱۹۴۹ء (۶) آندھی میں چراغ ۱۹۶۲ء، (۷) ذہن انسانی کا سفر ارتقا، (۸) زمان، زندگی اور تعلیم ۱۹۶۸ء (۹) داستان اشک و خون ۱۹۶۲ء (۱۰) مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں" مرتبہ صالحہ عابد حسین ۱۹۷۳ء۔

انیس، حالی اور اقبال ان کے محبوب شاعر تھے۔ ان تینوں پر ان کے بہت سے مضامین مختلف رسائل اور کتابوں میں چھپ چکے ہیں۔ انیس کے مرثیے وہ ایام عزا میں صحت الفاظ پڑھا کرتے تھے۔ بستیر کے جلسوں میں مسدس حالی سے بھی کام لیتے تھے۔

جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم "انیس صدی" کی تقریبات پر میر انیس پر ایک کتاب شائع کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے سیدین صاحب کو بھی مضمون لکھنے کے لیے کہا تھا۔ ۸ جنوری ۱۹۷۱ء کے خط میں سیدین صاحب مسعود حسن رضوی کو لکھتے ہیں۔

مکرمی۔ تسلیم نیاز۔

گرامی نامہ مورخہ ۱۸ دسمبر وصول ہوا۔ تعمیل ارشاد کی کوشش کروں گا۔ لیکن یقین نہیں کہ کامیاب ہوں گا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر آپ نے اب تک نہیں لکھا تو آپ بیگم صالحہ عابد حسین کو اس کتاب کے لیے ایک مضمون لکھنے کی دعوت دیں۔ انھوں نے انیس کے بارے میں کافی کام اور مطالعہ کیا ہے۔ خدا کرے کہ آپ کی کوششیں انیس صدی کی تقریبات کے بارے میں کامیاب ہوں۔ یہ آپ کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ اور اس کی نمایاں شان تکمیل ثابت ہوگی۔

مخلص غلام السیدین

سیدین اور اقبال۔

اقبال کو سیدین کے بزرگوں سے بڑی عقیدت تھی۔ ان کے پرنانا مولانا الطاف حسین حالی کے مداحوں میں تھے۔ اپریل ۱۹۰۴ء میں حالی انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں شریک ہوئے تھے۔ ضعف اور پیری کے سبب خود نظم نہ پڑھ سکتے تھے۔ اگر پڑھتے بھی تو مجمع زیادہ تھا اور حالی کی آواز زیادہ دور تک نہ پہنچ سکتی۔ اقبال بھی اسٹیج پر موجود تھے ان سے درخواست کی گئی کہ وہ نظم پڑھکر سنائیں۔ اقبال نے نظم سنانے سے پہلے حالی کی مدح میں ذیل کی رباعی پڑھی۔

مشہور زمانے میں ہے نام حالی معمور مئے حق سے ہے جام حالی
میں کشور شعر کا نبی ہوں گویا نازل ہے مرے لب پہ کلام حالی[۱]

پانی پت میں ۱۹۳۵ء میں حالی کے جشن صد سالہ کی تقریبات دھوم دھام سے منانے کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ حالی کے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین[۲] نے اقبال کو بھی مدعو کیا تھا۔ اقبال ۲ ستمبر ۱۹۳۵ء کو بھوپال سے سید نذیر نیازی کو لکھتے ہیں۔

"مولانا حالی کی سنٹینری (صد سالہ سالگرہ) اکتوبر کے آخر میں ہوگی۔ ان پر ایک مضمون آپ کے پہلے نمبر میں ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔ یا دوسرے نمبر میں۔ بشرطیکہ یہ دوسرا نمبر اکتوبر کے وسط سے پہلے نکل جائے تاکہ آپ کا رسالہ سنٹینری کے موقع پر تقسیم ہو سکے۔ سنٹینری پانی پت میں ہوگی۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال صدر ہونگے۔ میں بھی پانی پت اس موقع پر پہنچ جاؤں گا۔ میں انشاءاللہ ۲۸ اگست کی شام کو یہاں سے روانہ ہو کر ۲۹ کی صبح کو دہلی پہنچوں گا" (روح مکاتیب اقبال ۵۱)

اقبال ۲؍ستمبر ۱۹۳۵ء کو سید نذیر نیازی کو ایک اور خط میں مطلع کرتے ہیں۔

"مولانا حالی کی سالگرہ کی تاریخ ۲۶-۲۷؍اکتوبر مقرر ہوئی میں غالباً ۲۵ یا ۲۶ اکتوبر کو وہاں پہنچ جاؤں گا۔ اگر ممکن ہو تو خود وہاں پہنچ جائیں۔ میں آپ کو سر راس مسعود سے بھی انٹروڈیوس کراؤں گا"[۲۵]

اقبال خواجہ سجاد حسین کو پانی پت پہنچنے کی تاریخ سے آگاہ کرتے ہیں۔ چنانچہ لاہور سے ۱۲؍ستمبر ۱۹۳۵ء کے خط میں ان کو لکھتے ہیں۔

"مخدوم و مکرم جناب خواجہ صاحب السلام علیکم و رحمۃ اللہ
آپ کا والا نامہ مل گیا ہے۔ اگر میری صحت اچھی رہی تو میں انشاءاللہ ۲۴ یا ۲۵؍اکتوبر کو حاضر ہوں گا۔ مسعود کا خط آپ کے ساتھ ہی ملا وہ لکھتے ہیں ۲۵ یا ۲۶ کو پانی پت پہنچ جاؤں۔ بہرحال انشاءاللہ ضرور حاضر ہوں گا میرے ساتھ لاہور کے ایک دو احباب بھی غالباً اس مبارک تقریب میں حاضر ہونے کا قصد رکھتے ہیں۔ چند اشعار فارسی میں نے لکھے ہیں۔ جو اعلیٰ حضرت (نواب بھوپال) کی تشریف آوری کے موقع پر جلسے کے آغاز سے پہلے پڑھ دیئے جائیں تو خوب رہے گا۔ کاش میں خود پڑھ سکتا۔ گلے کی خرابی سے یہ بات ممکن نہیں۔ آپ انہیں کسی ایسے نوجوان کو یاد کرا دیں جو فارسی درست پڑھ سکتا ہو۔ اور خوش الحان ہو۔ اشعار جب آپ کا ارشاد ہو گا۔ ارسال خدمت کر دوں گا"[۲۶]

مخلص محمد اقبال

اقبال ۸؍ستمبر ۱۹۳۵ء کو سر راس مسعود کے نام لکھتے ہیں۔

"انشاءاللہ ۲۴ یا ۲۵؍اکتوبر کو پانی پت پہنچوں گا۔ جو چند اشعار فارسی کے لکھے تھے وہ میں نے خواجہ سجاد حسین صاحب کی خدمت میں ان کی درخواست پر بھیج دیئے ہیں"[۲۷]

منشی دیا نرائن نگم جشن صد سالہ حالی کے سلسلے میں خود بھی پانی پت میں موجود تھے۔ وہ اپنے مضمون "مولانا حالی مرحوم کی صد سالہ سالگرہ کا جشن" میں رقمطراز ہیں۔

"جشن حالی کی صدارت کے لیے نواب حمید اللہ خان والیٔ بھوپال منتخب ہوئے۔ اقبال ۲۴؍اکتوبر کو پانی پت پہنچے تھے۔ ۲۶؍اکتوبر ۹ بج کر ۵ منٹ پر نواب صاحب اسٹیشن پر پہنچے۔ اقبال اور دوسرے لوگوں نے ان کا استقبال کیا۔ نواب صاحب کے صدر نشین ہونے کے بعد حسب اعلان خواجہ غلام السیدین صاحب نے کلام پاک کی تلاوت فرمائی۔ نواب صاحب کی خدمت میں ایڈریس پیش کرنے کے بعد ماسٹر فیض احمد صاحب ٹیچر حالی اسکول نے اقبال کے مندرجہ ذیل خیر مقدمی اشعار سنائے

مزاج ناقہ را مانند عرفی نیک می بینم — چو محمل را گراں بینم حدی را تیز تر خوانم
حمید اللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو — ز الطاف تو موج لالہ خیزد از خیابانم
طوافِ مرقد حالی سزد ارباب معنی را — نوائے او بجانہا افگند شورے کہ من دانم

بیا تا فقر و شاہی در حضور او بہم سازم
تو بر خاکش گہر افشان و من برگ گل افشانم

لنچ کے بعد خواجہ غلام السیدین نے معززین کے پیغامات پڑھ کر سنائے اور نواب صاحب کے ہاتھوں چند تمغے تقسیم کرائے"[۲۸]

منشی صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ:۔

"مسدس حالی اور مقدمہ شعر و شاعری نے شعرا کے سامنے ایک نیا اور وسیع میدان کھول دیا اور اس سے جو عظیم انقلاب ہندوستانی شاعری میں پیدا ہو گیا۔ اس کا نتیجہ اب ہمارے سامنے ہے اور جس کی مثال میں دور حاضر کے سب سے بڑے فلسفی شاعر اقبال کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔"[۲۹]

جشن حالی کے سلسلے میں ایک اہم کام یہ بھی تھا کہ مولانا حالی کی کل تصانیف صحت اور سلیقے کے ساتھ چھپوا کر شائع کی جائیں۔ اور ادب کے اس خاص رنگ کو جو مولانا کی نظم و نثر میں جھلکتا ہے ملک میں رواج دیا جائے مسدس حالی صدی ایڈیشن اس سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔ اس کام کیلئے دہلی میں حالی پبلشنگ ہاؤس قائم کیا گیا تھا۔ سیدین صاحب کے چھوٹے بھائی خواجہ اظہر عباس (متوفی ۱۹۸۲ء) اس کے منیجنگ ڈائریکٹر تھے۔ اظہر صاحب نے بڑی محنت اور سلیقے سے مسدس حالی کا صدی ایڈیشن ۱۳/۱۹ سینٹی میٹر میں ۱۷۰ صفحات میں ۱۹۳۵ء میں شائع کیا۔ طباعت، کاغذ اور گیٹ اپ بہت ہی عمدہ اور خوبصورت ہے۔ اس میں مولوی عبدالحق، سر راس مسعود، مولوی حبیب الرحمٰن شروانی اور مولوی عبدالماجد دریابادی کی نگارشات کے

علاوہ سید سلیمان ندوی، خواجہ غلام السیدین اور ڈاکٹر عابد حسین کے مقدمات شامل ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کے "عرض مرتب" کے بعد "تقریبات" کے تحت "عکس خط سرسید مرحوم" ہے جو انھوں نے ۱۰ جون ۱۸۷۹ء کو شملہ پارک ہوٹل سے حالی کو لکھا تھا اور جس میں مسدس کی تعریف کی گئی تھی پھر عکس قطعہ دستخطی علامہ اقبال بالقابہ" کے تحت یہ شعر ہیں۔

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید بیفسرد   سید دگرا دردانے از ابر سحر داد
حالی ز نواہائے جگر سوز نیاسود   تا نالۂ شبنم زدہ را داغِ جگر داد[۳۱]

قطعہ کے نیچے اقبال کے دستخط اور ۲۴ جون ۱۹۳۵ء کی تاریخ درج ہے۔
جب مسدس حالی کا یہ ایڈیشن چھپ کر خواجہ اظہر عباس نے اقبال کی خدمت میں بھیجا تو انھیں بہت پسند آیا چنانچہ ۸ نومبر ۱۹۳۵ء کے خط میں ان کو لکھتے ہیں

ڈیر مسٹر اظہر عباس:-

آپ کا خط مل گیا۔ اس سے پہلے بھی ایک خط موصول ہوا تھا۔ مگر افسوس کہ میں علالت کی وجہ سے خطوط کا جواب لکھنے میں بہت سست ہو گیا ہوں۔

مسدس حالی نہایت عمدہ چھپی ہے۔ اس کے متعدد دیباچے نہایت مفید ہیں میں نے کئی سالوں کے بعد اسے کل اور پرسوں دوبارہ پڑھا اور نیا لطف اٹھایا۔ امید ہے کہ آپ مرحوم کا باقی کلام بھی اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی اور نفیس جلدوں میں شائع کر سکیں گے"[۳۲] محمد اقبال۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ:-

"خدا لگتی بات یہ ہے کہ مسدس اپنا کام مدت ہوئی کر چکا۔ احساس کی بیداری جو اس کا مقصد تھا اس میں وہ مدتیں گزریں۔ کامیاب ہو چکا۔ اکبر اور پھر اقبال جیسے سعید جانشین پیدا کر چکا"[۳۳]۔

مولانا حالی نے سب سے پہلے اس وقت اقبال کی حمایت کی تھی جبکہ حسرت موہانی اقبال کی زبان پر نکتہ چینی کی بوچھار کر رہے تھے۔ حالی نے روزنامہ "پیسہ اخبار" لاہور کے جاری ہونے پر تار کے ذریعہ جو پیغام "محبوب عالم" (متوفی ۱۹۳۳ء) کو نومبر ۱۹۰۲ء میں بھیجا تھا اس میں لکھتے ہیں۔

"جو لوگ پنجاب اردو پر نکتہ چینی کرتے ہیں انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ اردو زبان ان کے ہاتھوں سے نکل کر پنجاب میں جا رہی ہے۔ اگر یہی سلسلہ مدت تک جاری رہا تو جس طرح عربی زبان عرب سے نکل کر مصر اور شام میں چلی گئی ہے بعینہٖ وہ وقت دور نہیں ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے بجائے لاہور اردو کا گھر ہو جائے گا اور اس طرح ہمیشہ کے لیے اس بحث کا فیصلہ ہو جائیگا"[۳۴]

حسرت موہانی لکھتے ہیں کہ اس تار کے ذریعے حالی نے اقبال کی غلط تاویلوں کو صحیح قرار دیا تھا[۳۵] حسرت کے "تنقید اقبال" کے جواب میں جنوری ۱۹۰۲ء کے "عصر جدید" کے شمارے میں اقبال کی حمایت میں ایک مضمون خواجہ غلام الثقلین نے شائع کیا تھا۔ اس کے بارے میں حسرت موہانی لکھتے ہیں:

"تنقید ہمدرد کے جواب میں ایک اقبال کا مضمون تھا یا منشی ارشاد نبی قریشی کا مضمون عصر جدید میں شائع ہوا۔ اس مضمون کے لچر اور مہمل محض ہونے کے بارے میں ہمیں یقین کامل ہے کہ اقبال وانبالوی صاحب کو (جن کی تائید میں مضمون لکھا گیا ہے) بھی شک نہ ہو گا"[۳۶]۔

سیدین صاحب کے چچا خواجہ غلام الحسنین[۳۷] نے ۱۹۰۳ء میں ہربرٹ اسپنسر کی انگریزی کتاب "ایجوکیشن" کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ جب یہ کتاب اقبال کی نظر سے گزری تو انہوں نے خواجہ صاحب کو ایک خط میں لکھا۔

"آپ کے ترجمے کی بے تکلف روانی بالکل حیرت انگیز ہے۔ اگر ہربرٹ ہندوستانی ہوتا تو وہ بھی (اردو میں) اس سے بہتر طرز اختیار نہ کر سکتا" (انوار اقبال ص۲ بشیر احمد ڈار)

سیدین صاحب کی چھوٹی بہن صالحہ بیگم، ڈاکٹر عابد حسین ص[۳۸] سے منسوب تھیں اقبال کی راہ و رسم ڈاکٹر صاحب سے بھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب رسالہ "جامعہ" دہلی کے ایڈیٹر تھے۔ وہ کلام اقبال سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے کئی مضامین شائع کئے ہیں جن میں "عقل و عشق اقبال کی شاعری میں" (مطبوعہ "جوہر" شمارہ خصوصی بیادگار علامہ اقبال صفحہ ۳۰۶) اور "اقبال کا تصور خودی" (مضامین عابد) بہت ہی اہم ہیں۔ رسالہ "جامعہ" جلد ۳۰ بابت ماہ اپریل ۱۹۳۳ء نمبر ۴ صفحہ ۲۸۲ (مشمولہ جرائد ندوہ لکھنؤ، ۳) میں اقبال سے متعلق عبارت ذیل درج ہے۔

"علامہ اقبال جامعہ سے ہمیشہ ہمدردی فرماتے رہے چنانچہ

۱۹۳۶ء میں جامعہ کی امداد کے لیے قوم سے جو اپیل کی گئی اس پر صرف پانچ چھ بزرگوں کے دستخط تھے جن میں علامہ موصوف بھی شامل تھے مگر ہم لوگوں کی بد قسمتی سے آپ کو ابھی تک جامعہ میں تشریف لانے کا موقع نہیں ملا۔ پچھلے مہینے کے آغاز میں ایک دن چائے کی دعوت میں تشریف لائے اور اس کے بعد لاہور سے زحمت سفر اٹھا کر خاص اس غرض سے دلی آئے کہ ردفلے صاحب کے دو لکچر میں صدارت فرمادیں اور چونکہ تیسرے لکچر کے صدر ڈاکٹر سپرو تشریف نہیں لاسکے۔ اس لیے اس میں بھی آپ ہی نے مسند صدارت کو زینت بخشی اسی زمانے میں جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ کی التجا پر آپ نے وعدہ فرمایا کہ تھوڑے ہی دن کے بعد پھر تشریف لاکر اہل جامعہ کو اپنی تقریر سے مستفید فرمائیں گے۔ ۵ اپریل وہ مبارک تاریخ تھی جب آپ نے اس وعدہ کا ایفا کیا۔ ۵ بجے شام کو آپ نے جامعہ کی انجمن اتحاد کا سپاسنامہ قبول فرمایا اور اس کے جواب میں محبت و شفقت کے جو کلمے ارشاد کئے وہ ہم لوگوں کے دل سے کبھی محو نہ ہونگے اس کے بعد ۸½ بجے شب کو آپ نے اپنے سفر یورپ کے حالات پر تقریر فرمائی جس کا عنوان آپ نے لندن سے غرناطہ تک قرار دیا تھا۔ اس کے سب سے دلچسپ حصے دو تھے ایک جس میں آپ نے فرانس کے مایہ ناز فلسفی برگساں سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا۔ دوسرا وہ جس میں آپ نے جدید اسپین کے حالات بیان فرمائے خصوصاً اس رجحان پر روشنی ڈالی جو وہاں کے باشندوں کو آجکل اسلامی تمدن کی طرف ہے آپ کے خیال میں جو لوگ تہذیب اور معارف اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے اسپین میں جا کر رہنا ناگزیر ہے اور انھیں وہاں کی حکومت اور وہاں کے ارباب علم سے ہر طرح کی مدد ملے گی۔"

ڈاکٹر عابد حسین نے جامعہ جلد ۲ نمبر ۵ بابت مئی ۱۹۳۳ء میں اقبال کی ایک نظم "الہام اقبال" شائع کی تھی۔ مطلع یہ ہے ؎

دیکھ چکا المنی شورش اصلاح دیں   جس نے نہ چھوڑے کہیں نقش کہن کے نشاں

جامعہ جلد ۹ نمبر ۲ بابت فروری ۱۹۳۸ء میں ص ۷۱ سے ص ۸۰ تک اسلم جیراجپوری کا مضمون "یوم اقبال" چھپا ہے۔ یوم اقبال لاہور میں ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو دی انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ" کی طرف سے منعقد ہوا تھا۔ اس تقریب میں عابد علی عابد، حفیظ جالندھری، صوفی تبسم، علامہ عبداللہ یوسف علی، حکیم شہنواز اور خواجہ غلام السیدین صاحب وغیرہ تھے۔ سیدین صاحب نے اقبال کے فکر و فن پر انگریزی میں مقالہ پڑھا تھا۔ اس کی صدارت سر شیخ عبدالقادر نے کی تھی۔

"جامعہ" جلد ۹ نمبر ۶ بابت جون ۱۹۳۸ء ص ۵۲۳ تا ص ۵۲۹ میں ڈاکٹر محمد مجیب کا ایک معرکہ آرا مضمون "ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم" چھپا ہے۔ اس میں اقبال کی تصانیف پر عالمانہ بحثیں کی گئی ہیں۔ اسی شمارہ میں ڈاکٹر عابد حسین نے قطعۂ تاریخ وفات علامہ اقبال مرحوم کے عنوان سے کہی ہے ؎

لطف مجلس کیا رہا جب میر مجلس اٹھ گیا   وائے ناکامی کہ بزم اہل دل برہم ہے آج

تھا جہاں کل نعرۂ مستانہ کا جوش و خروش   ہے وہاں آہ مسلسل نالۂ پیہم ہے آج

سینۂ مسلم کہ تھا گنجینۂ شوق و امید   ہے وفور یاس اس میں اور ہجوم غم ہے آج

فکر کی جب سال رحلت کی تو دل نے یہ کہا

ملت اسلام میں اقبال کا ماتم ہے آج

۱۳۵۷ ہجری   (جامعہ ص ۶۰۵ جون ۳۸ء)

علامہ اقبال، ڈاکٹر عابد حسین سے انگریزی خطبات کا ترجمہ اردو میں کروانا چاہتے تھے۔ اس کا ذکر اقبال نے اپنے ایک خط مورخہ ۴ اپریل ۱۹۳۸ء میں کیا ہے۔ یہ خط موصوف نے سید نذیر نیازی کو لکھا تھا۔[۳]

سیدین صاحب بھی "جامعہ" میں لکھتے تھے۔ ان کے کئی مضامین اقبال پر جامعہ میں چھپ چکے ہیں۔ راقم کی نظر سے "اقبال کا ابلیس" مطبوعہ مئی ۱۹۴۷ء اور "اقبال کی انسان دوستی" مطبوعہ اپریل ۱۹۶۱ء گزرے ہیں۔

سیدین صاحب علامہ اقبال کے پرستاروں میں تھے۔ انھوں نے گہری نظر سے اقبال کا مطالعہ کیا تھا اور انہیں قریب سے بھی دیکھا تھا۔ دونوں میں مراسلت بھی تھی۔ انھوں نے اقبال پر ایک مستقل کتاب انگریزی میں IQBAL'S EDUCATIONAL PHILOSOPHY (اقبال کا فلسفۂ تعلیم) لکھی تھی جو لیو یل دانش سے عرفات پبلیکیشنز کے اہتمام سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ اب تک پاکستان میں اس کے آٹھ دس سے زیادہ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ سیدین صاحب

اقبال کے فکر و فن کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اقبال کی شاعری سے مجھے طالب علمی کے زمانے ہی میں کافی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت ان کے کلام کا صرف ایک مجموعہ شائع ہوا تھا یعنی بانگ درا۔ میں اس کی نظموں کو بہت ذوق و شوق سے پڑھتا تھا اور ان کے خیالات اور جذبات کی چوٹ براہ راست میرے دل پر پڑتی تھی اس عرصے میں ان کے کچھ اور مجموعے اردو اور فارسی کے شائع ہوئے۔ اور مجھے جوان سے عقیدت تھی اور ان کی فکر کا جو مجھ پر اثر تھا وہ بڑھتا گیا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ انہوں نے اپنے خاص نقطۂ نظر سے شاعری میں جن فلسفیانہ اور اخلاقی اور عالمانہ خیالات اور اعلیٰ جذبات کا اظہار کیا ہے ان کی بہت تعلیمی اہمیت ہے اور میں نے جن نئے تعلیمی افکار اور تحریکوں کا مطالعہ کیا۔ وہ بعض لحاظ سے ان کے خیالات سے بہت قریب ہیں۔ چنانچہ میں نے پہلے ایک ذرا طویل مضمون لکھا اور اس میں ان کے بعض بنیادی خیالات سے بحث کی اور اسے اپنی یونیورسٹی (علی گڑھ) کے ایک جلسے میں پڑھا اور بعض دوسری یونیورسٹیوں میں بھی ان کا خاصا استقبال کیا گیا۔ اس عرصے میں ڈاکٹر اقبال سے میری ملاقات ہو گئی تھی اور میرا جب کبھی لاہور جانا ہوتا یا وہ دہلی آتے تو میں کوشش کر کے ان سے ملتا اور ان کی شخصیت، ان کی فکر و نظر، ان کی ظرافت، ان کی ہمہ گیر انسانیت، ان کی رواداری اور وسیع المشربی مجھے مسحور کرتی۔ جب ان کی مشہور تصنیف "فکر اسلامی کی تنظیم جدید" کے نام سے شائع ہوئی (جس کی بدولت مجھے مذہب اور سائنس اور فلسفہ کے تعلق اور اسلام کی معنویت ہوئی) تو یونیورسٹی نے انہیں بلایا۔ انھوں نے دو لیکچر علی گڑھ میں دیئے ان کے نام کی کشش سے لوگ تو کافی تعداد میں لیکچروں میں شریک ہوئے لیکن میرا خیال ہے ان میں، ان کی اہمیت کو سمجھنے والے کم تھے۔ اس موقع پر مجھے ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا جو ہمیشہ میرے لئے باعث افتخار رہے گا۔ میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ان کے فکر اور شاعری کی جو اہمیت تعلیمی نقطۂ نظر سے ہے اس پر ایک کتاب لکھوں چنانچہ رفتہ رفتہ یہ کتاب "اقبال کا فلسفۂ تعلیم" مکمل ہو گئی۔ میری بڑی آرزو تھی کہ وہ خود اس کتاب کو ایک نظر دیکھ لیں لیکن معلوم ہوا کہ وہ اس زمانے میں بیمار ہو چکے تھے۔ جب میں آخری بار ان سے ملنے گیا تو میں نے کتاب کا ذکر کیا۔ کہنے لگے میں تو بہت شوق سے پڑھتا لیکن ڈاکٹروں کی اجازت نہیں۔ میں نے کہا اگر میں اس کا خلاصہ چند صفحوں کا لکھ کر بھیج دوں تو آپ اس پر ایک نظر ڈال سکیں گے؟ انھوں نے بخوشی وعدہ کیا اور جب میں نے وہ خلاصہ ان کو بھیجا تو انھوں نے اس کے جواب میں ایک خط لکھا جس سے میری بڑی ہمت افزائی ہوئی"۔[۳۹]

سیدین صاحب اقبال کو روح اسلام کے مفسر سمجھتے تھے۔ ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

"حقیقت یہ ہے کہ روح اسلام کی سب سے بہتر تفسیر میں نے علامہ کی شاعری اور تصانیف میں پائی۔ بحیثیت شاعر کے میں ان کی بہت قدر کرتا ہوں اور بعض اعتبار سے انہیں اردو زبان کا سب سے بڑا شاعر سمجھتا ہوں۔ میں ان کی ذہانت اور قوت فکر کا بہت قائل ہوں مغربی تہذیب کی جو جامع تنقید انھوں نے کی ہے اس کا میری نظر میں بہت بلند علمی مرتبہ ہے مگر ان کی شاعری کا ایک اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اس نے اسلام کا ایک زندہ تصور میرے سامنے پیش کیا اور مجھے اس حقیقت سے روشناس کیا کہ مذہب گوشہ گیری یا محض ریاضت و عبادت کا نام نہیں بلکہ وہ بعض بنیادی اصولوں کے ماتحت زندگی کی تنظیم کی تعلیم دیتا ہے اور اس کے بے اندازہ امکانات کو ظہور میں لانے کے لئے جد و جہد کرنا سکھاتا ہے۔ یہ اشعار دیکھئے۔

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہب مُلّا و جمادات و نباتات

ایک جگہ فرماتے ہیں:

اے مرد خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

سکینی و محکومی و نومیدی جاوید جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد
کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد
سر راس مسعود ۳۲ء سے ۳۶ء تک بھوپال میں قیام پذیر تھے۔ اقبال اور
سیدین بھی اس دوران وہاں جاتے رہے۔ سیدین کی موجودگی میں اقبال نے
ریاض منزل" اور بھوپال میں متعدد نظمیں تصنیف کیں۔ اس سلسلے میں سیدین صاحب
لکھتے ہیں:"

"بھوپال میں بھی چند روز ان کے ساتھ ٹھہرنے کا شرف
نصیب ہوا۔ میں عمر بھر اس میزبان عزیز کی مہمان نوازی کے
لطف اور خلوص و محبت کے سلوک کو نہ بھولوں گا۔ اس زمانے
میں ان کا اور لیڈی مسعود کا قیام ریاض منزل میں تھا۔ یہ وہ
مکان ہے جس کے دل کش پر فضا منظر اور ماحول نے اقبال کے
تغزل کو باوجود ان کی علالت کے از سر نو بیدار کر دیا تھا جہاں
انھوں نے یہ اشعار لکھے تھے۔

بہار و قافلۂ لالہ ہائے صحرائی شباب و مستی و ذوق و سرور و رعنائی
اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی یہ بحر یہ فلک نیلگوں کی پہنائی
سفر عروس قمر کا عماری شب میں طلوع مہر و سکوت سپہر مینائی
وہ ہو تو سامنے نظارہ کچھ بھی نہیں کہ بھتی نہیں فطرت جمال و زیبائی"
اس نظم کا عنوان "نگاہ" ہے اور ضرب کلیم میں شائع ہو چکی ہے۔

سیدین صاحب کو اقبال کی انسانیت دوستی بے حد پسند تھی۔ اور اس
جذبے کو انھوں نے اپنے کردار میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی کہتے ہیں۔

اقبال کے تصور انسانیت کی نقاب کشائی کے لیے مندرجہ ذیل
شعروں پر غور کیجئے جو مجھے بہت محبوب ہیں اور جن میں اس
نے بڑی سادگی اور صفائی سے "آدمیت" کا مطلب سمجھایا ہے
اس کے نزدیک آدمیت صرف ایک کسوٹی ہے آدمی کی عزت
کرنا ہر آدمی کی بلا لحاظ نسل و ملت۔ کیونکہ اس میں نور الٰہی
کا جلوہ ہے۔ خواہ کتنا ہی مدہم کیوں نہ ہو۔ جو عشق کا بندہ
ہوتا ہے وہ خدا کے راستے پر چلتا ہے اور کفر و دین کا فرق
بھلا کر کافر اور مومن کے لیے اپنے دل کے دروازے یکساں
طور پر کھول دیتا ہے۔

دین سراپا سوختن اندر طلب انتہایش عشق و آغازش ادب
حرف بد را بر لب آوردن خطا ست کافر و مومن ہمہ خلق خدا ست
آدمیت احترام آدمی باخبر شو از مقام آدمی
بندۂ عشق از خدا گیرد طریق می شود بر کافر و مومن شفیق
کفر و دیں را گیر در پہنائے دل دل اگر بگریزد از دل وائے دل

کفر و دین کے ضمن میں ایک دلچسپ نکتہ قابل ذکر ہے۔ عام طور پر لوگ یہ
سمجھتے ہیں کہ "مومن" سے مراد مسلمان اور "کافر" سے "غیر مسلم" اس غلط فہمی میں
غیر مسلم ہی نہیں بلکہ بہت سے مسلمان بھی شریک ہیں جن کی خوش فہمی ان کی
مذہبی بصیرت سے بڑھی ہوئی ہے۔ اقبال نے اس کے بارے میں ایک بڑے
پتے کی بات کہی ہے۔ اس کے نزدیک کافر اور مسلمان کا اصلی فرق رسمی عقائد
کا نہیں بلکہ دل و دماغ کی ساخت کا ہے۔ زندگی کے بنیادی تصورات اور
آدرش کا ہے۔ ان سہاروں کا ہے جن کے بل بوتے وہ زندگی کو بناتا اور بگاڑنا
چاہتا ہے۔ اقبال کی دنیا میں مسلمان کافر ہو سکتا ہے اور کافر مسلمان، فرق لیبل
کا نہیں بلکہ اس شراب کا ہے جو ان کے ساغر دل میں چھلکتی ہے۔

کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر ہے تو تابع تقدیر مسلماں مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

ایمان کی کسوٹی عشق ہے اور اس کی پہچان خدا سے لو لگانا اور اس کے بندوں
کی محبت اور خدمت کا دم بھرنا جس نے دل میں عشق کی شمع روشن کرنے کے
بجائے اس میں نفرت کے دھوئیں کو جگہ دی اور خدا کے سوا ماسوا سے امید
باندھی وہ مومن نہیں کافر ہے۔ چاہے وہ خود کو کسی نام سے پکارے ۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق
بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

اقبال، سیدین کی قدر کرتے تھے اور سیدین ان کے طرز فکر سے استفادہ
کرتے تھے۔ دونوں بزرگوں نے ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھا تھا۔
دونوں میں خط و کتابت بھی جاری تھی اقبال کے جو خطوط سیدین کے نام محفوظ
کر دیئے گئے ہیں وہ شیخ عطاء اللہ نے "اقبال نامہ" حصہ اول میں شائع کئے
ہیں۔ "اقبال نامہ" ہندوستان میں نایاب ہے اس لئے اس میں جو خطوط اقبال
کے سیدین کے نام (ص۳۱۳ تا ص۳۲۲) درج ہیں وہ ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں

(۱) ڈیر سیدین صاحب السلام علیکم

میرے دو بچوں کے لیے اتالیق کی ضرورت ہے جس پر میں ان کی اخلاقی اور دینی تربیت کے لئے اعتبار کر سکوں۔ تہذیب نسواں میں اشتہار دیا تھا جس کے جواب میں ایک خط علی گڑھ سے بھی آیا ہے۔ مہربانی کرکے اس خاتون کے متعلق حالات معلوم کرکے آگاہ کیجیے۔ چونکہ بچوں کی والدہ کا گزشتہ مئی میں دفعتاً انتقال ہو گیا۔ اس واسطے گھر کا تمام انتظام بھی اتالیق صاحبہ کے سپرد ہوگا ان کے فرائض مندرجہ ذیل ہوں گے۔

(۱) بچوں کی اخلاقی اور دینی تربیت اور نگاہ داشت۔ لڑکا ۱۱ سال کا ہے۔ اسکول جاتا ہے۔ لڑکی ۵ سال کی ہے۔

(۲) گھر کا انتظام اور نگہداشت۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ سب گھر کا چارج انہیں کو دیا جائے گا اور زنان خانے کے تمام اخراجات انہیں کے ہاتھ سے ہوں گے۔ مندرجہ ذیل باتیں ضروری ہیں۔ (۱) بیوہ اور بے اولاد ہو (۲) عمر میں کسی قدر مسن ہو تو بہتر ہے (۳) کسی شریف گھر کی ہو جو گردش زمانہ سے اس قسم کا کام کرنے پر مجبور ہو گئی ہو (۴) دینی اور اخلاقی تعلیم دے سکتی ہو۔ یعنی قرآن اور اردو پڑھا سکتی ہو۔ عربی اور فارسی بھی جانے اور بہتر ہے۔ (۵) سینا پرونا وغیرہ بھی جانتی ہو (۶) کھانا پکانا جانتی ہو۔ اس سے میری مراد یہ نہیں کہ اس سے باورچی کا کام لیا جائیگا۔

غرضیکہ آپ خود ماہر تعلیم ہیں اور میرے موجودہ حالات سے بھی باخبر۔ مندرجہ بالا امور کو ملحوظ رکھکر حالات دریافت کیجئے امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا اور آپ سے پانی پت میں ملاقات ہوگی

محمد اقبال ۸ اکتوبر ۱۹۳۵ء

(پس نوشت) جو خط علی گڑھ سے آیا ہے وہ اس خط میں ملفوف ہے۔

اس پر ان کا پتہ بھی لکھ دیا ہے۔

(۲) لاہور ۱۸ اپریل ۱۹۳۶ء

(۲) ڈیر سیدین صاحب السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے جس کے لئے بہت بہت شکریہ قبول کیجیے۔ میں خدا کے فضل سے بہ نسبت سابق بہت تندرست ہوں۔ آواز میں بھی نمایاں فرق ہے۔ اخباروں نے میری صحت کے متعلق غلط فہمی پھیلا دی تھی جس کی وجہ سے احباب کو تشویش لاحق ہوئی۔ بہرحال خدا کا شکر ہے۔

ضرب کلیم کے پروف دیکھ رہا ہوں امید ہے کہ مئی کے آخر تک کتاب چھپ جائیگی۔ تصویر ابھی تک نہیں بن سکی کیونکہ میں لاہور سے باہر رہا۔ آئندہ موسم میں انشاءاللہ بنواؤں گا۔ جاوید اچھا ہے۔ اپنی بیوی بچوں سے میری طرف سے دعا کہئے سر راس مسعود سے معلوم ہوا تھا کہ آپ کے بہنوئی دفعتاً انتقال فرما گئے۔ خدا انہیں غریق رحمت کرے۔ والسلام۔

محمد اقبال

(۳) لاہور ۲۱ جون ۱۹۳۶ء

مائی ڈیر سیدین

آپ کا نوازش نامہ ابھی ابھی موصول ہوا جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ آپ نے جو خلاصہ تیار کیا ہے نہایت ہی عمدہ ہے اور مجھے اس پر کسی اضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ "ضرب کلیم" امید ہے کہ جون کے آخر تک شائع ہو جائیگی اور میں آپ کو ایک نسخہ پیشگی بھیج سکوں گا۔ اس مجموعے میں ایک حصہ تعلیم و تربیت کے لیے وقف ہے۔ ممکن ہے آپ کو اس میں کوئی نئی بات نظر نہ آئے۔ تاہم اگر کتاب آپ کو بر وقت مل جائے تو محولہ بالا حصہ ضرور مطالعہ فرمائیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ LEIBNITZ MONADISM کے تعلیمی نتائج سے واقف ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ انسانی "موینڈ" زیادہ تر تاثر پذیر نوعیت کا حامل ہے۔ زمانہ ایک بڑی ہی برکت و نعمت ہے (لا تسبوا الدھر ان الدھر ھو اللہ) اگر ایک طرف موت اور تباہی لاتا ہے تو دوسری طرف وقت ہی آبادی و شادابی کا منبع ہے۔ یہی اشیاء کے پوشیدہ امکانات کو بروئے کار لاتا ہے حالات حاضرہ میں تغیر کا امکان ہی انسان کی سب سے بڑی دولت اور شکوہ ہے۔ (محمد اقبال)

پس نوشت۔ میری عام صحت بہت بہتر ہے آواز میں ترقی کی رفتار بہت سست ہے۔

(۴) لاہور، ۱۷ر اکتوبر ۱۹۳۶ء۔

ڈیر سیدین صاحب

آپ کا خط مل گیا۔ الحمد للہ خیریت ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ کی کتاب شائع ہو گئی ہوگی۔ بہر حال جب شائع ہو جائے تو اس کی ایک کاپی بھیج دیجیے گا۔ اب تو سردی کا موسم آگیا ہے ضرور کبھی لاہور آئیے گا۔ میں ابھی تک سفر کرنے سے ڈرتا ہوں ممکن ہے ایک ماہ کے بعد اس قابل ہو سکوں۔

سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت کے مذہب کے مخالف ہیں اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ بلفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں۔ مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا جس کی تشریح میں نے ان تحریروں میں جا بجا کی ہے اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی جو روحانیت میرے نزدیک مغضب ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔ والسلام۔

محمد اقبال۔

(۵) از لاہور ۳۱ر جولائی ۱۹۳۶ء۔

ڈیر خواجہ سیدین

مہربانی کر کے فوراً اطلاع دیجیے کہ آیا آپ اس وقت علی گڑھ میں ہیں یا علی گڑھ سے باہر۔ زیادہ کیا لکھوں سید راس مسعود مرحوم کے ناگہانی انتقال نے سخت پریشان کیا ہے

محمد اقبال

(۶) لاہور ۱۸ر ستمبر ۱۹۳۶ء۔

ڈیر سیدین صاحب

آپ کا خط ابھی ملا ہے جس کے لئے بہت بہت شکریہ قبول کیجیے۔ میری صحت پہلے سے اچھی ہے۔ آواز میں بھی کچھ فرق ہے۔ مگر افسوس کہ ضعف بصارت کی وجہ سے ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے سے منع کر دیا ہے۔ میری خط و کتابت احباب کرتے ہیں یا بھی جاوید میاں سے خطوط کے جواب لکھوا لیتا ہوں۔ اسلامی اصول فقہ کے متعلق ایک کتاب لکھنے کا ارادہ تھا۔ لیکن اب یہ امر موہوم معلوم ہوتی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں آپ کا مضمون نہ پڑھ سکوں گا۔ البتہ اگر آپ لاہور تشریف لائیں تو اس کے بعض مقامات مجھکو سنا سکتے ہیں۔ اسلامک کلچر کا مطبع بہت اچھا ہے۔ اس کے علاوہ لاہور میں ایک اور بھی انگریزی مطبع ہے۔ جہاں کی چھپائی بہت اچھی ہے۔ اگر رسالہ بہت طویل نہیں ہے تو اسلامک کلچر میں بھی چھپ سکتا ہے۔ اس کے متعلق آپ ایڈیٹر۔ ا۔ کلچر ماڈل ٹاؤن لاہور سے خط و کتابت کریں۔

مسٹر نکلسن کا ترجمہ غلط ہے۔ مصرع میں لفظ "نے" ہے جس کا انگریزی ترجمہ "REED" ہے۔ میں نے ان کی توجہ اس غلطی کی طرف دلائی تھی۔ مگر معلوم نہیں کہ ان سے کس طرح نظر انداز ہو گئی۔ ایک جگہ اور بھی ترجمے میں اغلاط ہیں۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ عابد صاحب سے سلام کہیے۔

محمد اقبال

(۷) لاہور ۲۵ ستمبر ۱۹۳۶ء۔

ڈیر سیدین صاحب

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ جس کے لیے شکریہ قبول کیجیے۔ میں نے مسعود مرحوم کے کتبۂ مزار کے لیے ایک رباعی رباعیات میں انتخاب کر کے مرحوم کے سکریٹری ممنون حسن خاں کو بھوپال بھیجی تھی۔ معلوم نہیں کہ انھوں نے اب تک علی گڑھ کیوں نہیں بھیجی۔ یہ رباعی حقیقت میں میں نے اپنے کتبۂ مزار کے لیے لکھی تھی۔ میں ابھی ممنون حسن خاں کو ایک خط لکھ کر

کو انتقال کیا۔ خواجہ صاحب کے کئی مضامین "عصر جدید" میں راقم کی نظر سے گزرے ہیں۔ اردو میں شعر بھی کہتے تھے۔ ایک غزل ۱۲ اشعار میں "مخزن" لاہور بابت نومبر ۱۹۰۳ء تا ۵۵ میں ایڈیٹر شیخ عبدالقادر کے اس نوٹ سے چھپی تھی: "اگست کے مخزن میں جو غزل مولانا حالی مدظلہ کی حضرت داغ کی ایک مشہور غزل کی طرح پر شائع ہوئی تھی اسے دیکھ کر ان کے شاگرد رشید چودھری خوشی محمد صاحب بی۔ اے اور ان کے نواسے خواجہ غلام الحسنین صاحب انسپکٹر مدارس گلبرگہ نے بھی اسی طرح طبع آزمائی کی ہے جس کا نتیجہ یہ غزلیں ہیں جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں" خواجہ غلام الحسنین کی غزل (چند شعر یہ ہیں)

کیوں پوچھتا ہے حالِ دلِ اس بدنصیب کا — ہٹ جا خدا کے واسطے ناصح قریب سے
دنیا کے مخمصوں نے وطن کو چھڑا دیا — ہے چرخ سے گلہ نہ ہے شکوہ نصیب سے
بندش غلط، ردیف غلط، قافیہ غلط — اس کے سوا بھی نہ سنا کچھ ادیب سے
کافی ہے ان کا خط بھی تسلی کے واسطے — ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

۳۸ روح مکاتیب اقبال ص ۲۹۷، ۲۹۸ ۳۹ مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں ص ۱۰۶ تا ۱۰۸ ۴۰ مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص ۱۲۶ مرتبہ محمد عمران خان مطبوعہ دارالعلوم ندوہ لکھنؤ ۱۹۳۶ء ۴۱ آندھی میں چراغ ص ۱۳۲ ۴۲ آندھی اور چراغ ص ۱۳۶ تا ص ۱۳۷، ۴۳ مراد جاوید اور ان کی بہن منیرہ ۴۴ تہذیب نسواں لاہور کا مشہور و معروف اخبار تھا جو خواتین کی تعلیم و ترقی کا ترجمان تھا۔ اس کی ایڈیٹر اردو کے مشہور ڈرامہ نگار اور صحافی امتیاز علی تاج کی بڑی بہن محمدی بیگم تھیں۔ وہ مولوی امتیاز علی کی صاحبزادی تھیں۔ محمدی بیگم ناول نگار بھی تھیں۔ ان کا ابتدائی ناول صفیہ بیگم ہے جس کا تفصیلی اشتہار مخزن لاہور جلد ۴ نمبر ۳ ص ۲۹ بابت دسمبر ۱۹۰۲ء میں چھپا تھا۔ ۴۵ راس مسعود کے نام اقبال کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک جرمن خاتون تھی جس کی تعریف پروفیسر رشید احمد صدیقی اور دوسرے لوگوں نے کی تھی (روح مکاتیب اقبال ص ۴۲۹) ۴۶ والدہ جاوید اقبال کا انتقال ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو ہوا تھا۔ لاہور کے مشہور قبرستان بیبیاں پاک دامان میں ایک بلند ٹیلے پر دفن کی گئی تھیں۔ سنگ مزار پر اقبال کا یہ قطعۂ تاریخ درج ہے۔

راہی سوئے فردوس ہوئی مادرِ جاوید — لالے کا خیاباں ہے مرا سینۂ پر داغ
ہے موت سے مومن کی نگہ روشن و بیدار — اقبال نے تاریخ کہی "ہمسرِ ما زاغ"
۱۳۵۴

(باقیات اقبال ص ۴۹۵)

۴۷ ان کا نام سید محمد مستحسن زیدی تھا۔ میرٹھ کے ایک مشہور بیرسٹر تھے۔ ان کے والد کا نام محمد حسنین شوق تھا۔ زیدی صاحب فرشتہ صفت انسان تھے پیشے میں کامیاب، نیک نام، شریف وضع دار، خوش مذاق، شعر و شاعری سے دل چسپی، کنیہ پرور، فیاض، باغبانی اور شکار کے شوقین ۱۹۳۲ء میں انتقال کیا۔ ۴۸ سیدین کی اس کتاب کا خلاصہ جو انھوں نے اقبال پر لکھی تھی یعنی "اقبال کا فلسفۂ تعلیم" ۴۹ اس مثنوی کا نام "پس چہ باید کرد....." ۵۰ سید راس مسعود ۱۸۸۹ء میں علی گڑھ میں پیدا ہوئے ۱۹۰۶ء میں میٹرک کیا اور سرکاری وظیفے پر اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے اور نیو کالج آکسفورڈ سے ۱۹۱۱ء میں بی۔ اے آنرز کی ڈگری حاصل کی ۱۹۱۲ء میں پٹنہ ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔ ضمیر نے یہ پیشہ گوارا نہیں کیا ۱۹۱۵ء میں گورنمنٹ کالج کٹک میں تاریخ کے پروفیسر ہوئے ۱۹۱۶ء میں نظام حیدرآباد کے ناظم تعلیمات ہوئے ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۴ء تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۷ء تک بھوپال کے وزیر تعلیم تھے۔ آپ سرسید کے پوتے اور سید محمود کے صاحبزادے تھے۔ راس مسعود، اقبال اور سیدین کے بے تکلف دوستوں میں تھے۔ ان کا انتقال ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء کو علی گڑھ میں ہوا۔ اقبال نے اپنے کتبۂ مزار کے لیے ایک رباعی کہی تھی۔ لیکن ان سے پہلے ہی اچانک سر راس مسعود کا انتقال ہو گیا تو اقبال نے وہی رباعی ان کے کتبۂ مزار کے لیے مخصوص کی۔ رباعی یہ ہے ؎

نہ پیوستم دریں بستان سرا دل — ز بندِ این و آں آزادہ رفتم
چو بادِ صبح گردیدم دمے چند — گلاں را رنگ و آبے دادہ رفتم

اقبال نے مرحوم کے سکریٹری ممنون حسن خان کو یہ رباعی بھیجی تھی۔ خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر صرف ایک ہی مطلع ان کے سنگ مزار پر لکھنا ہو تو مندرجہ ذیل شعر میرے خیال میں بہتر ہوگا

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں — خواب را مرگِ سبک داں مرگ را خوابِ گراں" (اقبال نامہ ص ۴۹۲ حصہ اول)

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی شری حیات وارثی کی کتاب اجالوں کے سفیر دیکھتے ہوئے۔ تصویر میں
اترپردیش کے وزیر قومی یکجہتی ڈاکٹر عمار رضوی اور شری حیات وارثی بھی نظر آرہے ہیں۔

گورنر اترپردیش شری سی۔ پی۔ این سنگھ ۱۸ جنوری ۸۴ء کو راج بھون، لکھنؤ میں رام پور رضا لائبریری
کے سالانہ جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے۔

مرکزی وزیر صنعت شری نرائن دت تیواری ۱۶ر جنوری کو گدرپور (نینی تال) میں کسان امداد باہمی شکر مل کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے

وزیر اعلیٰ شری سری پت مشرا ۱۰ر دسمبر ۸۳ء کو لکھنؤ میں وکیلوں کی ریاستی کانگریس کے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے۔
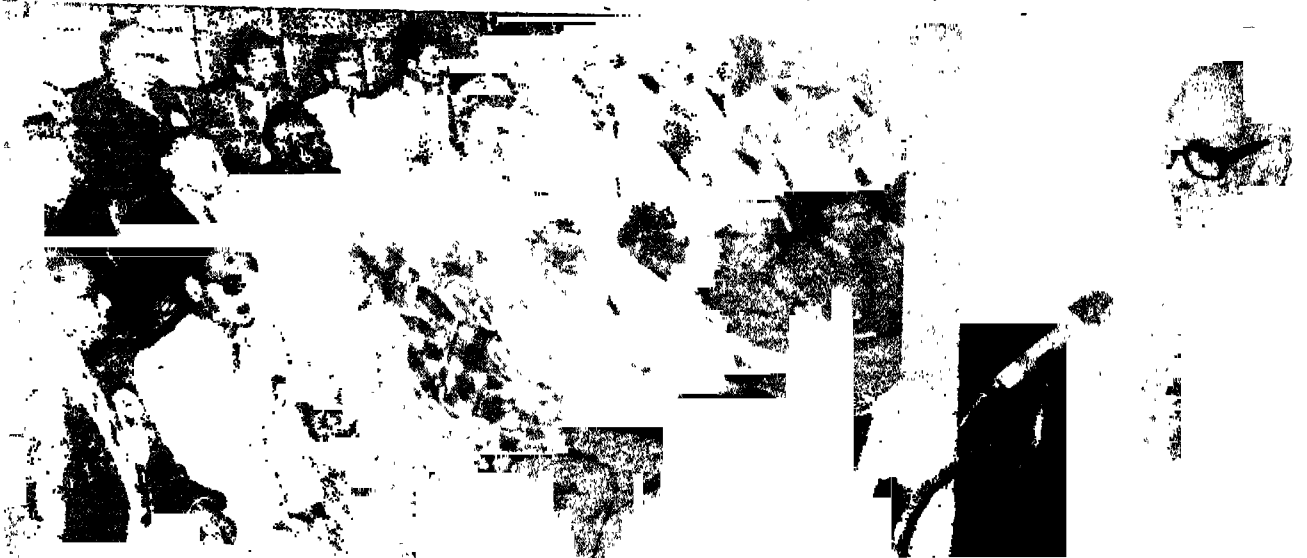
مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات شری ہری کشن لال بھگت وزیر اعلیٰ شری سری پت مشرا سے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس لکھنؤ میں ۴ دسمبر ۱۹۸۳ کو ریاست میں ٹیلی ویژن سنٹروں کی توسیع کے سلسلے میں تبادلۂ خیال کرتے ہوئے۔ تصویر میں سکریٹری اطلاعات شری یوگیندر نرائن اور ڈائرکٹر اطلاعات شری جی پی شکلا بھی نظر آ رہے ہیں۔

وزیر سیل شری عبدالرحمان نشتر ضلع جبل فیض آباد میں مجاہدین آزادی کی یاد میں تعمیر شدہ ستون دیکھتے ہوئے۔ اس یادگاری ستون پر مجاہدین آزادی کے نام کندہ ہیں۔

بزم ثاقب کے زیر اہتمام ۲ر جنوری ۲۰۰۴ کو لکھنؤ میں منعقدہ یوم ثاقب کے موقع پر شری علی جواد زیدی (مائک پر) اظہار خیال کرتے ہوئے

نیچے : شری اشوک درما اور انجنا بنرجی غزل سرا ہیں ۔ (تصویر : بشکریہ نیر زیدی)

حاضرین کا ایک منظر :

(تصویر : بشکریہ نیر زیدی)

۵۱۔ "اقبال کا فلسفۂ تعلیم" ۵۲۔ مصرعہ "صورتِ طفلاں ز نے مرکب کنی" ۵۳۔ مراد ڈاکٹر عابد حسین۔
۵۴۔ مسعود نمبر اردو سہ ماہی جلد ۱۳ حصہ ۶۸ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ رسالے کی ابتدا میں "ڈاکٹر سر محمد اقبال مدظلہ کی نظم" (مسعود مرحوم)، تین حصوں میں ۱۲ اشعار پر مشتمل ہے چند شعر یہ ہیں ؎

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی — وہ یادگار کمالاتِ احمد و محمود
زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اسکی — وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا مسعود
مجھے رلاتی ہے اہلِ جہاں کی بیداری — فغانِ مرغِ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود
نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غمِ دوست — نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود

"دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است"

۵۵۔ اقبال کے فلسفۂ تعلیم کے متعلق "توسیعی خطبات" دیئے جانے کی تجویز بعض احباب نے پیش کی تھی۔ ۵۶۔ تجویز یہ تھی کہ اقبال کے فلسفۂ تعلیم کے بارے میں پنجاب یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام توسیعی خطبات دیئے جائیں سیدین صاحب نے بعد میں ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو اقبال پر انگریزی میں مضمون "یوم اقبال" کے موقع پر لاہور میں سر شیخ عبدالقادر کی صدارت میں پڑھا تھا۔ یوم اقبال انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کے زیرِ اہتمام ہوا تھا (اکبر حیدری)

★

جمہور کی حکمرانی

بنکوں کو قومیانے کا فیصلہ جب مسز گاندھی نے کیا تو اس کے دوررس فوائد کے بارے میں تصور دشوار تھا لیکن آج کون سا گاؤں ایسا ہے جہاں کے لوگ بنکوں سے ملنے والے قرضوں اور ان کے ذریعہ مختلف قسم کے کام شروع کرنے سے محروم ہیں۔ اربوں روپے تقسیم ہو چکے ہیں اور اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے۔

جمہوریت اور سوشلزم کے ساتھ ہی ایک اہم جز و سیکولرزم ہے۔ ہندستان جیسے ملک میں جہاں ان گنت فرقے اور ذاتیں ہیں سیکولرزم کو بنیاد بنانا بڑا صائب فیصلہ ہے فرقوں اور ذاتوں کی بنیاد پر جھگڑے ہوتے ہیں ان کو دور کرنے کا بہترین نسخہ یہی ہے۔ جمہوریت کا تصور مساوات کا ہے۔ مملکت کے نزدیک ہر شہری برابر ہے خواہ وہ کسی فرقے یا ذات سے تعلق رکھتا ہو اور اس کا کوئی بھی عقیدہ اور مسلک ہو۔ کسی جگہ فساد یا ہنگامہ ہو جاتا ہے تو معمول کی زندگی مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ کاروبار پر اثر پڑتا ہے۔ پیداوار متاثر

(ص۸ کا بقیہ)

ہوتی ہے۔ نقصان انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کا ہوتا ہے۔ اس کو بعض ناسمجھ، مفاد پرست اور شر پسند عناصر محسوس نہیں کرتے اور اپنی حرکتوں سے اتحاد اور اکجہتی پر ضرب لگاتے ہیں۔ ملک میں جو بڑے بڑے کام ہو رہے ہیں ان کے بے روک ٹوک جاری رہنے کے لیے قومی یک جہتی از بس ضروری ہے۔ سوشلزم کا مدعا امن و امان کا طالب ہے نہ صرف ملک کے اندر بلکہ ملک کے باہر بھی۔ اسی لیے ہندستان نے ناوابستگی کی ایک نئی راہ اختیار کی تاکہ بڑی طاقتوں کی سیاست سے الگ رہ کر عالمی امن کو برقرار رکھنے میں مقدور بھر مدد دی جا سکے۔ ترقی اور عوام کے مسائل حل کرنے کے لیے جو منصوبے بنائے گئے ہیں ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بہت ضروری ہے کہ عالمی جنگ نہ چھڑے۔ اگر جنگ چھڑ جاتی ہے تو ہندستان الگ رہتے ہوئے بھی بری طرح متاثر ہوگا اور مختلف منصوبوں کو جامۂ عمل پہنانے کی رفتار بہت سست ہو جائے گی۔

★

ڈاکٹر عثمان صدیقی لبوانی
ایکسٹرل، لبوان، سیتاپور

پیامِ جمہوریت

متحد ہو ملت بن، دستاں بن جاؤ تم
قطرہ قطرہ مل کے بحرِ بیکراں بن جاؤ تم
اس زمیں کی پستیوں پر آسماں بن جاؤ تم
رہبرِ شمس و قمر اور کہکشاں بن جاؤ تم
کہتی ہے جمہوریت اک کارواں بن جاؤ تم
اے وطن والو! نشانِ جاوداں بن جاؤ تم

ملک میں ہرگز نہ آئے انتشار و ابتری
میل و ملت سے ہو سب امن و اماں کی دلبری
قومی یکجہتی سے ہو، اپنے وطن کی سروری
ساری دنیا کے لیے اس قوم کی ہو رہبری
گلشنِ جمہوریت میں اب نہ ہو غارت گری
اے وطن والو! یہ ہے پیام چھبیس جنوری

مختلف ذاتوں سے یہ اپنا وطن آباد ہے
مختلف پھولوں سے یہ اپنا چمن دل شاد ہے
دانہ دانہ گر بکھر جائے، وہی برباد ہے
ایک رشتے میں وطن کے قوم یہ آزاد ہے
تم سے یہ جمہوریت کی دوستو فریاد ہے
کیا وطن والو! تمہیں درسِ محبت یاد ہے

ہاں اگر ایسا ہے تو آؤ قسم کھا کر اٹھیں
اپنے اس عہدِ محبت کے لیے زندہ رہیں
پھر سے اک عزمِ جوانِ جمہوریت کا ہم کریں
قومی یکجہتی کی راہوں سے نہ ذرہ بھر ہٹیں
اہلِ عالم بھی نشانِ راہ پر اپنے چلیں
ہم بڑھیں آگے تو میرِ کارواں بن کر بڑھیں

حکیم جوہر وارثی بہرائچی
۲۰۳۔ بشیر گنج
بہرائچ

ایک نظم
کسانوں کے لیے

ترا حسن پوشیدہ سب پر عیاں ہے — ترا مثل اہلِ جہاں میں کہاں ہے
تری ہی بدولت زراعت کے چرچے — ترے دم سے یہ کاروبارِ جہاں ہے
تری زندگی پر زراعت ہے نازاں — تری ذات سے اک جہاں شادماں ہے
کیا سخت سے سخت وعدے کو پورا — کبھی تو نہ سمجھا یہ بارِ گراں ہے
تری رفعتوں کو کوئی ہم سے پوچھے — ترے واسطے یہ زمیں آسماں ہے
مشقت کیے جا بہ ایمانداری — مصیبت میں تیری مسرت نہاں ہے
سمجھ جائیگا جو ترا رازِ ہستی — وہ عزت کریگا اگر قدرداں ہے
زمانہ ہے وابستہ تیری خوشی سے — تو ہے کامراں تو ہر اک کامراں ہے
یہ جو واسی سن لیکے آیا ہے خوشیاں — ترقی کا راز اسمیں تیری نہاں ہے

مشقت سے محنت سے غافل نہ رہنا
ترے واسطے خلد سالِ رواں ہے

کشور سلطانہ
۱۳۹۰ محلہ افغانان کرتپور (بجنور)

عقیدتِ وطن

اتنا حسین لگتا ہے اپنا وطن مجھے — جچتی نہیں نظر میں کوئی انجمن مجھے
خائف نہ کر سکیں گے یہ دار و رسن مجھے — اسلاف سے ملا ہے وفا کا چلن مجھے
رشیوں کی سرزمیں ہو تو ولیوں کا دیش ہے — یوں جان سے عزیز ہے خاکِ وطن مجھے
بھارت کے ارتقا میں ہے ہم سب کا ارتقا — پیغام دے رہی ہے یہ گنگ و جمن مجھے
ڈوبا ہوا ہے حبِ وطن میں مرا کلام — حاصل ہے دورِ نو میں وہ طرزِ سخن مجھے
ذرے بھی اس کے مہر درخشاں سے کم نہیں — دھرتی دکھائی دیتی ہے اکی گگن مجھے
دیتی ہے چیخ چیخ کے پیغامِ آگہی — ہر روز آفتاب کی پہلی کرن مجھے
اچھا جواب آپ ہے بھارت کی سرزمیں — بھاتے نہیں ہیں اس لیے لعل یمن مجھے

کشور وطن پہ جو ہو سکے دل و جاں کروں نثار
بالپن کا یاد آتا ہے بچپن مجھے

کوثر چاندپوری
۲۱۷ ۔ اوکھلا ۔ جامعہ نگر ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

اعجاز صدیقی ــــ چند یادیں

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
مدت ہوئی ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

علامہ سیماب مرحوم کی اولاد میں اعجاز صدیقی مرحوم ایڈیٹر "شاعر" کا نام سب سے زیادہ مشہور ہے۔ وہ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ انتقال کے دن عمر تریسٹھ یا چونسٹھ سال کی تھی۔ ابتدائی تعلیم و تربیت سیماب صاحب کی نگرانی میں ہوئی۔ بڑے بھائی منظر صدیقی شروع میں اپنے والد کے شریک کار تھے۔ صحافتی اور ادبی کاموں میں دستِ راست کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ خانگی وجوہ سے الگ رہائش کا انتظام کرنے پر مجبور ہوئے اور اپنا اخبار "ایشیا" جاری کیا تو ان کی جگہ اعجاز صاحب کو ملی۔ وہ سیماب صاحب کی شعری و نثری خدمات میں معاونت کرنے لگے۔ شاعرانہ ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ یہ میراث ذاتی صلاحیت میں مل کر اور نکھر گئی۔ فاضل باپ اردو کے نامور شاعر اور ادیب تھے۔ نظم اور نثر نگاری کا مذاق بہت پاکیزہ تھا۔ متعدد تصانیف رسالہ "صوفی" (پنڈی بہاء الدین) سے اشاعت پذیر ہوئی تھیں۔ اکثر منظوم تخلیقات بھی "صوفی" اور دوسرے معیاری رسائل میں چھپتی رہتی تھیں۔ غیر منقسم ہندوستان میں ہزاروں شاگرد تھے۔ اعجاز کو بھی ان کے فیضِ صحبت سے شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا وہ شعر کہنے لگے۔ مشورۂ سخن کے لیے باہر جانا نہیں پڑا۔ قصر الادب ہی میں یہ ضرورت پوری ہوتی رہی۔ سیماب صاحب نوک پلک سنوارتے اور فنی اسقام کی اصلاح کرتے رہے۔ مشاعروں میں بھی شرکت کا موقعہ ملتا رہا۔ بھوپال کے آل انڈیا مشاعرے میں وہ اپنے والد بزرگوار کے ساتھ آئے تھے۔ میں بھی صفِ سامعین میں موجود تھا۔ اعجاز نے ترنم میں غزل پڑھی تھی شروع میں لحن ہی سے پڑھا کرتے تھے۔ آواز میں معصومیت آمیز نرمی کشش اور حلاوت تھی۔

سیماب صاحب نے آگرے سے متعدد رسائل اور اخبارات نکالے "پیمانہ" اپنے رومانی لب و لہجہ کی وجہ سے بہت مقبول ہوا مگر اس سے اعجاز کی وابستگی نہیں رہی "تاج" اور "شاعر" میں انھوں نے باقاعدگی سے سیماب کا ہاتھ بٹایا۔ سیماب صاحب اخبار "ریاست" سے متعلق ہو کر دہلی گئے۔ ان کے اہل و عیال ساتھ نہیں گئے تھے میں چاندنی چوک والے مکان میں ان سے ملا تھا ساغر صاحب کا حسن و جمال اور فن شباب پر تھا گیت خوب کہتے تھے۔ وہی سیماب صاحب کے ہمراہ تھے اس کے بعد سیماب صاحب بال بچوں کو لے کر لاہور چلے گئے۔ ساغر صاحب بھی گئے۔ وہیں سے رسالہ نکالا کسی نمبر میں میرا افسانہ بھی "مصنف کی بیوی" کے عنوان سے شائع ہوا۔ لاہور میں سیماب صاحب کا قیام زیادہ نہیں رہا چند ماہ گزار کر آگرہ لوٹ آئے۔ اعجاز صاحب سنِ تمیز کو پہنچ چکے تھے عقل و شعور میں بالیدگی آ گئی تھی۔ "شاعر" میں کبھی کبھی کلام شائع ہونے لگا تھا۔ ادارتی ذمہ داریوں میں بھی حصہ لے رہے تھے۔ جب تک سیماب صاحب کا قیام سرزمینِ تاج میں رہا اعجاز کا تجرباتی سفر جاری رہا۔ سیماب صاحب رہنمائی کرتے رہے۔ تقسیم کے بعد سیماب پاکستان چلے گئے "شاعر" کی عنانِ ادارت اعجاز نے سنبھال لی اور ذمہ دار مدیر بن گئے۔ اس وقت تک انھیں نظم و نثر کا اچھا سلیقہ حاصل ہو چکا تھا۔ باپ کے ترکِ وطن کرنے کی اولین ساعت سے اعجاز کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا جو بہت صبر آزما تھا۔ وہ ہجوم افکار میں گھر گئے۔ آگرہ کی تاریکی فضا نے ان کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ مقامی حالات سے تنگ آ کر اعجاز نے ایک بڑے انقلاب کو دعوت دی اور بمبئی کے سفر پر کمر باندھی۔ ضروری ریکارڈ، باپ کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اور دوسری اہم کتابیں لے کر وہ بمبئی کے

ہیلہ ہو گئے۔ اس سے پہلے ان کی والدہ مظہر صدیقی کے ساتھ کراچی چلی گئی تھیں اعجاز صاحب کی خواہش اور اطلاع پر میں نے اسٹیشن بھوپال پر انھیں خوش آمدید کہا تھا اور مہینوں کی نوکری ان کی والدہ کو پیش کی تھی۔ اس وقت تک اعجاز صاحب نے بمبئی جانے کے عزم کا اظہار نہیں کیا تھا۔ چند ماہ گزر جانے پر خط ملا جس میں لکھا تھا کہ آگرے کو خیرباد کہہ کر بمبئی جا رہا ہوں اسٹیشن پر ملاقات ہو جائے گی تو بڑا سکون ملے گا۔ پنجاب میل سے آ رہے تھے وہ رات کے نو بجے بھوپال پہنچے تھے میں دس منٹ پہلے پہنچ گیا۔ اعجاز نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا مجھے دیکھ کر اشکبار ہو گئے! تمھارا نام کو زانو پر بٹھا رکھا تھا کہنے لگے "یہ بچہ دادا کا بہت لاڈلا ہے" ٹرین پندرہ منٹ ٹھہری۔ حرکت میں آئی تو نمناک آنکھوں سے مجھے دیکھ کر دوبارہ معانقہ کیا۔

بمبئی میں نہایت سنگین حالات سے انھیں دو چار ہونا پڑا فٹ پاتھ پر رہے۔ برسات میں ایک سے دوسرے سے دوسری سرائے میں منتقل ہوتے تھا ہیں بارش میں بھیگیں بیوی بچوں کا یہی حال ہوا۔ بیوی سے انھیں گہرا لگاؤ تھا ان کے بھیگنے پر آزردہ ہوتے تھے ان کی بیگم نے ساس سسر کی نہایت سعادت مندی سے خدمت کی تھی۔ دونوں بہت خوش تھے۔ اعجاز صاحب پر اس کا بھی اثر تھا۔ بہرکیف اعجاز نے وقت کے خشمگیں تیوروں کا مقابلہ مجاہدانہ ہمت سے کیا۔ وقت بہت بڑا ممتحن ہے۔ وہ انسان کے عزم و حوصلہ کا امتحان ضرور لیتا ہے اسے کڑی آزمائشوں میں ڈالتا ہے۔ اس امتحان میں کامیابی ہو جاتی ہے تو آغوش محبت وا کر دیتا ہے ورنہ تباہی اور بربادی کے تاریک غار میں ڈھکیل دیتا ہے۔ اعجاز نے ہار نہیں مانی۔ آہستہ آہستہ ماحول سازگار ہونے لگا۔ چھوٹا سا مکان مل گیا۔ ایک مختصر سے کمرے میں اعجاز "شاعر" کی کاپیاں درست کرتے۔ خطوط کا جواب فرائض میں داخل تھا۔ یہ کام بھی اسی کمرے میں انجام دیا جاتا تھا۔ "شاعر" انھیں بہت عزیز تھا۔ اولاد معنوی میں سب سے بڑا اور محبوب بیٹا تھا۔ اسکی پرورش خون دل سے ہوئی تھی۔ دم واپسیں تک "شاعر" کو لہو پلاتے رہے۔ رسالہ کی ڈگمگاتی ناؤ کو بڑے مصائب اٹھا کر انھوں نے حالات کے طوفانی سمندر سے نکال کر ساحل مراد تک پہنچایا! اشاعت بے قاعدہ ضرور تھی۔ بمبئی میں پریس اور کاتب کے مسائل بہت الجھے ہوئے ہیں تاخیر کی اصل وجہ یہی تھی۔ آگرہ اور بمبئی کا "شاعر" معیار اور ظاہری و باطنی حسن کے لحاظ سے مختلف تھا۔ دونوں میں بچپن اور جوانی کا سا فرق تھا۔

اعجاز نے معیار کو بلند کرنے کے لیے بڑے جتن کیے۔ ممتاز اور مشہور ادیبوں کو رابطہ پیدا کیا۔ کرشن چندر، ہندر ناتھ، ظ۔ انصاری، ڈاکٹر محمد حسن اور یونس اگاسکر کو ہمنوا بنا کر یادگار حسن کے ضخیم نمبر نکالے۔ کرشن چندر نمبر، ڈرامہ و افسانہ نمبر، گاندھی نمبر اور جمہوریت نمبر اہتمام اور سلیقہ سے نکالا۔ ہم عصر اردو ادب نمبر آخری کارنامہ ہے۔ اسمیں ترتیب اور تدوین کا اچھوتا ڈھنگ ایجاد کیا ہے۔ عظیم ادیبوں سے تنقیدی مقالے، افسانے اور ڈرامے لکھوائے گئے ہیں تمام اصناف ادب کے جداگانہ عنوانات قائم کر کے ہر ایک ان کے تحت اسی صنف ادب پر تحقیقی اور تنقیدی مقالات پیش کئے گئے ہیں۔ پھر اسی صنف کی دوسری تخلیقات کو جگہ دی گئی ہے۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کو خاص نمبروں میں سر فہرست رکھا جائے گا کوئی ایسا حسین، خوب صورت اور جامع نمبر مشکل ہی سے اس کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔ ادیبوں کے لیے ایک گوشہ قائم کر کے اعجاز نے اپنے مخلصانہ رویہ کا ثبوت دیا ہے۔ گوشۂ کوثر چاند پوری کا اعلان کر چکے تھے۔ عرصہ تک تقاضہ کرنے کے بعد مجھے اس کے لیے تیار کیا تھا کتابت ہو چکی تھی مگر افسوس ہے کہ زندگی نے وفا نہ کی اور یہ نمبر ان کی نگاہ سے نہ گزر سکا۔

بھوپال سے مرحوم کو بہت انس تھا۔ جھیلوں کی گود میں کھیلتے ہوئے اس شہر کو حد درجہ پسند کرتے تھے۔ میری اور خفا گوالیاری مرحوم کی کوششوں سے بھوپال اور اس کے مضافات میں "شاعر" کے بہت سے خریدار بن گئے تھے ڈاکٹر تنکرو یالی شرما ایجوکیشن منسٹر تھے۔ میں نے انھیں "شاعر" کی اعانت پر آمادہ کیا۔ موصوف اردو دوست اور شریف النفس انسان ہیں۔ مشاعروں میں اردو پر ان کی تقاریر جمہوریت نوازی کی شاہد عدل ہیں۔ شرما صاحب نے بارہ پندرہ پرچے مختلف لائبریریوں میں جاری کر کے مجموعی قیمت خزانہ صدر سے ادا کرنے کا حکم دے دیا اعجاز سالانہ رقوم وصول کرنے اور سلسلہ خریداری جاری کرانے کے لیے سال میں ایک مرتبہ بھوپال ضرور آیا کرتے تھے میرے بھوپال آنے سے پہلے بھی ان کا اس شہر خوباں میں قیام رہا ہے۔ وہ زمانہ آگرہ کی سکونت کا تھا۔ رشدی بھوپالی ایڈیٹر روزنامہ "افکار" اور فولادی ہڈیوں کے ڈھانچے والے انسان صبا لکھنوی (ایڈیٹر ماہنامہ "افکار" کراچی) سے طویل صحبتیں رہا کرتی تھیں شعر و سخن کی محفلوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ میرے بھوپال آنے پر قیام میرے یہاں ہونے لگا تھا بعض اوقات ایک ایک ماہ ٹھہرے میں شاہ جہاں آباد کے شفا خانہ میں متعینات تھا۔ اسکی عمارت بہت وسیع اور عالی شان تھی۔ اعجاز

کو برابر کے کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا جو میرے سونے کے کمرے سے دور تھا۔ وہ رات میں تنہا سوتے ہوئے گھبراتے تھے۔ ایک روز صبح کو چائے کی میز پر کہا کہ تنہائی میں بڑی وحشت ہوتی ہے۔ میں نے عزیز گوالیاری کو قریب سونے کا پابند کردیا وہ سیماب صاحب کے شاگرد اور اعجاز صاحب کے معتقد تھے۔ ایک پاؤں بندوق کی گولی لگ جانے سے کاٹا جاچکا تھا۔ سرِ شام ہی بیساکھیوں کے سہارے بدھوارے سے شاہ جہان آباد آجاتے۔ ساتھ ہی کھانا کھاتے، صبح چائے پی کر چلے جاتے۔ چار بجے سے احباب کے آنے کا تانتا بندھ جاتا۔ پروفیسر شہاب اشرف، شفا گوالیاری، وکیل بھوپالی، عشرت قادری اور بہت سے مخلص دوست جمع ہوجاتے۔ قہقہوں سے فضا گونجنے لگتی۔ لطائف پر مسکراہٹوں کی کلیاں بکھر جاتیں۔ شعر و سخن کا مشغلہ رہتا۔ مشاعرے بھی ہوتے۔ ایک مشاعرہ میری صدارت میں نواب بھوپال کے مصاحب مسٹر اسد اختر خاں کے دولت کدے پر احمد آباد میں ہوا۔ اور بھی بہت سی محفلیں ہوئیں۔

اسی زمانے میں شفا صاحب مرحوم اپنا مجموعۂ کلام "نبضِ حیات" مرتب کر رہے تھے اعجاز نے پیش لفظ لکھنے کے لیے مجھ سے کہا اور بہت اصرار کیا۔ میں نے میں نے ناقدانہ طرز پر لکھا۔ اعجاز نے بہت غور سے پڑھا۔ دو جملے نکالنے کی فرمائش کی۔ میں نے ایک جملہ برقرار رکھا، ایک نکال دیا۔ کتاب بہت اہتمام سے چھپی لوگوں نے پیش لفظ پڑھکر کہا کہ کوثر صاحب نے آپ کو قتل کردیا۔ شفا صاحب بدحواسی کے عالم میں میرے پاس آئے۔ میں نے کہا کہ خوں ریزی میں آپ کے استاد زادے بھی شریک ہیں۔ وہ پیش لفظ کو نہایت غور سے پڑھ چکے تھے اور تنقید سے فنکار کا قتل مقصود نہیں ہوتا۔ غیر جانبداری کے ساتھ اس کے شہ پارے کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ شفا بظاہر مطمئن ہوگئے مگر ان کے اندر والے انا پرست شفا کو اطمینان نہ ہوسکا۔ اکثر شکایت کردیا کرتے تھے درمیان میں ایک واقعہ میں اور لکھ دینا چاہتا ہوں۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس نوابزادہ لیاقت علی خاں کی صدارت میں ہونے والا تھا۔ مجھے مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی، میں گیا، مقالہ پڑھا۔ کانفرنس کے اختتام پر آل انڈیا مشاعرہ ہونے والا تھا۔ عرشی بھوپالی نے ہمراہ چلنے پر اصرار کیا میں انہیں لے آیا۔ ایک روز دہلی میں بڑے بھائی سید علی اظہر صاحب مرحوم چیف انجنیئر کے پاس ٹھہرتا ہوا آگرہ پہنچا۔ صدر ہوٹل میں کمرہ میرے لیے مخصوص کردیا تھا۔ جناب ماہر القادری نے کمرے پر میرا نام دیکھ کر کہا "میں کوثر صاحب ہی کے پاس رہوں گا" میں نے عرشی صاحب کو ماہر القادری کے سپرد کردیا۔ وہ ہندوستان بھر میں انہیں گھماتے پھرے۔ ہم دونوں علامہ سیماب کے یہاں گئے کلام پاک کا منظوم ترجمہ سنا ماہر صاحب نے مشورہ دیا کہ ترجمہ پر علماء کی رائے ضرور حاصل کی جائے۔ ایک اعتراض بھی کیا۔ اسکا جواب میں نے دیدیا۔ کانفرنس تین روز تک جاری رہی۔ اعجاز سے ملاقاتیں ہوتی رہیں کبھی اجلاس میں، کبھی "شاعر" کے دفتر میں، جہاں سیماب صاحب کا خوبصورت حقہ رکھا رہتا تھا کانفرنس کا پروگرام اختتام پذیر ہوا تو علامہ نے اعجاز کے ذریعہ پیام بھیجا "اب تک آپ کانفرنس کے مہمان تھے آج سے میرے مہمان ہیں" جس وقت اعجاز صاحب آئے میں بستر ہولڈال میں لپیٹا جاچکا تھا۔ جاڑوں کے دن تھے۔ اعجاز اوور کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ایک ادائے خاص کے ساتھ ہولڈال پر بیٹھ گئے اور علامہ کی ترجمانی فرمائی۔ میں نے نہایت ادب واحترام سے معذرت کرلی۔

اعجاز نظم بھی کہتے تھے اور غزل بھی۔ ترنم میں پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ تحت اللفظ پڑھا کرتے تھے۔ ذوقِ جمال فطرت کا حصہ تھا۔ غزلیہ شاعری میں جذبہ اور تخیل ہی کی کارفرمائی ہوتی ہے نظم بلندی فکر کی طالب ہے۔ میں اعجاز کے کلام پر تنقید نہیں کرسکوں گا۔ ان کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ رسائل سے بکھرے ہوئے کلام کا سمیٹنا فرصت کا طالب ہے مجبوراً اس کام کو کسی اور موقعہ کے لیے ملتوی کرتا ہوں۔ ایک مسلسل غزل میں انھوں نے اپنے تازہ تاثرات جرأت مندانہ انداز سے پیش کیے ہیں۔ سیاسی اور سماجی حالات پر فنکاری کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس کے دو شعر (ایک مقطع ہے) لکھنے کو جی چاہتا ہے ؎

تودے اٹھے ہیں سرد دسمن دیکھ کر چلو ۔۔۔ اہلِ چمن ہوائے چمن دیکھ کر چلو
اعجاز کچھ تو وقت کی سمجھو نزاکتیں ۔۔۔ تم اور یہ بیانِ سخن دیکھ کر چلو

اعجاز کے اداریے عام طور پر جاندار ہوا کرتے تھے۔ اردو پر بیباکی سے لکھنے کے عادی تھے۔ ایسے مسائل پر بھی بحث کرتے تھے جن کا تعلق زبان سے ہوتا تھا۔ مجھ سے خاص نمبروں کے لیے بہت اصرار سے فرمائش کیا کرتے تھے۔ اپریل ۱۹۶۵ء میں مجھے دہلی آنے کا مرحلہ پیش آیا۔ یہ اپنی نوعیت کا پیچیدہ مسئلہ تھا۔ شانت سمندر میں بہت بڑا پتھر پھینکا جارہا تھا۔ احباب اور معززین شہر سوال کرتے تھے "کیوں جارہے ہیں آپ یہاں کیا تکلیف ہے، پریکٹس کامیاب ہے بےفکری سے بسر ہورہی ہے، ایسی صورت میں دہلی جانا ایک طرح کی خودکشی ہے" میاں نہیں جناب حکیم عبدالحمید صاحب کا مختصر خط دکھا دیا کرتا تھا۔

"مجھے اور فن کو آپ کی ضرورت ہے"

یہ جملہ عجیب تاثیر کا حامل تھا۔ اعجاز صاحب نے میرے ارادے سے مطلع ہو کر لکھا کہ "دہلی ضرور جائیے، ہرگز پس و پیش نہ فرمائیے" میں نے تمام کاروبار ختم کر کے بھوپال چھوڑنے کا عزم کر لیا بھوپال مجھے بہت عزیز تھا جو کا طویل اور حسین دور وہیں گزرا تھا۔ تعلیم وہیں پائی تھی۔ احباب اور اہلِ شہر نے بے پایاں خلوص دیا تھا چھوٹے اور بڑے تالاب کی بیتاب لہریں ساحل سے سر ٹکرا کر یہی کہتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں "کیوں جا رہے ہو یہاں تمہیں کس چیز کی کمی ہے" لیکن حکیم صاحب کے الفاظ نے سینہ میں فن کی محبت کا جذبہ بیدار کر دیا تھا اور میں وسیع پیمانے پر فن کی خدمت کرنے کے لیے بے چین ہو اٹھا۔ آخر کار ۲۲ اپریل ۱۹۶۵ء کو لال قلعہ کے تاریخی ماحول میں آ گیا اور ہمدرد نرسنگ ہوم میں کام کرنے لگا جس کا سنگ بنیاد پنڈت جواہر لال نہرو نے رکھا تھا۔ افتتاح میری موجودگی میں شری لال بہادر شاستری نے کیا تھا۔ اعجاز صاحب دہلی آئے اور میرے یہاں ٹھہرے۔ میں طبی کانفرنس کی عمارت سے اس وقت بلی ماران والے مکان میں منتقل ہو چکا تھا۔ مکان میں کافی گنجائش تھی۔ اعجاز کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی جب میرے یہاں ٹھہرنے کی گنجائش نہ رہی تو میں نے انہیں طبی کانفرنس کی بلڈنگ میں ٹھہرایا۔ یہاں بھی تنہائی کا سوال اٹھا۔ ایک صبح کو بغیر اطلاع ناز ہوٹل میں جا ٹھہرے۔ مولانا علیم اختر مرحوم نے مجھے خبر کی اور اسی وقت ہوٹل سے سامان اٹھوا کر اعجاز کو اپنے یہاں لے گئے۔ دوپہر کا کھانا میرے ہی ساتھ نرسنگ ہوم میں کھایا کرتے تھے۔ سنترے بنگالی نزاکت کے ساتھ چھیل کر قاشیں لیتوں اور باریک چھلکوں سے صاف کر کے لکھنوی رعنائی کے ساتھ منہ میں ڈالتے تھے۔ آخر میں محسن زیدی کے یہاں ٹھہرنے لگے تھے۔ ان کی بیگم زیدی کی مہمان نوازی کی تعریف کیا کرتے تھے آخری بار جنوری ۱۹۸۳ء کو دہلی آئے۔ واپسی ۱۴ جنوری کو ہو رہی تھی۔ مجھے ریزرویشن کے لیے لکھا۔ شرط یہ تھی کہ تھری ٹائر میں لوور برتھ ڈھونڈ دیا ملنا ہونی چاہیے۔ میں نے مسٹر پریم ناتھ کو نئی دہلی کے اسٹیشن بھیج کر انہیں شرائط کے ساتھ ریزرویشن کرا دیا۔ وہ دو گھنٹہ میں ٹکٹ لے کر آ گئے۔ ۷ جنوری کی دوپہر کو ملاقات ہوئی۔ وہ بارہ بجے کے بعد نرسنگ ہوم آئے۔ میں نے ٹکٹ دیا۔ بہت غور سے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ بہت سے سوالات کیے پھر پرس میں رکھ لیا صحت پہلے کے مقابلہ میں بہت اچھی تھی۔ گمان بھی نہ تھا کہ اتنی جلدی الجاب

سے بچھڑ جائیں گے اور بیوی بچوں کو بلکتا چھوڑ جائیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر بیمار رہا کرتے تھے۔ ہر خط میں علالت کا انہیں علالتوں کا تذکرہ ہوتا تھا۔ اسی مناسبت سے میں نے انھیں میرا تیس کہنا شروع کر دیا تھا چند بار کہا کہ بیماری کی نوحہ خوانی ترک کر دیں۔ آئندہ صحت کا مرثیہ نہ پڑھا کریں آپ بالکل ٹھیک ہیں جواب ہمیشہ ایک ہی ہوتا آپ اوپر ہی سے دیکھتے ہیں میرے اندر نہیں جھانکتے "میں بیمار بھی ہوں اور پریشان بھی، سینہ میں حساس دل ہے وتڑپتا ہی رہتا ہے۔ اسی پر آئے دن چرکے لگتے رہتے ہیں۔ سارا قصور اسی کا ہے ۔

دل بہم پہنچا بدن میں تب سے سارا تن جلا
آ پڑی یہ ایسی چنگاری کہ پیراہن جلا

شعر میں نے سن کر کہا "آپ فطری طور پر عاشق مزاج ہیں۔ اسی شعر میں کوئی کامیاب رومان گنگنا رہا ہے" بڑی عجلت سے بولے "ایسی بات خط میں نہ لکھئے گا۔ بیگم آپ کے خطوط بہت دلچسپی سے پڑھتی ہیں" مرحوم کو رفیقۂ حیات سے غیر معمولی محبت ہی نہیں عشق تھا۔ اسکی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں چند مکتوبات میں یہ جملہ دہرایا گیا ہے "ہائے میری چہیتی بیوی" ان کی ازدواجی زندگی بہت شگفتہ تھی ایک مرتبہ وہ کشمیر جاتے اور آتے ہوئے دہلی میں ٹھہرے تھے بیگم ساتھ تھیں انہیں دل کی بیماریاں تھیں چہرہ اور پیروں پر ورم تھا بلڈ پریشر بڑھا ہوا تھا۔ مجھ سے مخلصانہ خفگی کے ساتھ شکایتی لہجہ میں کہا "آپ ان پر توجہ نہیں کرتے"

"اسکا موقعہ ہی کب دیا آپ نے۔ میں بھابی کو پہلے پہل دیکھ رہا ہوں۔ آپ کے خطوط میں شاعرانہ مبالغہ ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں تحریری بیانات پر کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ بیگم کی علالت کے پیشِ نظر خیال یہ تھا کہ سفرِ آخرت میں پیش روی وہی کریں گی لیکن شیخ سعدی کی یہ بات حقیقت بن گئی ؎

شخصے ہمہ شب بر سرِ بیمار گریست
چوں روز شد آں بمرد و بیمار بزیست

اعجاز بیگم کی بیماری سے دلگیر اور پریشان رہا کرتے تھے۔ بار بار ڈاکٹروں کو دکھاتے، مختلف ٹسٹ ہوتے اور ہسپتال میں بھی داخل کراتے رہتے تھے خود جسمانی ساخت کے اعتبار سے بالکل آبگینہ تھے۔ چند ماہ قبل کپڑے پہننے کے لیے اٹھے پاؤں پھسلا گر پڑے، اتنی سی بات میں پاؤں کی ایک ہڈی ٹوٹ گئی

اس نزاکت اور آئینہ صفتی کے باوجود خیال تھا کہ وہ عرصہ تک زندہ رہیں
گے اور بیگم مقدمۃ الجیش بن کر آگے روانہ ہو جائیں گی مگر وہ انہیں بیمار
چھوڑ کر آپ رخصت ہو گئے۔ ۱۴ کو بمبئی کے لئے چلے۔ دس بارہ دن بعد کارڈ
ملا جس میں افتخار امام کے آنے کی اطلاع تھی۔ واپسی کے لئے ریزرویشن کو لکھا
تھا۔ شرائط بالکل وہی تھیں۔ یہ ان کا آخری اور تاریخی خط تھا میری بدخطی
کی پہلے بھی شکایت کر چکے تھے۔ کارڈ میں لکھا تھا کہ "آپ کی تحریر مشکل سے پڑھی
جاتی ہے کوئی ناقل رکھئے۔" میں نے جواب دیا کہ آپ بصارت کے ساتھ اپنی
بصیرت بڑھائیں اور کاتب کو مزید تعلیم دلائیں۔ ہندو پاک کے تمام رسائل میں
میری چیزیں چھپتی ہیں کہیں اور سے میرے خط کی اتنی مذمت نہیں کی گئی گو شاعر
کو ترجمان پوری میں شائع ہونے والی میری ایک تخلیق کے چند الفاظ ان سے
پڑھے نہیں گئے تھے۔ ڈاکٹر ظفر احمد نظامی بمبئی سے دہلی کیلئے روانہ ہونے کے ارادہ
سے اسٹیشن آگئے تھے اعجاز صاحب نے افتخار امام کو اسٹیشن بھیجا کہ ظفر صاحب
سے نشان زدہ الفاظ سمجھ آئیں۔ افتخار امام جشن جمہوریت کے مشاعرے میں
آئے تھے۔ رتلام کے راستے واپس ہوئے۔ چند اور شاعروں کے دعوت نامے
ملے تھے۔ غالباً وہ بمبئی پہنچے ہی ہوں گے کہ غیر متوقع طور پر اچانک ۹ فروری
۱۹۷۸ء کو ریڈیو سے انتقال کی خبر نشر ہوئی۔ جسم میں سر سے پیر تک کپکپی
دوڑ گئی۔ ان کا مسکراتا چہرہ نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ چند لمحے ایسے گزرے
کہ ہوش و حواس بجا نہ رہے جیسے بے ہوشی طاری ہو گئی ہو۔ تنہا مجددی
کا یہ شعر شعور میں گونجنے لگا ؎

آج ہے غم کا مزہ دل بھر کے رونے دیجئے
آستیں کا ذکر کیا دامن بھگونے دیجئے

سوچنے لگا کہ اعجاز مر نہیں سکتے۔ وہ مرنے کی چیز نہیں تھے
اور درحقیقت میں اعجاز مرے نہیں روپوش ہوئے ہیں اپنی تخلیقات سے
وہ جریدۂ عالم پر زندگی کی مہر دوام ثبت کر چکے ہیں۔ پھر بھی ان کی جدائی کا
تاثر شدید تھا۔ دیر تک قلب کی اختلاجی حرکات قائم رہیں۔ بتیس ۳۲ سال
کے مراسم تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی ذات میں گہرائی تک جھانک سکتے
تھے۔ بے تکلفی جتنی ان سے تھی کسی سے نہیں تھی۔ ان کے سارے معمولات میرے
سامنے عریاں ہو جایا کرتے تھے۔ تمام نقابیں اٹھ جاتی تھیں۔ کوئی بات
ڈھکی چھپی نہیں رہتی تھی۔ کسی کے تفصیلات پوچھنے پر غالب کا یہ شعر پڑھ دیتا ہوں ؎

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے — بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

آخری سفر مجموعہ کلام کی ترتیب و اشاعت اور لاڈلی بیٹی رانی کی شادی کی
غرض سے کیا تھا۔ اسی مقصد سے علی گڑھ گئے تھے مگر ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ترتیب کے سلسلہ میں ڈاکٹر عنوان چشتی سے مشورہ ضرور
کیا تھا۔ ان کے آہنی عزم و استقلال کا اندازہ اس گفتگو سے ہوتا ہے جو انھوں نے
آخری اور ٹوٹتے ہوئے سانسوں میں پسماندگان سے کی تھی۔ ڈاکٹر سید مجاہد حسین،
صدر شعبہ اردو و فارسی، جارٹی کالج بمبئی اس حادثہ پر رنج و الم کا اظہار کرتے
ہوئے لکھتے ہیں۔

"موت ایک مقامی ہسپتال میں ہوئی۔ ہوش و حواس آخر تک
قائم رہے۔ بیٹوں کو متحد رہنے کی تلقین کی۔ "شاعر" کو جاری رکھنے
کی ہدایت فرمائی۔ اپنی قبر کے متعلق ضروری وصیتیں کیں اس
کے بعد اردو کا یہ چراغ جو طویل مدت سے تیز و تند ہواؤں کا
مقابلہ کر رہا تھا جس میں تیل کی جگہ مرنے والے کا لہو جل رہا تھا
بھڑک کر گل ہو گیا" ؎

ہر آنکہ زاد بنا چار بایدش نوشید
ز جام دہر مئے کل من علیہا فان

موت ایسی حقیقت ہے جس سے بھیانک ہونے کے باوجود کوئی شخص اپنے
آپ کو بچا نہیں سکتا۔ اس سے کسی کو نجات نہیں ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے — آج وہ کل ہماری باری ہے

لیکن ایسی المناک موت بہت لرزہ خیز ہوتی ہے۔ وہ رانی کی شادی نہ کر سکے
اپنے بیٹے نعمان صدیقی کا گھر آباد نہ کر سکے۔ یہ بہت بھاری بوجھ تھا جو احساس پر
مدت سے رکھا ہوا تھا۔ خدا کرے جلد ان کی یہ دیرینہ آرزو پوری ہو اور
بے چین روح کو آرام ملے۔

اعجاز کی موت اردو کا اندوہناک حادثہ ہے اور میں نثر میں اسی
کا مرثیہ لکھ رہا ہوں۔ یہ عرصہ تک پُر نہ ہوگا۔ قدرت ان کے صاحبزادگان
کو ان کے نقوش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ راستے پر دور تک انھوں نے
ایسی شمعیں روشن کر دی ہیں جو پیچیدہ اور خاردار جادوں پر نور بکھیرتی رہیں
گی۔ ان کی جوت میں منزل تک رسائی حاصل کرنا دشوار نہیں۔ ان کی روح
(باقی صفحہ پر)

کملا پتی … آہن بلگرامی
۱۹۳۔ سرائے حسن گنج۔ لکھنؤ

تیرے دیوانے نے دیوار میں در کھولا ہے
سرِ افلاک نیا بابِ قمر کھولا ہے

ڈھل گیا دن بھی وہیں اپنے ڈیرا ڈالا
تھک کے رہرو نے جہاں رختِ سفر کھولا ہے

میرے محبوب سے یہ بھی بات نہ اب تک پہنچی
رازِ دل تو نے مگر دیدۂ تر کھولا ہے

درِ شبنم، مہ و انجم ہیں کبھی جلوہ فروش
کس نے گنجینہ یہ ہر شام و سحر کھولا ہے

حسد و حرص و ہوس لیے کئی چور رہے
میں نے جب چاپ کبھی اپنا جو گھر کھولا ہے

جس کو دیکھو وہی وارفتۂ منزل ہے یہاں
واہ کیا مکتبۂ فکر و نظر کھولا ہے

کس کو فرصت جو سنے تیری کہانی آہن
دفترِ اک شکووں کا یہ تو نے مگر کھولا ہے

کشفی لکھنوی
قاضی مسجد راج بھون لکھنؤ

دیوانہ پھر کسی نے کہا مدتوں کے بعد
خوش ہوں کہ پھر سنی یہ صدا مدتوں کے بعد

لے چل جنونِ عشق اسی دشت کی طرف
آج آ رہی ہے جس کی ہوا مدتوں کے بعد

دل کو سکون مل گیا آنکھیں چمک اٹھیں
جب کوئی مسکرا کے ملا مدتوں کے بعد

ان پھول سے لبوں پہ میرا نام آ گیا
لائی ہے رنگ میری وفا مدتوں کے بعد

پیغامِ نو بہارِ گلستاں لیے ہوئے
سوئے قفس چلی ہے صبا مدتوں کے بعد

کشفی وہ آج پھر ہیں نگاہوں کے سامنے
پھر میرا دل ہے نغمہ سرا مدتوں کے بعد

بسنت کما بسنت
۲۵۱/۳۹ ٹیڑھی بازار رکاب گنج۔ لکھنؤ

رہگذر کی کبھی دیوار نہیں بن سکتے
ہم کسی کے لیے آزار نہیں بن سکتے

پھول گلشن کے کبھی خار نہیں بن سکتے
ہیں وفادار خطا وار نہیں بن سکتے

کر گئی مست نظر زاہد و تم کو مدہوش
تم تو کہتے تھے کہ میخوار نہیں بن سکتے

خشک پتوں سے درختوں کے ملے گی نہ اماں
دھوپ میں سایۂ دیوار نہیں بن سکتے

ذہن و دل صاف نہیں جو نہیں راہِ حق پر
وہ کبھی صاحبِ کردار نہیں بن سکتے

راہ کے پھول نہیں ہم تو کوئی بات بنے
ہم کسی رہ کے کبھی خار نہیں بن سکتے

خار تو خار ہیں پھولوں سی مہک ان میں کہاں
جاں بھی دیدو تو وفادار نہیں بن سکتے

چند لمحے ہیں اک عمر کے کاغذ کے حروف
گرمیٔ شعلۂ افکار نہیں بن سکتے

علی جواد زیدی
۱۰/۶ ڈالی باغ کالونی، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

خورشید بھائی

عمر میں نو دس مہینے بڑے، رشتے کے ماموں زاد بھائی، بچپن کے ساتھی، عمر بھر کے دوست، ذوق ادب میں ہم مذاق، راہ وفا میں ہم سفر خورشید بھائی (سید خورشید احمد) کی جدائی کا زخم ابھی اتنا ہرا اور گہرا ہے کہ ان پر کوئی مضمون لکھنے کے لیے قلم اٹھ نہیں رہا ہے۔ یوں تو ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا اور ہر فرد کو فنا سے بالآخر دو چار ہونا ہے، دوست، عزیز، رفیق، ہم ذوق برابر جدا ہوتے رہتے ہیں، لیکن خورشید بھائی کی جدائی ایک عجیب سا سانحہ ہو گیا ہے۔

عمر گزشتہ کی کتاب کے اوراق پلٹتے وقت ذہن کرہان کی ان گلیوں میں پہنچ جاتا ہے، جہاں ہم دھول مٹی میں لوٹتے، کبڈی، گلی ڈنڈا اور آنکھ مچولیاں کھیلتے تھے، ہارتے اور جیتتے، خانہ باغوں کے اونچے درختوں پر بے خطر چڑھ جاتے، جلتی دوپہر میں جب بزرگ قیلولہ کرتے ہوتے، ہم مکانوں کی چھتوں پر چاہے وہ پکی چونے اور سیمنٹ کی ہوں، چاہے مٹی اور کھپریل کی کچی، دوڑتے پھرتے، کنکیا اڑاتے، مکان سے ملحق تالاب میں غوطے لگاتے اور طفلانہ دلیری کے مظاہرے کرتے، مسجد میں بڑوں کی باجماعت نمازیں پڑھتے پڑھاتے، مولوی صاحب سے قرآن کریم اور دینیات کے ابتدائی سبق لیتے، ان کے لیے چلمیں بھرتے، ان کے پاؤں دباتے اور کبھی کبھی سیلی و قمچی سے نوازے بھی جاتے۔ ہم نے اس زمانے میں ہی ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونا سیکھا، روٹھنا، منانا، مصالحت کرنا سیکھا، ایک دوسرے کے راز جاننا اور اسے سینوں میں محفوظ رکھنا سیکھا۔

کرہان (ضلع اعظم گڑھ) میں جو میرا ننہال ہے، ہمارے گھر کو امتیازی حیثیت حاصل تھی، اسی لیے نہیں کہ وہ لوگ ذی حیثیت زمیندار تھے بلکہ اس لیے بھی کہ بڑا علمی اور ادبی ماحول تھا۔ گھر میں معقول کتب خانہ تھا، جس میں مشاہیر اردو کے دواوین تھے۔ وہ ہم نے بچپن ہی میں پڑھ ڈالے۔ شرر، طبیب، نذیر احمد اور منشی سجاد حسین کے ناول تھے، شبلی، آزاد اور حالی کی بعض کتابیں تھیں، پھر اخبار و رسالے آتے رہتے، ہم سب ان کو شوق سے پڑھتے۔ کچھ دنوں بعد جب ہم ساتویں آٹھویں میں پہنچے تو کرہان میں ڈاک گھر کھل گیا۔ اس کے پوسٹ ماسٹر شمیم کرہانی کے بڑے بھائی غضنفر حسین صاحب ہوئے۔ ڈاک خانہ میں جو اخبار یا رسالہ آتا ہم لوگ اس کی بے ضابطگی یوں وصول کرتے کہ پہلے اسے کھول کے خود پڑھتے اور پھر بدستور بند کر کے اصل خریدار کے حوالے کرتے۔

شعر و شاعری کے برابر چرچے رہتے۔ یہ سلسلہ کئی پشتوں سے چلا آ رہا تھا۔ خورشید بھائی کے پردادا سید جعفر حسین جمیل شاعر اور صاحب دیوان تھے۔ انھوں نے "فسانۂ عجائب" کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔ دادا سید علی جعفر ذکا بھی بہت خوش گو شاعر تھے اور ان کا نعتیہ اور منقبتی کلام محفوظ رہ گیا ہے۔ میرے دونوں ماموں سید محمد رضا (خورشید بھائی کے والد) اور سید احمد علی احمد (ابوذر) شاعر تھے۔ ہم سنوں میں شمیم کرہانی بچپن ہی سے شاعری کرنے لگے تھے۔ ان کے بڑے بھائی سید اعظم حسین اعظم بھی (جو بعد میں ایڈیٹر روزنامہ "سرفراز" لکھنؤ ہوئے) شاعر تھے۔ میں نے بھی شمیم ہی کی طرح بچپن سے شاعری شروع کی۔ ہم لوگ آپس میں غزلیں اور سلام یا قصیدے طرح کرتے یا پھر ماموں صاحبان میں سے کوئی طرح دے دیا کرتا۔ کرہان سے پانچ میل کے فاصلے پر میرا وطن قصبہ محمد آباد گہنہ ہے۔ وہاں اکثر مشاعرے اور مقاصدے ہوا کرتے کبھی

کبھی [illegible] آجاتے کبھی جگر مرادآبادی غرض ادبی ذوق کو یہ فضا جلا دیتی [illegible]۔ پانچ میل کی دوری پر کرہان کے دوسرے سرے پر جیراکوٹ دوسرا مرکز علم تھا۔ جہاں علامہ شبلی کے استاد مولانا فاروق جیراکوٹی کا فیض مہیا بار تھا۔ وہ اب لٹ چکا تھا۔ پھر بھی جب تک کیفی جیراکوٹی حیات تھے وہ آتے جاتے رہے۔ خورشید بھائی نے باقاعدہ شاعری تو کبھی نہیں کی لیکن موزوں طبع تھے اور ہم لوگوں کے اصرار سے دو چار شعر کبھی کبھی کہہ لیا کرتے تھے شمیم کرہانی کی طرح خورشید بھائی خوش گلو بھی تھے اور ہم لوگ ان سے اصرار کر کے اقبال، جوش، عزیز یگانہ، فصلی وغیرہ کا کلام سنا کرتے۔ جب رسالے آتے تو اجتماعی خوانندگی یوں ہوتی کہ کوئی افسانہ سناتا اور سب سنتے۔ موقع موقع سے واہ واہ بھی ہوتی رہتی۔ کبھی کبھی بیت بازی ہونے لگتی۔ ٹولیاں بن جاتیں ہم لوگوں کو اس زمانے میں بہت سے اشعار یاد تھے۔ یہ سلسلہ "سونیار" وغیرہ میں بھی جاری رہا جہاں ہم سب طاعون کی وبا کے زمانے میں منتقل ہو جایا کرتے تھے۔

ایک بار ماموں جان نے کہا کہ شعر و شاعری کے علاوہ تقریر بھی ہونا چاہیے۔ چنانچہ گرمیوں کی چھٹیوں میں "سولہی" کے وسیع صحن میں "شرفائے" کرہان جمع ہوتے اور ہم نوجوانوں کو کوئی موضوع دیدیا جاتا اور ہم میں سے ہر ایک بقدر استعداد طبع آزمائی کرتا۔ عموماً میرے بعد خورشید بھائی ہی کی تقریر زیادہ پسند کی جاتی۔ میں کبھی کبھی جذباتی ہو جاتا لیکن وہ ہمیشہ ایک نپے تلے انداز میں تقریر کرتے اور میں اُن کی خطابت کی اس شان کو خصوصیت سے سراہتا تھا۔

خورشید بھائی اچھے شکاری تھے مجھے بندوق چلانا نہیں آیا اور نہ میں کبھی ان کی شکاری مہمات پر اُن کے ساتھ گیا لیکن ماحصل میں میرا حصہ ضرور لگتا! شکار میں وہ میلوں چلے جاتے اور دن دن بھر سفر کرتے۔ ہم سنوں میں نہ ملتا تو بزرگوں یا خوردوں میں ساتھی ڈھونڈھ لیتے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد وہ اعظم گڑھ چلے گئے، ویسلی ہائی اسکول میں اور میں محمود آباد، کالون ہائی اسکول میں لیکن چھٹیوں میں یکجائی ہو جاتی اور وہ صحبتیں پھر زندہ ہو اٹھتیں، جیسے بیچ میں نہ کوئی وقفہ رہا ہو نہ سلسلہ ٹوٹا ہو۔ خط و کتابت بھی برابر ہوتی رہتی اور وہ خطوط کے معاملے میں مجھ سے زیادہ تیز رفتار تھے۔ میں نے کبھی جواب میں دیر کی ہو تو کی ہو، وہ کبھی نہ کرتے اور نہ بعض کم ظرفوں کی طرح بدلے کی سوچتے۔

انٹرمیڈیٹ میں میں ایک سال پہلے لکھنؤ آ گیا، وہ ایک سال بعد ۱۹۳۸ء میں آئے۔ ہم لوگ اب ایک ساتھ رہنے لگے۔ میں اور میرا مرحوم بھائی علی اعتماد، خورشید بھائی اور اُن کے چچازاد بھائی اور بہنوئی مرحوم ابوجعفر جوبلی کالج میں علی عباس حسینی، اختر علی تلہری، خواجہ اطہر حسین رند، حامداللہ افسر مولوی ثاقب حسین نے ایک فعال ادبی ماحول بنا رکھا تھا۔ وہاں اردو کی "انجمن ادب" کا انتخاب ہوا۔ مجھے خورشید بھائی اور اب دور افتادہ دوست عبادت بریلوی نے سکریٹری شپ کا امیدوار بنا دیا۔ زوردار الکشن ہوا اور میں کامیاب ہو گیا۔ اس کامیابی میں خورشید بھائی اور ایک اور مرحوم دوست مسعود علی ذوقی کی کوششوں کا خاص دخل تھا۔ اسی سال ہم نے جوبلی کالج میں بڑی آن بان کا آل انڈیا مشاعرہ کیا۔ اس کی کامیابی میں عبادت بریلوی کی کوششیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

کالج کے باہر ہمارے مشترک دوستوں اور بزرگوں میں احتشام صاحب کا اضافہ ہوا۔ یونیورسٹی میں مسعود حسن رضوی ادیب مولوی محمد حسین صاحب اور عبدالقوی فانی صاحب، احمد علی، ڈاکٹر عبدالعلیم، ڈاکٹر سلمان احمد علی وغیرہ تھے۔ یونیورسٹی کے باہر آرزو لکھنوی، صفی لکھنوی آسی الدنی وغیرہ سے ملاقاتیں رہیں، اخبار نویسوں میں انیس احمد عباسی اور غلام احمد فرقت اور دوسرے ادبا اور شعرا میں شوکت تھانوی سے زیادہ قربت نصیب ہوئی۔ اسی زمانے میں ترقی پسندی کا زور ہوا۔ خورشید بھائی نے محتاط طبیعت پائی تھی۔ انھوں نے اس تحریک میں کوئی عملی حصہ تو نہیں لیا لیکن اس کی کانفرنسوں اور جلسوں میں خاموشی سے شرکت کرتے رہے۔ احتشام، فراق، جوش اور فیض کے پرستاروں میں تھے، سردار جعفری، مجاز، سلام مچھلی شہری سبط حسن وغیرہ سے خاصے مراسم ہو گئے تھے اور حبیب احمد خاں سے جو بعد میں مدرس جا کر وہیں کی خاک میں جا ملے، خورشید بھائی کے بے حد گہرے تعلقات تھے۔ حبیب احمد صاحب اُن دنوں ایم۔ این

والے کے مداح یعنی رائسٹ تھے، خورشید بھائی ان سیاسی جھمیلوں میں نہیں پڑتے تھے، لیکن دوستی کے ناتے حبیب صاحب ان کے جو سیاسی کام چاہتے کرا سکتے تھے، بشرطیکہ مرحوم کے ضمیر پر وہ کام بار نہ ہوتا۔

یونیورسٹی پہنچنے سے پہلے ہی میں سیاسیات میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ شروع میں یہ دلچسپی صرف طالب علموں کی سیاست سے متعلق تھی۔ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے قیام سے لے کر آزادی کے بعد آل انڈیا اسٹوڈنٹس کانگریس میں تبدیل ہو جانے تک میں طالب علموں کی تحریک سے اس طرح وابستہ تھا کہ صبح و شام اور سرد یا کی خبر نہ تھی۔ ہڑتالیں، جلوس، جلسے تنظیمی کارروائیاں، سارا وقت انھیں میں گزرتا اور تعلیم کی طرف سے تقریباً بے توجہی برتتا۔ خورشید بھائی مجھے اپنے مخصوص محتاط انداز میں متنبہ کرتے رہے۔ یہ اور بات ہے کہ جنونِ عمل مجھے آہستہ روی یا محتاط خرامی کی بات سننے ہی نہ دیتا تھا۔ وہ خود طالب علموں کی سیاست میں عملی طور سے شریک نہیں ہوئے لیکن برابر آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ممبر بنے رہے۔ اس کی کانفرنسوں میں باقاعدہ ٹکٹ لے کر شریک ہوتے رہے۔ یونیورسٹی یونین الکشنوں میں وہ ہمیشہ فیڈریشن کے ممبر بنے رہے۔ اس کی کانفرنسوں میں باقاعدہ ٹکٹ لے کر شریک ہوتے رہے۔ یونیورسٹی یونین الکشنوں میں وہ ہمیشہ فیڈریشن کے امیدواروں کو ووٹ دیتے اور ان کی کنونسنگ کرتے۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ ہر انتخاب میں میرے ساتھ ساتھ کام کرتے، چاہے میں جدھر بھی رہتا۔ کچھ دنوں بعد مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی شکل میں مسلم لیگ سے تعلق رکھنے والے طلبہ کی جماعت قائم ہوئی۔ وہ اس سے ہمیشہ الگ رہے، بلکہ مخالفت کرتے رہے۔ وہ کبھی مسلم لیگ کے موید نہیں ہوئے بلکہ اس کی پرجوش مخالفت کرتے رہے، زندگی کے آخری لمحوں تک سچی قوم پروری کی علامت بنے رہے۔

اسی دوران، وہ زمانہ بھی آیا جب میرے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری ہوا۔ فیڈریشن کے رفیقوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جس طرح سے بھی ہو مجھے سالانہ کل ہند کانفرنس تک اپنے کو گرفتاری سے بچانا چاہیے۔ کچھ دنوں اِدھر اُدھر پناہ لینے کے بعد میں نے آخر کار میٹ ہوسٹل کے اس کمرے کو اپنی روپوشی گاہ بنایا جو خورشید بھائی کی اقامت گاہ تھا۔ انھیں میں حبیب صاحب بھی شامل تھے۔ چنانچہ اب ان دونوں سے ملاقاتیں اور بحثیں اور مشورے ہونے لگے۔ ہم خورشید بھائی کی صائب رائے کا بڑا احترام کرتے تھے۔ یہ سلسلہ کئی مہینوں تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ ایک روز رات کے بارہ بجے کار سے میں وہاں سے نکل بھاگا اور سیدھے ناگپور پہنچا جہاں سالانہ اجلاس ہونے والا تھا۔ اس دور کی تفصیلات کا یہ محل نہیں، ورنہ کہانی دلچسپ ہے۔ خیر میں ناگ پور میں گرفتار ہوا، لکھنؤ میں مقدمہ چلا، سزایاب ہوا، اور بالآخر بنارس سنٹرل جیل سے رہا ہوا۔ رہائی کے بعد جب میں محمد آباد اسٹیشن پر پہنچا ہوں تو خورشید بھائی وہاں پھولوں کا ہار لیے موجود تھے۔ ماموں نے جو تحریک کے مخالف تھے میرے لیے اسٹیشن پر ہاتھی بھیجا۔ گھر پہنچنے پر ایک استقبالیہ جلسہ ہوا، جس میں خورشید بھائی نے تقریر کی۔ یہ ان کی پہلی عوامی سیاست سے متعلق تقریر تھی۔

اب وہ وکالت کے آخری سال میں آئے اور وکالت پاس کرنے کے بعد کچھ دنوں غازی پور میں وکالت کی۔ پھر راشننگ انسپکٹر ہو گئے لیکن ان کی دیانت داری نے انھیں اتنا ستایا کہ وہاں سے استعفیٰ دیدیا۔ پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد وہ "قومی آواز" کے ادارتی عملے میں شامل ہو گئے۔ بڑے خلوص اور بڑی لگن سے کام کرنا ان کا ہمیشہ شعار رہا۔ یہاں بھی محنت، صلاحیت اور خلوص کی بنا پر وہ بہت جلد ہر دل عزیز ہو گئے۔ ترجمہ بہت تیزی سے اور بہت صحیح کرتے تھے۔ "قومی آواز" کا یہ تجربہ لے کر وہ حکومت اترپردیش کے محکمہ اطلاعات میں جرنلسٹ کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ کچھ دنوں بعد میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ زندگی میں کبھی کبھی جو اتار چڑھاؤ آتے ہیں انھیں میں ایک یہ بھی تھا کہ میں اس شعبۂ اردو کا سربراہ ہو گیا جس سے مرحوم وابستہ تھے۔ میرے نزدیک اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ بزرگ تھے۔ جس ماحول کا میں پروردہ ہوں اس میں ایک دن کی بڑائی چھٹائی بھی معنی رکھتی ہے۔ یہاں تو وہ تقریباً ایک سال بزرگ تھے، لیکن خورشید بھائی کے یہاں فوری طور پر تبدیلی آئی۔ میرے کمرے میں آنے کے بعد انھوں نے مجھے "زیدی صاحب" کہا تو مجھے دھکا سا لگا۔ "خورشید بھائی! ایسا غضب تو نہ کیجیے گا" میں نے احتجاج کیا۔ "میں آپ کا وہی جواد ہوں!" انھوں نے مجھے یاد دلایا "لیکن یہ دفتر ہے۔ یہاں آپ سب کے لیے

زیدی صاحب میں نہ کافی دنوں تک یہ رسّہ کشی چلتی رہی ۔ وہ آتے تو میں کرسی سے ذرا سا اٹھ جاتا لیکن وہ اس پر احتجاج کرتے اور یہ ان کے احتجاج کا نتیجہ تھا کہ آخر میں میں دفتر میں "زیدی صاحب" اور گھر پر "جواد میاں" ہو گیا۔ آخر آخر تک وہ کبھی کبھی "زیدی صاحب" کہہ کر پکارتے اور میں ہر بار چونک پڑتا۔

خورشید بھائی نے ہمارے خاندان میں سب سے پہلے ایم اے کیا۔ بی اے (آنرز) اور ایم اے دونوں ہی جماعتوں میں وہ اول آئے ان کا مضمون اردو تھا۔ ان کے علم کا اندازہ ڈگری سے نہیں لگایا جاسکتا۔ ان کا وسیع مطالعہ انھیں بہت سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری پانے والوں سے بھی ممتاز کرتا تھا۔ وہ اُن لوگوں میں تھے جن سے وقت بے وقت ضرورتاً میں بھی مشورے کر لیا کرتا تھا۔

محکمۂ اطلاعات سے وہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ ریٹائر ہونے تک وہ لگاتار محنت کرتے رہے۔ اسی میں اُن پر قلبی دورہ پڑا، لیکن جیسے ہی ذرا سنبھلے، پھر دفتر پہنچ کر فرائض منصبی میں مشغول ہو گئے۔ ان فرائض میں "نیا دور" کی ادارت انھیں سب سے زیادہ عزیز اور محبوب تھی۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے نیا دور کا معیار ہمیشہ بلند رکھا۔ نثر و نظم دونوں ہی حصوں پر گہرائی سے نظر کرتے اور معیار کے معاملے میں کسی طرح کی مفاہمت گوارا نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے کئی اہم خصوصی شمارے شائع کیے اور تمام شماروں میں بھی ایسا معیاری مواد یکجا کر دیا ہے کہ نیا دور حوالے کے طور پر استعمال ہوتا رہے گا۔

خورشید بھائی نے جو اشعار لکھے وہ محفوظ نہیں رکھے۔ تین اشعار اُن کی طالب علمی کے زمانے کے یاد رہ گئے ہیں۔ انھیں اس خیال سے درج کیے دیتا ہوں کہ کم سے کم یہی محفوظ رہ جائیں۔

ہمت افزا و فوریہ مستی ہے — ہر بلندی نظر میں پستی ہے
مشت خاک اور وہ بھی برسرباد — میری ہستی بھی کوئی ہستی ہے
جا کے زیر زمیں کوئی ٹھہرا — وہ بھی کیا دل فریب بستی ہے

انھوں نے بہت سے مختصر رسالے اور مضامین لکھے، لیکن یہ سرکاری اور نشری مقاصد کے لیے وقف تھے اور بے نام شائع ہوئے۔ ایک پوری کتاب "دفاع کشمیر" کا بڑا حصہ انھیں کا ترجمہ کیا ہوا ہے۔ جب میں "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" مرتب کر رہا تھا تو انھوں نے اس کی ترتیب میں میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ بہت سا مواد انھوں نے ہی فراہم کیا اور میں نے تحریری طور پر اس کا اعتراف بھی کیا۔ یہی حال "نغمۂ آزادی" کی تالیف کے سلسلے میں بھی ہوا۔ ایسی خاموش ادبی خدمت کرنے والے کتنے ہیں!

خورشید بھائی اردو اکادمی کے رکن منتخب ہوئے اور اس کی لائبریری کمیٹی کے بھی رکن تھے۔ اگرچہ صحت گر چکی تھی اور دل کے مریض ہو چکے تھے لیکن اکادمی کے کاموں میں دلچسپی لینے لگے۔ مجھے اکثر اپنے مشوروں سے نوازتے۔ ریٹائر ہونے کے بعد ان کو وطن کی یاد ستانے لگی اور خاصا وقت کرہان میں گزارنے لگے۔ اب کرہان کی بہار خزاں ہو چکی تھی، وہ محفل اجڑ چکی تھی۔ انھوں نے پھر محفل جمانے کی کوشش کی۔ پہلے ایک لائبریری کے قیام میں عملی حصہ لیا۔ اپنی کتابوں کا معقول ذخیرہ لائبریری کی نذر کر دیا۔ اس کے چیرمین ہوئے۔ وہاں ایک اردو میڈیم اسکول بچیوں کے لیے کھلوایا۔ دونوں کو شمیم کا نام دیا، اپنا نہیں۔ یہ ایثار سب کے بس کی بات نہیں۔ کرہان ہی میں وہ اپنی تحت لفظ خوانی کے جوہر دکھاتے تھے۔ اس میں شک نہیں وہ اچھے اور کامیاب تحت اللفظ پڑھنے والوں میں تھے۔ کلام انیس کے شیدائی اور اس کے بڑے حصّے کے حافظ تھے۔ لیکن اسے کرہان تک محدود رکھا اور لکھنؤ کی اثر انگیز فضا میں بھی کسی کو اپنے اس ہنر کی ہوا نہ لگنے دی۔ وہی خاموشی طبع یہاں بھی طرۂ امتیاز رہی۔

مرحوم کے دوستوں میں دانش محل، لکھنؤ کے نسیم احمد، محکمۂ اطلاعات کے صباح الدین عمر، طالب علمی کے دور کے ساتھیوں میں عبدالمجیب سہالوی اختر اعظمی، نجم الدین شکیب وغیرہ مشترک دوست تھے۔ دانش محل برابر جاتے اور وہاں کے اٹھنے بیٹھنے والوں سے مختلف ادبی اور ثقافتی مسائل پر گفتگو کرتے تھے۔ ان محفلوں میں بھی دورِ جوانی کی گرم جوشی نہ رہ گئی تھی لیکن وہ وضع داری نباہے جاتے تھے۔ وہ خلوص اور وضع داری کا پیکر تھے اور اس معاملے میں اگر کسی دوست کے یہاں کوئی فرق بھی پاتے تو

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

فاروق انور
قومی آواز لکھنؤ

غریبی اور بے روزگاری سے نبرد آزما

اتر پردیش

ہندوستانی جمہوریت نے ملک کے حالات کی مناسبت سے معیشت کا جو بنیادی ڈھانچہ تیار کرنا چاہا ہے اس میں غریب ترین اور کمزور ترین طبقات کے لیے سماجی اور ثقافتی آزادی اور مساوات کا بھی پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کے ۲۰ نکاتی پروگرام میں بھی اس پہلو کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ غریب کو خوشحالی کے ساتھ سماجی تحفظ اور وقار بھی حاصل ہو۔ وزیراعلیٰ شری سری پت مشرا کی حکومت غریبی اور اس سے متعلق مسائل کے ساتھ ساتھ ۲۰ نکاتی پروگرام کی اہمیت اور افادیت سے بھی واقف ہے اور اس سلسلے میں اس نے جو اقدامات کئے ہیں وہ اپنی وسعت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے بہت نمایاں ہیں اور جن کے اثرات زراعت اور صنعت کے میدان میں بھی واضح طور سے نظر آتے ہیں۔

عکس اور آئینہ

اترپردیش میں کئے جانے والے ترقیاتی اقدامات سے متعلق صورت حال کا جامع اور واضح عکس بہرحال اعداد و شمار کے آئینہ ہی میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اترپردیش کی معیشت زراعت پر مبنی ہے کیوں کہ یہاں کی تقریباً ۷۰ فیصدی آبادی زراعت اور اسی سے متعلق دوسرے کاموں سے اپنی روزی روزی حاصل کرتی ہے اور اس طرح ریاستی معیشت میں زراعت کا حصہ نصف سے بھی کچھ زائد (تقریباً ۵۲ فیصد) تک جا پہنچتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ریاست کی معاشی ترقی کا انحصار بڑی حد تک زرعی پیداوار پر ہے اور یہاں زرعی پیداوار اور زرعی پیداواریت میں مزید اضافے کی زبردست گنجائش اور مواقع موجود ہیں جن کے پیش نظر ترقی یافتہ جدید طریقے اختیار کرنے، دیہی علاقے میں کسانوں کو فصلی قرضے، ترقی یافتہ بیج کیمیائی کھاد، آبپاشی، جدید ترین زرعی معلومات اور دوسری سہولتیں فراہم کرنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سیلاب اور خشک سالی کے باوجود ریکارڈ زرعی پیداوار ہوئی ہے۔

غلے کی پیداوار:

غلے کی پیداوار نے ۱۹۸۲-۸۳ء میں تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دیے اور ۲ کروڑ ۶۳ لاکھ ۵۲ ہزار ٹن غلہ پیدا ہوا جبکہ ۱۹۷۸-۷۹ء میں ۲ کروڑ ۳۱ لاکھ ۷ ہزار ٹن اور ۱۹۷۹-۸۰ء میں ایک کروڑ ۶۴ لاکھ ۳۹ لاکھ ٹن غلہ پیدا ہوا تھا۔ ۱۹۸۲-۸۳ء میں ربیع کی پیداوار بھی ایک کروڑ ۷۱ لاکھ ۶۰ ہزار ٹن کے مقررہ نشانہ سے آگے بڑھ کر ہر سال سے زیادہ ایک کروڑ ۸۶ لاکھ ٹن رہی۔ یاد رہے کہ اس سے پہلے کے سال میں یہ پیداوار ایک کروڑ ۲۸ لاکھ ٹن تھی اس طرح ۱۹۸۲-۸۳ء میں ملک میں ۵۰ لاکھ ٹن فاضل غلے کے ذخیرے میں اترپردیش کی جانب سے ۲۵ لاکھ ٹن غلہ فراہم کیا گیا اور پوری کوشش کی جارہی ہے کہ یہ رجحان موجودہ سال بھی برقرار رہے۔

ان کامیابیوں کے پیش نظر ۱۹۸۳-۸۴ء کے لیے ربیع کی پیداوار کا نشانہ ایک کروڑ ۹۱ لاکھ ۶۰ ہزار ٹن مقرر کیا گیا ہے اور خریف کی پیداوار کا تخمینہ بھی اس سال سب سے زیادہ ہے اور توقع ہے کہ خریف کی پیداوار میں تقریباً ۸۵ لاکھ ٹن کا اضافہ ہوگا۔

گیہوں:

گیہوں کی پیداواریت کا اوسط جو ۱۹۷۸-۷۹ء میں ۵۰ء۱۵ کوئنٹل فی ہکٹیر تھا ۱۹۸۲-۸۳ء میں ۶۰ء۱۸ کوئنٹل فی ہکٹیر رہا ہے ظاہر ہے کہ ۴ سال کے وقفے میں گیہوں کی پیداواری صلاحیت میں ۲۰ فی صد اضافہ ہوا ہے جس کی بنیاد پر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ اترپردیش بھی ملک کی ان ریاستوں

(?) صہ میں شامل ہو جائے گا جو گیہوں کی زبردست پیداوار کے لیے مشہور
ہیں بشرطیکہ پیداوار میں اضافے کا یہ رجحان زراعت کے جدید طریقوں
کی حوصلہ افزائی اور کسانوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دے کر برقرار
رکھا جائے جس کے لیے کوشش ہو رہی ہے۔

اس کے علاوہ آبپاشی کے رقبے میں ہر سال تقریباً ۱۰ لاکھ ہیکٹیر اضافہ
ہے اور فرٹیلائزر کے استعمال کو ہر سال مزید ۱۴ فی صد فروغ دے کر زرعی
پیداوار کو بڑھانے میں مدد مل رہی ہے۔ دوہری فصلوں اور دیگر کھیتی کے
پروگراموں سے بھی زرعی پیداوار بڑھ رہی ہے۔

گنا اور آلو

اترپردیش میں گنا اور آلو بھی خاصا پیدا ہوتا ہے۔ یہ نقد فصلیں
کسانوں کو تیزی سے خوشحال بناتی ہیں۔ ۱۹۸۲-۸۳ء میں سابقہ سال کے
مقابلے میں ۶ لاکھ ٹن زیادہ یعنی ۴۸ لاکھ ٹن آلو پیدا ہوا تھا

گنے کی پیداوار ۱۹۸۲-۸۳ء میں ۷ کروڑ ۹۱ لاکھ ٹن تھی جب کہ ۱۹۸۱-
۸۲ء میں یہ ۷ کروڑ ۲۶ لاکھ ٹن، ۱۹۸۰-۸۱ء میں ۵ کروڑ ۷۶ لاکھ
ٹن اور ۱۹۷۹-۸۰ء میں ۴ کروڑ ۱۷ لاکھ ٹن تھی۔ ۱۹۸۲-۸۳ء میں کسانوں
کے گنے کی مجموعی قیمت بھی ہر سال سے زیادہ ۴ ارب ۲۷ کروڑ روپے تھی
جس میں سے ۴ ارب ۵۰ کروڑ روپے ادا کیے جا چکے ہیں اور بقایا ۲۲ کروڑ
روپے بھی بہت جلد ادا کر دینے کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔

صنعت کی ترقی

زراعت کے میدان میں زبردست کامیابیوں کے باوجود یہ اعتراف
کرنا پڑے گا کہ صنعت کے میدان میں اترپردیش کو ترقی کی متعدد منزلیں طے
کرنا ہے اور آبادی کی ضرورتوں ملکی تقاضوں اور سائنس اور ٹکنالوجی کے
میدان میں آگے بڑھنے کی امنگوں کی تکمیل کے لیے بھی اور روزگار کے زیادہ
سے زیادہ مواقع فراہم کرنے اور ریاست کی معیشت کو فروغ دینے اور مستحکم
بنانے کے لیے بھی اترپردیش میں سرکاری اور نجی امداد باہمی زمرے کی بڑی
چھوٹی اور متوسط صنعتوں کا قیام اور فروغ ضروری ہے۔

اس کے لیے صنعتوں اور سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی ضروری ہے
عوام کو ترغیب دینے اور صنعتیں قائم کرنے کے لیے مناسب امداد اور سہولتیں
فراہم کرنا بھی ضروری ہے۔ یہی نہیں صنعتوں کو دیہی علاقوں تک پہنچانے
کا کٹھن کام بھی کرنا ہے۔ اس کام کی ابتدا ہو چکی ہے اور گذشتہ چند برسوں
کے دوران یہ کام خاصا آگے بڑھا ہے۔ اترپردیش اپنی آبادی کے لحاظ سے
سب سے بڑی ریاست ہے لیکن رقبے کے لحاظ سے بھی بڑی ریاستوں میں
اس کا شمار ہوتا ہے۔ متعلقہ پروگراموں اور اسکیموں نیز اعداد و شمار
پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ صنعت کے میدان میں
بھی زبردست اقدامات کیے جا رہے ہیں اور گذشتہ چند برسوں کے درمیان
ان کی رفتار تیز تر ہوئی ہے۔

بڑی اور درمیانہ درجے کی صنعتوں کے قیام کے لیے ریاست میں پہلے
ہی ابتدا کی جا چکی ہے اور اس وقت ان صنعتوں کے لائسنسوں کی تعداد
ریاست میں پہلے سے خاصی زیادہ ہے اور ان لائسنسوں کی بنیاد پر صنعتیں قائم
بھی ہو چکی ہیں۔ جہاں تک چھوٹی صنعتوں کو فروغ دینے کا معاملہ ہے اس
کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۸۲-۸۳ء میں ۱۳ ہزار ۶ سو سے
زیادہ چھوٹی صنعتوں کا قیام عمل میں آیا۔

نجی سرمایہ کاری

صنعتی میدان میں نجی صنعت کاری کی ہمت افزائی کے لیے ریاستی
حکومت ضروری امداد اور سہولتیں بہم پہنچانے کا ایک بنیادی ڈھانچہ
تیار کرنے کے ساتھ ساتھ سیلز ٹیکس سے مستثنیٰ کرکے، خصوصی اہمیت کے
حامل بعض دا هدوں کو "باوقار" اور "رہبر" صنعتیں سمجھتے ہوئے انھیں ترغیبات
دے کر نیز پسماندہ اور صنعت سے عاری اضلاع میں لائسنسوں اور
اجازت ناموں کے اجرا میں ترجیح دے کر اور اسی طرح کے دیگر متعدد اقدامات
کرکے ریاستی حکومت صنعتوں کے فروغ کے لیے سرگرم عمل ہے۔ اترپردیش
کے ۵۷ اضلاع میں سے ہر ایک میں ترجیحی سطح پر کم سے کم ایک بڑی یا درمیانہ
درجے کی صنعت قائم کرنے کا منصوبہ بھی ہے یہ صنعتیں سرکاری یا نجی یا مشترکہ
زمرے میں ہوں گی۔

۱۹۸۳-۸۴ء میں مذکورہ "باوقار" اور "رہبر" یونٹوں کے لیے ایک
نیا پروگرام شروع کیا گیا ہے اور پسماندہ اضلاع میں نئی یونٹوں کو سرمایہ
کاری کی مرکزی سبسیڈی بھی دی جائے گی۔ اس کے علاوہ غیر پسماندہ پسماندہ
اور صنعت سے محروم اضلاع میں بھی نئی یونٹوں کو علی الترتیب ۵، ۶ اور ۷
سال تک اپنی تیار شدہ اشیا پر سیلز ٹیکس بھی نہیں ادا کرنا ہوگا۔

ادیوگ بندھو

اس سلسلے میں "ادیوگ بندھو" پروگرام خصوصیت سے قابل ذکر ہے جس کے ذریعے صنعت کاروں کو ایک ہی مقام پر تمام معلومات اور سہولتیں فراہم کرنے کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ ادیوگ بندھو کے جلسے وزیراعلا کی صدارت میں مقررہ وقفے سے ہوتے ہیں اور ان میں متعلقہ وزرا اور افسران بھی موجود ہوتے ہیں جو صنعت کاروں کے مسائل موقع ہی پر حل کر دیتے ہیں۔

نئی صنعتوں کے مسائل حل کرنے کے لیے وزیراعلا کی سربراہی میں ایک اعلا اختیاری کمیٹی بھی تشکیل کی جا چکی ہے۔ اس کمیٹی کے جلسوں میں بھی صنعت کاروں کے مسائل موقع ہی پر حل کر دیے جاتے ہیں۔ نئی صنعتوں کے مختصر ترین وقفے میں پایۂ تکمیل تک پہنچنے کے مقصد سے متعلقہ امداد اور سہولتیں فراہم کرنے کا ایک بنیادی ڈھانچہ تیار کیا جا رہا ہے متعلقہ منصوبے میں اس کا بندوبست بھی کیا گیا ہے کہ ریاست کے "صنعت میں صفر" اضلاع کے ہر بلاک میں ایک "صنعتی علاقہ" قائم کیا جائے۔

دیہی صنعتوں کے فروغ پر بھی معقول توجہ دی جا رہی ہے اور اس سلسلے میں مسائل کو نپٹنے کے لیے ریاستی سطح پر ایک "خصوصی سیل" قائم کیا گیا ہے جو دیہی صنعت کاری کے لیے منصوبے بنائے گا اور دیہی صنعتوں کے فروغ کے لیے اقدام بھی کرے گا۔

مرکزی سرمایہ کاری

اترپردیش میں صنعت کے فروغ کی نئی حکمت عملی میں مرکزی زمرے کی سرمایہ کاری بھی شامل ہے اور توقع ہے کہ آئندہ چند برسوں میں یہاں متعدد مرکزی پراجیکٹوں پر کام شروع ہو جائے گا جن پر ۳۰ ارب روپے کی لاگت آئے گی۔ ان پراجیکٹوں سے، دیں پنجسالہ منصوبے کے دوران فائدے حاصل ہونے لگیں گے۔

یاد رہے کہ ماضی میں مرکزی سرمایہ کاری صرف ۵ ارب روپے کی رہی ہے۔

چھٹے پنجسالہ منصوبے کے اختتام تک توقع ہے کہ ریاستی حکومت کے تقریباً ۵ ارب ۶۱ کروڑ روپے کے متعدد پراجیکٹ بھی پایہ تکمیل تک پہنچ جائیں گے۔

متعدد پروگرام

مربوط دیہی ترقی پروگرام کے تحت ۸۳-۱۹۸۲ء میں اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے ۲ کروڑ ۷۲ لاکھ کنبوں سمیت مجموعی طور سے ۵ کروڑ ۶۵ لاکھ کنبے مستفید ہوئے ہیں۔ جو خط افلاس سے نیچے زندگی بسر کر رہے تھے اس سال بھی تقریباً اتنے ہی کنبوں کے اس پروگرام سے فائدہ اٹھانے کی توقع ہے۔ اسی طرح اس سال تقریباً ۷۰ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے کی سبسڈی کی تقسیم کا تخمینہ ہے جبکہ گزشتہ سال اس مد میں ۶۴ کروڑ ۴۵ لاکھ روپے تقسیم کیے گئے تھے۔

اسی طرح مختلف پروگراموں کے تحت ۱۴۵۴۶ اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے کنبوں سمیت ۸۱۸۳ کنبوں کیلئے گھروں کی تعمیر کی گئی ۷۴۹۸۵ بایو گیس پلانٹ لگائے گئے، امداد باہمی زمرے میں ۸۵۹ دیہی گوداموں کی تعمیر ہوئی گزشتہ سال مارچ ۱۹۸۳ء کے اختتام تک ایسے ۱۲۴۰۰ مواضعات میں پینے کے پانی کی فراہمی کا بندوبست کیا جا چکا ہے جہاں پانی کی قلت تھی اور ۸۵-۱۹۸۴ء کے اختتام تک اسی طرح کے ۳۵۵۰۶ مواضعات میں پینے کے پانی کا بندوبست کر دیا جائے گا۔

چھٹے پنجسالہ منصوبے کے دوران ۱۵ لاکھ ہریجن کنبوں کو خط افلاس سے اوپر اٹھانے کے مقررہ نشانے کے تحت ستمبر ۱۹۸۳ء کے اختتام تک دس لاکھ ۱۰ ہزار ہریجن کنبوں کو مستفید کیا جا چکا ہے اور یہ کام اب بھی جاری ہے اترپردیش میں غریبی کے خاتمے کا پروگرام مرکزی حکومت کی امداد سے چلایا جا رہا ہے جس سے روزگار کے مزید مواقع بھی فراہم ہو رہے ہیں اور معیار زندگی بھی بلند ہوتا جا رہا ہے۔

امن و قانون

جرائم، جرائم پیشہ افراد اور مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے افراد پر قابو پانے اور ریاست میں امن و قانون اور نظم و نسق کی صورت حال کو زیادہ سے زیادہ بہتر اور مستحکم بنانے کے لیے ایک طرف انتظامیہ اور پولیس کو چست فعال اور مستعد بنانے کے اقدامات کیے گئے ہیں اور دوسری طرف زرعی اور صنعتی ترقی کی رفتار تیز تر کرنے کے لیے متعلقہ ذمے داروں اور منتظم کاروں کو تربیت دینے اور ان کی اہلیت اور صلاحیت میں اضافہ کرنے کی کوششیں بھی کی جا رہی ہیں۔

بجلی

اترپردیش کے دیہی علاقوں کے علاوہ شہری علاقوں میں بھی بجلی کا بحران ایک سنگین مسئلہ رہا ہے لیکن گھریلو استعمال کے ساتھ ساتھ زرعی اور صنعتی استعمال میں آنے والی بجلی کی فراہمی کی صورت حال میں سدھار لانے کی کوششیں ناکام نہیں رہی ہیں، جس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ حال ہی میں اوبرا تھرمل پاور کمپلکس میں آگ لگ جانے کی بنا پر بجلی کی مجموعی پیداوار میں کمی آنے کے باوجود بجلی کی دستیاب پیداواری صلاحیت کو بروئے کار لاکر ریاست کو بہر حال بجلی کے بحران سے محفوظ رکھا گیا اور صرف چند دنوں کی معمولی کٹوتی کے علاوہ ریاست کو کسی بڑی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

چھٹے پنجسالہ منصوبے میں بجلی کی شرح نمو ۱۰،۵۷ فی صد مقرر کی گئی تھی لیکن "آنپارہ"، "پاریچھا"، "مانڈہ" اور "راندچا بار" کے زیر تعمیر پلانٹوں و متعدد ہائیڈرو الیکٹرک پراجیکٹوں کے بتدریج پیداوار شروع کر دینے کی بدولت توقع ہے کہ تنصیبی صلاحیت ۱۰ فی صد تک پہنچ جائے گی۔ مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں بڑے تھرمل پاور پراجیکٹوں کے "پی ایل ایف" (پاور پلانٹ لوڈ فیکٹر) میں بھی ۱۹۸۲ء تک ۴۷ فی صد اضافہ ہو چکا تھا۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار شاہد ہیں کہ اترپردیش نے گذشتہ چند برسوں کے دوران غریبی، پسماندگی اور بے روزگاری دور کرنے اور ترقی، خوشحالی نیز استحکام لانے کے لیے بھرپور جدوجہد کی ہے اور ایسے اقدامات کیے ہیں جن سے سماجی مساوات کی راہ بھی ہموار ہوتی ہے۔

★

اعجاز صدیقی —— صفحہ ۳۱ کا بقیہ

پکار کر کہہ رہی ہے ؎

اب کہاں مشکل رہا مسدود راہوں کا سفر

دل کا دورہ ساڑھے پانچ بجے پڑا۔ بڑی عجلت سے ہسپتال پہنچایا گیا سات بجے پیامِ اجل پہنچ گیا۔ انتقال کے بعد گھر لایا گیا اور اسی پلنگ پر لٹا دیا گیا جس پہ بیٹھ کر تحریری کام کیا کرتے تھے۔ شام کو چار بجے جنازہ اٹھایا گیا اور ناریل باڑی قبرستان (مجگاؤں) میں ابدی نیند سلا دیا گیا ؎

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

★

آفتاب لکھنوی

برابر کی فیس

امید و بیم کے چکر میں ڈال کر مجھ کو
سنائے اس نے عدو کو تری کے افسانے
زبانِ خشک سے میں نے کیا جو شکوۂ غم
لگے وہ سوئے فلک رو کے ہاتھ پھیلانے
یہ رنگ دیکھ کے فی الوقت کھنچ گیا میں بھی
اُدھر عدو بھی لگا اپنا زور دکھلانے
نہ بس چلا تو میں اک جوتشی کے گھر پہنچا
ڈٹے ہوئے تھے جہاں اور چند متانے
غرض کہ بیٹھ گیا میں بھی اپنے نمبر پہ
جو ٹرن آیا تو خود ہی لگا وہ فرمانے
میاں تمہیں بھی ستایا ہے عشق نے شاید
جبھی تو آئے ہو اس در پہ بیٹھ کسوانے
سوال یہ ہے کہ کچھ جیب میں بھی لائے ہو
میں ایک کام کے لیتا ہوں پونے پانچ آنے
کہا یہ میں نے کہ اے پاسبانِ علمِ نجوم
جو تو نہ ہو تو ستاروں کو کون پہچانے
تری نظر میں ہے آوارگیِ شمس و قمر
ترے دماغ میں روشن ہیں اُن کے افسانے
یہ اس کمال و ہنر پہ بھی اک تعجب ہے
کہ میری جیب کی حالت کو تو نہ پہچانے
میں ہوں وہ مفلسِ اعظم کہ جس کو مرغی نے
دیئے ہیں کھانے کو اکثر جوار کے دانے
یہ انتہا ہے کہ سر کو منڈا کے پھرتا ہوں
اور ایک ٹیپ کے لیتا ہوں پونے پانچ آنے

غزلیں

واحد القادری
تھانہ روڈ، رام پور
یو پی

مرے خلوص پہ تنقید کرنیوالا تھا
وہ اپنی بات کی تردید کرنیوالا تھا

اُسے بھی پھر کوئی موضوعِ گفتگو نہ رہا
میں جب فسانے کی تمہید کرنیوالا تھا

قبول کرتا کسی اجتہاد کو کیوں کر
ہمارا ذہن ہی تقلید کرنیوالا تھا

میں اپنے آپ سے کبتک منحرف ہوتا
جو ل رہا تھا وہ تاکید کرنیوالا تھا

گھٹا تھی دوشِ ہوا پر لیے ہوئے خوشبو
کہ موسم آج بھی امید کرنیوالا تھا

اسے بھی غربت و افلاس لیکے ڈوب گئے
وہ شخص تو عزمِ تائید کرنیوالا تھا

سبھی کو بزم میں واحد تھا انتظار اس کا
جو شامِ غم سحرِ عید کرنیوالا تھا

شفیع اللہ خاں راز اٹاوی
ایس۔ این کالج
کٹرہ پیر ذال خاں اٹاوہ

گلستاں سے مجھے صدا دی تھی
کوئی پھولوں کی شاہزادی تھی

میری آنکھوں میں دیکھ کر آنسو
غم کی تصویر مسکرا دی تھی

جب وہ آئے تو شوخ موسم نے
دھوپ میں چاندنی ملا دی تھی

طنز سنر مارہا تھا سناٹا
دشتِ ظلمت میں ذرزادی تھی

ہم خطاکار تھے، مگر اُس نے
بے خطاؤں کو بھی سزا دی تھی

سرد موسم حسین تھا، لیکن
روح میں آگ سی لگا دی تھی

کوہ آتش فشاں پہ لکھا ہے
شعلگی، راز برف زادی تھی

حسن فراز
۱۴۱۔ شاہ گنج، نخاس
لکھنؤ ۳

وہ جو ماضی بھلا نہیں سکتے
اپنی منزل وہ پا نہیں سکتے

جن کی نظریں نہیں ہیں طوفاں پر
وہ سفینے بچا نہیں سکتے

وقت کیا چاہتا ہے سوچو تو
ورنہ تم کچھ بھی پا نہیں سکتے

ہے مرض جن کو خود پسندی کا
وہ حقیقت سنا نہیں سکتے

نور و ظلمات آگ اور پانی
ایک مرکز پہ آ نہیں سکتے

تیز رفتار نسل بوجھ ترا
بوڑھے شانے اٹھا نہیں سکتے

دل سے مجبور ہو گئے ہیں فراز
ہم انھیں اب بھلا نہیں سکتے

غزلیں

سیدہ شائستہ معراج
[illegible]

اتنی معراج پہ عزت کی نہ نیچے جائے
کوئی نظیر سے گھبرائے تو کترا جائے

بے رخی وہ ہے کہ ہر رخ سے ابھر آتی ہے
تیری تصویر کو کس طرح سجایا جائے

وعدہ لطف ہوا ہو کہ کوئی بے وجہ کرم
پہلے ہر بات کو معیار پہ پرکھا جائے

قدریں بدلی ہیں تو ہر موڑ پہ بھی اپنا ہوگا
زندگی کو نئے انداز سے دیکھا جائے

آؤ شائستہ غمِ یار کی جانب لوٹیں
دل کہیں پھر نہ غمِ ذات سے گھبرا جائے

سرفراز علی خاں رازؔ ملیح آبادی

احساسِ دردِ زخمِ وفا دے گئے مجھے
جھونکے ہوا کے رات مزا دے گئے مجھے

وہ دن کبھی جو گزرے تھے اک ہم نفس کے ساتھ
راتوں کو جاگنے کی سزا دے گئے مجھے

پھر کیا تھی گر نہیں تھی خلوصِ نظر کی بات
منہ پھیر کر وہ آج دعا دے گئے مجھے

ہے گرد و پیش اُن کی مہک ان کے بعد بھی
کتنی حسین تر یہ فضا دے گئے مجھے

گذرے کچھ اس طرح وہ خیالوں کے شہر سے
نازک سی خوشبوؤں کی قبا دے گئے مجھے

ہر لمحہ ہے خزاں کے تھپیڑوں سے واسطہ
کیسے کہوں کہ بادِ صبا دے گئے مجھے

شایانِ شان اپنے کوئی غم نہیں رہا
جینے کی اہلِ غم وہ ادا دے گئے مجھے

ہے رازؔ تیرا طرز نئی فکر کا امیں
اشعار کہہ رہے ہیں جلا دے گئے مجھے

فاطمہ وصیّہ جائسی
۳۰/۴، لائن، نشاط گنج، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۶

لمحہ لمحہ یوں ہی بیتا جائے ہے
انتظارِ دوست بڑھتا جائے ہے

کیا بتاؤں ان کو ساری الجھنیں
حال میرا مجھ سے پوچھا جائے ہے

شام آئی بھی نہیں ہمدم مگر
دل سویرے ہی سے سہما جائے ہے

جب بہاریں ہیں چمن میں ہر طرف
کس لیے کانٹوں سے الجھا جائے ہے

بدگمانی ختم ہوتی ہی نہیں
فاصلہ دونوں میں بڑھتا جائے ہے

آپ اتنا کس لیے خاموش ہیں
رنگ کیوں چہرے کا اترا جائے ہے

پھر امیدیں کروٹیں لینے لگیں
پھر سفینہ دل کا ڈوبا جائے ہے

قید کافی ہے وصیّہ کے لیے
کیوں نشیمن کو جلایا جائے ہے

عارف محمود
۱۲/۱۳ پردہ میراس
کانپور

افسانہ

تیسرا مہمان

ٹرین آج پھر کچھ لیٹ آئی تھی اسلئے اسٹیشن سے باہر آکر میں نے اسٹینڈ سے سائیکل لی اور تیز تیز چلانے لگا... راستے سے کیلاش کو بھی لینا تھا۔ پونے ۱۰ بج چکے تھے اور اس ماہ دفتر میں "دو کراس" پہلے ہی لگ چکے تھے تیسرے کے بعد ایک دن کی اتفاقیہ چھٹی کاٹ لی جائیگی۔ ہنھ یہ بھی کوئی زندگی ہے صبح پانچ بجے سے رات کو نو بجے تک کی غلامی اور اوپر سے یہ روز کا تھکا دینے والا سفر! خیالات کی رو چلتی رہی اور میں کیلاش کے دروازے پر پہنچ گیا۔ خلاف معمول وہ سامنے نہیں تھا ورنہ دفتر جانے کیلئے تیار ہو کر ساڑھے نو بجے سے ہی وہ میرا منتظر رہتا تھا۔ میں نے سائیکل کی گھنٹی بجائی تو ننھے راجو نے آکر بتایا "بابا آج پیدل ہی دفتر چلے گئے"۔ میرا ماتھا ٹھنکا شاید آج پھر بھابھی سے کچھ ہو گئی۔ وقت کم تھا ورنہ خود رک کر بھابھی سے مل لیتا۔ خیر شام کو دیکھا جائیگا۔

یہ میرا روز کا معمول تھا۔ شہر میں مکانوں کی قلت کے باعث مجھے شہر سے پچیس تیس میل دور ایک قصبہ سے سفر کر کے آنا پڑتا تھا۔ ٹرین پکڑنے کیلئے فہیدہ مجھے پانچ بجے صبح جگا دیتی تھی اور جب تک میں ضروریات سے فراغت حاصل کرتا وہ ناشتہ وغیرہ تیار کرنے کے بعد میرا ٹفن باکس پیک کر کے میرے بیگ میں رکھ چکی ہوتی۔ گھر سے دفتر پہنچنے تک ایک ایسا طے شدہ پروگرام تھا جسمیں کسی بھی رد و بدل کی گنجائش نہیں تھی لیکن کبھی اتفاقیہ طور پر بھی اس پروگرام کی ایک کڑی اپنی جگہ سے کھسک جاتی تو ایک بے چینی اور بے کلی کا احساس ہوتا۔ آج بھی کیلاش کو گھر پر نہ پاکر ایسا لگا جیسے کچھ کھو سا گیا ہے۔

کیلاش اور میں بچپن کے ساتھی تھے۔ اسکول سے لیکر کالج کی زندگی تک ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے رہے اور پھر اتفاق سے ہم دونوں کو ایک ہی جگہ میں ملازمت بھی مل گئی ہماری پوسٹنگ بھی ایک ہی شہر میں ہوئی۔ زندگی کی ہر دوڑ میں میرے ساتھ رہنے والا کیلاش صرف شادی کے معاملے میں مجھ سے پچھڑ گیا کیونکہ جب میری بیوی فہیدہ ایک بچے کی ماں بن چکی تھی تب کہیں جا کر کیلاش کے پتا کو انکی پسند کے مطابق رشتہ مل سکا اور وہ تمام گھاٹا جو کیلاش کی تین بہنوں کی شادی میں انکو اٹھانا پڑا تھا صرف کیلاش کی شادی سے پورا ہو گیا۔ چاچا جی مطمئن تھے کہ انکی تجوری دوبارہ وزنی ہو گئی لیکن کیلاش کے سسرال والے ان سے زیادہ مطمئن تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کیلاش کچھ ہی دنوں کے بعد خود رخصت ہو کر انکے گھر آ جائیگا۔ جی ہاں یہ بھی اتفاق کی بات تھی کہ کیلاش کو ملازمت اور بیوی دونوں ایک ہی شہر میں ملیں اور نتیجہ ظاہر ہے کہ کچھ ہی عرصے بعد سوائے نقد کے جو کہ چاچا جی کی تجوری میں بند ہو چکا تھا رفتہ رفتہ جہیز کا سارا سامان آہستہ آہستہ وہیں واپس آ گیا کیونکہ کیلاش کو سسرال کا ایک کشادہ مکان بھی مل گیا تھا۔

شروع میں جب ہم لوگ اس شہر میں نئے نئے آئے تھے ایک وسط درجہ کے ہوٹل میں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ لیکن اب کیلاش کو سسرال میں رہنے کی جگہ مل گئی تو اسنے مجھ کو رائے دی کہ میں فہیدہ کو بھی شہر لے آؤں اور اسکے ساتھ ہی اسکی سسرال میں رہوں لیکن میں تو خود اسی کی رہائش وہاں پسند نہیں کرتا تھا میں اس کی کیسے تجویز مان لیتا لیکن اب مجھے اسکا احساس ہونے لگا تھا کہ آئندہ اکیلے ہوٹل میں رہنا میرے لیے بھی مشکل ہوگا اسلئے مکان کی تلاش شروع ہوئی اور آخر شہر سے بیس پچیس میل دور ایک مضافاتی قصبہ میں مکان کا انتظام ہو گیا اور میں فہیدہ کو سیکڑوں میل دور اپنے آبائی وطن سے وہاں لے آیا۔ میں نے دفتر آنے جانے کیلئے ٹرین کا ماہانہ پاس بنوا لیا اور روز طویل سفر طے کر کے دفتر آنے جانے لگا۔

کیلاش کی سسرال میں اسکی بڑی آؤ بھگت ہوئی اسکو جہیز کے ساتھ ایک اسکوٹر بھی ملا تھا اسلئے وہ روزانہ گاڑی کے وقت اسٹیشن آکر مجھے بھی ساتھ

لیتا تھا اور پھر ہم دونوں دفتر چلے جاتے چھٹیوں میں وہ اپنی بیوی ششی کو لے کر میرے گھر آجاتا اور اس طرح ایک طرح کی یکسانیت ہو جاتی کبھی کبھی ہم لوگ اس کے یہاں چلے جاتے۔ ہمارا ننھا شاہد ہم چاروں کے بیچ ایک کھلونا تھا سب اس سے دل بہلاتے تھے۔ ہم جب بھی اکٹھا ہوتے تو ایسا لگتا کہ اس دنیا میں غم، تفکرات نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ کیلاش اگر اپنی سسرال کے بل بوتے اڑاتا تھا تو میں اپنی بیوی فہمیدہ کے سلیقہ کی بنا پر اپنی محدود آمدنی میں خوش تھا گو کہ میرے اخراجات میں مکان کا کرایہ ٹرین کا ماہانہ پاس اور ننھے شاہد کی پڑھائی کا خرچ بھی شامل تھا۔

ششی طبیعتاً بالکل کیلاش جیسی تھی وہی اپنوں جیسا پیار اور ٹوٹ کر چاہنے کی ادا۔ کیلاش اور ششی کے درمیان ایک دلچسپ قسم کا اختلاف ششی کے خراب تلفظ کے سلسلے میں تھا کیلاش چونکہ بچپن سے میرے ساتھ رہا تھا اسلئے زبان کے معاملے میں وہ بہت حساس تھا۔ مزہ تب آتا جب ششی مجھے "ذلیل بھائی" کہہ کر مخاطب کرتی تو کیلاش کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا۔

"بھگوان کے لیے ششی کچھ تو میرا خیال کرو اس غریب کو "جلیل" ہی رہنے دو۔" اور ششی شرمندہ ہو کر میری بیوی سے مخاطب ہو جاتی۔

"اب فہمیدہ بھابھی دیکھئے سیکھتے ہی سیکھتے تو آئیگا۔ اگر کچھ دنوں کے بعد "فز" یہی کہوں تو "ناراج" ہونے گا"

"خدا کیلئے ششی چپ ہو جاؤ ورنہ میں خودکشی کر لونگا۔" کیلاش اپنا منہ پیٹنا شروع کر دیتا۔

"یار بچاری کو پریشان مت کرو۔ مجھے کوئی شکایت نہیں۔ فہمیدہ کچھ دنوں میں ششی کو سکھا پڑھا دے گی۔" آخر مجھے بیچ بچاؤ کرانا پڑتا: "آگے سب ٹھیک ہو جائیگا۔"

"کیا خاک ٹھیک ہو جائے گا: سارا موڈ مٹی میں ملا دیا۔ یار مجھے رونا اس بات کا نہیں کہ ان کا تلفظ خراب ہے بلکہ غصہ تو یوں لگتا ہے کہ یہ ہر لفظ صحیح بول سکتی ہیں لیکن پھر بھی کوشش نہیں کرتیں۔ اب دیکھو نا کہ "فہمیدہ" کو "پھہمیدہ" کہتی ہیں اور "پھر" کو "فر" لیکن لفظ "جب" کو تو جب ہی کہتی ہیں پھر جلیل کو آخر "ذلیل" کیوں کر دیتی ہیں۔؟

ششی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور میں نے کیلاش کو ڈانٹ دیا

"یار تو بڑا چالاک ہے اتنی دیر سے بیٹھے ہیں بجائے کچھ خاطر داطر کے باتوں میں ٹال رہا ہے" فہمیدہ نے ششی کے گلے میں باہیں ڈالیں اور اسے کچن لے چلی

گئی۔ ہم دونوں نے قہقہہ لگایا اور دفتر کی باتیں کرنے لگے جو بڑے بابو کی چاپلوسی سے شروع ہو کر کیلاش کی سسرال تک آگئیں۔ اسنے دبے الفاظ میں یہ اطلاع دی کہ شروع میں جو آؤ بھگت اسکی سسرال میں ہوتی تھی اسمیں اب کسی حد تک کمی آگئی ہے میں نے اسکو اشارتاً مشورہ دیا کہ کم از کم اسکو اپنا کھانا پینا الگ کر لینا چاہیئے اسنے فوراً میری بات مان لی۔۔۔

"یار میں تو خود یہی سوچ رہا تھا ششی بھی اس بات سے متفق ہے اچھا ہوا کہ تم نے بھی تائید کر دی۔" ششی اور فہمیدہ چائے لے کر آگئیں اور پھر خوش گپیاں ہونے لگیں۔

جب سے کیلاش نے اپنا کچن سسٹم الگ کر لیا تھا اسکے بے تکے اخراجات پہ روک لگ گئی تھی ذہنی طور پر وہ خود کو کافی ہلکا محسوس کرتا تھا۔ زندگی ایک بندھے ٹکے ڈھرے پر چل رہی تھی ششی اور کیلاش کے درمیان گھریلو باتوں پر اکثر چھوٹے موٹے اختلافات بھی پیدا ہوئے جن کو میں نے اور فہمیدہ نے مل کر سلجھا دیا اسی درمیان کیلاش دو بچوں کا باپ بن چکا تھا پہلے بچے راجو کے اسکول میں داخلے کے وقت ششی اور کیلاش کے بیچ ذرا سخت قسم کا اختلاف کھڑا ہو گیا ششی کا خیال تھا کہ راجو کو کسی اچھے قسم کے ہندی میڈیم اسکول میں ڈالا جائے جبکہ کیلاش کا خیال تھا کہ اسکو کسی پبلک انگلش اسکول میں داخل کیا جائے۔ بجٹ کے حساب سے انگلش اسکول اور ہندی میڈیم اسکول کے اخراجات میں تقریباً ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ کا فرق تھا۔ انگلش اسکول بھیجنے کیلئے صرف بس کے ہی چارجز تقریباً پچاس روپیہ ماہانہ تھے کئی دنوں تک بحث ہوتی رہی اور آخر میں ہم لوگوں کو بلا کر مقدمہ پیش کر دیا گیا۔ ووٹنگ ہوئی اور ہم دونوں نے بہت سوچ سمجھ کر کیلاش کے حق میں ووٹ ڈال دیا لیکن یہ ڈر بھی لگا رہا کہ اب ششی ناراض ہو جائیگی لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اس فیصلہ کے بعد سب سے زیادہ خوش وہی تھی کہنے لگی

"جلیل بھائی صاحب میرے بچے کے مستقبل کا سوال تھا آپ نے ٹھیک فیصلہ کیا میں تو صرف گھر کے بجٹ کی وجہ سے پیچھے ہٹ رہی تھی لیکن ٹھیک ہے اب میں نے یہ بھی طے کر لیا ہے کہ مہینے میں آٹھ دس پکچروں کے بجائے صرف ایک پکچر دیکھی جائیگی اور چھٹیوں میں ہوٹل بازی بھی بند۔"

گھر کی فضا جو کئی دنوں سے بوجھل بوجھل سی تھی ٹھیک ہو گئی راجو کا داخلہ ایک اچھے سے انگلش اسکول میں کروا دیا گیا اور زندگی پھر ایک بار اپنے

دھڑنے پر لگ گئی۔

میرا صرف ایک بچہ تھا شاید اور وہ بھی قصبہ کے ایک اسکول میں زیر تعلیم تھا۔ فہمیدہ گھر کے کام کاج کے بعد خود اسکو پڑھاتی تھی، ہوم ورک کراتی تھی جبکہ ششی کو اپنے دوسرے بچے کی وجہ سے اتنی فرصت ہی نہ مل پاتی کہ گھر کے کام کے علاوہ وہ راجو کیطرف بھی کچھ توجہ دے سکے۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ راجو پہلے ہی سال بری طرح فیل ہو گیا اسکے برعکس ہمارا شاہد اچھے نمبروں سے پاس ہوا۔ راجو کے اسکول سے ایک نوٹس آگیا کہ یا تو اس کا ٹیوشن لگایا جائے ورنہ آیندہ فیل ہونے کی صورت میں اسے اسکول سے نکال دیا جائیگا۔ اس نوٹس کے بعد ایک بار پھر کیلاش اور ششی میں سرد جنگ شروع ہو گئی اور آخر میں طے پایا کہ کسی طرح ٹیوٹر کا بندوبست بھی کر لیا جائے۔

راجو کیلئے ٹیوٹر رکھنے کے بعد گھر کے حالات مزید ابتر ہو گئے۔ کیلاش کے مزاج میں چڑچڑاپن آگیا۔ ششی بھی ہر وقت تفکرات میں گھری رہنے لگی۔ اس دوران ایک اور آفت آگئی۔ ششی کے چھوٹے بھائی کی شادی طے ہو گئی اور وہ واحد کمرہ جو ششی کے قبضے میں تھا اسکی بھی ضرورت پیش آگئی۔ تین کمرے پہلے ہی بڑے بھائی کی شادی کے وقت چھن چکے تھے۔ لہٰذا مکان کی تلاش شروع ہو گئی اور کسی نہ کسی طرح شہر میں ہی ایک چھوٹا سا کوارٹر ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ کرایہ پر دستیاب ہو گیا اور کیلاش اپنے ضروری سامان کیساتھ اسمیں منتقل ہو گیا۔ بقیہ سامان وہیں سسرال میں چھوڑ دیا گیا۔ اخراجات کا دھارا ایک ایسے ڈھلان سے گذر رہا تھا جس پر کسی طرح کا باندھ باندھنا نہ کیلاش کے بس میں تھا اور نہ ہمارے۔ میں نے اور فہمیدہ نے کئی بار انکے گھریلو بجٹ کو ٹھیک کرنے کی کوششیں کیں لیکن حالات نے سنبھلنے ہی نہ دیا اور آخر تنگ آ کر وقت کے دھاروں پر سب کچھ چھوڑ دیا گیا۔

کیلاش کافی مقروض ہو چکا تھا اور اس بوجھ کو کم کرنے کیلئے ایک دن چپکے سے اس نے اپنا اسکوٹر فروخت کر دیا۔ ہم لوگوں کو اسکی اطلاع اس وقت ہوئی جب اسکوٹر گھر سے جا چکا تھا اور میں اور فہمیدہ جب اسکے گھر پہنچے تو ایسا سوگوار ماحول تھا جیسے گھر سے کوئی میت ابھی ابھی اٹھی ہو۔ کیلاش اور ششی دونوں کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ بچے ڈرے سہمے سے ایک کونے میں بیٹھے تھے اور کچن میں صرف مکھیوں کا راج تھا۔ ہم نے رک کر حالات کا جائزہ لیا۔ ہمارا شاہد دوڑ کر بچوں کے پاس چلا گیا اور بچوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ فہمیدہ نے ششی کا ہاتھ پکڑا کچن سے چلی گئی

میں کیلاش کو حالات سے لڑنے کی ہمت دلاتا رہا اور ماضی کو بھول کر مستقبل کے پروگرام ترتیب دیتا رہا۔ کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں۔ فہمیدہ نے سامنے گھر کی صفائی شروع کر دی اور وہی گھر جو تھوڑی دیر قبل اپنے مکینوں کے حالات پر سوگوار تھا ایک بار پھر مسکرا اٹھا۔ ناشتہ پر بچے ہنس رہے تھے۔ ششی اور کیلاش کے چہروں سے بھی مصائب کی گرد چھٹ چکی تھی۔ چھٹی کا دن تھا اسلئے ہم سب شام تک وہیں رہے اور نئے سرے سے ایک نیا بجٹ ترتیب دیا گیا اور یہ طے ہوا کہ دونوں بچوں کو کسی دوسرے ہندی میڈیم اسکول میں داخل کرایا جائے۔ راجو کے ٹیوٹر کو ہٹا کر یہ ذمہ داری کیلاش اور ششی دونوں کو دی گئی۔ اسکول تبدیل کرنے سے بس کے کرایہ کی بھی بچت ہو گئی اور کھینچ تان کر اخراجات کو آمدنی کے اندر محدود کر دیا گیا۔ نئے انتظام سے ششی نے بہت راحت محسوس کی۔

کیلاش نے باتوں میں یہ بھی بتلا دیا کہ وہ اس حد تک مقروض تھا کہ اسکوٹر بیچنا ناگزیر تھا اور اب تمام قرض ادا کرنے کے بعد دو تین سو روپیے بچ رہے ہیں اور امید ہے کہ اس نئے انتظام سے حالات قابو میں رہیں گے۔

اتنے مسائل کے حل کرنے کے بعد ہم لوگ ٹھیک سے سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ ایک دن میری بیوی نے مجھے اطلاع دی کہ ششی کے یہاں اگلے ماہ تک ایک نیا مہمان آنے والا ہے اور اب چونکہ وہ الگ رہتی ہے اسلئے اس موقع پر کسی کا اس کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔

"یار فہمیدہ تم نے تو ششی اچھی نکلی۔ تم نے دس سال میں مجھے صرف ایک شاہد دیا اور!"

"اسے بس رہنے دیجئے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ کتنی پرسکون زندگی گزر رہی ہے اپنی۔ وہاں ہر روز کی ہائے ہائے دیکھ رہے ہیں آپ؟"

"بھئی کہتی تو ٹھیک ہو لیکن ایک کی گنجائش نکل ہی سکتی ہے۔ کیا خیال ہے؟"

"چپ رہئے شاہد اسکول سے آگیا ہے۔ ہاں تو ششی کیلئے کیا سوچا آپ نے؟"

"سوچنا کیا ہے وطن سے اتنی دور انکا ہمارے علاوہ ہے ہی کون۔ سسرال والوں سے ویسے ہی انکے تعلقات خراب ہیں۔ بھئی ایسا کرتے ہیں کہ میں اپنی امی کو جا کر لے آؤں وہ میری اور شاہد کی دیکھ بھال کرینگی اور تم کچھ دنوں کے لیے ششی کے پاس چلی جانا۔

کئی دن گزر گئے میں نے کیلاش سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا لیکن ایک دن وہ دفتر میں بہت خاموش اور بجھا بجھا سا بیٹھا تھا میں سمجھ گیا کہ ضرور دال میں

طے ہوا ہے۔" میں نے جلدی جلدی اپنے کام سے فراغت حاصل کی اور کیلاش کی میز پر پہنچ گیا۔

"کیوں بھیا۔ یہ منہ کیوں سوجا ہوا ہے کیا ششی نے پٹائی کر دی؟"

"یار تنگ مت کرو ورنہ ڈسی کی زبان میں تمہارا نام لینا شروع کر دونگا۔ میں آج کل بہت پریشان ہوں:"

"آخر وجہ؟" میں نے بالکل انجان بن کر سوال کر دیا۔

"بھئی وہ ششی ہے نا۔ میرا مطلب ہے ششی کے یہاں!!!"

"ارے اب آگے بھی بڑھو کیا ہوا ششی کے یہاں۔ اسکے ماں باپ تو بخیریت ہیں؟"

"اُف۔ تو کیسے بتلاؤں یار وہ ششی۔ ششی بچہ ماں بننے والی ہے۔" اسنے جلدی سے جملہ پورا کر دیا۔

"ہائیں غضب ہو گیا۔ یہ کس حرام زادہ کی حرکت ہے؟ مجھے نام بتلا دو تو سالے کے ہاتھ پیر توڑ دوں۔" میں نے آستین چڑھا کر تعجب اور غصہ کا اظہار کیا۔

"دوست حرکت تو میری ہی ہے۔ اور ایسی حرکت ہے کہ واقعی میرے ہاتھ پیر توڑ دینے چاہئیں۔"

"اگر تمہاری ہی غلطی ہے تو اسمیں اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے؟ تم تو اس طرح اطلاع دے رہے ہو جیسے کسی ناجائز بچے کی اطلاع دے۔"

"ہاں ہے وہ میرا بچہ ہوگا لیکن پھر بھی ناجائز ہوگا۔ گھر کی حالت تم دیکھ ہی رہے ہو اب ایک اور اضافے کو میں تو ناجائز ہی سمجھتا ہوں۔ ان تمام غریب بچوں کا حق اب تین جگہ تقسیم ہوگا۔ کیا یہ ناجائز نہیں؟ راجو کو ایک اچھے اسکول سے نکال کر بچوں کی خاطر ایک گھٹیا سے اسکول میں ڈالا گیا کیا وہ جائز تھا؟ اور اب ان نئے مہمان کیلئے ممکن ہے کہ دونوں کو اس اسکول سے بھی نکال کر کسی خیراتی ادارے میں داخل کرنا پڑے کیا یہ جائز ہوگا؟ اور کیا یہ ناجائز نہیں کہ ششی اس حالت میں بھی صبح سے رات تک مزدوروں کیطرح کام میں جٹی رہتی ہے اور اسکو ایک گلاس دودھ تک نہیں مل پاتا؟" اسنے ایک ہی سانس میں اتنی لمبی تقریر کر ڈالی۔

"یار ڈرامہ اچھا کر لیتے ہو۔ لیکن اب چاہتے کیا ہو؟" میں نے پھر ایک کچوکا دیا۔

جانتا ہوں تمہارا سر۔ گدھے اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ مجھے سسرال والوں سے تو کوئی مدد ملنے سے رہی اور ماں کو میں نے گذشتہ دو سال سے ایک پیسہ نہیں بھیجا انھیں کس منہ سے لکھوں۔ اب آخر اکیلے یہ سب کیسے ہوگا؟

"آ گئے نہ راہ پر۔ چلو اب بھی سمجھ آ گئی تو بہت ہے جاؤ منہ دھوکر آؤ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے اور ششی نے پہلے ہی پروگرام بنا لیا ہے۔"

★

خورشید بھائی

بھی میں کڑھتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ ایک پورا دور لے گئے۔

کھیلوں میں تاش سے لے کر ٹینس تک کئی کھیلوں سے دلچسپی تھی۔ بائیں آنکھ ہاکی کے کھیل میں آٹھویں جماعت میں زخمی کر لی تھی اور اس سے بصارت میں کچھ کمی آ گئی تھی لیکن اس کے باوجود لکھنے پڑھنے کے کام میں کبھی کوتاہی نہ کی۔ مہمان نوازی کی ہاشمی سیرت میں کبھی کوئی کمی نہیں آئی۔ کھیلوں سے بعد میں صرف کھیل دیکھنے کی حد تک دلچسپی باقی رہی۔ مذہب کے معاملے میں مرنجان مرنج رہے۔ آخر عمر میں داڑھی رکھ کر دو پشت پیچھے کی وضع داری واپس لائے، داڑھی سنت موکدہ ہے اور اس کے بارے میں مجال لب کشائی نہیں لیکن میری آنکھو نیں

(ص ۲ کا بقیہ)

آج بھی ان کا یہ ریش چہرہ اور اس پر کھیلتی ہوئی معصومانہ ہنسی گھومتی رہتی ہے۔ اس ہنسی کو تو داڑھی بھی نہ چھپا سکی

جس خاموشی سے جیے، اسی خاموشی سے سوتے میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی، جیسے یہ کھانا چاہتے ہوں کہ مرنا تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اُن کی جدائی سے میری ذاتی زندگی میں بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ میرے بچپن کا آخری ساتھی مجھ سے چھن گیا، میرے ننہال کا آخری بزرگ رخصت ہو گیا۔ اور اب عربی مقولے کے مطابق (کبر نی موت الاکابری: بڑوں کی موت نے مجھے بڑا کر دیا) میں بزرگ ہو گیا اب میری زندگی ایک عبرت ہے۔ اللہ بس، باقی ہوس۔

نقد و

تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "سب رس جدید اردو میں"
قاضی انیس الحق
ملنے کے پتے: مکتبہ جامعہ، دہلی، دانش محل لکھنؤ، بک ایمپوریم پٹنہ، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی۔
قیمت: پچاس روپیہ

قاضی انیس الحق صاحب اردو کے نوجوان اور خوش فکر شاعر ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک اعلا درجہ کے نثرنگار بھی ہیں۔ اس سے قبل ان کی دو کتابیں "ڈاکٹر عابد حسین کے مضامین میں طنز و مزاح" اور "نفوس برگزیدہ" شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ گذشتہ سال ان کی کتاب "سب رس جدید اردو میں" شائع ہوئی ہے جس پر اردو اکاڈمی اتر پردیش سے مبلغ ڈیڑھ ہزار روپیہ انعام بھی ملا۔

قاضی انیس الحق صاحب نے زیر نظر کتاب میں ایک جامع اور مبسوط مقدمہ بھی لکھ کر شامل کیا ہے اور اس میں "سب رس" کے ماخذ، اس کی زبان اور اس کے معاشرتی پہلو سے بحث کی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ قاضی انیس الحق صاحب کی کتاب "سب رس جدید اردو میں" بہت اہم ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ملا وجہی کی اصل دکنی "سب رس" کا مطالعہ ترک کر دیں۔

دراصل ملا وجہی کی "سب رس" خالص دکنی زبان میں ہے اس لیے اس کا سمجھنا سخت دشوار ہے۔ ملا وجہی کے یہاں اسم ذات۔ اسم اشارہ اسم ظرف۔ اسم کیفیت۔ اسم فاعل، ضمیر شخصی، ضمیر غیر شخصی، ضمیر استفہام صفت نسبتی، صفت عددی، صفت مقداری، ماضی مطلق، فعل حال، فعل مستقبل، مضارع، فعل ناقص، حرف جار، حرف عطف، حرف تشبیہ اور حرف شمول وغیرہ بدلے ہوئے انداز میں ملتے ہیں۔ اس لیے ان کے سمجھنے میں دقت محسوس ہوتی ہے۔ قاضی انیس الحق صاحب نے ہماری اس مشکل کو آسان کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ ملا وجہی کی سب رس میں زبان کی پیچیدگی کی بنا پر تمثیلی رموز و نکات زیادہ واضح نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی صوفیانہ مباحث جزئیات نگاری، مرقع نگاری، مکالمہ نگاری۔ اور دیگر امور دھندلے میں نظر آتے ہیں۔ قاضی انیس الحق نے ان ساری باتوں کو جدید اردو میں منتقل کر کے ہماری مشکلات کو آسان کر دیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ "سب رس جدید اردو میں" اساتذہ اور طلبا دونوں کے لیے مفید ہے۔ اساتذہ اس کی مدد سے اصل سب رس کو سمجھ سکتے ہیں اور طلبا کو سمجھا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی طلبا براہ راست اس کی مدد سے اصل سب رس کا مطالعہ کر سکتے ہیں امتحان کے دوران یہ کتاب ان کی خاص طور سے معاون و مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ غرضیکہ "سب رس جدید اردو میں" ایک مفید کتاب ہے جس کے لیے قاضی انیس الحق صاحب قابل مبارکباد ہیں۔

• ——— ڈاکٹر سلام سندیلوی

نام کتاب "سورج نما"
شاعر: محمد علی تاج
ملنے کا پتہ: مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی بھوپال
قیمت: بارہ روپیہ

محمد علی تاج کا یہ مجموعہ کلام بھوپال کا جسے بجا طور پر "شاعروں کا شہر" کہہ سکتے ہیں، ایسا تحفہ ہے جو ان کی موت کے کئی برس بعد سخن نوازوں کے ہاتھ آیا ہے اور اپنی صورت و سیرت میں تمام رنگینیوں اور سنگینیوں کا حامل ہے۔

غزلیں بہت سی ہیں اور سب کی سب حسن تاثیر اور شدت احساس کے ہتھیاروں سے لیس ہیں۔ نظمیں تھوڑی سی اور روایتی طرز کی ہیں جن سے بر ملا آشکارا ہے کہ شاعر نظم کا شاعر نہیں بلکہ بنیادی طور پر غزل کا تخلیق کار ہے۔

غزلوں میں جگہ جگہ جدیدیت اور ترقی پسندی دونوں رنگ جھلکتے ہیں لیکن روایتی غزل گوئی کے نخلستان بھی ان تپتے اور سلگتے ہوئے صحراؤں کے درمیان نظر آ جاتے ہیں۔

مدتیں ہو گئیں اس دامنِ رنگیں سے چھٹے
آج تک دیدۂ خوں بار لیے پھرتے ہیں

مگر ان نخلستانوں سے ہٹ کے جہاں تک نگاہ کی حد ہے بے برگ و گیاہ دشت ہی دشت ہیں تاج کے اندر کا ترقی پسند ان ریگستانوں کے بیچ کھڑا ہوا کہہ رہا ہے۔

وہ گرمیٔ تنفر ہے کہ منظر جلا دیئے
اہلِ ہوس نے سرو و صنوبر جلا دیئے

مہر و ماہ و انجم کے با وجود اندھیرا ہے
جانے کس نے دنیا سے چھین لی ہیں تنویریں

محمد علی تاج جدیدیت کے علم بردار نہ تھے اور نہ جدید شاعری کے "عدم توازن" کے قائل لیکن جدت پسندی ان کے اندازِ فکر میں رچی بسی تھی "سورج نما" میں قدم قدم پر اس کے نشانات ملتے ہیں کہیں کہیں تو ایک ہی غزل روایت ترقی پسندی اور جدت تینوں کا آمیزہ نظر آتی ہے لیکن ایک بات ضرور ہے انھوں نے جس رنگ میں بھی پیکر تراشی کی ہے اس میں پختگی اور شائستگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ جدید رنگ کے ان شعروں کو دیکھئے۔

کتنے چہرے کھچے الاؤ کے ساتھ
روشنی سو گئی پڑاؤ کے ساتھ

وہ شور ہے ہر شہر کی ہر راہ گذر پر
رنگین لباسوں میں بدن چیخ رہے ہیں

میں اکثر راستوں میں سوچتا ہوں
مرا گھر کوئی جنگل تو نہیں ہے؟

اس شہر کا یہ حال تو برسوں سے ہے یہاں
ہر اک مکان کے پاس کفن کی دکان ہے

توقع ہے کہ تاج کے پہلے مجموعہ کی طرح ان کے اس "بعد از مرگ شائع شدہ مجموعۂ کلام کو بھی ادبی حلقوں میں سراہا جائے گا سہ رنگی سرورق حسین ہے کتابت جاذبِ نظر اور طباعت اعلا درجہ کی ہے۔

——— شاکر جرولی

نام کتاب: لاانتھا
شاعر: منظر مہدی
قیمت: بیس روپیہ
ملنے کا پتہ: شب خون، کتاب گھر ۳۱۳ رانی منڈی الہ آباد ۳

"لا انتہا" حیدرآباد کے نوجوان شاعر جناب منظر مہدی کی چھوٹی بڑی ستر نظموں و قطعات کا مجموعہ ہے جو ۱۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

علی ظہیر صاحب نے اس مجموعے میں منظر مہدی کو ٹوٹی ہوئی زبان کا، ٹوٹے ہوئے معاشرے کا اور ٹوٹتے ہوئے ماحول کا شاعر گردانا ہے اور ان کی شاعری کو صاف، واضح اور سیدھا حملہ کرنے والی شاعری قرار دیا ہے۔

"لا انتہا" کو جدید شاعری کا ایک نمائندہ مجموعہ کہنا غلط نہ ہوگا یہ گنجلک اندازِ بیان اور دقیق و مشکل الفاظ سے مبرا سیدھے سادے اور عام بول چال کے الفاظ سے عبارت ہے۔ منظر صاحب نے اپنی بات اور اپنے خیالات کی ترجمانی جتنی سلیس اور موثر زبان میں کی ہے وہ ان کی حق گوئی اور سادگی کی مظہر ہے۔ جس طرح انسان کے چہرے کو دیکھ کر قیافہ شناس پر اس کی پوری شخصیت عیاں ہو جایا کرتی ہے اسی طرح "لا انتہا" کے مطالعہ سے منظر مہدی کے فہم و ادراک، شدتِ احساس، مشاہدہ، ندرتِ بیان اور ان کی فکر سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

——— سلطان خاں

Vol. 38 No. 10
JANUARY, 1984
50 paise

Urdu Monthly

NAYA DAUR

REGD .No. LW/NP-1[illegible]
Annual Subs.
Rs. 5/-

POST BOX No. 146 LUCKNOW 226001

[illegible] جھانکی [illegible] یوم جمہوریہ کے موقع پر ۲۶ جنوری ۱۹۸۳ کو نئی دہلی میں راج پتھ سے گزرتے ہوئے۔ اسے تمام ریاستوں کی جھانکیوں میں [illegible] قرار دیا گیا۔ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش کو [illegible] اولین انعام سے نوازا ہے۔ اس جھانکی کے خالق ممتاز فنکار [illegible] ہیں جو محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش سے وابستہ ہیں۔

اپنی بات

ریاستی اسمبلی میں ۱۷؍فروری ۱۹۸۴ء کو وزیر مالیات شری برہم دت نے سال ۸۵-۱۹۸۴ء کا بجٹ پیش کر دیا۔ جس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی نئے ٹیکس کی تجویز نہیں ہے۔ بجٹ میں ۵۹ کروڑ ۳۲ لاکھ روپے کا جو خسارہ دکھایا گیا ہے، اس کی تلافی کفایت شعاری، سرکاری واجبات کی موثر ڈھنگ سے وصولی اور آٹھویں مالیاتی کمیشن کی سفارشات کے نتیجے میں حاصل ہونے والی امداد سے کی جائے گی۔ بجٹ میں سالانہ منصوبے کے لیے ۱۳ ارب ۹۰ کروڑ روپے کی رقم کو بنیاد تسلیم کیا گیا ہے۔ لامرکزی منصوبہ بندی نظام کے تحت ضلعوں کے منصوبوں کے لیے گذشتہ سال کے مقابلے ہر ضلع کو سات فیصد زیادہ رقم الاٹ کی گئی ہے۔ زرعی پیداوار میں اضافہ کرنے کی غرض سے خصوصی منصوبے کے تحت چھوٹے اور درمیانی کسانوں کو گرانٹ دینے کے لیے ۴۳ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی ہے۔ دیہی بجلی کاری کے تحت اس بجٹ میں ساڑھے تین ہزار دیہات کو بجلی مہیا کرنے کا پروگرام ہے۔ عالمی بینک کی مدد سے ۲۲۰۰ نئے ٹیوب ویلوں کی تعمیر اور ۵۰۰ ٹیوب ویلوں کی جدید کاری کی جائے گی۔ مربوط دیہی ترقی اسکیم کے تحت عورتوں اور بچوں کی فلاح کے لیے ایک نئی اسکیم شروع کی جائے گی، جو اتر پردیش کے پانچ اضلاع کے ۲۲ ترقیاتی بلاکوں میں نافذ العمل ہوگی۔ پہاڑی علاقوں کی ترقی کے لیے ایک ارب چالیس کروڑ روپے مختص کیا گیا ہے۔ بلدیاتی اداروں کی سڑکوں کی تعمیر اور نگہداشت کے لیے ۱۸ کروڑ ۴۹ لاکھ ایک ہزار روپے کی گرانٹ کا بندوبست بجٹ میں ہے۔ اس کے علاوہ نئے نظام تعلیم کے نفاذ کے لیے ۱۰ لاکھ روپے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اب تک جو بیوائیں مالی امداد سے مستفید ہو رہی ان کے علاوہ مزید ۱۰ ہزار بیواؤں کے لیے گذر بسر اور ان کے بچوں کی تعلیم وغیرہ کے واسطے گرانٹ کی شکل میں ۴۲ لاکھ چھ ہزار روپے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ خواتین کو تکنیکی تعلیم کی سہولت فراہم کرنے کی غرض سے متھرا میں امداد یافتہ خواتین پالی ٹیکنک قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے، جس کے لیے دو لاکھ ۸۵ ہزار روپے کا بندوبست ہے۔ مجاہدین آزادی کو اپنے ضلعوں میں ریاستی ٹرانسپورٹ کی بسوں میں مفت سفر کرنے کی سہولت حاصل ہے۔ اب یہی سہولت انھیں اپنے ضلع کے باہر مجاہدین آزادی سے متعلق تقریبات میں شریک ہونے کی غرض سے بھی دی جائے گی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ۸۵-۱۹۸۴ء کے ہمارے بجٹ میں ترقیات سے متعلق تقریباً ہر پہلو کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ اس بجٹ کو ہم انتہائی عملی اور حقیقت پسندانہ بجٹ کہہ سکتے ہیں۔

● ابھی مشہور ناقد کلیم الدین احمد کے انتقال کے چند روز بعد ۲۵ جنوری ۸۴ء کو عظیم اردو محقق و نقاد قاضی عبدالودود بھی چل بسے۔ قاضی صاحب کا نام علمی و ادبی تحقیق کا سب سے بڑا نام تھا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تحقیق کو تکلفات لفاظی اور انشا پردازی سے نجات دلائی اور اسے ایک سائنٹفک فن بنا دیا۔ ہمارے بیشتر محققین تحقیق کو حواشی نگاری سمجھتے ہیں اور اپنے مضامین میں اتنے حواشی بھر دیتے ہیں کہ موضوع پس پشت چلا جاتا ہے اور حواشی ہی حواشی رہ جاتے ہیں۔ قاضی صاحب کی تحقیق اور ان کا اسلوب ان کی بے باکی، حقیقت پسندی اور تحمل ہمارے محققین کے لیے مشعل راہ ہیں۔

قاضی صاحب کی دسترس اردو، فارسی اور عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی، جرمن اور فرانسیسی زبان پر بھی تھی۔ ان تمام زبانوں کے ادبی و تحقیقی سرمائے پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ڈگری انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے بیرسٹری کی حاصل کی تھی۔ لیکن عمر انھوں نے علم و ادب کی خدمت میں گذاری اور گذشتہ پچاس برسوں کے دوران انھوں نے اردو تحقیق و تنقید کو جو کچھ دیا وہ ناقابل فراموش ہے۔ ایسی شخصیتیں حقیقتاً خال خال ہی ہوتی ہیں جو اپنی ذات سے ایک ادارہ، ایک انجمن ہوں۔ قاضی صاحب کی شخصیت ایسی ہی شخصیت تھی۔ غالب اور ان سے متعلق مختلف پہلوؤں پر انھوں نے جو کام کیا ہے وہ انتہائی معتبر سند کا درجہ رکھتا ہے۔

● بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر

(باقی صفحہ پر)

نازش پرتاپگڑھی
بیگم وارڈ - پرتاپ گڑھ

قسم کھاتے ہیں ہم

ہم اپنے دیش کو فرقہ پرستوں سے بچائیں گے
اور اپنی قوم کو ہر خوابِ غفلت سے جگائیں گے

ہمارے ملک میں آپس کی نفرت چل نہیں سکتی — وطن کے دشمنوں کی دال ہرگز گل نہیں سکتی
کسی بھی آگ میں کوئی صداقت جل نہیں سکتی — اہنسا کی جنم بھومی پہ ہنسا پل نہیں سکتی

اندھیرے کے پرستاروں کو ہم الٹا کر بتائیں گے
اور اپنے دیش کو فرقہ پرستوں سے بچائیں گے

نہ رہنے دیں گے ہم بغض و عداوت کا کوئی بادل — نہ ہونے دیں گے جھوٹے دھرم مذہب کی کوئی ہلچل
نہ جلنے دیں گے اپنے شہروں کے رنگیں، حسیں آنچل — نہ اب لوٹے گی گاؤں میں کسی بھی بیر کی چھاگل

محبت، امن، ایکجہتی کی مشعل ہم جلائیں گے
اور اپنے دیش کو فرقہ پرستوں سے بچائیں گے

کریں گے دور روڑے اور کانٹے اپنے رستے سے — جو کچھ دکھ سکھ ملے گا ہم سبھی جھیلیں گے مل جل کے
ہٹا ڈالیں گے دامن سے غموں کے داغ اور دھبے — سبھی خوشیوں سے اپنے ملک کے آنچل کو بھر دیں گے

مگن ہو ہو کے بھارت ماں کے بچے ناچیں گائیں گے
ہم اپنے دیش کو فرقہ پرستوں سے بچائیں گے

تر و تازہ کریں گے ساری کلیوں، سارے پھولوں کو — چمن سے دور کر دیں گے سبھی سوکھے ببولوں کو
کریں گے پھر سے زندہ پریم کی رسموں، اصولوں کو — نہ ہونے دیں گے شرمندہ اہنسا کے رسولوں کو

قسم کھاتے ہیں ہم اپنے قدم آگے بڑھائیں گے
اور اپنے دیش کو فرقہ پرستوں سے بچائیں گے

جہاں بھی ہو ذرا ٹھہرو
کہو کچھ بھی مگر سن لو
قسم کھاتے ہیں ہم لوگو!
کہ اپنے دیش کو فرقہ پرستوں سے بچائیں گے
اور اپنی قوم کو ہر خوابِ غفلت سے جگائیں گے

ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی
لکچرر شعبہ اردو شبلی نیشنل کالج
اعظم گڑھ

مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال

مولانا محمد علی جوہر علامہ اقبال کے ہم عصر تھے ان کی شخصیت کی تعمیر میں انھیں سیاسی اور سماجی حالات نے حصہ لیا جن سے علامہ کی شخصیت کی تشکیل عمل میں آئی لیکن مختلف افتادِ طبع اور انداز فکر کی بنا پر کچھ شخصی اور فکری مماثلتوں کے باوجود ان میں کافی فرق بھی پیدا ہو گیا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر مختلف حیثیتوں کے مالک تھے اور ان میں سے ان کی ہر حیثیت اہم تھی لیکن اقبال کی خاص حیثیت ایک شاعر اور مفکر کی ہے سیاست داں کی حیثیت سے بھی انھوں نے ملکی اور ملی سیاست پر کافی افکار مرتب کئے ہیں لیکن سیاست کے میدان میں وہ اسی راستے سے داخل ہوئے تھے۔ وہ ایک بلند پایہ خطیب اور ادیب بھی تھے۔ انھوں نے اردو اور انگریزی میں بہت سی تقریریں کی ہیں۔ انھیں میں ان کے ساتھ معرکۃ الآرا خطبات بھی شامل ہیں جو ایک علمی حلقہ کی دعوت پر ۱۹۲۸ء میں مدراس میں پیش کئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ اقبال نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز ہی سے مضامین قلم بند کئے ہیں۔ اور خطوط لکھے ہیں جن کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن ان کی نوعیت مولانا کی تقریروں اور تحریروں سے مختلف ہے۔

مولانا محمد علی جوہر ایک سچے اور کھرے مسلمان اور محب وطن تھے۔ اقبال کو بھی اپنے ملک و ملت سے شدید محبت تھی وہ بھی مولانا کی طرح حکمراں طبقہ سے سخت بیزار تھے اور اس کے تسلط سے ملک اور قوم کو بہر حال آزاد دیکھنا چاہتے تھے لیکن وہ اس بات کی ضمانت بھی چاہتے تھے کہ آزاد ہندستان میں مسلمانوں کے حقوق محفوظ رہیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ محض انگریز دشمنی سے کوئی پائیدار مشترکہ قومیت وجود میں نہیں آسکتی۔ مولانا بھی اقلیت کے تحفظ کے حامی اور اقبال کی طرح مخلوط انتخاب کے مخالف تھے لیکن محض آزادیٔ وطن کی خاطر انھوں نے آخر میں اپنے تمام اختلافات ختم کر دیئے تھے۔ جیسا کہ راج بہادر گوڑ نے 'کامریڈ' اور 'ہمدرد' کے حوالے سے اپنے ایک مضمون مشمولہ ہماری زبان ۱۵ اپریل ۱۹۷۹ء میں لکھا ہے گو کہ انھیں بھی آخر تک ملک کے ایسے عناصر کا شدت سے احساس تھا جو مشترکہ قومیت کی تشکیل میں زبردست رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ لیکن وہ مصلحتاً بھی انگریزوں کے تسلط کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

علامہ اقبال کبھی اسیر زنداں نہ ہوئے جبکہ مولانا نے کئی بار قید فرنگ کی سختیاں برداشت کیں اور ان کی زندگی کے کئی سال زنداں میں گزرے۔ اس کے برخلاف علامہ نے ۱۹۲۳ء میں حکومت برطانیہ کا مرحمت کیا ہوا 'سر' کا خطاب قبول کر لیا جبکہ اس زمانے میں حکومت کے عطا کردہ خطابات واپس کیے جا رہے تھے۔ اس کا بھی ملک گیر مقاطعہ چل رہا تھا۔ مزید برآں ۱۹۲۶ء میں پنجاب کونسل کے ممبر بھی منتخب ہو گئے اس پر طرہ یہ کہ اپنی کسی تقریر میں انھوں نے ہندستانیوں کے مقابلے میں انگریز افسروں کو ترجیح دینے کی بات کہہ دی۔ پھر کیا تھا مولانا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور انھوں نے اپنے اخبار ہمدرد کے پانچ شماروں میں پانچ مضامین لکھ ڈالے جن کے عنوان حسب ذیل ہیں:-

۱۔ میرا استاد اقبال ۔ ۲۔ طبیب حاذق سر محمد اقبال ۔ ۳۔ شاعر دلی

اقبال ۴۔ شاعرِ اسلام اقبال اور ۵۔ شمع و شاعر کے مصنف سے ایک سوال

مولانا محمد علی اقبال سے چاہتے تھے کہ وہ الدّ الخصام کو چن لیں اور ان کی طرح اسی کے مقابلے میں لگ جائیں اور الدّ الخصام اس وقت (مولانا کے خیال میں) انگریزی حکومت تھی جس سے ہندوؤں کے دوش بدوش وہ اسی طرح مقابلہ کرنا چاہتے تھے جس طرح رسول اکرمؐ نے یثرب کے یہودیوں تک کو مشرکین مکہ کے خلاف اپنا حلیف بنا لیا تھا (ہمدرد ۲۱ اگست ۱۹۲۷ء بحوالہ مضامین محمد علی حصہ دوم ص ۴۶۵) لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ علامہ اقبال ترکِ موالات اور سائمن کمیشن کے مقاطعہ میں بھی حصہ نہیں لیتے گو کہ اس مقصد کے لیے مولانا ان سے خود ملاقات کرتے ہیں مخلوط انتخاب کے مسئلہ پر مسلم لیگ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی محمد علی جناح اور ان کے ہمنوا مخلوط انتخاب کرانے پر رضامند تھے لیکن ڈاکٹر اقبال اور محمد شفیع اس کے مخالف تھے۔ مولانا کو اپنے دیرینہ تعلقات کی بنا پر حسنِ ظن تھا کہ وہ اقبال کو ہموار کر لیں گے لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔

مولانا محمد علی جوہر اقبال کی شاعرانہ عظمت کے قائل تھے۔ ان سے ایک طرح کی عقیدت رکھتے تھے۔ اور وارفتگی کی حد تک انھیں چاہتے تھے۔ وہ کلامِ اقبال کے رمز شناس تھے۔ اس کا اندازہ ہمدرد کے انھیں محولہ مضامین سے کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر یوسف حسین کے اس بیان سے بھی ہو سکتا ہے جو ان کی تصنیف یادوں کی دنیا اور ان کے ایک مضمون میں یکساں طور سے ملتا ہے کہ "مولانا محمد علی جوہر اپنے لیکچر کے دوران اقبال کی اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کے اشعار کی توضیح و تشریح کرتے تھے تو بولتے بولتے ان کا گلا بھر آتا تھا اور کبھی کبھی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔" (ہماری زبان ۲۲ جنوری و یکم فروری ۱۹۷۹ء مولانا محمد علی جوہر نمبر ص ۸)

مولانا نے اقبال کی مشہور نظم "ترانۂ ملی" کا ایک ریکارڈ تیار کرایا تھا ۱۹۱۱ء کی بات ہے کہ انھوں نے اپنے ایک برادرِ عزیز منظور محمود کو علی گڑھ سے بلا کر ان کی دلکش آواز میں یہ نظم سنی اور بلا تاخیر اسی آواز میں ریکارڈ تیار کرایا۔ (مضامین محمد علی ص ۴۴۳) اس کے علاوہ انھوں نے اپنے ایک مختصر سے مضمون "تعلیمات اقبال" مشمولہ "آثارِ اقبال" میں بھی کلامِ اقبال سے اپنی وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ جس کے مطابق کامریڈ اور ہمدرد میں پہلے غالب کے اشعار نقل ہوتے تھے لیکن جب سے انھیں اقبال کی شاعرانہ اہمیت کا اندازہ ہوا ان جریدوں کے کالم انھیں کے اشعار سے مزین ہونے لگے (بحوالہ اقبال دانائے راز از عبداللطیف اعظمی ص ۲۱)

ہمدرد میں تو شروع سے اقبال کے اشعار نظر آتے ہیں۔ یکشنبہ ۲۲ جون ۱۹۱۳ء کے شمارہ میں ان کی نظم "ترانۂ ملی" کے مطلع کا شعر "چین و عرب ہمارا ......" درج ہوا ہے (بحوالہ جوہر اسپیشل سیریز علی برادران نمبر مرتب رئیس احمد جعفری ص ۲۰) اور پنجشنبہ ۵ جون ۱۹۱۲ء کے شمارہ میں اقبال کی نظم صقلیہ (جزیرہ سسلی) کے حسب ذیل اشعار نقل ہوتے ہیں ؎

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا [illegible] پر — داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر
آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی — ابن بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

(بحوالہ جوہر اسپیشل سیریز علی برادران نمبر مرتب رئیس احمد جعفری ص ۲۳)

اور "ترانۂ ملی" کا درج ذیل شعر پنجشنبہ ۱۸ دسمبر ۱۹۱۳ء کے ہمدرد میں ملتا ہے ؎

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے — آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

اور اسی شمارہ میں جوابِ شکوہ کا یہ بند نقل ہوا ہے کہ ؎

مثلِ بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا — رخت بردوش ہوائے چمنستاں ہو جا
شوقِ وسعت ہے تو ذرّے سے بیاباں ہو جا — نغمۂ موج ہے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
بول اسلام کا ہر قوم میں بالا کر دے — اور دنیا کے اندھیرے میں اجالا کر دے

(بحوالہ جوہر اسپیشل نمبر علی برادران نمبر ص ۳۱۶، ۳۱۷)

اس طرح ہمدرد کے پہلے ہی سال کے مختلف شماروں میں اقبال کے اشعار پابندی سے نقل ہوئے ہیں۔

مولانا محمد علی کے اسی محولہ مضمون "تعلیمات اقبال" سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اقبال نے ۱۹۱۸ء میں اپنی شعری تصانیف اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی مولانا کی خدمت میں ارسال کی تھیں۔ یہ مضمون ۱۹۲۳ء یا اس کے بعد کا نوشتہ ہے کیونکہ اس میں اقبال کو سر محمد اقبال لکھا گیا ہے۔ اور سر کا خطاب انھیں جنوری ۱۹۲۳ء میں ملا تھا۔ اپنے اس مضمون میں مولانا نے یہ بھی لکھا ہے کہ "جب کسی کام سے مجھے لاہور جانا پڑا تو میں ان کا مہمان ہوتا" (بحوالہ اقبال دانائے راز از عبداللطیف اعظمی ص ۲۱) اس کی عبارت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان حضرات کے مابین کافی عرصہ سے تعلقات استوار

ہو چکے تھے لیکن ان کے تعلق میں گہرائی کب پیدا ہوئی اور اقبال اور ان کی شاعری کے متعلق مولانا کے کیا اثرات تھے مضمون سے اس کا بھی کچھ حد تک اندازہ ہوتا ہے انھوں نے لکھا ہے کہ "کامریڈ کے مقدمہ میں جب مجھے متعدد بار لاہور جانا پڑا تو میں نے ان کی زبان سے ان کی مثنوی کے بعض حصے سنے تھے جبکہ وہ لکھی جارہی تھی۔" (اقبال اور جامعہ از عبداللطیف اعظمی مشمولہ جامعہ۔ اقبال کی یاد میں بابت جنوری۔ مارچ ۱۹۷۰ء شمارہ ۱۔۳ ص۱۱) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب مثنوی اسرار خودی لکھی جارہی تھی مولانا اقبال سے کافی قریب ہو چکے تھے اور کامریڈ کا مقدمہ ۱۹۱۴ء کے آخر میں چلا تھا[۲۸] اس کا مطلب ہے کہ ۱۹۱۴ء میں دونوں حضرات کے تعلقات کافی استوار ہو چکے تھے پھر بھی کسی ذریعہ سے اس بات کا سراغ نہ مل سکا کہ ان کے مابین یہ تعلق کب سے شروع ہوا تھا۔

ان حضرات کے تعلقات کا اندازہ جاوید اقبال کے اس بیان سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ "..... بعد مولانا محمد علی بحیثیت قائد تحریک خلافت لاہور پہنچے اور اقبال سے ملنے کے لیے انارکلی والے مکان میں گئے اقبال بیٹھک میں دھسہ اوڑھے حقہ کا کش لگا رہے تھے۔ مولانا محمد علی سے ان کی کافی بے تکلفی تھی۔ مولانا نے انھیں دیکھتے ہی طنزاً کہا ظالم ہم تو تیرے شعر پڑھ کر جیلوں میں چلے جاتے ہیں اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں لیکن تو ویسے کا ویسا دھسہ اوڑھے حقہ کا کش لگاتا رہتا ہے۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ اقبال نے برجستہ جواب دیا مولانا میں تو قول کا قوال ہوں۔ اگر قوال خود ہی وجد و حال میں شریک ہو کر ہو حق میں تہہ و بالا ہونے لگے تو قوالی ہی ختم ہو جائے بہرحال اقبال نے خلافت کانفرنس کے ایک آدھ جلسہ میں شرکت کی اور صوبائی خلافت کمیٹی کے رکن بھی بن گئے۔" (زندہ رود جلد دوم ص۲۴۶۔۲۴۷)

غالباً یہ واقعہ امرتسر کی خلافت کانفرنس اور کانگریس کے مشترکہ جلسہ کے فوراً بعد کا ہے جو دسمبر ۱۹۱۹ء میں منعقد ہوا تھا۔ جس میں مولانا محمد علی مولانا شوکت علی، گاندھی جی، موتی لعل نہرو اور کئی دوسرے بڑے لیڈر شریک ہوئے تھے۔ اس میں اقبال نے بھی شرکت کی تھی اس موقع پر جب دو علی برادران سے بغل گیر ہوئے تو جلسہ میں عوام کے جوش و خروش کا عجب عالم تھا۔ شدت جذبات سے اکثر لوگ رو رہے تھے۔ اس میں دونوں بھائیوں کو مخاطب کرکے اقبال نے اشعار بھی پڑھ کر سنائے جو بانگ درا میں "اسیری" کے عنوان سے موجود ہیں۔ یہ اشعار اسی روز موٹر کار میں سفر کے دوران موزوں ہوئے تھے۔ (زندہ رود جلد دوم ص۲۴۷) اور حسب روایت منیر نیازی صاحب ان کو اقبال نے جلسہ میں ترنم کے ساتھ سنا یا جس نے حاضرین پر سکتہ طاری کردیا۔ (جوہر اسپشل سیریز علی برادران نمبر مرتبہ رئیس احمد جعفری ص۵۴۳) راستے میں گپ شپ ہو رہی تھی کہ یکایک اقبال کھو گئے بے تکلف دوستوں نے تبصرہ کیا نزول شعر شروع ہو گیا۔ چنانچہ جلسہ میں انھوں نے یہی شعر سنائے جو راستے میں امرتسر جاتے وقت ہوئے تھے:

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشک آخر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

بہر حال مولانا محمد علی جوہر اور اقبال ایک عرصہ تک نہ صرف ایک دوسرے کے روشناس رہے ہیں بلکہ ان میں برسوں ذہنی وابستگی بھی رہی ہے اور ملاقات کا سلسلہ بھی قائم رہا ہے۔ مولانا اقبال کی شاعری کے بے حد دلدادہ تھے۔ انھوں نے ناراضگی اور برہمی کے باوجود اقبال کے ہر دور کی شاعری کا جو اس وقت تک معرض وجود میں آچکی تھی جس انداز سے جائزہ لیا ہے اس سے ان کی اقبال شناسی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اقبال کی اس خداداد صلاحیت کی وجہ سے مولانا چاہتے تھے کہ وہ ہمارے ہمراہ تحریک آزادی اور تحریک خلافت میں مستعدی کے ساتھ عملی طور پر حصہ لیں کیونکہ اس سے ملک و قوم کو بے حد فائدہ پہنچنے کی امید تھی۔ اور ان تحریکوں میں جان پڑ سکتی تھی۔ لیکن اقبال نے اپنے مختلف انداز فکر کی بنا پر ان کا پورا پورا ساتھ نہیں دیا۔ وہ تحریک خلافت سے بھی کچھ ہی عرصہ کے بعد الگ ہو گئے۔

علامہ اقبال نے سید سلیمان ندوی کے نام مورخہ ۲۷ ستمبر ۱۹۱۹ء کو لاہور سے جو خط لکھا ہے اس سے تحریک خلافت کے متعلق ان کے خیالات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ اس خط میں انھوں نے خلافت کے موضوع پر بلا عنوان ایک چار شعر کی تضمین معارف میں اشاعت کے لیے درج کی ہے اور لکھا ہے کہ سادہ لوح مسلمان نہیں سمجھتے اور لندن ..... کے

اشارے پر ناچتے پھرتے ہیں۔ خط کے نیچے فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ لندن ...... سے اشارہ ہز ہائی نس آغا خاں کی طرف ہے۔ مجلس خلافت کی بنیاد ڈالنے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ انھیں کی ایما پر میر منشی مشیر حسین صاحب نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو خط لکھ کر اس کے لیے آمادہ کیا تھا۔ مذکورہ تضمین کے اشعار درج ذیل ہیں ؎

بہت آزمایا ہے غیروں کو تو نے — مگر آج ہے وقت خود آزمائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا — خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے — مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی
مرا از شکستن چناں عار ناید — کہ از دیگراں خواستن مومیائی

(اقبال نامہ حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص۱۰۵ تا ۱۰۷)

عبدالمجید سالک نے اپنی تصنیف "ذکر اقبال" میں معلوم نہیں کیسے انھیں وفد خلافت سے وابستہ کر دیا ہے جو مولانا محمد علی کی سرکردگی میں یورپ گیا تھا۔ (ذکر اقبال ص۱۳۲-۱۳۳) جبکہ یہ وفد یکم فروری ۱۹۲۰ء کو لکھنؤ سے روانہ ہوا اور اکتوبر ۱۹۲۰ء کو ہندستان واپس پہنچا تھا۔ (جامعہ محمد علی نمبر محمد علی کی آپ بیتی از مولانا محمد علی ترجمہ پروفیسر محمد سرور ص۲۵) اور خلافت کے متعلق درج بالا اشعار "پولیٹیکل گداگری" کے عنوان سے معارف ماہ اکتوبر ۱۹۱۹ء" کے شمارہ میں شائع ہو چکے تھے جو بعد میں علامہ اقبال کے شعری مجموعہ بانگ درا" میں "دریوزہ خلافت" کے عنوان سے طبع ہوئے۔ اسی شمارہ اور اسی صفحہ (۳۱۳-۳۱۴) پر جس پر یہ تضمین شائع ہوئی تھی، "زندانیوں کا وداع رمضان" کے عنوان سے مولانا کی غزل نما نظم بھی چھپی تھی، لیکن پتہ نہیں کیسے مولانا نے بھی اسے "وفد خلافت" کے لیے سمجھ لیا۔[1]

پروفیسر عزیز احمد نے اپنی تصنیف "اقبال نئی تشکیل" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ اقبال اسلامیت کا مرکز خانہ کعبہ کو سمجھتے تھے۔ اقبال نے خضر راہ میں اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے — نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

جبکہ تحریک خلافت اس کے علمبرداروں کے نزدیک اسلامی مرکزیت کو قائم رکھنے کی ایک کوشش تھی، لیکن اقبال کو اس بات کا افسوس ضرور تھا کہ ترکمان سخت کوش باہمی نفاق اور ذاتی مفاد کی بنا پر خاک و خون میں مل رہے ہیں ؎

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ — خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

اقبال فرنگی نظریہ قومیت کے شدید مخالف تھے کیونکہ اس کے سبب مسلم قوم پارہ پارہ ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود پروفیسر عزیز احمد نے تحریک خلافت کے انقلابی کردار کو تسلیم کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ یہ دو لحاظ سے انقلابی تحریک تھی (۱) وہ عام یورپی سامراج کے مقابل مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک اور خصوصاً ترکی کو آزاد دیکھنا چاہتی تھی (۲) وہ ہندستان کی مکمل آزادی کی خواہاں تھی اس وجہ سے بھی کہ مصر سے لے کر ملایا تک بہت سے اسلامی ممالک محض ہندستان کی وجہ سے برطانوی سامراج کے غلام تھے۔ یہی وجہ تھی کہ خلافت کانفرنس اور اس کے لیڈروں نے کامل آزادی کو ڈومینین اسٹیٹس کے مقابلہ میں کانگریس سے پہلے اور اس کے مقابلے میں زیادہ جوش سے ترجیح دی۔ (اقبال نئی تشکیل ص۸۸-۸۹)۔

لیکن دوسری اسلامی حکومتیں اب ترکی کی خلافت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ انجام کار مصطفیٰ کمال نے خلافت کو خود ہی ختم کر دیا۔ مگر تحریک خلافت سے تحریک آزادی میں تیزی آ گئی جس سے برطانیہ کے ایوان حکومت میں ایک ایسی دراڑ پڑ گئی جو پھر کبھی نہ بھر سکی۔

بہرحال علامہ اقبال ترکوں کی تباہی سے رنجیدہ ضرور تھے۔ اپنی نظم خضر راہ میں انھوں نے اسی رنج و یاس انگیز حالت میں لکھی تھی۔ لیکن جب مصطفیٰ کمال نے فرنگیوں کو شکست دی تو ان کا دل امنگ اور حوصلے سے بھر گیا۔ یہی وجہ ہے کہ "طلوع اسلام" میں یاسیت کے بجائے ایک طرح کی رجائیت ملتی ہے، جس کو انھوں نے مصطفیٰ کمال کی فتح پر لکھا تھا۔ لیکن بعد میں جب اس نے مغرب کی تقلید میں اصلاحات شروع کیں

---

[1] خلافت کیلئے مسلمانان ہندستان نے یورپ کو ایک وفد بھیجا جس کا سرگروہ میں تھا تو ڈاکٹر صاحب کو اس قدر غیرت آئی (اور میں اس غیرت کو بجا سمجھا) کہ انھوں نے دریوزہ خلافت کا قطعہ لکھا۔" (مضامین محمد علی حصہ دوم ص۴۲۵)

تو وہ اس سے بھی مایوس ہو گئے حسب ذیل اشعار ان کے اسی طرح کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں ؎

میری نوا سے گریبانِ لالہ چاک ہوا
نسیمِ صبح چمن کی تلاش میں ہے ابھی
نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی
مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن
زمانہ دار و رسن کی تلاش میں ہے ابھی

(سیرتِ اقبال صہ۴۶۳)

۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جب مولانا محمد علی جوہر نے علی گڑھ کالج کے مقابلے میں جامعہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی اس وقت بھی انھوں نے اقبال کو اپنے قریب لانے کی کوشش کی۔ گاندھی جی سے انھیں خط لکھوایا۔ لیکن انھوں نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا۔ گاندھی جی کے خط کے جواب میں انھوں نے جو خط لکھا ہے اس سے اور ایک آدھ دوسرے خط سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے جامعہ اسلامیہ کی پرنسپلی قبول کیوں نہیں کی۔ عبداللطیف اعظمی کے ایک مضمون بعنوان ہماری زبان مولانا محمد علی جوہر نمبر ۲۲ جنوری دیکم فروری ۱۹۷۹ء میں اور بعض دیگر مضامین میں اس کی تفصیل ملتی ہے۔ لیکن طوالت کے خوف سے اسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ ابتدائی صفحہ پر لکھا گیا کہ مولانا کی اقبال سے ناراضگی اور ان کی طرف سے مایوسی اس وقت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی ہے جب وہ پنجاب کونسل میں ہندستانیوں کے مقابلے میں انگریز افسروں کو ترجیح دینے کی بات کہتے ہیں اور جو ان کے پانچ مضامین کے لیے محرک بنتی ہے لیکن مولانا نے اپنے آخری مضمون "شمع و شاعر کے مصنف سے ایک سوال" میں اقبال کو جس انداز سے مخاطب کیا ہے اس سے ان کو پھر سے پانے کی تڑپ ظاہر ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں :-

بس یا تو خاموش رہ یا پھر وہی دیپک راگ الاپ جس نے ہندستان کے مسلمانوں میں ۱۹۲۲ء تک دیپک کا کام دیا تھا اور ہر قلب میں ایک آگ لگا دی تھی۔

شرط خود تیری اپنی مقرر کردہ ہے ؎

شعلہ بن کے پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

تعجب ہے کہ آج تو بھی لا تخف سے اتنا خوف زدہ ہو گیا۔ جب کہ گویا میں لکھا جاتا ہے تو ہی وہ اقبال نہیں ہے جس نے ہم کو بتایا تھا ؎

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر
از نبی تعلیم لا تحزن بگیر

قوتِ ایماں حیات افزایدت
ورد لا خوفٌ علیهم بایدت

چوں کلیمے سوئے فرعونے رود
قلبِ او از لا تخف محکم بود

بیم غیر اللہ عمل را دشمن است
کاروانِ زندگی را رہزن است

ہر جو پیداست اندر پائے ما
ورنہ صد سیل است در دریائے ما

ہر کہ رمز مصطفےٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

تو ہوشیار ہو کر مسلمانوں کو پھر بیدار کر اور مسلمانوں ہی کو نہیں مگر ہندوؤں کو بھی جو ہم سے بھی زیادہ خوف زدہ ہیں فقط مسلم لیگ ہی کو نہ جگا بلکہ کانگریس کو بھی ہوشیار کر پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے۔"

(مضامین محمد علی حصہ دوم ص ۴۷۵)

اہلِ سیاست جو بھی سمجھیں مگر مولانا کے جذبہ کا خلوص اور ملک و ملت سے ان کی بے پایاں محبت ظاہر ہے ان کی حق گوئی، جواں مردی اور بے باکی ایک ضرب المثل بن چکی ہے۔ اقبال ہی نے تو کہا تھا ؎

آئینِ جوانمردی حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مولانا اقبال کیا چاہتے تھے انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے :-

" میں تو آج بھی اقبال اپنے محبوب اقبال سے کہتا ہوں کہ ساقیا تو آتش بجام آ کر دیکھ کچھ شعلہ آشام اب بھی باقی ہیں۔ مانا کہ آخر شب بسمل کی تڑپ دید کے قابل تھی مگر تو پھر بالائے بام آ کر دیکھ ابھی تیرے سامنے تڑپنے کے لیے بہت بسمل باقی ہیں۔ "

(مضامین محمد علی ص ۴۷۶)

مولانا کو اس بات کا افسوس تھا کہ اقبال نے لالچی منچے اور کلکٹر کے دامِ فریب کو تو دیکھ لیا لیکن اس جال کو نہ دیکھ سکے جو لندن سے شملہ اور شملہ سے لاہور تک پھیلا ہوا تھا جو زیادہ سخت تھا۔
بات دراصل یہ تھی جس کی طرف محمد احمد خاں نے اپنی تصنیف

"اقبال کا سیاسی کارنامہ" میں ایک جگہ اشارہ کیا ہے کہ :-

"..... اقبال اس وقت پنجاب کونسل کے رکن تھے اس تجویز کی مخالفت کی ان کی رائے تھی کہ اس وقت فضا فرقہ واریت کے زہر سے مسموم ہو چکی ہے اس لیے اگر تقررات کھلی مسابقت کے ذریعہ ہوں گے تو مسلمانوں کو بہت کم موقع ملے گا۔ لہٰذا تقررات کا ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس میں مسابقت کے ساتھ نامزدگی بھی ہو دوران تقریر میں آپ نے یہ بھی کہہ دیا کہ موجودہ فرقہ وارانہ فضا میں کھلی مسابقت کے ذریعہ تقررات کیے جانے پر وہ غیر ملکی افسروں کے تقررات کو ترجیح دیں گے (اقبال کا سیاسی کارنامہ ص ۲۴۹)

لیکن محمد احمد خاں ہی کے قول کے مطابق اقبال نے مولانا کی اس سخت تنقید کو گوارہ کر لیا یعنی مولانا نے ان پر جو بے عملی اور رجعت پسندی کا الزام لگایا تھا انھوں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن ایک نقاد نے اس سلسلے میں بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ " اقبال کے اعتراف کمال کے باوجود جوہر کی معاندانہ روح ان کی گوشہ گیری اور راحت پسندی پر معترض ہوئی وہ اس اعتراض کی تردید تو کیا کرتے ان کی ذہانت نے اس کی صحت کے اعتراف میں کبھی جھجک محسوس نہیں کی ع

وہ اک مرد تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا۔ یا ع تخم کردارے ز خاک ما ندزاد۔ یہ اعتراف بھی اس بے عمل انسان کا ایک عمل ہی ہے پھر اس کی بے عملی نے اپنی جگر گداز نواؤں سے جتنے باعمل انسان پیدا کئے دنیا کے کسی ایک شاعر کو بھی وہ نصیب نہ ہو سکے۔ اس کا اعتراف خود علی برادران نے بھی کیا ہے کہ اسلام کا ابوالکلام کی نثر اور اقبال کی نظم میں بڑا حصہ ہے (محمد علی کی نذر از عرشی امرتسری مشمولہ جوہر اسپیشل سیریز ص ۴۹، ۵۰)

اس کے علاوہ مولانا نے اقبال کے سائمن کمیشن کے مقاطعہ میں حصہ نہ لینے پر بھی ۱۲ نومبر ۱۹۲۷ء کے ہمدرد میں ان کے خلاف ایک مضمون لکھا تھا۔ مولانا کی اس تلخ نوائی کو بھی انھوں نے برداشت کر لیا لیکن نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد ۱۹۲۸ء میں جب مولانا نے رپورٹ کی سخت مخالفت کی اور کانگریس سے ترک تعلق کر کے آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شریک ہوئے تو بقول محمد احمد خاں تصور اقبال اور مولانا کے زاویہ نگاہ میں کوئی بڑا فرق نہیں رہا۔ اور سیاست کے میدان میں دونوں ایک دوسرے سے قریب ہو گئے اور ڈاکٹر صاحب کے دل میں ان کا احترام بڑھ گیا چنانچہ ایک خط میں مولانا کے متعلق وہ لکھتے ہیں :-

" ان کی اسلامی سادگی اور آخری سالوں میں اپنی بعض آرا کے بدلنے میں جس امانت و دیانت کا انھوں نے ثبوت دیا اس کا بہت احترام کرتا ہوں "

(بحوالہ اقبال کا سیاسی کارنامہ ص ۲۵)

مولانا نہرو رپورٹ سے اس لیے خوش نہیں تھے کہ اس میں آزادی کامل کے بجائے ڈومینین اسٹیٹس کی مانگ کی گئی تھی۔ اور مسلمانوں کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا تھا۔ لیکن کانگریس سے الگ ہونے کے بعد بھی ان کے نصب العین میں کوئی بنیادی فرق نہیں آیا۔ اس کا کھلا ہوا ثبوت مولانا کی آخری تقریر ہے۔ جو انھوں نے پہلی گول میز کانفرنس کے چھٹے عام اجلاس میں ۱۹ نومبر ۱۹۳۰ء کو قصر سینٹ جیمس لندن میں کی تھی۔ اس میں انھوں نے اپنی زندگی کے خاص مقصد کو نہایت جرأت مندانہ طور پر واضح کیا ہے۔ اور اپنے وطن کے لیے آزادی کامل کا مطالبہ کیا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج وہ تنہا مقصد جس کے لیے میں آیا ہوں یہ ہے کہ میں اپنے ملک کو اسی صورت میں واپس جاؤں گا جب ایسی آزادی جس پر آزادی کا اطلاق ہو سکے میرے ہاتھ میں ہو میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا۔ میں ایک غیر ملک میں بشرطیکہ وہ ایک آزاد ملک ہو مرنے کو ترجیح دوں گا اور اگر آپ ہم کو ہندوستان میں آزادی نہیں دیں گے تو آپ کو یہاں ایک قبر دینی پڑے گی"

(مترجم ۔ م ۔ م ۔ صدیقی)

مولانا نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ ہندوستان میں ہندو مسلم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے اور اگر ہے تو اس کے ذمہ دار بھی آپ ہی ہیں۔ ہم میں آپس میں کوئی لڑائی نہیں ہے ہمارے لڑنے اور جھگڑنے کے لیے کوئی چیز نہیں ہے۔ پہلے ہمیں آپ آزادی دیجئے۔ اس کے بعد ہم اپنے حقوق کیلئے

آئیں میں لڑیں گے۔ ابھی تو ہماری لڑائی آپ سے ہے۔ مجھے یہ تجویز ادھر انجام بھی گوارا ہے کہ حکومت اکثریت کی ہوگی۔ حکومت اکثریت کو کوئی بھی چاہیے۔ ہمیں اقلیت کے تحفظ کی بھی اب ضرورت نہیں۔ غرض مولانا نے ہر طرح کے ذاتی اور ملی اندیشوں سے بلند ہو کر ملک کے لیے آزادی کامل کی اپنی تقریر میں جراءت مندانہ مانگ کی۔

مولانا بڑی خستہ حالت میں کانفرنس میں شریک ہونے گئے تھے۔ وہ ذیابطیس کے مرض میں شدت سے مبتلا تھے۔ خون کا دباؤ بھی کافی بڑھ گیا تھا۔ اس لیے انھیں بیٹھ کر تقریر کرنے کی اجازت مل گئی۔ انجام کار اسی سفر میں ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن ہی میں انھوں نے انتقال کیا۔ ان کی وفات پر نہ صرف ہندوستان میں صف ماتم بچھ گئی بلکہ تمام عالم اسلامی بھی اس سانحہ پر تڑپ اٹھا۔ بہت سے اسلامی ممالک نے محمد علی کی ابدی آرام گاہ اپنے ملک میں بنانے کی خواہش ظاہر کی۔ ان کی میت ایک تابوت میں رکھ دی گئی تھی۔ لندن سے اسے لے کر چلے تو فلسطین کے مفتی اعظم کا فتویٰ شائع ہوا کہ مولانا محمد علی عالم اسلام کے رہنما تھے اور ان کی زندگی عربوں کے مفادات کی حفاظت میں صرف ہوئی ہے۔ اس لیے انھیں بیت المقدس میں دفن کیا جائے۔ اب جہاں مولانا محمد علی کا مزار ہے وہ ایک کوٹھی تھی۔ جسے کسی شخص نے اپنے لیے محفوظ کر رکھا تھا۔ جب اسے محمد علی کی خدمات کا علم ہوا اور انھیں بیت المقدس میں دفن کرنے کی تجویز سامنے آئی تو اس نے اپنی جگہ مولانا محمد علی کے لیے نذر کر دی جہاں وہ ۲۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو سپرد خاک کیے گئے۔ ان کی قبر پر ان کا یہ شعر درج ہے ؎

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

مولانا کا مزار مسجد اقصیٰ کے احاطہ میں مسجد عمرؓ کے متصل ہے۔

مولانا کی وفات پر ملک میں ان کے متعلق بڑے پیمانہ پر مضامین اور مراثی شائع ہوئے۔ لیکن علامہ اقبال کا مرثیہ سرفہرست نظر آتا ہے جو سوز و گداز اور مولانا سے ان کی جذباتی وابستگی کا مظہر ہے۔ ؎

یک نفس جان نزار او تپید اندر فرنگ
تا مژہ برہم زنیم از ماہ و پرویں در گزشت

اے خوشا مشت غبار او کہ از عذف حسوم
از کنار اندلس از ساحل بربر گذشت
خاک قدس او را بہ آغوش تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت
می نگنجد جز بہ آں خاکے کہ پاک از رنگ نیست
بندہ کو از تمیز اسود و احمر گذشت
جلوہ او تا ابد باقی بہ چشم آسیاست
گرچہ آں نور نگاہ خاور از خاور گذشت

لیکن مولانا محمد علی کا یہ مرثیہ اقبالؔ کے کسی شعری مجموعہ میں شامل نہیں ہے اس بات پر پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ راقم الحروف کو بھی حیرت ہے جبکہ آزاد نے اس مرثیہ کو فارسی ادب کا شاہکار بتایا ہے۔

لہ مثل بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا
رخت بر دوش ہوائے چمنستاں ہو جا
نغمۂ موج ہے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
ہے تنک مایہ تو ذرے سے بیاباں ہو جا
قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے

(کلیات اقبال اردو (صدی ایڈیشن) ص ۲۰۶، ۲۰۷)

لہ بحوالہ جامعہ۔ مولانا محمد علی نمبر: محمد علی کی آپ بیتی مترجم پروفیسر محمد سرور (ص ۲۵، ۲۶)

*

غزلیں

حیات وارثی
باغ انوار۔ لکھنؤ ۳

نصیلِ شکر میں ہیں، صبر کے حصار میں ہیں
جہاں گذر نہیں غم کا ہم اس دیار میں ہیں

وجود ہی سے عدم کو وجود ملتا ہے
ہیں منتظر بھی ہمیں خود ہی انتظار میں ہیں

ہمیں اجال دے، پھر دیکھ اپنے جلووں کو
ہم آئینہ ہیں مگر پردۂ غبار میں ہیں

ہے اختیار ہمیں کائنات پر حاصل
سوال یہ ہے کہ ہم کس کے اختیار میں ہیں

جلا کے مشعلیں چلتے تو ہوتے منزل پر
وہ قافلے جو سویرے کے انتظار میں ہیں

بکھر گیا ہے کمال و ہنر کا شیرازہ
دل و دماغ معیشت کے انتشار میں ہیں

خمار ٹوٹے گا ان کا بھی شاخِ گل کی طرح
جو ناشناسِ چمن نشۂ بہار میں ہیں

حیاتؔ کی کوئی تشریح ہو نہیں سکتی
لطافتوں کے جہاں، گُن کے اختصار میں ہیں

مست حفیظ رحمانی
پرانا سیتاپور ۔ یو۔پی۔

اک مدت سے گم ہے نشاں بھی تحریروں کے صحرا میں
اپنا چہرہ ڈھونڈھ رہا ہوں تصویروں کے صحرا میں

رنگ برنگے موسم یونہی آئیں گے اور جائیں گے
کوئی نہیں پہچاننے والا تنویروں کے صحرا میں

اک دن بنجر ہو جائے گی یہ بھی زمینِ فکر و عمل
قافلۂ احساس گھرا ہے تقریروں کے صحرا میں

فن کا سبزہ لفظ کے بوٹے فکر شجر کے دوش بدوش
نقشِ فنِ آذر بھی ملیں کے تحریروں کے صحرا میں

بے سر ہی زندہ رہتے ہیں سر والوں کی دنیا میں
دیکھیے چل کر سر کی بلندی شمشیروں کے صحرا میں

جن کو شعورِ شعر نہیں ہے بزم کی وہ بھی زینت ہیں
طالبِ شہرت گھوم رہے ہیں تدبیروں کے صحرا میں

کتنے مسائل جاگ رہے ہیں مستؔ ہمارے شعروں میں
کوئی شناسا ڈھونڈھ ہی لے گا تفسیروں کے صحرا میں

شوکت پردیسی
محلہ [illegible] جونپور

حرمت الاکرام

ایک جوانِ فکر شاعر

یادش بخیر! ایک بار پھر ۱۹۴۵ء کی وہ رات نگاہوں میں ہے۔ جونپور شہر کے تلک دھاری ڈگری کالج میں ایک آل انڈیا قسم کا مشاعرہ تھا جس میں رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری۔ علامہ انور صابری۔ روش صدیقی کے علاوہ دیگر بہت سے بیرونی شعرا آئے تھے۔ مشاعرہ کالج والوں کی طرف سے کالج کے وسیع ہال میں ہوا تھا۔ مشاعرہ کے بعد منتظمین نے تمام شعرا کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا۔ شعرا پر عجیب بے بسی طاری تھی۔ انور صابری صاحب تو یہاں کے اپنے مستقل ٹھکانے پر چلے گئے۔ فراق صاحب کو بھی کچھ لوگوں نے الہ آباد روانہ کر دیا۔ روش مرحوم خود ہی کسی طرف ہو لیے۔ واپسی پر کسی نے ان کو دیکھا ہی نہیں کہ وہ کہاں اور کیسے واپس گئے۔ کچھ شعرا مولانا شفیق جونپوری مرحوم کے دولت خانے پر براجمان ہوئے۔ کالج سے شہر آنے والی سڑک پر دو ساے متحرک تھے۔ جاڑے کی رات تھی۔ غالباً دو بج رہا تھا سڑک پر سناٹا ہو چکا تھا۔ دو میں سے ایک کی حالت غیر تھی۔ انتہائی نحیف و لاغر ہڈیوں کا ڈھانچہ بھوک اور ٹھنڈک سے نڈھال۔ قریب پہنچا۔ تو میں نے پوچھا آپ لوگ کون ہیں؟ کہاں جائینگے؟ جواب ملا۔

"مسافر ہوں۔ مشاعرہ میں آیا تھا۔ رات بھر کے لیے سائے کی تلاش ہے"

"آپ کا اسم گرامی"

"حرمت الاکرام"

"یہ تھی حرمت الاکرام سے شہر کی ایک سنسان سڑک پر پہلی ملاقات۔

" حرمت نے لرزتے ہونٹوں سے کہا کہ" مجھے تو اب شاید صبح دیکھنی نہ نصیب ہو"

نازش پرتاب گڈھی صاحب البتہ کچھ سوچتے ہوں گے۔ یہ ان کا جانا بوجھا شہر ہے۔ میں پہلی بار آیا ہوں" میں نے کہا کہ اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو غریب خانہ حاضر ہے ...... حرمت الاکرام نے کسی بھی توقف کے بغیر کہا کہ ٹھہر کے گفتگو کرنے کے بجائے چلے چلئے ورنہ پھر میں چلنے کے قابل بھی نہ رہوں گا ڈیڑھ میل پیدل چلکر گھر پہنچتے ہی سب سے پہلے دونوں آدمیوں کو گرما گرم کافی پیش کی اور لحاف وغیرہ دیا۔ بعد ازاں تازہ بہ تازہ کھانا کھانے کے بعد ان لوگوں کو آسودگی حاصل ہوئی۔ نازش پرتاب گڑھی تو دوسرے ہی روز پرتاب گڈھ روانہ ہوگئے۔ اور انھوں نے آج تک اخلاقی طور پر بھی پہنچنے کی رسید نہیں بھیجی۔ حرمت الاکرام دس گیارہ روز قیام پذیر رہے کھانسی۔ زکام اور بخار میں مبتلا رہے معقول علاج اور پرہیز سے تیسرے ہی روز صحت مند ہوگئے۔ واپسی کا کرایہ جونپور آنے والے کسی بھی شاعر کے پاس نہ تھا۔ جب جونپور سے مرزا پور رخصت ہوئے تو ریلوے اسٹیشن پر اتنے جذباتی ہوگئے کہ مجھے یہ کہنا پڑا کہ ایک نوجوان کو اتنا رقیق القلب نہیں ہونا چاہیئے۔ اسکے بعد سے حرمت الاکرام دم واپسیں تک مجھ سے قریب رہے۔ اس ملاقات کے بعد بھی وہ دو بار جونپور غریب خانہ پر آئے۔ دوسری بار میرا فرسودہ مکان مسمار ہونے کے بعد نئی عمارت تعمیر ہو چکی تھی۔ اتفاق سے حرمت جب آئے تو اس روز مہمانوں کی برکت تھی۔ علامہ محوی صدیقی لکھنوی۔ علامہ اقبال جوہر سہیل مرزا احسان اور عادل رشید پہلے سے موجود تھے یہ لوگ بالکل اتفاقی طور

پر ایک کے بعد ایک کر کے میرے غریب خانہ پر یکجا ہوئے تھے وہ رات شعر و ادب کی بڑی حسین و لطیف رات تھی۔ کھانے کے بعد بھی دو ڈھائی بجے شب تک محفل ادب گرم رہی۔ دوسرے روز صبح گیارہ بجتے بجتے سب لوگ رخصت ہو گئے البتہ حرمت الاکرام اور عادل رشید مزید دو روز کے قیام کے بعد گئے۔ ۱۹۵۳ء میں جب میں بمبئی چلا گیا اور اپنے پہلے ہی سفر میں مسلسل پانچ چھ سال قیام کیا تو وہاں سے بھی میری خط و کتابت جاری رہی۔ یہاں تک کہ وفات سے ایک ماہ پیشتر بھی حرمت الاکرام کا ایک تفصیلی خط اپنی کچھ کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں ملا تھا اسی لفافہ میں یہاں کے ابھرتے ہوئے افسانہ نگار ایس. ایم عباس صاحب ایڈووکیٹ جونپور کے نام بھی ایک خط تھا جسے میں نے خود بھیجا کے عباس صاحب کو دیا۔

یکے بعد دیگرے میرے لئے یہ تیسرا صدمہ ہے۔ سلام مچھلی شہری کی وہ تحریر اور تار اب بھی محفوظ ہے۔ جو آپریشن سے صرف بیس منٹ پہلے مجھے لکھا تھا۔

"شوکت! دنیا بڑی اچھی لگ رہی ہے۔ دعا کرو آپریشن کامیاب ہو۔ بیس منٹ اور باقی ہیں تمہارا سلام"

دوسرا تار ملا "سلام اب نہیں رہے" کلیجہ مسوس کے رہ گیا چند سال بعد ایک اور تار لکھنؤ سے ملا۔

"۴ر جون ۱۹۸۲ء کو حسن جاوید ایم اے رخصت ہو گئے" یہ دوسری چوٹ چٹیلی کاری تھی۔ حسن جاوید میرے ہم زلف تو تھے ہی لیکن ہم خیال اور یار خاص بھی تھے۔ محترم جناب امیر احمد صدیقی ایڈیٹر "نیا دور" لکھنؤ سے میرا غائبانہ تعارف مرحوم ہی کا رہین منت ہے حرمت الاکرام کے بڑے بھائی جو مستقل طور پر کلکتہ میں رہتے تھے، مشہور صحافی اور مزاح نگار بھی تھے حسن جاوید کے یار خاص میں سے تھے۔ حرمت کے بڑے بھائی کی وفات بھی حسن جاوید سے چند ہی ماہ پیشتر ہوئی تھی۔ ان سب موقعوں پر حرمت الاکرام نے اپنے طویل خطوط میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اس سے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ "وہ خود بھی کمر باندھے ہوئے تیار بیٹھے ہیں" اور اپنی روانگی کا یہ تیسرا صدمہ بھی جلد ہی ۱۹۸۳ء سے آج تک کی کہانی دہرائے گا جونپور کی ایک اور بزرگ ہستی قابل قدر ادبی شخصیت محسن رضا صاحب بھی حرمت سے جا ملے۔ ایک عجیب بے بسی بے یاری اور بے اعتمادی کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔

حرمت الاکرام میں عام شعرا جیسی عادت نہیں تھی۔ وہ بیحد مخلص وضع دار خلیق اور نیک سیرت انسان تھے۔ بڑی حساس طبیعت کے مالک تھے کم سخن تھے۔ ہنگاموں سے دور رہتے تھے۔ مگر ارادے کے مضبوط اور اہل و عیال کی آسائش کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ چائے کثرت سے نہیں پیتے تھے لیکن پھر بھی چائے اور پان کے عادی تھے۔ لباس صاف ستھرا پہنتے۔ اور کھانا وغیرہ وقت سے کھانے کے عادی تھے۔ وہ کہیں بھی جاتے تو اس بات کا پورا پورا خیال رکھتے کہ صاحب خانہ کو ان کی ذات سے کوئی دشواری نہ پیدا ہو۔ مشاعروں میں جانا انھیں ذاتی طور پر پسند نہ تھا۔ شب بیداری کا ان کے اعصاب پر بڑا خراب اثر پڑتا تھا۔ ہر وقت مسکرانا ان کی عادت تھی شعر سنانے کے لیے کبھی بیتاب نہ رہتے۔ مخصوص نشستوں سے بیحد محظوظ ہوتے تھے ایک بڑا وصف یہ بھی تھا کہ کسی نے غلط کہا ہو یا صحیح۔ وہ کبھی حیلہ بازی یا محفل برخواست ہونے کے بعد اس پر تنقید نہ کرتے۔ کسی کے بھی فکر و فن کو ناقص یا اپنی تخلیقات کو کامل نہ کہتے۔ بہت زیادہ کچھ کہنا ہوتا تو صرف اتنا ہی کہتے کر کھوٹے کھرے کی پرکھ کا غذ پر خود ہی ہو جاتی ہے۔ کسی کے بھی خط کا فوراً جواب نہ دینا وہ بدترین بد اخلاقی سمجھتے تھے۔ عمر بھر مالی مشکلات سے دوچار رہے۔ بڑی عسرت کی زندگی گذاری۔ صحت نے بھی ہمیشہ محروم ہی رہے لیکن پھر بھی اپنی ذمہ داریوں سے کبھی غافل نہیں رہے۔ بیوی بچوں سے انہیں بھرپور لگاؤ تھا۔ انھیں بچے بچیاں بہت عزیز تھیں۔ وہ عام شعرا کی طرح باہر واہ واہ اور گھر میں آہ آہ کو ناپسند کرتے تھے ان میں کوئی بھی ایسی عادت نہیں تھی جو کسی طرح سے بھی انسان کے کردار کو مجروح کرے۔ قول و فعل میں تضاد نہ تھا۔

عسرت و تنگدستی نے آخری لمحہ تک ان کا ساتھ نہ چھوڑا لیکن وہ اتنے غیور تھے کہ کبھی اپنی مصیبت یا پریشانی کا اظہار عام آدمیوں سے نہیں کرتے تھے۔

ان کی مشہور نظم "نشیب و فراز" ان کی اپنی ہی ذات کی ترجمان ہے

داستانِ غمِ دل تجھ کو سناتا اے دوست!
ہو سکا مجھ سے تو یہ بھی نہ گوارا اے دوست!

میری خودداری کو ہر ایک تکبر سمجھا
رازِ خودداری مگر کوئی نہ سمجھا اے دوست!

آم کی شاخ پہ کوئل کی یہ کوکیں پیہم
کون سمجھے کہ یہ نغمہ ہے کہ نالہ اے دوست!

میری ہستی کے خد و خال نظر کیا آتے
مجھکو دنیا نے بہت دور سے دیکھا اے دوست!

اب نہ پہچانیں فلک والے تو یہ بات ہے اور
آخرش میں بھی ازل میں تو نہیں تھا اے دوست!

کم سے کم دوست یہ کرتی ہے بھروسہ دنیا
یوں تو دنیا میں نہیں کوئی کسی کا اے دوست!

بحیثیت ایک شاعر کے ان کی جولانیٔ طبع کسی ایک ہی صنفِ سخن تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ ان کی شاعری کے خوانِ یغما پر انواع واقسام کے لذائذ موجود ہوتے تھے۔ حرمت الاکرام کے کلام میں متانت اور سنجیدگی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ بھرتی کے مضامین سوقیانہ محاورہ۔ ہوس پرستی اور مبتذل الفاظ و تراکیب سے بڑی حد تک ان کا کلام پاک ہے۔ چونکہ خوشی اور غم کا وجود انسان کی ذات سے باہر نہیں۔ اور ہمارے جذبات میں ہر دو عناصر کا کچھ نہ کچھ حصہ فطرت کی طرف سے بھی ودیعت ہوتا ہے۔ اس لیے "ناامیدی" میں بھی کوئی نہ کوئی امید ضرور پنہاں ہوتی ہے جو انتہائے یاس و بیم کی تاریکی میں بھی اپنی ٹمٹماتی ہوئی روشنی برقرار رکھتی ہے رنج و غم کی بعض کیفیتیں انسان میں ایسی بھی ہوتی ہیں جن سے اسکو ایک طرح کا اطمینان و سکون ہی نہیں بلکہ لطف بھی حاصل ہوتا ہے۔ حرمت الاکرام نے اپنی شاعری میں ایسی ہی کیفیتوں سے ہمیشہ استفادہ کیا ہے۔ اور عمر بھر وہ یکسر قنوطیت سے محفوظ رہے۔ مثلاً

بچنا بھی ہے محال کہ افتادِ بے زری
رستے میں خود کھڑی ہے خریدار کیطرح

غرض حرمت الاکرام عمر بھر ناکامی میں کامیابی کے جویا رہے۔ شکست میں ان کو فتح نظر آئی۔ رنج و غم سے ان کو خوشی حاصل ہوئی ان کا فلسفہ استوار ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ حرمت الاکرام بلاشبہ ایک جوان فکر شاعر تھے ان کے کلام میں سب سے زیادہ قابلِ تعریف امر یہ ہے کہ وہ بلند و ارفع خیالات تک کو نہایت سلیس عبارت میں بیان کر دیتے ہیں۔ جو قوافی اور بحور انھوں نے عموماً استعمال کی ہیں وہ بھی نہایت آسان اور بے حد سیدھی سادھی ہیں۔ ان کے خیالات بھی زیادہ پیچیدہ نہیں ہوتے جسکے لئے زیادہ دماغ سوزی کرنا پڑے جن خیالات کو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے لیے نہایت عمدہ چیدہ اور منتخب الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اور اگر بغور دیکھا جائے تو یہی ان کی شاعرانہ کامیابی اور ہردل عزیزی کا راز ہے۔ اس کے ثبوت میں ذیل کے اشعار ہیں ؎

امید خانماں برباد لوٹ کر آئی
بنا کے ٹوٹتی شاخوں پہ کتنے گھر آئی

صبا گئی تھی پئے رقص و سرخوشی لیکن
سنا ہے اور بھی ان کو اداس کر آئی

بلوغ خاک کے انداز ہیں جدا حرمت
کہ عمر گذری تو دنیا شباب پر آئی

یہ چلے گھر سے تو روشن رہے منزل کی ڈگر
رات کی مانگ چراغوں سے سجائی جائے

کیجئے بچنے کی تدبیر کہ وقت
قاتلوں سے بھی بڑا قاتل ہے

اسی طرح اگر ان اشعار کو غور سے دیکھا جائے تو اپنی سلاست اور راست گوئی میں بہترین اشعار کہے جا سکتے ہیں ؎

نہ کچھ اور میں نے چاہا نہ کچھ اور میں نے پایا
یہ انا بھی چھن گئی تو میرے پاس کیا رہے گا

نہ تھی کوئی میری قیمت کہ تھا مول ہی سوا کچھ
مجھے بیچ بھی نہ پائی یہ ستم ظریف دنیا

پیکر طرازِ حسرت و حرماں کہیں جسے

(باقی ص ۳۵ پر)

ایس۔ایم عبّاس
مانی کلاں۔ضلع جونپور

نئی زندگی کے تقاضے

حرمت الاکرام کی شاعری میں

شہر نسرین و گل و لالہ تک آتے آتے
زندگی شیوۂ آشفتہ سری بھول گئی
ہم بھی کیا کیا نہ پشیمان ہوئے ہیں کہ حیات
خودگری بھول گئی، خودنگری بھول گئی

اور شاعر کا یہی وہ شعور ہے جو اسے نئی زندگی کے تقاضوں کی طرف متوجہ کرتا ہے، فن سے فن کار کا تعلق شعور کے رشتہ سے ہی قائم ہوتا ہے اور اسی لیے تخلیق اپنے خالق کے فکر و شعور، احساس و ادراک کی گہری غمازی کرتی ہے۔ شاید اسی لیے حرمت الاکرام نے کہا ہے ؎

ہر کشمکش درد کو اپنا لینا ہنس لینا گا لینا، غم کھا لینا
ادراک لگاتا ہے کچھ کے ورنہ دل کو میں کھلونوں سے بھی بہلا لینا

فن کا خمیر اگر زندگی کے جزوِ لطیف سے اٹھتا ہے اور اس میں جمال کی حسن آرائیاں اور جلال کی جلوہ سامانیاں ایک ساتھ ابھری ہیں شعلے کی تپش اور شبنم کی خنکی و لطافت کا امتزاج ہے تو اسے فن کار کے بھرپور شعور و ادراک سے بہرہ ور ہونا بھی ناگزیر ہے۔ فن کار کو عصری آگہی کا ادراک جتنا زیادہ ہوگا۔ اس کے فن کی راہیں اتنی ہی استوار اور اس کی تخلیق کا مرتبہ اتنا ہی اونچا ہوگا۔ اس عصری آگہی کا اثر کچھ اتنا تیز ہوتا ہے کہ فن کار کی لطیف اور جمالیاتی حس (جو یقینی طور پر اس کے چہرۂ فن کا غازہ ہوتی ہے) بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی ہے اور شاید اسی لیے فن کار کے دل میں نجانے کتنے نرم و نازک جذبات تڑپ رہ جاتے ہیں نہ معلوم کتنی معصوم تمنائیں گھٹ کر دم توڑ دیتی ہیں لیکن وہ ان کا اظہار بھی نہیں کرسکتا ہے اور جب اس کی زندگی سے زندگی کا ملاپ نہیں ہو سکتا ہے اور وہ دلی جذبات کا اظہار نہیں کرسکتا ہے تو اس کی حسرت و افسردگی فطری ہو جاتی ہے۔ ؎

بھیڑ سی بھیڑ ہے اور تک ہے پہنچنا دشوار
زندگی سے کوئی کیا مل سکے تنہائی میں

گونج لفظوں میں لہو کی یوں ہے
کسی گنبد کی صدا ہو جیسے

لمحوں کی کائنات ہے بازار کی طرح
تکتا ہوں چار سو کسی نادار کی طرح

اور ایسے ہی دوسرے بہت سے رے شعر حرمت کی دلی کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں بیسویں صدی نے آہستہ آہستہ نئی کروٹ لی، دنیا کے حالات تیزی سے بدلے۔ اس تبدیلی سے جہاں دوسرے شعبۂ حیات متاثر ہوئے وہیں شعر و ادب کی روایت بھی یکسر بدل گئی۔ بدلتی ہوئی زندگی کے دھارے نے شعر و ادب کے نگار خانے پر نہ صرف نئی فکر و خیال کی شمعیں روشن کردیں بلکہ ادیب و شاعر کے لیے نہ جانے کتنے نئے رجحانات

کے دروا کر دیئے۔ نئی دریافتوں نے نئے مسائل کو جنم دیا اور فن کار نے ان نئے مسائل سے اپنا رشتہ شعوری اور لاشعوری طور پر جوڑا ہے موجودہ صدی کی تیسری یا چوتھی دہائی کے بعد ادب میں جو بہت ساری تبدیلیاں رونما ہوئیں انھیں اسی سیاق و سباق میں دیکھا جا سکتا ہے۔

بات تھوڑی واضح کی جائے یوں کہا جا سکتا ہے کہ تخلیق بھی ایک تجریدی عمل ہے اور اس کا دائرہ کار یہی سرزمین ہے جس پر ہم سانس لیتے ہیں کوئی بھی ادب خلا یا فضا میں نہ جنم لیا ہے نہ پروان چڑھا سکتا ہے اس تخلیقی عمل کے لیے حیات کے ہر دھارے حالات کے ہر تقاضے، وقت کی ہر رفتار سے متاثر ہونا لازمی ہے لیکن یہیں پر فن کار پر بھی یہ ایک بڑی ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ اسے اپنے عہد کے تقاضوں کا شعور و ادراک ہو اور وہ فن اور سماج کے باہمی رشتے کا احترام کرنا جانتا ہو بلکہ اپنا فریضہ سمجھتا ہو اسی بات کو مختصر کر کے یوں کہا جا سکتا ہے کہ فن کی بقا کے لیے لطیف ترین احساسات، عمیق ترین جذبات، بلند ترین خیالات کے ساتھ ساتھ عصری آگہی کا شعور، نادر مشاہدات اور قیمتی تجربات کا امتزاج ضروری ہے اور اس التزام کے بعد ہی کوئی شاعر یا ادیب "ادب کی محراب پر تا دیر رنگ و نور بکھیرنے والی شمعیں روشن کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے حرمت الاکرام نے اپنے فکر و فن کا تعارف یوں کرایا ہے ؎

ہر روشنی ہی میری منزل بھی، میرا فن بھی
فکر کی دھوپ میں تپتا ہوں بیاباں کی طرح

حرمت قدم قدم پہ کٹانا پڑا ہے سر
لمحات کا سفر ہے یا چلتی چھری کی دھار

نئی زندگی کے دھارے نے حیات کی بساط کو بری طرح الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ انسانیت کا قافلہ گم کردہ راہ ہو کر رہ گیا ہے اور وہ آج ایسے چوراہے پر کھڑا ہے جہاں ہر طرف سے اسے شدید اضطراب و انتشار نے گھیر لیا ہے۔ ڈر، خوف، ہراس، وحشت اور بیگانگی کے ماحول میں وہ ہمہ وقت سخت گھٹن محسوس کر رہا ہے وہ کہاں جائے کدھر جائے؟ وہ منزل کے لیے پریشاں ہے لیکن اس کی نگاہوں میں نہ کوئی منزل ہے نہ راستہ اور اس عالم میں وہ تنہائی کے احساس نے اس کے دل میں گھر کر لیا ہے۔ ایک طرف ہم قومی سے بین الاقوامی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن دوسری جانب ہمارے جذبات و احساسات محدود سے محدود تر ہوتے جا رہے ہیں۔ آج یہ بات پوری دنیا کے لیے بے چینی کا باعث بنی ہوئی ہے بے پناہ فکری توانائیں اس مسئلہ کے حل میں صرف ہو رہی ہیں ایک ادیب و شاعر، مفکر و محقق جب اس آفاقی علم رکھنے کا دعویٰ کرنے والے انسان کی یہ کھلی ہوئی شکست دیکھتا ہے تو وہ سخت مایوس ہو جاتا ہے اور اس کے لہجے میں گہری افسردگی و تلخی گھل جاتی ہے ؎

اجنبی اتنی یہ دنیا کب تھی
آج ہر چہرہ نیا ہو جیسے

ہائے اس عہد بلا خیز کے انساں کا وجود
جیسے طوفان میں اڑتا ہوا تنکا یا پرے

کیا وقت آ پڑا ہے کہ اپنا وجود بھی،
خنجر کی طرح سر پہ لٹکتا دکھائی دے

ہر شخص پارہ پارہ ہے لمحوں کی ضرب سے
چہرہ دکھائی دے نہ سراپا دکھائی دے

شاید کہ رہ گئی نہ کوئی جائے عافیت
خوابوں کا ایک ایک جزیرہ اداس ہے

کوئی مکین نظر آیا نہ میزباں پایا
وہ میہماں ہوں کہ خالی ملا مکان مجھے

یہ اور اس قسم کے بہت سے دوسرے اشعار حرمت الاکرام کے دلی جذبات و احساسات کی غمازی کرتے ہیں۔

بات فن و ادب سے چل کر حالات حاضرہ کے تبصرے تک پہنچ گئی لیکن مجموعی طور پر آج حالات نے زندگی کے ہر شعبہ کو جس قدر متاثر کیا ہے اس سے کوئی ذہن بچ ہی نہیں سکتا ہے۔ موجودہ زندگی کے

ایسے مسائل نے ہر حساس ذہن کو جو ایک مستقل کرب و انتشار بخشا ہے اس کا تسلسل ترجمہ وادب میں اتر آیا ہے اور اثر سے بھی کیوں نہیں؟ شاعر یا ادیب بھی سماج کا ایک انگ ایک اکائی ہے ایک ایسا انگ جو بہت زیادہ حساس ہوتا ہے ایک ایسی اکائی جس کی نگاہ ذروں سے کائنات تک پر ہے جس کے کان پر آہٹ پر لگے ہیں۔ اسی لیے ادیب زندگی کی ہر آن بدلتی تصویروں پر نظریں جماتا ہے۔ ان سے اثر قبول کرتا ہے اور پھر ان تاثرات کو اپنے تعلق خاطر سے الفاظ کا جامہ پہنا کر سماج کے سامنے پیش کر دیتا ہے سلام سندیلوی کے الفاظ میں۔

"دراصل ادب وہی ہے جس میں عوام کی زندگی
کے تجربات اور ان کے احساسات کا تجزیہ ہو۔ عام طور پر
ادب وہی کہا جا سکتا ہے جس میں انسان کے دل کی دھڑکن
بندیوں جس کے ماحول میں ایک چلتا پھرتا جیتا انسان نظر
آئے اور جس کی فضا میں انسان کے قہقہے اور اس کی
سسکیاں دونوں سنائی دیں، مختصر یہ کہ ادب کو زندگی
کا آئینہ دار ہونا چاہیے" [1]

درحقیقت ادب کچھ اور نہیں زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ حیات کے تمام تر مسائل کا احاطہ کرتا ہے اور تجربات و مشاہدات عمل اور رد عمل کے زینوں سے آگے بڑھتا ہے آج کے حالات یا اس مشینی دور کے پیدا شدہ مسائل ہی کچھ ایسے پیچیدہ ہیں اور زندگی کچھ ایسی پیچیدگیوں میں الجھتی جا رہی ہے کہ فن کار کو ہر سمت ایک عجیب سا سماں نظر آتا ہے۔ شاعر زندگی کا نبض شناس ہے، وہ برابر زلف ہستی سنوارنے کی سعی کرتا رہا ہے وہ کبھی اپنی کوشش سے مایوس نہیں لیکن لگاتار کوششوں کے باوجود بھی زلف نکھرنے اور سنورنے کے بجائے الجھتی جاتی ہے تو وہ افسردہ و کبیدہ خاطر ہو جاتا ہے پھر بھی "یاس" کی فضاؤں میں "آس" کا سفر جاری ہے۔ غموں کے درمیان گزار کر خوشیوں کے لیے جد و جہد بھی فن کار کا اہم فریضہ ہے اور محترمہ کرام اپنی شاعری میں اس فریضے سے بجدہ برآ ہوئے ہیں۔

آدمی اپنی دنیا کا مختار ہے
آدمی اپنے فردا کا معمار ہے
آدمی خود نگر آدمی دیدہ ور
رقص کر زندگی، زندگی رقص کر

(اجنبی وادیوں میں)

عظیم شاعرو، دانشورو، قلمکارو
قلم اٹھاؤ کہ یہ وقت آزمائش ہے
دیے جلاؤ کہ یہ وقت آزمائش ہے
ہمک کے بڑھتی ہوئی ظلمتوں کو للکارو
قلم سے جرأت پیکار بھی لرزتی ہے
قلم کی ضرب سے تلوار بھی لرزتی ہے

(محاذ فن کی طرف)

سوال یہ نہیں کہ ہم نے ترقی نہیں کی، یقینی طور پر ہماری تعمیر و ترقی کا کارواں تیزی سے رواں دواں ہے سوال یہ ہے کہ ہماری ترقی کی راہیں کیسی ہیں، ہم کس طرف بڑھ رہے ہیں؟ خوشحالی کی جانب یا پامالی کی طرف؟؟ ہماری منزل کون سی ہے موت کی جانب یا حیات کی سمت؟؟ بلاشبہ ہمارے قدم چاند کی دنیا تک پہنچے لیکن چاند کی بلندیوں کو چھو لینے کے بعد بھی ہمیں مسرت و خوشحالی نہیں مل سکی ہماری الجھنوں اور پریشانیوں میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ ہمارا ذہنی کرب و انتشار ہمہ وقت بڑھتا جا رہا ہے۔ ہر لمحہ ہمیں جنگ کے خوف نے گھیر رکھا ہے اور ہر دن قتل و خون و غارت گری کی آہٹیں بڑھتی جا رہی ہیں، ان حالات میں ہمیں چاند ستاروں سے زیادہ امن و آشتی کا سفر درکار ہے۔ زندگی کس قدر سخت مراحل میں پھنسی ہے اس کا بیان مشکل ہے ؎

ذائقہ کون بتائے اس کا
وقت ہیرے کی کنی ہو جیسے

کیا چاند تک پہنچانے والی عظیم ٹیکنالوجی انسان کے گندے، گھناؤنے اور ناپاک جذبات کو طہارت، پاکیزگی اور رفعت و بلندی عطا کر سکتی ہے؟ مادیت کا بھیانک عفریت، جو حیات کی مسرتوں کو تاراج کرتا جا رہا ہے، نفرت و بیگانگی، جو خلوص و محبت کے لیے سم قاتل

---

[1] ادب کا تنقیدی مطالعہ۔ سلام سندیلوی صفحہ ۱۳

بن رہی ہے، خود غرضی اور مطلب پرستی جو معاشرہ کی ہم آہنگی کو درہم برہم کر رہی ہے۔ کیا ایسی تجربات کے پاس ان کا علاج ہے؟ یہ سوال وقت کے ہر فنکار کا ہے اور یہ اس وقت تک برابر دہرایا جاتا رہے گا جب تک اس کی روح پیاسی رہے گی اس کے خواب ادھورے رہیں گے ؎

کوئی موسم کوئی عالم ہو مجھے جلنا ہے
یہ نہ پوچھو کہ مرا آگ سے رشتہ کیا ہے

شاعر دل میں ارمانوں کا ہجوم لیے، خود کو اپنی "فکر" کے خلوتوں کا محرم تصور کرتا ہے۔

کسی دور کے گاؤں میں
چل کے رہنے کو جی چاہتا ہے
یہ بیمار صناعیوں کا خرابہ
گرجتی مشینوں کا صحرا
خنا زارِ حشر و نوا ہے

کھٹکتی ہے اک پھانس سی دل میں اکثر کہ مجرم ہوں میں فکر کی خلوتوں کا

اور حالات کو سازگار بنانے کے لیے زندگی نئے تیشہ زن اور نئے کوہکن چاہتی ہے۔

تھکے تھکے سے ہیں روح کے آئینے
دوش پر اپنی زلفیں پریشاں کیے
زندگی آتی ہے کچھ تقاضے لیے

.. ..

زندگی اپنے جلوؤں کی جھلمل لیے
زندگی اپنے کرنوں کا محمل لیے
ڈھونڈھتی ہے کسی دل کے بیدار کو
وقت کا ہر تقاضا ہے اک بے ستوں
کتنا سنگیں ہے خسروی کا فسوں!

زندگی کو بھی اک کوہکن چاہیے
زندگی کو بھی اک تیشہ زن چاہیے

دوستو شہر خوباں سے واپس چلو
دوستو شہر خوباں سے واپس چلو
ہیر کے واسطے، سوہنی کے لئے
زندگی کے لیے آدمی کے لئے

آل احمد سرور نے نئی زندگی کے مسائل اور شاعر کی ذمہ داری کے سلسلے میں لکھا ہے۔

"..... فضا کے طویل و عریض صحرا میں ہماری زمین ایک ذرہ ہے اور اس ذرے میں یہ انسان ایک طرف لا انتہا طاقتوں کا مالک اور دوسری طرف اتنا عاجز ہے کہ ہر دور ایک نئی زنجیر ساتھ لاتا ہے۔ مذہب، وطن، انسانیت، اخلاق کے کتنے ہی آدرش اپنی طرف بلاتے ہیں .. .. .. اگر ہماری شاعری ان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی تو وہ اپنے فرض سے قاصر رہے گی شاعری خوابوں کے کانٹوں پر تول کر انھیں پرکھتی ہے، وہ معنی خیز تجربات، گہری بصیرت، بلند تخیل سچے مثالی حوصلے سے کام لے کر انسانیت اور اس کے ابدی حسن کا احساس دلاتی ہے وہ اپنے سماج کی ہر تبدیلی کا عکس بھی پیش کرتی ہے اور اپنے خوابوں کی آنچ سے اس کی برت کو پگھلاتی ہے"

حرمت الاکرام کی شاعری بھی معاشرہ کی پراگندگیوں اور ان سے پیدا شدہ مسائل کا حل چاہتی ہے اپنے غموں کا مداوا تلاش کرتی ہے اور زندگی کے چہرے پر تبسم تابانی دیکھنے کی متمنی ہے ؎

زندگی! تیرے فقط ایک تبسم کے لیے
ہم فقیروں نے لٹائے دل و لیلیان کیا کیا

★

ڈاکٹر کیف رضوی
لکچرر۔ ڈی۔ اے۔ وی کالج
لکھنؤ

شراب

شراب نے تو ہزاروں کے گھر بگاڑے ہیں
اسی نے لوٹا ہے کتنی سہاگنوں کا سہاگ
وصال کے لیے حیلہ تراشش سے کوئی
یہ دیکھنے میں حسیں ہے مگر ہے اصل میں آگ
دماغ و دل میں کدورت کا رنگ بھرتی ہے

شراب زہر کا اک خوبرو سے سانچے میں
یہ قتل کرتی ہے انساں کو خواب دکھلا کر
کہیں شراب سے کچھ غم غلط نہیں ہوتے
تمام عمر یہ رکھتی ہے دل کو بہلا کر
اسے جو کرنا ہے لمحوں میں کر گزرتی ہے

شراب تو کسی پیکر میں ڈھل کے آتی ہے
پھر اس کے بعد یہ شفاف و صاف سے پیکر
نہ جانے کتنے دلوں کو اداس کرتے ہیں
کسی طرح نہیں ملتی ہے رنج و غم سے مفر
اسی بہانے سے پھر زندگی بکھرتی ہے

شراب سے تو اک انساں بنا ہے افسانہ
حقیقتوں کو پرکھنے سے باز رہتا ہے
سلگتے لمحوں کے عیش و نشاط کی خاطر
تمام عمر مصائب وہ دل پہ سہتا ہے
ہر ایک خواہش دل اس کی روز مرتی ہے

حسین شیشوں میں رکھی حسین رنگ شراب
فریب دل ہے فریب نظر فریب دماغ
کسی بھی گوشے سے لاتی نہیں ہے رنگ حیات
یہ شمع موت کی ہے اور موت ہی کا ایاغ
یہ زندگی کے عوض موت پیش کرتی ہے

انور سلونوی
سلون۔ رائے بریلی

جہیز

جہیز لفظ ہے شاستروں میں بھی نام اس کا
مگر نہیں ہے تواریخ میں مقام اس کا
جہیز کیا ہے کہاں کب ہوا رواج اس کا
جواب مجھ کو بتائے ذرا سماج اس کا
جہیز کا کسی مذہب میں کچھ مقام نہ تھا
کسی سماج میں کچھ اس کا اہتمام نہ تھا
کبھی تو کچھ بھی نہ تھی تاجدار بطحیٰ کو
جہیز کتنا دیا تھا جناب زہرا کو
مگر زمانہ میں اک ایسا انقلاب آیا
قبیح رسموں کا دنیا پہ پڑ گیا سایا
جہیز اپنی ہی پستی کی اک نشانی ہے
یہ ہر سماج کی اک دکھ بھری کہانی ہے
تلک کے نام پہ رائج جو سودے بازی ہے
اسی سماج کا اک جرم اجتماعی ہے
اسی جہیز نے بجھائے گھر غریبوں کے
اسی نے کھیت بھی چھنوائے کم نصیبوں کے
ستم کا اس کے جو انداز ہے نرالا ہے
کسی کو جیتے جی دوزخ میں اس نے ڈالا ہے
کسی سے چھین لیا لطف زندگی اس نے
کسی کو کر دیا مجبور خودکشی اس نے
مظاہرہ جہاں مقصود ہو امارت کا
وہاں یہ رسم بھی غمزہ ہے ایک دولت کا
اسی جہیز کی خاطر وہ وقت بھی آئے
کہ باپ بیٹی کے مرجانے کی دعا مانگے
ہمارا فرض ہے انور رواج کو بدلیں
ہم اپنے آپ کو بدلیں سماج کو بدلیں

[illegible]
[illegible]

مرزا رسوا کا منظوم ڈرامہ : مرقعِ لیلیٰ مجنوں

ایک تنقیدی جائزہ

ڈرامہ حقیقتاً تمثیل نگاری کا اصطلاحی نام ہے۔ ڈرامہ کے مختلف حصوں کو اصطلاحاً "ایکٹ" کہتے ہیں اور یہ لفظ ایکٹ اس بات کی دلیل ہے کہ ڈرامہ عمل جاننا ہے۔ ڈرامے میں حقیقت کی نقلی تمثیل نگاری بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ دراصل ڈرامے کا مقصد یہی ہے کہ جیتی جاگتی زندگی کی ایک ایسی نقل پیش کی جائے جس پر حقیقی زندگی کا دھوکا ہونے لگے دیکھنے والے ان تمثیلی کرداروں کو حقیقی اور پیش ہونے والے حادثات و واقعات کو حقیقت سمجھنے لگیں۔

ڈرامے کے برعکس دیگر اصنافِ ادب جن میں مسلسل کوئی کہانی بیان کی گئی ہو جیسے داستان، افسانے، ناول اور مثنوی اس پابندی سے آزاد ہیں۔ ان کے کرداروں کے لیے عمل یا نقلِ عمل کی کوئی شرط نہیں ہے بلکہ ان کی کہانیاں صرف بیانیہ بھی ہو سکتی ہیں۔

مرزا ہادی رسوا کا "مرقعِ لیلےٰ مجنوں" ایک منظوم ڈرامہ ہے۔ ایک ڈرامے کی حیثیت سے اس پر وہ تمام پابندیاں لازم آتی ہیں جو عام طور سے ڈراموں کے لیے مخصوص ہیں جیسے تمثیل نگاری، نقلِ عمل، اسٹیج وغیرہ مرزا ہادی رسوا کو انگریزی اور یونانی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا چنانچہ انہوں نے ان دونوں زبانوں سے استفادہ کرتے ہوئے فنِ ڈرامہ کے تمام تر اصولوں کو برتنے کی کوشش کی ہے۔ مغربی انداز پر اس کو سین اور ایکٹوں میں تقسیم کیا ہے لیکن "امراؤ جان" "ذاتِ شریف" جیسے مقصدی ناولوں کے خالق ہادی رسوا نے اپنے منظوم ڈرامہ "مرقعِ لیلیٰ مجنوں" میں پلاٹ کی اہمیت پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ناول ہو افسانہ یا ڈرامہ سب کیلئے پلاٹ کی ضرورت ہے۔ پلاٹ ہی کسی کہانی کی خوبیوں کو اجاگر کرنے اور کہانی میں مقصدیت پیدا کرنے کا ضامن ہوتا ہے۔

کہانی کی کامیابی اور ناکامی میں بڑا حصہ اسکے پلاٹ کا ہوتا ہے کیونکہ پلاٹ کی تخلیق کہانی کے وجود میں آنے سے بہت پہلے ہوتی ہے۔ فنکار پہلے پلاٹ ترتیب دیتا ہے۔ اور پلاٹ ترتیب دیتے وقت ان تمام گوشوں پر نظر رکھتا ہے جن سے کہانی کو گزرنا ہوتا ہے۔

پلاٹ کی اچھائی برائی فنکار کی بالغ نظری اور کم سوادی سے تعلق رکھتی ہے۔ فنکار جتنا حساس اور نکتہ رس ہوگا پلاٹ کی ترتیب میں اتنی ہی کامیاب کاوش کرے گا اور اگر خود فنکار میں بلاغت نظر کی کمی یا فقدان ہو تو پلاٹ کا خدا ہی حافظ۔ بدقسمتی سے ہمارے ادب میں ایسے ڈراموں، افسانوں اور ناولوں کی بہتات ہے جن میں سنجیدگی سے پلاٹ کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی بلکہ چند رومانی کہانیوں کی کامیابی سے مرعوب ہو کر انہیں کہانیوں کی تقلید میں نئی کہانیوں کی تخلیق کرتے چلے گئے۔

رسوا نے بھی اپنے منظوم ڈرامہ "مرقع لیلیٰ مجنوں" میں پلاٹ کی اہمیت پر کوئی خاص توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور ایک ایسی کہانی کو جو بدقسمتی سے ایک حلقے میں تاریخی سمجھی جانے لگی ہے، منظوم ڈرامائی انداز میں منظم کر دیا ہے۔ جیسا کہ مرزا نے خود تحریر کیا ہے کہ "تھیٹروں میں اس قبیل کے ڈراموں کی مقبولیت نے ان کو "لیلیٰ مجنوں" کی طرف متوجہ کیا اور بعد دوستوں کے اصرار نے ان کی خلش فکر کو تیز تر بنا دیا"

یہ ہمارے ادب کی بدقسمتی ہے کہ ہمارے اکثر فنکاروں نے طبع زاد کہانیوں پر مروجہ قصوں کو ترجیح دی اور پھر مجبوراً انھیں ڈگروں پر چلنا پڑا جن پر پہلے ہی سے ان قصوں کی بنیاد رکھی گئی۔

مرزا نے بھی کسی طبع زاد پلاٹ کی تخلیق پر روایتی کہانی لیلیٰ مجنوں کو ترجیح دی اور تھیٹروں میں تڑپا دینے والے اس ڈرامے کو انھوں نے منظوم مرقع بنا کر اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے نظم کا ایک اعلیٰ نمونہ تو بنا دیا مگر پلاٹ کے معیوب کو دور کرنا گویا ان کے بس سے باہر تھا یا روایت کی مجبوری تھی۔

کہانی کا پلاٹ صرف یہ ہے کہ قبیلہ عامر کے سردار عبداللہ کے یہاں منتوں مرادوں کے بعد ایک بچہ قیس پیدا ہوتا ہے۔ کاہن اس کے عاشقانہ مزاج اور اس کے جنون محبت اور انجام کی پیشین گوئی کرتا ہے۔ جب بچہ کچھ سمجھدار ہو جاتا ہے تو اسے مدرسہ میں داخل کر دیا جاتا ہے اور وہاں اپنی چچازاد بہن کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ اس عشق کی خبر لیلیٰ کی ماں کو ہوتی ہے۔ وہ لیلیٰ کو مکتب جانے سے روک دیتی ہے۔ قیس لیلیٰ کو نہ پاکر ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے۔ استاد کی تنبیہہ پر مکتب ہی نہیں گھر چھوڑ کر نکل جاتا ہے۔ باپ تلاش کرکے لاتا ہے۔ بھائی کو اپنے بیٹے کا پیغام دیتا ہے جو نامنظور ہو جاتا ہے۔ قیس یعنی مجنوں جنگل میں بھاگ جاتا ہے، محبت کا اثر رائیگاں نہیں ہوتا۔ ایک دن ساری نگہبانیوں کے باوجود لیلیٰ اپنے محبوب تک پہنچ جاتی ہے۔ دو محبت کرنے والے ملتے ہیں دنیا پھر حائل ہوتی ہے۔ لیلیٰ جدا کر لی جاتی ہے اور اس غم میں دیوانگی کے عالم میں مر جاتی ہے۔ مجنوں کو خبر ہوتی ہے وہ بھی اپنی لیلیٰ کی قبر پر پہنچ کر اپنی جان دے دیتا ہے اور کہانی ختم ہو جاتی ہے۔

پلاٹ کوئی برا نہیں ہے مگر مشکل یہ ہے کہ اسے کسی طرح بھی حقیقت سے ہمکنار نہیں کیا جا سکتا۔ لیلیٰ قیس کی حقیقی چچازاد بہن تھی یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ مکتب سے پہلے کبھی انہوں نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا ہو۔ پھر مکتب کی عمر بھی زیادہ طویل نہیں ہو سکتی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکتب محبت کدہ تھا جہاں ایک طرف قیس و لیلیٰ عشق کے پینگ بڑھا رہے تھے، دوسری جانب نیلا اور طرار محبت کی سودے بازی کر رہے تھے اگرچہ ڈرامے میں سن و سال کا ذکر نہیں ہے لیکن جو مکالمے ہیں ان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ سن بالکل معصومیت کا نہیں ہے۔ لیلیٰ قیس کو مکتب میں دیکھ کر کہتی ہے ؎

مدت میں یہ ہم چشم ہمارا نظر آیا
دل ڈھونڈتا تھا جسکو وہ پیارا نظر آیا

اور دوسری ملاقات میں قیس صاحب فرماتے ہیں ؎

اللہ نے پھر آج وہی شکل دکھائی
پھر ہم کو وہی چاند سی صورت نظر آئی

مذکورہ خیالات اس کا واضح ثبوت ہیں کہ دونوں عمر کی قابل لحاظ منزل میں داخل ہو چکے تھے اسکے باوجود ایک ایسے مکتب میں پڑھ رہے تھے جو اس عہد کے اعتبار سے ناقابل یقین ہے یعنی مخلوط تعلیمی نظام۔

ایک مکتب میں پڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ قیس اور لیلیٰ کے گھر اسی علاقہ میں تھے قبیلہ کا صرف ایک ہی سردار ہوتا ہے۔ بنی عامر کا سردار عبداللہ تھا۔ اب یہ نہیں چلتا کہ عبدالعزیز لیلیٰ کا باپ کس قبیلے کا سردار تھا۔ بادشاہ نوفل جب مجنوں کی ہمدردی میں عبدالعزیز کو پیغام جنگ دیتا ہے تو عبدالعزیز کی شخصیت سردار قبیلہ کی حیثیت سے سامنے آتی ہے اور عبداللہ کا کوئی ذکر نہیں آتا۔ پتہ نہیں عبداللہ کو سرداری سے معزول کر دیا گیا تھا یا کوئی دوسرا قبیلہ تھا۔ کہانی جو تاثر دیتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لیلیٰ کا باپ سردار نجد ہے مگر مجنوں کے رہائشی علاقے کا نام نہیں ملتا تاہم لیلیٰ اس مکتب میں پڑھتی ہے جہاں قیس ہے اور جب قیس گھر سے بھاگتا ہے تو سیدھا نجد کے جنگلوں میں پہنچتا ہے اور لیلیٰ بھی آنکھیں بند کرکے اسی صحرا میں پہنچ جاتی ہے جہاں مجنوں موجود ہے اور سارے تلاش کرنے والے آسانی سے صحرائے نجد میں نہ صرف پہنچتے ہیں بلکہ انہیں تلاش بھی کر لیتے ہیں۔ اسی طرح نجد کے صحرا میں پیرزن کا طرار کو لیکر گھومنا کیا معنی رکھتا ہے ایک پیرزن کے قبضہ میں ہوکر طرار جیسے قوی ہیکل جوان کا گلی گلی گھومنا بعید از قیاس ہے۔ کیا وہ بھیک خود نہیں مانگ سکتا تھا زبردستی کسی واقعہ کو جو خلاف معمول ہو شامل کرنا پلاٹ کی خامی ہے۔ صرف لیلیٰ کے گھر تک مجنوں کو لانے کے لیے یہ واقعہ شامل کیا گیا جس سے پلاٹ میں نقص پیدا ہو گیا۔

"مرقع لیلیٰ مجنوں" کے پلاٹ میں جذبات سے قطع نظر بے شمار جھول

ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ڈرامہ خالص تجارتی نقطہ نظر سے وجود میں لایا گیا ہے۔ اسکی ادبی حیثیت پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے مرزا صاحب نے بھی اسی روایت کو برقرار رکھا جو پہلے سے چلی آرہی تھی۔

عموماً مرکزی کردار ابتدا ہی سے نمایاں رہتا ہے لیکن کبھی کبھی پلاٹ کی پیچیدگی ذہنوں کو الجھا لیتی ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اس کہانی کا "محور" کون ہے۔ بعض کردار اس قدر متنوع اور ہمہ رنگ ہوتے ہیں کہ ان میں امتیاز کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ عقل کشمکش میں پڑ جاتی ہے کہ آخر کس کردار کو کس پر ترجیح دے اور کسے مرکزی کردار مانے یہی کشمکش اکثر معکوس صورت بھی اختیار کر لیتی ہے یعنی کردار اس قدر بے اثر ہوتے ہیں اور اس بے اثری میں مختلف کردار اس قدر خلط ملط ہو جاتے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک پر مرکزی کردار قرار دینے میں دشواری ہوتی ہے۔

"مرقع لیلےٰ مجنوں" بھی ایسے ہی ڈراموں کی صف میں شامل ہے جن میں مرکزی کردار کے لیے فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے۔ جہاں تک زہرہ، خیلا، خون خوار خاں اور طرار خاں کے کرداروں کا تعلق ہے اگر مرقع لیلےٰ مجنوں میں نہ ہوتے تو بھی ڈرامہ بنیادی طور پر متاثر نہ ہوتا۔ پورے ڈرامے میں صرف دو کردار نظر آتے ہیں جو کہانی کی رفتار کا دور تک ساتھ دیتے ہیں یعنی عبداللہ اور نوفل کے کردار۔ یہی دو کردار متحرک فطری اور فعال معلوم ہوتے ہیں اور انہیں میں مرکزیت تلاش کرنا پڑیگی۔

"مرقع لیلیٰ مجنوں" میں جو کردار سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ عبداللہ کا کردار ہے۔ یہ کردار ان تمام خوبیوں کا حامل نظر آتا ہے جو ایک مشفق باپ میں ہونی چاہیئے۔ بحیثیت ایک باپ کے وہ تمام نیک خواہشات اور آرزوئیں اپنے بیٹے قیس کے لیے رکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا قیس قومی روایات کا پیکر ہو تاکہ قبیلے میں اسے عزت اور سربلندی حاصل ہو۔ قیس کی ذات میں وہ اپنی خواہشات اور توقعات کو پورا ہوتا نہیں دیکھتا حالات پے در پے بد سے بدتر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ چاروں طرف سے مایوسیاں اور ناامیدیاں گھیر لیتی ہیں۔ لیکن مایوسیوں اور حالات کی تلخیوں کے سامنے وہ سپر انداز نہیں ہوتا بلکہ ڈرامے کے آغاز سے لیکر انجام تک قیس کی کامیابی اور کامرانی کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ دوسرا کردار نوفل کا ہے۔ نوفل کا کردار عرب کی روایتی شجاعت دلیری اور عدل گستری سے عبارت ہے۔ اس کردار میں بیحد جاہ و جلال ہے جس کے سامنے لیلیٰ اور مجنوں کا کردار بھی حتمی ذیلی حیثیت رکھتا ہے۔

بہر حال "مرقع لیلےٰ مجنوں" پر ایک ڈرامے کی صورت میں ان تمام پابندیوں کا اطلاق ہوتا ہے جو عام ڈراموں کے لیے لازمی قرار دی گئی ہیں چنانچہ مرقع نگار نے اپنے مرقع کو باغیانہ حیثیت اختیار نہیں کرنے دیا ہے بلکہ بڑی حد تک کوشش کی ہے کہ اصول تمثیل نگاری سے روگردانی نہ ہو مرزا صاحب نے "مرقع لیلیٰ مجنوں" کے لیے ایک پلاٹ بھی منتخب کیا ہے، تمثیل نگاروں کی بھی گنجائش رکھی ہے۔ کشمکش کے پہلو بھی اجاگر کیے ہیں مکالمے بھی حتی الوسع پر اثر اور دلکش انداز میں پیش کیے ہیں۔ حزنیہ اور طربیہ گوشوں پر بھی توجہ دی ہے منظر نگاری کو بھی یکسر نظر انداز نہیں کیا ہے۔

"مرقع لیلےٰ مجنوں" کا سب سے کمزور پہلو منظر نگاری ہے۔ یہ کہنا شرکی زیادتی ہوگی کہ پورے ڈرامے میں منظر نگاری کو عمداً نظر انداز کیا گیا ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ منظر نگاری پر پوری توجہ نہیں دی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ اس سلسلے میں اختصار کا پہلو زیادہ ملحوظ رکھا گیا ہو تاہم ایسا اختصار بھی کیا کہ تمثیل کو پوری طرح سمجھنے میں حارج ہو؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرقع نگار کوئی داستان بیان کرتے ہوئے طول کلام کی زحمت سے بچنے کے لیے اپنے خیال میں غیر ضروری اجزاء کو حذف کر دینا چاہتا ہے۔

کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ عبداللہ اپنے دیوان خانے میں اولاد کے لیے دعا مانگتے ہیں۔ دعا کے الفاظ مرقع میں درج نہیں ہیں، پھر وہ باغ میں نظر آتے ہیں گویا دعا کی قبولیت سے مطمئن ہیں ملازم آکر ولادت کی خبر دیتے ہیں۔ کاہن آتا ہے پیش گوئی کرتا ہے اور پھر مکتب تک کے سارے مراحل سرسری طور پر طے ہو جاتے ہیں اور ان مراحل کیلئے قاری کو اپنے ذہن اور قوت متخیلہ کی مدد سے مناظر خود وضع کرنا پڑتے ہیں صاحب مرقع منظر کشی کو غالباً غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

قیس مکتب سے صحرا میں پہنچ جاتا ہے لیکن قاری نہ صحرا کی ہیبت سے واقف ہوتا ہے۔ نہ قیس کی ہیبت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے میں صرف یہی ایک صحرا تھا اور اس قدر سہل الحصول کہ جب جس کا

جی چاہے وہاں پہنچ جائے۔ مجنوں کو تلاش کرتے ہوئے عبداللہ اسی جنگل میں پہنچتے ہیں۔ لیلیٰ جب گھر کے زنداں خانے سے گھبرا جاتی ہے تو سیدھی صحرا میں، مجنوں کے پاس پہنچ جاتی ہے اور لیلیٰ کی والدہ محترمہ بھی ٹھیک اسی مقام پر پہنچتی ہیں اور پھر بادشاہ نوفل کو بھی اسی صحرا سے گذرنا ہوتا ہے۔

ان سارے واقعات میں صحرا کا تصور ذہن میں نہیں پیدا ہوتا بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک غیر آباد راستہ ہے جہاں سے راہگیر برابر گزرتے رہتے ہیں کسی کی قیام گاہ نہیں ہے۔ البتہ نوفل کے دربار کی تھوڑی بہت منظر کشی کی گئی ہے۔ ایسے ہی اکا دکا مواقع اور ملتے ہیں جہاں منظر نگاری سے کام لیا گیا ہے۔

کسی بھی ناول افسانے یا ڈرامے کی اساس اسکا پلاٹ ہوتا ہے کیونکہ پلاٹ ہی فنکار کی رہنمائی کرتا ہے اگرچہ یہ پلاٹ خود فنکار ہی کا خلق کردہ یا منتخب کردہ ہوتا ہے تاہم فن پاروں کی تکمیل اور ان کو مقصدی بنانے میں پلاٹ کا بڑا دخل ہوتا ہے اور پلاٹ کا نقص پوری فنی کاوشوں کو بے مقصد اور ناقص بنا کر رکھ دیتا ہے تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تنہا "پلاٹ" چاہے وہ کتنا ہی مکمل اور کتنا ہی مقصد ہی کیوں نہ ہو کسی کاوش کو بھرپور تاثر نہیں دے سکتا بلکہ اس کے لیے دوسرے اجزا کی بھی کم و بیش اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی خود پلاٹ کی۔

ڈرامہ کے اجزا میں مکالمہ کا درجہ بہت بلند ہے کیونکہ پورے ڈرامے میں مکالمے ہی فنکار کے فن کی بلندی تک پہنچنے میں ناظرین یا تماشائی کی مدد کرتے ہیں۔ مکالمے اگر فنکاری کا اعلیٰ نمونہ نہ ہوں تو اکثر دوسری کوتاہیوں کی طرف سے توجہ ہٹی رہتی ہے اور مکالموں کی کمزوری بعض اوقات پورے ڈرامے کو بے توجہی کا شکار بنا دیتی ہے۔

دوسرے ڈراموں کی طرح "مرقع لیلےٰ مجنوں" میں بھی مکالموں سے تعمیری کام لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مرزا صاحب نے بھرپور کوشش کی ہے کہ انکے کردار جو مکالمے ادا کریں ان میں وقار بھی ہو اور کشش بھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بڑی حد تک اس کوشش میں کامیاب بھی ہوئے ہیں مثلاً برخوردار قیس اس قابل ہوئے ہیں کہ انہیں مکتب نشینی کا شرف حاصل ہو باپ رسم مکتب کے وقت بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تمہارا مکتب شروع ہو رہا ہے اب تم کو لازم ہے کہ علم ادب جی لگا کر سیکھو اس لیے سیکھو کہ اسی ادب سے قوم عرب نامور ہے ؎

یہ ادب کیا ہے شرافت کی علامت اے قیس
کہ ادب ہی سے تو ممتاز ہوئی قوم عرب

اور پھر قیس جواب دیتا ہے ؎

مجھ کو کیا عذر ہے اے قبلہ و کعبہ اس میں
یہ تو ہے عین مراد اور یہ عین مطلب

خوں خوار خاں اپنے لڑکے طرار کو لیکر مولوی صاحب کی خدمت میں آتا ہے اور خونخوار کو خود اسکا اعتراف ہے کہ لڑکا بے حد نالائق ہے تاہم محبت پدری چاہتی ہے کہ یہ نالائق کسی لائق بن جائے پہلے وہ لڑکے کی نالائقی کا اظہار کرتا ہے ؎

یہ لڑکا ہے میرا بڑا بے شعور

اسے اس بات کا بھی احساس ہے کہ یہ شوق سے نہیں پڑھ سکیگا۔ ہاں اگر استاد مشفق ہو تو ممکن ہے چنانچہ التجا کرتا ہے ؎

اسے گھول کر سب پلا دیجئے
گدھا ہے یہ، انساں بنا دیجئے

اور پھر کہتا ہے کہ ع شرارت کرے تو سزا دیجئے ..... مولوی صاحب اس شرط پر راضی ہوتے ہیں ؎

اگر یہ شرارت کرے گا یہاں
میں توڑونگا خوب اسکی سب پسلیاں

طرار مولوی صاحب کا عزم جنگ دیکھ کر دعا کرتا ہے ؎

یہ مولوی نابکار
چھڑا اسکے پنجے سے پروردگار

ان تمام مواقع پر مرزا صاحب نے اتنی خوبی سے مکالمے نظم کیے ہیں کہ بے تکلف اور بے ساختہ گفتگو کا لطف آجاتا ہے۔ مکتب میں صرف قیس و لیلےٰ رہ جاتے ہیں۔ لیلےٰ اپنا سبق یاد کرتی ہے ؎

الف اللہ کی نشانی ہے بندگی اس کی بے سے جانی ہے

قیس جسے اس الف بے سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی لیلیٰ سے مخاطب ہوتا ہے ؎

کتاب دیکھ چکیں؟ اب ذرا ادھر دیکھو
حجاب دے جو اجازت تو اک نظر دیکھو

لیلیٰ جواب میں کہتی ہے ؎

نہ ایسی باتیں زباں پہ پھر آنے پائیں کبھی
خدا کے واسطے صاحب ذرا ادھر دیکھیں

اور خیلا جو چھپ کر دونوں کی گفتگو سن رہی تھی سامنے آ کر کہتی ہے ؎

یہ کیسی باتیں ہیں صاحب ذرا ادھر دیکھو
تمام شہر میں کر دوں گی میں خبر دیکھو

ان تمام خوبیوں کے باوجود اکثر و بیشتر مقامات پر مکالموں کو داستان گوئی کا شرف بخش دیا گیا ہے۔ پوری پوری غزلیں مکالموں کے طور پر ادا ہوئی ہیں۔ ایک موقع پر طرار اور تونخوار کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہے بے حد دراز کار ہے۔ باپ بیٹوں میں وہ چاہے کتنے ہی گرے ہوئے کیوں نہ ہوں اس قسم کا انداز تخاطب ممکن نہیں۔ تکرار کے بعد تو زباں درازی کا امکان ہے مگر اپنی داستان عشق دہراتے ہوئے طرار سے مسلسل "ابے بادا" ابے بادا" کہلوانا کچھ جچا نہیں۔

مرزا صاحب نے لیلیٰ اور مادر لیلیٰ کی گفتگو جن مختصر فقروں میں ادا کی ہے وہ کافی دلچسپ اور موثر ہے۔ جب لیلیٰ کو صحرائے نجد سے بے ہوشی کے عالم میں اسکی ماں لے آتی ہے لیلیٰ کو ہوش آتا ہے خود کو اپنے گھر میں دیکھ کر خود کلامی کے انداز میں پوچھتی ہے ؎

"کون لایا مجھے؟" ——— ماں کہتی ہے۔ "یہ ہے میری خطا"
"کیوں ستایا مجھے؟" ——— " چپ ہو او بے حیا

مرزا صاحب نے مکالمہ نگاری کے لوازمات کی تکمیل کے سلسلے میں بڑی پابندی سے کام لیا ہے۔ ردیف اور قافیوں کی پابندی اور وہ بھی مسلسل غزلوں کی صورت میں۔ اس پابندی نے اکثر و بیشتر مکالموں کو بوجھل اور بے اثر بنا دیا ہے اگر وہ مکالمہ نگاری کے موقع پر نظم معریٰ یا زیادہ سے زیادہ مثنوی کا انداز اختیار کرتے تو شاید وہ اور زیادہ کامیاب ہوتے مگر افسوس کہ وہ ردیف اور قافیوں کی پابندی میں ضرورت سے زیادہ الجھ گئے تاہم ان تمام فرد گذاشتوں اور دشواریوں کے باوجود مرزا صاحب نے اصول مکالمہ نگاری کو مجروح ہونے سے حتی الامکان بچایا ہے اور بڑی حد تک کامیاب مکالمہ نگاری کی ہے۔ سسپنس کسی بھی ڈرامے کا جزو اعظم ہوتا ہے اور ڈرامہ نگار جس قدر مشاقی اور چابکدستی کا اظہار تجسس کو موثر بنانے میں صرف کرتا ہے اسی قدر ڈرامہ کامیاب اور دلکش ہوتا ہے۔ حقیقی زندگی میں بھی سسپنس اقدار حیات کو متنوع بنانے میں نمایاں رول ادا کرتا ہے تاہم اکثر و بیشتر یہ تجسس ایک محدود سی فضا میں گھٹ کر رہ جاتا ہے اور کبھی کبھی اس کا دائرہ شخص واحد تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔

ڈرامہ نگار اس قید سے اصولاً آزاد ہوتا ہے کیوں کہ اس کے کردار حقیقی نہیں تمثیلی ہوتے ہیں اور تمثیلی کردار بھی اگر تکلفات سے کام لینے لگیں تو تمثیل کا مقصد ہی فوت ہو جائے کیونکہ تمثیل کا مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ زندگی کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے جو اکثر عام نظروں سے اوجھل رہتے ہیں یہی سبب ہے کہ ڈرامائی تجسس بیک وقت تمثیلی کرداروں اور تماشبینوں کے لیے یکساں طور پر جاذب توجہ ہوتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کرداروں سے زیادہ تماشائیوں کو ایک کشمکش میں مبتلا کر دیتا ہے۔

"مرقع لیلیٰ مجنوں" بھی اس پہلو سے بالکل عاری نہیں مرزا صاحب نے اپنے اس مرقع میں حتی الوسع تجسس کے پہلو بھی اجاگر کیے ہیں مگر کیونکہ ڈرامے کے پلاٹ اور ماحول کے اعتبار سے اتنی گنجائش ہی نہیں تھی کہ کوئی چونکا دینے والی بات پیش کی جاتی۔ تجسس کی ابتدا مکتب ہی سے ہوتی ہے مولوی صاحب کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر سارے بچے بھاگ جاتے ہیں قیس و لیلیٰ نہیں بھاگتے، خیلا چھپ کر انکی گفتگو سنتی ہے اور پھر انہیں افشائے راز کی دھمکی دیتی ہے۔ اس دھمکی کے بعد توقع تھی کہ کچھ عرصے یہ سلسلہ چلے گا مگر یہ توقع پوری نہیں ہوتی اور دوسرے ہی لمحے مادر لیلیٰ اس راز سے واقف ہو جاتی ہے اور لیلیٰ کا مکتب جانا بند ہو جاتا ہے دوسرے ہی دن قیس مکتب میں لیلیٰ کو نہیں پاتا، فکرمند ہوتا ہے اور پھر فوراً ہی مولوی صاحب کو سبب معلوم ہو جاتا ہے اور قیس میاں مکتب چھوڑ کر صحرانوردی اختیار کرتے ہیں۔

دوسرا موقع تجسس کا وہ ہے جب عبداللہ اپنے بیٹے قیس کو صحرائے نجد سے اس یقین دہانی کے ساتھ لاتا ہے کہ وہ لیلیٰ سے اسکی شادی کرا دیگا۔ وعدے کے مطابق وہ عبدالعزیز کے گھر جاتا ہے اور اپنے بیٹے سے لیلیٰ کی نسبت کا خواستگار ہوتا ہے۔ اب ذرا دیر کے لیے ذہن امید

دائیں: علاوہ اتر پردیش میں شری ہری بت
متحدہ ریاست کے وزیر مالیات شری
سی بی گپتا مرحوم کو خراج عقیدت
پیش کرتے ہوئے
شری گپتا کا انتقال
۲۳ جنوری ۱۹۸۰ء کو
لکھنؤ میں ہوا
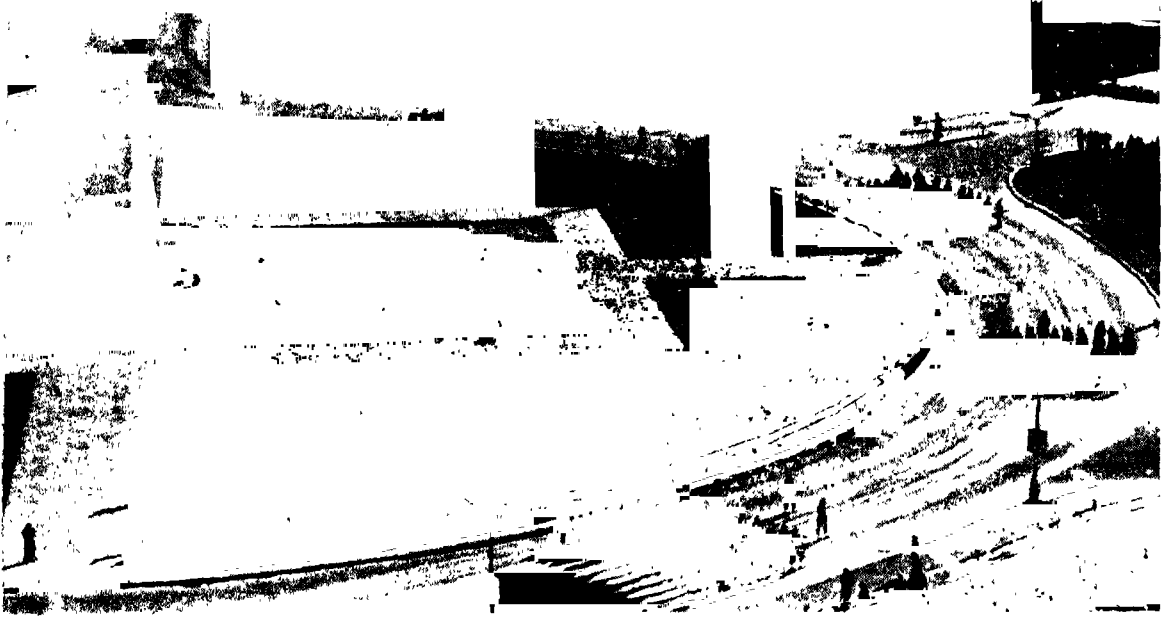
یوم جمہوریہ کے موقع پر ۲۶ جنوری ۲۰۰۴ کو نئی دہلی میں ہونے والی پریڈ
کا ایک منظر

اتر پردیش کے وزیر صنعت
شری ویر بہادر سنگھ ۱ جنوری
۲۰۰۴ کو لکھنؤ میں محکمہ صنعت
کی جانب سے منعقدہ ایک
جلسے میں صنعت کار خواتین
سے خطاب کرتے ہوئے۔

دیم کی کیفیت سے دو چار ہوتا ہے دیکھئے انجام کیا ہو تاہم یہ گوشہ بہت زیادہ فکر انگیز نہیں ہے۔ انجام جیسے پہلے ہی سے معلوم ہو' اور یہی ہوتا بھی ہے کہ عبدالعزیز قیس کے رشتے کو نامنظور کر دیتا ہے اور امید کا چراغ جو پہلے ہی سے دھندلاتا تھا' بجھ جاتا ہے۔

پورے ڈرامے میں تجسس کا اہم ترین موقع وہ ہے جب بادشاہ نوفل صحرائے نجد سے گزرتے ہوئے مجنوں کو دیکھتا ہے اور اسکی مشکل آسان کرنے کا وعدہ کر لیتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ نوفل کو خواہ مخواہ ڈرامہ کا جز بنایا گیا ہے اور اسے ضرورتاً صحرائے نجد میں گھیر کے لایا گیا بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ تجسس سب سے زیادہ اسی موقع پر جلوہ گر ہے۔ بادشاہ قیس کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور پھر عیش و عشرت میں اپنا وعدہ بھول جاتا ہے۔ قیس ایک موقع پر اسے یاد دلاتا ہے۔ نوفل عبدالعزیز کو طلب کر کے قیس کی شادی کا پیغام دیتا ہے اور عبدالعزیز حسب سابق رد کر دیتا ہے۔ بادشاہ فوج کشی کی دھمکی دیتا ہے اور اب ذہنوں میں امیدیں مچلنے لگتی ہیں کہ بادشاہ کی فوج کے مقابلے میں کونی قبیلہ کیا ٹھہرے گا؟ یقیناً قیس اور لیلےٰ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے مگر یہ بھی ممکن ہے کہ عبدالعزیز اپنی آن پر مر مٹے' یہ بھی ممکن ہے کہ لیلےٰ مجبوراً دیکھنے کے قابل ہی نہ رہے لیکن یہ تجسس اس وقت کافور ہو جاتا ہے جب وزیر نوفل بادشاہ کو جلد بازی کا شکار کہہ کر اسے فیصلہ بدلنے پر مجبور کرتا ہے تاہم ایک چراغ اور روشن ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ نوفل لیلےٰ کو دیکھ کر فیصلہ کرنا چاہتا ہے وہ فقیرانہ بھیس بدل کر نجد میں جاتا ہے۔ لیلےٰ کو دیکھتا ہے اور قیس کے عشق لیلےٰ کو اپنے معیار نظر کے اعتبار سے گویا بے وقعت سمجھتا ہے مجنوں کو لیلےٰ سے ترک تعلق کا مشورہ دیتا ہے۔ نوفل کی پیشکش کو قیس ٹھکرا دیتا ہے۔

خود لیلےٰ کی زندگی میں یہ کشمکش نسبتاً کم ہے یا ناقابل بیان سمجھی گئی ہے مجنوں کو اسیر پیر زن دیکھنا' دیوانگی کے عالم میں گھر چھوڑ کر قیس تک پہونچ جانا اور پھر دوبارہ گرفتار ہو کر بیمار ہونا اور جان دیدینا' ہر لمحہ ایک کشمکش تھی مگر سچی بات یہ ہے کہ مرزا صاحب نے کسی بھی موقع پر کشمکش کو اس طرح تیکھا روپ نہیں دیا کہ اس نے دور کو تڑپا دیا ہو یا نگاہ تجسس والہانہ انجام تک پہونچنے کے لیے مضطرب ہو رہی ہو۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرقع لیلےٰ مجنوں میں مرزا صاحب نے اس پہلو پر یا تو عمداً کم توجہ دی ہے یا پھر شعری مجبوری نے پوری طرح مافی الضمیر ادا کرنے سے باز رکھا ہو بہر حال یہ طے ہے کہ مرزا صاحب کشمکش نگاری میں ایک نکتہ رس فنکار کی طرح کامیاب نہیں رہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پسند کیے جانے والے منظوم ڈراموں میں امانت کی "اندر سبھا" کے بعد "مرقع لیلیٰ مجنوں" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ لیلےٰ مجنوں اپنی روایتی شہرت کے اعتبار سے عوام کی پسندیدہ کہانی رہی ہے اور عوام میں اس قدر رچ بس گئی ہے کہ اسے بھلانا مشکل ہے۔ قیس و لیلےٰ کی داستان محبت ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ مجنوں کا نام ارباب محبت کے لیے بطور نشان امتیاز استعمال ہونے لگا اور اس امتیازی خصوصیت نے ان افسانوی کرداروں کو حقیقی بنا دیا۔

مرزا محمد ہادی' جو مرزا رسوا کی حیثیت سے لافانی شہرت کے مالک ہیں انکے ہر دل عزیز ناول" امراؤ جان ادا" "ذات شریف" اور "شریف زادہ" وغیرہ شہرت کے آسمان تک پہونچ چکے ہیں خصوصاً "امراؤ جان ادا" جسے عوام کے ایک طبقے نے بڑی سنجیدگی سے حقیقی واقعہ سمجھا ہے اور اپنے خیال پر مصر بھی رہا ہے۔ اس شہرت کے باوجود ایسے لوگ کم ملیں گے جن کو یہ علم ہو کہ رسوا صرف نثر نگار ہی نہیں تھے بلکہ ایک خوش فکر شاعر بھی تھے اگرچہ رسوا نے ناولوں میں جابجا اپنے اشعار بھی نقل کیے ہیں۔

بہر نوع مرزا رسوا شعر بھی کہتے تھے اور شعری میدان میں تو وہ کو مرزا کہلوانا پسند کرتے تھے۔ تاہم شاعرانہ صلاحیتوں کے باوجود شاید ایک بڑا اردو داں حلقہ مرزا کی شاعرانہ شخصیت سے ناواقف رہتا اگر مرزا نے "لیلےٰ مجنوں" کو نظم کا جامہ نہ پہنایا ہوتا۔

مرقع "لیلیٰ مجنوں" کوئی ایسا پراثر شعری شاہکار نہیں ہے کہ "سنتے ہی دل میں اتر جائے" ممکن تھا کہ منظوم مرقع دلکش نظم کا اعلیٰ نمونہ بھی ہوتا مگر جیسا کہ مرزا نے دیباچہ میں تحریر کیا ہے کہ اپنے استاد کے حکم کی تعمیل میں اس نظم کو مختلف بحور واصناف کا مجموعہ بنا کر پیش کر رہا ہوں غالباً اسی التزام نے ڈرامے سے وہ سلاست اور روانی چھین لی جسکی اسے

ضرورت تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بسا اوقات کسی ایک بحر کی قید تخیل کی پرواز میں مانع اور حارج ہوتی ہے اور اس حرج کو دور کرنے کے لیے کسی دوسری بحر کا سہارا اگر لیا جائے تو غلط نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ اسکی کھلی اجازت ہونا چاہیئے اگرچہ ہمارے مثنوی گو شعرا نے ایک ہی بحر میں پوری پوری کہانیاں نظم کر کے راہ عمل واضح کر دی تاہم مثنوی گو شعرا کے گمان میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ کبھی ان کی کاوش کو تمثیل کا جامہ بھی پہنایا جا سکتا ہے لیکن ڈرامہ نویس کو ہر قدم پر اس بات کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ کہانی اسٹیج بھی کی جائیگی اور اس طرح اس پر زیادہ پابندی ہوتی ہے کہ وہ اپنے افکار کو عوام کے ذہنوں پر بارینے سے بچائے اس لیے اگر فنکار بجائے ایک بحر کے مختلف بحور کو آزمائے تو بیجا نہ ہوگا۔

مرزا صاحب نے اپنے مرقع کو بالقصد شعری شاہکار بنانے سے زیادہ فنی نمونہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ عمدًا انھوں نے سہل اور سقیم بحور کو استعمال کر کے مرقع کو مرقع سے زیادہ "عروض" کی کتاب بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جس وقت مرقع کی تصنیف ہوئی تھی اس وقت عوام میں فنکارانہ ادبی ذوق کافی تھا تاہم اس ذوق کی آزمائش یا نمائش کی جگہ ڈرامہ کا اسٹیج نہیں ہو سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے "مرقع لیلےٰ مجنوں" اسٹیج سے زیادہ کتابی شکل میں پیش کرنے پر زیادہ دھیان دیا ہے۔

مرزا صاحب نے واقعیؔ مختلف بحور اور متعدد صنعتیں استعمال کر کے مرقع کو ایک اچھا خاصا عروضی شاہکار بنا دیا ہے۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس عروض دانی نے اکثر مقامات پر قاری کو شکوک و شبہات میں ڈال دیا ہے۔ مثلاً مجنوں اپنے دل سے مخاطب ہے ؎

کوئی نہیں ہے دل کہ اس کوچے میں پہنچائے مجھے
کوئی اگر پہونچا بھی دے تو غیر اٹھوا دے مجھے

یا

اٹھ یا وہ سر پہ بار الم فلک بھی جسے اٹھا نہ سکے

؎ وہی اضطراب دل، وہی یا د زلف یار ہے
وہی پیچ و تاب ہے وہی اضطرار ہے

مذکورہ بالا اشعار پہلی نظر میں ناموزوں سے معلوم ہوتے ہیں اگرچہ یہ حقیقت نہیں ہے غالبًا اس کا سبب یہ ہے کہ مذکورہ بحور ہمارے طبائع سے تعلق نہیں رکھتے۔ تاہم جہاں جہاں مرزا نے مروجہ بحور استعمال کی ہیں وہاں فصاحت و دلکشی کے دریا بہا دیئے ہیں۔ مثلاً قیس اپنے والد کو اپنی حالت بتاتا ہے ؎

میں وہ بیمار ہوں جینے کی مرے آس نہیں،
جز غم و یاس کوئی آس پاس نہیں

یا عبداللہ اپنے بھائی کے سامنے قیس کی صفائی پیش کرتا ہے ؎

محبت بھی ہے کوئی تقصیر، بھائی
اگر ہے، تو کیا اس کی تعزیر؟ بھائی۔

مجنوں کا حال زار دیکھ کر راہگیر آپس میں گفتگو کرتے ہیں ؎

پہلا۔ کون ہے؟ یہ جواں زار و نزار
دوسرا۔ ہے یہ لیلےٰ کا عاشق بیمار

"مرقع لیلےٰ مجنوں" میں مرزا نے جس فنی چابکدستی کا مظاہرہ کیا ہے وہ ان لوگوں پر بار بھی ہو سکتا ہے۔ جنھیں فن شاعری سے دلچسپی نہ ہو اور صرف تمثیل کی حیثیت سے مرقع کو دیکھنا یا پڑھنا چاہتے ہوں لیکن وہ لوگ جو فن شاعری سے تعلق رکھتے ہیں اور فن کے خواستگار ہیں ان کے یہ موقع سامان تسکین ہے۔ مرزا نے پوری فنی مہارت کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس اعتبار سے "مرقع لیلےٰ مجنوں" کو کامیاب شعری شاہکار کہا جائے گا اور ادبی حلقوں میں اس کی ادبی حیثیت ہمیشہ مسلم رہے گی۔

کسی پورے ڈرامے میں اس تاثر اور ان کیفیات کا پایا جانا جو دل و دماغ کو اپنے حسن میں جذب کر کے محویت طاری کر دیں تقریبًا ممکن ہے اور ساز ادل تا آخر یکسوئی اور تعلق خاطر بھی تقریبًا دشوار ہے غالبًا یہی سبب ہے کہ تمام ڈراموں میں کم و بیش ایسے چند کرداروں کو بالالتزام جگہ دی جاتی ہے جو ہنسنے ہنسانے میں مدد دیکر دل و دماغ میں پھر سے تازگی پیدا کر دیں۔ تاہم ڈرامے کا وہ حصہ جسے عروج کہتے ہیں یہ

صلاحیت رکھتا ہے کہ ناظرین کو تھوڑی دیر کے لیے اس ہنگامہ خیز کائنات سے دور لے جا کر عالم خود فراموشی میں پہنچا دے۔

کامیاب ترین ڈرامہ وہ ہے جو اپنے عروج کے لمحات میں ناظرین کو اپنے ماحول میں اس طرح جذب کر سکے کہ وہ اپنے آپ کو اسی ڈرامے کا ایک حصہ سمجھنے لگیں۔ دوسرے ڈراموں کی طرح "مرقع لیلےٰ مجنوں" میں بھی اس نکتہ پر نظر رکھی گئی ہے اور شعری پابندیوں کی مجبوری کے باوجود صاحب مرقع نے وہ کتنا ہی لمحاتی کیوں نہ ہو مگر ایسا عالم پیدا کر دیا ہے کہ ہر قاری کا ذہن تھوڑی دیر رک کر یہ سوچنے لگتا ہے کہ دیکھیں اس کا انجام کیا ہو؟۔

لیلےٰ مجنوں کے عشق کی روایتی کہانی جب مکتب کی حدود میں داخل ہوتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب داستان کی ابتدا ہوئی جس انداز میں دونوں کی محبت پرورش پاتی ہے وہ بعد میں چاہے جس قدر عظیم ہو جائے مکتب کی گھٹی ہوئی فضا میں زیادہ سے زیادہ بچوں کی بے راہروی کہا جائے گا، کہانی بتدریج آگے بڑھتی ہے۔ اس بے راہروی کا علم بچوں سے بڑھ کر بوڑھوں تک پہنچتا ہے۔ مولوی صاحب کو خبر ہوتی ہے لیلےٰ کی ماں واقف ہو جاتی ہے اور نتیجہ میں دونوں مکتب سے جدا ہوتے ہیں۔ لیلےٰ گھر میں نظر بند ہوتی ہے مجنوں صحرائے نجد کا رخ کرتا ہے۔

داستان بام عروج پر اس وقت پہنچتی ہے جب لیلےٰ علم بغاوت بلند کرتی ہے۔ وہ قیس کے لیے بے قرار ہو کر گھر سے نکلنے پر تیار ہو جاتی ہے ؎

گھر سے نکل جاؤں میں قیس کو دیکھ آؤں میں
دل کو نہیں ہے قرار، آہ کوئی کیا کرے

لیلےٰ کی ماں بیٹی کی دیوانگی دیکھ کر مضطرب ہو جاتی ہے اور لیلےٰ کو پکڑ کر پوچھتی ہے ؎

کیا ہوا؟ لیلےٰ تجھے، کیا ہوا بیٹی تجھے
بکتی ہے کیوں بار بار آہ کوئی کیا کرے

عبدالعزیز یہ کیفیت دیکھ کر کہتا ہے کہ یہ دیوانی ہو گئی ہے اس کا علاج قید ہے۔ لیلےٰ زنجیروں میں جکڑ دی جاتی ہے اور پھر ایک دن زنداں بان غلطی سے در زنداں بند کیے بغیر سو جاتا ہے لیلےٰ کے لیے یہ مژدہ مسرت تھا وہ اسے اپنے جذب نہاں کا اثر سمجھتی ہے ؎

جذب دل کو بے اثر سمجھی تھی میں
آج رمز پرسش پنہاں کھلا
نالہ و فریاد کب تھی بے اثر
آج اعجاز دل نالاں کھلا

اور وہ گھر چھوڑ کر صحرا میں نکل جاتی ہے۔ محبت کی کشش اسے اپنے محبوب تک پہنچاتی ہے بچھڑے ہوئے دل ملتے ہیں اور کیف محبت میں گم ہو جاتے ہیں۔ اسی غفلت کے عالم میں مادر لیلےٰ، لیلےٰ کو گھر لے جاتی ہے۔ دونوں دیوانے پھر جدائی کی آگ میں سلگنے لگتے ہیں۔ مجنوں اس لمحاتی وصل کو خواب سمجھتا ہے۔ لیلےٰ جدائی کا یہ غم برداشت نہیں کر پاتی اور سفر آخرت اختیار کرتی ہے۔ مجنوں کو اپنی محبوبہ کی خبر وفات ملتی ہے دیوانہ وار اس کی قبر تک پہونچتا ہے اور خود بھی دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

لیلےٰ کی دیوانگی سے مرگ قیس تک کہانی کا عروج ہے۔ مرزا صاحب نے اپنے قلم کی پوری صلاحیت اس عروج کو کامیاب بنانے میں صرف کی ہے اگرچہ ہر گام پر شعری پابندی ان کی راہ میں حائل ہوئی تاہم انھوں نے یہ دشوار گذار راستہ بڑی حد تک کامیابی سے طے کیا نظم کی مجبوری کو اگر ذہن میں رکھا جائے تو ہر صاحب انصاف ادب دوست اور کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ "مرقع لیلےٰ مجنوں" میں عروج کی تعمیر کے سلسلے میں پوری فنکارانہ صلاحیتوں سے کام لیا گیا ہے اور فنکار کو اپنے مقصد میں نمایاں کامیابی ہوئی ہے۔

★

غزل

جنید حزیں لاری
معرفت جناب سرفراز احمد
پیپر مرچنٹ، دال منڈی
وارانسی

بڑے جتن سے جسے آنسوؤں نے پالا تھا
وہ زخم پھول کے مانند کھلنے والا تھا

قریب تھی کوئی منزل، نہ ہم سفر کوئی
ہجوم یاس میں کس نے مجھے سنبھالا تھا

جُھلس کے رہ نہ گیا ہو وہ ریگزاروں میں
کہ نرم خوابوں کی دنیا کا رہنے والا تھا

ملا تو جھک کے ملا ہم سے خاکساروں سے
وہ اپنے قد سے بھی کتنا بلند و بالا تھا

اب ایک گوشۂ تاریک ہے جہاں میں ہوں
مرے ورود سے پہلے یہاں اُجالا تھا

کتابِ زیست ہوئی جا رہی تھی بوسیدہ
ورق ورق اسے میں نے بھی دیکھ ڈالا تھا

حزیںؔ کہ شاعرِ گمنام تھا زمانے میں
ہر ایک بات ہر انداز میں نرالا تھا

ہو کے خاموش تو اب شعلوں پہ برفاب نہ رکھ
اے مرے دوست تجھے تشنۂ القاب نہ رکھ

میں پھر اک عمر بھٹکتا رہوں نوحہ بن کر
تارِ احساس پہ اس طرح سے مضراب نہ رکھ

جن کی آنکھوں میں نہ تشکیک نہ عکسِ حالات
اتنے معصوم بھی اس دور میں احباب نہ رکھ

تیری قسمت میں ازل سے رہی کرنوں کی قبا
شب گزیدہ ہوں مرے سامنے مہتاب نہ رکھ

اس سراسیمہ نگر سے کوئی بوسہ بھی چُرا
صرف کشکول میں زہراب ہی زہراب نہ رکھ

اپنی قسمت کی لکیروں کو بدلنے کے لیے
تو صحیفوں پہ نئے طور سے اعراب نہ رکھ

کیا خبر پھر انھیں راہوں سے گزر ہو تیرا
اپنی راہوں میں سلگتے ہوئے گرداب نہ رکھ

جس کے سائے میں کوئی پھول نہ کھلنے پائے
شجرِ یاس کو اس طرح بھی شاداب نہ رکھ

تجھ پہ لازم ہے ہر اک جسم کی تقدیس شمیمؔ
اپنی نظروں میں فقط منبر و محراب نہ رکھ

ندیم اشرف
سی ۵۰۰، سیکٹر اے جہانگر
لکھنؤ

یہ کون کہتا ہے تجھ سے غرورِ جاں مت رکھ
انا جو رکھی ہے تو سر کو درمیاں مت رکھ

یہ کون کاٹ رہا ہے درخت کو جڑ سے
یہ کون چیخ رہا ہے کوئی نشاں مت رکھ

مرد میں تھیں جنھیں تو دف سمجھتا تھا
یہ دھوپ تیرا مقدر ہے سائباں مت رکھ

جو ریت ہونا تھا تو برف ہو گئے ہوتے
کوئی بس اتنا ہی کہتا کہ سرگراں مت رکھ

اُسے تو نیزہ ہی کر سکتا ہے مزید بلند
یہ سرِ عظیم ہے اس کو یہاں وہاں مت رکھ

صباح الدین عمر
[illegible] روڈ، لکھنؤ

ہندستان میں قومی یکجہتی

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں

"جشن صلح کل" آگرہ منعقدہ اکتوبر ۱۹۸۰ کے موقع پر ہم نے صباح الدین عمر صاحب سے "ہندستان کی قومی یک جہتی" پر ایک خصوصی مضمون لکھنے کی درخواست کی تھی۔ انھوں نے ایک مضمون بہت کم وقت میں ہمیں عنایت کیا اور اصل مضمون نیز اس کا ہندی ترجمہ، محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش کی جانب سے تمام اردو۔ ہندی اخبارات کو بھیج دیا گیا۔ اتفاق سے اردو مضمون میں اُن کا نام لکھنے سے رہ گیا جب کہ ہندی میں اُن کا نام موجود تھا۔ یہ مضمون نیا دور میں اب تک شائع نہ ہو سکا تھا لیکن اس کی افادیت کے پیش نظر اب ہم اُسے اِس اشاعت میں شامل کر رہے ہیں۔ —— ایڈیٹر

دنیا کے تمام ملکوں میں یہ خصوصیت صرف ہندستان کو حاصل ہے کہ یہاں ایک سے زیادہ قومیں باہر سے آئیں اور ایک دوسرے سے گھل مل گئیں۔ صرف قومیں نہیں، مختلف مذہب یہاں باہر سے آئے اور پھلے پھولے۔ خود اس ملک میں کئی مذہبوں نے جنم لیا اور اس سرزمین کے رہنے والوں نے انھیں اپنا لیا۔ یہ آج سے نہیں، بہت پرانے زمانے سے ہوتا چلا آیا ہے۔ یہاں آریہ آئے۔ یہاں یونانی آئے۔ یہاں ہن آئے۔ یہاں عرب آئے۔ یہاں افغان آئے۔ یہاں ترک آئے۔ یہاں ایرانی آئے۔ جو یہاں آیا اور یہیں بس گیا۔ مادرِ ہند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور اسے ماں کا پیار دیا۔ اس ماں کو اس سے مطلب نہیں تھا کہ اس کے ان بچوں کا دھرم یا مذہب کیا ہے۔ وہ سناتن دھرم کو مانتا ہے یا بودھ مت کو۔ جین ہے یا سکھ۔ مسلمان ہے یا پارسی یا عیسائی۔ وہ صرف یہ جانتی تھی کہ یہ سب اس کے بچے ہیں۔ اور اس کے ان بچوں نے بھی ہمیشہ ہر مذہب کا احترام کیا۔ ہر مذہب کے بزرگوں کی عزت کی۔ ہر صاحب کمال اور گنی کے گن گائے گئے چاہے اس کا کوئی مذہب یا دھرم ہو۔ یا نہ ہو۔ یہاں آستک کا بھی سمّان کیا گیا اور ناستک کا بھی۔

ہندستان میں مسلمان پہلے تھوڑی تعداد میں آئے تھے۔ دھیرے دھیرے ان کی یہ تعداد بڑھتی گئی اور ہندو دھرم کے ماننے والوں کے بعد ملک میں ان کی آبادی دوسرے مذہب والوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہو گئی۔ ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں اور ملک کی اکثریت یعنی ہندوؤں میں میل جول بھی بڑھتا رہا۔ ویسے تو محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے سے پہلے، جب مسلمان تاجر عرب سے جنوبی ہندستان تجارت کی غرض سے آنے لگے تھے تبھی سے ہندوؤں نے ان کے ساتھ بھائی چارے کا برتاؤ شروع کر دیا تھا لیکن جب مسلمان ملک کے مختلف حصّوں میں باقاعدہ آباد ہو گئے تو اس بھائی چارے میں اور اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے سے اتنا قریب ہو گئے کہ زندگی کے ہر شعبے میں ایک نے دوسرے کا اثر قبول کرنا شروع کر دیا۔ پیدا ہونے سے مرنے تک کے اکثر رسم و رواج مشترک ہو گئے۔ چھٹی۔ سوہر کے گیت (پیدائش کے وقت) مانجھا، ابٹنا، جوتھی، بھالا (شادی کے وقت)، تیجا۔ دسواں، چالیسواں، برسی (مرنے کے بعد)

بہت سے تیوہار بھی مشترک تیوہار بن گئے۔ ہندوؤں کے تیوہاروں میں مسلمان نہ صرف شریک ہونے لگے بلکہ مسلمان شاعر ان کی اور ہندو بزرگوں کی تعریف میں نظمیں کہنے لگے جن کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ دوسری طرف ہندو شاعروں نے مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں کی تعریف میں ایسی نظمیں کہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا یہ اشعار کسی مسلمان کے نہیں ہیں۔ عام شاعر ہی نہیں اگر کوئی مسلمان بادشاہ شاعر بھی ہوا تو اس نے بھی ان تیوہاروں پر نظمیں کہیں۔ اب سے لگ بھگ چار سو برس پہلے بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد۔ قطب شاہی سلطنت کے بادشاہ محمد قلی قطب شاہ نے جو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر گذرا ہے، بسنت۔ ہولی، دیوالی وغیرہ پر کئی کئی نظمیں کہیں۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی نظمیں الگ ہیں۔ مغل شہنشاہ ہمایوں، اپنی راکھی بند بہن کو گجرات کے مسلمان بادشاہ کے حملے سے بچانے کے لیے شیر شاہ سے جنگ چھوڑ کر بھاگم بھاگ گجرات پہنچا تھا، نواب آصف الدولہ خود ہولی کھیلتے تھے۔ بعض مسلمان صوفی بزرگوں کے مزاروں پر بسنت کی تو چندی پہلے بھی منائی جاتی تھی اور اب بھی منائی جاتی ہے۔ مولانا حسرت موہانی ایسا وطن پرور اور عظیم شاعر کرشن جی کی محبت میں متھرا اور ورنداون کی یاترا کرتا ہے اور عقیدت کے جذبے سے سرشار ہو کر کہتا ہے ؎

متھرا میں بھی قبول ہو حسرت کی حاضری
سنتے ہیں عاشقوں پہ تمھارا کرم ہے خاص

ادھر ہندو صوفیوں کے مزار پر جانے لگے اور چادریں چڑھا کر منتیں ماننے لگے۔ بڑی عقیدت سے محرم میں بھی حصہ لینے لگے اور تعزیے رکھنا شروع کر دیے۔ اب سے پچاس برس پہلے تک مسلمان عورتوں کے ساتھ ہندو عورتیں بھی اپنے چھوٹے بچوں کو گودیوں میں لیے شام کی نماز کے وقت مسجدوں کے دروازے کے سامنے کھڑی ہو جاتیں اور مسجدوں سے نکلنے والے، نمازیوں سے ان بچوں پر پھونک " پڑھواتی تھیں۔ اب بھی بہت سے ہندو مرد یا عورتیں کسی مسجد یا مزار کے سامنے نکلتی ہیں تو سلام کر لیتی ہیں۔

رسم رواج اور تیوہاروں ہی میں یہ ایکتا نہیں دکھائی پڑتی تھی، علم اور فن بھی اس سے متاثر ہوئے۔ ہندستانی سنگیت میں ہندو مسلمانوں کے میل جول سے نئی طرزیں، نئی راگ، راگنیاں نکلیں۔ شاستریہ ہندستانی سنگیت کی ایک اہم اور خاص طرز "خیال" جسے امیر خسرو نے اور "بڑا خیال" جسے سلطان حسین شرقی نے ایجاد کیا تھا، اس اتحاد کی مثالیں ہیں۔ ہندستانی تعمیر کے فن میں بھی ایک نیا رخ پیدا ہوا جو نہ خالص ہندستانی تھا، نہ عربی، نہ ایرانی، نہ ترکی بلکہ وہ جسے صحیح معنوں میں "ہند مسلم فن تعمیر" کہا جاتا ہے۔ محل ہوں یا قلعے، مسجدیں ہوں یا مقبرے، گنبد ہوں یا مینار، ان سب کی بناوٹ میں ایک خالص ہندستانی طرز نظر آتی ہے۔ ہندستان کی سب سے زیادہ حسین عمارت، تاج محل کے گنبد کی ساخت، دوسرے ملکوں میں عربوں کے بنوائے ہوئے گنبدوں کی ساخت، سے الگ ہے! عرب، ایران، ترکستان اور افغانستان میں جو لباس پہنا جاتا تھا وہ بھی ہندستان پہنچ کر بدل گیا اور پوشاک بھی "ہندستانی" ہو گئی۔ دیہات میں اگر ہندو مسلمان دونوں دھوتی پہنے ہوئے دکھائی پڑتے تھے (اور اب بھی دکھائی پڑتے ہیں) شہروں میں شیروانی اور پائجامے کا رواج چل پڑا تھا اور تو اور اس میل جول نے ایک نئی زبان (اردو) کو جنم دیا، جس کے پروان چڑھانے میں جتنا حصہ مسلمانوں نے لیا اتنا ہی ہندوؤں نے۔

یہاں کے ہندو اور مسلمان جنگ بھی کرتے تھے لیکن آپس میں نہیں، دونوں مل کر کسی دوسرے سے لڑتے تھے، چاہے یہ "دوسرا" کوئی ہندستانی ہو یا باہر کا۔ اگر ایک مسلمان بادشاہ اور ایک ہندو راجا سے جنگ ہوتی تھی تو اس لیے نہیں کہ ایک مسلمان ہے اور دوسرا ہندو، بلکہ اس لیے کہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانا اور اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا۔ مگر مسلمان بادشاہ ہو یا ہندو راجا، دونوں کی فوجوں میں ہندو بھی ہوتے تھے اور مسلمان بھی۔ مغل شہنشاہ اکبر اور مہارانا پرتاپ میں جنگ ہوئی تو وہ ہندو مسلمانوں کی لڑائی نہ تھی بلکہ صرف دو

ہندستانیوں کے درمیان جنگ تھی۔ اکبر کی فوج میں ساٹھ ہزار مغل اور چالیس ہزار راجپوت تھے اور مہارانا پرتاپ کی فوج میں چالیس ہزار راجپوت اور بیس ہزار پٹھان۔ اکبر کی فوج کا سپہ سالار ایک ہندو (راجا مان سنگھ) تھا اور مہارانا پرتاپ کی فوج میں بھی مسلمان سپہ سالاری کر رہے تھے۔ اورنگ زیب اور شیواجی میں جنگ ہوئی تو اورنگ زیب کی فوج میں راجپوت بھی تھے اور مسلمان بھی — اور شیواجی کی فوج میں بھی ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ شیواجی نے سختی سے یہ حکم دے رکھا تھا کہ مسجد اور قرآن مجید کی بے حرمتی ہرگز نہ ہونے پائے۔ اس زمانے تک ہندو اور مسلمان کا فرق اتنا مٹ چکا تھا کہ جب ایک غیر ملکی حملہ آور، احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں سے پانی پت کے میدان میں جنگ ہوئی تو پیشوا بالاجی راؤ کی فوج کا ایک بہت بڑا فوجی افسر ابراہیم گاردی تھا جس نے اپنی جان دے دی مگر ابدالی کا ساتھ دینا منظور نہیں کیا۔ پھر جب ایک بدیسی حکومت یہاں طاقت پکڑ گئی تو ۱۸۵۷ء میں اس کے خلاف ہندو مسلمان سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت محل کے مشیر خاص راجہ جیالال تھے اور مولانا احمد اللہ شاہ کے سب سے بڑے معتقد رانا بینی مادھو سنگھ۔ نانا صاحب کے صلاح کار عظیم اللہ خاں تھے اور مہارانی جھانسی کے دست راست نواب باندہ اور پھر جب تقریباً ساٹھ برس بعد مہاتما گاندھی کی قیادت میں ہندستان کی آزادی کی فیصلہ کن لڑائی ہنستے ہوکر اور اہنسا (عدم تشدد) کے اصول پر کاربند ہوکر لڑی گئی تو ہندو عوام اور لیڈروں کے علاوہ، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا حسین احمد اور کتنے ہی مسلمان رہنما اور مسلم عوام ان کے ساتھ تھے۔

اس ہندو مسلم اتحاد کے پیچھے کیا راز تھا؟ راز یہ تھا کہ دونوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ انھیں اور ان کی اولاد کو اسی ملک میں جینا اور مرنا ہے اور یہ کہ مذہب کے فرق کے باوجود دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ امن اور سلامتی سے رہنا چاہیئے۔ یہ لوگ مذہب کے صحیح مفہوم سے واقف تھے اور اس کی روح کو پہچانتے تھے۔ مسلمان سمجھتے تھے کہ اسلام رواداری اور بھائی چارہ سکھاتا ہے اور ہندو سمجھتے تھے کہ ہندو دھرم میں بڑی وسعتیں ہیں، بڑی فراخ دلی ہے اور ہر ایک کے لیے اس کے دل میں بڑا نرم گوشہ ہے۔ مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی دونوں اپنے مذہب کو بھول جاتے ہیں، اپنی مذہبی تعلیم بھول جاتے ہیں، اپنے مذہبی پیشواؤں کے احکام اور اپدیش بھول جاتے ہیں۔ اپنی تاریخ بھول جاتے ہیں اور اپنی تہذیب بھول جاتے ہیں۔ یہ سب بھول کر وہ کبھی کبھی ایسی حرکتوں پر اتر آتے ہیں جن میں ان کا بھی ہر طرح سے نقصان ہوتا ہے اور ملک کا بھی۔ ان کی بھی بدنامی ہوتی ہے اور ملک کی گردن بھی شرم سے جھک جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ صرف چند سماج دشمن اور شر پسند لوگ ایسی حرکتیں اور دنگے فساد کراتے ہیں اور ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اس طرح وہ ایک فرقے کے لیڈر بھی بن جائیں گے اور فساد ہو جانے کی صورت میں مال بھی ہتھے چڑھے گا۔ مگر ہم ہیں کہ ان کے بہکانے میں آجاتے ہیں۔ اور یہ نہیں سوچتے کہ ہم یکایک دیوانے کیوں بن جائیں اور اس سے حاصل کیا ہوگا؟ ہندستان سے سارے مسلمان نکل جائیں گے؟ کیا ہندستان، ہندوؤں سے خالی ہو جائے گا؟ اگر ایسا نہیں ہو سکتا۔ اور یقیناً نہیں ہو سکتا.... تو پھر یہ فساد اور یہ جھگڑے کس بات کے لیے؟ آزادی کے بعد تو ہندو مسلم اتحاد کا رشتہ اور مضبوط ہو جانا چاہیئے تھا اور ہندستان کے ہر رہنے والے کو کندھے سے کندھا ملا کر آزادی کی بنیادوں کو مضبوط ملک کی طاقت میں اضافہ اور اس کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانا چاہیئے تھا تاکہ آزادی کی نعمتوں سے ہم سب بہرہ ور ہوں اور ہماری اور ہماری آنے والی نسلوں کی زندگی خوش گوار تر ہو جائے۔ مگر اپنی اور اپنے ملک کی حالت سدھارنے کی جگہ ہم بھی تباہ ہو رہے ہیں اور ملک کو بھی تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

یہ جھگڑے فساد عام طور سے مذہب کے نام پر کرائے جاتے ہیں مگر یہ یقینی ہے کہ جھگڑا کرنے والوں کو نہ اپنے مذہبوں کی کوئی پروا ہوتی ہے نہ وہ مذہبی تعلیمات سے واقف ہوتے ہیں۔ ہاں، وہ یہ ضرور جانتے ہیں کہ مذہب کے نام پر لوگ بھڑک اٹھیں گے اور ان کا کام چل نکلے گا۔ اب جہاں تک مذہب کا تعلق ہے ایسا کوئی مذہب نہیں جو قتل و غارت پر اکساتا ہو اور فساد کرانے پر آمادہ کرتا ہو۔ قتل و غارت تو الگ چیز ہے، اسلام نے تو فساد پھیلانے کی بھی شدت سے مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ "فساد قتل سے بھی زیادہ خراب چیز ہے۔" خود مذہب کے سلسلے میں قرآن شریف میں بتایا گیا ہے کہ "مذہب کے معاملے میں کسی پر کوئی جبر نہیں۔" ایک اور جگہ کہا گیا ہے کہ "تم اپنے دین پر ہم اپنے دین پر۔" پھر کوئی مسلمان، جو اسلام کو مانتا ہو اور اس کے رسول کو مانتا ہو، صرف اس وجہ سے کسی سے نہیں لڑ سکتا کہ اس کا مذہب دوسرا ہے۔ اور ہندوئیت کی تعریف مہاتما گاندھی نے اس طرح کی ہے "ہندوئیت کوئی جداگانہ مذہب نہیں۔ اس میں دنیا کے ہر پیغمبرؑ کی عبادت کی جگہ ہے ..... ہندوئیت ہر ایک کو یہ پیغام دیتی ہے کہ اپنے مذہب یا دھرم کے مطابق خدا کی عبادت کرو۔ اس لحاظ سے وہ ہر مذہب کے ساتھ بڑے پرامن طریقے سے نباہ کر لیتی ہے۔" اسلام کے بارے میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں "میں اسلام کو اسی طرح امن کا مذہب سمجھتا ہوں جس طرح عیسائیت، بدھ مت اور ہندومت کو ....."

اسلام نے کسی کی غلطی یا زیادتی پر درگزر کرنے اور معاف کر دینے پر بھی بہت زور دیا ہے۔ قرآن شریف میں ہے کہ وہ لوگ نیک اور پرہیزگار ہیں "جو غصے میں آ کر بے قابو نہیں ہو جاتے اور لوگوں کے قصور کو بخش دیتے ہیں۔" پیغمبر اسلام نے ایک مرتبہ فرمایا کہ "طاقت ور وہ شخص نہیں جو کشتی میں دوسرے کو پچھاڑ دیتا ہے۔ طاقت ور وہ ہے جو غصے کے موقع پر اپنے اوپر قابو رکھتا ہے۔" یہی تعلیم دوسرے مذہب کے پیشواؤں نے بھی دی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے ایک موقع پر اپنی قوم کے لوگوں سے جو ان کے ساتھ بڑی زیادتیاں کرتے رہتے تھے اس طرح دعا کی تھی "اے خدا انھیں معاف کر دے کیونکہ یہ لوگ جو کر رہے ہیں اس کی برائیوں کا انھیں احساس نہیں۔" وید ویاس جی نے ایک وید میں لکھا ہے کہ "چھما (یعنی درگزر) دھرم ہے، چھما یگیہ ہے، چھما وید ہے اور چھما شاستر ہے۔" مہاتما گاندھی لکھتے ہیں کہ "درگزر کرنا بہادر کی صفت ہے نہ کہ بزدل کی۔" اور ایک مغربی مصنف کا کہنا ہے کہ "درگزر انتقام سے بہتر ہے کیونکہ درگزر کرنا علامت ہے نرم مزاجی کی اور بدلہ لینا پہچان ہے ایک وحشی کی۔"

نتیجہ ان سب باتوں کا یہ نکلا کہ مذہب کا ان جھگڑوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہر مذہب، رواداری اور بھائی چارے کا سبق دیتا ہے۔ ہر مذہب کے ماننے والوں کی بڑی اکثریت نہ جھگڑا چاہتی ہے نہ جھگڑے کے قریب جانا چاہتی ہے۔ بنیادی طور سے ہندو مسلمان امن پسند ہیں اور سیکڑوں برس سے ہر معاملے میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے آئے ہیں۔ اس کے باوجود اگر کہیں فساد ہو جاتا ہے تو یہ مٹھی بھر سماج دشمنوں کا کام ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر ہمارا ..... ہر ہندو مسلمان کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ جوش میں نہ آ جائے بلکہ ہوش سے کام لے۔ جھگڑے بہت ہو چکے۔ اب ہمیں عقل سے کام لے کر ایک نئے ہندستان کی تعمیر کرنا ہے۔ جہاں مذہب کے نام پر جھگڑے نہ ہوں جہاں ہر مذہب کے رہنے والوں کو ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہوں (جیسا کہ ہندستان کے آئین میں کہا گیا ہے)، جہاں امیر غریب اور اونچ نیچ کا فرق نہ ہو، جہاں ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی مل کر مادر وطن کی زلفیں سنواریں اور اپنے آپ کو ایک قوم یعنی "ہندستانی" سمجھیں کیونکہ مذہب کا قومیت سے تعلق نہیں ہوتا۔ کتنا سچ کہا ہے مہاتما گاندھی نے:

"مذہب سے قومیت کا امتحان نہیں ہوتا بلکہ وہ ....

غزلیں

ڈاکٹر سلمان عباسی
۔۔ ڈاکٹر موتی لال بوس روڈ
نئ

ا بربادی کا منظر اچھا لگتا ہے
ب نازک ہاتھوں میں پتھر اچھا لگتا ہے

رشیوں پہ ماتم کرنا ہر روز کی عادت ہے
پے غم پہ ہنسنا اکثر اچھا لگتا ہے

ینا تو جینا ہے اب مجھ کو مرنے کو بھی
پنے گھر سے اوروں کا گھر اچھا لگتا ہے

ظلم کے آگے جھک جائے جو سر وہ بے قیمت
زے پر اونچا ہو جو سر اچھا لگتا ہے

پہلے جشنِ مرگ منانا اچھا لگتا تھا
ب مجھ کو مرنا گھٹ گھٹ کر اچھا لگتا ہے

چنگیزوں کی تلواریں ہیں مجھ پہ برہنہ سر
عباسی ہوں مجھ کو خنجر اچھا لگتا ہے

رشمی کانت راہی
کونارک گفٹ ہاؤس
نیا سڑک۔ کٹک ۲-۵۳۰،

جلوۂ حسنِ مہر و ماہ ہوں میں
قطرۂ بحرِ بے پناہ ہوں میں

تنگ ہے وسعتِ دو عالم بھی
گرچہ اک نقطۂ سیاہ ہوں میں

تھا کبھی سنگِ منزلِ مقصود
اب فقط مشتِ گردِ راہ ہوں میں

مجھ سے منسوب لغزشِ آدم
کیسے کہہ دوں کہ بےگناہ ہوں میں

نغمۂ نے کا سوز ہوں راہی
نالۂ درد و کرب و آہ ہوں میں

آصف لکھنوی
احاطہ مبارک
مفتی گنج لکھنؤ
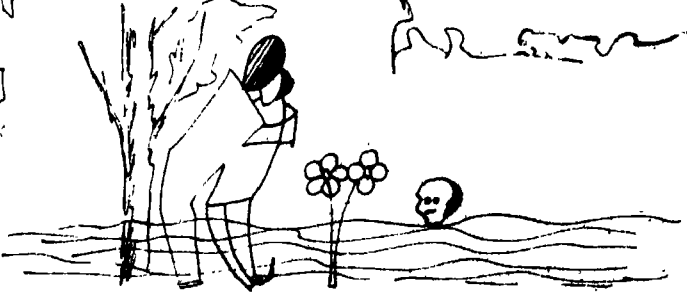
کسی کو غم نے کسی کو خوشی نے لوٹ لیا
جہاں پہ چاہا جسے زندگی نے لوٹ لیا

میں ڈر رہا تھا ترے ساتھ ساتھ چلنے سے
وہی ہوا کہ مجھے دوستی نے لوٹ لیا

یہ کیا خبر تھی کہ ڈاکہ پڑے گا آنکھوں پر
ہمارے گھر میں ہمیں روشنی نے لوٹ لیا

ہمارے ذہن میں ناسور بن کے رہتا ہے
وہ اک خیال اگر پھر کسی نے لوٹ لیا

میں کیوں کہوں کہ ستاروں نے چال بدلی ہے
مرا وجود مری بے حسی نے لوٹ لیا

نظر سے چھن گئے دیوار و در مرے گھر کے
چراغ بجھتے ہی تیرہ شبی نے لوٹ لیا

منڈو نانی

خاکہ

امانت اللہ خاں شیروانی
پرنسپل اسلامیہ کالج اٹاوہ

جب میں کسی بڑی بوڑھی کو بچوں کو کہانی سناتے دیکھتا ہوں تو مجھے فوراً منڈو نانی یاد آجاتی ہیں۔ منڈو نانی ہمارے قصبہ کی حویلیوں کا ایک عجیب، دلآویز اور دلچسپ کیریکٹر تھیں۔ قصبہ میں چھوٹے بڑے پرانے زمینداروں کے کچے پکے مکان ہیں جو حویلیاں کہلاتے ہیں۔ ان میں کوئی بڑی حویلی کوئی چھوٹی حویلی، کوئی پکی حویلی اور کوئی کچی حویلی کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ کچھ حویلیاں پھاٹک والی حویلی، کنوئیں والی حویلی اور حاجی میاں والی حویلی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ اب سے تقریباً چالیس پچاس سال پہلے زمینداریوں کے زمانے میں ان حویلیوں میں عجیب و غریب زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرنے والے بھرپور کیریکٹر پائے جاتے تھے۔ حویلی کے سامنے چبوترے پر مونڈھوں پر بیٹھے حقہ گڑگڑاتے اور اپنے بچپن اور جوانی کے زمانے کو بھلاتے اس وقت کو برا بھلا کہنے والے کیریکٹر، حویلیوں کے اندر بات بات پر لڑکیوں کو ٹوکنے اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ رکھ کر لڑکیوں کو غور سے دیکھ کر ہائے کتنی سیانی ہوگئی کہنے والے کیریکٹر، زیوروں سے لدی پھندی آپس میں کھسر پھسر کرنے والی دلہنوں کے کیریکٹر، موقع ملتے ہی چھتوں پر جاکر ادھر ادھر جھانکنے والی نوجوان لڑکیوں کے کیریکٹر، کالج میں پڑھنے والے اور چھٹیوں میں گھر آکر خواب دیکھنے والے نوجوانوں کے کیریکٹر، چادریں اوڑھے ادھر سے ادھر اس حویلی سے اس حویلی میں لپک جھپک جانے والی نائنوں، بڑی بی بیوں، خالاؤں اور پھپھیوں کے کیریکٹر ملتے تھے۔ ان ہی آخری کیریکٹروں میں ایک دلچسپ کیریکٹر ہماری منڈو نانی کا تھا۔

ان دنوں منڈو نانی کی عمر ساٹھ سال سے کچھ اوپر ہو گئی تھی، چہرہ پر چیچک کے داغ تو تھے ہی، جھریاں پڑ جانے سے پورے چہرے پر تقسیم کے نشان سے پڑ گئے تھے۔ درمیانہ قد اور دبلا پتلا بدن، لمبی اور پتلی ناک میں بڑی سی لونگ، سر کے بال سفید لیکن پوری طرح نہیں کیونکہ ابھی مکمل بڑھاپا کچھ دور تھا۔ چہرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ ہنسی اب آئی تب آئی، زیادہ تر کالے رنگ کی تنگ مہری کا پاجامہ، ڈھیلا سا کرتا، سفید مٹیالی سی چادر، پیروں کی جوتیوں کو سپاٹ سپاٹ کرتی ہوئی نانی اس حویلی سے اس حویلی میں جایا کرتی تھیں۔ صبح سے شام تک نا معلوم کتنی حویلیوں کے چکر لگاتی تھیں اور ہر جگہ کچھ نہ کچھ کام بھی کر آتی تھیں۔ ہمارے یہاں انکا قیام کچھ زیادہ رہتا تھا اسکی وجہ غالباً یہ تھی کہ بی اماں مرحومہ سے انکی بڑی رازداری کی باتیں ہوتی تھیں اور ان سے نانی کو کچھ مل بھی زیادہ جاتا تھا۔

منڈو نانی کے دو بڑے وصف تھے۔ انھیں کہانی سنانے کا ملکہ حاصل تھا۔ خدا معلوم انہیں کتنی کہانیاں یاد تھیں یا وہ کہانیاں گڑھ لیا کرتی تھیں۔ مختلف قسم کی کہانیاں بچوں کی دلچسپی کی کہانیاں، نوجوانوں کے لیے شہزادے شہزادیوں کی کہانیاں، ہنسانے والی کہانیاں، اور رلانے والی کہانیاں غرضکہ ہر طرح کی کہانیاں انھیں یاد تھیں اور موقع و محل کے مطابق انھیں عجیب انداز سے سناتی تھیں۔ دوسرا وصف ان میں بچوں کو سنبھالنے اور بہلانے کا تھا۔ بچے چاہے کتنا ہی ضد کر رہے ہوں نانی کے بس میں یوں آجاتے تھے جیسے ان کی کہانیوں میں پری کے قبضہ میں دیو آجاتے تھے۔

ادھر منڈو نانی کے قدم کسی حویلی کی ڈیوڑھی میں آئے کہ ادھر چاروں طرف بچوں میں برقی لہر دوڑ گئی "آہا! نانی آگئیں" "منڈو نانی چلو ہم نانی کہانی یاد کرائیں" اسی قسم کے فقرے چاروں طرف سے سننے میں آتے۔ منڈو نانی ہیں کہ باچھیں کھلی جا رہی ہیں کبھی ایک بچہ کو پیار کرتی ہیں کبھی دوسرے کو گلے لگاتی ہیں، ادھر لڑکیوں اور بڑی بوڑھیوں کی طرف سے بھی مختلف قسم کی فرمائشیں کی جا رہی ہیں "اے خالہ خالو نے چھوڑ دیا۔ کب سے راستہ

دیکھ رہی ہوں یا دورہا میرا سر دھلوا دو" دوسری طرف سے کسی پوپلے منھ سے یوں آواز آئی" اے منڈو کی بہو خدا تمہیں غارت کرے۔ دو دن میں صورت دکھائی ہے اور میرا پاندان تو ماتجھو دو پھپھوندی چڑھ آئی ہے" غرضیکہ منڈو نانی کی ہر طرف سے پکار مچتی تھی اور نانی کبھی دھیمے دھیمے مسکراتیں کبھی پوری باچھیں کھولتیں اور کبھی قہقہے لگاتیں ادھر ادھر کام میں لگ جاتیں۔ جدھر جاتیں بچے پیچھے پیچھے نانی نانی کہتے ہوئے ساتھ ہو لیتے۔

منڈو نانا مجھلے جسم کے بوڑھے آدمی تھے۔ ڈیڑھ بالشت کی لال سی داڑھی تھی۔ غالباً خضاب لگاتے تھے۔ ان کا کام قصبہ کے اسٹیشن پر دو وقت جاکر میاں لوگوں کا سامان حویلیوں تک پہونچانا یا حویلیوں سے اسٹیشن تک لے جانا تھا۔ ان دونوں قصبوں میں دن میں صرف دو سواری گاڑیاں آیا جایا کرتی تھیں۔ اس طرح نانا کو دو چار آنہ روز مل جاتے تھے۔ باقی وقت وہ اپنے گھر کے دروازہ کے سامنے ایک بورا بچھا کر بیٹھے رہتے اور حقہ گڑگڑایا کرتے تھے۔ معلوم نہیں ان کا اصلی نام یہی تھا یا پڑ گیا تھا۔ بہر حال منڈو کہلاتے تھے اور اسی مناسبت سے نانی منڈو نانی کہلاتی تھیں۔ نانی جب کبھی منڈو نانا کا ذکر کرتیں تو بظاہر برے خطابوں سے نوازتی تھیں مثلاً کسی نے پوچھا" منڈو خالہ آج بڑی دیر سے آئیں" وہ جواب دیتیں" اے بنو! وہ کمبخت بڈھا آج ہائے ہائے کر رہا ہے۔ سوچا ذرا پیر ہی دبا دوں" یا" اے ذرا دڑھیل کے نخروں میں دیر ہو گئی" اسی طرح وہ ہمیشہ نانا کا ذکر عجیب عجیب خطابوں سے کرتی تھیں لیکن ان کے الفاظ اور ان کے لہجے سے نانا کے لیے ان کی بے پایاں محبت کا اظہار ہوتا تھا۔ ان کے کئی لڑکے اور لڑکیاں تھے۔ سب کی شادیاں ہو گئی تھیں اور اپنے اپنے گھروں میں تھے صرف ایک لڑکا جبار جو سب سے چھوٹا تھا ان کے ساتھ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ انھیں بہت تنگ کرتا تھا۔ وہ اکثر جبار کی شکایتیں کرتی رہتی تھیں۔ میں نے انھیں اگر کبھی سنجیدہ دیکھا تو صرف جبار کے ذکر پر دیکھا ورنہ کہیں سوگ کی مجلس میں بھی ہوتیں تو بھی ان کے چہرہ سے ہنسی پھوٹ پڑتی تھی۔

بچوں کے بہلانے کے لیے تو ان کی خدمات خاص طور پر حاصل کی جاتی تھیں۔ جہاں انھوں نے عجیب عجیب منھ بنائے۔ آوازیں نکالیں اور اپنے جسم کو مختلف طریقوں سے توڑا مروڑا۔ الٹا سیدھا کیا اور روتا بچہ ہنس دیا۔ کبھی کبھی انھیں کہانیوں کی رشوت بھی دینی پڑتی تھی۔ [illegible] کبھی کبھی نقد کبھی ادھار۔

نانی کی باتیں بھی بڑے مزے دار ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی ان میں طنز و مزاح کے ایسے نشتر چھپے ہوتے تھے کہ ان کی چبھن کی میٹھی میٹھی کسک ایک عرصہ تک باقی رہے۔ ایک مرتبہ ایک بچہ کھیلتا ہوا بھاگا آرہا تھا کہ ایک ستون سے ٹکرا گیا۔ بڑی زور کی آواز ہوئی سب بھاگے پاس ہی نانی بیٹھی تھیں۔ جلدی سے بولیں" اے اللہ چوٹ تیرے لگی یا میرے" کبھی کوئی پوچھتا۔ نانی تم بڑی ہو یا نانا؟" ارے بیٹا تمہارے نانا تو اللہ والے۔ اللہ والوں کی کوئی عمر ہوتی ہے۔ میں دیکھیا گنا ہوں کی پوٹلی کل پیدا ہوئی تو کل مر جاؤں گی"" نانی تم کل کس سال پیدا ہوئی تھیں؟"" اے بیٹا! تم تو بال کی کھال نکالتے ہو مجھے دن تاریخ کیا یاد۔ یہ تو پڑھے لکھوں کی باتیں ہیں"

کسی حویلی میں شادی کے موقع پر تو چاروں طرف وہ ہی وہ نظر آتی تھیں معلوم ہوتا تھا کہ سارا انتظام انھیں کے ہاتھوں میں ہے۔ دن بھر کام میں لگی رہتیں اور رات کو ڈھولک کی تھاپ پہ خوب تھرکتیں۔ ممکن ہے اچھا ناچتی ہوں لیکن مجھے تو وہ تھرکتی نظر آتی تھیں۔ چاروں طرف قہقہے بلند ہوتے اور کنواریاں بالیاں منھ میں دوپٹے ٹھونسے ادھر ادھر سے تاکا جھانکا کرتی تھیں۔ لڑکے بھی اگر سات آٹھ سال سے کم ہوتے تو محفل میں بے کھٹکے شریک ہو جاتے کوئی منع کرنے والا نہیں ہوتا لیکن ذرا بڑے ہوتے تو پھر دیکھنے کے لیے کہیں نہ کہیں سے جھانکنا پڑتا تھا۔ لیکن ایک بات ضرور تھی نانی کے گلے میں بلا کا رس تھا۔ ان کی آواز بڑی جذباتی تھی اور وہ موقع کے لحاظ سے سماں باندھ دیتی تھیں۔ ان کے ایک گیت کا بول آج تک میرے کانوں میں رس گھولتا ہے۔

"بارہ بجے آدھی رات بنا میرا یادوں میں ہوگا"

رات کے سناٹے میں ڈھولک کی تھاپ پر یہ گیت نوجوان کنواروں کے سینے کی دھڑکنیں تیز کر دیتا تھا اور آنکھوں کے سامنے سہرے کی لڑیاں جھل مل کرنے لگتی تھیں۔

منڈو نانی گانے ناچنے کے ساتھ ایکٹنگ بھی لاجواب کرتی تھیں۔

میرا تو خیال ہے کہ اگر قسمت انھیں کبھی فلم کمپنی تک پہونچا دیتی تو آج انکا نام ملک کی مشہور ایکٹرسوں میں ہوتا۔ گانے میں جب انھیں حال آتا یا کبھی کسی ڈرامے یا محفل میں لطف پیدا کرنے کے لئے وہ اپنے اوپر کسی جن یا شہید بابا کو بلالیتیں اس وقت انکی ایکٹنگ دیکھنے کے قابل ہوتی یہ بھی کہا جاتا تھا کہ وہ اکثر اپنے گھر پر ایسی ہی ایکٹنگ کرکے منڈو نانا سے جو بھی چاہتیں منوالیتی تھیں۔ برفی اور قلاقند تو وہ اکثر ما نگا کرتی تھیں۔ ناک پھیلائے، بال بکھرائے کبھی حلق اور ناک سے مختلف آوازیں نکالتیں۔ کبھی غصہ اور کبھی پیار سے دوسروں پر نظر ڈالتیں۔ کبھی کوئی آیت پڑھتیں اور کبھی ایسی باتیں کرتیں جس کا سر نہ پیر، غرضیکہ انکی ایکٹنگ لاجواب ہوتی تھی۔ ایسے موقعوں پر انکی خاطر بھی خوب ہوتی تھی جو مانگتیں آجاتا۔ جب کسی حویلی میں یہ ڈرامہ کھیلا جاتا تو فوراً منڈو نانا کو خبر کردی جاتی اور وہ فوراً بھاگے بھاگے آتے اور ڈیوڑھی پر کھڑے پل پل کی خبریں پوچھتے رہتے تھے یا آیۃ الکرسی پڑھا کرتے۔ کبھی کبھی فرمائش پر بازار دوڑکر جاتے اور مٹھائی کا دونا لے کر بھاگے آتے۔ ان کی بےچینی اور اضطراب دیکھنے کی چیز ہوتی انھیں کبھی یقین ہی نہیں آتا کہ نانی ڈرامہ کھیلتی ہیں۔ سنا ہے وہ مولویوں اور سیانوں سے چپکے چپکے تعویز اور گنڈے بھی کرواتے رہتے تھے۔ نانی کو جب اس کا علم ہوتا تو خوب ہنستیں اور کہتیں "مردوا عشق میں پاگل ہو گیا ہے۔"

منڈو نانی کو کہانیوں کے ساتھ ساتھ روزانہ کے واقعات اور حادثات کو خوب نمک مرچ لگا کر سنانے کا بھی شوق تھا۔ کبھی کبھی موقع کے لحاظ سے بڑھی بوڑھیوں میں اور لڑکیوں میں انکی دلچسپی کے مطابق کچھ واقعات گڑھ کر بھی سنا دیا کرتی تھیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ خدا معلوم سچا تھا یا گڑھا ہوا انھوں نے چند بیبیوں کے سامنے سنایا تھا مجھے اب تک یاد ہے اتفاق سے میں کمرہ میں لیٹا ہوا تھا اور شاید کسی کو اسکا علم نہیں تھا۔ ہماری پھوپی جان نے نانی سے کہا "ہاں منڈو خالہ وہ بات جلیبی اور برفی والی تو بتاؤ"۔ "اے ہے بی بی تم تو ایک بات کے پیچھے پڑ گئیں۔ بوڑھا قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہے لیکن جہاں کسی کو دیکھا رال ٹپکی"۔ میں سمجھا کہ منڈو نانا کا ذکر خیر ہوگا لیکن معلوم ہوا کہ ہماری مسجد کے موذن شیخ جی کی بات ہے۔ یہ واقعہ ان ہی کی زبانی سنئے کہنے لگیں تو بی بی پچھلی گرمیوں کی بات ہے کوئی دوپہر کے بارہ بجے ہوں گے۔ بڑی کڑی دھوپ تھی۔ چیل نے بھی انڈا چھوڑ دیا تھا۔ میں پھاٹک والی حویلی سے حاجی میاں کی طرف جارہی تھی۔ گلی سنسان تھی نہ آدم نہ آدم زاد۔ دیکھوں کیا کہ سامنے سے بڈھا شیخ لاٹھی ٹیک ٹیک کر ایک ہاتھ میں سالن کا پیالہ لئے چلا آرہا ہے۔ ویسے تو بیٹے کو کچھ دکھتا نہیں اندھا کہیں کا جانے مجھے کیسے دیکھ لیا۔ پاس آکر بولا "اے منڈو کی دلہن کہاں جارہی ہو سنو! تمہیں جلیبی اچھی لگتی ہے یا برفی؟ کل اس وقت ملنا تمھیں حلوائی سے خاص طور پر بنوا کر لاؤں گا" یہ سن کر میرے آگ ہی تو لگ گئی۔ جی چاہا داڑھی پکڑ کر اتنی جوتیاں لگاؤں کہ سب جلیبی برفی کا مزہ بھول جائے بڈھا ندیدہ" "اے خالہ تم بھی غضب کرتی ہو۔ بیکار ہی اتنا غصہ شیخ جی بیچارے نے ایسا کیا کہہ دیا۔ تمہاری خاطر کرنے کو ہی تو کہہ رہے تھے" "اے ہے خاطر کرکے اپنی ماں بہنوں کی خاطر کیوں کرے۔ اللہ میرے بڈھے کو زندہ سلامت رکھے۔"

غرضیکہ اس قسم کے قصے اور واقعات خوب مزے لے لے کر سنا تی تھیں ان ہی باتوں سے وہ بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں میں بھی کافی مقبول تھیں جہاں کوئی "میاں" اندر تشریف لائے اور انھوں نے جھٹ دوپٹہ یا چادر منھ پر کھینچ کر گھونگھٹ کر لیا۔ کچھ میاں تو کنکھیوں سے دیکھ کر مسکراتے یا ماتھے پر بل ڈالتے نکل جاتے تھے کچھ ایسے بھی ہوتے تھے جو کہہ دیتے تھے "ارے منڈو کی بہو پردہ کب تک کرو گی اب تو ستر کی عمر آگئی ہے۔" فوراً گھونگھٹ میں سے ہی بول پڑتیں "ارے میاں! میاں ان حویلیوں کو قائم رکھے پردہ بھی رہیگا۔" ان دنوں سب مرد، بالغ لڑکے زیادہ تر باہر مردانے میں رہتے تھے ان لوگوں کے حویلیوں میں آنے کے اوقات مقرر تھے خصوصاً جب کسی حویلی کے سب سے بڑے بزرگ اندر تشریف لانے والے ہوتے تو چاروں طرف کھلبلی مچ جاتی دوپٹے سروں پر آجاتے لڑکیوں کے قہقہے بند ہو جاتے اور نوجوان چلے جاتے تھے۔ پاندان سے کرسی اماں تخت پر آ بیٹھتی تھیں اور ایک کرسی پاس بچھا دی جاتی تھی۔ اکثر نانی حویلی میں ہوتیں تو تو تو تھا وہ پھرتی اور دوسری ملازماؤں اور خادماؤں کو تنبیہ کرتی جاتی تھیں۔ [illegible]

شفیق رامپوری
[illegible] روڈ رامپور ۲۴۴۹۰۱
یوپی

تحفیل آثر مسعودی
سلون ضلع رائے بریلی

[illegible] سہاوی
[illegible] اکبری گیٹ

غزلیں

جیسے جیسے ہم زمانہ آشنا ہوتے گئے
اپنے غالب آپ اپنا مدعا ہوتے گئے

عمر پڑتی گئی جس درجہ گرد ماہ و سال
اور دنیا کے لیے ہم آئینہ ہوتے گئے

رنگ لاتی ہی رہیں حالات کی تبدیلیاں
رفتہ رفتہ آشنا نا آشنا ہوتے گئے

کیسی کیسی ہستیاں آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں
کیسے کیسے لوگ دنیا سے خفا ہوتے گئے

زندگی کو بھی شعورِ احتیاط آتا گیا
ہم بھی دنیا کی نظر میں پارسا ہوتے گئے

زندگی کی ہم سے وابستہ تھیں کچھ قدریں مگر
ہم بھری محفل میں صحرا کی صدا ہوتے گئے

دست دنیا قلب و جگر پتھر کے سر پتھر کا ہے
بے حسی ایسی ہے جیسے ہر بشر پتھر کا ہے

حادثے دنیا کی میری سمت آ کر کیا کریں؟
موم جیسا دل ہے سینے میں جگر پتھر کا ہے

سنگدل لوگوں کی بستی پتھروں کے شہر میں
ہے جو شیشے کا مکاں ہر وقت ڈر پتھر کا ہے

بے اثر ہے بیکسوں کی آہ کا سوز و گداز
پتھروں کے گھر میں کیا ہر اک بشر پتھر کا ہے

ہے امینِ الفتِ شاہ جہاں، تاج حسیں
دیکھنے میں خوبصورت ہے مگر پتھر کا ہے

کون دیکھے گا ہمارے فن کی یہ شیشہ گری
آج کل تو شیشۂ اہلِ نظر پتھر کا ہے

دل پہ جو کچھ بھی گذر جائے کبھی کہتا نہیں
یہ اثر ہے حادثوں کا یا اثر پتھر کا ہے

یہ کون آج جلوہ نما انجمن میں ہے
کچھ روشنی سی ہوش کی دیوانہ پن میں ہے

ساقی کچھ ایسی بات ترے بانکپن میں ہے
دل ہے کہ جیسے حلقۂ دار و رسن میں ہے

اللہ رے یہ جوششِ گلکاریٔ جنوں
دنیا کی ہر بہار ہمارے چمن میں ہے

بکھری ہوئی ہے یوں رُخِ روشن پہ زلفِ دوست
محسوس ہو رہا ہے کہ سورج گہن میں ہے

ساقی ادھر بھی ایک اچٹتی ہوئی نگاہ
آج ایک پارسا بھی تری انجمن میں ہے

شاید اسی کا نام ہے بیداریٔ وفا
میں ہوں وطن سے دور مرا دل وطن میں ہے

کچھ بھی ہو لے پیام مرے فن پہ تبصرہ!
یہ کم ہے کیا کہ ذکر مرا اہلِ فن میں ہے

افسانہ

احمد ابراہیم علوی
۳- بیلنچھ اسکوائر
لکھنؤ

بڑی بیگم اور ستارا جمال جو زمین نظروں میں کچھ اس طرح سماگئی کہ احمد مرزا یہ قطعاً بھول گیا وہ سمندروں کے پرے اس بستی میں آنے سے پہلے اپنے دیس اور اپنے گاؤں میں بھی گوریوں کا ایک جھمگھٹ چھوڑ کر آیا ہے۔ اس جھمگھٹ میں فتو خالہ ہیں جو عمر کے پینتیس برس خواہ مخواہ گنوا دینے کے باوجود آج بھی پُر امید ہیں جیسے خوابوں کے دیس سے کوئی شہزادہ آئے گا اور ان کے ہاتھ پیلے کرکے سرخ لباس کے پر لگا کر دور بہت دور آسمانوں میں لے اڑے گا۔ شہبانہ ہے دردانہ ہے اور ردمانہ ہے سب ناک نقشے سے درست گھریلو تعلیم یافتہ اور سلیقے کی لڑکیاں ہیں مگر ان بیچاریوں نے آنکھوں کو مخصوص انداز میں نچا کر مردوں کو دیوانہ بنانے کا ہنر نہیں سیکھا اس لیے یہ سب اپنے کچے بکا ؤں کی کچی چہار دیواریوں میں کچی عمروں ہی میں بڑھاپے کو دعوت دیئے بیٹھی ہیں پہلے ان کے پیغامات آئے اور خوب آئے مگر ماں باپ بڈیوں کو تھوڑے بیٹھا لینے کی حماقتوں کے شکار رہے دوسروں نے چھڑیاں پسند کرلیں نتیجہ یہ ہوا کہ پیغامات کے سلسلے بند ہوگئے پھر کسی کا باپ مرگیا تو کسی کی ماں اور سنجیدگی سے رشتوں کی تلاش کا سلسلہ ہی منقطع ہوگیا پھر کبھی جمال بھائی تو کبھی کمال بھائی آئے یا احمد مرزا آموں کی فصل میں دوست احباب کو آم کھلانے لائے اور انھوں نے پیڑوں کی شاخوں میں پھیلنے والے آموں کے علاوہ گھروں میں بھی کچے پھل پائے تو اس سے بھی لطف اندوز ہوتے اور جب دل بھر گیا تو چلتے بنے دولڑکیوں نے تمام خاطر مدارات کی سرپرستوں نے ڈھیل دی کہ شاید کام بن جائے مگر بگڑے ہوئے کام زیادہ تر اور بگڑا جایا کرتے ہیں بنتے کہاں ہیں اس لیے کام بگڑتے رہے ہر ہر لڑکی کے بارے میں افواہیں پھیلیں داستانیں بنیں لیکن کوئی حقیقت جنم نہ لے سکی۔

پرسوں شام اچانک ہی لندن کے سستے مذے ریسٹوران "سیلون ٹی ہاؤس" میں داخل ہوتے ہی احمد مرزا کی نظر بہت سی سانولی سلونی ہندوستانی پاکستانی اور سری لنکا کی لڑکیوں پر پڑی تو پھر جوزفین کا جمال اور نہ جوڈتھ کا شراب کی مانند چھلکتا جسم اسے روک سکا کہ وہ لندن کے اس بارونق بازار میں توبہ شکن جوانیوں کی بھیڑ میں اپنے کو گم کرکے ہندوستان میں اندھیروں میں ڈوبے گاؤں کی سادہ لوح لڑکیوں کے تصور سے باز رکھ سکے۔ اس کا بے اختیار دل چاہا کہ وہ اڑ کر ہندوستان پہنچ جائے اور پھر شہبانہ، دردانہ اور ردمانہ ہوں وہ اسکو مسلسل ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی ہوں وہ پوچھے "کیا چاہتا چاہتی ہو۔ جو اسطرح دیکھے جا رہی ہو"۔ جواب وہی ہو جو ہندوستان کی سب لڑکیاں لندن سے لوٹ کر آنے والے لڑکوں کو دیکھ کر کرتی ہیں — "لندن سے آئے ہیں کوئی فرق نہیں نظر آرہا ہے" وہ مسکرا کر جواب دے۔

"تو کیا پر لگ جانا چاہیئے تھا یا سینگ نکلنا چاہیئے تھا۔

ایک قہقہہ ہو پُرخلوص اور ترنم ریز۔ جو سوائے ہندوستان کے گاؤں کی گوریوں کے کہیں اور نہیں ملتا۔

احمد مرزا کا دل چاہا کہ وہ دردانہ سے کہے۔ "میں پیرس کے نائٹ کلبوں میں ناچا لندن میں شو ہوئیں جسموں کی آنچوں کے درمیان سے گزرا روم اور فرینکفرٹ برلن اور بیروت کے بازار حسن دیکھے ہر نسل اور ہر قوم و مذہب کی لڑکیاں ملیں میں نے ایسا حسن دیکھا کہ جسکا پہلے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا سرخ سفید شاداب رخساروں اور دہکتے جسموں کا لمس حاصل ہوا مگر اپنے گاؤں کی دبلی پتلی سوکھی سہمی سانولی سلونی ردمانہ اور فرزانہ کو بھول سکا اور شاید کبھی نہ بھول سکوں اس لیے آؤ دردانہ آج بہت دل چاہ رہا ہے ایک عہد کرلوں "ہم تم دونوں اب ہمیشہ ساتھ رہیں گے کبھی بھی زندگی کے کسی بھی موڑ پر علیحدہ نہ ہوں گے۔ آؤ کر اب بہت دل بھر گیا ہے ان بارونق بازاروں سے لمبی لمبی کاروں اور گھڑگھڑاتے جٹ ہوائی جہازوں سے اب اپنے گاؤں میں آم کے باغ میں ایک جھونپڑی ڈال کر بڑے امن اور بہت سکون سے زندگی

"بادیں کر زندگی کا صحیح لطف وہیں ہے۔"
لیکن ۔۔

احمد مرزا لندن میں سیلون کی ہاؤس میں تھا اس لیے وہ ایسا کچھ نہ کر سکا۔ اس نے کاؤنٹر سے چائے اور پیسٹری لی اور پھر ایک طرف جا بیٹھا۔ پچھلے ہی مہینے وہ اپنی چھٹیاں پیرس میں گزار کر آیا تھا اور اب چھ ماہ طویل چھٹی ملنے کی کوئی امید نہ تھی اس وقت بھی اس کو غور و خوض کے لیے وقت نہ تھا وہ حسب معمول فیکٹری سے سیدھا ٹی ہاؤس آیا تھا اور یہاں سے اٹھ کر اسے ٹیوب (TUBE) کے ذریعے اپنے گھر جانا تھا جہاں اسکے گھر والی اس کی منتظر تھی کہ وہ آئے اور اپنے کو بیسویں صدی کا ترقی یافتہ ثابت کرنے کے لیے کبھی بلا مقصد ٹی وی کھول کر وقت برباد کرے تو کبھی نرم نرم گدوں میں دھنس کر ریڈیو گرام کے ذریعے مدھم سروں کو بکھیر کر نیند کی آغوش میں چلا جائے۔

اس نے چائے پی نہیں بلکہ زہر مار کی اُسے سب کچھ بہت بے کیف اور بے مزہ لگ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا یہی وہ زندگی ہے جس کے لیے ہم اپنا وطن چھوڑ کر دیوانہ وار بھاگتے ہیں۔ یہ سب کچھ کتنا پھیکا نہ لگتا ہے کتنی احمقانہ خواہش ہے کہ صرف اچھے کھانے اچھے کپڑے اور کار ٹی وی کے لیے آدمی اپنے سارے رشتے ناتے توڑ کر لندن میں آکر تارکین وطن کے حقیر زمرے میں شامل ہو کر حقیر ہو جائے۔ یہاں ہر چیز پرائی ہے حد ہے شہریت تک پرائی ہے۔ لعنت ہے اس زندگی پر۔" گھٹن نفرت اور الجھن کے ملے جلے جذبات نے اس کو گھیر لیا۔ اس بھیڑ سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنے بینک بیلنس پر نظر کی نوکری چھوڑنے پر ملنے والی رقم اور سب کچھ فروخت کر کے حاصل ہونے والی رقم کا تخمینہ کر کے طے کیا۔ "یہ تو بہت کافی رقم ہوتی ہے۔ کیوں نہ اس حقیر زندگی کو لات مار دی جائے۔ اتنی رقم میں ہندوستان میں کوئی چھوٹا موٹا کارخانہ لگ سکتا ہے۔ کتنوں کو روزگار مل سکتا ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر اپنا ملک۔ اپنے لوگ اپنے ریت رواج۔ اپنے پھر اپنے ہیں۔"

اسکے چہرے سے تفکرات کی شکنیں سمٹ کر غائب ہو گئیں اس نے عہد کر لیا اس منصوبے پر عمل کر کے کچھ کر دکھاؤں گا۔

★

حرمت الاکرام

(صـ۱۴ کا بقیہ)

دل ہے وہ نقش میر کا دیوان کہیں جسے

ہائے اس عہد بلا خیز کے انساں کا وجود
جیسے طوفان میں اڑتا ہوا تنکا تیسر

عقل سے دل نے مروت جو نبھانی چاہی
تجربے بن گئے الجھا ہوا دھاگا پیارے

ہم بھی کیا کیا نہ پشیمان ہوئے ہیں کہ حیات
خود گری بھول گئی، خود نگری بھول گئی

ٹوک بیٹھا کوئی بدبخت تو جانے کیا ہو
خواب کی بات کسی کو نہ بتائی جائے

کردار جانے کتنے فسانوں کا بن چکا
دنیا میں جی رہا ہوں اداکار کی طرح

دکھ کو ابھرنے کب دیتی ہے سینے کی گہرائی حرمت
ساگر اپنی ہی موجوں سے سر کو ٹکراتا رہتا ہے

غرض اسطرح کے اور بھی بے شمار اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں ادھر ان کی شاعری نے جب پختہ کلامی کا رنگ اپنانا شروع کیا تو دو[illegible] چل بسے۔ کسی نے سچ کہا ہے ۔

نہیں معلوم کتنے جلوہ ہائے حسن پنہاں ہوں
کوئی پہونچا نہیں گہرائیوں میں اشک پیہم کی

★

ڈاکٹر شوق کریمی علیگ
کریمی بلڈنگ، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

وہ مل گئے تو ہمیں اپنا کچھ پتہ نہ ملا
دعا تو کی تھی مگر حاصلِ دعا نہ ملا

قمار خانہ میں دو چار تو ملے لیکن
حرم میں ایک بھی ہم کو تو پارسا نہ ملا

وہ زندہ پھر بھی ہے دنیا میں غور اس پہ کرو
تمام عمر جسے کوئی آسرا نہ ملا

مزہ تو جب ہے اسے زیبِ داستاں کر لو
وہ ایک لفظ جو اب تک کہیں لکھا نہ ملا

خوشی سے ترکِ تعلق تو کیجئے لیکن
ہمارا جیسا اگر کوئی دوسرا نہ ملا

رواں دواں وہ چلا جا رہا ہے منزل پر
وہ قافلہ کہ جسے کوئی رہنما نہ ملا

ہمارا عکس ہی جس میں ہمیں نظر آتا
ہمیں تو ایسا کوئی شوق آئینہ نہ ملا

حبابؔ ہاشمی
۲۳۵ بخشی بازار، الہ آباد ۳

جنوں میں سیر تخیل میں نہ آنے والے
یہ بھی کیا بات ہوئی مجھ کو بھلانے والے

سچ تو یہ ہے کہ زمانے کو بنایا ہم نے
کیا مٹائیں گے بھلا ہم کو زمانے والے

درد کی دولتِ بیدار ملی ہے ہم کو
ہم تو ہیں ایک زمانے کو جگانے والے

زندگی نغمہ بھی ہے، رنگ بھی ہے، نور بھی ہے
داستانِ غم و آلام سنانے والے

ہم کہ ہیں شاعرِ آوارہ و آشفتہ مزاج
ہم کہاں تیری گلی لوٹ کے آنے والے

آئینہ کوئی سلامت بھی ہے اے آئینہ گر
مجھ کو ہر آن اک آئینہ دکھانے والے

میں تو خود اپنے زمانے کا ہوں منصورِ حبابؔ
قصۂ دار و رسن مجھ کو سنانے والے

نجمی لکھنوی
اکبری گیٹ، لکھنؤ

ہنسا کر مجھے خوں رلا دینے والے
یہ احساں نہیں ہیں بھلا دینے والے

نظر پھیر کر مسکرا دینے والے
یہ انداز ہیں دل دکھا دینے والے

امیدوں کا گلشن جو مہکا ہوا ہے
کرم ہے ترا مسکرا دینے والے

ادھر آ نگاہیں تجھے ڈھونڈھتی ہیں
کہاں ہے غمِ لا دوا دینے والے

تسلی سے دل مطمئن ہو گیا ہے
سلامت رہیں آسرا دینے والے

سلامت رہیں یہ خدا سے دعا ہے
چراغِ تمنا بجھا دینے والے

نگاہوں سے ہیں دور کیوں آج نجمیؔ
محبت کے نغمے سنا دینے والے

سید محمد حامد
شیعہ کالج
وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

مرزا محمد رضا برق کی غزل گوئی

مرزا محمد رضا مولانا مرزا کاظم علی ملقب بہ صالح مجتہد کے فرزند تھے۔ آپ کا تخلص برق تھا لیکن کہیں کہیں پر رضا تخلص کا بھی استعمال ملتا ہے۔ آخری تاجدار اودھ نواب واجد علی شاہ کے یہ مصاحب خاص اور استاد تھے اور ان کے دربار سے انھیں فتح الدولہ، خان بہادر اور بخشی الملک جیسے خطابات سے بھی نوازا گیا۔ ۱۲۰۵ھ مطابق ۱۷۹۰ء کے قریب یہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ انتزاع سلطنت اودھ کے بعد سلطان عالم نواب واجد علی شاہ کے ہمراہ کلکتہ گئے اور وہیں ۲۸ صفر المظفر ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء کو بحالت تپ اس دار فانی سے کوچ کیا۔

برق کا شمار شیخ امام بخش ناسخ کے ارشد تلامذہ میں کیا جاتا ہے۔ یوں تو انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن صنف غزل میں ان کا شمار اپنے دور کے ممتاز ترین شعرا اور اساتذہ فن میں کیا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں دبستان لکھنؤ کی وہ تمام خوبیاں ملتی ہیں جنکی وجہ سے اس مکتب فکر کو ایک انفرادیت حاصل تھی۔ زیر نظر مقالہ برق کی غزل گوئی سے متعلق ہے اس لیے اس میں ان کی غزل گوئی کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا جائیگا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غزل محبت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے لازمی کیفیات کی ترجمانی کا نام ہے لیکن یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ انسانی ضمیر پر اثر انداز ہونے والے حالات و کیفیات کے جملہ تاثرات اور ان تاثرات کی بہتر سے بہتر انداز میں ادائیگی کو ترقی یافتہ غزل سے بے تعلق نہیں قرار دیا جا سکتا۔

برق کے یہاں ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں جو سادگی، روانی اور حسن تخیل کے زیورات سے مزین و آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ ضرب المثل بننے کی بھی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں ؎

سر پہ آغاز میں رکھتے تھے جو تاج زریں ٹھوکریں پاؤں کی کھاتے یہ انجام ہوا
مال دنیا سے خیال نفع اے عاقل نہ کر فائدہ کیا ہے جو آئے ہاتھ دولت خواب میں

ناسخ اور آتش کا دور دبستان لکھنؤ کا بہترین دور تصور کیا جاتا ہے اور اس دور کی اہم ترین خصوصیات میں سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں لفظوں کے نئے نئے تلازموں کی مدد سے تشبیہات، استعارات کے نئے نئے پیکر ڈھالے گئے کہنہ الفاظ کو لباس نو سے آراستہ کر کے اس دور کے مروجہ مقبول اور پسندیدہ زیورات تخیل سے سجا کر اس طرح پیش کیا گیا کہ لوگ ماضی کو بھول کر اس نئے انداز کو کلام کا حسن سمجھنے لگے۔ برق کے کلام میں بھی ہمیں تشبیہ مرکب، تشبیہ مفرد، تشبیہ مفرد و مرکب اور استعارہ اپنے شاعرانہ کمال کے ساتھ ملتے ہیں۔

لکھنؤ کے شعراء کے کلام میں تصوف کا فقدان ملتا ہے۔ اس فقدان کا اصل سبب عقیدہ تصوف سے نامماثلت ہی ہو سکتا ہے۔ ناسخ کا کلام تو تصوف سے بالکل خالی ہے اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کا کلام ان عناصر سے بھی خالی ہے جنھوں نے فارسی اور اردو کی غزلیہ شاعری میں ماورائیت اور اخلاقیات کا احاطہ کیا۔ لکھنؤ کے معاشرے میں چونکہ خارجیت کا بول بالا تھا اس لیے یہاں تصوف کے پنپنے کے امکانات بالکل نہ تھے۔ ناسخ کے یہاں تصوف تو نہیں ہے لیکن رعایت لفظی کی کرشمہ سازی سے ایک ایسا انداز پیدا کیا گیا ہے جس کی ظاہری صورت تصوف کی تصویر سے ملتی جلتی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں ؎

بحر وحدت میں ہوں میں گو سر گیا مثل حباب چوب کیا، تلوار سے پانی جدا ہوتا نہیں

برق کے کلام میں بھی ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن میں عقیدہ کی ناماثلت

کے باوجود تصوف کی تصویر نہایت دلکش اور پُراثر انداز میں نمایاں نظر آتی ہے مثلاً وہ کہتے ہیں ؎

مثالِ روح نہاں ہے میں کس طرح دیکھوں　　وصال میں بھی مجھے وہ نظر نہیں آتا

ناسخ اور آتش کے دور میں ایک رنگ اور بھی نمایاں تھا اور وہ تھا خارجیت کا. خارجیت کے دو انداز دکھائی دیتے ہیں. ایک تو وہ انداز ہے جو جراُت یا ان کے ہم خیال شعراء نے پیش کیا ہے اور جسے ہم معاملہ بندی سے تعبیر کر سکتے ہیں دوسرا وہ جس میں سامانِ آرائش، لباس کے اجزا، رنگ، پیراہن، پان کا رنگ، مسّی اور کاجل، سرمہ اور مہندی وغیرہ کا تذکرہ ملتا ہے لیکن وہ معاملہ بندی سے بالکل الگ ہے. برق کے کلام میں بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں خارجیت پائی جاتی ہے. اس سلسلہ میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ برق نے جس طرح خارجی عناصر کا تذکرہ کیا ہے اس میں ایک تنوع اور ندرت ہے. انھوں نے اپنے اشعار میں ابتذال سے بچتے ہوئے جو انداز اختیار کیا ہے وہ یقیناً قابلِ ستائش اور لائقِ تحسین ہے. ان کی فنکارانہ مہارت اور استادانہ طرزِ ادا کا اندازہ ان چند اشعار سے لگایا جا سکتا ہے جو ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں ؎

کیا نہ سنا نہ آیتِ ابرو کی شان میں　　مطلب مگر نہ حل کسی تفسیر سے ہوا

تا عمر ابروؤں پہ رہا گوشۂ نقاب　　دم بھر جدا غلاف نہ شمشیر سے ہوا

غنچۂ تبسّم دہن کو میں سمجھا　　گل کا عارض یہ احتمال رہا

برق کے کلام میں مضامینِ تازہ کی جلوہ گری بھی بدرجۂ اتم موجود ہے. یہ مضامینِ تازہ ہی کی تلاش کا نتیجہ تھا کہ مشکل سے مشکل زمینوں کو سرسبز کیا جانے لگا. سخت سے سخت قوافی پر کوششیں ہونے لگیں اور پھر انھیں کوششوں کی مدد سے بڑے بڑے کرشمے دکھائے جانے لگے. حقیقت یہ ہے کہ انھیں کرشمہ سازیوں نے لکھنؤ کی شاعری کو دلی جذبات کی عکاسی کے بجائے الفاظ کی شعبدہ گری بنا کر رکھ دیا. برق کے کلام میں بھی رعایتِ لفظی کے عجائبات اور تلاشِ مضامینِ نو کے سلسلے میں الفاظ کی کرشمہ سازیوں کے دفتر کے دفتر موجود ہیں. مثلاً وہ کہتے ہیں .

کہکشاں ہے مانگ تیرے خال پیشانی افق
ماہِ نو ابرو ہیں روئے صاف دلبر آفتاب

فانوس ہیں کہ پائینچے ہیں شمع ہے کہ ساق
خلخال ہے کہ حلقۂ زنجیرِ پائے شمع

برق کے کلام میں الفاظ کے متناسب امتزاج کے ذریعہ خیالات کو پیش کرنے کا وہ انداز جسے ناسخ اسکول کا ایک خاص اور منفرد رنگ مانا جاتا ہے بدرجۂ اتم موجود ہے. خیال آفرینی کی اس ورزش کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ اس میں کبھی تو الفاظ کی سجاوٹ کی وجہ سے دلکشی اور دلفریبی کا رنگ بے طرح جھلک اٹھتا ہے تشبیہ اور استعارے کی مدد سے کوئی ایسا پہلو نمایاں ہو جاتا ہے جس میں کاوش کی سنگینی پر تعبیراتی انداز کی سنگینی غالب آ جاتی ہے اور اس سے دلچسپ اور پُرفریب صورت نظروں کے سامنے آ جاتی ہے اور جو ذہنِ انسانی کو اس طرح مسحور کر دیتی ہے کہ سننے والا ایک لمحہ کے لیے تو واہ کہنے پر آمادہ ہو ہی جاتا ہے اس سلسلے میں برق کا یہ شعر دیکھیے ؎

شوخیِ رنگِ گلِ رخسار اس پر ختم ہے
عکس سے لعلِ یمن ہیرے کا بندہ ہو گیا

کس قدر متاثر کن انداز ہے کہ انسان تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا. محبوب کے حسن اور شوخی کے بیان کرنے کے لیے جو اندازِ تخیل اختیار کیا گیا ہے. اس میں کشش و جاذبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے . اس طرح کے اور بھی بہت سے اشعار برق کے یہاں موجود ہیں جن میں الفاظ کی ترتیب اس طرح دی گئی ہے کہ پڑھنے والا ایک حیرت خیز حسرت کے احساس سے دو چار ہو جاتا ہے مثلاً ایک مقام پر وہ کہتے ہیں ؎

اٹھا کے آئینہ دکھلا دیا اسے میں نے
نہ سوجھی عارضِ گلگوں کی جب مثال مجھے

برق کے کلام میں فلسفۂ حیات، فلسفۂ اخلاقیات اور دیگر فلسفیانہ مسائل کی عکاسی بھی ملتی ہے. اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری میں فلسفیانہ خیالات کو پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں. اس سلسلے میں شاعر کے لیے وسعتِ نظر بہت ضروری ہے کیونکہ یہ کمال کسی شاعر میں اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی نظر طبیعیات و مابعد الطبیعیات دونوں پر نہ ہو. برق کے یہاں بھی طبیعیاتی اور مابعد الطبیعیاتی حقائق کی نقاب کشائی کی کافی مثالیں ملتی ہیں. مثلاً وہ کہتے ہیں ؎

اہلِ جوہر پاتے ہیں دنیا میں جوہر سے فروغ
آئینہ بنتا ہے اکثر خلق میں فولاد کا

برق کا یہ شعر حسنِ تعلیل پر مشتمل ہونے کے ساتھ ساتھ اس حقیقت

پسند وشنی ڈال رہا ہے کہ کوئی چیز آغاز میں کتنی ہی حقیر اور پست کیوں نہ ہو لیکن وہ ارتقا کی بلند منزل تک پہنچ سکتی ہے بشرطیکہ اس کے اندر جوہر صلاحیت واستعداد ہو۔ اس طرح ایک اور شعر ہے، جس میں وہ کہتے ہیں ؎

مالِ دنیا سے خیالِ نفع اے عاقل نہ کر
فائدہ کیا ہے جو آئے ہاتھ دولت خواب میں

یہ شعر بھی فلسفیانہ موشگافی سے پُر ہے جس میں اس حقیقت کی ترجمانی کی گئی ہے کہ دنیا کی زندگی کی حیثیت خواب سے زیادہ نہیں اگر دنیا میں انسان کو دولت مل جائے تو اس پر مغرور نہ ہونا چاہئے کیونکہ خواب میں ملنے والی دولت بے حقیقت ہوا کرتی ہے۔

برق نے اپنے اشعار میں لکھنؤ اسکول کی خصوصیات کے ساتھ فلسفیانہ مسائل کو بڑی جسن وخوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے فلسفہ حیات وموت فلسفہ ذرہ، فلسفہ اخلاق اور فلسفہ محبت بڑے ہی دلکش اور پر اثر انداز میں پیش کیا جسکی مثال ان کے معاصرین کے یہاں کم ہی نظر آتی ہے۔

برق کے کلام میں لکھنویت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی دکھائی دیتی ہے ان کے کلام میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن میں یہاں کی خوش حالی فارغ البالی اور عیش وعشرت کی مکمل عکاسی کی گئی ہے۔

برق کے یہاں صنائع لفظی ومعنوی کی بھی بے شمار مثالیں ملتی ہیں ان کے کلام میں صنعت مراۃ النظیر، صنعت تضاد، صنعت ایہام لف ونشر مبالغہ اور تلمیح کی بڑی اچھی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ مبالغہ کے سلسلے میں یہ شعر ملاحظہ ہو۔

نالے بلند ہوں تو کہیں اہل آسماں
مینار ہیں یہ مسجد اقصا کے سامنے

برق کی غزلیات میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں قصوں اور واقعات کی طرف بڑے دلچسپ اشارے کئے گئے ہیں۔ یہ اشعار تلمیح کے انوکھے نمونے اس لیے کہے جا سکتے ہیں کہ ان میں لکھنوی انداز بہت نمایاں ہے مثلاً وہ کہتے ہیں ؎

جس نے دیکھا میرے یوسف کو خریدار ہوا
چوک میں وہ جو گیا مصر کا بازار ہوا

پتھرے چوٹ پھول کی افزوں ہے عشق میں
شیریں کی تلخ بات قضا کوہکن کی ہے

برق کے کلام میں ایہام کی بھی بڑی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ انھوں نے ذو معنی الفاظ کے استعمال کے سلسلے میں ندرتِ تخیل کا بڑا دلکش مظاہرہ کیا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں ؎

دوری سے مضطرب دلِ فرقت نصیب ہے
لیجے خبر کہ وقت ہمارا قریب ہے

دیکھ کر رخسارِ تاباں کو رخِ عاشق کر گئے
دھوکے دیتی ہے مسافر کو سفر میں چاندنی

صنعت مراۃ النظیر اور استعارے کا امتزاج مندرجہ ذیل شعر میں ملاحظہ ہو ؎

اے سرو تیرے آنے سے کیا باغ باغ ہوں
گل ہو گیا ہے پھول چراغِ مزار کا

یہاں سرو سے مراد راست قد اور نازک اندام محبوب ہے جو استعارے کی مثال ہے اور باغ کی مناسبت سے سرو، گل اور پھول کا استعمال ہوا ہے جو مراۃ النظیر کی مثال ہے۔ مختصر یہ ہے کہ برق ترقی یافتہ تغزل کے دور کی پیداوار تھے اور انھوں نے اپنے پیش رو شعرا کے افکار وخیالات سے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ ادب میں گرانقدر اضافہ بھی کیا لیکن انتہائی افسوس کی بات ہے کہ برق جیسے شاعر کو اردو کے اکابر غزل گو شعرا میں ابتک جگہ نہیں دی گئی جبکہ اپنی امتیازی خصوصیات کی بنا پر وہ اس کے قطعی طور پر مستحق تھے۔

★

غزل

احتشام مرزا تنہا
۲۴۹/۹۶ اصطبل یحییٰ گنج لکھنؤ

ستم اور نہ کوئی جفا یاد آئی
صنم تری قاتل ادا یاد آئی

کبھی تم نے اپنے جو بکھرائے گیسو
زمانے کو کالی گھٹا یاد آئی

کیا تذکرہ جب تمنا کا اپنی
کسی بے خطا کی سزا یاد آئی

لیے تھے وہ نظروں میں اشکِ ندامت
انھیں میری شاید وفا یاد آئی

سکندر علی خاں
ایم۔ ایل۔ اے
تلہر، شاہجہاں پور

شاہراہِ ترقی پر

اترپردیش کے بڑھتے قدم

وزیراعظم کے بیس نکاتی پروگرام کے تحت کم سے کم دس نکات میں سو فیصد کامیابی ہماری ریاست کی کارکردگی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ انتظامیہ کی بہتر صلاحیت کی بنا پر جرائم پیشہ میں کمی اور امن وامان میں کافی سدھار دیکھنے میں آیا۔ سماج دشمن عناصر پر کڑی نظر رکھنے کے سبب کمزور طبقوں میں اطمینان کی صورت پیدا ہوئی۔ ریاست میں مرکزی زمرہ کے گیس پر مبنی کیمیاوی کھاد کے چار کارخانوں کے علاوہ دیگر کارخانے قائم کرنے کی منظوری حاصل کی گئی۔ ۷۲۶۸ دیہی صنعتی واحدے قائم کیے گئے جن سے ۶۵۰۰ سے زیادہ افراد کو روزگار حاصل ہوا۔ اسی سال ہمارے صوبہ نے قومی زرعی دیہی ترقیاتی بینک سے توسیع زراعت کے لیے ایک ارب چار کروڑ روپیہ حاصل کر کے اس سلسلے میں ملک کے تمام صوبوں میں پہلا مقام حاصل کیا ہے۔ "انسیٹ" پراجکٹ کے تحت ریاست کے چار اضلاع گورکھپور، بستی، اعظم گڑھ، دیوریا کے دور دراز علاقے تعلیمی نشریات سے مستفید ہو سکیں گے۔ پندرہ دن کی تنخواہ کے برابر بونس بھی ریاستی ملازمین کے لیے اس سال کا تحفہ ہے۔

گزشتہ برسوں کے دوران تباہ کن بارش سے دھان کی فصلوں کو کافی نقصان پہنچا بہر نوع اب کے ۶۸ لاکھ ٹن چاول پیدا ہوا جو پہلے سے تقریباً ۱۲ لاکھ ٹن زیادہ ہے۔ اس سال خریف و ربیع کی فصلوں پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے جس سے قوی امید ہے کہ پیداوار میں کافی اضافہ ہوگا۔ ویسے گیہوں بھی پہلے کے مقابلہ میں اس سال ۲۵،۳۷ لاکھ ٹن زیادہ حاصل ہوا۔ چنے کی پیداوار کا نشانہ سال رواں میں ۱۵ لاکھ ٹن رکھا گیا تھا۔ گزشتہ سال ۱۳،۹ لاکھ ٹن چنا پیدا ہوا تھا۔ ۱۹۸۲-۸۳ میں اناج کی مجموعی پیداوار ۲۶۳،۵۲ لاکھ ٹن تھی اس بار کا نشانہ ۲۷۴ لاکھ ٹن ہے۔ کاشتکاروں کو قرض دینے کے لیے بھی کافی رقم بجٹ میں مختص کی گئی ہے۔ زراعت کے سلسلے میں آب پاشی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے وزیراعظم نے بھی اپنے بیس نکات میں اسے خصوصی اہمیت دی ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ملک میں اترپردیش ہی ایسی ریاست ہے جس نے محدود وسائل کے باوجود مقررہ نشانہ حاصل کر لیا ہے۔ سال رواں کے دوران اکتوبر تک آب پاشی صلاحیت میں اضافہ کرنے کی غرض سے ۱۰۵،۴۳ کروڑ روپیہ صرف کیا گیا اور ۲۳،۹۶ ہزار ہیکٹر آبپاشی صلاحیت سرکاری چھوٹے آبپاشی کاموں کے تحت پیدا کی گئی۔ ٹیوب ویلوں کی تعداد اب بڑھ کر ۱۹۶۷۱ ہو گئی ہے۔ عالمی بینک کی مدد سے دوسرے مرحلہ میں ۲۲۰۰ نئے ٹیوب ویل لگائے جائیں گے جس میں ۱۲۰۰ اسی سال لگیں گے ظاہر ہے اس سے کسان بھائیوں کو کافی فائدہ پہنچے گا۔ گنا کاشتکاروں کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکومت نے شکر ملوں سے وہی قیمت مقرر کروائی جو گزشتہ دو تین برسوں سے دی جا رہی تھی۔ گزشتہ سیزن میں سیتاپور کی محمود آباد امداد باہمی مل نے پیرائی شروع کر دی ہے۔ اس سال مرادآباد میں گجرولہ امداد باہمی مل نے بھی کام شروع کر دیا ہے۔ اسطرح ریاست میں امداد باہمی مرہ کی بیس ملیں ہو گئی ہیں جلد ہی دیگر مقامات پر بھی مزید ملیں قائم کی جائیں گی۔

زراعت کی اہمیت کے ساتھ ساتھ صنعتی ماحول بہتر بنانے پر

بھی حکومت کی توجہ ہے۔ یہ دور بھی صنعتی دور ہے لہٰذا صنعت کے سلسلے میں پیش رفت گویا پورے ملک کے وقار کا مسئلہ ہے مجموعی طور پر درمیانی درجہ کی صنعتوں کے تحت اس سال ۱۴۸ صنعتوں کا رجسٹریشن کیا گیا اور ۵۰ لائسنسوں پر عمل درآمد کیا گیا جس میں ۹۴ کروڑ روپیہ کی سرمایہ کاری ہوئی اور سات ہزار افراد کو روزگار فراہم ہوا۔ اترپردیش مالیاتی کارپوریشن نے ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت ۱۵ کروڑ ۱۲۱ لاکھ ۱۰ ہزار روپیہ اور پک اپ نے سات کروڑ آٹھ لاکھ ۲۰ ہزار روپیہ بطور قرض تقسیم کیا۔ اسی طرح ہینڈلوم کے زمرہ میں ۲۶۰۰ افراد کو تربیت دی گئی نیز ۲۶۰۳ ہتھ کرگھوں کو امداد باہمی زمرہ میں شامل کیا گیا۔ زیر نظر مدت میں تقریباً ۲۵ کروڑ ۷۷ لاکھ ہینڈلوم کپڑا تیار کیا گیا۔ دستکاری واحدوں کو بھی امداد سے نوازا گیا جن کی تعداد ۲۵۹۵۲ ہے اور ۷۲۶۸ چھوٹے اور دیہی صنعتی واحدے قائم کیے گئے جس کے نتیجہ میں ۴۷۱۵۶ لوگوں کو جینے کا سہارا ملا۔ مربوط دیہی ترقی اسکیم اور ٹرائی سم اسکیم کے تحت بھی بڑے پیمانے پر صنعتیں قائم کی گئیں۔ چرما کارپوریشن نے بھی ۳۲۵۵ افراد کو امداد مہیا کی۔

وزیراعظم نے یوم آزادی کے موقع پر تعلیم یافتہ بے روزگاروں کے لیے ایک حوصلہ افزا اعلان کیا تھا جس کے تحت ریاست کے ۲۷۰۰۰ افراد کو روزگار دلانے کا نشانہ ہے۔ مغربی جرمنی کے اشتراک سے لکھنؤ میں قائم ٹول روم تربیتی ادارہ نے کام شروع کر دیا ہے اس کے علاوہ مرادآباد میں نان فیرس رولنگ مل بھی کام کرنے لگی ہے وارانسی میں سلک پراجکٹ پر کام شروع ہونے کے ساتھ مبارکپور میں بھی ایک مرکز کام کرنے لگا ہے۔ بجلی کی فراہمی ایک بڑا مسئلہ ہے حکومت پوری طرح اس پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مالیاتی سال رواں کے آخر تک حرارتی بجلی میں ۱۱۰ میگاواٹ اور آبی بجلی کی فراہمی میں ۱۵۰ میگاواٹ کا اضافہ متوقع ہے۔ اوبرا بجلی گھر میں آتشزدگی کے سبب جو کٹوتی کی گئی تھی وہ ختم کر دی گئی ہے۔ جنوری سے ستمبر کے آخر تک کاروباری بینکوں کی ۲۰۹ شاخیں کھولی گئیں اب ان کی تعداد بڑھ کر ۴۵۹۰ ہو گئی ہے۔ ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران مختلف کاریگروں کو ادارہ جاتی مالیات کی طرف سے ۱۱۴ کروڑ روپیہ کی امداد مہیا کرنے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔

صارفین کی ضروریات کے پیش نظر یکم جنوری ۱۹۸۴ء سے رہائشی مکانات کی مرمت کے لیے ملنے والی لیوی سیمنٹ کی مقدار بڑھا کر دس بوری کر دی گئی ہے۔ راشن کارڈ پر ۵ لیٹر تک مٹی کا تیل مہیا کیا جاتا ہے۔ اس وقت ریاست کے لیے مٹی کے تیل کا کوٹہ ۰۰۰۰۰ کلو لیٹر ہے جسے بڑھا کر ۷۵۰۰۰ کلو لیٹر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ نومبر تک کنٹرول کپڑے کی ۱۹۱۴۲۳۳ گانٹھیں تقسیم کی گئیں کوشش کی جا رہی ہے کہ حکومت ہند سے عمدہ قسم کا پالسٹر کپڑا بھی منگوا کر تقسیم کیا جائے۔ حکومت اترپردیش کے قبضہ میں آئی فاضل زمین کو کمزور طبقوں میں تقسیم کیا گیا جس سے ۲۰۰۲۹۲ افراد مستفید ہوئے۔ سال ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۹۸ لاکھ روپیہ کی مالی امداد الاٹیوں کو دینے کا نشانہ رکھا گیا جس کے مقابلہ میں ۲۴۰۳ لاکھ روپیہ ۴۴۵۷ الاٹیوں میں نومبر تک تقسیم کیا گیا۔

حکومت اترپردیش بیس نکاتی پروگرام پر پوری مستعدی سے عمل درآمد کر رہی ہے اس میں اب دو رائیں نہیں کہ بیس نکات کی تکمیل کے ذریعہ ہی ہمیں خوشحالی کی منزل ملے گی۔ خشک زمین کو قابل کاشت بنانے۔ پیداوار میں اضافہ محکمہ دیہی ترقی کی جانب سے ہریجن بستیوں میں پینے کے پانی کے بندوبست۔ رہائشی قطعات کے الاٹمنٹ۔ حاملہ عورتوں اور چھ برس سے کم عمر کے بچوں کو قوت بخش غذا۔ مناسب قیمت کی گشتی دکانوں کے قیام وغیرہ میں سو فیصد کامیابی حاصل ہونا انتظامیہ کی کارکردگی کا روشن ثبوت ہے سال ۱۹۸۳ء میں ۲۰۰۱ کلومیٹر نئی سڑکوں اور ۵۵ پلوں کی تعمیر مکمل ہوئی مزید برآں ۱۱۵۴ کلومیٹر موجودہ سڑکوں کی نو تعمیر کی گئی۔ لکھنؤ کی رنگ روڈ بھی ایک کروڑ کی لاگت سے بن گئی ہے۔

تعلیم کی توسیع پر بھی خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ پرائمری سطح پر ۳۰۰ افراد کی آبادی والی بستیوں میں ۱.۵ کلومیٹر کے دائرے میں اور مڈل سطح پر ۸۰۰ افراد کی آبادی والی بستیوں میں تین کلومیٹر کے دائرے میں اسکول کی سہولت فراہم کرنے کی غرض سے ۳۲۸ پرائمری اور ۸۰۷ مڈل اسکول کھولنے کی تجویز ہے ہر ضلع کے چھ ترقیاتی

بلاکوں میں ۵۰ پرائمری اور ۲۰ مڈل سطح کے غیر رسمی تعلیمی مرکز قائم کیے گئے ہیں۔ جن میں ۲۵۰۰ ۲۵ بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ ان کو اُن ایڈ مادہ یا پیشہ ورانہ تعلیم بھی حسب ضرورت قائم کرنے کی اسکیمیں چلائی گئی ہیں۔ سال ۸۳-۱۹۸۲ء کے دوران ۱۲۲۹۷ تعلیم بالغان مرکزوں میں ایک لاکھ ۴۳ ہزار افراد کا رجسٹریشن کیا گیا۔ اس کے علاوہ ۱۹۸۳-۱۹۸۴ء میں ۱۸۳۰۰ مرکزوں کے توسط سے ۵۵۳۰۰۰ افراد کو خواندہ بنانے کا ہدف تھا۔ سنہ ۱۹۸۳ء ہی میں ہر بے زمین خاندان کے کم سے کم ایک فرد کو ۱۰۰ دن کا روزگار فراہم کیا گیا جنگلاتی اشیاء کے فروغ کے لیے بھی خصوصیت سے منصوبے بنائے گئے ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں ایک نیا صنعتی ماحول تیار ہوا ہے۔ ایچ۔ ایم۔ ٹی، بی۔ ایچ۔ ای۔ ایل، ہندستان فوٹو فلمس، الکٹرانکس کارپوریشن آف انڈیا اپنے صنعتی کارخانے قائم کر رہے ہیں۔ کوٹ دوار میں فلش ڈور فیکٹری تیار ہو گئی ہے۔ امن و قانون کی صورت حال میں بھی کافی بہتری آئی ہے۔ جرائم ڈاکوؤں کے گروہ ہونے سے ۱۹۰۶ مڈبھیڑ ہوئیں جن میں ۵۰۸ ڈاکو موقع پر ہلاک ہو گئے اور ۵۴۲۳ ڈاکو گرفتار کیے گئے انھیں ۱۳ لاکھ روپیہ میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ کی ناجائز شراب برآمد کی گئی۔ غازی پور میں تقریباً ایک کروڑ روپیہ کی نشہ آور اشیاء اور دیوریا میں ساڑھے چار لاکھ روپیہ کا گانجہ برآمد کیا گیا۔ فرقہ وارانہ صورت حال سے نپٹنے کے لیے "خفیہ سیل" قائم کیا گیا جو ڈی۔ آئی۔ جی پولیس کی قیادت میں کام کر رہا ہے۔ کمزور طبقوں کی سہولت کے لیے قلیل مدتی قرضہ کی شرح سود ساڑھے گیارہ فی صد کر دی گئی ہے۔ امداد باہمی زمرہ میں چار مزید کولڈ اسٹوریج تعمیر ہو جانے سے ان کی مجموعی تعداد ۱۱۵ ہو گئی ہے۔ جلد وانی میں سولیمن پلانٹ اور بناسپتی کا پلانٹ بھی لگ رہا ہے۔

★

ہندستان میں قومی یک جہتی ——— (ص ۳۲ کا بقیہ)

انسان اور اس کے خدا کے درمیان ایک ذاتی معاملہ ہے۔ اگر قومیت کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ ہندستانی پہلے اور ہندستانی آخر میں ہیں وہ چاہے کسی مذہب کو مانتے ہوں۔"

منڈو نانی ——— (ص ۳۶ کا بقیہ)

دو پہر ٹھیک سے اوڑھ لو حاجی میاں آ رہے ہیں۔"

ایک بات عجیب تھی نانی کو غصہ کبھی نہیں آتا تھا کبھی کوئی بی بی ان پر غصہ کرتیں تو فوراً ہنس کر کہتیں "بھو بی بی کے کنوئیں کا پانی پی لو بی بی غصہ نہیں آئے گا۔ میں نے تو اسی کنوئیں کا پانی خوب پیا ہے چاہے کتنا ہی بولو مجھے غصہ نہ آنے کا۔" تو بہ ہے "کہہ کر وہ بی بی چپ ہو جاتیں یا مسکرا دیتیں۔

منڈو نانی نہ صرف بڑی دل آویز شخصیت کی مالک تھیں بلکہ فرشتہ صفت بھی تھیں۔ سب کے دکھ سکھ میں شریک سب کے کام آتا اور سب سے خاص بات یہ کہ بڑی ایماندار اور بڑی اعتبار ہستی تھیں یہی وجہ بھی کہ ان کی پہنچ ہر محل ہر جگہ ہر کمرہ اور کوٹھاروں تک تھی انھیں حویلی کے مکینوں کے راز تو معلوم ہی تھے [illegible] زیور روپیہ پیسہ کے راز سے بھی واقف تھیں۔ کس بی بی نے کتنا بچا بچا کر چھپا رکھا ہے کس کے پاس کتنا زیور ہے لیکن کیا مجال جو ان کی زبان سے کسی غیر جگہ کوئی لفظ بھی نکل جائے۔ اسی لیے وہ سب کی راز دار تھیں اور سب کے رازوں کی امین بھی۔ اب ایسی ہستیاں صرف ہماری تہذیبی اور معاشرتی تاریخ کا حصہ بن کر رہ گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے (آمین)

★

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب : وہ سب باتیں
مصنف : ڈاکٹر بشیشر پردیپ
قیمت : بیس روپے
ملنے کا پتہ : نصرت پبلشرز حیدری مارکٹ نزد گلمرگ ہوٹل امین آباد لکھنؤ

زیر نظر کتاب ڈاکٹر بشیشر پردیپ کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے پانچویں دہائی کی ابتدا سے بشیشر پردیپ افسانہ نگاری کی شاہراہ پر محو سفر ہیں ـــ آگے کی جانب ـــ کبھی آہستہ اور کبھی تیز ـــ سفر مدام سفر کے قائل بشیشر پردیپ درخشاں منزلوں کی جانب سبک گامی سے گامزن ہیں اس مجموعہ میں شامل افسانوں میں بھی، اپنے سابقہ افسانوں کی طرح، بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی موثر ڈھنگ سے وہ زندگی کی المناکیوں محرومیوں، مسرتوں اور لطافتوں کا احاطہ کرتے نظر آتے ہیں۔ بشیشر پردیپ کے افسانوں کا اسلوب رواں دواں اور واضح ہے۔ زندگی اور وہ بھی عصری زندگی کے پیچ و پیچ مسائل و مصائب، نفسیاتی الجھنیں اور سماجی بحران کو وہ بڑی فنکاری اور مہارت سے اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔

زیر نظر افسانوی مجموعہ کے بیشتر افسانوں کا محور بھی انسان اور اس کے اندر کی پھیلی ہوئی وہ بھی گہرائی لیے ہوئے نگاتی ہوئی دنیا ہے۔ تلخ و شیریں حقائق سے بھرپور بشیشر پردیپ کے دیگر افسانوں کی طرح اس مجموعے میں شامل افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی اس حقیقت کا احساس بڑی شدت سے ہوتا ہے کہ انسانی نفسیات پر بلا تفریق سن و جنس افسانہ نگار کی گرفت کافی مضبوط ہے۔ تقریباً ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد کی زندگیوں کا اس نے بڑی عمیق نظر سے مشاہدہ کیا ہے۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دکھوں اور مسرتوں میں برابر کا شریک بھی ہے۔ مثال کے طور پر اس مجموعے کے افسانے پیار و چاہ میں ایک نیپالی لڑکے کا کردار افسانہ نگار نے کیسے فطری اور موثر طریقے پر پیش کیا ہے:

"یہ سن کر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ تو یہ بس اس کے گاؤں کے پاس سے نہیں گزرے گی ـــ ؟! وہ ماں سے نہیں مل سکے گا ـــ ؟! ماں جو اس وقت ہر روز اس کی بس دیکھنے آتی ہو گی! آج بھی آئی ہوگی! کل بھی آئے گی ـــ نہ جانے کتنے دن آتی رہے گی ـــ ؟! اس کا باپ بھی بھیرواکے بس اڈے پر پتہ کرتا ہوگا! وہ نہ ماں سے مل سکے گا، نہ باپ سے ـــ ماں سے ملنے کے لیے تو وہ بہت بے قرار تھا ـــ اب ماں سے کب ملے گا ـــ ؟ کیسے ملے گا ـــ ؟ ـــ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے"

آج جب، خارجی دنیا کے مسائل و مصائب سے افسانہ نگاروں کے ایک طبقے نے ناطہ توڑ لیا ہے بشیشر پردیپ اور اس قبیل کے دوسرے افسانہ نگار فن اور زندگی کے ازلی رشتوں کو اور زیادہ مضبوط کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسے تمام افسانہ نگار مبارکباد کے مستحق ہیں!

مجموعی طور پر یہ افسانوی مجموعہ ہر اعتبار سے ایک کامیاب تخلیقی پیش کش ہے۔ سرورق بھی دیدہ زیب ہے، قیمت بھی معقول ہے کتابت اور طباعت اچھی نہیں ہے۔

ـــــــ جعفر عسکری

"کشکول"

نام کتاب : "کشکول"
مصنف : کمال احمد
قیمت : پندرہ روپے
ناشر : شاداب کتاب گھر کلکتہ

اردو میں آج تک ڈرامہ کی روایت قائم نہ ہو سکی۔ اس کے بہت سے وجوہ ہیں۔ اول اردو کے نصاب میں جو ڈرامے شامل ہیں

ان کو پڑھانے والے بیشتر اساتذہ اسٹیج کے اصول سے ناواقف ہوتے ہیں۔ دوم اردو کا ڈرامہ نگار بھی اسٹیج کے اصولوں سے کماحقہ واقف نہیں ہوتا۔ سوم اردو کا تنقید نگار بھی ڈرامہ کو ادبی حیثیت سے دیکھتا تو ہو سکتا ہے وہ خود اسٹیج کے مسائل میں الجھنا نہیں چاہتا۔ بہرکیف ان تمام کمزوریوں اور مجبوریوں کے باوجود اردو ڈرامہ سست رفتاری سے سہی آگے بڑھ رہا ہے۔ اردو میں طبع زاد ڈرامے بہرحال لکھے جا رہے ہیں اور اسٹیج بھی ہو رہے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب احمد کمال صاحب کے چار مختصر ڈراموں کا مجموعہ ہے۔

پہلا ڈرامہ "بکشکول" ہے جو ایک مال دار تاجر اور اس کے نالائق بیٹے کی کہانی ہے۔ سیٹھ دھرم چند بسترِ مرگ پر ہے۔ وہ اپنی دولت اپنے نالائق بیٹے کو دینا نہیں چاہتا۔ اس ڈرامے کے مرکزی کردار دھرم چند اور دوسرے غیر فطری ہیں۔ کوئی بھی نالائق سے نالائق لڑکا جلنے بات کی مدد سے بیٹھا ہو یہ ہرگز نہیں کہے گا

"ارے پتا جی آپ ابھی زندہ ہیں مرتے نہیں ــ
مگر کیوں؟ آپ مرکیوں نہیں جاتے کب تک مجھے یونہی
تڑپاتے رہیں گے۔ پچھلے چھ ماہ سے آپ موت سے ...
آخر یہ آنکھ مچولی کب ختم ہوگی۔ لگتا ہے آپ کی موت ... سکے
اتنظار میں گھٹ گھٹ کر میں ہی مر جاؤں گا۔ وغیرہ۔ وغیرہ
(کشکول صفحہ ۹)

دوسرا ڈرامہ "مسیحا" ہے یہ ایک نواب کی کہانی ہے۔ نواب مرزا سکندر علی کے پاس سوائے پرانی قدروں کے اب اور کچھ نہیں بچا ہے۔ ڈرامہ کا پلاٹ گھسا پٹا ہے کرداروں کی نفسیاتی پکڑ ڈھیلی ہے۔ MELO DRAMA بہت ہے اور NARATION کی وجہ سے ڈرامہ کا کوئی گراف نہیں بنتا۔

تیسرا ڈرامہ۔ "مرض بڑھتا گیا" ہے اس کی کہانی ایک حکیم کے گرد گھومتی ہے ایٹمی تجربات سے پیدا ہونے والی مہلک بیماریوں پر اچھا طنز ہے مزاح بھی ابھر کر آتا ہے۔ ڈرامہ میں شروع سے آخر تک روانی ہے یہ ڈرامہ بہرحال اسٹیج پر کامیاب ہو سکتا ہے۔

چوتھا ڈرامہ "اور پھر بیان اپنا" بیویوں کے ظلم و ستم سہنے والے دو شوہروں کی کہانی ہے۔ مصنف کا کہنا ہے۔

"یقین جانیے میں اپنے ہر ڈرامے میں خود کو EXPOSE
کرتا ہوں میرے ڈراموں کے تمام کردار میری شخصیت کے
مختلف روپ ہیں۔" (کشکول صفحہ ۴)

ممکن ہے کہ یہ ڈرامہ مصنف کا اپنا بیان ہو! یہ ڈرامہ بھی بہرحال اسٹیج کے قابل ہے

امجد علی خاں ــــــــ

اپنی بات

(ص ۱ کا بقیہ)

ادھر کئی مہینوں سے نیا دور کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہو رہی ہے جس کے لیے ادارہ اپنے قارئین سے انتہائی معذرت خواہ ہے۔ فراق نمبر حصہ دوم کے لیے متعدد بار اعلان کیا جا چکا ہے لیکن چونکہ نیا دور کی اشاعت معمول پر لانے میں ابھی دو تین ماہ لگ جائیں گے اس لیے فراق نمبر حصہ دوم اب مئی۔ جون۔ جولائی کے مشترکہ شمارے کے طور پر شائع ہوگا۔ اس خصوصی نمبر کے لیے مواد اکٹھا کر لیا گیا ہے اور کتابت بھی شروع ہو گئی ہے۔ امید ہے یہ نمبر جولائی میں منظرِ عام پر آ جائے گا۔

اس خصوصی نمبر کو بھی زیادہ سے زیادہ وقیع اور معیاری بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ چنانچہ امید ہے کہ یہ نمبر فراق نمبر حصہ اول سے کمتر نہ ہوگا بلکہ مواد کے اعتبار سے قدرے بہتر ہوگا کیونکہ اس بار ہمیں پاکستان کے متعدد ادیبوں اور شاعروں کی گرانقدر تخلیقات بھی موصول ہو چکی ہیں۔

ادارہ ــــــــ

Vol. 38 No. 11
FEBRUARY, 1984
50 paise

Urdu Monthly

NAYA DAUR

REGD .No. LW/NP-17
Annual Subs.
Rs. 5/-

POST BOX No. 146 LUCKNOW 226001

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی (منی پور کے روایتی لباس میں) ۲۹ جنوری ۸۴ء کو نئی دہلی میں منی پور کی روایتی لوک رقاصاؤں کے ساتھ جو یوم جمہوریہ کی تقریبات میں شرکت کے لیے دہلی آئی تھیں۔

مارچ ۱۹۸۴ء

جلد ۳۸	نمبر ۱۲

مارچ ۱۹۸۴ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: گنگا دھر پرشاد شکلا

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی

مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے

زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلیکیشنز اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ - لکھنؤ

ایڈیٹر نیا دور محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

ممتاز اردو شاعر ساغر نظامی بھی گذشتہ دنوں اللہ کو پیارے ہو گئے ان کا انتقال ۸۰ سال کی عمر میں ۲۷ر فروری ۱۹۸۳ء کو دہلی میں ہوا۔ وہ محض شاعر ہی کے شاعر نہیں تھے۔ اگرچہ ایک زمانے میں ان کا نام مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت تھا۔ اپنی دلکش آواز اور ترنم سے وہ مشاعروں میں ایک سماں باندھ دیتے تھے۔ لیکن ان کی اہمیت صرف یہیں تک محدود نہیں تھی۔ انھوں نے کچھ کام بھی کیا۔ اگرچہ تصنیف انھوں نے اپنی یادگار چھوڑی ہیں، جن میں زیادہ تر شعری مجموعے ہیں۔ انھوں نے شکنتلا کا منظوم ترجمہ کیا اور مشعلِ آزادی کے نام سے جنگِ آزادی کی منظوم تاریخ لکھی۔ سابق وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے ان کے بڑے قریبی روابط تھے جن کی نوعیت ذہنی اور فکری بھی تھی۔ نہرو نامہ کے عنوان سے انھوں نے نہرو جی پر جو نظم لکھی اس میں ان روابط کا عکس تاثرات جذبات کی شکل میں نمایاں ہے۔ کلاسیکیت اور رومانویت کا حسین امتزاج ساغر صاحب کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ یہ امتزاج نظموں کے علاوہ ان کی غزلوں اور گیتوں میں بھی نمایاں ہے۔

صدر جمہوریۂ ہند شری گیانی ذیل سنگھ نے ان کے انتقال پر اپنے تعزیتی پیغام میں انھیں ایک عظیم محب وطن اور عظیم شاعر قرار دیا ہے۔ صدر جمہوریہ نے کہا کہ ساغر صاحب نے شاعری کو مادرِ وطن سے اپنی محبت کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اپنے تعزیتی پیغام میں انھیں ایک قوم پرور شخصیت قرار دیتے ہوئے کہا کہ ساغر صاحب نے سیکولرازم کو عام کرنے کے لیے بہت کام کیا اور اپنی شاعری کے ذریعہ وطن سے محبت کا جذبہ بیدار کیا۔ ان کی وفات سے اردو نے ایک بڑا شاعر کھو دیا ہے۔

ادارۂ نیا دور ان کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور ان کے متعلقین کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

● اتر پردیش میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت مختلف مقررہ نشانوں کی تکمیل کے لیے نظم و نسق کی پوری مشینری کو زیادہ سے زیادہ فعال اور سرگرم بنایا گیا ہے، اس پروگرام کے تحت مختلف اسکیموں پر عمل درآمد کی رفتار کی موقع پر چیکنگ کے لیے وزیر اعلا شری سری پت مشرا نے ڈویژنل کمشنروں، ضلع مجسٹریٹوں اور دیگر تمام محکموں کے ہر سطح کے نگراں افسروں کو خصوصی ہدایت جاری کی ہیں اور مقررہ نشانے مدت کے اندر مکمل کر لینے پر خاص زور دیا ہے۔

حکومت اتر پردیش وزیر اعظم کے ۲۰ نکاتی پروگرام پر عمل درآمد کے سلسلے میں خاص طور سے چوکس اور سرگرم ہے۔ وزیر اعلا نے گذشتہ ماہ اس سلسلے میں کہا تھا کہ "میں خود افسروں کی کارگزاری کا جائزہ لینے کی غرض سے وقتاً فوقتاً مختلف ضلعوں میں ہونے والے کاموں کا معائنہ کروں گا۔"

یہ حکومت اتر پردیش کی اسی چوکسی اور سرگرمی کا ہی نتیجہ ہے کہ وزیر اعظم کے ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت ریاست کے ... متاثرہ مواضعات میں پینے کا پانی فراہم کرنے کے نشانے کے مقابلے میں ۳۱ر جنوری ۸۴ء تک ۱۳۱۸ مواضعات میں پینے کا صاف پانی مہیا کرا دیا گیا۔ اتر پردیش کی اس نمایاں کامیابی کے پیشِ نظر مرکزی حکومت نے گذشتہ دسمبر اور جنوری میں اسی مقصد کے تحت بالترتیب ۴۱۲۹ کروڑ اور ۲۲۴ر۳ کروڑ روپے کی مزید رقم اتر پردیش کو فراہم کی۔

۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت دیہاتوں کی ہمہ گیر ترقی کے تصور کو عملی شکل دینے کی غرض سے گذشتہ ماہ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ ریاست میں چھ ماہ تک روزانہ ایک گاؤں کو اور چھ ماہ بعد روزانہ دو مواضعات کو خاص سڑک سے مربوط کیا جائے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ریاست میں ۲۰ نکاتی پروگرام کی رفتارِ عمل نہ صرف یہ کہ اطمینان بخش اور حوصلہ مندانہ ہے، بلکہ اس کے مثبت نتائج بھی برآمد ہو رہے ہیں، جن سے دبے کچلے پسماندہ اور نادار طبقے مستفید بھی ہو رہے ہیں اور ان کی معاشی حالت بتدریج سدھر رہی ہے۔

— ایڈیٹر

وامق جونپوری
ولن کوٹھی۔ کجگاؤں
ضلع جونپور یوپی

غزل

رات کے سمندر میں غم کی ناؤ چلتی ہے ۔۔۔ دن کے گرم ساحل پر زندہ لاش جلتی ہے

اک کھلونا ہے زمیں جس کو توڑ توڑ کے ۔۔۔ بچوں کی طرح دنیا روتی ہے مچلتی ہے

شاہزادیٔ سخن ایک ناگن اک بلا ۔۔۔ شب میں خون پیتی ہے دن میں زہر اگلتی ہے

مفلسی کی زندگی ایک بوند پانی کی ۔۔۔ ناچتی ہے آگ پر برف پر سنبھلتی ہے

بھوک پیٹ کی ڈائن سوتی ہی نہیں کبھی ۔۔۔ دن میں دھوپ کھاتی ہر شب میں پی کے ٹلتی ہے

پتیوں کی تالیاں سن کے جاگ اٹھا چمن ۔۔۔ اور پتّی پتّی اب بیٹھی ہاتھ ملتی ہے

گھپ اندھیری راہوں پر مٹھیوں میں شمعِ زر ۔۔۔ ہے لہو میں ایسی تر بجھتی ہے نہ جلتی ہے

موت کیا ہے کیا حیات حادثات و انقلاب ۔۔۔ تیز رو سواری جب پٹریاں بدلتی ہے

تشنگی کے تذکرے مثلِ شمع ہیں وامق
جو زباں کھلتی ہے اس سے لَو نکلتی ہے

ڈاکٹر سلام سندیلوی

گورکھپور میں اردو صحافت کا آغاز و ارتقا

جس طرح گورکھپور میں اردو شاعری اور نثر نگاری نے ترقی کی ہے اسی طرح یہاں اردو صحافت کو بھی فروغ حاصل ہوا ہے۔ یہ بات ابھی تک پایۂ تحقیق کو نہیں پہونچ سکی ہے کہ گورکھپور میں پہلا اخبار یا رسالہ کب شائع ہوا؟ مگر یہاں کے بزرگوں سے یہ معلوم ہوا ہے کہ گورکھپور کے محلہ پانڈے کے احاطے میں ایک یہودی رہتا تھا جس کا نام جیک تھا۔ اس نے پہلی بار گورکھپور سے ایک اردو ماہنامہ جاری کیا۔ مگر یہ بات اب تک نہیں معلوم ہو سکی ہے کہ اس رسالہ کا کیا نام تھا اور وہ کس سال جاری ہوا اور کب ختم ہو گیا۔

گورکھپور میں اردو صحافت کا آغاز اس وقت ہوا جب حضرت ریاض خیرآبادی اس شہر میں تشریف لائے۔ ریاض خیرآبادی گورکھپور میں سنہ ۱۸۸۱ء میں آئے۔ مگر اس سے قبل وہ اردو صحافت کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ انھوں نے ۱۸۶۲ء میں خیرآباد سے "ریاض الاخبار" جاری کیا تھا۔ یہ اخبار انھیں کے پریس "لمعۂ درخشاں" سے شائع ہوتا تھا۔ ریاض خیرآبادی اپنے والد صاحب سید طفیل احمد کے ہمراہ خیرآباد سے گورکھپور آئے۔ اس کے بعد وہ گورکھپور ہی سے "ریاض الاخبار" شائع کرنے لگے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں ریاض خیرآبادی لکھنؤ چلے گئے۔ اس کے بعد وہ لکھنؤ ہی سے ریاض الاخبار شائع کرنے لگے جو ۱۹۱۰ء تک شائع ہوتا رہا۔ اس کے سرورق پر یہ شعر درج ہوتا تھا۔

ترا اٹھان ترقی کرے قیامت کی
ترا شباب بڑھے عمر جاوداں کی طرح

"ریاض الاخبار" میں خاص طور سے گورکھپور کے متعلق خبریں شائع ہوتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی غیر ممالک کی خبریں بھی اشاعت پذیر ہوتی تھیں۔ یہ صرف خبروں کا حامل نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کے صفحات پر فارسی اور اردو کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ چنانچہ ریاض الاخبار یکم اپریل ۱۸۹۳ء کے شمارے میں امیر مینائی کی ایک فارسی غزل شائع ہوئی ہے۔ ریاض الاخبار ۱۸ اپریل ۱۸۹۳ء کے شمارے میں داغ کی ایک غزل چھپی ہے۔ اس اخبار میں احسان اللہ عباسی۔ قاضی تلمذ حسین۔ ڈاکٹر اقبال حکیم برہم اور وسیم خیرآبادی کے مضامین اور کلام شائع ہوا کرتا تھا۔

ریاض خیرآبادی کی شوخ طبیعت ریاض الاخبار سے مطمئن نہ ہو سکی اس لیے انھوں نے طنز و مزاح کے لیے "فتنہ عطرفتنہ" کا اجرا کیا۔ ریاض نے ۹ جولائی ۱۸۸۲ء کو فتنے کا پہلا شمارہ جاری کیا فتنہ ایک ہفتہ وار اخبار تھا۔ جو گورکھپور کے محلہ نخاس سے نکلتا تھا۔ یہ اخبار سولہ اوراق پر مشتمل ہوتا تھا اور ہر بدھ کو شائع ہو کر منظر عام پر آتا تھا۔ اس کا چندہ ایک روپیہ آٹھ آنے سالانہ تھا۔ اس رسالہ کے مہتمم حافظ نظام احمد انداز خیرآبادی تھے اور پرنٹر سیتلا بخش تھے۔

فتنہ نہایت ننھے منے سائز کا رسالہ تھا۔ اس کو پاکٹ سائز کہہ سکتے ہیں۔ اس کی خصوصیت کو ریاض نے ایک شعر میں بیان کیا ہے

فتنہ کو پوچھتا ہے کوئی اس ادا کے ساتھ
چھوٹا سا وہ ریاض کا اخبار کیا ہوا

فتنہ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ گلابی۔ ہرے۔ نیلے پیلے نارنجی اور دیگر مختلف رنگ کے اوراق پر شائع ہوتا تھا۔ اس میں زیادہ تر نثر ہوتی تھی۔ چونکہ فتنہ نام کچھ چونکا دینے والا

اس لیے انگریزی حکومت اس کو مشکوک نظروں سے دیکھتی تھی۔ مگر اس میں انگریزوں کے خلاف کچھ مواد نہیں ہوتا تھا۔ فتنہ کی بے پناہ مقبولیت کو دیکھ کر ریاض نے یکم جنوری ۱۸۸۵ء کو اس میں سولہ صفحات کا اضافہ کر دیا اور اس کا نام "عطر فتنہ" رکھ دیا۔ اب فتنہ اور عطر فتنہ ایک ساتھ چھپنے لگے۔ ریاض نے فتنہ عطر فتنہ کو ۲۴ مارچ ۱۸۹۰ء تک جاری رکھا۔ اس کے بعد اس کے انتظامات حکیم برہم کے سپرد کر دیے۔ حکیم برہم یہ رسالہ ۱۹۱۲ء تک شائع کرتے رہے۔ اس کے بعد یہ رسالہ انھوں نے بند کر دیا۔ اور اس کے بجائے انھوں نے "رجسٹریشن ریویو" جاری کیا جو قانونی رسالہ تھا اور رجسٹریشن ایکٹ کے متعلق معلومات فراہم کرتا تھا۔

فتنہ عطر فتنہ میں گورکھ پور کے تہواروں اور رسموں کے بارے میں تفصیلات شائع ہوتی تھیں۔ مثلاً گورکھ پور کے محرم کے بارے میں اس میں مکمل تفصیلات فراہم کی جاتی تھیں۔ محرم کے علاوہ اس میں برسات۔ بسنت اور رمضان شریف کے بارے میں بھی مضامین شائع ہوتے تھے۔ فتنہ عطر فتنہ کی سب سے نمایاں خصوصیت شوخی اور ظرافت ہے۔ اگرچہ ریاض بہت پاکباز اور صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے مگر وہ محلہ بسنت پور کی سرائے میں روزانہ جاتے تھے جہاں طوائفیں رہتی تھیں۔ ریاض بسنت پور کی زہرہ جبینوں سے دلچسپی لیتے تھے۔ فتنہ عطر فتنہ میں ان کا ذکر جا بجا نظر آتا ہے۔ چنانچہ ریاض نے فتنہ عطر فتنہ نمبر ۱۳ - جلد ۱۹ مطبوعہ ۳ اگست ۱۹۰۲ء کے شمارے میں مشاہدان بازاری کو خطابات سے نوازا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔

۱۔ نظیر ۱ ۔ شب فرقت
۲۔ نظیر ۲ ۔ شب دیجور
۳۔ فتو ۔ بے تت
۴۔ لاڈو ۔ شب ہجراں
۵۔ پھندن ۔ شام وصال
۶۔ قطالو ۔ صبح شب وصال
۷۔ جھپکا ۔ روز آخر
۸۔ منا ۔ روز بد
۹۔ نتاب جان ۔ وقت زوال
۱۰۔ طوطی ۔ صبح وصال
۱۱۔ مینا ۔ روز وصال

عطر فتنہ میں ریاض مختلف رسالوں سے کلام کا انتخاب کر کے بھی شائع کرتے تھے۔ مثلاً "عطر فتنہ" نمبر ۳۹ - جلد ۱۳ - ۱۰ اکتوبر ۱۸۹۴ء میں "گلچیں" سے غزلوں کا انتخاب کر کے شائع کیا گیا ہے۔ اس میں داغ۔ افضل اور اعجاز کی غزلیں منتخب کی گئی ہیں۔ اس انتخاب کے علاوہ اس رسالے میں مختلف شعرا کی غزلیں اور نظمیں براہ راست شائع کی جاتی تھیں۔ چنانچہ فتنہ عطر فتنہ میں ثاقب۔ اقبال۔ امیر مینائی۔ داغ دہلوی۔ جلال لکھنوی۔ تسلیم لکھنوی۔ چکبست۔ سرور جہاں آبادی۔ اکبر الہ آبادی۔ حفیظ جونپوری۔ آسی غازی پوری۔ عزیز لکھنوی۔ صفی لکھنوی۔ نوح ناروی اور حسرت موہانی وغیرہ کا کلام موجود ہے۔

ریاض خیرآبادی نے ۱۸۹۵ء میں گورکھپور سے ایک روزنامہ جاری کیا اور اس کا نام صلح کل رکھا۔ اپنی مدد کے لیے ریاض نے جالب دہلوی کو بھی گورکھپور بلا لیا تھا۔ صلح کل چار ورقی فلسکیپ سائز کا اخبار تھا۔ انگریزی اخبارات سے مواد یکجا کر کے اس روزنامہ میں شائع کیا جاتا تھا۔ اس میں ملکی اور غیر ملکی خبریں شائع کی جاتی تھیں۔

گورکھپور سے ایک ہفتہ وار لطیف الاخبار بھی شائع ہوتا تھا۔ یہ اخبار محلہ خونی پور سے ۱۰ اکتوبر ۱۸۸۶ء کو پہلی بار شائع ہوا۔ اس اخبار کے مالک مولوی عبداللطیف خاں صاحب تھے۔ اور اس کے مدیر کا نام خواجہ محی الدین لکھنوی تھا۔ یہ اخبار ۱۲ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ جو ہر جمعہ کو جاری ہوتا تھا۔ اس کا چندہ دس روپیہ سالانہ تھا۔

محلہ خونی پور گورکھپور سے ایک اور ماہنامہ شائع ہوتا تھا جس کا نام "نیکی" تھا۔ یہ ماہنامہ اپریل ۱۸۸۷ء میں جاری ہوا۔ اس کے بھی مالک مولوی عبداللطیف خاں صاحب تھے۔ اور مدیر خواجہ محی الدین لکھنوی تھے۔ یہ ماہنامہ ۱۶ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کا سالانہ چندہ دو روپیہ آٹھ آنے تھا۔

وسیم خیرآبادی نے لکھنؤ سے ایک ماہنامہ گلچیں جاری کیا تھا۔ اس کا اجرا ۱۸۹۱ء میں ہوا تھا۔ جس میں لکھنؤ کے شعرا کا کلام شائع

ہوتا تھا جنوری ۱۸۹۲ء میں گلچیں لکھنؤ سے گورکھپور منتقل کر دیا گیا اس کے بعد وہ ریاض خیرآبادی کی نگرانی میں شائع ہونے لگا مگر کچھ عرصہ بعد گلچیں کی اشاعت پھر لکھنؤ سے ہونے لگی۔ غالباً لکھنؤ میں گلچیں کی اشاعت میں کچھ دقت محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے آخر میں گلچیں سیتا پور سے شائع ہونے لگا۔ ۱۹۱۸ء میں یہ ماہنامہ ہو گیا گلچیں کے ٹائیٹل پیج پر یہ شعر لکھا جاتا تھا۔

دامن نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

گلچیں کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کسی استاد کا مصرعہ طرح دیا جاتا تھا اور پھر مشہور شعرا اس طرح میں غزلیں کہتے تھے جو گلچیں میں شائع ہوتی تھیں۔ ایک بار امیر مینائی نے یہ مصرع شعرا کی طبع آزمائی کے لیے دیا۔

کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے

اس طرح میں مختلف شعرا نے غزلیں کہیں۔ مگر یہ محبوب علی خاں والی دکن کا ایک مصرع بے مثل ہے۔

یہ چوٹی کس لیے پیچھے پڑی ہے

اسی طرح میں امیر مینائی نے بھی ایک دلکش مطلع کہا ہے۔

نظر کس چشم فتاں سے لڑی ہے
کہ آنکھوں کو لیے نرگس پڑی ہے

اسی طرح میں ریاض نے ایک شوخ مطلع پیش کیا ہے۔

مزے لو تو کلیم اب بن پڑی ہے
بڑی اونچی جگہ قسمت لڑی ہے

یہ حقیقت ہے کہ گلچیں اپنے دور کا ایک معیاری ماہنامہ تھا جس میں مشاہیر سخن کا کلام شائع ہوتا تھا۔

دسمبر ۱۸۹۲ء میں گورکھپور سے ایک ہفتہ وار اخبار الوقت جاری ہوا۔ یہ اخبار ہر چہارشنبہ کو شائع ہوتا تھا اور اس کا چندہ تین روپے آٹھ آنے سالانہ تھا۔ اس کے ایڈیٹر اور پبلشر محمد سعید زاہد تھے اور سیتلا بخش شائق لکھنوی منیجر تھے۔ یہ اخبار اسدی پریس محلہ نظام پور، گورکھپور سے شائع ہوتا تھا۔ اور ۱۲ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ الوقت میں زیادہ تر خبریں شائع ہوتی تھیں خبریں ملکی اور غیرملکی دونوں ہوتی تھیں۔ کہیں کہیں گورکھپور کی خبریں بھی شائع کردی جاتی تھیں۔

ریاض خیرآبادی کی ادبی مشغولیت گورکھپور میں کافی بڑھ گئی تھی اس بنا پر وہ علیل ہو گئے تھے اور کام کرنے سے بڑی حد تک معذور ہو گئے تھے اسی بنا پر انھوں نے بھوپال سے اپنی مدد کے لیے حکیم برہم کو بلا لیا تھا اور صلح کل کی ادارت ان کے سپرد کردی تھی۔

۱۹۰۶ء میں حکیم برہم نے اپنا ذاتی ہفتہ وار نکالنا شروع کر دیا جس کا نام مشرق رکھا۔ اس کو مشرق کا دور اول سمجھنا چاہیے۔ یہ رسالہ ۱۶ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ مگر اس کے بعض شمارے ۲۸ صفحات، ۳۲ صفحات اور ۳۸ صفحات تک پہونچ گئے ہیں۔ اس وقت اس کی قیمت چھ روپیہ سالانہ پیشگی تھی۔ اس کے بعد اس کی قیمت دس روپیہ سالانہ ہو گئی۔ یہ ہفتہ پنجشنبہ کو چھپتا تھا۔ اس اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کی پالیسی کا انحصار قومی یک جہتی اور اتحاد و اتفاق پر تھا

مشرق میں سیاسی خبریں اور سیاسی مضامین بہت نمایاں طور پر شائع ہوتے تھے۔ مثلاً مشرق نمبر ۲۸۔ جلد ۱۸۔ ۱۰ جولائی ۱۹۲۴ء کے شمارے میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "ہندستان میں سوراج کیسا ہونا چاہیے"۔ مشرق نمبر ۴۲۔ جلد ۱۸۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۴ء صفحہ ۸ پر ایک مضمون "اردو خالص" کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس مضمون میں اردو کے بارے میں گاندھی جی کے نظریات پیش کیے گئے ہیں۔ گاندھی جی کا یہ قول تھا کہ اردو میں کثرت سے عربی اور فارسی کا استعمال غیر مناسب ہے۔

مشرق سیاسی کے علاوہ ادبی پرچہ بھی تھا۔ اس میں مشاہیر سخن کا کلام شائع ہوتا تھا۔ مثلاً مشرق نمبر ۲۷۔ جلد ۱۸۔ ۳ جولائی ۱۹۲۴ء صفحہ اول پر شوق ندوائی کی ایک غزل شائع ہوئی ہے جس کا مطلع ہے۔

بڑا مزہ مجھے آئے گا جاں فشانی میں
چھری بجھائی ہے اس نے نمک کے پانی میں

مشرق نمبر ۲۹ جلد ۱۸۔ ۱۷ جولائی ۱۹۲۴ء صفحہ اول پر حسرت موہانی کی ایک غزل شائع ہوئی ہے جس کا مطلع ہے۔

بے شک گل رہے دل بلبل کہاں تلک
اے ساقی بہار! تغافل کہاں تلک

مشرق نمبر ۴۵ جلد ۱۸ ، ۶ ر نومبر ۱۹۲۴ء صفحہ اول پر علامہ اقبال کی ایک غزل شائع ہوئی ہے جس کا یہ شعر بہت مشہور ہو چکا ہے۔

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ

۱۹۲۸ء میں حکیم برہم اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اس کے بعد ان کی صاحبزادی مشرق کی مالک ہو گئیں۔ اور محمد قربان وارث اس کے ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر ہو گئے۔ محمد قربان وارث کے علاوہ اس کی مجلس ادارت میں اے۔ اے خان وارثی۔ ایم مشیر صدیقی۔ اور مولانا تیر بوردی بھی شامل تھے۔ مگر ۱۵ ر ستمبر ۱۹۳۴ء کے بعد محمد قربان وارث ہی کا نام بہ حیثیت مدیر شائع ہونے لگا۔ یہ مشرق کا دوسرا دور ہے

مشرق کے دوسرے دور میں محمد قربان وارث نے حکیم برہم کی پالیسی پر عمل کیا۔ اس دور میں بھی اس اخبار میں ملکی و غیر ملکی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی مشاہیر ادب کی تخلیقات بھی منظر عام پر آتی تھیں۔ چنانچہ مشرق ۷ ر جولائی ۱۹۳۳ء کے شمارے میں صفحہ ۱۱ پر ماہر القادری کی غزل شائع ہوئی ہے۔ ۲۸ ر جولائی ۱۹۳۳ء کے شمارے میں صفحہ ۱۱ پر جگر مراد آبادی کی ایک غزل چھپی ہے جس کا مطلع ہے

عالم ہے کچھ ایسا کہ زمانہ نہ زمیں ہے
میں ہوں نہ در یار نہ سجدہ نہ جبیں ہے

اس کے بعد رسالہ مشرق کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے ۸ ر مارچ ۱۹۵۴ء کو ڈاکٹر محمد عاصم واحدی نے محمد قربان وارث سے مشرق کے جملہ حقوق خرید لیے اور اس کے بعد وہ اس کے پروپرائٹر، پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر ہو گئے۔ انھوں نے مشرق کا پہلا شمارہ ۲۲ ر مارچ ۱۹۵۴ء کو جاری کیا جو ۸ صفحات پر مشتمل تھا۔ ڈاکٹر عاصم واحدی نے بھی حکیم برہم کی پالیسی کو برقرار رکھا۔ انھوں نے قومی یکجہتی کے تصور کو فروغ دیا۔ اس کے ساتھ ہی ادبی معیار کو کبھی پست نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ ان کے دور میں مولانا حسرت موہانی، نوح ناروی، شفیق جونپوری۔ جوش ملیح آبادی اور احسان دانش وغیرہ کا کلام شائع ہوا۔

قاضی تلمذ حسین گورکھپور کے ایک ذی علم انسان تھے۔ انھوں نے ایک ماہنامہ لسان العصر کے نام سے جاری کیا۔ اس کا پہلا شمارہ مارچ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ مگر اس کے صرف ۵ شمارے نکل سکے جولائی ۱۹۱۰ء میں یہ ماہنامہ بند ہو گیا۔ قاضی تلمذ حسین ندوۃ العلماء کی مصروفیت کی بنا پر اس ماہنامے کو جاری نہ رکھ سکے۔

علامہ احسان اللہ عباسی کے صاحبزادے وحید اللہ عباسی نے بھی ایک ماہنامہ گورکھپور سے نکالا تھا جس کا نام التحقیق تھا اس کی اشاعت کے لیے انھوں نے خود اپنے گھر میں پریس قائم کیا تھا۔ اور شاہ نذیر ہاشمی کو انھوں نے التحقیق کا مدیر بنا دیا تھا۔ یہ اخبار ۱۹۲۰ء کے قریب شائع ہوتا تھا۔

گورکھپور سے ایک ہفت روزہ بیداری بھی شائع ہوتا تھا۔ اس کے مدیر سید کامل حسین تھے جو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تھے بیداری میں اس دور کی خبریں نمایاں سرخی کے ساتھ شائع ہوتی تھیں اور واقعات حاضرہ پر بے لاگ تبصرہ ہوتا تھا۔ یہ ہفت روزہ عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتا تھا اور انگریزوں کی پالیسی کے خلاف تھا۔

علامہ کیفی چریاکوٹی نے ایک رسالہ سحبان کے نام سے ۱۹۲۰ء میں جاری کیا تھا۔ اس کے صرف چار شمارے شائع ہوئے۔ اس کے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا۔ یہ بہت معیاری رسالہ تھا۔ اس میں اعلیٰ درجے کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ اس میں مشاہیر سخن کی نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں۔ مثلاً سحبان جلد ۱۔ رمضان ۱۳۳۸ھ میں حضرت آسی غازی پوری اور ریاض خیرآبادی کی غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ اس رسالے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اردو کے علاوہ فارسی کی بھی غزلیں اس میں شائع ہوتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی عربی کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ سحبان میں انگریزی اور ہندی کی شاعری بھی پیش کی جاتی تھی۔

تحفۂ خوشتر گورکھپور کا ایک مشہور ماہنامہ تھا۔ اس کے پرنٹر

ہری پرشاد سنگھ خوشتر گورکھپوری تھے جو محلہ مفتی پور میں رہتے تھے اس کا رجسٹریشن نمبر اے ۱۱۶۳ تھا۔ اس رسالے میں زیادہ تر شاعروں کی طرحی غزلیں چھپتی تھیں۔ شعرا کے کلام کا انتخاب تسنیم خیرآبادی کے ذمے تھا۔ یہ پونے دو اجزا کا رسالہ ہوتا تھا۔ اور اس کی قیمت دو روپیہ آٹھ آنے ہوتی تھی۔ یہ رسالہ رفاہ عام پریس گورکھپور سے شائع ہوتا تھا۔

تحفۂ خوشتر کا پہلا شمارہ ستمبر ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ رسالہ آٹھ سال تک نکلتا رہا۔ اس میں مشاہیر سخن کا کلام شائع ہوتا تھا۔ مثلاً تسنیم خیرآبادی۔ واقف سوانی۔ فہیم گورکھپوری۔ اور ننگ بہادر لال جگر گورکھپوری۔ کی غزلیں مختلف شماروں میں شائع ہوئی ہیں

مولانا آزاد سبحانی نے بھی "روحانیت" کے نام سے ایک رسالہ گورکھپور سے ۱۹۲۴ء میں جاری کیا تھا۔ اس رسالے کا دفتر دائرہ ربانیہ محلہ تیواری پور گورکھپور تھا۔ اس میں زیادہ تر مولانا آزاد سبحانی کے مذہبی اور فلسفیانہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ ماہنامہ دو سال تک نکلتا رہا۔ اس کے بعد بند ہو گیا۔ "روحانیت" کے بند ہونے کے بعد مولانا آزاد سبحانی نے "دعوت" رسالہ ۱۹۲۶ء میں جاری کیا۔ اس رسالے کے ذریعہ مولانا آزاد سبحانی اپنے نظریۂ ربانی کی تبلیغ کرتے تھے

گورکھپور سے ایک رسالہ موٹر کار بھی شائع ہوتا تھا۔ اس کے مدیر ماسٹر عبدالرحیم سیتاپوری تھے۔ یہ رسالہ ۱۹۲۷ء میں گورکھپور سے جاری ہوا۔ پہلے ماسٹر عبدالرحیم صاحب بابو گرد ھر داس کے موٹر ڈرائیور تھے۔ اس کے بعد انھوں نے موٹر ڈرائیوری کا اسکول کھول دیا جس میں لوگوں کو موٹر ڈرائیوری کی تعلیم دیتے تھے موٹر ڈرائیوری کی تعلیم کو عام کرنے کے لیے انھوں نے موٹر کار رسالہ بھی جاری کیا مگر آگے ساتھ ہی انھوں نے اپنے رسالے میں ادبی مواد بھی شائع کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً موٹر کار گورکھپور، جنوری، فروری ۱۹۳۶ء کے شمارے میں فہیم گورکھپوری کی غزل شائع ہوئی ہے جس کا مطلع۔

قفس والوں کا کچھ غم ہم صفیرانِ چمن کرتے
کبھی غربت زدوں کو یاد تو اہلِ وطن کرتے

۱۹۳۳ء میں میاں صاحب جارج اسلامیہ کالج گورکھپور سے ایک رسالہ عزیز کے نام سے جاری ہوا۔ اس کے سرپرست سید جواد علی شاہ تھے۔ اور نگراں چھوٹے خاں پرنسپل تھے۔ یہ رسالہ بدیع الزماں اعظمی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ دراصل یہ رسالہ طلبہ کے اخلاق کو درست کرنے کے لیے جاری کیا گیا تھا مگر اس میں دیگر شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات بھی شائع ہوتی تھیں۔ یہ رسالہ ۱۹۴۳ء تک نکلتا رہا۔ اس کے بعد بند ہو گیا۔

گورکھپور سے ایک ہفتہ وار مراد شائع ہوتا تھا۔ اس کے مدیر حکیم امجد حسین نزار تھے۔ اور سرپرست جناب محمد ساجد علی ایڈوکیٹ تھے۔ اس رسالے کا اجرا ۱۹۳۰ء میں ہوا۔ جو محلہ عسکر گنج گورکھپور سے شائع ہوتا تھا۔ اس کا چندہ تین روپیہ سالانہ تھا۔ اور یہ چار صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ مراد کی پالیسی کا انحصار قومی یک جہتی اور ہندو مسلم اتحاد پر تھا۔ اگرچہ مراد میں خاص طور سے خبریں چھپتی تھیں مگر اس میں ادبی مواد بھی شامل کیا جاتا تھا۔ چنانچہ مراد ۲۳ جون ۱۹۳۱ء جلد ۱ نمبر ۳-۴ صفحہ ایک پر نوح ناروی کی ایک غزل شائع ہوئی ہے جس کا مطلع ہے

بدل کر بھیس ارمان دل مضطر نکلتے ہیں
ادا ہو کر سماتے ہیں دعا بن کر نکلتے ہیں

قاضی محمد علی اختر قاضی پوری کی ادارت میں ایک ہفتہ وار اخبار صلح کے نام سے گورکھپور سے جاری ہوا تھا۔ اس کا پہلا شمارہ یکم ستمبر ۱۹۳۰ء کو شائع ہوا تھا۔ صلح میں خاص طور سے خبریں شائع ہوتی تھیں مگر اس میں ادبی چاشنی بھی موجود ہوتی تھی۔ مثلاً صلح جلد ۲ نمبر ۵-۱۶، ستمبر ۱۹۲۱ء کے شمارے میں جگر مرادآبادی کی ایک غزل شائع ہوئی جس کا مطلع ہے۔

اپنا ہی سا اے نرگس مستانہ بنا دے
میں جب تجھے جانوں مجھے میخانہ بنا دے

گورکھپور سے ایک اور مشہور ماہنامہ نکلتا تھا جس کا نام ایوان ہے۔ اس کے مدیر اردو کے درجہ اول کے نقاد مجنوں گورکھپوری تھے اس کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ ایوان اشاعت گورکھپور سے نکلتا تھا۔ اس کا سالانہ چندہ چار روپیہ تھا اور ایک

پرچے کی قیمت آٹھ آنے تھی۔ اس رسالے میں اردو کے مشہور ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شائع ہوتی تھی۔ مثلاً ایوانِ جولائی ۱۹۳۴ء کے شمارے میں مولانا حسرت موہانی کی ایک غزل شامل ہے اس کے علاوہ فراق گورکھپوری کی دو غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ مجنوں گورکھپوری کا مضمون قائم چاندپوری پر شائع ہوا ہے۔ ایوان کچھ دنوں تک شائع ہوتا رہا۔ پھر بند ہو گیا۔ اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں دوبارہ جاری ہوا۔ کچھ دنوں تک یہ چھپتا رہا۔ اس کے بعد پھر بند ہو گیا۔ بہرحال ایوانِ اردو ایک معیاری رسالہ تھا جس نے ہمیشہ اعلیٰ درجہ کا مواد پیش کیا۔

حکیم عارف بگرامی گورکھپور سے شاہکار نکالتے تھے۔ یہ رسالہ ۱۹۳۱ء میں جاری ہوا۔ اور ۱۹۳۰ء تک شائع ہوتا رہا شاہکار کے کچھ بہت معیاری نمبر شائع ہوئے ہیں مثلاً شاہکار کا جدید اردو شاعری نمبر بہت اہم ہے جو جولائی ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا ہے اس میں ۱۵۲۲ء سے ۱۸۵۷ء تک کی مختصر تاریخ ادب اردو ۱۸۵۷ء سے ۱۹۳۸ء تک مفصل تاریخ ادب اردو سے بحث کی گئی ہے۔

۱۹۳۰ء میں گورکھپور سے ایک رسالہ صحیفہ جاری ہوا اس کے مدیر عزیز الرحمن اصلاحی تھے۔ اور اس کے معاون مدیر یحییٰ اعظمی تھے۔ مگر ایک سال کے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا۔ اس کا سالانہ چندہ ایک روپیہ آٹھ آنے تھا۔ اس میں خاص طور سے اسلامی مضامین چھپتے تھے مگر ادبی موضوعات کو بھی اس میں جگہ ملتی تھی۔

گورکھپور سے ایک رسالہ ست رنگ شائع ہوتا تھا۔ اس کے مدیر موتی لال مختار تھے۔ اس رسالے میں مہرشی شیو برت لال ورمن کے بچن اور ان کے اقوال پیش کیے جاتے تھے۔ ست رنگ پہلے جنوری ۱۹۳۴ء سے رادھا سوامی دھام ضلع مرزاپور سے شائع ہوتا تھا۔ دو سال کے بعد جنوری ۱۹۳۶ء سے اس کا دفتر گورکھپور میں آ گیا اور یہ رسالہ اس شہر سے نکلنے لگا۔

عبدالرشید وتر گورکھپوری نے گورکھپور سے رسالہ زندگی ۱۹۳۵ء میں جاری کیا۔ یہ رسالہ کانگریس کا حامی تھا اور قومی نظریات کی ترویج کرتا تھا۔ مگر یہ زیادہ عرصہ تک شائع نہ ہو سکا اور ایک سال کے بعد بند ہو گیا۔

نشیمن گورکھپور کا ایک مشہور رسالہ تھا اس کے پبلشر نواب زادہ سید محمد علی کبیر خاں تھے۔ مدیر مجنوں گورکھپوری اور مدیرہ انجم لاہوری اہلیہ نواب علی کبیر تھیں۔ نشیمن آسی پریس، گورکھپور میں چھپتا تھا اور اس کا دفتر محلہ بلاقی پور میں تھا۔ اس کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۴۰ء میں نکلا۔ یہ رسالہ تقریباً دو سال تک نکلتا رہا اور۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں بند ہو گیا۔ نشیمن کے ایک پرچے کی قیمت پانچ آنے تھی اور سالانہ چندہ تین روپیہ آٹھ آنے تھا۔

بیدار گورکھپور کا ایک رسالہ تھا جس کے مدیر وصی حیدر تھے۔ اس کا اجرا ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ اس کا اپریل ۱۹۴۸ء کا شمارہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ یہ گاندھی نمبر ہے۔ اس شمارے میں گاندھی جی کی مختلف تصویریں شائع ہوئی ہیں اور ان کے بارے میں بہت سے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

فضل الرحمن عثمانی نے گورکھپور سے دیہات رسالہ جاری کیا۔ آزادی ہند کے بعد گورکھپور سے یہ پہلا پرچہ شائع ہوا۔ اس رسالے کے ادارہ تحریر میں ہر قوم کے افراد شامل تھے۔ ہندوؤں کے نمائندگی گنیش پرشاد پیام، سکھوں کی نمائندگی سردار سرودل سنگھ اور عیسائیوں کی نمائندگی اے۔ بی فلپس صابر اکبرآبادی کرتے تھے۔ اس رسالے کے چند شمارے شائع ہوئے۔ اس کے بعد یہ بند ہو گیا

گورکھپور کا ایک ہفتہ وار صبح وطن تھا جو اسلام چک گورکھپور سے نکلتا تھا۔ اس کے مدیر مقبول احمد انصاری تھے۔ اس کا پہلا شمارہ ۱۵ر جنوری ۱۹۶۱ء کو شائع ہوا تھا۔ یہ ہفتہ وار بڑے سائز پر چھپتا تھا اور ۴ یا ۶ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس میں کرگھا صنعت کے بارے میں خصوصی خبریں چھپتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی کچھ علمی اور ادبی مواد بھی شائع ہوتا تھا۔ مقبول احمد انصاری کا انتقال ۱۶ر مارچ ۱۹۶۵ء کو ہو گیا مگر یہ ہفتہ وار اب بھی شائع ہو رہا ہے۔

جناب ایم۔ کوٹھیاوی راہی اردو کے مشہور افسانہ نگار اور شاعر نے ایک ہفتہ وار اشتراک محلہ ناتی پور خرد، گورکھپور سے جاری کیا اس کا پہلا شمارہ ۲۹ر مئی ۱۹۶۶ء کو نکلا تھا۔ یہ ہفتہ وار آنجہانی

باقی ص۱۳ پر

جسونت سنگھ ترانہ

۲۳۳۴، سیکٹر ۲۲۔ بی
چنڈی گڑھ، یو ٹی ۱۶۰۰۲۲

اردو صحافت
اور
مولانا ظفر علی خاں

برصغیر کی اردو صحافت کی تاریخ اس وقت تک مستند اور مکمل تصور نہیں کی جا سکتی جب تک "زمیندار" کے مولانا ظفر علی خاں "ہمدرد" کے مولانا محمد علی جوہر اور "الہلال" کے مولانا ابو الکلام آزاد کا اس میں تفصیلاً ذکر نہ ہو۔ ان سحر آفریں شخصیتوں نے اردو صحافت کو زندہ و تابندہ رکھنے کے لیے اپنی اپنی جگہ نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ظفر علی خاں کی خداوندانِ لندن کے خلاف قلمی محاذ آرائی جوہر کے اداریوں کی نشتر زنی اور آزاد کے قلم کی بے بدل روانی اور اسلوب نے اردو صحافت کو جلا دیکر یک گونہ آزاد صحافت کی طرح ڈالی۔ جس سے اس کے گیسو لکھی گئے اور سنور بھی۔

گو مذکورہ بالا تینوں بڑوں کے اسلوبِ نگارش میں جوش و ولولہ، بانکپن اور علمیت کا طنطنہ قریب قریب ایک جیسا ہی ہے مگر ایک بات جو مولانا ظفر علی خاں کو اپنے ہر دو جلیل القدر ہمعصروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی قومی اور صحافیانہ شاعری ہے۔ وہ پہلے صحافی تھے جنھوں نے صحافت کو شاعری کا تاج پہنایا اور صحافیوں کو خبروں، تبصروں اور واقعات کو شعری لباس پہنانے کا ڈھنگ سکھایا۔

حق تو یہ ہے کہ ظفر علی نے اپنی صحافیانہ زندگی کے ہر دور میں اور ہر گام پر اردو صحافت کی گراں قدر خدمت کی اور صحافیانہ منظر کی تابانی کے سامان بہم کیے۔ "زمیندار" اخبار کے ۱۹۲۵ء سے پہلے کے شمارے شاہد ہیں کہ مولانا نے تحریک آزادی کی جنگ لڑنے میں زیادہ تر صحافیانہ شاعری سے کام لیا اور یہ جنگ جس جرات مندانہ انداز سے لڑی اُس سے اپنی شخصیت کے نقوش صحافت کی تاریخ پر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیے۔ پریس ضبط کرائے۔ مالی اور ذہنی پریشانیوں کا نمونہ بنے۔ برسوں قید فرنگ میں رہے۔ ان دشواریوں کے باوجود ان کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔ اور وہ جنوں کی حکایاتِ خونچکاں لکھنے سے باز نہ آئے۔

انھیں آزادی ہر چیز سے پیاری تھی اور انگریز کی کوئی چیز بھی گوارہ نہ تھی۔ چنانچہ پہلی جنگِ عظیم کے آغاز سے کچھ سال قبل جب وہ ولایت گئے تو مراجعت پر وہاں کے روز و شب پر اپنے اخبار میں ایک طویل اداریہ سپرد قلم کیا۔ اس کی ابتدا اس شعر سے کی۔ جو برسوں زبان زد خاص و عام رہا ؎

چار چیز است تحفۂ لنڈن
خمر و خنزیر و روزنامہ و زن

اس اداریے کے منظرِ عام پر آتے ہی حکومت نے اخبار پر پابندی لگا دی اور دس ہزار کی رقم ضمانت کے طور پر داخل کرانے کا حکم دیدیا۔ مولانا کے پاس اتنی رقم کہاں تھی ایک کانگرسی دوست کے مشورہ اور بسیار اصرار پر چندہ کے لئے اپیل کی تو ایک دن میں مطلوبہ رقم جمع کر لی۔ اس وقت کے دستور کے مطابق عدالت میں نقدی کی صورت میں ضمانت پیش کرنے کے لئے آئے تو یہ شعر فی البدیہہ کہا ؎

"زمیندار" ہوگا حشر تک زندہ
یہ تو عرشِ اعظم سے تار آ گیا

اس طرح جلیاں والہ باغ کے جاں گسل سانحہ پر ایک طویل نظم "زمیندار" میں لکھنے اور کلمہ حق جابر سلطان کے آگے کہنے پر انھیں بھاری بھرکم رقم ضمانت کے طور پر عدالت میں پیش کرنے کو کہا گیا۔ اس

رقم کا مولانا نے کس طرح انتظام کیا اس بارے میں کچھ پتہ نہیں البتہ ان کے کچھ اشعار ذہن میں ضرور محفوظ ہیں ؎

حکومت جن دنوں پنجاب میں تھی مارشل لا کی
تو قابل دید تھی اوڈوائر کی غضبناکی
جب امرتسر میں ہم پر گولیاں برسیں تو ہم سمجھے
کہ بوندیں ہیں یہ اہلِ ہند کے خونِ تمنا کی
خدا کے قہر کی بجلی گرا کرتی ہے ظالم پر
مگر پنجاب میں اس برق کے مظلوم تھے نشانا کی

جب اس دور ذرا سا گزرا اور قتلِ عام پر دنیا کے احتجاج پر تحقیقات شروع ہوئی تو انھوں نے برسبیلِ ارتجال درج ذیل اشعار کہے جو ان کی بیباکی اور حق گوئی کا بیّن ثبوت ہیں ؎

ہلاکو کو عبث تاریخ میں بدنام کرتے ہیں
بچارے نے نہتوں پر دیا کب حکم فائر کا
مسلمان اور ہندو کو بھی ہے ناز اپنے سینہ پر
اسے گر غرّہ ہے بارود گولی کے ذخائر پر
کیا تھا بند ریوڑ کو قفس میں نو مہینے تک
دیا تھا کاٹ پر سنسر نے اس بجلی کے طائر کا
کھلا جب قتل کی تفتیش کا دفتر عدالت میں
بغل میں لائے بستہ داب کر گاندھی نظائر کا

جب گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک آغاز کیا تو مولانا ان دنوں نیشنلسٹ مسلمانوں کے سرخیل تھے۔ انھوں نے تحریک کے شروع ہونے پر ایک طویل نظم لکھی اور خوشی سے پابند سلاسل ہوئے افسوس کہ نظم یاد نہیں رہی صرف یہ مطلع ہی یاد ہے ؎

گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کر دیا
باطل سے حق کو دست و گریباں کر دیا

تحریک کے اختتام پر جب وہ رہا ہوئے تو کچھ طالع آزما سیاست دانوں جاہ طلبوں اور انگریز کے حاشیہ نشینوں کو کانگرس اور متحدہ قومیت کے خلاف صف آرا دیکھ کر اپنے خیر مقدمی جلسہ میں فی البدیہہ اشعار کہے ؎

ناقوس سے غرض ہے نہ مطلب اذاں سے ہے
مجھ کو اگر ہے عشق تو ہندوستاں سے ہے
تہذیبِ ہند کا نہیں چشمہ اگر ازل
یہ موجِ رنگ رنگ کی آئی کہاں سے ہے
ذرے میں گر تڑپ ہے تو اس خاکِ پاک کی
سورج میں روشنی ہے تو اس آسماں سے ہے

اس نظم پر جب کچھ فرقہ پرست مسلمان چیں بہ جبیں ہوئے تو "زمیندار" میں ایک اور طویل نظم لکھ کر سب کو خاموش کر دیا۔ اس کے صرف دو شعر ہی حافظہ میں محفوظ ہیں ؎

جب سے ہم میں آنربیل اور سر پیدا ہوئے
سوئے فتنے جاگ اٹھے اور شر پیدا ہوئے
حاسدانِ تیرہ باطن کو جلانے کے لیے
تجھ میں اے پنجاب اقبال و ظفر پیدا ہوئے

تحریکِ سول نافرمانی کے دوران جب آپ کو لوگوں کو آمادہ بہ بغاوت کرنے کے جرم میں دو سال قید کی سزا ملنے پر عدالت میں پیش کیا گیا تو عدلیہ کو جواب کے طور پر مخاطب کرتے ہوئے برسبیلِ ارتجال ارشاد فرمایا ؎

قسم ہے جذبۂ حبِ وطن کی بے پناہی کی
ہمارا ملک غیروں کا غلام اب رہ نہیں سکتا
ہمیں زنداں میں تم بھجواؤ یا سولی پہ لٹکا دو
یہاں قائم تو انگریزی نظام اب رہ نہیں سکتا
پشاور کی شہادت گاہ سے یہ پیغام آیا ہے
کہ بن جھکے مسلمانوں کا نام اب رہ نہیں سکتا

۱۹۳۱ء کی ۲۳ مارچ کی شام بجھی بجھی سی فضا اداس تھی۔ لاہور کے لوگ گاندھی جی کی اپیل پر بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی سزائے موت کی معافی کی خبر کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ اور اخبار والوں کی نظریں ریوٹر کے تار پر لگی ہوئی تھیں جب رات کے مہیب سائے گہرے ہو گئے تو یہ منحوس خبر پھیل گئی کہ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا ہے۔ اور راتوں رات لاشیں جلا کر راکھ دریائے ستلج کی نذر کر دی گئی ہیں۔ لاہور میں ہندو،

سکھوں اور مسلمانوں کے لیے بیاد جوش و خروش کے درمیان ماتمی جلسہ ہی جب مولانا ظفر علی خاں شہیدوں کو باچشم پرنم نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے اٹھے تو عوام نے تقریر کے بجائے نظم سنانے پر اصرار کیا اس موقع پر انھوں نے ایک طویل فی البدیہہ نظم کہی جس نے اہل جلسہ کو آبدیدہ کر دیا۔ کچھ شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

توانائوں کے بس میں ہے سراپائے حقارت سے
کروڑوں ناتوانوں کی تمنائوں کو ٹھکرانا
ہے جن کے دل میں آزادی کی دھن ان نوجوانوں کو
وطن کے عشق کی پاداش میں سولی پہ لٹکانا
بہا دینا کسی کی راکھ کو ستلج کی موجوں میں
کسی کی لاش اٹک کے پار خاک خوں میں تڑپانا
ملوکیت پرستوں کے لیے یہ بات آساں ہے
مگر دشوار ہے قانونِ قدرت کا بدل جانا
زوال اس سلطنت کا ٹل نہیں سکتا ہے ٹالے سے
خود اپنی ہی رعایا سے پڑا ہے جس کو ٹکرانا

جہاں مولانا ظفر علی خاں کو انگریز اور اسکے جی حضوریوں اور کاسہ لیسوں سے کد تھی وہاں وہ گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے جاں نثاروں میں سے تھے۔ چنانچہ ایک بار جب پنڈت جی لاہور میں ایک کانفرنس کے سلسلہ میں تشریف لائے۔ تو مولانا نے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے فی البدیہہ نظم کہی جس کا ایک شعر یوں تھا ؎

وطن کی عظمتوں کی راہ میں پل پل کے آئی ہے
جواہر لال نہرو کی سواری چل کے آئی ہے

یہ علیحدہ بات ہے کہ ۱۹۳۵ء کے بعد مولانا کے تیور بدل گئے اور ہر ایک کانگرس لیڈران کے خدنگِ قلم کی زد میں آگیا۔ متحدہ قومیت کا نعرہ انھوں نے طاقِ نسیان پر رکھ دیا اور قوم پرست جماعتوں سے برگشتہ ہوگئے الغرض ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک مولانا کے اشہب قلم کا کچھ اور ہی رنگ ڈھنگ تھا۔ اس سے حضرت مولانا کی سیاسی شہرت قدرے داغدار ضرور ہوئی۔ لیکن کانگرس سے جدا ہونے اور سیاسی لغزشوں کے باوجود ان کی شخصیت جنگِ آزادی کی تحریک کی تاریخ اور اردو صحافت کی تاریخ کا نا قابلِ فراموش باب بن چکی ہے۔ اگرچہ ان کی شاعری وقتی تھی پھر بھی ان کی قومی اور صحافیانہ شاعری کو کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

بہرکیف اس حقیقت میں کچھ کلام نہیں کہ سیاسی کوتاہیوں اور لغزشوں کے باوجود مولانا تاریخ ساز شخصیت تھے۔ اور انکی حیثیت اردو صحافت اور سیاسی شاعری کی تاریخ میں اس روشن مینار کی سی ہے جس کی ضوفشانی سے صحافت کا ہر گوشہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منور رہے گا۔ اور زندہ دلان پنجاب اس عظیم صحافی۔ شاعر اور فاضلِ اجل پر ناز کرتے رہیں گے۔

گورکھپور میں اردو صحافت (صفحہ ۹ کا بقیہ)

پروفیسر فراق گورکھپوری کی سرپرستی میں شائع ہوتا تھا۔ اشتراک میں ملکی و غیر ملکی خبریں باقاعدہ شائع ہوتی ہیں اور حالات حاضرہ پر بھرپور تبصرہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ معیاری ادبی اخبار بھی ہے۔ اس میں ملک کے مشاہیر ادب کے افسانے، مضامین، نظمیں اور غزلیں شائع ہوتی ہیں۔

گورکھپور کا ایک اخبار تاجور بھی ہے جس کے مدیر عاصم گونڈوی صاحب ہیں۔ اس کا پہلا شمارہ یکم جون ۱۹۶۴ء کو شائع ہوا۔ یہ ایک سال تک پندرہ روزہ رہا۔ پھر یکم جون ۱۹۶۵ء سے ہفت روزہ ہو گیا۔ اس اخبار میں عام طور سے خبریں شائع ہوتی ہیں مگر اس میں علمی و ادبی مواد بھی ملتا ہے۔

گورکھپور سے دو رسالے اور بھی نکلتے تھے جو اب بند ہوگئے ہیں ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے نبض ماہنامہ گورکھپور سے جاری کیا۔ اسی کا پہلا شمارہ یکم اپریل ۱۹۶۷ء میں نکلا اس کے صرف تین شمارے نکلے۔ اس کے بعد یہ بند ہو گیا۔ ماہنامہ پیکر بھی گورکھپور سے نکلا۔ اس کے مدیر مبارک اللہ تھے۔ اس کا پہلا شمارہ نومبر ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ اس کے چند شمارے نکلے۔ اس کے بعد یہ بھی بند ہوگیا

اس موقع پر گورکھپور کے تقریباً تیس اخباروں اور رسالوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ گورکھپور میں اردو صحافت کے ارتقاء اور اس کے فروغ میں گورکھپور نے باقاعدہ حصّہ لیا اور گورکھپور اردو صحافت میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔

*

غزلیں

شاربؔ لکھنوی
اسٹیٹ فارمیسی، موہان روڈ
لکھنؤ

دل میں اک سوزِ محبت کا عمل جاری ہے
جس کو بجھنا نہیں آتا یہ وہ چنگاری ہے

قافلہ جاگ اٹھا کوچ کی تیاری ہے
چھوٹ جائیں گے جنھیں نیند بہت پیاری ہے

کیا ضرورت ہے کہ دنیا تجھے پھر مارے
تم نے اک پھول جو مارا ہے وہی بھاری ہے

جب کھلے آنکھ تو خود دیکھنا اپنا چہرہ
وقت کے ہاتھ میں آئینۂ بیداری ہے

لوگ کہتے ہیں بہت جلد سویرا ہوگا
دل یہ کہتا ہے کہ یہ رات بہت بھاری ہے

روشنی روکے ہیں اس طرح یہ کالے بادل
جیسے سورج پہ اندھیروں کی عملداری ہے

گھر میں ہم اور ہیں۔ کچھ اور ہیں گھر کے باہر
زندگی کیا ہے فقط ایک اداکاری ہے

چشمکِ برق و شررِ گل کی ہنسی دل کی تڑپ
یہ کسی ایک ہی فنکار کی فنکاری ہے

ہم جو بچھڑے ہیں تو اس بات میں دونوں ہیں شریک
کچھ قدم سست ہیں کچھ راہ میں دشواری ہے

دل کی آواز ہے شعروں میں ہمارے شاربؔ
نبض پر ہاتھ ہے اور مشقِ سخن جاری ہے

حکیم جوہرؔ بہرائچی
۲۰۳ - اشر گنج بہرائچ

جب تک ترے مزاج میں گہرائیاں نہ تھیں
اتنے عروج پر مری رسوائیاں نہ تھیں

ہر درد کو دبا دیا بادِ سموم نے
چوٹیں ابھرتیں کیسے کہ پروائیاں نہ تھیں

وہ لوگ اس کی بزم میں داخل نہ ہو سکے
جن کے لبوں پہ حاشیہ آرائیاں نہ تھیں

حُسنِ ستمگری سے ہے اب تجھ میں جو نکھار
آذر کے بھی خدا میں یہ رعنائیاں نہ تھیں

اب تو زمیں پہ پاؤں بھی رکھتے نہیں ہو تم
ایسی تو ابتدا میں خود آرائیاں نہ تھیں

تم کم سے کم ستم کے تو عادی ہو رہ کے دور
جب پاس تھے کرم میں یہ گہرائیاں نہ تھیں

تعبیر کے بغیر تو جوہرؔ یہ حال ہے
اچھا ہوا جو خواب میں سچائیاں نہ تھیں

"بہت سی باتیں زندگی میں صرف ایک بار ہوتی ہیں" راجن بھیا نے بے دلی سے کہا اور اپنی بیوی کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھنے لگے جو طویل بیماری کے سبب سرخ سے سفید ہو گیا تھا۔ اس بیماری نے انھیں بے حد کمزور کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی آنکھیں، جو یوں بھی بڑی بڑی تھیں اور بھی بڑی لگنے لگی تھیں لیکن وہ ہر وقت مسکراتی رہتی تھیں۔ کبھی ہم لوگ زیادہ پریشان ہوتے تو وہ کہتیں۔

"کیا تم سمجھتے ہو میں راجن کو چھوڑ کر چلی جاؤں گی، اکیلے۔ میں ایسی بے وفا نہیں۔"

میڈیکل کالج کے کاٹج وارڈ نمبر ۵ کے اندر کے دالان سے چندر کانتا اوشا کے ہاتھ تھامے تھامے جنرل وارڈ کی سہ منزلہ عمارت کے پیچھے سے ابھرتے ہوئے چاند کو دیکھتی تو کہتی۔

"اوشا، راجن بھیا، ہر دم ہنسنے، قہقہے لگانے والے راجن بھیا کی زندگی میں کوئی راز ضرور ہے۔ لیکن وہ اس پر کیسا خوبصورت پردہ ڈالے رہتے ہیں۔"

اوشا راجن بھیا کے بارے میں یہ بات سن کر سوچتی کہ اس کی تردید کرے لیکن وہ چندر کانتا کے مزاج سے خوب اچھی طرح واقف تھی اور اسے اس قدر چاہتی تھی کہ اسے یہ بھی پسند نہ تھا کہ اس کی بات سے اختلاف کرے۔ اس لیے وہ کہتی "ممکن ہے۔"

"تم کہتی ہو ممکن ہے۔ میں کہتی ہوں اس کے علاوہ کچھ ممکن ہی نہیں" چندر کانتا کہتی۔ "لیکن وہ ہیں بہت گہرے —— ان کی تھاہ پانا مشکل ہے۔ بارہ سال ساتھ گذارنے کے باوجود بھابھی جی کو اس کا احساس تک نہ ہو پایا ہوگا" وہ کہتی "اور یہ بھی ممکن ہے کہ خود ان کو بھی جس کی یاد راجن بھیا دل میں چھپائے ہوئے ہیں، ان کی محبت کی شدت کا علم تک نہ ہو"

"یہ تو بالکل خیالی محبت ہوئی —— راجن بھیا پریکٹیکل انسان ہیں،" اوشا بمشکل بحث کرتی۔

"ہاں" چندر کانتا 'ہاں' کے الف کو کھینچتے ہوئے کہتی "لیکن یہ ضروری نہیں کہ عام زندگی کا پریکٹیکل انسان محبت کے معاملہ میں بھی ایسا ہی ہو۔"

اس موضوع پر دونوں پہروں بات چیت ہوتی لیکن کبھی کسی نتیجہ پر نہ پہونچتی کیونکہ دل ہی دل میں دونوں ایک دوسرے کو ناراض کرنے کے خیال سے بھی ڈرا کرتی تھیں۔

راجن بھیا نے یہ جملہ اس وقت کہا تھا جب ان کا چھوٹا بھائی کشن ہوسٹل کے پاس کی ڈھلان پر سدرشن کے ساتھ تقریباً ایک گھنٹہ بتا کر آیا تھا۔ اس دوران ان دونوں کے درمیان ایک بے معنی سی بات پر ایسی محبت بھری تکرار ہوتی رہی تھی جسے اس وقت کشن نے کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔

"کشن میں تم کو ایک بات بتانا چاہتی ہوں۔"

"اب بتانے کو رہ ہی کیا گیا ہے۔ تم ہاں تو پہلے ہی کہہ چکی ہو۔"

"وہ تو میں کہہ ہی چکی ہوں —— لیکن۔"

"لیکن کیا۔؟"

"تم یہ تو کہو کہ سننے کو تیار ہو تو میں کہوں"

"میں صرف دو باتیں سننے کے لیے تیار تھا۔ بلکہ صرف دو باتیں ہی ممکن تھیں۔ ہاں یا نہیں۔ تم انکار کر دیتیں تو بھی میں تمہیں اسی طرح چاہتا رہتا لیکن اب تو تم 'ہاں' کہہ چکی ہو"

تم نے سوچ لیا ہے، خوب اچھی طرح، تم نے مجھے سمجھ لیا ہے سدرشن نے کہا، اگر میں کہوں کہ میں تمہارے قابل نہیں تو" سدرشن کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔

"یہ بات تو میرے سوچنے کی ہے' تمہارے سوچنے کی نہیں" کرشن نے اپنے حساب سے بات ختم کر دی۔

"لیکن میری ایک بات تو سن لو" سدرشن نے ایک بار پھر کوشش کی۔

"اب نہیں جو کہنا ہے شادی کے بعد کہنا"

سدرشن کانپ گئی۔ اس کے لب تھرتھرائے، سارے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ اچھا ایک دن، بلکہ ایک گھنٹہ، نہیں صرف دس منٹ تم مجھے ایسے دے دو کہ میں جو کہوں وہ تم سن لو۔ اس کے بعد جو تم کہو گے وہ کر دوں گی۔ لیکن ایک بار"

"ایک بار نہ دو بار" کرشن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھتے ہوئے کہا "اب میں تمہیں راہِ فرار اختیار کرنے کا کوئی موقعہ نہ دوں گا۔ سمجھیں" کرشن نے سدرشن کے گال تھپتھپائے۔

"پلیز کرشن" اس نے التجا کی۔

"نو پلیز"

یہ بات ۹ر نومبر کی تھی۔ ۱۰ر نومبر کو سدرشن بھابھی کو دیکھنے نہ آئی۔ ہم سب نے رات گئے تک اس کا انتظار کیا۔ پھر یہ سوچ کر شاید ایمرجنسی ڈیوٹی لگ گئی ہو ہم سب سو گئے۔ اگلے دن بھی سدرشن کا انتظار رہا۔ لیکن وہ شام کو میں اور چندر کانتا سدرشن کی تلاش میں اسپتال گئے جہاں وہ سینئر نرس تھی۔ دریافت کرنے پر وارڈن نے گول مول جواب دیا پرسوں تو تھی۔ کچھ بیمار سی لگتی تھی۔ یہیں کہیں ہوگی"

پھر ہم دونوں نے دوسری نرسوں سے دریافت کیا لیکن کوئی بات معلوم نہ ہو سکی ہاں یہ ضرور اندازہ ہوا کہ ان میں سے ہر ایک کچھ نہ کچھ چھپا رہا ہے۔ اس کے کمرہ کے باہر تالہ لٹک رہا تھا۔ ہم دونوں زیادہ مایوس، زیادہ الجھے ہوئے اور زیادہ پریشان لوٹ ہی رہے تھے کہ باہر پھاٹک پر گہرے گندمی رنگ کے بھاری بھرکم جسم اور گھنی مونچھوں والے ڈاکٹر سرکار اور ان کے دوست ڈاکٹر جوہری پر نظر پڑی۔ یہ دونوں بھابھی کو دیکھنے برابر ہی آیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر سرکار کی آنکھیں سرخ تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ بولے 'سدرشن' اس کے آگے ان کی آواز گویا گلے کے قبرستان میں دفن ہو گئی۔

"سدرشن کہاں ہے" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"میرے ساتھ چلو" انھوں نے کہا اور سنہرے فریم کا اپنا نازک سا چشمہ اتار کر آنسو پونچھنے لگے۔

کمرہ نمبر ۹۔ ومین ہاسٹل۔ وقت ۷ بجے شام

سدرشن بستر پر پڑی تھی۔ سرہانے اسٹینڈ پر گلوکوز کی بوتل الٹی ٹنگی تھی۔ دوسری طرف اسٹینڈ پر خون کی بوتل ٹنگی تھی۔ لیکن اس وقت خون دیا نہیں جا رہا تھا۔ دو تین نرسیں جو اس کے پاس پریشان پریشان سی کھڑی تھیں ہم لوگوں کو دیکھتے ہی کمرہ کے باہر چلی گئیں۔

سدرشن نے مجھے اور چندر کانتا کو دیکھا اور بس دیکھتی ہی رہی لیکن اس کی آنکھوں میں کوئی چمک نہ تھی۔ ہم لوگوں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور انھیں سہلانے لگے۔ پھر بھی وہ اسی طرح ہم دونوں کو دیکھتی رہی۔ اسی لمحہ کرشن اور راجن بھیا آ گئے۔ انھیں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا لیکن راجن بھیا بظاہر پرسکون تھے اور کرشن خاموش، پریشان۔

کرشن کو دیکھتے ہی اوشا کے ہونٹ ہلے۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن آواز نے ارادہ کا ساتھ نہ دیا۔

کچھ نہیں ہوا ہے" کرشن نے آنسوؤں سے لڑتے ہوئے کہا "تم اپنا فیصلہ نہ بدلنا۔ میں اب بھی اپنے فیصلہ پر قائم ہوں" کمرہ کے باہر لیڈی ڈاکٹر نے سرکار سے شائد کوئی سخت بات کہی جس کے جواب میں اس نے نہایت تلخ لہجہ میں انگریزی میں کہا۔

"میں ساری ذمہ داری قبول کرتا ہوں اور شادی کے لیے تیار ہوں"

"لیکن یہ شادی کا سوال نہیں۔ قتل کا سوال ہے۔ اگر سدرشن مر گئی اور اب وہ موت کے بالکل قریب پہنچ چکی ہے، تو اس کے قاتل تم

قرار پاؤ گے۔"

"مجھے اپنا یہ جرم بھی قبول ہے۔"

ڈاکٹر سرکار نے اسے لاجواب کر دیا تو وہ کھٹ کھٹ کرتی دوسرے کمرہ میں چلی گئی۔

سدرشن کے کمرہ کا دروازہ بند ہونے کے باوجود ہم نے یہ ساری باتیں سن لی تھیں۔ اسی لمحہ دروازہ دھیرے سے کھلا اور لیڈی ڈاکٹر جو اپنے غصہ کے لیے خاص طور پر ایسے مردوں پر غصہ کرنے کے لیے جو اپنی بیویوں کو اس وقت اسپتال لاتے ہیں جب وہ زندگی اور موت کے درمیان پل کی دوسری ڈھلان پر پہونچ جاتی ہیں، مشہور تھی، اندر داخل ہوئی۔

"آپ مریضہ کے کون ہیں؟"

"آپ کون ہیں؟"

"آپ کا ان سے کیا رشتہ داری ہے؟"

اس نے ہم میں سے ایک ایک سے پوچھا اور جواب میں ہمیں خاموش پا کر ہم سب کو کمرہ سے باہر کر دیا۔

"یہ کوئی تماشہ نہیں ہو رہا ہے — آپ لوگ باہر چلیں۔"

اس دوران کسی کے بتائے بغیر میں اور چندر کانتا بھی حالات کی پوری سنجیدگی اور اس صورت حال کے سبب واقف ہو گئے تھے۔ ہم دونوں خاموش نظروں سے کشن کو دیکھتے رہے جو بت بنا کھڑا تھا۔ ڈاکٹر سرکار جو کشن کے برابر ہی بیٹھے ہوئے تھے، ان کے کندھے پر ہاتھ رکھے انھیں سہارا دیے ہوئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس کی حالت زیادہ قابل رحم ہے۔ ڈاکٹر سرکار کی جو سدرشن کے جسم کی خوشبو سونگھ چکا تھا یا کشن کی جو اس خوشبو کی امید ہی سے سرشار تھا۔ چندر کانتا البتہ سرکار سے بھی خفا تھی اور کشن سے بھی۔

"میں یہ نہیں کہتی کہ سرکار کو سدرشن سے دوستی کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ میں اس تعلق کو بھی ناجائز نہیں سمجھتی۔ میں تو کہتی ہوں کہ جب سدرشن اور کشن کی شادی کی بات ہو رہی تھی تو اس نے آگے بڑھ کر یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ وہ سدرشن سے محبت کرتا ہے اور چند ماہ بعد وہ اس کے بچہ کی ماں بننے والی ہے۔ اب بڑا بہادر بنتا ہے۔"

"میں ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔" اس نے ڈاکٹر سرکار کی نقل کی۔ "بزدل کہیں کا۔ بہادر لوگ اپنے بچہ سے اس کے پیدا ہونے سے قبل یوں جان چھڑانے کی کوشش نہیں کرتے۔"

میں نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تو وہ بپھر پڑی۔

"اور تمہارے بھیا کشن میں ان کی جگہ ہوتی تو"

اسی لمحہ میں نے چندر کانتا کو خاموش رہنے کے لیے آنکھوں سے اشارہ کیا کیونکہ کشن جو اپنے خیالوں میں غرق کاریڈور کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگا رہا تھا ہم دونوں کے قریب ہی آ گیا تھا۔ لیکن چندر کانتا پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا "میں کسی سے ڈرتی نہیں ہوں۔ سچ بات ضرور کہوں گی۔ میں ان کی جگہ ہوتی تو ایسی لڑکی کو کتے کی موت مر جانے دیتی۔ ایک بار بھی اس کی صورت نہ دیکھتی۔ وہ کشن کے بارے میں سنجیدہ تھی تو اسے ان کو ساری بات بتانا تو چاہیے تھی۔"

کشن نے جملہ کا آخری حصہ سن کر باقی ساری بات بھی سمجھ لی اور چندر کانتا کی طرف دیکھے بغیر بولے۔

"دوسروں کو الزام دینا کس قدر آسان ہے — ویسے آپ کی اطلاع کے لیے سدرشن نے مجھے یہ بات بتانے کی کوشش کی تھی۔"

کشن کے "آپ" نے چندر کانتا کو بے سدھ کر دیا اور وہ خاموش خاموش نظروں سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔

۲۱ نومبر۔ ۵ بجے شام

ہم لوگ کمرہ نمبر ۹ کے باہر بے چین، مضطرب کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر قبل ایک نرس کمرہ سے تیزی سے نکلی تھی۔ اور چند منٹ بعد لیڈی ڈاکٹر کو آپریشن تھیٹر سے ملے ہوئے ہال سے بلا کر لے آئی تھی۔ کچھ دیر بعد لیڈی ڈاکٹر کمرہ سے نکلی۔ وہ بے حد گمبھیر اور برہم معلوم ہوتی تھی۔ لیکن بولی کچھ نہیں اور سیدھے اسی ہال میں داخل ہو گئی۔ جہاں سے اسے نرس بلا کر لائی تھی۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور نرس نے اپنا آدھا جسم باہر نکال کر کہا۔

"آپ لوگ ایک ایک کر کے مریض کو دیکھ لیں۔"

ہم سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ سب سے پہلے راجن بھیا اندر گئے اور چند لمحوں میں واپس آ گئے۔ اس کے بعد ہم سب ایک ایک کر کے اندر

جانے لگے۔ میں نے دیکھا سدرشن کی آنکھیں تقریباً پتھرا گئی تھیں۔ اور آکسیجن کی نلی اس کی ناک سے نکال دی گئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ بستر پر اس طرح پھیلے تھے کہ ہتھیلیاں کھلی ہوئی تھیں لیکن اب اس کا مستقبل جاننے کے لیے ان کی لکیروں کو پڑھنے کی ضرورت نہ تھی۔
اس کے بعد ڈاکٹر سرکار اندر گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ان کے رونے کی آواز باہر تک سنائی دے رہی تھی۔ نرس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انھیں باہر پہنچا دیا۔ ہم میں سے کسی کو ان کے آنسوؤں سے ہمدردی نہ تھی، لیکن ہم سب خاموش تھے۔ کسی نے اپنے غصہ یا نفرت کا اظہار بھی نہ کیا تھا۔ نہ الفاظ سے نہ اپنے چہرہ کے تاثرات سے لیکن چندر کانتا کے لیے یہ سب کچھ برداشت کرنا مشکل تھا۔ وہ ویسے بھی اپنی پسند ناپسند چھپا نہیں پاتی تھی۔ اس نے سامنے لان کی طرف منہ کر کے زور سے تھوک دیا۔
کشن بھیا اندر جانے لگے تو میں بھی۔ اس کے ساتھ ہو گئی۔ انھیں دیکھتے ہی سدرشن کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی۔ ممکن ہے مجھے یہ چمک اس لیے نظر آ رہی تھی کہ وہ آنکھیں اس وقت کشن بھیا کو دیکھ رہی تھیں لیکن اتنا تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ اس وقت وہ ایسی پتھر نہیں تھیں جیسی اس وقت تھیں جب تھوڑی دیر قبل میں نے انھیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں حرکت ہوئی۔ میں تو اس کے معنی نہ سمجھ سکی لیکن کشن بھیا نے آگے بڑھ کر سدرشن کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر نہایت نرم انگلیوں سے اس کے پپوٹوں کو چھوا اور اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بس اس قدر کہہ سکے۔

"رخصت — اچھی سدرشن رخصت"۔

اس وقت ان کی حالت واقعی قابل رحم تھی۔ آنسوؤں کو روکنے کے لیے انھیں بے حد جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ میں نے سہارا دینے کے لیے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا اور دھیرے دھیرے ان کو دروازہ کی جانب لے چلی۔ دروازہ کے قریب آ کر انھوں نے مڑ کر ایک بار پھر سدرشن کی طرف دیکھا۔ ایک لمحہ کے لیے رکے اور زیر لب بولے۔
"سدرشن میں تجھے کبھی نہ بھولوں گا، کبھی نہ بھول سکوں گا"۔

چند منٹ بعد نرس کمرہ سے باہر نکلی۔

"اٹ از اوور، آل از اوور"

اب ہم سب نے سنجیدہ بنے رہتے، خود سے لڑ کر اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش چھوڑ دی۔ کشن بھیا نے جن کے کندھے اس وقت جھکے جھکے لگ رہے تھے اپنے چہرے پر ایک ایسی مسکراہٹ بکھیری جس کو ترجمہ مایوسی کا نام دے سکتی ہوں، نہ غم کا، نہ غصہ کا، نہ قسمت کے آگے بے دست و پا ہو جانے کا۔ اس میں سب کچھ تھا اور کچھ بھی نہ تھا اور پھر ہار مان لی۔ آنسوؤں کے قطرے ان کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔

تقریباً ایک سال بعد سدرشن کی بڑی بہن ارچنا سے، جو شکل و صورت بات چیت کرنے، مسکرانے کے انداز، غرض ہر طرح سدرشن کی جڑواں بہن معلوم ہوتی تھی کشن بھیا کی شادی ہو گئی۔ اب اسے بھی کئی سال بیت گئے ہیں۔

پیاری چندر۔ تیرا خط ملا تھا۔ (دیکھ نہ کہنا کہ پتہ ٹھیک لکھا تھا اس لیے ملا ہی ہوگا) میں فوراً جواب نہ دے سکی۔ (اس کے لیے کونسا بہانہ ڈھونڈھوں کہ سارے بہانے تو پہلے ہی بنا چکی ہوں۔ تو بھی کہتی ہوگی کہ بیس سال ادھر کی کہانی دہرانے کی مجھے کیا ضرورت آن پڑی اور وہ بھی اس طرح کہ کشن نے میڈیکل کالج کے ڈھال پر، ہوسٹل کے پاس سدرشن سے اپنی آخری ملاقات کی جو کہانی اس کی موت کے بعد سنائی تھی، وہ بھی پوری کی پوری نقل کر دی اور اگر ایسی کوئی ضرورت بھی تھی تو بس سیدھے سادے طریقے سے بیان کر دیتی۔ ایسا کرنا آسان بھی تھا لیکن میں نے سوچا ساری باتیں اسی ترتیب سے بیان کر دوں جس ترتیب سے میرے ذہن میں نقش تھیں کہ شاید تجھے سب کچھ اس قدر تفصیل سے یاد نہ ہو۔
پچھلے مہینہ شانتی بھابھی ایک دم بیمار پڑ گئیں۔ میں آج کل بھابھی کے گھر آئی ہوئی ہوں اور یہ خط وہیں سے لکھ رہی ہوں۔ ڈاکٹر بلایا گیا تو اس نے ایک انجکشن لکھ کر دیتے ہوئے کہا کہ اسے جلد سے جلد حاصل کیجیے۔ مشکل سے ملے گا۔ گھر کے پاس دواؤں کی دوکانیں ہیں لیکن وہاں انجکشن نہ ملا تو ہم دونوں گھبرا گئے۔ اس وقت گھر میں اور کوئی نہ تھا

ارچنا بیکھ گئی ہوئی تھی اور کرشن پچاس ساٹھ میل دور ایک ندی پر لے ہوا رہے تھے۔ میں نے راجن بھیا سے کہا "آپ حضرت گنج میں تلاش کیجیے میں امین آباد جاتی ہوں۔ کسی نہ کسی دکان پر مل ہی جائے گا۔ دونوں کو بھی مل گیا تو کوئی حرج نہیں۔ راجن بھیا ایسے گھبرائے ہوئے تھے کہ میری بات مان گئے۔

میں نے امین آباد میں ایک ایک دکان چھان ماری لیکن وہ انگشن نہ ملا تو میں قیصر باغ چلی گئی۔ وہاں دواؤں کی ایک دکان میں داخل ہونے جا ہی رہی تھی کہ راجن بھیا رکشہ سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں نے ہاتھ کے اشارہ سے پوچھا کہ انگشن ملا یا نہیں تو انہوں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ میں جلدی سے دکان میں داخل ہو گئی۔ راجن بھیا میرے پیچھے تھے میرے سامنے سے ادھیڑ عمر کی ایک عورت، ایک بچے کا ہاتھ پکڑے دکان سے باہر نکل رہی تھی۔ وہ راجن بھیا کو دیکھ کر ٹھٹک سی گئی۔ راجن بھیا نے بھی اس کی طرف دیکھا لیکن مجھے اپنی جانب دیکھتے پا کر انھوں نے نظریں دوسری طرف کرلیں۔ اس عورت نے ایک بار پھر راجن بھیا کی طرف دیکھا۔ بچہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ اس نے بچہ کا ہاتھ دوبارہ پکڑنے کے لیے اپنی آنکھوں سے زیادہ اپنے ہاتھ سے کام لیا اور آخر کامیاب ہو گئی اور دھیرے دھیرے دکان کے دروازے کی جانب بڑھنے لگی۔ مجھے ایسا لگا کہ اس کی پتلیوں پر پانی کی ایک تہہ سی جم گئی تھی جس کی وجہ سے اسے پاس کی چیز بھی دھندلی دھندلی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر راجن بھیا کی طرف دیکھا۔ وہ نہایت سکون سے دکاندار کو انگشن کی قیمت دے رہے تھے۔

دکان سے باہر نکل کر راجن بھیا نے پتلون کی جیب سے رومال نکالا اور مجھے سناتے ہوئے زیر لب بولے۔

"کس قدر گرد ہے" یہ کہہ کر انھوں نے چہرہ پر سے گرد صاف کرنے کے بہانے رومال سے آنکھوں کے کونے پونچھے۔

—— جہاں وہاں آنسو تھے۔

راجن بھیا اور کرشن کے آنسوؤں میں سے کون زیادہ قیمتی تھے یہ شاید ایک ایسی بات ہے جس پر ہم دونوں میں کوئی اختلاف نہ ہو اس لیے اسے بتانے کی ضرورت بھی نہیں۔

ہاں یہ بتانا بھول ہی گئی کہ خالہ بھی اب بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ مجھے خط لکھنے میں جو دیر ہوئی اس کی وجہ ان کی بیماری بھی تھی۔

تیری اپنی اوشا۔

چندر پرکاش جوہر بجنوری
۶۔ ریوا بلڈنگ لیڈر روڈ
الہ آباد۔ ۳

غزل

گل و سمن نہیں گلچیں تو خار رہنے دے
چمن میں کچھ تو نشانِ بہار رہنے دے

تجھے جنوں کی قسم اے دلِ سکوں دشمن
تمام عمر مجھے بیقرار رہنے دے

یہ حادثاتِ محبت ہیں آج بھی دلکش
اگر سکوں سے غمِ روزگار رہنے دے

کہیں نہ حسرتِ خوابیدہ پھر سے جاگ اٹھے
نوازشِ نگہِ فتنہ کار رہنے دے

فریبِ عدۂ فردا بہت غنیمت ہے
مزاجِ دوست اگر برقرار رہنے دے

نفس نفس ہے محبت میں دائمی جوہرؔ
مگر جو زندگی مستعار رہنے دے

سرشید احمد
آنگن، بنیاد گنج گیا ۔ ۸۲۳۰۰۳

گاندھی اور نہرو کا شارح

ڈاکٹر سیّد عابد حسینؔ

ڈاکٹر سید عابد حسین آدرش سیکولر مزاج اور صحت مند قوم پروری کا جذبہ لے کر دنیائے علم و ادب میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے سیکولر قوم پرستی کو ایک باضابطہ فلسفۂ حیات بنا ڈالا اور اپنی ساری زندگی اسی فلسفے کے اصولوں پر ڈھال لی۔ سیکولر قوم پرستی انکی سرشت میں دور تک سرایت کر گئی تھی۔ اور انکے مزاج کا خصوصی وصف بن گئی تھی۔ سیکولر مزاجی اور قوم پروری عابد صاحب کے لئے مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو سے قربت اور فکری ہم آہنگی کا وسیلہ بن گئی۔ دوسری طرف گاندھی اور نہرو کی قربت نے انکی اس مخصوص طرزِ فکر کو مزید گہرا کر دیا۔ انکی زندگی کے تمام شعبوں پر سیکولر قوم پروری کا دبیز غلاف منڈھ گیا۔ اور انکی سوچ و فکر اور فکروں کی تعبیر و تفسیر سب پر ہندوستان کے دو عظیم رہنما مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کا اندازِ نظر حاوی ہو گیا۔

بدم جوشن عابد حسین کی انگریز نوازی سے قوم نوازی کی جانب آمد کا ذریعہ بھی گاندھی جی کی ہی ذات بنی۔ ضیاء الحسن فاروقی کے استفسار کے جواب میں عابد حسین نے اپنی تبدیلیٔ فکر کی وضاحت یوں فرمائی ہے۔

> "پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں انگریزوں کا طرفدار تھا۔ پائنیر پڑھتا تھا۔ اور میرے سیاسی خیالات وہی تھے جنکی تبلیغ پائنیر کرتا تھا۔ لیکن جلیان والا باغ کا مجھ پر بہت اثر تھا۔ اسی زمانے میں مجھ پر گاندھی جی کی ایک تقریر جو معاشیات سے متعلق تھی اور جس میں پیداوار اور تقسیم پیداوار سے بحث کی گئی تھی بہت اثر ہوا۔ سامراجی نظام کی چیرہ دستیاں مجھ پر واضح ہونے لگیں۔ ...... میرے خیالات بلکہ طرزِ خیال ہی بدل گیا ......"

طرزِ خیال بدلنے کے بعد عابد صاحب نے گاندھی اصولوں کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا۔ اردو میں گاندھی واد کی تبلیغ کا بیڑہ اٹھایا۔ اور یوں عابد صاحب کا قلم گاندھی جی کے خیالات کی ترجمانی کے لیے وقف ہو گیا۔

۱۹۳۲ء کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں مہاتما گاندھی نے جو تقاریر کی تھیں اور جنکو پیارے لال نے "NATIONS' VOICE" کے عنوان سے مرتب کیا تھا۔ کا اردو ترجمہ عابد حسین نے بعنوان "قوم کی آواز" کیا۔ پیارے لال کی ایک اور ترتیب دادہ کتاب "گاندھی جی بادشاہ خاں کے دیس میں" کے نام سے کیا۔ مہاتما گاندھی کے ایک مضمون کا عابدی ترجمہ "اخلاقی زوال کے آثار" ۱۹۳۳ء میں منظر عام پر آیا۔ ۱۹۴۶ء میں مہاتما گاندھی کی شہرۂ آفاق تصنیف "MY EXPERIMENTS WITH TRUTH" کا "تلاش حق" کے عنوان سے دو جلدوں میں ترجمہ کیا۔ گاندھی جی کی دو اور اہم کتابوں "ALL MEN ARE BROTHERS" (سب انسان بھائی بھائی ہیں) اور SELF CONTROL V. S. SELF INDULGANCE. ("ضبطِ نفس اور نفس پرستی") کو اردو میں منتقل کرنے کا سہرا بھی عابد حسین ہی کے سر ہے۔ مذکورہ تراجم سے گاندھیائی نظریے کی تبلیغ کے جذبے کی تسکین نہ ہوئی تو عابد حسین نے مہاتما گاندھی پر اوریجنل مضامین لکھنا شروع کیا۔ اور کبھی "باپو کی زندگی اور ان کے پیام" کی تفسیر و تشریح بیان کی کبھی گاندھی جی کی سادگی کو سپردِ قلم کیا۔ کبھی گاندھی جی کے "فلسفۂ حیات" پر قلم اٹھایا اور کبھی "گاندھی جی کی فلسفی اور ادیب" کی حیثیت کو موضوعِ بحث بنایا۔

اس کے [illegible] ہوا تو ۱۹۶۹ء میں ایک مکمل کتاب "GANDHI AND COMMUNAL UNITY" (انگریزی) تصنیف کر ڈالی۔

عابد صاحب مشرق کے بھی معترف تھے اور مغرب سے بھی متاثر وہ مشرق و مغرب کے مابین کشمکش اور تناؤ نہیں مفاہمت اور ہم آہنگی دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ مغرب کے صنعتی نظام اور جدید مشینوں سے مستفید ہونے کو مفید خیال کرتے تھے۔ جدید کلچر کی خوبیوں کے معترف اور شارح تھے اور مشرقی تہذیب و تمدن کی بنیادی قدروں کے رسیا اور دلدادہ۔ اپنی اس خصوصیت کے سبب جہاں عابد حسین کی تشریحی اور تفسیری صلاحیتیں گاندھیائی خیالات کی تبلیغ کا ذریعہ بنیں وہیں قلم عابد نہرو ازم کی اردو میں اشاعت کا وسیلہ بنا۔

عابد حسین نے پنڈت جواہر لال نہرو کی تین معرکتہ الآرا تصانیف "DISCOVERY OF INDIA" ("تلاشِ ہند")، "AN AUTO BIOGRAPHY" ("میری کہانی") اور "GLIMPSES OF WORLD HISTORY" ("جگ بیتی") کے تراجم شگفتہ نثر میں کئے۔ یہ وقیع کتابیں مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوئیں مگر بعد ازیں بھی نہرو ازم کی تبلیغ سے عابد صاحب کی سیری نہ ہوئی تو ایک پر مغز مضمون "جواہر لال نہرو — انسانیت، امن اور رواداری کا علمبردار" لکھا جو آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے نشر ہوا۔ — پنڈت نہرو کی ہی ایما پر ۱۹۶۲ء میں عابد حسین آئی۔ سی۔ آر۔ سے بحیثیت ادبی مشیر منسلک ہوئے تو آٹھ سال کی اس مدت ملازمت میں مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو جیسی عبقری سیاسی شخصیتوں پر بے شمار تقاریر تیار کیں اور ریڈیو سے نشر کروائیں۔ عابد حسین کی تالیف "کیا خوب آدمی تھا" اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

ڈاکٹر سید عابد حسین کی پالیسی صلح کل کی تھی اور ان کا مزاج صلح جو۔ وہ مفاہمت اور سمجھوتے کے رسیا تھے۔ مشرقی روایات کے امین تھے اور مغربی تعلیم کے دلدادہ و شیدا۔ وہ قدیم و جدید کی خوبیوں کا اکتساب کرکے ایک نئی راہ بنانے پر قادر تھے۔ دو متضاد نظریوں کو ہم آہنگ اور ہم آمیز کرکے جدید سالم نظریہ قائم کرنے میں اپنی مثال آپ تھے۔ اپنے اسی بے مثال وصف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گاندھی اور نہرو کی فکروں کے درمیان مفاہمت اور سمجھوتے کا شرف بھی اس طرح حاصل کیا کہ ایک وقیع اور جامع کتاب "WAY OF GANDHI AND NEHRU" (انگریزی) تصنیف کیا۔ دو سالوں بعد یعنی ۱۹۶۱ء میں اس تصنیف کو اردو میں بعنوان "گاندھی اور نہرو کی راہ" منتقل کرکے عابد حسین نے گاندھی جی اور نہرو جی کے نظریاتی بُعد کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ اردو میں گاندھی ازم اور نہرو ازم کے مشترکہ سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کی شائع کردہ ۲۷۰ صفحے کی یہ کتاب اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اردو میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی اور (ابتک کی) آخری کتاب ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے اس کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے انھوں نے بھی اس کتاب کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔

ہند کی تعمیر نو اور نئی تہذیب کی جستجو میں عابد صاحب نے ہندستان کی دو متوازی روحوں کی دریافت کی ہے۔ ایک قدامت و شرقیت کی روح ہے جو گاندھی کے پیکر میں نمایاں ہوئی دوسری جدت و مغربیت کی روح ہے۔ جو نہرو کی شخصیت میں نمودار ہوئی — "گاندھی اور نہرو کی راہ" اصلاً ان تناقضات کو عبور کرنے کے لیے لکھی گئی ہے جو ان دونوں رہنماؤں کے خیالات و تصورات کے مابین حائل تھے خود عابد حسین فرماتے ہیں۔

> "ہمارے ذہنوں میں الجھن جسے دور کرنے کی ناچیز کوشش اس کتاب میں کی جارہی ہے۔ یہ ہے کہ نئی زندگی کے جو تصورات گاندھی جی اور جواہر لال کے ذہن میں تھے ان میں کس حد تک اشتراک اور کتنا اختلاف ہے؟ اور اس اختلاف میں کہاں تک مصالحت پیدا کی جاسکتی ہے۔"

اس کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر عابد حسین کے دیرینہ رفیق ڈاکٹر ذاکر حسین نے قلم بند کیا ہے۔ ذاکر حسین نے بھی ان دونوں بزرگوں کے تضاد فکر اور تفاوت مقاصد کا اعتراف کرتے ہوئے اس الجھن کا اظہار کیا ہے جو اس کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔

> "گو یہ کئی لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ ان کی ذہنی ساخت میں اور ان شخصی مقاصد میں جو [illegible]

دیتے تھے بظاہر بہت فرق تھا پھر بھی باہمی رفاقت محبت اور احترام کے نازک رشتوں میں کچھ اس طرح بندھے ہوئے تھے کہ مہاتما جی نے اپنے رفیق کے بارے میں جو ان سے عمر میں کم تھا صاف لفظوں میں یہ اعلان کر دیا کہ وہ ان کے سیاسی وارث تھے۔ پھر بھی یہ دونوں جس طرح سوچتے تھے اس سے ان کے نقطۂ نظر میں بنیادی فرق کا پتہ چلتا ہے۔ اور ہندوستان کی موجودہ نسل جو ایک نئی زندگی کی تعمیر میں مصروف ہے جس کے لیے ان دونوں کی ذات یکساں کشش رکھتی ہے بعض اوقات بڑی الجھن اور پریشانی میں پڑ جاتی ہے۔"

سچ تو یہ ہے کہ گاندھی اور نہرو کا جتنا گہرا مطالعہ اور جتنا قریبی دیدار عابد صاحب کی نگاہوں نے کیا ہے اور ان دونوں کی عقیدت و پیروی میں جتنی دور تک چلے گئے ہیں اسکی وجہ سے ان دونوں کے تضادات خود عابد صاحب کے لیے الجھن کا باعث اور اس کو حل کرنا ان کا ذاتی مسئلہ بن گیا تھا۔ اور بقول ذاکر حسین (مشترکہ ملکیت) "ان دونوں کی شعور کی گہرائیوں میں احساس فکر اور عمل کی جو وحدت موجود ہے اسے دیکھنے کے لیے ایک ترکیبی بلکہ شاید باطنی نقطہ نظر کی ضرورت ہے۔" جو عابد صاحب کے علاوہ بہت کم خوش نصیب لوگوں کو نصیب ہوا ہے اس لیے اس جذباتی کشمکش اور نفسی الجھن سے نجات کی راہ دکھانا عابد صاحب ہی کی ذمہ داری تھی اور اس ذمہ داری کو انھوں نے اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ دونوں میں سے کسی کو چھوڑنے کی نوبت نہیں آئی۔

کتاب کا پہلا باب "سچائی اور محبت کا مذہب" ہے اس باب میں عابد صاحب نے گاندھی جی کے تصور زندگی سے بحث کی ہے جن کا ذکر مذہب کی بنیاد ذاتی تلاش اور واردات قلب کو بنایا ہے اس باب میں عابد صاحب پہلے مذہبی اصلاح اور نشاۃ ثانیہ کے اثرات کے حوالے سے موہن داس کرم چند گاندھی کے دل میں ہندوستان کی مذہبی روح کو ایک نئی کروٹ لیتے دیکھتے ہیں۔ پھر گاندھی جی کے نشو و نما ذہنی و فکری ارتقا کے حوالوں سے اور انکے اقوال و اعمال کی روشنی میں گاندھی جی کی ایسی تصویر کشی کرتے ہیں جس میں پیغمبرانہ شان کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کے بعد گاندھی جی کے خیالات کا ایک ربط جو کہ پیش کرنے سے پہلے تسلیم کرتے ہیں۔

"ہر چند کہ گاندھی جی کے خیالات میں وہ منطقی ربط نہیں
پایا جاتا جو باقاعدہ فلسفیوں کے نظام فکر میں ہوتا ہے
لیکن اس سے زیادہ گہرا اندرونی ربط موجود ہے جو
صرف ایک منضبط اور سالم شخصیت سے تعلق رکھتا ہے۔"

آگے چل کر گاندھی جی کی اصطلاحوں کی تعبیر و تفسیر کی ہے جنھیں وہ کثرت سے استعمال کرتے تھے۔ مثلاً ستیہ جو گاندھی جی کے یہاں حق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یا مثلاً "اہنسا" جو ایجابی حیثیت سے وسیع ترین محبت اور انتہائی عفو کا مفہوم رکھتا ہے۔ اور دوسرے تمام اصطلاحوں کی تفہیم خود گاندھی جی کے بیانات اور وضاحتوں کے حوالے سے کی ہے۔

گاندھی جی کے تصور مذہب کے چار اخلاقی ستون ہیں ۱۔ ستیہ (حق پرستی) ۲۔ اہنسا (تقویٰ) ۳۔ برہمچریہ (ضبط نفس) ۴۔ اپری گرہ (عدم ملکیت) مگر یہ چاروں ستون انھوں نے قدیم مذہبی معتقدات سے اخذ کیے ہیں۔ عابد صاحب اس کو دوسرے انداز سے فرماتے ہیں۔

"ہندو دھرم کے وسیع خزانہ میں جہاں ستیہ، اہنسا،
برہمچریہ، اپری گرہ کی اخلاقی اقدار تھیں وہاں اوتار،
پنر جنم، ورناشرم، گؤ رکھشا اور مورتی پوجا کے ازعانی
عقائد بھی تھے۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ عام عقیدے
کے مطابق آخر الذکر کو ہندویت کے جوہر کی اول الذکر
کو اعراض کی حیثیت حاصل تھی۔ گاندھی جی نے اس
نسبت کو الٹ دیا۔ اور چاروں اخلاقی اقدار کو اصل
مذہب قرار دیا۔"

تاہم ازعانی عقائد سے بھی وہ دست بردار نہیں ہوئے بلکہ انھیں جی جان سے مانتے رہے اور ان کی تلقین بھی کرتے رہے۔

گاندھی جی کی ایک اور اصطلاح عدم تشدد نے بہت زور پکڑا تھا۔ اور ایسا لگتا تھا کہ وہ صنعتی نظام اور بھاری مشینوں کے بھی مخالف تھے۔ جبکہ نہرو کے ہندوستان میں یہی چیزیں ترقی کی بنیاد تھیں اور ہیں بھی۔

گاندھی جی اقتصادیات سیاست اور تہذیب و معاشرت کو بھی مذہبی اصول

کا ہی خواب دیکھتے تھے۔ اور اپنے مخصوص مذہبی اور اخلاقی معتقدات کی روشنی میں ملک کی تعمیر جدید کا نقشہ رکھتے تھے۔ جسے وہ گرام راج اور رام راج کی اصطلاحوں سے تعبیر کرتے تھے جس سے نہرو اتفاق نہ کر سکے۔

جواہر لال نہرو کی ذہنی و فکری نشو و نما لادینی ماحول میں ہوئی تھی اور وہ مغربی اقدار و معیارات کے دلدادہ تھے۔ نہرو جی ہندوستان کی تعمیر جدید میں سوشلزم، سیکولرزم اور جمہوری اقدار کو اپنانا چاہتے تھے انھیں گاندھی جی کے رام راج سے کوئی راہ و رسم نہ تھی بلکہ ایک گونہ وحشت تھی وہ اس مغربی تصور زیست کے حامی تھے کہ مذہب کو انسان کا پرائیوٹ معاملہ رکھا جائے۔ اور اسے سیاسی اداروں میں دخل اندازی کا ہرگز موقع نہ دیا جائے۔ گاندھی اور نہرو کے یہ تضادات اتنے نمایاں اور واضح تھے کہ کھینچ تان کے بغیر کوئی بھی ان کو دفع نہیں کر سکتا تھا۔

عابد صاحب نے گاندھی جی کے یہاں خیالات کے دو الگ الگ سلسلوں کی دریافت کر کے گاندھی کے تضاد فکر کو دور کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ یہ تاثر بھی پیدا کر دیا ہے کہ گاندھی جی تصوراتی سے زیادہ عملی آدمی تھے۔ فرماتے ہیں کہ گاندھی جی کے یہاں خیالات کے دو الگ دھارے ہیں۔

> "ایک تو خالص اہنسا تمک سماج یا رام راج کے نصب العین کے متعلق ہے جسے وہ موجودہ مصلحتوں اور معذوریوں سے بالاتر خالص اور بے میل رکھنا چاہتے ہیں دوسرا قومی ریاست کے منصوبے سے متعلق ہے جسے وہ زمانے کے حالات سے معقول حد تک مصالحت کر کے مستقبل میں بہت جلد پورا کرنا چاہتے ہیں۔"

یہیں سے عابد صاحب نے درمیانی راستہ نکالا اور برملا اعلان کیا کہ "گاندھی جی ہندوستان میں جواہر لال کی طرح غیر مذہبی ریاست کا تصور رکھتے تھے" اور یہ کہ

> "ہندوستانی ریاست کی غیر مذہبی نوعیت کے بارے میں متفق ہونے کے علاوہ گاندھی جی اور جواہر لال اس پر بھی متفق تھے کہ یہ لبرل جمہوری ریاست ہو۔ گاندھی جی کا اصل مقصود خالص اہنسا پر مبنی نراجی سماج تھا مگر ان کی عملی سوجھ بوجھ اور انسانی فطرت کے تجربے نے انھیں یقین دلایا تھا کہ ابھی انسان ایسے سماج کے لیے تیار نہیں۔"

بہرحال اس میں شک نہیں کہ عابد صاحب نے دونوں بزرگوں کے خود اپنے تضادات کو بھی دور کرنے کی کوشش کی ہے اور دونوں کے باہمی فرق و اختلافات کو بھی کم کرنے بلکہ ختم کرنے کی سعی بلیغ کی ہے اس سعی و کوشش کا عام طور پر رخ یہ رہا ہے کہ گاندھی جی کی مذہبیت میں لادینیت اور دنیاداریت کی آمیزش کر کے جواہر لال نہرو کے خالص غیر مذہبی تصور زندگی سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ ادھر جواہر لال کے یہاں مذہبی روح کی کارفرمائیاں دکھا کر ان کی غیر مذہبی شدت کو اتنا کم کر دیا ہے کہ وہ گاندھی جی کے مذہبی تصور سے بہت نزدیک آگئے ہیں۔ اور اس طرح دونوں کی راہ کم از کم ریاست کی تشکیل اور ملک کی تعمیر کی حد تک ایک ہو گئی ہے۔

عابد صاحب کی یہ کتاب عقیدت مندی کے اعتبار سے بھی عمدہ ہے اور خالص علمی اور معروضی نقطہ نظر سے بھی ایک کامیاب کوشش ہے۔

ادھر کچھ دنوں سے گاندھی اور نہرو کے نئے عقیدت مند دو بڑے فکری اعتبار سے الگ الگ صف بندی شروع کر دی ہے اس سیاسی کرتب بازی کی وجہ سے گاندھیائی اصولوں کے پیروؤں اور نام نہاد نہرو ازم کے مقلدوں کے مابین تنازعات بڑھتے جا رہے ہیں جس کے نتیجے میں ملک دو متحارب حلقوں میں منقسم ہو گیا ہے۔ جس میں ایک خود کو احیائے ماضی کی تحریک کا زبردست حامی کہتا ہے اور دوسرا خود کو خالص سوشلزم اور بے میل اشتراکیت کا علمبردار بتاتا ہے۔ یوں ملک کی فکری سالمیت ان دنوں جن خطرات سے دوچار ہے ان سے نپٹنے کا واحد اور سہل طریقہ یہ ہے کہ گاندھی اور نہرو کے [illegible] طرز فکر کو از سر نو زندہ کیا جائے۔ اور اس امر کی رہنمائی کے لیے ڈاکٹر [illegible] عابد حسین کی کتاب گاندھی اور نہرو کی راہ مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے [illegible] عابد حسین کا فیصلہ یہ ہے کہ

"عملی نقطہ نظر سے گاندھی اور نہرو کی [illegible]

غزلیں

محسن زیدی
۲۴۳، سیکٹر ۴، آر۔ کے۔ پورم
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲

ہمارے روز و شب پہلے بسر ایسے نہ ہوتے تھے
ہم اپنے حالِ دل سے بے خبر ایسے نہ ہوتے تھے

جو لمحوں میں گذر جائیں سفر ایسے نہ ہوتے تھے
کہ جیسے اب ہیں رستے مختصر ایسے نہ ہوتے تھے

چلے آتے تھے طائر لوٹ کر اپنے بسیروں میں
نکل کر گھونسلوں سے در بدر ایسے نہ ہوتے تھے

یہ کس نے آتشِ خاموش کو آ کر ہوا دے دی
کبھی پہلے تو آہوں میں شرر ایسے نہ ہوتے تھے

خدا جانے یہ کس نے نفرتوں کے بیج بوئے ہیں
کہ اس مٹی سے پیدا شور و شر ایسے نہ ہوتے تھے

جنھیں جتنی ہے ان کی اب خبر پہلے نہ ہوتی تھی
وہ ہم سے اب ہیں جتنے بے خبر ایسے نہ ہوتے تھے

گذر جاتے تھے برسوں سر کو ٹکراتے ہوئے محسن
کہ پتھر جیسی دیواروں میں در ایسے نہ ہوتے تھے

سعید اختر نظامی
[illegible]، لکھنؤ

کبھی غریب گھروں تک نہ جن کے سائے گئے
انھیں درختوں کے مانے میں شہر پائے گئے

صداقتوں کے امیں یوں بھی آزمائے گئے
کبھی صلیب کبھی دار پر چڑھائے گئے

خدا ہی جانے وہ صبحیں کہاں ہیں جن کے لئے
جلا جلا کے ہزاروں دیے بجھائے گئے

عجیب شخص تھا پھر بھی دعائیں دیتا تھا
وہ جس کی راہ میں کانٹے بہت بچھائے گئے

احاطہ کر نہ سکا کوئی وسعتِ دل کا
خیال و فکر کے سو دائرے بنائے گئے

قلم لبوں سے دبا کے وہ سوچتا ہوگا
مرے خطوط کسی کو اگر دکھائے گئے

جہاں بس ایک تمہارے سوا کچھ اور نہیں
کبھی کبھی تو ہم ان وادیوں میں پائے گئے

ذرا سی جراتِ انکار کی سزا یہ ملی
ہمارے جرم ہماری نظر میں لائے گئے

سبب ہے جو بہت انگلیاں اٹھائے ہو
یہ ایسے ایک تم کو نہیں دکھائے گئے

کسی نے روتے تھے روز کی اختر
پھر اس کے بعد تو ہم بہت ہنسائے گئے

محمد مصباح اللہ

اپنی ذاتی تصنیف : مُصنّف کی نظر میں

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہر تصنیف مصنف کی اپنی قیمتی متاع ہوتی ہے لیکن مصنف ہر تصنیف یا تالیف کو بہترین اور لاجواب شمار نہیں کرتا بلکہ اس تصنیف یا تالیف ہی کو اپنا شاندار اور معیاری کارنامہ قرار دیتا ہے جو گوناگوں صفات کی حامل ہو، فنی محاسن کی کسوٹی پر پوری اترتی ہو اور ارباب علم کی نگاہ میں شاہکار کہلانے کی مستحق ہو۔ شاید ہی کوئی مصنف ایسا ہوگا جسے اپنی ادبی کمزوریوں، کوتاہیوں اور صلاحیتوں کا علم نہ ہو ورنہ حق بات تو یہ ہے کہ جب تخلیق پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے تو دیانت دار مصنف ہر زاویہ سے اپنی تصنیف کی جانچ پڑتال کرتا ہے، روشن اور تاریک پہلوؤں کو نگاہ میں رکھتا ہے اور اپنی تخلیق کے متعلق اس بات کا بخوبی اندازہ لگا لیتا ہے کہ جب یہ تصنیف جلوہ گر ہوگی تو ارباب بصیرت کی نگاہ میں اس تخلیق کی قدر و قیمت کیا ہوگی؟ وہ ان سب امور کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے آپ سے مطمئن ہو کر اپنی تصنیف یا تالیف کے متعلق مناسب اور موزوں رائے قائم کرتا ہے اور اس سلسلہ میں جو کچھ بھی کلمات اپنی تصنیف کے لیے اس کی زبان سے نکل کر صفحۂ قرطاس پر نمودار ہوتے ہیں وہ نہایت جاندار اور وقیع ہوتے ہیں۔ اکثر صورتوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ قلمکار کے کلمات حرفِ آخر کا درجہ رکھتے ہیں۔

اردو ادب کا دامن بے شمار قلمکاروں کی ان گنت تصانیف و تالیفات سے مالامال ہے۔ ان میں بعض کتابیں معیاری ہونے کی بنا پر شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ اور عالمگیر شہرت کی مالک ہیں۔ ان معرکۃ الآرا کتابوں کے متعلق مصنفین نے اپنی جانب سے جو کچھ بھی کلمات اپنے کارناموں کی اہمیت اور افادیت کو جتانے کے لیے تحریر کیے ہیں اس میں شک نہیں کہ وہ بیانات اپنی جگہ جہاں دلچسپ اور خوب ہیں، وہاں صداقت کے آئینہ دار ہیں۔ اکثر حالات میں یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ مصنف اپنے قول میں حق بجانب ہے اور جہاں کہیں اس نے اپنی تخلیق کی بڑائی کا دعویٰ کیا ہے اس کا اپنا دعویٰ، دعویٰ بے دلیل نہیں ہوا۔ اکثر اس کے کلمات اور ارشادات سے کتاب کی اہمیت، افادیت اور عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

میں اس نگارش میں بطور نمونہ دو چار مصنفین کے شاندار، دلکش اور دلچسپ کلمات و بیانات کے اہم اقتباسات ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں۔ یہ بیانات مصنف کی ذاتی تصنیف یا تالیف سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن لوگوں کی نظر سے یہ بیانات گزرے ہیں اور جنھوں نے ان ارشادات کی روشنی میں قلمکار کی متعلقہ کتاب کا مطالعہ کیا ہوگا انھیں اس بات کا علم ہوگا کہ صاحب کتاب کے یہ بیانات اور کلمات صداقت پر مبنی ہیں۔

یہاں پر قلمکار کے بیان کے اقتباس کو نقل کرنے سے پہلے

وزیر اعلا شری سری پت مشرا ۱۲ر مارچ کو سہکار تا بھون لکھنؤ میں ڈاکٹر عرفان عباسی کی تذکرۂ شعرائے اتر پردیش کی ساتویں جلد کی رسم اجرا ادا کرتے ہوئے۔

وزیر تعلیم و قومی یک جہتی ڈاکٹر عمار رضوی ۱۹ر فروری کو صدر پور (ضلع سیتا پور) میں ابتدائی علاج کے سرکاری اسپتال کا افتتاح کرتے ہوئے۔

مشہور اردو شاعر احمد فراز گذشتہ ماہ اتر پردیش اردو اکاڈمی کی دعوت پر لندن سے لکھنؤ تشریف لائے۔ اس تصویر میں وہ شری علی جواد زیدی، مسٹر سراج الدین عمر، امیر احمد صدیقی اور شاداں بارہ بنکوی وغیرہ کے ساتھ نظر آرہے ہیں۔
(تصویر: منے بخشی)

وزیر اعلا شری سری پت مشرا ۲۰ر جنوری کو کے. ڈی
سنگھ بابو اسٹیڈیم (لکھنؤ) میں ہند۔ آسٹریلیا خواتین
کرکٹ ٹیسٹ سیریز کے دوسرے میچ کی کھلاڑیوں
سے ملتے ہوئے۔

وزیر تعلیم و قومی یک جہتی ڈاکٹر عمار رضوی نے ،
فروری کو بانسرا کے اقوام مندرجہ فہرست کے صنعت
کاروں کے لیے پیداواری اور خرید و فروخت مرکز
کا سنگ بنیاد رکھا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے
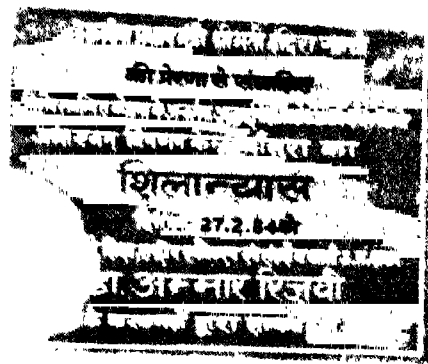
گذشتہ ماہ جشن لکھنؤ کے موقع پر حضرت محل پارک
لکھنؤ میں مشہور و ممتاز پاکستانی گلوکارہ ملکہ پکھراج
اور ان کی صاحبزادی طاہرہ سید اپنے فن کا
مظاہرہ کرتے ہوئے۔

گورنر اترپردیش شری چندر یشور پرشاد نرائن سنگھ ۱۰ر فروری ۸۴ء کو راج بھون لکھنؤ میں گورنر اڑیسہ شری بی۔ این پانڈے اور حکومت ہند کے ڈپٹی منسٹر شری گیان پرکاش سے محو گفتگو ہیں۔

وزیر اعلیٰ اترپردیش شری سری پت مشرا ۱۵ر فروری کو ودھان بھون (لکھنؤ) میں سفیر ترکی برائے ہند کا خیر مقدم کرتے ہوئے

وزیرا علا شری سری پت مشرا ۲۶ رفروری کو اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس (لکھنؤ) میں وزیر ریلوے شری غنی خان چودھری سے محو گفتگو ہیں۔

مرکزی وزیر مملکت برائے تعلیم شریمتی شیلا کول کے ہاتھوں لکھنؤ میں ۱ رفروری کو کمزور طبقوں کے لیے لکھنؤ ترقیاتی اتھارٹی کی مولانا "آزاد نگر" ہاؤسنگ اسکیم کی تعمیرات کا آغاز ہوا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے جس میں اتر پردیش کے وزیر منصوبہ بندی شری رام سنگھ کھنا بھی نظر آرہے ہیں۔

وزیرا علا شری سری پت مشرا ۱ رفروری کو لکھنؤ میں جیلوں کے کھیل کود مقابلوں میں کامیاب ہونے والے افراد کو انعام تقسیم کرتے ہوئے۔ میں وزیر جیل شری عبد الرحمٰن نشتر بھی نظر آرہے ہیں۔
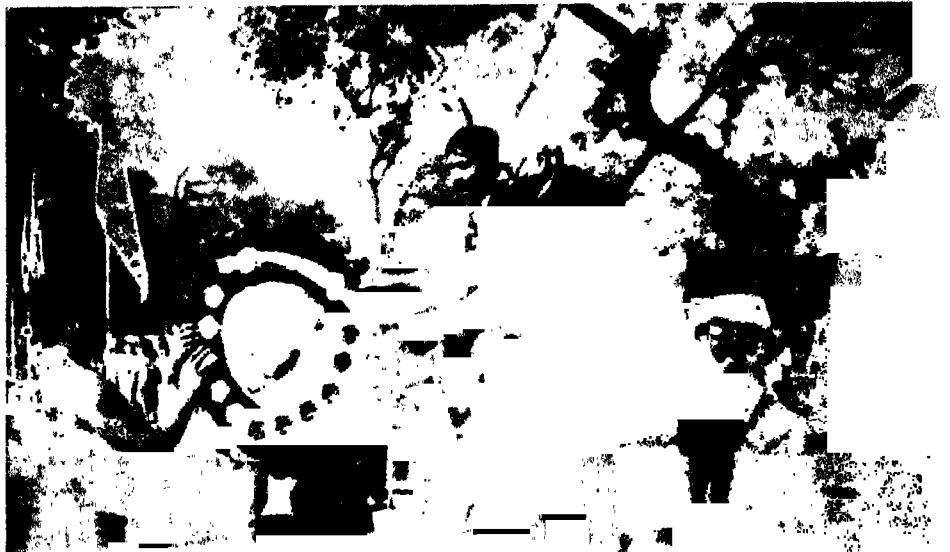
قلم کار اور اس کی متعلقہ کتاب کا مختصر تذکرہ بطور تعارف
اس خیال سے درج کیا گیا ہے کہ قاری مصنف اور تصنیف
کی عظمت سے بے خبر نہ ہو۔

مولوی نذیر احمد مرحوم کی شخصیت تعارف کی محتاج
نہیں ہے۔ ان کے متعلق کچھ کہنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔
سب جانتے ہیں کہ دنیائے اردو میں مولوی نذیر احمد ایک
بلند پایہ ادیب کی حیثیت سے خاص شہرت رکھتے تھے موصوف
کا شمار چوٹی کے نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ یوں تو آپ نے
بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن کی ادبی دنیا میں دھوم ہے لیکن
موصوف کی نگاہ میں یہ بہت معمولی تصانیف تھیں۔ درصل
آپ کا عظیم الشان کارنامہ قرآن مجید کا ترجمہ ہے۔ جسے آج
بھی عالمگیر بت حاصل ہے۔ بقول فاضل تذکرہ تالیف کا
سبب یوں ہوا! خدا خدا کرکے بڑھاپے میں فرصت ملی تو
قرآن شریف حفظ کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ شوق ہوا کہ اس
کا ترجمہ بھی کرلوں۔ لوگوں کو بھی مفید ہوگا اور شاید میری
نجات کا بھی ذریعہ ہوجائے۔"

مولوی موصوف کو اپنے اس ترجمہ پر بدرجہ کمال ناز
تھا اور نہایت فخر کے ساتھ اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے چنانچہ
آج بھی آپ کا یہ ارشاد وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے:

"میری تمام عمر کا اصلی سرمایہ کلام مجید کا ترجمہ ہے۔
اس میں مجھے جتنی محنت اٹھانی پڑی ہے اس کا
اندازہ کچھ میں ہی کرسکتا ہوں۔ ایک ایک لفظ
کے ترجمہ میں میرا سارا سارا دن صرف ہوگیا ہے۔
میں نے جتنی بھی کتابیں لکھی ہیں وہ دوسروں
کے لیے لکھیں لیکن "قرآن مجید کا ترجمہ" یہ کتاب
میں نے اپنے لیے لکھی۔ میں اسے اپنے لیے توشۂ
آخرت سمجھتا ہوں۔"

اس حقیقت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ آج بھی ڈپٹی
نذیر احمد مرحوم کا قرآن مجید کا ترجمہ مستند مانا جاتا ہے اور ادب
اردو میں خاصے کی چیز ہے۔

• • •

ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کی شخصیت ہشت پہلو ہیرا تھی۔ آپ
عظیم مفکر اور بہت بڑے سائنسی فلسفی تھے، شاعر اسلام تھے،
ادیب تھے، ماہر تعلیم تھے، حکیم ملت تھے۔ ترجمان حقیقت
تھے، فخر قوم سیاسی رہنما تھے اور سچے عاشق رسول تھے۔ آج
علامہ اقبال کی شخصیت کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے [illegible]
کی جتنی بھی تصانیف ہیں۔ ان کے ترجمے یورپ اور امریکہ کی
مختلف زبانوں میں ہورہے ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ اس بات
سے واقف ہے کہ یورپ، انگلستان اور امریکہ کی یونیورسٹیوں
میں آپ کی تصانیف کی مانگ ہے اور یہ دلچسپی سے پڑھی جاتی
ہیں۔ ممدوح کی ایک معرکتہ آرا تصنیف "RECONSTRU-
CTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM"
بہ زبان انگریزی ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی تو بیرونی مغربی ممالک
میں قبول عام کی سند پائی۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ "تشکیل
جدید الٰہیات اسلامیہ" کے نام سے علامہ موصوف کی نگرانی میں
ہوا۔ دانائے راز علامہ اقبالؒ کو یہ کتاب اتنی مرغوب تھی
کہ اس کا ذکر اکثر موقعوں پر اپنے دوست احباب اور ملنے جلنے
والے تعلیم یافتہ لوگوں سے کیا کرتے اور دریافت فرماتے کہ آیا
اس کتاب کا انھوں نے مطالعہ کیا ہے کہ نہیں؟ اپنی اس
عظیم الشان تصنیف کے متعلق نہایت فخر کے ساتھ مفکر اسلام
علامہ اقبالؒ نے یہ رائے قائم کی تھی:

اگر میری یہ کتاب "تشکیل جدید" خلیفہ مامون
الرشید کے دور میں شائع ہوتی تو پورے عالم
اسلام میں ایک تہلکہ مچ جاتا۔"

آج بھی دانشوروں کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر اقبال کا یہ
قول صداقت پر مبنی ہے۔ کیونکہ اس کتاب میں فلسفے کے لطیف
اور نازک نکات جو پیش کیے گئے ہیں وہ انھیں کا حصہ ہے۔

ان سے کتاب کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

• • •

کرنل فقیر سید وحید الدین لاہور کے معزز گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ موصوف کے پدر فقیر سید نجم الدین مرحوم علامہ اقبالؒ کے خاص عقیدت مندوں میں تھے۔ دونوں میں بڑا یارانہ تھا۔ فقیر وحید الدین کا خاندان علم و فضل، ہنر و فن اور اخلاق و مروت کے لیے لاہور میں مشہور تھا۔ اسی مناسبت سے اس گھرانے کے اکثر و بیشتر افراد سے علامہ کے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ چنانچہ کرنل موصوف کو اپنے پدر کے توسط سے علامہ اقبالؒ کی صحبت سے فیض یاب ہونے کے بارہا مواقع ملے۔ کرنل نے علامہ اقبالؒ کے متعلق متعدد مضامین بہ زبان انگریزی اور اردو لکھے لیکن ان میں "روزگار فقیر" کو ایک خاص امتیازی شان حاصل ہے کیونکہ اس تصنیف میں موصوف نے علامہ اقبالؒ کی سیرت کے انوکھے اور دلکش پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے جہاں عقیدت کے پھول نچھاور کیے ہیں وہاں واقعات اور حالات کے بیان کرنے میں حقیقت اور صداقت کو نظر انداز ہونے نہیں دیا ہے۔

"روزگار فقیر" کے بارے میں فقیر سید وحید الدین کا یہ پُرخلوص بیان ملاحظہ ہو جو اس قابل ہے کہ سنہرے حروف میں لکھا جائے:

"اپنی اس سادہ دلی کا اعتراف ضروری ہے کہ عنفوان شباب میں والد مرحوم کی جانب سے کوئی بڑی جائداد یا ترکہ نہ ملنے کا احساس اکثر مضطرب کیا کرتا تھا لیکن "روزگار فقیر" کی تدوین کے دوران اپنی اس خام خیالی کا اندازہ ہوا کہ اقبال ایسے مفکرِ قوم، عظیم انسان اور عاشق رسول کی رفاقت اور سالہا سال ان کی مخلوں سے وابستگی کا سرمایہ، اس ترکہ سے کہیں زیادہ قیمتی، قابلِ فخر اور پائدار ہے جو چند اینٹوں کی عمارات، کچھ زرعی اراضی اور طلائی و نقرئی سکوں کی صورت میں ملتا۔

اس کتاب کو پیش کرنے میں ایک اور روحانی مسرت حاصل ہو رہی ہے کہ والد بزرگوار فقیر سید نجم الدین مرحوم کو اپنے عزیز دوست اقبال مرحوم سے جو والہانہ عشق تھا یہ کتاب اس عشق کو حیات جاوید بخشنے میں معاون ثابت ہوگی اور میں اس خوشگوار فرض کی ادائیگی پر ان کے سامنے سرخرو ہو سکوں گا۔

"روزگار فقیر" میرا سرمایۂ حیات ہے اور اس سرمایہ کو میں دانائے راز اقبالؒ کے نام پر قوم کی خدمت میں فخر و مسرت کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔"

بلا مبالغہ میں یہاں یہ بات وثوق سے کہوں گا کہ اس غیر فانی تصنیف "روزگار فقیر" کے بارے میں کرنل موصوف کا یہ مذکورہ بالا پرخلوص بیان "تاریخ اقبالیات" میں ہمیشہ یاد رہے گا۔

• • •

سید رئیس احمد جعفری ندوی بے شمار اردو کتابوں کے مصنف، مولف اور مترجم تھے۔ اردو ادب کا شاید ہی کوئی شعبہ ایسا ہوگا جسے موصوف کے قلم نے نوازا نہ ہو۔ اردو دنیا جعفری کو صاحب طرز انشا پرداز، عظیم ادیب، معتبر سوانح نگار، محقق، تاریخ داں، دیانت دار صحافی، مستند مترجم اور حقیقت نگار، ناول نویس وغیرہ حیثیتوں سے یاد کرتی ہے۔ "تاریخ اردو ادب" میں موصوف کی ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں کیونکہ آپ کی گراں قدر ان گنت کتابوں سے اردو ادب کے سرمایہ کی لاگت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔

"دید و شنید" آپ کی ان دو چار شاہکار کتابوں میں سے ایک ہے جن کی شہرت کو چار چاند لگے ہوئے ہیں۔ یہ

کتاب اُس زمانہ میں لکھی گئی ہے جب کہ ملک میں آزادی کا
سنگرام اپنے پورے شباب پر تھا اور جس کی اشاعت اُس
وقت عمل میں آئی جبکہ ملک کے چپہ چپہ میں آزادی کی فضا مسلط
تھی اور آزادی کا پرچم اپنی پوری آن بان اور شان سے لہرا
رہا تھا۔ ملک کو طوقِ غلامی سے نجات دلانے میں ملک کی
بے شمار مشہور و معروف ہستیوں کا ہاتھ تھا۔ یہ کتاب
برصغیر ہند و پاک کے نامور افراد کی روداد پر مشتمل ہے۔
اس لحاظ سے اس وقت ملک کے عام تعلیم یافتہ لوگ عموماً اور
کالج اور یونیورسٹی کے طلبا خصوصاً ان تمام مشاہیر کے حالات
جاننے کا بیحد اشتیاق رکھتے تھے جنھوں نے اس آزادی کی
جنگ میں کسی نہ کسی حیثیت سے حصہ لیا تھا۔ چنانچہ یہ کتاب
ظہور پذیر ہوئی تو غیر معمولی طور پر ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور دلچسپی
سے پڑھی گئی۔ نہایت قلیل عرصہ میں تمام کاپیاں فروخت
ہوگئیں اور یہ کتاب دوبارہ شائع نہ ہوسکی۔

مولانا جعفری مرحوم اپنی اس تصنیف کے بارے میں
مخصوص رائے رکھتے تھے۔ مولانا موصوف کا ارشاد
ملاحظہ ہو:

"میں نے اس روش عام سے ہٹ کر یہ کتاب
(دید و شنید) لکھی ہے اور صرف اپنے تاثرات،
مشاہدات پر اکتفا کیا ہے۔ میں نے جو کچھ دیکھا
جو کچھ پایا، جو کچھ پرکھا اسے برملا بیان کر دیا ہے
اور حتیٰ الامکان افراط و تفریط سے دامن بچایا
ہے۔

زندگی میں میں نے بہت سے بڑے اور
فاضل ذکر آدمیوں کو دیکھا اور پرکھا۔ یہ کتاب
اسی پرکھ اور نظارہ کی روداد پر مشتمل ہے۔
مجھے کسی سے عناد نہیں لیکن اظہار تاثرات کے
وقت میں نے اس کی ذرا بھی پروا نہیں کی ہے
کہ لوگ اسے عناد پر محمول کریں گے یا تنگ نظری پر۔
لوگ جو چاہیں کہیں اور سمجھیں۔ میں نے وہی کہا
اور لکھا ہے جسے سچ سمجھا ہے۔ سچ کے لیے ضروری
نہیں کہ وہ خوشگوار ہو۔ کبھی کبھی اس میں کڑواہٹ
بھی آجاتی ہے۔ ممکن ہے میرا سچ کہیں خوشگوار ہو
کہیں تلخ۔ لیکن میں نے اس کی پوری کوشش کی ہے
کہ وہ سچ حدود کے باہر نہ نکلنے پائے۔"

چشم بصیرت ارباب نے مولانا جعفری مرحوم کی اس لاجواب
کتاب "دید و شنید" کو بیحد سراہا، پسند کی نگاہ سے دیکھا اور اسے
عدیم المثال تصنیف شمار کیا ہے۔ لیکن یہ انمول کتاب اب وہ
نایاب ہوتی ہے جس کو دیکھنے کے لیے ناظرین کی آنکھیں ترس رہی
ہیں اس لیے کہ طباعت اور اشاعت کے دائرہ سے باہر ہے۔

• • •

نواب احمد جنگ مرحوم شہر حیدرآباد دکن کے ایک معزز
نائط خاندان کے مایہ ناز سپوت تھے۔ اس زمانہ کے دستور
اور خاندانی رواج نواب نے بچپن میں قرآن مجید اور اسلامی فقہ
کے علاوہ دیگر علوم علم حدیث و تفسیر اور سیرت کی تعلیم حاصل کی۔
جوانی میں موصوف کو مشرقی و مغربی علوم سے بہرہ ور ہونے کا
خاص اشتیاق رہا۔ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد نواب کو سابق
نظام سرکار میں جلیل القدر عہدوں پر فائز ہونے کا شرف
حاصل رہا ہے۔ سرکاری ملازمت کی مصروفیات کے دوران
بھی دینی و دنیاوی کتب کا مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا عمل
موصوف کا محبوب فطری مشغلہ رہا۔

انھوں نے فقہ شافعی میں ایک ضخیم جامع کتاب "المبسوط"
تدوین کی جس میں دلائل آیات قرآنیہ و احادیث شریفہ اور
شان نزول کے واقعات برمحل درج ہیں۔ موصوف نے شافعی
فقہ کے مسائل کو عربی کے مستند و معتبر ماخذ سے اردو زبان کے قالب
میں ڈھالا ہے۔ یہ تمام شرعی مسائل شگفتہ الفاظ اور سلجھے ہوئے
شاندار اسلوب میں مرقوم ہیں۔ اس اعتبار سے اردو زبان میں
شافعی فقہ کی یہ واحد کتاب ہے جو اپنی طرز میں انفرادی شان

دکتری ... کے بارے میں ہندوستان کے زبردست عظیم عالم مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کا ارشاد ہے :

"فقہ و قانون کی کتابیں اپنی خشک بیانی کے لیے بدنام ہیں۔ یہ کتاب (المبسوط) اس کلیہ میں ایک خوش آئند استثنا ہے۔"

"المبسوط" کے متعلق مولف کتاب نواب احمد جنگ بہادر مرحوم کا یہ بیان ملاحظہ ہو۔ کس سادگی سے فرماتے ہیں :

"گو میں نے اس کتاب کی تالیف میں کافی سے زاید وقت صرف کیا ہے پھر بھی اپنی کوتاہیوں کا معترف ہوں کہ اہم فریضہ "تالیف کو کما حقہ ادا نہ کر سکا۔ زبان حال کہتی ہے کہ تحریر میں طوالت ہو گئی اور جذبہ شوق کہتا ہے کہ "المبسوط" کی بساط پھر بھی کوتاہ کی کوتاہ رہی۔ میرا التماس ہے کہ ان کوتاہیوں کو نہ صرف معاف کیجیے بلکہ جیسے جیسے نظر آ جائیں بطور یادداشت درج فرماتے جایئے اور بہ وقت فرصت مولف کے پاس بھیج دیجیے تاکہ دوسری اشاعت میں اس سے استفادہ کیا جائے۔ عمر کی آخری منزل پر ہوں۔ فردا کا یقین نہیں مگر پھر بھی ایک طویل اصلاحی تجویز پیش کر رہا ہوں۔"

اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں اور یہ کتاب اندرون ملک کے علاوہ بیرونی اسلامی ممالک کی دینی درسگاہوں کے نصاب میں شامل ہے۔ بقول بیگم احمد جنگ صاحبہ "اس کتاب کی اب بھی اتنی زبردست مانگ ہے کہ اس کی تعمیل موصوفہ کے بس کی بات نہیں۔" شرعی احکام کی پابندی کرنے والے مذہبی خیال کے اشخاص کے لیے یہ کتاب بےحد مفید ہے۔

• • •

عظیم مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم ایک باعمل عالم اور کامل المعیار انسان کی حیثیت سے عالمگیر شہرت کے مالک ہیں۔ اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ آپ کی اکثر مستند و معتبر تصانیف و تالیفات قبول عام کی سند رکھتی ہیں۔ مولانا نے ڈاکٹر الحاج محمد عبدالحق افضل العلماء مرحوم کرنولی کی تحریک پر رسول کریم صلعم کی سیرت پر قرآن مجید کی روشنی میں گرانقدر مقالات قلمبند کیے تھے۔ جنھیں مولانا موصوف نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی صدارت میں جنوری ۱۹۵۸ء میں اہل مدراس کے گوش گزار کیے تھے۔ سامعین نے عقیدت سے ان خطبوں کو سنا اور بےحد پسند کیا۔ بعد ازاں یہ مقالات کتابی صورت میں بنام "قرآنی سیرت نبوی مسمی بہ خطبات ماجدی" مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سدرن انڈیا مدراس ۱۴ کی جانب سے شائع ہو کر منظر عام پر آئے۔ یہ کتاب مولانا کی مقبول ترین اور مشہور ترین تصانیف میں سے ایک ہے جس کی اسلامی دنیا میں دھوم ہے۔ اس کتاب کے متعلق اگر میں کچھ کہنا چاہوں تو چھوٹا منہ بڑی بات ہو گی۔ کتاب کے خاتمہ پر مولانا کا خوشگوار اختتامیہ ہر حیثیت سے قابل مطالعہ ہے۔ بہ خوف طوالت ایک مختصر اقتباس نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ مولانا کی عالی ظرفی دیکھیے کہ اپنے خطبات کے بارے میں کس عجز و انکسار سے ارشاد فرماتے ہیں :

"ان مقالات کی تیاری کا جس وقت حکم ملا تھا، اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر مدت کافی ہی نہیں بلکہ اچھی خاصی معلوم ہوئی تھی لیکن جب کام کو ہاتھ لگایا اور قرآن مجید کا مطالعہ اس خاص مقصد سے بہ غور شروع کیا تو نظر آیا کہ معلومات کا ایک دریا ابلتا ہوا اور امنڈتا ہوا سامنے ہے اور اس سمندر کو سمیٹ کر ایک مختصر مدت کے اندر کوزہ میں بند کرنا مجھ جیسے نااہل فرد کی حد استطاعت سے یقیناً باہر ہے۔ قرآن مجید کی ساڑھے چھے ہزار آیتوں میں سے اگر نصف نہیں تو ایک ثلث تو ضرور ایسی ہیں کہ جن سے سیرۂ نبوی کے کسی پہلو

پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ اب پچھتایا کہ جلت اور مزید بھوں نہ مانگ لی لیکن وقت اب پچھتانے کا بھی گزر چکا تھا۔ جوں توں اور بڑی عجلت اور رواداری میں جو کچھ بھی بن پڑا، بہ طور تحفہ پیش کر دیا گیا۔ ادھر حالات تکوینی بھی متواتر ایسے پیش آتے گئے کہ ناگزیر مصروفیتوں نے وقت کا خاصہ بڑا حصہ اپنی طرف لے لیا اور دو ایک ضروری باب یکسر کورے کے کورے رہ گئے"

مولانا نے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرنے میں بے اعتنائی نہیں برتی اور نہ ان کا اظہار اپنے لیے کسر شان سمجھا۔ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی غالباً یہ مکمل تصنیف ہے جو قرآنی سیرت نبوی صلعم کے موضوع پر روشنی ڈالتی ہے۔ چونکہ اس کتاب کو مقبول عام ہونے کی سند حاصل ہے، بارگاہ رب العزت و بارگاہ رسالت مآب میں شرف قبولیت پانا ایک یقینی بات ہے اس لیے کہ بقول ذوق مرحوم ع

زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

•

نتیجے کے طور پر یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ آج تک کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہو سکی کہ عظیم مصنفین نے اپنی معیاری تصانیف میں مقدمہ یا افتتاحیہ یا پیش لفظ کے تحت اپنی تخلیقات کے متعلق جو اقوال درج کیے ہیں یا جن ارشادات کا اظہار کیا ہے وہ سب مبالغہ آمیز ہیں یا غلو سے مملو ہیں بلکہ ارباب بصیرت کو مصنف کی رائے سے پورا پورا اتفاق ہے اور ان کا کہنا ہے کہ مصنف کے کلمات صداقت اور حقیقت کے ترجمان ہیں۔ ان کے بیان میں انھوں نے دیانت داری سے کام لیا ہے۔ جس کے باعث ان کی تخلیقات کامیاب ہیں۔

★

پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۹۵۶ء (۱۹۵۶ء میں ترمیم شدہ) کی دفعہ 19 ڈی کے قاعدہ ۸ کے مطابق ماہنامہ نیا دور کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیلات شائع کیے جاتے ہیں۔

(۱) مقام اشاعت — لکھنؤ

(۲) وقفۂ اشاعت — ماہوار

(۳) پرنٹر کا نام، قومیت اور پتہ: شری اشوک در۔ ہندستانی۔ سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری۔ اتر پردیش، الہ آباد

(۴) پبلشر کا نام، قومیت اور پتہ: شری گنگا دھر پرشاد شکلا، ہندستانی، ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش، لکھنؤ

(۵) ایڈیٹر کا نام، قومیت اور پتہ: شری امیر احمد صدیقی ایڈیٹر نیا دور، محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اتر پردیش، لکھنؤ

(۶) ان اصحاب کے نام جو اس رسالے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا اس کے تمام سرمائے کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں۔ — نیا دور سرکاری جریدہ ہے اس لیے اس کے بارے میں ان اصحاب کے نام اور پتے کا جو اس جریدے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا ساری پونجی کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

میں گنگا دھر پرشاد شکلا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) گنگا دھر پرشاد شکلا (پبلشر)

اقبال محشر رائے بریلوی
۲۲۳، تعلیادہ سیتاپور

وہ چڑھتی ہوئی دھوپ کے رُخ پر جو کھڑے ہیں
قد دیکھ کے خوش ہیں کہ ہمیں سب سے بڑے ہیں

یہ چھاؤں ہماری ہے تو وہ چھاؤں ہماری
کچھ لوگ گلستاں میں اسی ضد پہ اڑے ہیں

اے ہمسفرو، راہرو، راہ نوردو!
ٹھہرو نہ کہیں راہ میں یہ کوس کڑے ہیں

کب کون ہمیں وقت کے ایندھن میں جلا دے
ہم ایک کٹے پیڑ کی مانند پڑے ہیں

رازوں کے لیے ظرف کا معیار بھی رکھو
پانی نہ بھرو ان میں جو ناپختہ گھڑے ہیں

اب اچھا بُرا جو بھی کہو ہم کو نہیں غم
مورت کی طرح ہم تو دوراہے پہ گڑے ہیں

ان ریشمی ہونٹوں پہ ہے تحریرِ زرِ گل
جب ہنس کے وہ بولے ہیں تو کچھ پھول جھڑے ہیں

حاصل تجھے کرنا کوئی آساں بھی نہیں تھا
ہم تیرے لیے سارے زمانے سے لڑے ہیں

کانوں میں ابھی تک ہے وہ لوٹ آنے کا وعدہ
محشر ہم ابھی تک اسی منزل پہ کھڑے ہیں

وجاہت علی سندیلوی
نصرت منزل
سندیلہ

قطرۂ شبنم نے تازہ کر دیا داغِ کُہن
پھر سوالی بن گیا ہے لالۂ خونیں کفن

اب نہ آئیں گے تری محفل میں اے وعدہ شکن
درد سے ہم نے سجا لی ہے خود اپنی انجمن

اُس سے کیسے بات طے ہو وارداتِ عشق کی؟
آنکھ جس کی جان مانگے اور زباں ہو بے سخن

حیف کیسی زندگی ہے آج محکومِ شکم
دولت و ثروت کے پنجے میں عنانِ فکر و فن

نبضِ دوراں رک گئی ہے درد کی آغوش میں
شاعرِ غمگیں نوا کیوں تو ہوا ہے نغمہ زن

اک نگاہِ خشمگیں ایسی تھی دل کے واسطے
برق کے چنگل میں آئے جیسے گل کا پیرہن

منتظر ہیں ایک مدت سے کسی جاں باز کے
آؤ بڑھ کر ہم بڑھائیں رونقِ دار و رسن

سید اظہر حسین ہاشمی
نعمت اللہ روڈ، لکھنؤ

بچے کی نشو و نما اور ماں کی نفسیات

نفسیات کیا ہے؟ نفسیات اُس جبلّت یا فطرت کو کہتے ہیں جو بچے کی شکم مادر میں نو ماہ کی مدت میں تیار ہوتی ہے۔ اس لیے خلقی ہوتی ہے جس طرح ایک ننھا پودا زمین سے غذا حاصل کر کے پروان چڑھتا ہے اسی طرح بچہ بھی شکم مادر میں اس کے خون سے نشو و نما پاتا ہے۔ ننھے پودے میں ننھی ننھی کونپلیں پھوٹتی ہیں پھر ٹہنیاں اور پتیاں نمودار ہوتی ہیں۔ ٹہنیاں شاخیں بن جاتی ہیں۔ تنا لمبا اور موٹا ہو جاتا ہے۔ جڑیں زمین میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ جو تنے کے ذریعہ پودے کی چوٹی تک غذا بہم پہنچاتی ہیں۔ من وعن بچہ کے جسم کے بھی ننھے ننھے اعضا بنتے ہیں۔ جیسے ریڑھ کی ہڈی جو درخت کے تنے کے مثل ہوتی ہے۔ پسلیاں پھیپھڑے، گردے، معدہ اور آنتیں باریک رگوں کا جال پھیل جاتا ہے۔ ہاتھ پیر اور انگلیاں بنتے ہیں۔ سر کا ملائم خول بنتا ہے جو بعد میں سختی اختیار کر لیتا ہے اور کھال سے پورا جسم ڈھک جاتا ہے تاکہ اندرون جسم اعضا محفوظ رہیں۔ غرض ہر ہر عضو میں پختگی آتی جاتی ہے۔ شریانوں میں خون کی گردش کا عمل شروع ہونے لگتا ہے۔ سر کے ملائم خول میں ملائم گودہ کا بھیجہ بنتا ہے۔ یہ جسم کے ہر عضو کو کنٹرول بھی کرتا ہے اور اس میں سے ایک خاص قسم کی تراوش بھی ہوتی ہے جو جسم کے نشو و نما اور بالیدگی میں معاون ہوتی ہے ورنہ جسم بونا رہ جائے۔ دل بھی آہستہ آہستہ متحرک ہونے لگتا ہے۔ پھیپھڑوں میں سانس کی آمد و رفت ہونے لگتی ہے۔ جب نو ماہ کی مدت پوری ہو جاتی ہے تو یہ مختصر سا انسان عالم وجود میں ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔ چونکہ شکم مادر کے خون سے بچہ کی پرورش ہوتی ہے اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس کا وجود مکمل طور پر ماں کی نفسیات سے متاثر ہوتا ہے اور اس کا عکس ہوتا ہے۔

چنانچہ دوران حمل ماں کا جیسا ماحول ہوتا ہے۔ بچہ اسی کے مطابق ڈھلتا ہے۔ اگر خوشگوار ماحول رہا تو بچہ کی زندگی بھی خوشگوار گزرتی ہے۔ اگر ماں مشکلات سے دوچار رہی تو بچہ کو بھی تمام عمر مشکلات کے دور سے گذرنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ پیدائش کے بعد بچہ ماں کا دودھ پیتا ہے اور آغوش مادر میں پرورش پاتا ہے لہٰذا ماں کی نفسیات اور اس کی فطری جبلّت پختہ ہو جاتی ہے۔ اور مثل اس انگریزی کہاوت کے کہ: THE CHILD IS THE FATHER OF THE MAN جوں جوں بچہ بڑا ہوتا ہے۔ ماں ہی کی خصلتوں اور عادتوں کے مطابق اس کا ظہور و نمود ہونے لگتا ہے۔ اور بتدریج عمر یہ چیز بھی بڑھتی رہتی ہیں اور مستقبل میں اس کی شخصیت بن جاتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ بچہ پر تعلیم و تربیت یا صحبت کا اثر ہوتا ہے یا نہیں؟ اصلیت یہ ہے کہ تعلیم و تربیت اور صحبت کا اثر ملمع جیسی حیثیت رکھتا ہے۔ پیتل پر سونے کے ملمع سے سونا جیسی چمک تو آجاتی ہے لیکن چند عرصہ بعد پیتل اپنے اصلی جوہر میں پھر نمایاں ہو جاتا ہے۔ نا اہل کی تعلیم و تربیت اور اچھی صحبت بھی اس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ دانشوروں کا اس بات

پر اتفاق ہے کہ

تربیت نا اہل را چوں گردگان برگنبد است

گنبد پر گیند پھینکی جائے وہ ہر بار واپس آجاتی ہے یہی حال نااہل کی تعلیم و تربیت اور صحبت کا ہے۔ اس کے نہ تعلیم کام آتی ہے نہ تربیت کارگر ہوتی ہے اور نہ صحبت ہی سے فائدہ ہوتا ہے برخلاف اس کے جس طرح سونا اگر کھرا ہے، صرف بھدا پن آگیا ہے تو سونے کا پانی چڑھانے سے رنگ نکھر آتا ہے اور چمک اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بچوں میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے جو بچے طبیعتاً صالح اور شریف مزاج پیدا ہوتے ہیں ان میں صلاحیت تو بیشک بھی ودیعت ہوتی ہے۔ ایسے بچوں پر تعلیم و تربیت اور صحبت وہی اثر کرتی ہے جو سونے پر سہاگہ کرتا ہے۔ یعنی وہ کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی کے مصداق ہو جاتے ہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا ہم قدرت کے اس عمل کو کہ کوئی اہل پیدا ہوتا ہے کوئی نا اہل و نکما، کوئی ہمدرد و انصاف پسند تو کوئی ظالم و سفاک ہوتا ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ قدرت کا فیض عام ہے۔ اس بارے میں اس کے یہاں کسی کی تخصیص نہیں۔ نہ کسی سے احتراز نہ تکلف۔ وہ ہر شے کو یکساں نوازتی ہے۔ مثلاً سورج کی روشنی اور گرمی سب کے لیے ایک جیسی ہے۔ کسی کی نہ تفریق ہے نہ امتیاز۔ اگر اس سے محل سرا منور ہوتے اور گرمی حاصل کرتے ہیں تو جھونپڑیاں بھی محروم نہیں رہتیں۔ روشنی اور گرمی سے وہ بھی فیضیاب ہوتی ہیں۔ چاند اپنی ضیا باری سے اگر آبادیوں کی تاریکی دور کرتا ہے تو لق و دق بیابان بھی اس کی نورانی کرنوں سے جگمگاتے ہیں۔ اسی طرح بارش کا پانی بھی ہر جگہ سیراب کرتا ہے۔ سڑکوں اور گندی نالیوں پر بھی بارش ہوتی ہے اور غلاظت کے ڈھیروں پر بھی اور گندے ذرات بھی پانی سے لبریز ہو جاتے ہیں۔ مگر اس کے جو بد اثرات نظر آتے ہیں اس کا سبب بارش کا پانی نہیں ہے

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست   در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

بارش کا پانی اپنی لطافت اور صلاحیت میں یکساں ہے۔ لیکن چونکہ زمین مزروعہ اور باصلاحیت ہوتی ہے۔ اس میں پھل پھول پیدا ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے بنجر زمین میں اسی بارش کے طفیل سے کانٹے اُگتے اور جھاڑیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ فرق زمین کے سبب سے ہے بارش کے پانی پر کیا الزام؟ پس اس معاملہ میں قدرت ہر طرح سے بری الذمہ ہے۔

شیر کا بچہ ماں کے پیٹ ہی میں گھاتیں اور گر سیکھ لیتا ہے اس لیے کہ اس کی ماں کو دن رات انھیں سے واسطہ رہتا ہے۔ شتر بچہ بھی ماں کے ہی پیٹ میں صحرائے ریگستان کا نظارہ کر لیتا ہے کیونکہ اس کی ماں کو بھی انھیں صحرائی ریگستانوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ گائے اور بکری کا بچہ پیدا ہوتے ہی اچھل کود شروع کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ یہ وصف ان کی ماں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں بھینس کا بچہ مدتوں سست رفتار بنا رہتا ہے کیونکہ ماں بھی ایسی ہی سست رفتار ہے۔

(۱) انگلستان کا مشہور فلاسفر ٹامس ہوب اپنی سوانح حیات میں رقمطراز ہے کہ وہ جن دنوں شکم مادر میں تھا۔ اہل انگلستان اسپین کے حملے کے اندیشے میں مبتلا رہتے تھے۔ چنانچہ اس کا اثر اس کی ماں پر بھی پڑا۔ اس لیے وہ بھی زندگی بھر احساس کمتری میں مبتلا رہا اور خوف و اضطرار اس کی زندگی کا جزو بن گئے تھے۔

(۲) انگلستان ہی کا مشہور مورخ یعقوب ثانی بھی اپنے حالات زندگی کے بارے میں لکھتا ہے کہ اس کی ماں نے ہمیشہ کلفت و حرماں نصیبی میں دن گذارے تھے لہٰذا اس کو بھی انھیں حالات سے تمام عمر دوچار رہنا پڑا۔ گویا کلفت و حرماں نصیبی اس کی نوشتہ تقدیر بن گئی تھی۔

(۳) نپولین بوناپارٹ جن دنوں شکم مادر میں تھا اس کی ماں کو جلاوطنی میں دن کاٹنے پڑے۔ لیکن اس نے وہ دن ہوشمندی سے گذارے اور مشکلات کا خاطر خواہ جی سے مقابلہ کر آئی رہی۔ کبھی خوف و ہراس پاس نہ آنے دیا۔ پس نپولین میں بھی یہی صفات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ اس نے بھی ہر مشکل کا جرأتمندی سے مقابلہ

کیا۔ گویا دل جمعی اور بے خوفی اس کی جزو زندگی بن گئی تھی اسی لیے وہ ایک اچھا شہسوار، نامور جرنیل اور فاتح مشہور ہوا۔

(۴) ہندوستان میں کئی ہزار سال گزرے مہا بھارت ہوئی تھی۔ یہ اس زمانہ کی سب سے مشہور جنگ تھی۔ ایک طرف کورو کی فوج تھی دوسری طرف پانڈو تھے جو پانچ بھائی تھے۔ ان میں ارجن دلاور مشہور تھا۔ ان دنوں میدان جنگ میں فوج کو اس طرح تربیت دیتے تھے کہ اس سے سات چکر دیوہ بن جاتے تھے دشمن کا ان چکر دیوہ سے گزرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اگر وہ ان کو توڑ دے تو فتح مند قرار پاتا تھا۔

ارجن نے ایک روز شب میں اپنی بیوی کو چکر دیوہ کی کہانی کہ کس طرح توڑا جاتا ہے۔ سنائی۔ اس کا لڑکا ابھمنو اُن دنوں شکم مادر میں تھا۔ بیوی نے صرف چھ دروازے توڑے جانے تک کہانی سُنی۔ ساتویں میں سو گئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ دیر ابھمنو کو جب ایک جنگ میں سابقہ پڑا تو اُس نے اپنی بہادری سے چھ چکر دیوہ ختم کر دیے مگر ساتویں میں مارا گیا۔ تاریخ نے اس واقعہ کو اہمیت دی ہے کہ اگر ابھمنو کی ماں ساتویں چکر دیوہ توڑے جانے کی بھی کہانی سُن لیتی تو دیر ابھمنو ساتواں چکر دیوہ بھی توڑ دیتا اور مارا نہ جاتا۔

ان واقعات و دلائل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بچہ کی نفسیات شکم مادر ہی میں نشو و نما پاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی کہ باپ کی حیثیت بارش کے پانی جیسی ہے اور ماں کی زمین جیسی۔

اسی موضوع کے شواہد میں ایک حکایت مشہور ہے کہ کسی مملکت میں ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ عوام کے جان و مال محفوظ نہ تھے۔ خوف و دہشت کا ماحول طاری تھا۔ بالآخر وہ گروہ پکڑا گیا اس کے افراد سب کے سب تہہ تیغ کر دیے گئے۔ ان میں ایک کم سن لڑکا بھی پکڑا گیا۔ اس کی بھی گردن زدنی کا حکم دے دیا گیا۔ مگر وزیر کو اس کی کم سنی پر رحم آگیا۔ اس نے جان بخشی کی سفارش کی کہ یہ ابھی بچہ ہے۔ اس میں ڈاکوؤں کی خصلت سرایت نہیں ہوئی ہے۔

یہ مثل گیلی لکڑی کے ہے کہ جس طرف چاہو موڑ دو۔ اس کی تعلیم و تربیت کی جائے اور اچھے لوگوں کی صحبت میں رہے تو جوان صالح ہوگا۔ خلق خدا کو اس سے فائدہ پہنچے گا۔ تعلیم و تربیت اور اچھی صحبت رائیگاں نہیں جاتی۔

مگر سربراہ مملکت نے وزیر کی بات سے اتفاق نہیں کیا۔ اُس نے کہا۔ جس کسی کی بنیاد بدی پر قائم ہو جائے اس سے نیکی کی توقع عبث ہے۔ یہ ڈاکوؤں کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ڈاکو کی بیوی نے اس کو جنم دیا ہے لہٰذا بڑا ہو کر یہ بھی خلق خدا کے لیے خطرناک ثابت ہوگا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ؎

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

معمار جس عمارت کی پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھ دے تو وہ عمارت خواہ کتنی ہی بلندی تک جائے ہمیشہ ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہتی ہے۔ بلندی پر جانے سے سیدھی نہیں ہو جاتی۔ پس اس بچہ کی حیثیت بھی ایسی ہی ہے۔ ایک روز یہ بھی ڈاکہ زنی کا پیشہ اختیار کریگا۔ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ تعلیم و تربیت اور صحبت کسی کی خلقی جبلت کو نہیں بدل سکتی۔

مگر وزیر نے بمنت پھر عرض کیا۔ صحبت کا اثر ہوتا ہے۔ جس زمین پر پھول گرتے ہیں اس زمین کی مٹی تک خوشبودار ہو جاتی ہے۔ کیا آپ نے نہیں سُنا کہ ؎

سگِ اصحاب کہف روزے چند
پئے نیکاں گرفت مردم شد

کتا ایک درندہ صفت جانور ہے۔ اصحاب کہف کے ساتھ کچھ مدت رہنے سے اگر آدمیت اور شعور آسکتا ہے تو یہ انسان کا بچہ ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ تعلیم و تربیت اور اچھی صحبت اس پر اثر انداز نہ ہو۔ تعلیم و تربیت اور صحبت کی اسی لیے فضیلت ہے۔ لہٰذا یہ بچہ بھی اچھا انسان بن سکتا ہے۔

سربراہ مملکت نے پھر بھی اتفاق نہیں کیا۔ اپنی رائے پر مصر رہا۔ اس نے کہا۔ مانا کہ کتے میں شعور آدمیت آگیا۔

لیکن کسی کی خلقی جبلت نہیں بدلتی۔ اس کی درندہ صفتی ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ اس بارے میں وہ اچھے بُرے کی تمیز سے قاصر ہے۔

چوں سگ درندہ گوشت یافت نہ پُرسد
کیں شترِ صالحؑ است یا خرِ دجال

کتّے کی مرغوب غذا گوشت ہے جب پاجاتا ہے پھر یہ تمیز نہیں کرتا کہ حضرت صالحؑ کے اونٹ کا حلال اور پاکیزہ ہے یا دجال کے گدھے کا حرام و ناپاک۔ پس یہ محض خوش فہمی ہے کہ نفسیات یا جبلت بدل جاتی ہے۔ بہرحال اس نے وزیر کا دل رکھ لیا اور اس لڑکے کی جاں بخشی کر دی۔

وزیر نے خوش خوش اس لڑکے کو محل میں رکھا۔ ناز و نعم سے پرورش کی۔ تعلیم اور تربیت کے لیے استاد و اتالیق مقرر کیے۔ اس کو گمان تھا کہ وہ بڑا ہو کر ناموری حاصل کرے گا۔ خلوقِ خدا کا ہمدرد ثابت ہوگا۔ مگر وہ لڑکا اس کے بہاں کے برعکس ثابت ہوا۔ یعنی جب تعلیم و تربیت سے فارغ ہو گیا اس وقت جوان عمر ہو چکا تھا۔ ایک روز اس کی خاندانی رگِ ڈاکہ زنی ابھر آئی اور موقع پاکر محل سے راہِ فرار اختیار کی۔ اور ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ اس لڑکے کو نہ محل کی آب و ہوا راس آئی نہ ناز و نعم کی پرورش کام آئی۔ نہ تعلیم و تربیت نے اثر دکھایا۔ ڈاکو کا لڑکا ڈاکو ہی ثابت ہوا۔ اس نے بھی قتل و غارت گری میں ایسا نام کر دکھایا کہ ڈاکوؤں کے گروہ کو لوگ بھول گئے۔ وہ اپنی سفاکی اور ظلم کی بدولت اپنے گروہ کا سردار بن گیا۔

آخر کار یہ گروہ بھی پکڑا گیا۔ اس کا بھی وہی حشر ہوا جو اس سے پہلے گروہ کا ہوا تھا۔ سب کے سب قابلِ گردن زدنی قرار پائے۔ سب کی گردنیں جسم سے جدا کر دی گئیں۔ انھیں لوگوں میں وہ لڑکا بھی شامل تھا جس کی وزیر نے جاں بخشی کی سفارش کی تھی۔ سربراہ مملکت کو جب اس لڑکے کے تہ تیغ کیے جانے کا علم ہوا تو اس نے کہا ؎

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود
گرچہ با آدمی بزرگ شود

بھیڑیے کا بچہ خواہ بزرگ آدمیوں کے ساتھ مدتوں رہے مگر بعد میں بھیڑیا ہی ثابت ہوتا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا۔ اس لڑکے کے لیے قتل الموذی قبل الایذا۔ ہی مناسب تھا۔ اس پر عمل کیا گیا ہوتا تو بے قصور لوگوں کی جانیں کیوں ضائع جاتیں۔

ایک بچہ جو تولد ہوتا ہے وہ کنبہ میں ایک فرد کا اضافہ کرتا ہے۔ کنبہ سے خاندان بنتا ہے اور خاندان سے نسل تیار ہوتی ہے۔ بچے ملک و ملت کی امانت ہیں۔ اس امانت کو پوری دیانت سے رکھا جائے۔ انھیں میں سورما ہیں۔ فاتح ہیں۔ انقلابی ہیں۔ ادیب و شاعر بھی ہیں۔ رہبرانِ ملت اور مصلحانِ قوم بھی۔ پس ان کے سدھار سے پوری قوم و ملت کا سدھار ہے۔ انھیں کے دم سے ملک و ملت کا مستقبل درخشاں ہے۔ اس لیے ان کی تربیت کو دوسرے مسائل پر فوقیت دی جائے۔ اس کا طریقِ عمل یہ ہے کہ ہم خود اپنے ماحول کو خوشگوار بنائیں۔ اس بارے میں دو رائیں نہیں ہیں کہ بچے پیدائشی طور پر اپنے ماحول کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ✱

سائنس کا کرشمہ کمپیوٹر

(صفحہ ۲۹ کا بقیہ)

اس کے حافظہ کو یادداشت کے ذرے ایک مربع سنٹی میٹر میں آسکتے ہیں۔

کمپیوٹر کیسے اور کن بنیادوں پر بنتا ہے اور کیونکر وہ سلسلے کام انجام دیتا ہے یہ ایک تفصیلی مضمون میں ہی بیان کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال ایک کمپیوٹر ذاتی طور پر گروہ کی خود شناسی اور پوری انسانیت کی بھلائی کے مسئلے حل کر سکتا ہے۔

✱

غزلیں

کمال جائسی
کرنیل گنج کان پور

چہروں کے اس شہر میں جیسے درد کی رت دیوانی ہے
خوب سنبھل کے رہنا یارو ہر لمحہ طوفانی ہے

ہم تم دونوں قید ہوئے ہیں لہروں کی زنجیروں میں
گہرا گہرا پیار کا ساگر ٹھنڈا ٹھنڈا پانی ہے

میرا دامن تیرا آنچل دونوں نے اپنا ہی لیا
کانٹوں کا یہ پاگل پن ہے پھولوں کی نادانی ہے

ڈوب نہ جائے دل کی دھڑکن چھوٹ نہ جائے ساتھ ترا
تیری آنکھوں کے دریا میں آج بڑی طغیانی ہے

فصلِ بہار آئی تو کدھر سے کچھ تو اس کا حال سنا
چاند سا جس کا چہرہ ہے اور آنچل دھانی دھانی ہے

کون بتائے کس منزل میں اپنا ادب آیا ہے جہاں
شعر سمجھنے میں دشواری کہنے میں آسانی ہے

آج کمال اس شوخ کی خاطر پھولوں سے کچھ شعر لکھو
اس کے بدن کی دھوپ نے دیکھو دھند کی چادر تانی ہے

اختر شاہجہانپوری
محلہ ڈھکین چوپال شمس خاں کا پل
شاہجہانپور ۲۴۲۰۰۱

کہکشاں کی طرح جگنوؤں کی طرح
کون آنکھوں میں ہو منظروں کی طرح

قطرۂ خونِ دل یا کہ حسرت ہے وہ
کچھ تو پلکوں پہ ہے آنسوؤں کی طرح

خواب آنکھوں میں ہیں لب پہ جذبات ہیں
پھر بھی خاموش ہو مقبروں کی طرح

میرے احباب منھ پھیر لیں گے اگر
میں بھی سچ بول دوں آئینوں کی طرح

ہم کو احساس ہے جب سے بے گھر ہوئے
ساری دنیا ملی ہے گھروں کی طرح

کیا خبر کون سے پل بھلا دو ہمیں
بے وفا تم بھی ہو موسموں کی طرح

اب تو اختر یہ احساس بھی مٹ گیا
ہمسفر کون ہے رہبروں کی طرح

انتصار حسین رشک
محمد نئی شاہجہاں پور

شعلۂ گل کی تمازت سے بھی جل جاؤ گے
موم بن کر جو جیوگے تو پگھل جاؤ گے

اپنی آنکھوں میں کھلائے ہوئے خوابوں کے کنول
اس کڑی دھوپ میں نکلو گے تو جل جاؤ گے

راہ میں اب کسی دیوار کا سایہ بھی نہیں
تم کو احساس جو ہوگا تو سنبھل جاؤ گے

اپنے احساس کو پتھر کا بنا لو ورنہ
صورتِ شمع رہو گے تو پگھل جاؤ گے

بے سبب میری اداسی کو نہ سمجھو ورنہ
مجھ سے دنیا کی طرح تم بھی بدل جاؤ گے

رشک تم شوخیٔ رفتار پہ نازاں مت ہو
چکنے پتھر پہ چلوگے تو پھسل جاؤ گے

شوکت صدیقی
[illegible] پیپر مل کالونی۔ لکھنؤ

سائنس کا کرشمہ : کمپیوٹر

کمپیوٹر انسانی کاوشوں کا کارنامہ اور تجربوں کا نچوڑ ہے کمپیوٹر کی شکل میں انسان کو ایک ایسا ساتھی مل گیا ہے جو اس کی ہر مشکل آسان کرتا ہے۔ کمپیوٹر نے انسان کے ایسے پیچیدہ مسائل کو حل کر دیا جو اس کے لیے درد سر بنے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ کوئی کام انسانی اختیار سے باہر ہو یا انسانی دماغ اس کا حل تلاش کرتے کرتے تھک جائے یا انتہائی وقت طلب ہو اسے کمپیوٹر کی مدد سے انجام دینے کی کوشش کی جائے تو کوئی نہ کوئی حل ضرور مل جائے گا۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کوئی نئی ایجاد براہ راست یا اچانک وجود میں نہیں آجاتی۔ پہلے انسان کو ضرورت محسوس ہوتی ہے پھر کچھ بنیادی اصول بنتے ہیں ان پر تحقیق اور تجربے ہوتے ہیں اور آہستہ آہستہ اس ایجاد کی صورت اور ہیئت ابھرتی ہے۔ مثلاً ہوائی جہاز بنانے کی کوشش کو لیجیے۔ انسان نے کتنی کوششیں کیں کہ وہ اڑے، کبھی پر لگا کر، کبھی غباروں میں لٹک کر وہ اڑنے کی کوشش کرتا رہا اور پرواز کے اصولوں پر پہونچنے میں اسے بہت سی منزلیں طے کرنا پڑیں تب کہیں جا کر ہوائی جہاز وجود میں آیا۔

اسی طرح کمپیوٹر وجود میں آنے سے پہلے انسان کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی اور سیکڑوں معلومات کا سہارا لے کر اسنے برسوں کے تجربات سے خود کار مشین ایجاد کی۔ جب صنعت کا میدان وسیع ہوتا گیا تو اسے کمپیوٹر کی صورت میں اپنا جیسا ذہن ایجاد کرنا پڑا جو اس کے بدلے ان مسائل کا حل نکالے جو اس کو الجھائے رہتے ہیں اور جن کا حل کرنا بہت دقت طلب ہوتا ہے۔

علم ریاضی کا ماہر جان نیپیر (JOHN NAPIER) (۱۵۵۰ء سے ۱۶۱۷ء) پہلا انسان تھا جسنے کسی لفظ کو ہندسوں کے برابر تسلیم کر کے ایک چھوٹی پر لکھوا اور یہی طریقہ آگے چل کر انالوگ (ANALOG) کمپیوٹر میں استعمال ہوا۔

جرمنی کے ریاضی داں لائبنز (LEIBNITZ) (۱۶۴۶ء سے ۱۷۱۶ء) نے اپنے باپ کے ٹیکس کا حساب کتاب کرنے کے لیے اعداد جوڑنے کی مشین بنائی جس کے ذریعہ وہ آٹھ آٹھ ہندسوں کے اعداد جوڑتا تھا۔ اسی نے ریاضی کی ایک خاص شاخ اسٹیٹسٹکس (STA-TISTICS) کی بنیاد ڈالی۔ اس کی ایجادوں کا فائدہ اٹھا کر نیوٹن (۱۶۴۲ء سے ۱۷۲۷ء) نے لاگرتھیم (LOGRETHIUM) یعنی کسی بڑی ناپ کا چھوٹا پیمانہ بنایا۔ یہ بھی آج کمپیوٹر بنانے میں مددگار رہا۔

اٹھارویں صدی کا آخر اور انیسویں صدی کا ابتدائی حصہ کمپیوٹر کی ایجاد میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس زمانے میں یورپ کے ممالک کپڑے کی بنائی میں ایک دوسرے سے زبردست مقابلے کر رہے تھے۔ بنائی کی جو بھی نئی ترکیب نکالی جاتی وہ دوسروں سے چھپائی جاتی چنانچہ جوزف میری جیکرڈ (JOSEPH MARIE JACQUARD) نے جب خود بخود چلنے والی کپڑے کی مشین یا کرگھا بنایا اور اس کی شٹل (SHUTTLE) یعنی نال ایجاد کی تو اسے فکر دامن گیر ہوئی کہ اس کی نال کو اس پار سے اس پار مختلف رنگ کے تاگے لے جانے والا کیسے بنایا جائے۔ وہ جانتا تھا کہ کپڑوں پر رنگ برنگے ڈیزائن بنانے کیلئے

رنگ برنگے تاگوں کو مقررہ وقت اور مقررہ چھید سے گذارے بغیر ڈیزائن بنا سکنا ممکن نہیں ہے اور اس کے لیے جو دوسرے طریقے نکالے بھی گئے وہ بہت وقت طلب تھے اور ان پر لاگت بھی بہت آتی تھی چنانچہ اس نے ایک طریقہ نکالا جس میں ہر ایک مخصوص رنگ کا تاگہ لے کر ایک کارڈ میں بنائے گئے مخصوص چھید سے گذرتی تھی۔ اس ایجاد سے کپڑے پر ڈیزائن بنائے جانے لگے۔ کارڈ سستے بھی تھے اور نمونے بدلنے میں مددگار بھی جیکرڈ نے خود اپنی تصویر کپڑے پر بنا کر سنسنی پھیلا دی اور دنیا کو پنچ کارڈ (PUNCHCARD) کا ایسا اصول مل گیا جس نے بنائی کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔

ایک انگریز ریاضی داں چارلس بیبج (CHARLES BABBAGE ۱۷۹۱ء سے ۱۸۷۱ء) نے جو کیمبرج یونیورسٹی میں ریاضی کے استاد تھے اور کسی بھی چیز میں ذرہ برابر نقص برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی بے چین روح انھیں ہر اصول کی مکمل تصدیق کئے بغیر ماننے سے انکار کرتی تھی چنانچہ جب انھیں علم ہوا کہ علم نجوم کی مشین غلطیاں کرتی ہیں تو انھیں بہت غصہ آیا اور انھوں نے ۱۸۲۳ء میں ایک مشین بنا ڈالی جو غلطیاں پکڑتی تھی۔ اگرچہ یہ مشین ایک کمپیوٹر ثابت ہوئی۔ لیکن وہ اسے محض غلطیاں پکڑنے کی مشین ہی کہتے تھے۔

ایک بہتر کمپیوٹر بنانے کی کوشش میں انھوں نے ایک مشین بنائی جس کا نام (ANALYTICAL MACHINE) رکھا مگر یہ مشین بہت پیچیدہ تھی اور اس کا وزن بہت زیادہ تھا۔ اس کے پرزے ٹکڑے دھرے، پہیے وغیرہ انھوں نے خود بنائے تھے۔ اس کے دعوے اس خوبی سے گھومتے تھے کہ ہر سوال کا جواب عام طور پر بالکل صحیح آتا تھا۔

اس طرح برابر تجربے کرتے رہنے سے انھیں ایسی صحیح مشین بنانے کا علم ہو گیا جو سوال کرنے پر اس کا صحیح جواب دے اور بالکل غلطی نہ کرے۔ اسی کوشش کے ساتھ ساتھ وہ اپنے تجربات اور خیالات کی بنیاد پر ایک کتاب بھی لکھتے رہے۔

ان کو یقین تھا کہ جیکرڈ کے چھید سے بھرے کارڈ بنائی کے علاوہ حساب کتاب کرنے والی مشین میں بھی استعمال ہو سکتے ہیں اس مشین سے دوسری مشین میں معلومات اور ڈاٹا منتقل بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک طرح کا فیڈ بیک (FEED BACK) طریقہ ہے جو آج کمپیوٹر بنانے میں نہایت اہم مانا جاتا ہے اس لیے کہ اس کی بدولت چیزوں کو بار بار دہرانا بھی نہیں پڑتا اور حل کئے سوالات سے اور آگے کے حل نکال سکنے میں مدد بھی ملتی ہے۔

کمپیوٹر بنانے کی کامیابی میں جارج بول (GEORGE BOOLE ۱۸۱۵ء سے ۱۸۶۴ء) کی ریاضی کی نئی معلومات کو بھی بہت دخل ہے جارج انگلینڈ کے مشہور ریاضی داں اور فلسفی تھے۔ انھوں نے اپنی فکر سے یہ منطقی نکتہ نکالا کہ اگر اعداد کی منطق بنائی جا سکتی ہے تو الفاظ اور حروف کی منطق بھی ہو سکتی ہے اور انھیں منطقی بحث میں کھینچا جا سکتا ہے۔ ان کی یہ بات سچ ثابت ہوئی۔ آج الجبرا ریاضی کی اہم ترین شاخ ہے۔ اور خاص طور سے کمپیوٹر تو ان ہی اصولوں پر چلتا ہے۔

امریکہ میں ۱۸۹۰ء کی مردم شماری کا کام ڈاکٹر ہرمان ہالرتھ HERMAN HOLLRITH. کو دیا گیا انھوں نے جیکرڈ کے پنچ کارڈ کی ترکیب استعمال کر کے گنتی کی جو مشین تیار کی وہ سب سے پہلا کارآمد "انالوگ کمپیوٹر" تھا جس نے مردم شماری کو قلیل عرصے میں پورا کر دیا۔

کلاڈ شینن (CLAUDESHANON) جو عرصے سے کمپیوٹر پر تحقیق کر رہے تھے ۱۹۳۸ء میں ایک اعلیٰ قسم کا کمپیوٹر بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کمپیوٹر سے منطقی بنیاد پر بھی مسئلوں کو حل کرنا ممکن ہو گیا۔ اور جب دنیا کے سائنس دانوں اور ریاضی کے عالموں نے اس کی افادیت کو سمجھا اور قائل ہو گئے تو نئی نئی سائنسی معلومات کا کمپیوٹر بنانے میں استعمال کیا جانے لگا۔ اس کو حساب کتاب کرنے کے علاوہ فکر کرنا بھی سکھا دیا گیا۔

آج کمپیوٹر میں لگاتار تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور آئے دن تیز رفتار، ذہین، کم خرچ، صنعت و حرفت میں انقلاب برپا کر دینے والے کمپیوٹر بنتے جا رہے ہیں۔ ڈیجیٹل کمپیوٹر تو انیسویں صدی کے آخر میں ہی وجود میں آ گئے تھے لیکن انھیں برق رفتار، کم خرچ، کم جگہ گھیرنے والا بنانے کی ذمہ داری الکٹرانکس کی تھی۔

ویسے تو الکٹرانکس کے معنی ہیں وہ سائنسی تکنیک جو بجلی گیس میں یا سیمی کنڈکٹر اور اس سے متعلق اوزار یا آلات کی رہنمائی کرے یا ان کے عمل کا تعین کرے۔ لیکن کمپیوٹر میں ان کا خاص استعمال سوئچ یعنی

[illegible] یک یا چند پرزوں سے کام کیا گیا جیسے الکٹرانک گھڑی
جو [illegible] [illegible] تاریخ جینز یک وقت بتاتی ہے اور اس میں
محض چند پرزے ہوتے ہیں۔ اسی کی بدولت کمپیوٹر کے لاکھوں پرزے
SOLID STATE[1] میں تبدیل کر دیے گئے ہیں اور یہ چھوٹے کمپیوٹر
پہلے کے کمپیوٹروں سے زیادہ کارآمد زیادہ تیز رفتار اور کم خرچ ہیں۔

کمپیوٹر کی افادیت کا عالم یہ ہے کہ بچوں کو انسائیکلوپیڈیا سے
لے کر خود کمپیوٹر کی تکنیک پڑھا سکتا ہے۔

اکثر یہ بھی سوال اٹھایا جاتا ہے کہ کیا کمپیوٹر دماغی کام بھی کر سکتا
ہے اور کیا وہ نئے خیالات پیدا کر سکتا ہے؟

ہاں کمپیوٹر دماغ کے متوازن کچھ کام کر سکتا ہے۔ ریاضی اور منطقی
بحث اور فیصلے کر سکتا ہے خود پڑھ سکتا ہے اور پڑھا بھی سکتا ہے۔

کمپیوٹر کی ساخت کو انسانی دماغ سے مشابہ بنانے میں بھی کامیابی
ہوئی ہے مثلاً انسانی دماغ کی طرح نیوران[2] (NEURON) کا کمپیوٹر
میں بنانا یا بائیونکس[3] (BIONICS) کا استعمال کیا جانا۔

کچھ کمپیوٹر محض آواز کے احکامات بھی بجا لاتے ہیں یا انسان
کی طرح اگر کسی کام کو کرنے سے قاصر ہوتے ہیں یا غلط احکامات
دیے جاتے ہیں تو وہ بگڑ جاتے ہیں اور اس طرح خالی آواز نکالنے
اور چکر لگانے ہیں جیسے کہ انھیں غصہ آگیا ہو ان کے اسکرین پر یہ لکھ
کر آجاتا ہے کہ آپ غلط فہمی دبا رہے ہیں یا ہم سے مذاق نہ کیجئے۔

اہم عالمی معلموں پر فیصلہ کرنے سے پہلے کمپیوٹر سے مشورہ کیا
جاتا ہے اور وہ ایک قابل اعتماد مشیر کی طرح سربراہوں کی مدد کر سکتا
ہے۔

کمپیوٹر کے ذریعہ بڑی ہستیوں کی تقاریر، کچھ بہترین اور نایاب
کتابوں کے اسکرپٹ، کچھ اہم اور دلچسپ مضامین جو اکثر وقت کے ہنگاموں
اور ماہ و سال کی گرد کے نیچے دب کر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں
اب ہمیشہ کے لیے محفوظ کئے جا سکتے ہیں۔

مصنوعی سیارہ یا راکٹ فضا میں ایک منٹ کے اندر اتنی دور
جا سکتا ہے جتنی دور پانی کا جہاز دن بھر میں جاتا ہے اور متعین
وقت، ٹھیک مقام اور رفتار مقرر نہ ہو تو حادثے ہونے کا امکان ہو
اور یہ سارے کام کمپیوٹر کی مدد سے ممکن ہوتے ہیں۔

ایک ریاضی داں اگر خلائی گاڑی خلا میں پہنچنے کا حساب لگاتا
تو اس کے پہنچنے سے پہلے اس کی چالیس پیڑھیاں اس کام کو پورا کر
پاتیں لیکن آج کمپیوٹر کی مدد سے یہ دو ہزار آٹھ سو سال کا عمل محض
تین سکنڈ میں کمپیوٹر سے پورا کیا جا سکتا ہے۔

غور کیجئے تین کروڑ چھبیس لاکھ تاسی ہزار (۳،۲۶،۸۷،۰۰۰)
میل لمبا خلائی سفر کرنے والی امریکہ کی گاڑی (۲۔۱) اگست ۱۹۶۲ء بغیر
ایک سکنڈ کا فرق ہوئے ٹھیک وقت پر زہرا کے گرد پہنچا دے اور پھر
وہ زمین سے دیے گئے احکامات پر عمل کر کے اپنے کیمرے کا ہاتھ باہر
نکالے اور فلم کھینچنا شروع کر دے جو ٹی۔ وی کی تکنیک سے زمین پر
دکھائی دے اور جب زمین سے پیغام پہونچے کہ اب فلم بنانا بند کر دو اور
سیارے کے اور نزدیک جاؤ تو خلائی گاڑی اس پر عمل کرے بغیر کمپیوٹر
کے ممکن ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

کچھ مصنوعی سیارے روس، یورپ کے دیگر ممالک اور ہندوستان
میں قائم کئے گئے ہیں اور پیغام رسانی کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔
ہندوستان کا انسیٹ۔ ایک۔ بی جسے اگست ۱۹۸۳ء میں چھوڑا گیا تھا ایسا
ہی ایک سیارہ ہے۔

ہندوستان نے اب تک نو مصنوعی سیارے خلا میں چھوڑے اور
انسیٹ۔ ایک۔ بی کی کامیابی نے یہ ثابت کر دیا کہ ہم جلد ہی دوسرے
ترقی یافتہ ملکوں کے ہم پلہ ہو جائیں گے۔

انگلستان، امریکہ اور نیدرلینڈ کے سائنس دانوں نے جنوری
۱۹۸۳ء میں آئرس (IRAS) نامی ایک مصنوعی سیارہ چھوڑا جو زمین
کے چکر لگاتا ہے۔ اس میں ایک بڑی دوربین اور ایک چھوٹا کمپیوٹر
نصب ہے۔ اس مصنوعی سیارے نے ایک ایسے سیارے کی خبر دی
ہے جو ہماری دنیا کے گرد گھومنے والے چاند سے چار گنا بڑا ہے اور
دنیا سے پچاس کروڑ (۵۰،۰۰،۰۰،۰۰۰) کیلومیٹر دوری سے ہو کر
گزرے گا اور سات ایسے ستاروں کا پتہ لگا ہے جو ہمیں سے بن رہے

---

[1] کئی پرزوں کا کام ایک پرزے سے لیا جانا۔ [2] خاص طور سے دماغی رگوں کا جال، [3] زندگی سے متعلق۔

ہیں۔ انھیں (PROTOSTARS) کہا جاتا ہے۔ یہ غبار کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ دراصل یہ غبار ہائیڈروجن، ہیلیم گیس ہے جو ان ستاروں کے بنیادی عناصر ہیں۔

امریکہ کی رپورٹ ہے کہ ان کمپیوٹروں کے بینک، بیمہ وغیرہ میں لگنے سے کاغذ کے استعمال میں حیرت انگیز بچت ہوئی۔ اس سے قبل تقریباً آٹھ سو پچاس کھرب ڈالر کا کاغذ صرف ہوتا تھا۔ محض بینکوں میں چار کروڑ چیک ہر سال لکھی جاتی تھیں۔ اب نہ کاغذ کا اتنا خرچ نہ بینکوں میں اتنی دیر لگتی ہے جتنی پہلے لگتی تھی

آج ہوائی جہاز بہت پیچیدہ قسم کے پرزوں سے لیس ہوتے ہیں۔ اڑنے سے پہلے کمپیوٹر ان سب کی جانچ کرتا ہے۔ اس سے وقت بچتا ہے۔ اور کمپنیاں فائدہ اٹھاتی ہیں۔ ایک کمپیوٹر ایک دن میں پانچ لاکھ چالیس ہزار ریزرویشن بھی کر سکتا ہے۔

ڈاکٹری علاج کے لیے کمپیوٹر کا استعمال روز افزوں ہے کینسر جیسی بیماری سے نپٹنے کے لیے کمپیوٹر کا سہارا لینا پڑتا ہے کینسر کے خلیے (CELL) بنا کر ان پر تجربے کرنا اور پھر ان کی تفصیلی جانچ کرنا کمپیوٹر ہی سے ممکن ہے۔ دل کے مریضوں کی دیکھ بھال اپاہج لوگوں کی مدد اس کے علاوہ ہر طرح کی بیماریوں کے لیے مرکبات بنانا، فالج زدہ اعضائے انسانی کے لیے مصنوعی دماغ کی مدد سے ان کو حرکت میں لانا سارے کام اس کمپیوٹر سے ہی ہوتے ہیں۔

ماہروں کا کہنا ہے کہ ہندستان جیسے ملک میں جہاں مختلف زبانیں لکھی اور بولی جاتی ہیں کمپیوٹر کی مدد سے ترجمے کرکے زبان کا مسئلہ اس کے آپسی جھگڑے ختم کیے جاسکتے ہیں اور ہم معنی الفاظ کی ڈکشنری تیار کرکے ایک ایسا حل نکالا جاسکتا ہے کہ سب ایک دوسرے کی زبان اپنی زبان میں سمجھ سکیں اور ایک دوسرے کے نزدیک آ سکیں۔ فروری ۱۹۸۳ء میں غیر جانب دار ملکوں کی کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی تھی اور اس میں ایسے ہی ایک کمپیوٹر سے کام لیا گیا تھا اور ہر سربراہ اپنی زبان میں دوسروں کی تقریر سن سکتا تھا۔

کمپیوٹر ہمارا علمی، تحقیقی اور منطقی استاد بننے کی تمام تر خصوصیات اور بہترین صلاحیتیں رکھنے والا ہے ترقی یافتہ ممالک میں اس کی تعلیمی درس گاہوں میں کارگزاری دیکھی جاسکتی ہے۔

ان تعلیمی اداروں میں کمپیوٹر پر باقاعدہ کورس شروع کر دیے گئے اور یہ تعلیم عام ہو گئی کہ کمپیوٹر اس کی ریاضی صنعت و حرفت میں اس کے امکانات اس کے پروگرام کیسے بنتے ہیں۔ ان پر کتابیں لکھی گئیں پروفیسر، ڈین، انجنیر اور کمپیوٹر کے ماہر پیدا کرنے کے لئے اونچے درجوں کے کورس شروع ہو گئے۔ اسکولوں میں کمپیوٹر ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے۔ ہائی اسکول میں کمپیوٹر کا لازمی کورس ہے۔ کمپیوٹر سے بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ اب ان ملکوں میں سترہ سال کے بچے کمپیوٹر کے ماہر بن کر نکلتے ہیں۔

روبوٹ یا مشینی انسان ترقی یافتہ ممالک میں محض کھلونوں کی طرح استعمال نہیں ہوتے مثال کے طور پر روس میں ان کا استعمال بڑھا اور خاص طور سے ان کاموں میں جو انسانی صحت کے لیے مضرت رساں ہیں، یعنی اعلیٰ دباؤ والے کام، نقصان دہ عناصر والے کام، ریڈیشن اور زیکوم وغیرہ سے متعلق کام یا دہ نفسیاتی بوجھ ڈالنے والے کام جیسے آٹو موبائل اور گھڑی سازی کی صنعت۔ روبوٹ بیرونی فضا اور سمندر کی گہرائیوں، دھات کی جڑائی، نیوکلیائی ری ایکٹر کا کنٹرول کاروں پر رنگ چڑھانا وغیرہ۔ اب سوویٹ روس میں روبوٹ پنج سالہ منصوبوں کا اہم جزو بن گئے ہیں جس کی بدولت کم از کم ۲۵ کروڑ روبل کی مجموعی بچت ہو سکے گی۔

ریت میں ملے ہوئے چمکدار ذرے جو سلیکان کہلاتے ہیں کمپیوٹر کی یادداشت بنانے کے لیے استعمال ہوتے رہے اب انھیں انسانی دماغ کے خلیے نیوران کی طرح بنایا جارہا ہے ایسے کمپیوٹر کی رفتار ایک سکنڈ میں بیس کروڑ حساب کرنے کی ہو سکتی ہے جتنے کمپیوٹروں کے کام کرنے کی رفتار روشنی کی رفتار کا مقابلہ کرتی ہے اور وہ صفر درجہ حرارت پر بھی کام کر سکتے ہیں۔

دماغی ذرات بنانے کے لیے محض ۴ × ۴ ملی میٹر کی ضرورت ہوگی اور اتنی سی جگہ میں دو لاکھ چھپن ہزار ذرات اطلاعات رکھے جاسکیں گے اور انھیں پڑھنے کی رفتار ایک سکنڈ کا دس کروڑواں حصہ ہوگی جس کے لیے ببل (BUBBLE) کی یادداشت زیادہ کارآمد ثابت ہوگی اسلئے کہ

(بقیہ ۴۲ پر)

[illegible] کرار حسین رفعت لکھنوی
[illegible]

اوزانِ رُباعی تسکینِ اوسط کی روشنی میں

رباعی کے سلسلے میں صدہا مضامین سپردِ قلم کیے جا چکے ہیں۔ جن میں رباعی کی تخلیق اور اس کے اوزان پر مباحث موجود ہیں۔ بظاہر اس موضوع میں تازگی پیدا کرنے کے لیے کئی زاویوں سے اس کے اوزان پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"معیار البلاغت" اور "تذکرہ دولت شاہ" سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رباعی "امیر یعقوب بن لیث صفاری" کے عہد کی پیداوار ہے۔ جوز بازی میں امیر زادہ کے منھ سے یہ الفاظ نکلے تھے۔ (غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گور) امیر یعقوب کے حکم سے اُس کے مصاحبین "ابو دلف" اور "زینت الکتب" نے تقطیع کی تو بحرِ ہزج میں موزوں پایا اور ایک مصرع لگا دیا۔ پھر ایک بیت بڑھا کر دوبیتی کر دیا۔ ابن لیث کا عہد "تذکرہ خزانۂ عامرہ" کی رو سے ۲۵۱ھ ہے جب کہ "معیار البلاغت" اور "تذکرۂ دولت شاہ" سے چوتھی صدی ہجری کا پتہ چلتا ہے۔ رودکی بھی چوتھی صدی ہجری میں پیدا ہوا۔ "مؤلف منجد" رودکی کی پیدائش ۳۰۴ھ لکھتا ہے۔ رودکی کو فارسی غزل کا موجد مانا گیا ہے اور پہلا صاحبِ دیوان شاعر بھی۔ چند تذکروں میں "رودکی" اور امیر یعقوب کا عہد ایک ہی بتایا گیا ہے۔ (علیٰ ہذا القیاس) بہرحال رباعی بعہدِ امیر یعقوب عالمِ وجود میں آئی۔ رباعی کے دس ارکان مقرر کیے گئے ہیں۔ ایک سالم اور نو مزاحف۔ (۱) مفاعیلن (سالم) (۲) مفاعیلُ (مکفوف) (۳) مفاعلن (مقبوض) (۴) فاعلن (اشتر) (۵) مفعولُ (اخرب) (۶) مفعولن (اخرم) (۷) فعولُ (اہتم) (۸) فاع (ازل) (۹) فَعَل (مجبوب) (۱۰) فع (ابتر)۔ ان دس ارکان میں چار "فعولُ" "فاع" "فَعَل" "فع" عروض و ضرب سے مختص ہیں اور کہیں نہیں آتے۔ اور چار "مفاعیلن" "مفاعیلُ" "مفاعلن" "فاعلن" حشو سے مختص ہیں کہیں اور جگہ نہیں آتے اور دو "مفعولُ" "مفعولن" صدر و ابتدا میں بھی آتے ہیں اور حشو میں بھی لیکن عروض و ضرب میں نہیں آتے۔ شمس الدین محمد بن قیس "المعجم" میں لکھتا ہے کہ: خواجہ حسن قطان خراسانی نے چوبیس اوزان منضبط ہونے کے لیے دو شجرے ایجاد کر کے "اخرب و اخرم" کے حدود قائم کر دیے۔ رباعی کسی وزن میں کہی گئی ہو مذکورہ چوبیس اوزان میں کسی نہ کسی وزن پر ضرور ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ رباعی اتحاد و اختلافِ اوزانِ مصاریع کے اعتبار سے ہزاروں اوزان رکھتی ہے، لیکن چوبیس خاص اوزان ہیں۔ جن کی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

دائرہ اخرب

۱	مفعولُ	مفاعلن	مفاعیلُ	فعول
۲	مفعولُ	مفاعلن	مفاعیلن	فاع
۳	مفعولُ	مفاعلن	مفاعیلُ	فَعَل
۴	مفعولُ	مفاعلن	مفاعیلن	فع
۵	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعیلُ	فعولُ
۶	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعیلن	فاع
۷	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعیلُ	فَعَل
۸	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعیلن	فع
۹	مفعولُ	مفاعیلن	مفعولُ	فعولُ
۱۰	مفعولُ	مفاعیلن	مفعولن	فاع
۱۱	مفعولُ	مفاعیلن	مفعولُ	فَعَل

۱۲	مفعولُ	مفاعیلن	مفعولن	فع

دائرۂ اخرم

۱	مفعولن	فاعلن	مفاعیل	فعولُ
۲	مفعولن	فاعلن	مفاعیلن	فاع
۳	مفعولن	فاعلن	مفاعیلُ	فعَلْ
۴	مفعولن	فاعلن	مفاعیلن	فع
۵	مفعولن	مفعولُ	مفاعیلُ	فعولُ
۶	مفعولن	مفعولُ	مفاعیلن	فاع
۷	مفعولن	مفعولُ	مفاعیلُ	فعَلْ
۸	مفعولن	مفعولُ	مفاعیلن	فع
۹	مفعولن	مفعولن	مفعولُ	فعولُ
۱۰	مفعولن	مفعولن	مفعولن	فاع
۱۱	مفعولن	مفعولن	مفعولُ	فعَلْ
۱۲	مفعولن	مفعولن	مفعولن	فع

مؤلف غیاث کا کہنا ہے کہ رباعی کا خاص وزن لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا باللّٰہ ہے۔ "ابن قیس" نے المعجم میں بیان کیا ہے کہ رباعی کو ترانہ اس لیے کہتے ہیں کہ ارباب موسیقی نے اس میں عمدہ عمدہ راگ بنائے ہیں۔ عربی میں ایسے اشعار کو قول کہتے ہیں، اور کسی خاص راگ کا لحاظ کئے بغیر صرف اشعار کے اعتبار سے دُوبیتی کہتے ہیں، کیونکہ اس میں دُو بیت سے زیادہ نہیں۔ عرب بیشتر رباعی بولتے ہیں کیونکہ یہ بحر ہزج میں ہے اور وہ عرب میں مربع الاجزا ہے۔ رباعی کی ہر ایک بیت عربی کے اعتبار سے بمنزلہ دُو بیت ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ مذکورہ دس ارکان کا اپنی اپنی جگہ اختلاط جائز ہے۔ چاہے تخنیق نام رکھا جائے یا تخنیق، یا تسکین اوسط کہا جائے۔ ہر مصرع کا وزن برابر ہے تو کیا معنی کہ ہر مصرع کا اشتراک جائز ہو! استثناً ساتذۂ فن نے ہر مصرع مختلف الوزن ایک رباعی میں کہنا جائز قرار دیا ہے جس کی مثالیں عروض کی بیشتر کتابوں میں موجود ہیں خاص طور سے "ملا جامی" کی چھ رباعیاں جن کا ہر مصرع مختلف الوزن ہے۔ چونکہ رباعی اہل فارس کی ایجاد ہے اس وجہ سے [illegible] [illegible] میں اجتناب کیا اور اس سے [illegible]

نہ ہوئے لیکن متاخرین نے اوزان رباعی میں خوب طبع آزمائی کی۔ طوائی مضمون مانع ہے ورنہ ہر مقام کا شعر مثال کے لیے دیا جا سکتا تھا۔ رباعی کے وزن میں "فعول" کہنا بھی جائز ہے۔ [دائرۂ اخرب و اخرم تسکین اوسط کی روشنی میں]

(۱) اخرب کے صدر اور حشو کے پہلے رکن کے ملنے سے تین متحرک متواتر ہیں۔ یعنی مفعولُ کا "لام"، مفاعلن کا "میم" اور "فا"۔ مفاعلن مفاعیلُ فعولُ" کے برابر ہو جائے گا۔ اسی طرح اخرب کے پہلے وزن میں حشو کے دوسرے رکن مفاعیلُ اور عروض میں فعول کے ملنے سے پے بہ پے تین متحرک موجود ہیں۔ یہاں بھی تسکین اوسط کے ذریعہ "فعول" کا "فا" ساکن ہو کر مفاعیلُ کے "لام" سے مل جائے گا۔ اور یہ شکل پیدا ہو جائے گی۔ "مفاعیلت عول" اسے "مفاعیلن فاع" سے بدل لیں گے۔ اخرب اخرم میں یہی شکل دیکھی جا سکتی ہے۔ تیسرا وزن "مفعولُ مفاعلن مفاعیل فعَلْ"۔ "فعَلْ کا "فا" ساکن ہو کر مفاعیلُ "مکفوف" کے لام سے مل جائے گا اور یہ وزن پیدا ہو گا۔ "مفاعیلت عل"، جسے مفاعیلن فع سے بدل لیں گے۔ یہ صورت اخرب و اخرم کے چوتھے وزن میں دیکھی جا سکتی ہے۔ دائرۂ اخرب کا پانچواں وزن "مفعولُ مفاعیلُ فعولُ" ہے۔ حشو کے پہلے رکن کا "میم" ساکن ہو کر "مفعولُ" اخرب کے "لام" سے مل جائے گا اور "مفعولن مفعولُ" کی شکل اختیار کرے گا جیسا کہ دائرہ اخرم کا پانچواں وزن ہے۔ اسی وزن میں "فعول" کا "فا" ساکن ہو کر حشو کے دوسرے رکن کے مفاعیلُ سے مل جائے گا اور مفاعیلن فاع کا وزن حاصل ہو جائے گا۔ چھٹے وزن کی یہی صورت نظر آتی ہے۔ دائرہ اخرب کے ساتویں وزن میں، فعَلْ کا "فا" ساکن ہو کر حشو کے دوسرے رکن کے "مفاعیلُ" مکفوف کے لام سے مل جائے گا اور یہ وزن پیدا ہو گا۔ "مفاعیلن فع" یہ شکل اخرب و اخرم کے آٹھویں وزن میں پائی جاتی ہے۔ دائرۂ اخرب کا نواں وزن "مفعولُ مفاعیلن مفعولُ فعول" ہے۔ مفاعیلن کا "میم" ساکن ہو کر مفعولُ اخرب کے "لام" سے مل جائے جس کی یہ شکل ہو گی "مفعولم فاعیلن" اسے "مفعولن مفعولن" سے بدل لیا جائے گا۔ اسی وزن میں عروض کے "فعول" کا "فا" ساکن ہو کر رکن [illegible] کے لام متحرک سے مل جائے گا۔ اور

ہم ایسے مقامات پر تسکین اوسط سے کام نہیں لے سکتے۔ علامہ طوسی نے زحافِ تسکین اوسط عام کرنے کے لیے رباعی میں ایک نیا قاعدہ ایجاد کیا ہے جسے سمجھنے کے لیے فلسفیانہ نظر درکار ہے۔ ان کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ رباعی کے صرف چوبیس ۲۴ یا بارہ ۱۲ یا چھ ۶ ہی اوزان ہیں! بلکہ وہ عروضیوں کو دعوت فکر دیتے ہیں کہ اگر ایک مصرع سے چوبیس اور چوبیس سے ہزاروں اوزان، رباعی کے چار مصرعوں کے الٹ پھیر سے ہو سکتے ہیں تو ان کے استعمال کی شکل کیا ہونا چاہیے! اسی لیے انھوں نے "اخرب" کو اخرم پر مقدم کیا، تاکہ تسکین اوسط کا عمل جاری ہو سکے۔ ورنہ عالم وجود میں آنے والے رباعی کے پہلے مصرع کا وزن "اخرم" ہے۔ اصول و قوانین مرتب کرنے سے قبل واضع کو ہر زاویے سے غور کرنا پڑتا ہے۔ علامہ محقق طوسیؒ نے بھی "عروض و ضرب" کے واسطے فَعَل، اور فع، اخذ کیے، تاکہ آخر میں ایک ساکن کا اضافہ "فَعَل"، کو فعولُ اور "فع" کو فاع کر دے جس طرح تسکینِ اوسط سے اوزان کم ہو سکتے ہیں اسی طرح "تسبیغ" کے ذریعے بڑھ سکتے ہیں۔ اوزان نہ صرف چوبیس ۲۴ ہیں۔ نہ بارہ ۱۲، نہ دو ۲۔ بلکہ رموزِ تسکین اوسط سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اوزان کی تعداد کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ بسبب تسکین اوسط بارہ سے گھٹ کر دو اوزان کیونکر رہ جاتے ہیں؟ اس کا نقشہ مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) مفعولُ مفاعیلن مفعولُ فَعَل } مفعولن مفعولن مفعولن فع
(۲) مفعولُ مفاعیلن مفعولن فع

(۳) مفعولُ مفاعلن مفاعیلُ فَعَل } مفعولن فاعلن مفاعیلن فع
(۴) مفعولُ مفاعلن مفاعیلن فع

(۵) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فَعَل } مفعولن مفعولن مفعولن فع
(۶) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلن فع

(۷) مفعولن مفعولن مفعولُ فعل } مفعولن مفعولن مفعولن فع
(۸) مفعولن مفعولن مفعولن فع

(۹) مفعولن فاعلن مفاعیلُ فعل } مفعولن فاعلن مفاعیلن فع
(۱۰) مفعولن فاعلن مفاعیلن فع

(۱۱) مفعولن مفعولُ مفاعیلُ فعل } مفعولن مفعولن مفعولن فع
(۱۲) مفعولن مفعولُ مفاعیلن فع

بسبب تسکین اوسط: پہلا۱ ۔ دوسرا۲ ۔ پانچواں۵ ۔ چھٹا۶ ۔ ساتواں۷ ۔ آٹھواں۸ ۔ گیارھواں۱۱ ۔ بارھواں۱۲ ۔ وزن ایک ہے۔ اور تیسرا۳ ۔ چوتھا۴ ۔ نواں۹ ۔ دسواں۱۰ وزن ایک ہے۔

پہلے، تیسرے، پانچویں، ساتویں، نویں۔ اور گیارھویں وزن کے عروض و ضرب میں اگر ایک ساکن کا اضافہ کیا جائے تو فعل، فعولُ ہو جائے گا۔ اور دوسرے، چوتھے، چھٹے۔ آٹھویں۔ دسویں۔ اور بارھویں وزن میں اگر ایک ساکن کا اضافہ کیا جائے گا تو "فع" "فاع" ہو جائے گا۔ یعنی تسکین اوسط کے عمل سے صرف دو اوزان باقی بچتے ہیں (۱) "مفعولن مفعولن مفعولن فع" کہ اس میں سب سبب خفیف جمع ہیں۔ (۲) "مفعولن فاعلن مفاعیلن فع" کہ اس میں سات سبب خفیف اور دو اوتاد ہیں۔ اب ان دونوں اوزان میں تسکین اوسط کی گنجائش نہیں ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ اگر تسکین اوسط و تسبیغ سے کام لیا جائے تو رباعی کے خاص اوزان کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ چوبیس ۲۴ ہیں۔ جو بہ اعتبار وزن برابر مانے گئے ہیں۔ خواجہ نصیر الدین محقق طوسی علیہ الرحمہ نے زحافِ تسکین اوسط ایجاد کر کے اور اسے عام کر کے علم عروض کی صدہا پیچیدگیاں کم کر دیں ورنہ رباعی میں اس کے دس ارکان کا اختلاط بصورت تحقیق، بحر زخّار سے کم نہ تھا! شعر خواہ کسی بحر میں ہو، وافی۔ مجزو۔ مشطور۔ منہوک۔ شاعر کو اختیار ہے کہ زحافات کی مدد سے اپنی مرضی کے مطابق کرے۔ یعنی جتنا مترنم وزن چاہے اختیار کرے ہماری شاعری کے مزاج نے، علم القوافی و علم العروض سے اتنا ہی لیا ہے جتنا ہماری زبان کا ہم مزاج تھا ہماری زبان نہ طوالی حرکات کی متحمل ہے نہ طوالیٔ سکون کی۔ عربی کا مزاج اور لہجہ علیحدہ ہے فارسی کا جداگانہ یہی وجہ ہے کہ ہمارے شعراء نے رباعی کے ان اوزان میں کم طبع آزمائی کی ہے جن میں ضرورت سے زیادہ سکون و تحریک ہے حد اعتدال میں جتنے اوزان آئے نظم کیے گئے، اور کثرت سے نظم کیے گئے۔ ہاں ان اوزان میں بھی فنی مظاہرے کے لیے طبع آزمائی کی گئی لیکن کل بھی وہ اوزان نامانوس و نامطبوع تھے اور آج بھی ہیں۔
رباعی میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ رکنی تقابل کا اختتام اگر سبب پر ہوا ہے

(باقی آئندہ)

مزاحیہ

احمد جمال پاشا
نشاط افزا - سیوان (بہار)

جائیں تو جائیں کہاں

یہ دنیا تو انسانی چوپایوں کی چراگاہ ہے۔ جس میں روزانہ صبح سے رات تک جنگل، عجائب گھر اور سرکس کے بھانت بھانت کے مویشیوں سے ہم ٹکراتے رہتے ہیں۔ اگر آپ نہ بھی ملنا چاہیں تو پڑوسی، رشتے دار اور دوست آپ سے ملاقات کے بہانے ٹکراتے رہیں گے۔

پڑوسی اس فلسفی کو کہتے ہیں جو آپ کے گھر کو اپنا آنگن سمجھے پڑوسی کا سارا عمل چھوٹے زمیندار یا بڑی طاقتوں والا ہوتا ہے۔ آپ سے کون کون ملنے آیا؟ کیا کیا باتیں ہوئیں؟ اصل معاملہ اور معاملے کی تہہ میں کیا ہے؟ آخر آپ کے یہاں پکا کیا ہے؟ غرض وہ ہر بات کی ٹوہ میں رہتا ہے اس کی جاسوسی کا مقصد آپکو دراصل کمزور کرنا اور اپنا ماتحت بنانا ہوتا ہے اِدھر آپ نے صبح صبح مرغیاں باہر نکالنے کے لئے دروازہ کھولا اور پڑوسی اندر آگئے۔ آپ نہانے کا موڈ ہی بناتے رہ گئے کہ وہ غسل خانے میں قلعہ بند ہوگیا۔ آپ نہانے گئے تو وہ آپ کا اخبار لیکر دھوپ کھانے بیٹھ گیا۔ آپ دھوپ بھی نہ کھا پائے کہ وہ آپ کا ناشتہ کھا گیا۔ تیار ہوکر دفتر کے لئے جانے لگے تو اس نے اپنے دس غیر ضروری کام آپ کے سر منڈھ دیئے آپ کے جانے سے پڑوسیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ قطعاً ختم نہ ہوگا۔ اس کی گھر والی آپ کے گھر میں دن بھر ادھار اور منگنی کا خوشگوار سلسلہ جاری رکھے گی۔ شام کو جب آپ پڑوسیوں کے کاموں سے بامراد لدے پھندے تھکے تھکائے لوٹیں گے تو پڑوسیوں کو حسب معمول ڈرائنگ روم کو چوپال کی طرح استعمال کرتے ہوئے پائیں گے۔

پڑوسی کی دنیا پڑوسی کا گھر، محلہ کا مسائل اور سب سے مفید مشغلہ محلے والوں کو آپس میں لڑانا جس کے لئے وہ ایسے ایسے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں جن کے جملہ حقوق ہر قسم کے سیاسی لیڈروں کے نام محفوظ ہیں یہی وجہ ہے اکثر کامیاب پڑوسی مقامی لیڈر بھی ہو جاتا ہے۔

سب سے مزے میں وہ ہے جو ہر قسم کے پڑوسیوں اور پڑوس سے پاک ہے۔ ہمارے ایک بے حد سنجیدہ دوست کا جب یہاں تبادلہ ہوا تو ایک سے ایک بہتر مکان ملنے کے باوجود انھوں نے ایک مہنگے اور اچھے ہوٹل میں رہنا پسند کیا۔ جب ہم نے ان سے اس بے جا ٹھاٹ باٹ نمود و نمائش بلکہ آرائش و زیبائش کا سبب پوچھا تو بولے "ہوٹل بہت مہنگا ضرور ہے مگر پڑوس اور پڑوسی نہ ہونے کی وجہ سے گھر اور اسپتال سے بے حد سستا پڑتا ہے۔

رشتے داری کے لئے کہا گیا ہے کہ غم داری

غم ندارد بُز بخر

یہاں بکری کی تشبیہ دراصل رشتہ دار کے لئے استعمال کرکے غم کی مرغی نہیں غم کی بکری پالنے والوں کو آگاہی دی گئی ہے کہ خبردار اگر تم نے کسی رشتے دار کو پالنے کی کوشش کی تو تمہارا بھی اس دار فانی میں وہی حشر ہوگا جو مرغیاں اور بکریاں پالنے والوں کا ہوا کرتا ہے۔ اور تمہاری جان کو غم کا روگ لگ جائے گا۔

رشتے دار سے نجات ممکن نہیں۔ یہاں پر ہر فارمولا فیل ہو جاتا ہے کہتے ہیں کہ جو رشتے دار جتنا نزدیکی ہوتا ہے وہ اتنا ہی تکلیف دہ ہوا کرتا ہے رشتے داری دراصل ایک قسم کی نہ ختم ہونے والی پنچایت ہوا کرتی ہے! اس بنیادی جمہوریت میں رشتے دار کی حیثیت آپ کے لیے حزب مخالف کی ہوتی ہے۔ آپ میں کتنی برائیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ یہ تو آپ کے دل سے زیادہ کراماً کاتبین ہی بتا سکتے ہیں مگر معہ مبالغے کے آپکے رشتے دار ان سے کہیں زیادہ بتاتے بلکہ جتاتے رہتے ہیں۔

پڑوسی سے تو آپ پیچھا چھڑا بھی سکتے ہیں مگر رشتے دار اپنا خون جو ٹھہرا۔ اس لیے خون خواری ختم ہونے میں نہیں آتی۔ کیونکہ اس کا آپ

تو جنم جنم کا ساتھ ہے۔

جس طرح فصل پر ٹڈی دل گرتے ہیں۔ اسی طرح رشتے داروں کے نزول کا بھی بارہ ماسی موسم ہوا کرتا ہے۔ اور اس طرح گرتے ہیں جیسے کسی قوم پر عذابِ الٰہی نازل ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ دور دراز کے ایک بڑے چھوٹے بزرگ نما خوشحال رشتے دار جن سے رشتہ بھی بہ خوبی واضح نہ ہو سکا اپنے ایک درجن کھلنڈرے اور بدشوق بچوں کو اسکول میں داخل کرانے کے لیے نازل ہو گئے۔ بڑی بھاگ دوڑ کے بعد ان کے داخلے بھی ہو گئے۔ ہاسٹل میں جگہ نہ مل سکی اس لئے بچوں کی دیکھ بھال اور ہماری نگرانی کے لیے اگلے سیشن تک بزرگوار رک گئے۔ لگے ہاتھوں ایک معقول مکان کی تلاش کی بھی فرمائش کر دی۔ مگر اس مفت کا چندن گھس بے للو کے مقابلے میں کوئی مکان پسند بھی کیسے آتا۔؟ ادھر گھر گرہستی کی اینٹ سے اینٹ بھی جا رہی ہے۔ بچوں کے فلموں کے جنگلی مناظر فلمانے سے فرنیچر کی چولیں ہلی جا رہی ہیں۔ گھر کباڑ خانہ بن گیا ہے۔ مگر اف تک نہیں کی جا سکتی کہ رشتے داری دھوئیں کی دیوار کی طرح غائب نہ ہو جائے خدا خدا کر کے یہ فوج گئی تو دوسری [illegible] آگئی۔ معلوم ہوا کہ رشتے کے [illegible] کی حالت غیر ہے گھر سے اسپتال [illegible] کے بعد ڈاکٹروں نے جواب دے دیا اب ان کو دیکھنے [illegible] آرہے ہیں جنھیں دیکھ کر ہمارا بھی جی خوش ہو جاتا کہ ماشاء اللہ کافی بڑا خاندان پایا ہے۔ لاکھ مغموم ماحول سہی مگر گھر میں کیا چہل پہل ہے آخر شریف آدمی تھے۔ دم اکھڑنے لگا اور سورہ یٰسین پڑھی جانے لگی تو وطن کی مٹی کی فرمائش کر دی۔

ابھی ٹھیک سے بخیر چھٹی بھی نہیں تھی کہ ایک صاحب کا تبادلہ ہو گیا۔ خاصی بڑی توپ تھے۔ اور سامان توپ خانہ جب تک بنگلہ الاٹ نہ ہو سکا۔ انھوں نے خانہ انوری کو جگمگائے رکھا۔ ان کی چھوٹی حاضری، منجھلی حاضری اور بڑی حاضری نے ناک میں دم کر دیا۔ بقیہ کسر ان کے بلڈاگ نے پوری کر دی۔

رشتہ داری میں یہ بتانا ضروری نہیں کہ ادھر خیر سے کسی لڑکی کی شادی طے ہوئی اور پورا کا پورا خاندان معہ شاگرد پیشہ آن دھمکا مہینوں خریداری۔ ڈھولک، سینما، پک نک اور سیر سپاٹوں کا سلسلہ جاری رہتا آخر میں بجٹ فیل ہوتے اور اسے عارضی طور پر خسارے سے منافع میں تبدیل کرنے کی براہ راست ذمہ داری بھی آپ ہی پر پڑے گی۔ پھر رشتے دار کا کھاتہ ہمیشہ سادہ ہی رہتا ہے۔ بلکہ الٹی شکایت ہی رہتی ہے کہ "صاحب آخر آپ کی بھی تو ذمہ داری ہے۔ آپ تو کچھ کرتے ہی نہیں؟

دوستوں میں معاملہ ایک دم صاف ہے۔ جس کو غرض ہوگی وہ آپ سے دوستی کرے گا۔ جس سے آپ کو غرض ہوگی آپ اس کی دوستی کا دم بھریں گے۔ اگر آپ کی ہر ممکن امداد سے دوست ترقی کی راہ پر آپ سے کچھ بھی آگے بڑھ گیا، آپ سے اونچا ہو گیا تو بس اس کی صرف ایک ہی پہچان ہے۔ وہ یہ کہ وہ آپ کے خط کا جواب نہ دے گا آپ سے ملاقات کے لیے اس کے پاس وقت ہی نہ رہ جائے گا۔

دوستوں میں سب سے معصوم قسم دانشور ٹائپ کے احباب کی ہوا کرتی ہے۔ دانشور اس زمانے میں اسے کہا جاتا ہے جس میں سوائے دانش کے سب کچھ ہو، کرسی ہو، عہدہ ہو، براہ راست لانڈری سے ڈرائی کلین کی ہوئی نہایت جامہ زیب، موٹر نشین شخصیت ہو حاتم طائی سے شجرہ میل کھاتا ہو۔ اس کمی کو وہ آپس میں لڑ جھگڑ کر بزور بازو پوری کرتا رہتا ہے۔

خیر سے ہمارے ایک شاعر دوست ہیں حضرت بیدار غافل پوری وہ اپنی تعریف سے بڑے خوش ہوتے ہیں۔ ان کے خراب شعر پر بھی اگر داد نہ دیں تو تعلقات خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر وہ کوئی ایسی خطرناک چیز کہہ دیں کہ پیاری پولیس انہیں فوراً گرفتار کرے تو ان کی بڑی شہرت ہو جائے گی۔ غالباً ان کا "خطرناک" میں "ناک" پر زیادہ زور تھا۔ مگر وہ کئی بار ناک کا ذکر کرنے کے بعد بھی اس کی وضاحت نہ کر پائے ہم نے سمجھایا بھی کہ پولیس کی ذمہ داریاں یوں کون سی کم ہیں کہ وہ اس میں آپ جیسے بے ضرر کا خواہ مخواہ میں اضافہ کرے۔ آخر آپ کا استعمال کیا ہوگا؟ انھوں نے برسوں سے دیوان فقط اس لئے نہ چھپوایا کہ انھیں کوئی نام پسند نہیں آیا۔ ان کے غیر پسندیدہ ناموں کی ایک طویل فہرست بطور آٹوگراف بک ان کے ساتھ رہا کرتی ہے جس میں مزید ناپسندیدہ ناموں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے دشمنوں کو خطرہ ہے کہ کہیں دیوان سے پہلے وہ دیوان کے متوقع ناموں کی فہرست نہ چھاپ دیں۔

ہمارے ایک افسانہ نگار دوست ہمیشہ بے وقت اور بے موقع

معہ اپنے تازہ ترین افسانے کے آن دھمکتے ہیں۔ شیطان کی آنت سے بھی لمبا افسانہ ایک سانس میں سنانے کی ناکام کوشش کے بعد وہ کرید کرید کر اس کی خوبیاں اگلواتے ہیں۔ پھر انھیں اطمینان ہو جاتا ہے۔ پھر بھوک لگتی ہے۔ پھر سو جاتے ہیں۔ یہ تو خیر قابو میں بھی آ جاتے ہیں۔ مگر جب کوئی ناول نگار، ناول سنانے کی تمہید باندھتا ہے۔ تو ہم گھر چھوڑ بھاگ نکلنے کے امکانات پر ازسرِ نو غور کرنے لگتے ہیں۔ اور ہمیں بے تحاشہ وہ معصوم ناول نگار یاد آنے لگتے ہیں۔ جو ناول سنانے کی دھن میں یہ بھی بھول جاتے تھے کہ ہم باقاعدہ سو یا غائب ہو چکے ہیں۔

غرض انہی پڑوسیوں، رشتے داروں اور دوستوں کے درمیان ہماری زندگی کے شب و روز گردشِ ایام سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ جو بھی آتا ہے صاحب بالکل صاف اپنے مطلب سے آتا ہے۔ اب ہمارے پاس ہمارے اپنے لئے کوئی وقت نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جائیں تو جائیں کہاں ۔؟ ہم سوچتے ہیں کہ آج غالب پر نئی کتاب پڑھیں گے ابھی کتاب کھولنے کی بھی نوبت نہ آئی تھی کہ پڑوسی کے ساتھ اس کا کتا ڈھونڈنے جانا پڑا۔ کچھ لکھنے کا موڈ بناتے ہیں کہ چلو کوئی مضمون نہ سہی خط ہی تو رشتے دار اپنا مقدمہ نکال کر بیٹھ جاتے ہیں کہ فریقین کے مابین جس زمین پر جھگڑا ہے پہلے اس کی چوحدی تو سمجھ لیجئے۔ سینما جانے کے لئے تیار ہوتے ہیں تو کوئی بے تکلف دوست آ جاتا ہے کہ "فلاں حاکم سے فلانے دوست کے بھانجے کے لیے سفارش کر دیجئے" رات کو جب سونے کی کوشش کرتے ہیں تو کوئی شب بیدار سیلانی آن دھمکتے ہیں کہ اس مصروف زندگی میں دن میں موقع نہ مل سکا اس لیے بڑی مشکل سے وقت نکال کر آیا ہوں۔ کہ رات بھر گپ لڑائی جائے یار تمہارا تو چہرہ دیکھنے کو ترس گیا۔ ہاسٹل لائف بھی کیا شاندار تھی! ہم لوگ علی گڑھ میں چاندنی راتوں میں کیسی مٹرگشتی کیا کرتے تھے۔؟ اور وہ مسٹر "پادری"، مسٹر "لاحول ولا قوۃ" اور "استاد چھوہارا" یاد ہیں؟ یہاں تک کہ خواب میں بھی یہی دیکھتا ہوں کہ شناساؤں کا غول جاپانی طرح تعاقب میں مصروف ہے۔ اور میں اپنا گھر سر پر اٹھائے جنگل کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہوں۔ گھبراہٹ میں آنکھ کھلتی ہے تو مارے دہشت کے پھر سوچنا شروع کر دیتا ہوں کہ جائیں تو جائیں کہاں؟

وارننگ: کوئی صاحب برائے مہربانی اس مضمون کو بہ آوازِ بلند نہ پڑھیں، ورنہ ان کے کسی بھی پڑوسی، رشتے دار یا دوست کے آبگینوں کو ٹھیس پہنچ سکتی ہے خطرہ ہے کہ طیش میں سامع کو خوفِ خدا نہ رہے۔ ★

★

اوزان رباعی

(صفحہ ۴۳ کا بقیہ)

تو رکن مابعد کی ابتدا بھی سبب ہی سے ہوگی اور اگر وتد پر اختتام ہوا ہے تو وتد سے ہوگی۔ یعنی سبب کے لیے سبب اور وتد کے لیے وتد ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو رباعی کا وزن غلط ثابت ہوگا۔ رباعی کے لیے یہ ایک مصرع مشہور ہے" سبب پئے سبب است و وتد پئے وتد است" اس مصرع کے ساتھ ساتھ ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ رباعی کا تیسرا رکن صرف "مفاعیل" مکفوف ہے حشو کے دوسرے رکن میں تمام ارکان تسکین اوسط کے ذریعے "مفاعیل" مکفوف" ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔ رباعی میں حشو کے دوسرے رکن "مفاعیل" مکفوف" کی جگہ رکن "مفاعلن" مقبوض کا لانا علم عروض سے ناواقفیت کی دلیل ہے "مفاعلن" مقبوض، حشو کے پہلے رکن ہی میں آتا ہے اور کہیں اس کا وجود نہیں۔ ماقبل رکن مقبوض "مفعول" اخرب کا آنا ضروری ہے چنانچہ صدر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگر رکن مفاعلن مقبوض رباعی کے تیسرے رکن میں لایا جائے گا تو رکن مفاعیل مکفوف جو کہ اصلی رکن ہے اس کی ترتیب بگڑ جائے گی۔ رباعی میں سیدھے سادے اور آڑے ترچھے سب طرح کے اوزان موجود ہیں تو اس کے تیسرے رکن مفاعیل مکفوف کی اصل صورت بگاڑنا اور اس کی جگہ "مفاعلن" مقبوض کا لانا محض لاحاصل ہے۔ اگر تیسرے رکن میں تبدل سے کام لیا جائے تو دیگر ارکان میں بھی تغیر و تبدل کا سوال پیدا ہو جائے گا اور رباعی اپنی ہیئت کھو بیٹھے گی۔ لہٰذا رباعی کے لیے جو ارکان وضع کیے گئے ہیں اور ان میں ترتیب دی گئی ہے اس کی پابندی نہایت ضروری ہے۔ واضعین نے رباعی کے حدود اس لیے نہیں قائم کیے کہ بے سوچے سمجھے ان میں ترمیم و تنسیخ کی جائے۔ رباعی کے رموز و نکات سمجھنے کے لیے اس کے دس ارکان کا اختلاط اور تسکین اوسط کے فوائد کا عمیق نظر سے جائزہ لینا ضروری ہے۔ ★

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

نام کتاب: مژگاں مژگاں (شعری مجموعہ)

شاعر : اطہر نبی ۔ قیمت : بیس روپے، ملنے کا پتہ : نصرت پبلشرز حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ۔

اطہر نبی لکھنؤ کی ان فعال اور متحرک شخصیتوں سے مرحلیں ہیں جن کی وجہ سے شہر کی ادبی اور تہذیبی فضا میں تموج اور سر و سبز ریبید اہو تا رہتا ہے ۔ وہ اپنی ادبی انجمن ہندی اردو ادب اوارڈ کمیٹی کے زیر اہتمام ہند و پاک کے ادبی مشاہیر کو مدعو کرتے رہتے ہیں اور لکھنؤ کے ارد و دوستوں کو یہ موقع فراہم کرتے رہتے ہیں کہ وہ شعر و ادب کے نئے نئے رجحانات سے براہ راست واقفیت حاصل کرتے رہیں ۔

ان کا شعری مجموعہ "مژگاں مژگاں" جسے اتر پردیش اردو اکاڈمی نے انعام سے نوازا اور جس کی معنوی خوبیوں کا اعتراف ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، رشید حسن خاں جیسی اہم شخصیتوں نے تحریری طور پر کیا ہے اور جو اس مجموعے میں دیباچے کے طور پر شامل ہے ۔

زیر نظر مجموعہ جس معیاری کلام پر مشتمل ہے اس کے پیش نظر یہ بات بڑے اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ اطہر نبی نے اپنے نقش اول ہی میں صاحبان ادب کے درمیان جو اعتبار قائم کر لیا ہے وہ مستقبل میں اور بھی زیادہ پائدار اور مضبوط ہوگا ۔ اطہر نبی نے اگر ایک طرف اپنا رشتہ اردو کی کلاسیکل روایات سے جوڑے رکھا ہے اور ان تمام فنی لوازمات کو ملحوظ رکھا ہے جسے دبستان لکھنؤ نے صدیوں کے سفر میں سنوارا اور نکھارا ہے تو دوسری طرف اپنے رمزیہ لب و لہجہ اور عصری احساسات کی آمیزش کی بنا پر اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے ۔

اطہر نبی جب عشقیہ شعر کہتے ہیں تو عصر حاضر کی بدلی ہوئی حسیات کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ اسی لیے موضوع اپنی قدامت کے باوجود ان کے اشعار کے پیکر میں ڈھلتا ہے تو ہمارے عہد کی طرز فکر سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یہ کائنات مجسم کرو تو لگتا ہے
دھنک بدن ہے گھٹا زلف، روشنی چہرہ

رہے وہ زلف کہ بادل کے سائبان رہے
سفر کی دھوپ بہت تیز ہے دھیان رہے

اب مرے ذہن میں ٹھہراؤ ہے جھیلوں جیسا
یاد جاناں کوئی کنکر ہی گرا دے مجھ میں

ہے سلیقہ جسے کچھ انجمن آرائی کا
بس وہی شخص ہے مارا ہوا تنہائی کا

ان اشعار کی تخلیق میں جو نفسیات پوشیدہ ہے وہ قدیم اور روایتی موضوعات کو اپنی بنیادوں پر قائم رکھتے ہوئے بھی ہمارے عہد سے قریب تر کر دیتی ہے اور اطہر نبی کے ہاتھ میں وہ جدید معلوم ہونے لگتے ہیں ۔

مگر عشقیہ اشعار کے علاوہ اطہر نبی کی فنکاری وہاں اور بھی روشن اور چمکدار ہو جاتی ہے جہاں وہ حکایت روزگار کو حدیث حسن اور جگ بیتی کو آپ بیتی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہی وہ خطرناک منزل ہوتی ہے جہاں عہد حاضر کے کھردرے مسائل غزل کے فن پر خراشیں ڈال دیتے ہیں اور شاعری نعرہ بازی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اطہر نبی اس مرحلے سے بھی نہایت چابکدستی اور فنکاری کے ساتھ گزر جاتے ہیں اور اپنے موضوعات کو فنی نزاکتوں کے ساتھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ موضوع کی چمک سے فن کا پیمانہ بھی جگمگانے لگتا ہے اور غزل بوجھل نہیں ہونے پاتی۔ عصری آگہی اور حسیت کی یہ آمیزش ان کی غزلوں کو خاصہ کی چیز بنا کر ہمارے سامنے رکھتی ہے ان کے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں ؎

کیا شہر احساس یہی ہے
آنسو، آہیں، پتھر، شعلے
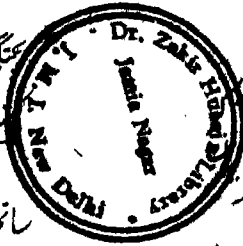
یہ کیسا زمانہ ہے نزدیک مرے
چھینے لیے جاتا ہے مجھ سے مرا چہرہ

آج کچھ لوگوں سے پھر رسماً مجھے ملنا پڑا
آج پھر اپنی طبیعت بے مزہ کرنا پڑی

یہ اور بات جسم ہے سارا لہو لہان
لیکن مرے بدن پہ ابھی میرا سر تو ہے

مجموعی طور پر مژگاں مژگاں پڑھنے سے یہ احساس قوی ہوتا جاتا ہے کہ اطہر نبی اپنی ذات کے مسائل سے نکل کر حیات و کائنات کے مسائل سے ہم آہنگ ہونے چلے جا رہے ہیں۔ سفر کا یہ رخ اور شاعر کا یہ رویہ اس کے مستقبل کے امکانات کو وسیع سے وسیع تر بناتا ہے اور یہ امید نہیں بلکہ یقین کامل پیدا کرتا ہے کہ ان کا کلام مشق اور ریاضت کے ساتھ ساتھ ہمارے عہد کے کرب، محرومیوں اور الجھنوں سے آنکھیں ملا کر عہد حاضر کی تاریخی دستاویز بن جائے گا۔ جس کی صداقتیں مستقبل کے ادبی مورخ کے لیے ایک صحیفہ کی حیثیت رکھیں گی۔

—— ملک زادہ منظور احمد

نام کتاب: تجربوں کی دھوپ (شعری مجموعہ)
شاعر: رئیس انصاری
ملنے کا پتہ: انصاری ہینڈلوم کارنر متصل امین آباد پاور ہاؤس، لکھنؤ
قیمت: دس روپے

جناب رئیس انصاری صاحب اردو کے جواں سال شاعروں میں ہیں۔ میں برسوں سے انھیں جانتا ہوں۔ ان کا کلام کئی مرتبہ آل انڈیا مشاعروں میں سننے کا بھی اتفاق ہوا ہے۔ موصوف لکھنؤ کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں نہایت جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں۔ اور کئی اداروں کے روح رواں بھی ہیں۔ ان کے کلام میں سلاست، پاکیزگی اور روانی کے علاوہ پختگی بھی پائی جاتی ہے۔ انداز بیان پر لطف بھی ہے۔ غرضیکہ ایک کہنہ مشق شاعر کی طرح انھیں شعر گوئی کا اچھا سلیقہ ہے۔

رئیس صاحب بڑے حساس اور انسان دوست شاعر ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ قومی یک جہتی اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہیں۔ وہ ہندستانی معاشرے میں ایک زبردست تبدیلی کے خواہاں ہیں اور اپنے اشعار کے ذریعے وہ عوام میں ذہنی انقلاب لانا چاہتے ہیں چنانچہ زیر نظر مجموعہ میں "مجھ سے ملیے" کے تحت کہتے ہیں۔

"میں نے جب قلم اٹھایا تو مجھے نسیم صبح کے بجائے آگ برساتے ہوئے شعلے، شبنم کے معطر قطروں کے بجائے محرومی کے آنسو، آسودگی کے بجائے بھوک، شیشے کے محلات کے بجائے کھنڈر اور مسکراتے ہوئے حسین چہروں کے بجائے بلکتے اور نوحہ کرتے ہوئے یتیم بچے مجھ سے اپنا حق مانگتے ہوئے نظر آتے ہیں اور میں نے ان کا حق یہ کہہ کر ادا کرنے کی کوشش کی ہے:

امن، تہذیب، رواداری، شرافت، اخلاص
نقش کیا کیا تھے جو نفرت نے مٹا ڈالے ہیں
ہماری زندگی جلتے ہوئے شہروں میں گزرے گی
ہمیں آتا نہیں بھڑکے ہوئے شعلوں سے ڈر جانا

رئیس انصاری کے اشعار زندگی سے بہت قریب ہیں۔ ان میں احساس کی شدت اور جذبات کی عکاسی کے علاوہ معنی آفرینی، بلند خیالی اور انقلابی تاثرات پائے جاتے ہیں۔

ان کے کلام میں طنز و مزاح کی پاکیزہ اور عمدہ مثالیں بھی ملتی ہیں کہتے ہیں۔

غزلوں کا میری اور بھی معیار بڑھ گیا   قوال جب سے ٹی وی پہ گانے لگے مجھے

اب پختگی کلام کی بھی یہ مثالیں ملاحظہ ہوں: ـــ

میری توبہ شراب خانے میں   روز اک جام توڑ دیتی ہے
تم نے چھوڑا تو کیا گناہ کیا   زندگی ساتھ چھوڑ دیتی ہے

آئیے، تجربوں کی دھوپ پڑھیے اور جواں سال شاعر کو داد دیجیے۔

—— اکبر حیدری